سرفروش
PDFBOOKSFREE.PK
1
اظہر
کلیم

دوڑتے دوڑتے میرے برہنہ تلووں میں آبلے پڑ گئے۔ اب تو شاید یہ آبلے پھٹ کر رسنے بھی لگے تھے لیکن میں تکلیف کی پروا کیے بغیر پاگلوں کی طرح دوڑ رہا تھا۔ یہ زندگی کی طرف ایک ایسی دوڑ تھی جس میں موت کا سایہ میرا حریف تھا۔ تقدیر اس دوڑ کو جتنا طول چاہتی، دے سکتی تھی اور اسے مختصر کرنا بھی اسی کے ہاتھ میں تھا لیکن اس دوڑ کو جیتنے کی میری کوشش، آخری سانس کے ساتھ ہی دم توڑنا چاہتی تھی کہ میں بُری طرح ہانپ رہا تھا۔

میرے گلے میں محاورے والے نہیں بلکہ حقیقی کانٹے اُگ آئے تھے۔ میرا حلق خشک ہو چکا تھا۔ آتی جاتی سانس سے میرے پھیپھڑوں میں ایک عجیب سی چُبھن ہونے لگی تھی۔ زخمی پیر جب کنکریوں پر پڑتے تو جسم کے ساتھ ساتھ میری رُوح بھی کانپ جاتی اور یوں لگتا جیسے میں دہکتے ہُوئے انگاروں پر دوڑ رہا ہُوں۔

بیڑیوں کی وجہ سے دوڑنے میں کافی دُشواری ہو رہی تھی اور مَیں کئی بار مُنہ کے بل بھی گر چکا تھا۔ چہرہ بچانے کی کوشش میں میری ہتھیلیاں زخمی ہو گئی تھیں اور ماتھا، آہنی ہتھکڑیوں سے ٹکرا کر خون کے چھینٹے اُڑانے لگا تھا۔ خون کی یہ بوندیں میری آنکھوں میں گر گر کر رُخساروں پر لڑھکتی ہُوئی، میری باچھوں تک پہنچ رہی تھیں اور مَیں اپنے ہی خون کا ذائقہ محسوس کر رہا تھا۔ دوڑتے دوڑتے میری ٹانگیں بھی شل ہو گئی تھیں اور بیڑیوں کی وجہ سے میرے ٹخنے زخمی ہو کر ناکارہ ہوتے جا رہے تھے لیکن میں اس وقت تک نہ رُکا، جب تک مجھے یہ یقین نہ ہو گیا کہ میں بہت دُور نکل آیا ہوں اور کوئی میرا تعاقب بھی نہیں کر رہا ہے۔

مَیں رُک گیا اور پلٹ کر دیکھنے لگا۔

دُور... بہت دُور دُھوئیں کا ایک مرغولہ فضا میں معلّق، کوئی آسیب نظر آ رہا تھا۔ اس کے نچلے حصّے میں شعلوں کی سُرخی نظر آ رہی تھی۔ جیل کی جس گاڑی کو حادثہ پیش آیا تھا، وہ ابھی تک جل رہی تھی۔ غالباً اس کا پیٹرول ٹینک پھٹ چُکا تھا لیکن اندھا دُھند دوڑنے اور فاصلے کی وجہ سے مَیں یہ دھماکا سُننے سے قاصر رہا تھا۔ حادثات ہوتے ہیں تو لوگ عموماً مر جاتے ہیں لیکن مجھے جو حادثہ پیش آیا، اس کی وجہ سے مجھے زندگی مل گئی تھی۔ اگر اس گاڑی کو حادثہ پیش نہ آتا تو میں اپنی موت کی آخری ہچکی کا وقت بڑے وثوق سے بتا سکتا تھا... لیکن مجھے زندگی مل گئی تھی... ایک بالکل ہی نئی زندگی... یہ الگ بات ہے کہ اس زندگی کو موت کی نظر لگی ہوئی تھی اور اسے محفوظ رکھنے کے لیے ہر انسانی نگاہ سے چُھپا کر رکھنا چاہیے تھا۔

اُف کتنے بھیانک تھے، وہ لمحات!

عدالت نے مجھے ایک ناکردہ گناہ کی پاداش میں سزائے موت سُنا دی تھی اور مجھے قیدیوں کی مخصوص گاڑی میں واپس جیل لے جایا جا رہا تھا۔ اس گاڑی میں میرے اور ڈرائیور کے علاوہ صرف تین محافظ تھے۔ ایک مسلّح محافظ اگلے حصّے میں ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا تھا جب کہ عقبی حصّے میں، میرے دائیں بائیں، منکر نکیر کی طرح دو سرکاری فرشتے براجمان تھے۔ جیل کے راستے میں دس بارہ میل کا ایک ویرانہ تھا۔ اس ویرانے میں چھوٹی چھوٹی چٹانوں کے کئی سلسلے تھے اور یہاں دُور دُور تک کوئی عمارت دکھائی نہیں دیتی تھی۔ جیل گاڑی جیسے ہی اس علاقے کی سنسان سڑک پر پہنچی... مخالف سمت سے آنے والی ایک گاڑی سے ٹکرا گئی۔ حادثہ اس قدر اچانک اور شدید تھا کہ یہ بھی سمجھ میں نہ آ سکا کہ کیا ہُوا ہے؟ مَیں

زندہ بھی ہُوں یا نہیں ؟ غالباً میں بے ہوش ہوگیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ ذہنی غفلت زیادہ دیر برقرار نہیں رہی۔ میری آنکھیں تو کھلی ہُوئی تھیں لیکن اپنے زندہ ہونے کا یقین نہیں آرہا تھا . . . اور جب میں نے ملبے میں پڑے ہُوئے دو باوردی سپاہی دیکھے اور انھیں بے حس و حرکت پایا تو رفتہ رفتہ احساس ہونے لگا کہ موت میرا بوسہ لیے بغیر ہی رُخصت ہوگئی ہے۔

تصادم کی وجہ سے عقبی حصّے کا دروازہ کھُل گیا اور میں دھچکا لگنے کے باعث سڑک کے کنارے جاگرا۔ سڑک کے کنارے پاؤڈر جیسی نرم نرم دُھول تھی جس نے میرے جسم کو کسی شدید ضرب لگنے سے پہلے ہی اپنے اندر جذب کرلیا تھا۔ جسم و جاں کو سلامت پایا تو حواس تیزی سے قابو میں آگئے۔ میں نے اُٹھنے کی کوشش کی لیکن پہلی بار ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ شاید میری کوشش بارآور ثابت ہُوئی تھی۔

سڑک کے کنارے کھڑے کھڑے مَیں نے متصادم گاڑیوں کی طرف دیکھا۔ دونوں ایک دوسرے میں دھنس کر رہ گئی تھیں۔ درمیانی حصّے سے دُھواں اُٹھ رہا تھا اور ہر گزرتے ہُوئے لمحے کے ساتھ اس کی کثافت بڑھتی ہی جارہی تھی۔ عقبی حصّے کے دونوں محافظ مُردہ تھے اور ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان آدمیوں کے بارے میں کچھ کہنا اس لیے ممکن نہ تھا کہ میری آنکھیں اُنھیں ملبے میں دیکھنے سے قاصر تھیں۔ یہ حادثہ ایک ایسے قیدی کے لیے یقیناً رُوح افزا تھا جسے تین روز بعد علی الصّباح سزائے موت دی جانے والی تھی۔ میں نے عقب میں اور سامنے دیکھا۔ دونوں طرف حدِ نگاہ تک سڑک خالی تھی۔ کار تو درکنار، کسی آدمی کا ہیولہ بھی دِکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے ایک طرف دوڑنا شروع کر دیا۔ اس سے پہلے کہ حادثے کی خبر قانون کے کانوں تک پہنچتی، میں اس مقام سے دُور نکل جانا چاہتا تھا . . . اتنی دُور جہاں میری گردن پر مسلط کی ہُوئی جبری موت کا سایہ بھی مجھ تک پہنچنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

دوڑتے دوڑتے مجھے ٹھٹک جانا پڑا۔

میری سماعت سے کسی گاڑی کی آواز ٹکرانے لگی تھی۔

پلٹ کر دیکھا تو مجھے یوں محسوس ہُوا جیسے کوئی ٹھاٹھیں مارتا ہُوا سمندر میرے تعاقب میں چلا آرہا ہو . . . اور اگر میں کسی محفوظ جگہ پہنچنے میں کامیاب نہ ہُوا تو اس کی لہریں مجھے نگل لیں گی۔ ایک سرکاری جیپ اُچھلتی کُودتی میری طرف چلی آرہی تھی۔ میں ایک بار پھر دوڑنے لگا۔ اس مرتبہ میں یوں دوڑا تھا جیسے میرے پیروں کے نیچے پَر لگ گئے ہوں۔ موت کا خوف مجھے اُڑائے لیے جارہا تھا۔

دفعتاً نشیب میں مجھے ایک عمارت دِکھائی دی۔

عمارت کے گرد خاردار تاروں کی باڑ تھی۔ میں جب اس باڑ کے قریب پہنچا تو ایک بار پھر پلٹ کر دیکھا۔ جیپ نظر تو نہیں آرہی تھی البتہ میں اس کی آواز ضرور سُن سکتا تھا . . . لیکن میری نگاہ اگلے ہی لمحے تاروں پر جھُولتی ہُوئی ایک تختی پر جم کر رہ گئی جس کی تحریر کا مفہوم کچھ یوں تھا؛

"اس باڑ سے گزرنے والے کی واپسی ناممکن ہے۔
چاہے وہ کسی بھی عہدے یا شخصیت کا مالک
کیوں نہ ہو۔ سرکاری و غیر سرکاری، ہر شخص اس
عمارت سے دُور رہے ورنہ اس کی زندگی کی کوئی
ضمانت نہیں دی جاسکتی۔"

مَیں ہانپ کر رہ گیا۔ ایک مصیبت سے نکلا تھا تو دوسری مصیبت سامنے آگئی تھی۔ یہاں سے آگے بڑھنا خود کو قانون کے حوالے کرنے کے مترادف تھا جب کہ باڑ کو پار کرنا بھی موت کی علامت بن سکتا تھا . . . لیکن یہ ایک غیر یقینی موت تھی اس لیے مَیں نے اس کو قبول کرلینا گوارا کرلیا اور تاروں میں گھُستا چلا گیا۔ تاروں میں گھُستے ہی مجھے یُوں لگا جیسے جسم و جان کا رشتہ اچانک ہی منقطع ہوگیا ہو۔

مَیں دُنیا و مافیہا سے بے خبر ہوگیا۔

★★

میری آنکھیں دیر سے کھُلی ہُوئی تھیں لیکن چشمِ ہوش کو ابھی بینائی میسّر نہیں آئی تھی۔ پُورا جسم پھوڑے کی طرح دُکھ رہا تھا اور ٹیسیں، میری ہستی کو ہلکان کیے دے رہی تھیں۔ میں نے کراہ کر کروٹ لینے کی کوشش کی تو معلوم ہُوا کہ میں جسم کو حرکت دینے کی خواہش تو کرسکتا ہُوں، اسے حرکت نہیں دے سکتا۔ میرا جسم بندھا ہُوا تھا لیکن کوئی بندش دِکھائی نہیں دیتی تھی۔ یوں لگ رہا تھا، جیسے میرے پٹھے اکڑ کر ناکارہ ہو گئے ہوں . . لیکن میں اتنا کمزور بھی نہیں تھا کہ اتنی بھاگ دوڑ کی وجہ سے یوں بے جان ہوکر رہ جاتا۔ یقیناً کوئی اور ہی بات تھی۔

مَیں اپنی آنکھوں کو جہاں تک حرکت دے سکتا تھا، انھیں متحرک کر کے دیکھا تو معلوم ہُوا کہ میرے جسم پر نیلی نیلی روشنی کی لہریں پڑ رہی ہیں۔ غالباً ان روشن لہروں نے ہی میری توانائی سلب کر رکھی تھی۔ اس نیلی روشنی کے پار مجھے ایک چہرہ دِکھائی دینے لگا جس کے خدوخال ساکت تھے اور جس پر سجی ہُوئی چشمے کے

شیشوں کی اوٹ میں، دو غیر متحرک آنکھیں مجھ ہی پر جمی ہُوئی تھیں۔

"آقائے سرزرش!" اچانک اُسی چہرے کے ہونٹوں نے حرکت کی اور بھاری آواز میری سماعت سے ٹکرائی: "تم اس وقت جن شعاعوں کی زد میں ہو، ان سے نکل جانا انسانی طاقت سے بعید ہے۔"

"اوہ! تو یہ شخص میرا نام بھی جانتا ہے!" مَیں نے سوچا اور اس سے بات کرنے کے لیے مُنہ کھولنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔

"ٹھہرو . . " اس شخص نے کہا اور اُس مشین کا رُخ پھیرنے لگا جس سے منتشر ہونے والی شعاعوں نے مجھے حصار میں لے رکھا تھا۔ مشین سے نکلنے والی شعاعیں میرے چہرے سے ہٹ گئیں اور سینے سے پیروں تک میں نیلی نیلی روشنی میں نہایا رہا۔ گویا اس نے سر اور گردن ان پُراسرار شعاعوں کے اثر سے نکال دی تھی۔ "اب تم بات کرسکتے ہو۔" اسی شخص کی آواز سُنائی دی۔

"تم میرا نام کیسے جانتے ہو؟" مَیں نے حیرت سے پوچھا۔

"کچھ دیر قبل ریڈیو پر جیل کی گاڑی کو پیش آنے والے حادثے کی خبر نشر ہو چکی ہے اور تمھارے متعلق مجھے سب کچھ معلوم ہو چُکا ہے۔"

"پھر تم نے ابھی تک مجھے قانون کے حوالے کیوں نہیں کیا؟"

"شاید تم نے تاروں میں گھُسنے سے پہلے باہر لکھی تنبیہہ نہیں پڑھی تھی۔" اُس شخص نے کہا۔ "یہاں صرف شہنشاہ اور تین سائنس دانوں کی آزادانہ آمدورفت ہے۔ ان کے علاوہ کوئی بھی شخص زندہ باہر نہیں جاسکتا۔"

"تو پھر مَیں اَب تک کیسے زندہ ہوں؟"

"تم جب تک اس عمارت میں ہو، زندہ ہو۔ اس سے باہر جاتے ہی تمھارے جسم و جان کا رشتہ ختم کردیا جائے گا۔" اس شخص نے خوف ناک لہجے میں کہا۔ "اس کے علاوہ مَیں نے تمھارے بارے میں خصوصی معلومات حاصل کر کے خاص اجازت نامہ طلب کیا ہے۔ اگر شہنشاہ نے میری درخواست منظور کرلی تو میں تمھارے سامنے ایک تجویز رکھوں گا جسے قبول یا رَدّ کرنا تمھارا کام ہوگا۔ اس کے بعد ہی تمھارے مقدر کا کوئی فیصلہ ہوگا۔"

"کیا مَیں تمھارے بارے میں کچھ پوچھ سکتا ہوں؟" میں نے کہا۔ "اور مَیں اس پُراسرار عمارت کے متعلق بھی جاننے کے لیے بے چین ہُوں۔"

"جب تک اُوپر سے واضح ہدایات نہیں آجاتیں، تمھیں کچھ نہیں بتایا جاسکتا۔" یہ کہتے ہُوئے اس نے مشین کا رُخ بدل کر میرے چہرے کو بھی نیلی روشنی کے حصار میں دے دیا۔

مَیں نے آنکھیں بند کرلیں۔ عجیب روشنی تھی۔ آنکھوں کے علاوہ میں جسم کے کسی بھی حصّے کو حرکت نہیں دے سکتا تھا . . . سوچیں بھی منجمد نہیں تھیں اس لیے میں اپنے مقدر کا فیصلہ سُننے کے انتظار میں کسی لاش کی طرح بے حس و حرکت لیٹا سوچتا رہا . . لیکن میں واضح طور پر کچھ سوچ بھی نہیں پایا تھا کہ نیند کی گہرائی میں ڈوبتا چلا گیا۔

نہ جانے کتنی دیر بعد پھر میری آنکھ کھُلی۔

اس بار میرے قریب چار آدمی کھڑے تھے۔ ان میں ایک وہی تھا جس نے پہلی دفعہ، ہوش میں آنے پر مجھ سے بات چیت کی تھی۔ میرے سینے سے پیروں تک نیلی روشنی کا حصار تھا لیکن گردن آزاد تھی۔ میں نے باری باری ان چاروں کی طرف دیکھا۔

"میرا نام ڈاکٹر فریدان ہے۔" مانوس آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ "آقائے سرزرش! تمھارے بارے میں شہنشاہ کے احکامات آچکے ہیں اور اب میں وہ تجویز پیش کرنا چاہتا ہوں، جسے قبول کرنا یا رَدّ کرنا تمھارے اپنے اختیار میں ہے۔ اس سے پہلے یہ بات ذہن نشین کرلو کہ تم ایک مُردہ آدمی ہو۔ تمھاری موت کا وقت طے ہو چُکا ہے۔ تجویز رَدّ کرنے کی صورت میں تمھیں یہیں سزائے موت دے دی جائے گی اور اس طرح قانون کا وہ تقاضا بھی پورا ہو جائے گا جس سے تم اپنی دانست میں، فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے۔"

"ڈاکٹر فریدان . . ." میں نے پُرسکون آواز میں کہا: "میں نہیں جانتا یہ کون سی جگہ ہے اور یہاں کیا ہو رہا ہے البتہ میں ایک بار پھر کہوں گا کہ مَیں بے گناہ ہُوں۔ میں نے قتل نہیں کیا۔ میرے خلاف ایک سازش کی گئی تھی۔ اگر مجھے مہلت دی جاتی تو میں یقیناً اپنی بے گناہی ثابت کر دیتا۔ بہرحال، تم لوگوں نے بھی شاید میرے متعلق تحقیقات کی ہیں، ان سے تمھیں اندازہ ہوگیا ہوگا کہ میں ایک انسان دوست اور کھرا آدمی ہُوں۔"

"بے شک، لیکن واقعاتی شہادتیں تمھارے خلاف ہیں۔" ڈاکٹر فریدان نے کہا: "بہرحال، یہ ان باتوں کا وقت نہیں ہے۔ تم ایک بے جگر، مضبوط اور غیر معمولی آدمی ہو اس لیے میں نے تمھارا وجود اپنے تجربے میں استعمال کرنے کی اجازت حاصل کرلی ہے۔ اگر تمھیں یہ تجویز منظور ہو تو تیار ہو جاؤ لیکن یہ بات ذہن میں رکھنا کہ اس تجربے میں تمھارے زندہ بچ جانے کی اُمید صرف ایک فی صد ہے۔"

"ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بھی بہت ہوتا ہے، ڈاکٹر فریدون۔" میں نے تلخی سے ہنس کر کہا۔ "ننانوے فی صد موت میں سے ایک فی صد زندگی بچ گئی تو میں اسے بھی بہت سمجھوں گا۔ وہ تجربہ کیا ہے؟"

"تمھیں کمپیوٹر میں ڈال کر ماضی کے سفر پر روانہ کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ تمھارا وجود تحلیل ہو جائے گا اور ماضی میں کہیں جا کر دوبارہ مجسّم ہو جائے گا۔"

"ایک فی صد یا سو فی صد؟"

ڈاکٹر فریدون ہنس پڑا۔ اُس کی آنکھوں میں میرے لیے تعریفی چمک پیدا ہو گئی تھی۔ اس نے داد طلب نظروں سے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا جنھوں نے اثبات میں سر ہلا کر تائید کر دی۔ گویا ڈاکٹر فریدون نے تنہائی میں انھیں جو کہا تھا، وہ تینوں اس سے متفق ہو گئے تھے۔ یہ غالباً وہی تینوں سائنس دان تھے جن کا ڈاکٹر فریدون نے پہلے مجھ سے تذکرہ کیا تھا۔

"اس سلسلے میں کوئی بھی حتمی بات نہیں کہی جا سکتی۔" ڈاکٹر فریدون نے میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔ "تم پہلے جان دار ہو جو اس کمپیوٹر میں سفر کرو گے۔"

اس کے بعد ڈاکٹر فریدون نے کمپیوٹر کے تجربات اور ان کے نتائج پر ایک طویل بات چیت کی جسے میں خاموش لیٹا سنتا رہا تھا۔ جب ہر بات مجھ پر واضح ہو گئی تو میں نے ایک لمحے کے لیے بھی سوچنا گوارا نہ کیا۔ موت سامنے ہو اور فرار کا کوئی راستہ نہ ہو تو لائحہ عمل ترتیب دینے کی کوئی گنجائش بھی تو نہیں ہوتی۔ بہرکیف، مجھے حیرت ضرور تھی کہ آخر ڈاکٹر فریدون میری رضامندی کیوں چاہتا ہے۔ گیند اس کے کورٹ میں تھی اور وہ اس سے اپنی مرضی کے مطابق کھیل سکتا تھا۔ ۔ لیکن میں نے اس سلسلے میں یا کسی بھی سلسلے میں کوئی سوال کرنے کی بجائے ٹھوس لہجے میں کہا۔ "ڈاکٹر فریدون! تم ایک عظیم آدمی ہو۔ میں تمھارے انداز اور باتوں سے تمھاری شخصیت کا اندازہ لگا چکا ہوں۔ میں تمھارے تجربے کے لیے تیار ہوں۔ اگر زندہ رہا تو انشاءاللہ خود کو بے گناہ ثابت کرنے کی کوشش کروں گا ۔ ۔ ۔ اور اگر مر گیا تو اس حسرت سے، مجھے ایک ناکردہ گناہ کی پاداش میں سزائے موت دی گئی ہے۔"

ڈاکٹر فریدون نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اس کے تینوں ساتھیوں نے عجیب وضع کے ریوالور نکال لیے اور ڈاکٹر نے نیلی روشنی کی مشین بند کر دی۔ لمحوں میں میرا جسم ہلکا پھلکا ہو گیا اور تب پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ میرے جسم پر لباس نام

کی کوئی بھی چیز نہیں ہے اور اس سے بھی زیادہ یہ محسوس کر کے مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا کہ میرے جسم پر زخم کا ہلکا سا بھی نشان موجود نہیں ہے۔ تھکن کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ مجھے ریوالور کی نال پر ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ جہاں اَن گنت مشینیں تھیں اور بے شمار بلب جلنے بجھنے میں مصروف تھے لیکن وہاں ایک بھی آدمی موجود نہیں تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے سارا کام کسی خودکار نظام کے تحت ہو رہا ہو۔

مجھے ایک آرام دہ کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا گیا۔

میں بیٹھ گیا تو میرے ہاتھ پیر بالکل اسی انداز میں شکنجوں سے کس دیے گئے جیسے سزائے موت کی کرسی پر بیٹھے ہوئے مجرم کو بے بس کر دیا جاتا ہے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ جیل گاڑی سے فرار ہونے سے پہلے اور بعد کی بہت سی باتیں، بہت سی اُلجھنیں میرے ذہن میں سر اُبھار رہی تھیں لیکن میں سب کو نظرانداز کر کے آنکھیں بند کیے کرسی پر نیم دراز پڑا رہا حتیٰ کہ میرا جسم یکایک سرد پڑنے لگا اور پھر ٹھٹھری ہوئی یہ حالت میرے لیے ناقابل برداشت ہو گئی۔ تب میں نے قلب و ذہن کو گرمانے والی ایک ہستی کا پیکر اپنے تخیل میں اجاگر کر لیا۔ وہ میری دھڑکنوں سے بھی زیادہ قریب تھی لیکن میں اپنی ہستی کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دینے کے لیے مجبور تھا۔ ۔ ۔ اور میری ہستی، اس عزیز از جان ہستی سے دور ہوتی چلی گئی۔ مجھے اپنا وجود ذرات میں ڈھلتا محسوس ہونے لگا اور پھر نہ جانے کب میں ہوش و خرد کی فضاؤں سے نکل کر بے ہوشی کے سمندر میں تہ نشین ہوتا چلا گیا۔

★★

مجھے ہوش آیا تو شام کا پہلا ستارہ نمودار ہو چکا تھا۔ درد کی ہلکی ہلکی لہریں ابھی تک میرے دماغ میں دوڑ رہی تھیں۔ دفعتاً مجھے احساس ہوا کہ میں ایک انجانی دُنیا میں موجود ہوں۔ ۔ ۔ میں مخملیں گھاس کی دبیز چادر پر پڑا ہوا تھا۔ میرے چاروں طرف کیڑوں مکوڑوں اور جھینگروں کی بھنبھناہٹ گونج رہی تھی اور کہیں دُور سے کتوں کے بھونکنے کی آواز آ رہی تھی۔ قریب ہی ایک چشمہ رل ترل کی آواز کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں، ڈوبتے سورج کی سُرخ ٹکیہ لمحہ بہ لمحہ تحلیل ہو رہی تھی۔

دفعتاً قریب ہی ایک سایہ سا لہراتا محسوس ہوا اور اس کے ساتھ ہی ٹھنڈے پانی کی دھار میرے چہرے کو تر کر گئی۔

سرد پانی کی کاٹ نے میرے اعصاب کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ میں غصے اور صدمے سے جھلایا ہوا اُٹھ بیٹھا۔ اُسی لمحے میری سماعت سے ایک نسوانی آواز ٹکرائی۔

"اب ٹھیک ہے۔ مجھے یقین تھا کہ تم مُردہ نہیں ہو۔ دیکھو! اب تم فوراً میری مدد کرو۔ میں شہزادی تاشیہ تمھیں حکم دیتی ہوں۔"

میں آنکھوں سے پانی صاف کرنے لگا۔

مطمئن تھا کہ میں زندہ ہوں اور میری زندگی اس تجربے کی بھینٹ نہیں چڑھی۔ جس میں ننانوے فی صد موت کی توقع تھی۔

یکایک وہی نسوانی آواز دوبارہ سُنائی دی۔

میں خیالوں کی دُنیا سے نکل کر حقیقت کی دُنیا میں آ گیا۔

"جلدی کرو۔" لڑکی نے بے چین آواز میں کہا۔ "اور یہ گنواروں کی طرح آنکھیں ملنا بند کرو۔ وہ قریب آتے جا رہے ہیں۔ اگر انھوں نے ہمیں تلاش کر لیا تو مار ہی ڈالیں گے اور میں ایک قیدی کی حیثیت سے ملکہ زوبا کے سامنے جانے کی بجائے مرنا ہی پسند کروں گی۔"

حواس ٹھکانے آتے ہی مجھے ایک زبردست جھٹکا لگا۔ میرے جسم پر لباس نام کی کوئی بھی چیز نہیں تھی۔ اس چیز سے تو مجھے کمپیوٹر میں ڈالنے سے پہلے ہی محروم کر دیا گیا تھا۔ اچانک وہی نسوانی آواز دوبارہ سنائی دی۔

"لو، اسے پکڑو۔ فرار ہونے کے لیے مجھے ایک نگراں کو ہلاک کرنا پڑا تھا۔ یہ میری زندگی کا پہلا خون تھا شاید اسی لیے مجھے دشمن کو ہلاک کر کے کوئی لطف نہیں آیا۔ تم کوئی جاں باز دکھائی دیتے ہو، لہٰذا اس ہتھیار کا استعمال بھی جانتے ہو گے۔ سُنو، سُنو، وہ اسی طرف آ رہے ہیں۔"

میں نے آواز کی طرف نگاہ اُٹھا کر دیکھا۔ وہ ایک نوخیز اور بے حد دلکش لڑکی تھی۔ سُرخی مائل بھورے بال اس کی کمر تک آئے ہوئے تھے جنھیں اس نے ایک طلائی چھلے سے باندھ رکھا تھا۔ اس کے جسم پر گہرے رنگ کا ریشمی لباس تھا، جس سے صحیح معنوں میں پردہ داری نہیں ہو رہی تھی۔ نازک کمر سے بندھی ہوئی کانسی کی پیٹی سے سینگ کی بنی ہوئی چھاگل جھول رہی تھی۔ غالباً اسی چھاگل سے میرے چہرے پر پانی ڈالا گیا تھا۔ لڑکی کے پیروں میں چمڑے کی خوش نما چپل تھی۔ وہ اپنی بڑی بڑی غزالی آنکھوں سے مجھے گھور رہی تھی۔

میں نے محسوس کیا کہ اس کی آنکھوں میں حیرت یا حجاب نہیں ہے۔ اس کا انداز تحکمانہ تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں بھاری تلوار دبی ہوئی تھی جس کی دھار پر خشک خون کے دھبے نظر آ رہے تھے۔

معاً میں چند آوازیں سُن کر چونک پڑا۔ لڑکی غلط نہیں کہہ رہی تھی۔ کہیں قریب ہی کتے بھونک رہے تھے اور اُن کے ساتھ ہی کچھ لوگوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ لمحہ بہ لمحہ اُن آوازوں کا فاصلہ کم ہوتا جارہا تھا۔ یہ آوازیں مغرب میں پھیلی ہُوئی سرسبز پہاڑیوں کے عقب سے آرہی تھیں، جہاں میں اور لڑکی کھڑے تھے، وہ ایک چھوٹی سی وادی تھی۔ قریب سے ایک چشمہ اٹکھیلیاں کرتا ہُوا گزرتا تھا اور اس کے ساتھ بلوط کا گھنا اور بلند و بالا جنگل دُور تک پھیلا ہُوا تھا۔

میں نے فی الفور فیصلہ کیا اور لڑکی کے ہاتھ سے تلوار لے لی۔

مجھے شکار کرنے اور شکار ہونے کا بڑا وسیع تجربہ تھا... آخر میں مارشل آرٹس کا انسٹرکٹر تھا اور فنونِ حرب سیکھنے کے بعد مجھے بڑے ہی سنگین حالات سے گزرنا پڑا تھا۔

مجھے اندازہ تھا کہ مزید کچھ سوچنے اور غور کرنے کا وقت نہیں رہا۔ آوازیں اب زیادہ سے زیادہ چوتھائی میل کے فاصلے پر رہ گئی ہوں گی۔ میں نے تلوار تولتے ہُوئے کہا: "تم نے کہا تھا کہ تم کوئی شہزادی ہو؟"

"تمھیں اس میں کوئی شبہ ہے؟" لڑکی کی بھوری آنکھیں ناگواری سے سکڑ گئیں۔

میں غیر ارادی طور پر، غالباً مضحکہ اُڑانے کے لیے اس کے آگے ذرا سا جھکا اور تلوار کو سلامی کے انداز میں اُٹھاتے ہُوئے کہا: "میں نے اس لیے نہیں پوچھا کہ تمھارے شہزادی ہونے میں کوئی شبہ ہے بلکہ بات دراصل یہ ہے کہ صورتِ حال میری عقل میں نہیں آئی۔ یہ تمام باتیں مجھے بے حد عجیب لگ رہی ہیں کیوں کہ میں اس سرزمین پر اجنبی ہوں۔"

وہ تنقیدی نظروں سے میرا جائزہ لینے لگی: "ہاں، میں بھی یہی محسوس کر رہی ہوں۔" اس بار اس کا لہجہ نرم تھا: "میں نے احباز میں تم جیسا آدمی پہلے کبھی نہیں دیکھا لیکن تم کوئی بھی ہو، فی الحال تمھیں میرے حکم کی تعمیل کرنا ہوگی۔ میں احباز کے بادشاہ کی بیٹی تاشیہ تمھیں حکم دیتی ہوں کہ میری مدد کرو۔ میں خطرے میں ہوں۔ اگر تم نے میری مدد کی تو میں غور کروں گی کہ تمھیں کیا انعام دیا جاسکتا ہے۔ یقین کرو، احباز کا بادشاہ انعام و اکرام دینے میں بے حد فراخ دل ہے۔ اب تم احمقوں کی طرح مجھے گھورنا بند کرو اور یہاں سے نکل چلنے کی فکر کرو، ورنہ میرے ساتھ تم بھی مارے جاؤ گے۔"

میں نے ایک بار پھر تلوار کو سلامی کے انداز میں حرکت دی اور مسکراتے ہُوئے کہا: "میں، تمھارے ہر حکم کی تعمیل کروں گا... شہزادی تاشیہ! میں تمھارا سچا خادم ہُوں لیکن تم مجھ سے کس قسم کی خدمت لینا چاہتی ہو؟ فی الحال تو کوئی خطرہ نہیں۔ اگر تم خود کو دُشمنوں کے نرغے میں محسوس کرتی ہو تو وہ ابھی کافی دُور ہیں۔"

لڑکی کے خوب صورت لبوں پر دلکش مسکراہٹ نمودار ہُوئی۔ وہ بھرپور نظروں سے میرے سراپا کا جائزہ لے رہی تھی: "نہ جانے کیوں مجھے یقین ہے کہ تمھارا تعلق کسی نیچ ذات سے نہیں ہے۔ تمھارا تعلق طبقۂ اشراف سے معلوم ہوتا ہے۔ تم کسی دوسری سرزمین سے آئے ہو، جو یہاں سے بہت دُور ہے۔ تمھارا نام کیا ہے؟" نام پوچھتے ہُوئے اس کا لہجہ ایک بار پھر تحکمانہ ہوگیا۔

"میرا نام سرفروش ہے اور سرفروشی ہی میرا پیشہ ہے۔ میں جس سرزمین سے آیا ہوں، وہاں بھی انسان ہی بستے ہیں لیکن وہاں کا انسان بے حد ترقی یافتہ ہے۔ وہاں تلوار جیسے ہتھیار متروک ہو چکے ہیں۔"

"ترقی یافتہ!" اس نے مضحکہ اُڑانے والے انداز میں کہا اور اس کی انگشتِ شہادت تیر کی طرح میری طرف اُٹھ گئی: "اتنے ترقی یافتہ کہ تمھیں لباس تک میسّر نہیں۔"

"یہ ایک ضمنی بات ہے جس کی وضاحت میں پھر کسی وقت کروں گا۔" میں نے کھسیا کر کہا۔

"تم نے اپنا نام کیا بتایا تھا؟" شہزادی تاشیہ نے پوچھا۔

"سرفروش۔" میں نے جواب دیا۔

وہ مُسکرا کر بولی: "عجیب سا نام ہے... لیکن اچھا لگتا ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ تم آسانی سے میری زبان سمجھ سکتے ہو اور تمھاری باتیں بھی میری سمجھ میں آرہی ہیں۔"

"ہاں... اس پر میں بھی حیران ہُوں لیکن شاید یہ ڈاکٹر فریدون کے کمپیوٹر کا کمال ہے۔" میں نے وضاحت کی: "تم وہ فارسی بول رہی ہو جو میرے لیے قدیم ہے۔"

وہ ایسی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی جیسے میں نے اس بار کوئی ناقابلِ فہم بات کہہ دی ہو: "سار... فروش!" اس نے زیرِ لب کہا۔ غالباً وہ ابھی تک میرے نام ہی میں اُلجھی ہُوئی تھی... پھر اُس نے سر جھٹکتے ہُوئے کہا: "ہُرمزد کی قسم! یہ بڑا ہی عجیب نام ہے میری تو زبان پر ہی نہیں چڑھ رہا ہے۔ خیر، ہم ان تمام باتوں کے بارے میں بعد میں بات کریں گے، فی الحال میں، تمھیں حکم دیتی ہوں کہ میرے عم زاد، شاہ یوطا با کے شہر تک میری محافظت کرو۔ اس شہر کا نام عکران ہے اور کہیں قرب و جوار ہی میں واقع ہے۔"

"یہ شہر کہیں قرب و جوار میں واقع ہے۔ یعنی خود تمھیں بھی ٹھیک سے نہیں معلوم کہ شہر کس طرف ہے۔ بہت خوب... اور تم چاہتی ہو کہ ایک ایسا آدمی تمھاری رہنمائی کرے جو بذاتِ خود اس سرزمین پر اجنبی ہے۔" میں نے طنزیہ کہا: "واقعی یہ تو شہزادیوں جیسی ہی ایک بات ہے۔"

"ایک راستہ اس شہر تک جاتا ہے..." وہ غصّے سے بولی۔

"یقیناً، کوئی نہ کوئی راستہ تو اس شہر تک ضرور جاتا ہوگا، ورنہ لوگ وہاں کیسے آتے جاتے ہوں گے۔" مجھے اب اس لڑکی سے چھیڑ چھاڑ میں لُطف آنے لگا تھا: "گویا ہمیں وہ راستہ تلاش کرنا ہے ورنہ ہم زندگی بھر اِدھر اُدھر ہی بھٹکتے رہیں گے۔"

لڑکی نے کچھ کہنے کے لیے مُنہ کھولا ہی تھا کہ اچانک سامنے جنگل سے ایک کُتّا تیر کی مانند برآمد ہُوا۔ وہ اپنے گروہ سے بہت آگے نکل آیا تھا۔ اس کی آنکھوں سے سُرخی جھلک رہی تھی اور تھوتھنی سے جھاگ چھُوٹ رہا تھا۔ اس کے تیوروں میں ہلاکت آفرینی تھی۔ غالباً اُسے اسی مقصد کے لیے سُدھایا گیا تھا... بال کھڑے کیے اور حلق سے غرّاہٹیں بلند کرتے ہُوئے اس عفریت نما کُتّے نے ہماری طرف چھلانگ لگائی۔

میں جلدی سے لڑکی کے سامنے آگیا... اور فوراً ہی اس کی کمر سے سینگ کی نوک دار چھاگل ایک جھٹکے سے الگ کر کے بائیں ہاتھ میں لے لی اور سرگوشی کی۔

"میرے پیچھے ہی رہنا، بالکل خاموش اور ساکت۔" میرے لہجے میں دبا دبا سا جوش و خروش تھا۔

اُس بپھرے ہُوئے درندے نے کوئی دس قدم کے فاصلے سے مجھ پر چھلانگ لگائی۔ اس کے بھاری جبڑے کھُلے ہُوئے تھے۔ بے رحم اور خون آشام دانت ڈوبتے سُورج کی سُرخی میں چمک رہے تھے۔ میں نے اپنا جسم ڈھیلا چھوڑ دیا اور ذرا آگے کو جھک آیا۔ کُتّا جبڑے پھیلائے، سیدھا میرے حلق پر آرہا تھا۔ قریب سے پتہ چلا، اس کی جسامت کسی چھوٹے ٹٹو سے کم نہیں ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ میرے جسم پر گرتا اور اس کے دانت میرے حلق میں پیوست ہوتے، میں نے بایاں ہاتھ آگے بڑھایا اور خود کو ایک طرف ہٹاتے ہُوئے اس کے جسم کو نوک دار سینگ پر روک لیا اور ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر میں نے دائیں ہاتھ سے تلوار اس کے پیٹ میں گھسیڑ کر دو تین جھٹکے دے دیے۔

کتے کا بھاری جسم زور دار آواز کے ساتھ زمین پر گرا۔ اس کے پیٹ سے خون کا فوارہ پھُوٹ پڑا اور جسم جان کنی کے عالم میں آہستہ آہستہ کانپنے لگا۔ اس کے حلق سے گھٹی گھٹی غرّاہٹیں نکل رہی تھیں۔ میں نے اس کی موت آسان بنانے کے لیے تلوار سے اس کی گردن پر بھرپُور وار کیا اور اُسے جان کنی کی اذیت سے نجات مل گئی۔

تلوار کو گھاس پر اچھی طرح صاف کرنے کے بعد میں نے پلٹ کر لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ مُنہ پہ ہاتھ رکھے، پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری ہی طرف متوجہ تھی۔ شدید حیرت کے باوجود اس کی آنکھوں میں میرے لیے تحسین کی جھلک نمایاں تھی لیکن وہ شہزادی تھی، اس لیے فوراً ہی شاہی نخوت آڑے آئی: "بے حد خوب صورت کُتّا تھا۔ تم نے اسے ضائع کر دیا۔" اس نے عجیب انداز میں میرے کارنامے کو سراہا تو بے اختیار جی چاہا کہ تلوار کا ایک ہاتھ اس کی کھوپڑی پر بھی رسید کر دوں۔ میں نے بہ مشکل خود کو روکا۔

میں اُس سرزمین پر اجنبی بلکہ ایک طرح سے اسیر تھا۔ شہزادی مزید کچھ 'فرمانا' چاہ رہی تھی کہ میں نے یک لخت ہاتھ کے اشارے سے اُسے بولنے سے روک دیا۔ آدمیوں اور کتّوں کی آوازیں بے حد قریب آگئی تھیں۔

وہ اس قدر نزدیک پہنچ گئے تھے کہ گھنے جنگل سے مشعلوں کی روشنی چھن چھن کر باہر آنے لگی تھی... پھر نیم تاریکی میں وہ مشعلیں یکے بعد دیگرے صاف دِکھائی دینے لگیں۔

چند لمحے بعد وہ مشعلیں نیم دائرے کی صورت اختیار کرنے لگیں۔ وہ لوگ اناڑی نہیں تھے۔ شہزادی کی تلاش میں کوئی کسر نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر وہ اسی انداز میں حرکت کرتے رہے تو ہمارے لیے راہِ فرار اختیار کرنا مشکل ہوجائے گی۔ ہمیں بھیگے ہُوئے چوہوں کی طرح پکڑ لیا جائے گی۔

میں نے پلٹ کر شہزادی کی طرف دیکھا۔ وہ بھی اسی جانب دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر خوف پھیل گیا تھا اور وہ مجھے ایک سہمی ہُوئی ہرنی نظر آرہی تھی۔

میں نے مزید وقت ضائع کیے بغیر اِدھر اُدھر دیکھا۔ فوری طور پر کچھ کر گزرنا چاہیے تھا جو تھوڑی سی مہلت تھی اُسے ہم نے باتوں میں گنوا دیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہاں سے نکلنے کا ایک ہی راستہ ہے۔ یہ راستہ چشمے سے ہو کر گزرتا تھا۔ میں نے جھپٹ کر لڑکی کا ہاتھ تھام لیا اور چشمے کی طرف دوڑنے لگا۔

"جلدی سے نکل چلو، شہزادی! تمھیں تھوڑی دیر دوڑنے کی زحمت اُٹھانا ہوگی۔"

چشمے میں رانوں سے زیادہ گہرا پانی نہیں تھا لیکن اس کی

تہ ناہموار اور پتھریلی تھی۔ پانی اتنا ٹھنڈا تھا کہ مجھے اپنا جسم برف ہوتا محسوس ہونے لگا۔ چشمے کی تہ میں جا بجا درختوں کی خشک ٹہنیاں اور گرے ہوئے تنے بھی موجود تھے۔ اس کے علاوہ رات کی بڑھتی ہوئی سردی اور دُھند کی یلغار نے پریشان کر دیا۔ مجھے تو خیر اس قسم کی صورتِ حال اور مشقت کی عادت تھی لیکن شہزادی تاشیہ کا حوصلہ ٹوٹ رہا تھا۔ وہ راستے کی رُکاوٹوں، تھکن اور ٹھنڈک سے بے حال ہو رہی تھی۔ اگر میں اُسے سہارا نہ دے رہا ہوتا تو وہ کب کی گر چکی ہوتی۔ وہ کسی نرم و نازک سی بیل کی مانند مجھ سے لپٹی ہوئی تھی اور میں اس کے ہانپنے کی آوازیں سُن رہا تھا۔ اُسے میرے جسم سے حرارت مل رہی تھی۔ غالباً اسی لیے وہ یُوں چپکی ہوئی تھی۔ اُس نے تقریباً سارا بوجھ میرے اوپر ڈال رکھا تھا۔ میں اس اجنبی سرزمین کی اجنبی شہزادی کو سہارا دیے دوڑتا رہا۔

ہم چشمے کے بہاؤ پر چل رہے تھے۔ مجھے تھکن کا احساس نہیں تھا البتہ اب سردی مزاج پوچھنے لگی تھی۔ چشمے کے ٹھنڈے پانی اور یخ بستہ ہواؤں نے رگوں میں خون منجمد کرنا شروع کر دیا تھا۔ اگر ہم دوڑ نہ رہے ہوتے تو شاید اب تک ہماری نسوں میں خون جم بھی چکا ہوتا۔ اوپر دُھند اور نیچے یخ بستہ پانی قیامت ڈھا رہا تھا۔

کچھ آگے جا کر چشمے کی مشرقی سمت میں، گھنے درختوں کا وسیع سلسلہ شروع ہو گیا ——— آسمان پر نیم روشن چاند نکل آیا تھا جس کی زرد زرد چاندنی سے فضا کسی حد تک صاف نظر آنے لگی۔

میں نے پلٹ کر اس طرف دیکھا جہاں سے ہم نے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا۔ وہاں دُھند کچھ زیادہ ہی گہری تھی اور شاید یہی دُھند ہماری ڈھال بن گئی تھی۔ تعاقب کرنے والے کسی اور طرف جا چکے تھے اور کوئی مشعل دِکھائی نہیں دے رہی تھی۔ آدمیوں کی آوازیں بھی سُنائی نہیں دے رہی تھیں اور کتوں نے بھی بھونکنا بند کر دیا تھا۔ وہ لوگ یا تو کہیں دُور نکل گئے تھے یا پھر اُنھوں نے ہماری تلاش کا کام سپیدۂ سحر کے انتظار میں ملتوی کر دیا تھا۔

میں نے سکون کی سانس لی اور شہزادی تاشیہ کو سنبھالے ہُوئے کنارے پر آ گیا۔

کنارے پر سبز گھاس کا تختہ تھا۔ میں اس پر گر گیا۔ گھاس کا یہ بستر حرارت تو نہیں پہنچا سکتا تھا تاہم یہ جگہ چشمے سے کہیں بہتر تھی۔ ہم غیر ارادی طور پر ایک دوسرے کے قریب قریب ہی دراز ہو گئے۔

شہزادی تاشیہ نے دھیمے لیکن تحکمانہ لہجے میں کہا "مجھے سخت سردی لگ رہی ہے اس لیے میں حرارت کی خاطر تمھارے ریچھ جیسے جسم کی پناہ لینے پر مجبور ہُوں۔ کہیں تم کچھ اور نہ سمجھ لینا" میرا ہنسنے کو جی چاہا لیکن مُسکرا کر رہ گیا۔

"میں خوب اچھی طرح سمجھتا ہُوں، تم بہر حال ایک شہزادی ہو اور میں ایک غریب اجنبی ہوں، جس کے جسم پر ایک تار بھی نہیں ہے۔ تمھیں خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں اپنی حیثیت جانتا ہوں اس لیے حدود سے تجاوز نہیں کروں گا" میں نے مُسکرا کر کہا حالانکہ اس کی بات پر مجھے ایک بے ساختہ قہقہہ بڑی مشکل سے ضبط کرنا پڑا تھا۔

اُس نے سر اُٹھا کر میری آنکھوں میں دیکھا اور عجیب سے لہجے میں بولی "نہ جانے کیوں، مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے تم میرا مذاق اُڑا رہے ہو۔ میں ایک شہزادی ہوں لیکن تم نے جس لہجے اور جس انداز میں بات کی ہے کوئی اس لہجے میں شہزادی سے بات نہیں کرتا۔ مجھے تمھارا لہجہ پسند نہیں آیا۔ کیا تم مجھے شہزادی تسلیم نہیں کرتے اور تمھارا شبہ اب بھی برقرار ہے؟"

"یہ بات نہیں ہے، شہزادی! مجھے افسوس ہے اور میں معذرت چاہتا ہُوں کہ اپنے لہجے کے سلسلے میں بے بس ہُوں: مجھے کچھ اسی انداز میں بات کرنے کی عادت ہے"

"اگر مجھے یقین ہوتا کہ تم میرا مذاق اُڑا رہے ہو، یقین کرو کہ عکران پہنچ کر میں، تمھیں کوڑے ضرور لگواتی۔ میں قسم کھاتی ہوں کہ ایسا ہی کرتی" اس نے ایسے لہجے میں کہا جسے میں شاہانہ بے بسی ہی قرار دے سکتا تھا۔

"شاید یہ ممکن نہ ہوتا شہزادی!" میں اوّل شب کی چاندنی میں اس کے سحر انگیز چہرے پر نگاہ جمائے، مُسکرا کر بولا "میں اس وقت مسلّح نہیں ہُوں۔۔۔ اور جب میرے پاس کوئی ہتھیار موجود ہو تو مجھے کوڑے نہیں لگائے جا سکتے۔ ایسا صرف اُسی صورت میں ممکن ہے، جب خون بہے۔۔۔ وہ خون چاہے میرا اپنا ہو یا میرے حریفوں کا۔۔۔ لیکن خون بہنا لازمی ہے۔ بہر حال مجھے کوڑے لگانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی کیوں کہ میں نے تمھارا مذاق نہیں اُڑایا"

یہ سن کر لڑکی کی آنکھوں میں میرے لیے احترام کی جھلک نمایاں ہُوئی۔ اس کے یاقوتی لب دل کش انداز میں کھُل گئے "تو پھر ٹھیک ہے۔ اب ہم دوبارہ دوست ہیں۔ تم اپنے قُرب سے مجھے حرارت پہنچا سکتے ہو۔ میں سردی سے منجمد ہُوئی جا رہی ہُوں"

۔۔۔ لیکن ابھی میں دوستی کی تجدید کا آغاز نہیں کر پایا تھا کہ اچانک ہی مشرق کی طرف سے گھنے سیاہ جنگل کے قلب کو چیرتی ہُوئی مترنم آوازیں سُنائی دیں۔ یہ ندائیہ اور دُعائیہ آوازیں تھیں۔۔۔ جیسے مذہبی رسوم انجام دیتے وقت کوئی مقدس گیت گایا جا رہا ہو۔

تاشیہ ایک جھٹکے سے اُٹھ بیٹھی اور ہاتھ سینے پر لے جا کر عجیب انداز میں حرکت دینے لگی۔ میرے خیال کی تصدیق ہو گئی تھی۔ وہ اس مقدس گیت سے متاثر ہو گئی تھی۔

"ہُرمزد ہماری حفاظت کرے" اس نے سرگوشی میں کہا۔ "یہ قبروتی ہیں۔ آج رات مقدس معبد میں ان کا اجتماع ہے اور سرفروش! مجھے پتہ چل گیا ہے کہ اس وقت ہم کس جگہ ہیں۔ اگر ہم چکر کاٹ کر اس معبد کے دوسری طرف نکل جائیں تو وہ راستہ مل جائے گا جو عکران کی طرف جاتا ہے۔ آؤ!" میرا ہاتھ تھام کر کھڑی ہو گئی۔

میری نگاہ اسی طرف اُٹھی ہُوئی تھی جدھر سے آوازیں آ رہی تھیں۔ کبھی کبھی بلوط کے گھنے درختوں اور جھاڑیوں کے درمیان کوندا سا لپکتا دِکھائی دیتا تھا جیسے وہاں کوئی بہت بڑا الاؤ روشن ہو۔

میرے وجود میں بے چینی اور تجسس کی عجیب سی لہر دوڑ گئی۔ اس آگ اور اُن دُعائیہ کلمات نے میرے پورے وجود کو جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ میرے اندر دم بہ دم اُس جگہ کو دیکھنے اور اس کے بارے میں جاننے کی خواہش تیز ہوتی جا رہی تھی اور جب میں نے اپنی اس خواہش کا اظہار تاشیہ سے کیا تو اس نے ایک جھٹکے سے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔

وہ دو قدم ہٹ کر مجھے اس طرح گھورنے لگی جیسے اُسے میری دماغی صحت پر شبہ ہو گیا ہو۔

"نہیں۔۔۔ نہیں" اس کی آنکھوں سے دہشت جھانکنے لگی۔ "قبروتیوں کی ٹوہ میں رہنا سختی سے منع ہے۔ اُن کی اپنی ایک پُراسرار دُنیا ہے اور پُراسرار رسوم ہیں جن میں مداخلت ناقابلِ معافی جُرم ہے اگر ہم پکڑے گئے تو مار ڈالے جائیں گے"

"لیکن یہ لوگ کیا کر رہے ہیں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ کسی کو قربان کرنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ اگر اُنھوں نے ہمیں پکڑ لیا تو ہمارے اعضا جُدا کر دیں گے اور پھر دھیمی آنچ پر کسی خرگوش کی مانند بھون کر چٹ کر جائیں گے۔ نہیں سرفروش! نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ ہم چکر کاٹ کر ان سے دُور نکل جائیں گے اور ہمیں بہت احتیاط سے نکلنا ہو گا۔ وہ ان اوقات میں، اپنے نگراں مقرر کر دیتے ہیں"

تاشیہ کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا اور اس کی دہشت ابھی کم نہیں ہُوئی تھی۔ میں نے اُسے کھینچ کر اپنے قریب کر لیا۔

اس کا جسم کانپ رہا تھا، سردی کی وجہ سے نہیں بلکہ یہ کپکپاہٹ، خوف کی لرزش تھی۔ میں نے اس کے بال سہلاتے ہُوئے پُوچھا "کیا تم نے کبھی یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے بھی دیکھا ہے؟"

"کیا سب کچھ؟" وہ خوف زدہ لہجے میں بولی۔

"یہی قربانی کا منظر۔۔۔ اور ان کے نگراں؟"

"نہیں۔۔۔" تاشیہ نے سر کو انکار میں جنبش دی "میں اس کی جرأت بھی نہیں کر سکتی۔ میں احمق نہیں ہُوں جو اس طرح مرنے کی خواہش کروں۔ البتہ میں نے احباز میں ان کی بہت سی داستانیں ضرور سُنی ہیں اور یہ داستانیں حقیقت پر مبنی ہیں۔ قبروتی بہت طاقت ور، بااثر اور مقتدر ہیں۔ ان کا اپنا قانون ہے۔ یہ بات سبھی جانتے ہیں اور تمھیں بھی سمجھ لینا چاہیے کہ اجنبی اور لاعلم ہونے سے جُرم اور سزا کی نوعیت میں تبدیلی نہیں آ جاتی"

وہ مجھ سے دُور کھڑی ہو گئی اور میرے چہرے کی طرف دیکھتے ہُوئے بولی "میں سمجھتی ہُوں کہ تم اتنے بے وقوف نہیں ہو جو اس قسم کی موت کو پسند کرو"

"نہ میں بے وقوف ہوں اور نہ اس قسم کی موت پسند کرتا ہُوں" میں نے مستحکم لہجے میں کہا "لیکن میں کسی قبروتی کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہُوں"

مجھے اس سرزمین پر نہ جانے کتنا عرصہ قیام کرنا تھا۔ اپنی بقا کے لیے ضروری تھا کہ میں ہر ممکن معلومات حاصل کر لیتا۔ تاشیہ کی گفتگو سے اندازہ ہو گیا کہ قبروتی بے حد خطرناک لوگ ہیں اور میرے دشمن بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس لیے ضروری تھا کہ میں ان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کروں چنانچہ میں نے مضبوط لہجے میں کہا "شہزادی تاشیہ! مجھے افسوس ہے کہ میں اپنے ارادے سے باز نہ رہ سکوں گا۔ اگر وہاں کوئی خطرہ ہے تو میں تمھیں اپنے مصائب میں شریک نہ کروں گا۔ تم یہیں ٹھہرو اور میری واپسی کا انتظار کرو"

"تم پاگل ہو گئے ہو" اس نے خوف سے لرزتی ہُوئی آواز میں کہا "قبروتی ان لوگوں سے بھی زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں، جو میرے خون کی پیاس میں مبتلا مارے مارے پھر رہے ہیں"

"لیکن میں انھیں نظر انداز کر کے آگے نہیں بڑھنا چاہتا۔۔۔"

میں نے کہا: "تم یہیں ٹھہرو۔ میں جلد ہی واپس آ جاؤں گا۔"

"نہیں... میں تنہا نہیں رہ سکتی۔ میں تمہارے ساتھ چلوں گی... جو مقدر میں لکھا ہے، وہ ہو کر رہتا ہے۔ جب تمہارا سر کٹنے لگے تو یاد کر لینا کہ میں نے تمہیں روکنے کی انتہائی کوشش کی تھی۔"

"بے فکر ہو کر میرے ساتھ آؤ۔" میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا اور اُدھر چل دیا جدھر سے آوازیں آ رہی تھیں۔ آوازوں کی شدت میں گہری ہوتی ہوئی رات کے ساتھ ساتھ تیزی آ گئی تھی۔

تاشیہ ہانپتی کانپتی میرے ساتھ چل دی۔

راستہ خاصا دشوار گزار ثابت ہوا۔ ہر طرف خار دار جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں جن سے ہمارے جسموں پر جا بجا خراشیں آ گئیں۔ میں آگے آگے چل رہا تھا اور تاشیہ میرے نقشِ قدم پر چل رہی تھی۔ کئی جگہ سے اس کا لباس جھاڑیوں میں اُلجھ کر پھٹ گیا تھا اور میرے اطمینان دلانے کے باوجود بھی وہ بُری طرح سہمی ہوئی تھی۔

فاصلہ سمٹنے کے ساتھ ساتھ وہ آوازیں بلند اور واضح ہوتی گئیں۔ اُن آوازوں میں ہم آہنگی اور موسیقیت نہیں تھی بلکہ انھیں سُن کر دل پر دہشت طاری ہوتی تھی۔ آوازوں کے علاوہ اب الاؤ سے اُٹھتے ہوئے شعلوں کی لپکتی ہوئی لمبی لمبی زبانیں بھی واضح ہو گئی تھیں۔ آگ یقیناً ایک بڑے دائرے میں جل رہی تھی۔

میں آگے بڑھتا رہا کہ اچانک ایک کرخت آواز سُنائی دی۔

"کون ہے، جسے مقدس معبد کی طرف آنے کی جرأت ہوئی ہے؟"

آواز سے میں بولنے والے کی جنس کا تعین نہ کر سکا لیکن یہ اندازہ ضرور ہو گیا کہ آواز عقب سے آئی تھی۔ تاشیہ بے ساختہ اُچھل پڑی اور مجھ سے لپٹ گئی۔ میں نے اسے الگ ہٹاتے ہوئے سرگوشی میں وہیں ٹھہرنے کی ہدایت کی اور آواز کی سمت چل دیا۔ آواز دینے والا یقیناً کسی درخت کی اوٹ میں تھا ورنہ میری نگاہ سے چھپا نہ رہتا۔

میں نے چند ہی قدم اُٹھائے تھے کہ ایک سفید سائے پر نظر پڑی۔ تلوار پر میری گرفت مضبوط ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی پہلے جیسی خشک، کھردری اور کرخت آواز دوبارہ اُبھری۔

"وہیں ٹھہر جاؤ، میرے قریب نہ آؤ۔ میں قبروتی ہوں اور جو شخص میری نافرمانی کرتا ہے، اس پر سارے جہان کے دیوتاؤں کا عذاب نازل ہوتا ہے۔ اُسے ابدی تاریکی اور قہر کا دیوتا ہمیشہ کے لیے نگل جاتا ہے۔ وہیں رُک جاؤ۔ یہ میرا حکم ہے۔"

میں نے بولنے والے کی لن ترانیوں پر کوئی توجہ نہیں دی اور آگے بڑھتا رہا۔ یہ دیکھ کر وہ سایہ غضب ناک ہو گیا۔ وہ اُچھل کر میرے سامنے آ گیا تو میں نے دیکھا کہ وہ سفید لبادے میں ملبوس ہے۔

"موت تمہارا مقدر ہو گئی ہے۔ تم نے عقل کی بات پر کان نہیں دھرا، اب مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔" قہر آلود آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

بھرپور چاندنی میں، اس سفید پوش کے ہاتھ میں مجھے ایک تیز دھار خنجر چمکتا دکھائی دیا۔ میں اس کے خطرناک ارادے کو بھانپ گیا اور تیزی سے تلوار والا ہاتھ گھمایا۔ سفید لبادے والی یہ خوف ناک مخلوق غالباً تلوار سے بے خبر تھی۔ گھومتی ہوئی تلوار کی چمک محسوس کرتے ہی، وہ ٹھٹک گیا۔ تذبذب کا یہ ایک ہی لمحہ اس کی موت کا پیغام بن گیا۔ تلوار اس کی گردن پر پڑی اور اگلے ہی لمحے وہاں سے سُرخ سُرخ خون اُبل پڑا۔

وہ گھٹنوں کے بل جھکتا چلا گیا۔

ابھی تک اس نے کوئی آواز نہیں نکالی تھی تاہم میں نے یہ سوچ کر کہ کہیں وہ مدد طلب کرنے کے لیے چیخنا نہ شروع کر دے، اس پر پے در پے وار کیے۔

وہ چند بار تڑپ کر ہمیشہ کے لیے ساکت ہو گیا۔

میں نے تلوار کی نوک سے وہ سفید لبادہ چاک کر کے مرنے والے کا جسم دیکھا تو مجھے ٹھٹک کر لڑکھڑا جانا پڑا۔

وہ ایک بوڑھی عورت تھی اور اس کا چہرہ بھی بے حد بھیانک تھا۔

تاشیہ نہ جانے کب میرے پیچھے آ کھڑی ہوئی تھی۔ لاش پر نظر پڑتے ہی اس کا جسم بری طرح کانپنے لگا۔ "مُبر مزد ہماری حفاظت کرے۔ تم نے اسے مار ڈالا، ایک قبروتی کو مار ڈالا۔ ہم پر عذاب ہی عذاب نازل ہو گا۔ اب ہمیں کوئی نہیں بچا سکتا۔" اس کا لہجہ رو دینے والا تھا اور آواز میں کپکپاہٹ تھی۔

"فضول باتیں نہ کرو، شہزادی!" میں نے تیز لہجے میں کہا۔ "تمہیں یہ بات پہلے ہی بتا دینی چاہیے تھی کہ قبروتیوں میں عورتیں بھی شامل ہیں۔ میں عورتوں پر ہاتھ نہیں اُٹھاتا، چاہے وہ میری جانی دُشمن ہی کیوں نہ ہوں۔"

تاشیہ نے جلدی سے میرا ہاتھ تھام لیا اور مجھے ایک طرف کھینچتی ہوئی بولی: "اب یہاں ایک لمحہ بھی رُکنا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ آؤ یہاں سے نکل چلیں۔ ابھی جان بچانے کا موقع ہے۔"

میں اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوا۔ میری نگاہ اُس دور افتادہ الاؤ پر جم گئی... جس سے اُٹھتے ہوئے شعلے پہلے سے کہیں زیادہ غضب ناک ہو گئے تھے۔

"میں یہاں تک آ گیا ہوں اور میرے ہاتھوں ایک قتل بھی ہو گیا ہے تو میں اپنا مقصد حاصل کیے بغیر آگے نہیں جاؤں گا۔ میں پُراسرار قبروتیوں کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔ ان میں کتنی عورتیں شامل ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"قبیلۂ قبروت سے تعلق رکھنے والی ساری کی ساری عورتیں ہی ہوتی ہیں۔ میں نے غیر اہم سمجھ کر یہ بات تمہیں نہیں بتائی تھی۔ آہ... تم نے یہ کیا کر دیا؟ اب یہ تمہیں کبھی نہیں بخشیں گے، کسی نہ کسی طور ڈھونڈ نکالیں گے اور انتقام لیں گے۔ کاش میری تم سے ملاقات نہ ہوئی ہوتی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ تم قبروتیوں کی ٹوہ میں لگ جاؤ گے۔ اجنبی! تم نے اپنے ساتھ مجھے بھی مصیبت میں ڈال دیا ہے۔"

"میں نے تم پر جبر تو نہیں کیا تھا... پھر تم میرے ساتھ کیوں چلی آئیں؟ اب بھی موقع ہے، تم اپنے راستے پر جا سکتی ہو۔"

"اور تم...؟" اس نے خوف زدہ ہو کر پوچھا۔

"میں اُدھر جاؤں گا۔" میں نے کہا اور تاشیہ کی طرف دیکھے بغیر آگے بڑھ گیا لیکن قدموں کی چاپ سے محسوس ہوا کہ وہ میرے پیچھے ہی آ رہی ہے۔

الاؤ کے قریب پہنچ کر ہم ایک درخت کی آڑ میں کھڑے ہو گئے۔ ہماری نگاہیں وسیع دائرے میں روشن آگ کی سُرخ سُرخ زبانوں پر جم کر رہ گئی تھیں۔ سفید لبادوں والے قبروتی ہیولے آگ کے گرد رقص کر رہے تھے اور بلند آواز سے کچھ پڑھ بھی رہے تھے۔

میں نے تاشیہ کی طرف دیکھے بغیر سرگوشی میں پوچھا: "وہ عورت جو ایک طرف کھڑی ہے، یہ کون ہے؟" میرا اشارہ اس عورت کی طرف تھا جو نہ تو گا رہی تھی اور نہ ہی رقص میں شریک تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک طلائی تلوار چمک رہی تھی۔ اس کا جسم دُبلا پتلا تھا اور وہ دراز قامت تھی۔ اس کا چہرہ نقاب میں چھپا ہوا تھا۔

"یہ نو بیس ہے، بڑی پجارن۔" تاشیہ نے سرگوشی میں جواب دیا۔ "میرا عم زاد یوطابا اس سے ہمیشہ خوف زدہ رہتا ہے بلکہ ہر کوئی اس سے ہمیشہ دہشت زدہ رہتا ہے، اور میں بھی اس سے ڈرتی ہوں۔ اگر تم بالکل ہی احمق نہیں ہو تو تمہیں بھی اس سے خوف آئے گا۔ ذرا رقص کرنے والوں سے پرے، درخت کے نیچے دیکھو تو تمہیں اندازہ ہو جائے گا۔"

میری نگاہ اب تک اس طرف نہیں گئی تھی۔ درخت کے نیچے ایک بے لبادہ لڑکی ٹکٹکی سے لٹکی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ پیر تسموں سے بندھے ہوئے تھے اور مُنہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا۔ فاصلے کے باوجود اس کی آنکھوں سے دہشت اُبلتی ہوئی صاف دکھائی دے رہی تھی۔

اچانک رقص تھم گیا۔

اس کے ساتھ ہی وہ مہیب شور بھی ختم ہو گیا۔ رقص کرنے والی لڑکیاں ٹولیوں کی صورت میں منتشر ہو گئیں۔ چار لڑکیاں ٹکٹکی سے لٹکی ہوئی لڑکی کی طرف جا رہی تھیں۔ آٹھ لڑکیاں آہنی کھانچوں سے آگ کو مزید دہکانے میں مصروف ہو گئیں اور کچھ لڑکیاں کوئلہ لا کر آگ کے ڈھیر میں ڈالنے لگیں جس سے شعلے بھڑک کر درختوں کی چوٹیوں سے بھی اوپر تک اُڑنے لگے۔

میری نگاہ دوبارہ ٹکٹکی سے لٹکی ہوئی لڑکی پر جم گئی۔ اُسے تسموں سے آزاد کیا جا رہا تھا لیکن اس کے مُنہ سے کپڑا نہیں نکالا گیا۔ لڑکی کا چہرہ دہشت کی زیادتی سے سفید پڑ گیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کے وجود میں لہو کی ایک بوند بھی باقی نہ رہ گئی ہو۔ اس کی آنکھیں خوف سے اُبلی پڑ رہی تھیں۔

آزاد ہونے کے بعد اس نے سر کو اِدھر اُدھر جھٹکا اور تھوڑی سی جدوجہد کی لیکن مضبوط گرفت کے سامنے اس کی پیش نہ گئی۔ اُسے گھسیٹ کر ایک بڑے شاہ بلوط کے نیچے پہنچا دیا گیا پھر ایک چوبی تختے پر گرانے کے بعد اس کے ہاتھ پیر دوبارہ جکڑ دیے گئے۔

اب وہ ذرا بھی جنبش نہیں کر سکتی تھی۔

میرے خون کی گردش ایک دم تیز ہو گئی۔

مجھے اپنا پورا وجود گھومتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

تاشیہ نے شاید میری اس کیفیت کو بھانپ لیا تھا۔ وہ میرے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے سرگوشی میں بولی: "نہیں سرفروش! تم اب مزید کوئی حماقت نہیں کرو گے۔ اس لڑکی کو بچانے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اسے بچانا، کسی وحشی درندے کے مُنہ سے شکار چھیننے کے مترادف ہے۔ قبروتی، وحشی درندوں سے بھی زیادہ سفاک ہیں۔ یہ پل بھر میں ہماری تکا بوٹی کر دیں گے۔"

شہزادی تاشیہ کی بات کچھ غلط بھی نہیں تھی۔ میں جھاگ کی مانند بیٹھ گیا۔ اُس لڑکی کو بچانے کا صاف مطلب تھا کہ میں تاشیہ اور اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دوں... لیکن وہ لڑکی پھر بھی محفوظ نہ رہتی۔ اب مجھے اچھی طرح احساس ہو گیا تھا کہ قبروتیوں کے بارے میں تاشیہ کی بتائی ہوئی باتیں محض قصہ کہانی نہیں بلکہ حقائق پر مبنی ہیں۔ جو کچھ میری آنکھوں کے سامنے ہو رہا تھا، یہ اس بات کا زندہ ثبوت تھا۔

دفعتاً تاشیہ چونک پڑی۔ ۔ پھر اس کی گھٹی گھٹی سی آواز سنائی دی: "یہ لڑکی، جسے قربان کیا جانے والا ہے، میں اسے پہچانتی ہوں۔ یہ میرے عم زاد شاہ یوطابا کی خاص ملازمہ ہے لیکن اس کے علاوہ بھی اس کی ایک حیثیت تھی۔ یہ یوطابا کی منظورِ نظر بھی تھی۔ اب میں کچھ کچھ درپردہ بات کو بھی سمجھ رہی ہوں۔ پچھلے دنوں، یوطابا اور اس لڑکی کے بارے میں کئی افواہیں سُننے میں آئی تھیں۔ ہُرمزد ہم پر رحم کرے، بالآخر وہ افواہیں سچ ہی ثابت ہوئیں۔"

میری توجہ لڑکی سے ہٹ کر اس عورت پر مرتکز ہو گئی، جو آہستہ آہستہ اپنے شکار کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس نے تلوار والا ہاتھ اُٹھا رکھا تھا۔ اس کی چال میں وقار اور دبدبہ تھا۔ اس کا چہرہ ابھی تک نقاب میں چھپا ہُوا تھا۔ وہ شکار کے قریب پہنچی تو بے بس لڑکی کا جسم، ہاتھ پاؤں بندھے ہونے کے باوجود شکنجے کی کیفیت میں بل کھانے لگا۔

لڑکی کے قریب پہنچ کر وہ عورت رُک گئی۔ ۔ پھر اُس نے دونوں ہاتھوں سے تلوار پکڑ کر سر سے بلند کر لی۔ اُسی وقت ہُوا کے جھونکے سے یا پھر دونوں ہاتھ اُٹھانے کے باعث اس کی نقاب سرک گئی۔

ایک ثانیے کے لیے اس کا چہرہ میری نظروں کے سامنے آگیا۔

وہ بے پناہ حسین تھی۔

میں اس کے حُسن کی دِل کشی سے مسحور ہو کر رہ گیا۔ اسی لمحے تاشیہ بول پڑی اور یہ سحر ٹوٹ گیا۔ وہ جوش سے کانپتی ہوئی آواز میں کہہ رہی تھی۔

"یہ زوبیس نہیں ہے بلکہ کوئی اجنبی ہے۔ آخر آج یہاں کیا ہو رہا ہے؟ پے در پے حیرت انگیز چیزیں سامنے آ رہی ہیں۔ پہلے تم۔ ۔ پھر یہ لڑکی اور اب یہ اجنبی عظیم پجارن۔ میں اسے بالکل ہی نہیں جانتی۔"

عظیم پجارن نے تلوار کو سر سے اُوپر اُٹھا رکھا تھا اور ساتھ ہی زیرِ لب کچھ بولتی بھی جا رہی تھی۔

میرے دانت سختی سے ایک دوسرے پر جم گئے اور شدید سردی کے باوجود میرے ماتھے سے پسینہ پھوٹ پڑا۔ میں سحر زدہ سا عظیم پجارن کو یک ٹک دیکھے جا رہا تھا۔

اچانک تلوار بڑی تیزی سے اور قوت کے ساتھ نیچے آئی اور لڑکی کے دل میں دھنس گئی۔ لڑکی کا جسم بُری طرح تڑپا اور ایک ہی لمحے میں ساکت ہو گیا۔

عظیم پجارن لڑکی کے مُردہ جسم پر یُوں جھکی کھڑی تھی، جیسے اُسے خود اپنا بھی ہوش نہ رہا ہو۔ کافی دیر بعد اُس نے سر اُٹھایا اور چاروں طرف دیکھا۔ ۔ دوسری پجارنوں کی طرف اور اس طرف، جہاں میں اور شہزادی تاشیہ چھپے ہُوئے تھے۔ ایک لمحے کو مجھے یُوں محسوس ہُوا، جیسے وہ ہم دونوں کی موجودگی سے آگاہ ہو گئی ہو۔

میری ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد سی لہر دوڑ گئی۔

میں نے سانس روک لی۔

۔ ۔ لیکن عظیم پجارن نے ایک جھٹکے سے سر گھمایا اور مُردہ لڑکی کے جسم سے دُور ہٹ گئی۔ ۔ پھر وہ سر جھکائے، سامنے درختوں کے جھنڈ کی طرف چلنے لگی۔ اس کے بعد کا منظر بڑا ہی گھناؤنا تھا۔ پجارنیں، لڑکی کی لاش کے قریب پہنچیں اور اس کے اعضا کاٹ کاٹ کر دھڑ سے جُدا کرنے لگیں۔ میں جھرجھری لے کر رہ گیا۔ واقعی تاشیہ نے ان کی بہیمیت اور شقاوت کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا، وہ بالکل دُرست تھا۔

میں ابھی واپسی کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ ایک اور منظر سامنے آیا۔ یہ منظر بھی دِل ہلا دینے والا تھا۔ اگر میں تاشیہ کے مُنہ پر ہاتھ نہ رکھ دیتا تو یقیناً اس کی چیخ نے اُن سب کو ہماری طرف متوجہ کر دیا ہوتا یکایک چیخ دپکار کی آواز بلند ہُوئی تھی اور دو پجارنیں ایک اور لاش اُٹھائے ہُوئے درختوں کے جھنڈ سے برآمد ہُوئی تھیں۔ لاش دُور ہی سے پہچانی جا سکتی تھی۔ یہ اُس بوڑھی قبرِوتی عورت کی لاش تھی جو کچھ دیر قبل میرے ہاتھوں ہلاک ہُوئی تھی۔

قبرِوتی بڑھیا کی لاش آگ کے قریب رکھ دی گئی اور بین شروع ہو گیا۔ پجارنیں مرنے والی کا سوگ منا رہی تھیں۔ "یہ تو بہت بُرا ہُوا!" میں نے سوچا! اس طرح انھیں پتہ چل گیا کہ اُن کے درمیان کوئی اجنبی یا کوئی دُشمن بھی موجود ہے، جس نے اُن کی ساتھی کو ہلاک کر دیا ہے۔ قبرِوتی سمجھ گئے ہوں گے کہ بڑھیا کو ہلاک کرنے والے نے اُن کی وہ پُراسرار قربانی کی رسم بھی دیکھ لی ہو گی۔ گویا جلد ہی ہماری تلاش شروع ہونے والی تھی۔

میں نے مُڑ کر دیکھا تو تاشیہ کی خوب صورت آنکھیں آنسوؤں میں ڈوبی ہُوئی تھیں۔ مجھے اپنی طرف دیکھتے پا کر اُس نے کہا: "میں نے تمھیں پہلے ہی سب کچھ بتا دیا تھا۔ ہر بات سے آگاہ کر دیا تھا۔ اب ہُرمزد ہی ہمیں بچائے تو بچا لے۔ پجارن کی لاش دریافت کر لی گئی ہے۔ اب ہمیں بھی اِن کی درندگی کی بھینٹ چڑھنا پڑے گا!"

میں نے اس کے آنسوؤں سے بھیگے ہُوئے دِل کش چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لے کر محبت و اپنائیت سے کہا: "تم بالکل

فِکر نہ کرو! میں تمھیں یہاں تک لایا ہُوں اور میں ہی تمھیں یہاں سے نکال کر لے جاؤں گا۔ تمھیں صرف اتنی زحمت کرنا ہو گی کہ بہت آہستہ اور بے حد محتاط ہو کر چلنا ہو گا۔ ۔ ۔ کچھ دور جانے کے بعد تمھیں ایک بار پھر دوڑ لگانی پڑے گی۔ تھک گئیں تو میری پیٹھ حاضر ہے۔ آخر تمھارا یہ خادم کب کام آئے گا!"

میری باتوں سے ڈھارس بندھی تو شہزادی کے بھیگے بھیگے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

★★

چاند کے غروب ہوتے ہوتے تاشیہ نے عکران جانے والا راستہ تلاش کر لیا۔ قبرِوتیوں کی حدُود سے نکلنے کے بعد اس کی دہشت کسی حد تک کم ہو چکی تھی لیکن ان کا خیال اَب بھی اس کے ذہن سے چپٹا ہُوا تھا۔ اس کے مطابق قبرِوتیوں کا حلقۂ اثر بہت وسیع تھا۔ وہ موآبہ پر بُری طرح چھائے ہوئے تھے۔ زندگی کے ہر شعبے میں ان کا عمل دخل تھا۔ اس لیے وہ کسی بھی وقت ہم تک پہنچ سکتے ہیں۔

تاشیہ نے راستے میں، اپنے بارے میں بہت سی باتیں بتائیں۔

وہ ساحل پر واقع ایک قبرِوتی اسکول میں چار سال تک زیرِ تعلیم رہنے کے بعد اپنے محل واپس آ رہی تھی کہ ملکہ رُوبا نے اُسے اغوا کروا لیا۔ ملکہ رُوبا اس کے باپ احباز کے بادشاہ کی بہن تھی لیکن دونوں کے درمیان نفرت کی دیوار حائل تھی۔ تاشیہ اپنے باپ کی اکلوتی اولاد تھی، اس لیے ملکہ رُوبا کا خیال تھا کہ وہ اُسے قیدی بنا کر احباز کے بادشاہ سے بھاری تاوان اور متعدد مراعات حاصل کر سکے گی۔

قید میں تاشیہ بے حد پریشان رہی۔ وہ ہر وقت فرار کی تدبیریں سوچتی رہتی تھی۔ آخر اُسے ایک تدبیر سُوجھ ہی گئی۔ اُس نے ملکہ رُوبا کو پیغام بھجوایا کہ وہ تنہائی کی اذیت سے ہلاک ہو رہی ہے اس لیے اُسے جنگلوں اور میدانوں میں گھومنے پھرنے کی اجازت دے دی جائے۔ اس حبس کی فضا میں اس کا دم گھٹ جائے گا۔ ملکہ رُوبا اُسے ہلاک نہیں کرنا چاہتی تھی کیوں کہ تاشیہ کے اغوا کا مقصد ہی ختم ہو جاتا۔ ۔ ۔ پھر وہ اس کی جان کی دُشمن نہیں تھی۔ وہ تو تاشیہ کو عارضی طور پر روک کر اس کے باپ سے کچھ مراعات اور کثیر زرِ تاوان حاصل کرنا چاہتی تھی۔ چنانچہ اُس نے تاشیہ کو گھومنے پھرنے اور طویل سیر کی اجازت دے دی۔ البتہ ایک محافظ دستہ اس کے ساتھ کر دیا جو اُسے ایک لمحے کے لیے بھی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتا تھا۔

"مگر شہزادی!" میں نے مسکرا کر کہا: "تم تو ایک دھان پان اور بے حد کمزور دِل کی لڑکی ہو، تم اس محافظ دستے کو جُل دینے میں کیسے کامیاب ہو گئیں؟"

"یہ ایک الگ کہانی ہے۔" تاشیہ نے سر ہلاتے ہُوئے کہا۔ کافی دیر بعد اس کے لبوں پر بے باک اور شوخ مُسکراہٹ اُبھری تھی: "محافظوں کا دستہ دُور رہ کر ہر وقت میری نگرانی کرتا رہتا تھا۔ اُن سے بچ نکلنا آسان نہیں تھا۔ تھک ہار کے میں نے وہی نسخہ کیمیا استعمال کیا جو ایسے وقت پر عموماً استعمال کیا جاتا ہے۔"

"مثال کے طور پر؟" میں نے پوچھا۔

"مردیوں تو بہت ہوشیار، عقل مند اور دُور اندیش ہوتا ہے لیکن کسی عورت کو اپنی طرف مائل دیکھ کر وہ تمام اوصاف گردی رکھ دیتا ہے سو میرے ساتھ بھی یہی ہُوا۔ دستے میں سے ایک نوجوان کو منتخب کر کے میں نے نگاہوں ہی نگاہوں میں اسے اشارے کرنے شروع کر دیے۔ ایک شہزادی کو اپنی طرف مائل پا کر اُس نے اپنے مستقبل کے بارے میں نہ جانے کیا کچھ نہ سوچ لیا ہو گا کہ ایک روز موقع پا کر میں نے اس سے کہا کہ وہ تنہائی میں مجھ سے ملے، میں بے چینی سے اُس کی منتظر رہوں گی۔ وہ تنہائی میں ملنے کے لیے شاید مجھ سے بھی زیادہ بے چین تھا۔" یہ کہتے ہُوئے وہ کھِل کھِلا کر ہنس پڑی۔

"پھر وہ تنہائی میں تم سے ملا، تم نے موقعے سے فائدہ اُٹھاتے ہُوئے اُسے ہلاک کر دیا اور وہاں سے فرار ہو گئیں؟" میں نے تاشیہ کی بات مکمل کر دی۔

وہ مجھے حیرت بھری نظروں سے دیکھنے لگی: "تم بہادر ہونے کے ساتھ ساتھ عقل مند بھی معلوم ہوتے ہو۔"

"مگر ویسا عقل مند نہیں، جیسے تم جھانسہ دے کر ہلاک کر آئی ہو۔" میں نے ہنستے ہُوئے کہا۔

"میں نے تمھارے متعلق ایسا نہیں سوچا ہے، سرفروش! تم اپنی سرزمین پر یقیناً بہت بڑے آدمی رہے ہو گے۔ بہادر، دانش مند اور صاحبِ تدبیر۔ ۔ ورنہ قبرِوتیوں کے درمیان اس طرح جانے کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا!"

میں خاموش رہا۔

"تم کس سوچ میں ڈوب گئے؟" اس نے ناگواری سے پوچھا۔

"میں، تم سے چند باتیں معلوم کرنا چاہتا ہُوں۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہُوئے کہا: "کیا تم بتا سکتی ہو کہ یہ کون سا دور ہے؟"

"ارے! تم اتنا بھی نہیں جانتے؟" اس کے لہجے میں پہلے تو حیرت پیدا ہوئی... پھر اس نے اثبات میں سرہلا دیا: "میں بھول گئی تھی کہ تم اس سرزمین پر اجنبی ہو۔ بہرحال یہ عہدِ اشکانی ہے۔"

"اشکانی عہد۔" میں نے دُہرایا: "اُف میرے خُدا!" میرا دل شدّت سے دھڑکنے لگا۔ ڈاکٹر فریدون کے کمپیوٹر نے مجھے اس دَور میں لا پھینکا تھا جس کے بارے میں، میں نے ایران کی قدیم تاریخ میں پڑھا تھا... یہ غالباً ۲۴۹ قبل مسیح کا دَور تھا۔

"تم کہاں سے آئے ہو؟" تاشیہ نے میری اُلجھن سے پریشان ہو کر سوال کیا: "اور تمھاری زبان تھوڑے سے فرق کے ساتھ اتنی آسانی سے میری سمجھ میں کیسے آرہی ہے؟ جب کہ تم اس سرزمین کے باشندے نہیں لگتے؟"

"میں اسی زمین کا رہنے والا ہُوں۔" میں نے دھیمی آواز میں جواب دیا: "تمھارا مذہب کیا ہے، تاشیہ؟"

"ہم ہُرمزد کو خُدا مانتے ہیں اور آفتاب کی پرستش کرتے ہیں، جو انسان کو زندگی، توانائی اور نعمتیں بخشتا ہے۔"

"اور قبروتیوں کا مذہب کیا ہے؟"

"قبروتی زرتشت ہیں۔" اس نے جواب دیا: "لیکن تم مجھے اپنے بارے میں کچھ کیوں نہیں بتاتے؟"

"میں بھی تمھاری طرح کا ایک انسان ہی ہُوں۔" میں نے کہا: "لیکن میں جس دَور کا رہنے والا ہُوں، وہ ہزاروں سال بعد آئے گا۔"

وہ میری طرف ایسی نظروں سے دیکھنے لگی جیسے میری باتیں اس کی سمجھ میں نہ آئی ہوں لیکن میں اُسے اگر اپنے بارے میں کچھ بتاتا بھی تو شاید وہ نہ سمجھ پاتی۔ میں ایران کے ایک معروف کلب کا انسٹرکٹر تھا اور مارشل آرٹس کی تربیت دیتا تھا... لیکن اور پیشوں کی طرح اس پیشے میں بھی حسد پایا جاتا ہے... اور اسی حسد کی وجہ سے ایک حریف نے میرے ایک شاگرد کو قتل کر کے میرے ہی کلب میں یوں پھنکوا دیا کہ اس کے قتل کا الزام میرے سر آیا اور مجھے سزائے موت دے دی گئی لیکن خوش قسمتی سے میں بچ نکلا اور تقدیر بالآخر مجھے اس قدیم عہد میں لے آئی۔

میں متلاشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

اس وقت سب سے بڑا مسئلہ میری بے لباسی تھا۔ مجھے سخت اُلجھن ہو رہی تھی۔ میں چاہتا تھا کوئی ایسا بندوبست ہو جائے کہ میں کسی طرح اپنا جسم ڈھانپ لوں۔ میں اس حالت میں آبادی میں داخل ہونے کے تصوّر ہی سے گڑا جا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد تاشیہ نے یہ مسئلہ حل کر دیا۔ اس وقت ہم کھڑی فصلوں کے درمیان سے گزر رہے تھے۔ دفعتاً وہ چلتے چلتے رُکی اور ایک جانب اشارہ کر کے بولی: "تمھارے لباس کا مسئلہ تو حل ہو گیا۔"

میری گرفت تلوار پر مضبوط ہو گئی۔

مَیں نے تاشیہ کی بتائی ہُوئی سمت میں دیکھا پھر کھسیانے ہُوئے انداز میں ہنس دیا۔ کھیت کے ایک کونے پر پرندوں اور جانوروں کو ڈرانے اور فصل کو نقصان سے بچانے کے لیے بانس کا ایک پُتلا کھڑا تھا۔ سر کی جگہ اُلٹی ہانڈی رکھی ہُوئی تھی اور بقیہ جسم پر ایک بوسیدہ سا چوغہ لٹکا دیا گیا تھا۔

"ہر وقت لڑنے بھڑنے کے لیے تیار رہتے ہو۔" تاشیہ نے میرے تیور دیکھ کر ہنستے ہُوئے کہا: "یہ چوغہ تو شاید تمھارے جسم پر بالکل ہی نہ آئے، کیوں کہ تم آدمی تو ہو نہیں۔ بس جانور ہو جانو۔ بہرحال، کوشش کرو۔ شاید پھنس پھنسا کر پہن لینے میں کامیاب ہو جاؤ۔"

تاشیہ کا خیال دُرست نکلا۔ مَیں نے وہ چوغہ پہن تو لیا لیکن ابھی میرا جسم جگہ جگہ سے جھلک رہا تھا کیوں کہ تنگ لبادہ پہنتے وقت کئی جگہ سے پھٹ گیا تھا۔ میری اس ہیئت کذائی پر تاشیہ بچّوں کی طرح محظوظ ہو رہی تھی۔

"یہ کیسی سرزمین ہے جہاں ایک اجنبی کو لباس تک میسّر نہیں" مَیں نے جل کر کہا۔

"اپنا جُملہ دُرست کر لو۔ تم یہاں آئے تھے تو تمھارے جسم پر ایک تار بھی نہیں تھا اور تم غیر مسلّح تھے جب کہ اس وقت نہ صرف تمھارے جسم پر ایک چوغہ ہے بلکہ تم ہاتھ میں تلوار بھی لیے ہُوئے ہو۔"

مَیں نے شکریے کے طور پر جُھکنا چاہا لیکن لبادے کی تنگی نے اجازت نہ دی۔

ہم رات بھر بغیر کچھ کھائے پیئے چلتے رہے۔ ہنگامی حالات اتنے تواتر سے پیش آئے تھے کہ کھانے پینے کا ہوش ہی جاتا رہا تھا۔ ہم جنگل پیچھے چھوڑ آئے پھر ایک دِن طلوع ہُوا تو بھوک اور پیاس بھی جاگ اُٹھی۔ تاشیہ پر بھوک پیاس سے زیادہ تکان غالب تھی۔ مارے تھکن کے اس کا بُرا حال ہو رہا تھا لیکن جیسے ہی اُفق پر دھوئیں کی پہلی لکیر دِکھائی دی تاشیہ خوشی سے بے قابو ہو گئی۔ مجھ سے لپٹتے ہُوئے بولی: "یہ عکران قریب آرہا ہے۔ سارے درد کا درماں ہو جائے گا۔" پھر وہ کسی سوچ میں ڈوب گئی۔

ذرا دیر بعد جب ہم مویشیوں کے ایک ریوڑ کے درمیان سے گزر رہے تھے، وہ فکرمند لہجے میں بولی: "سرفروش!"

"جی، شہزادی صاحبہ!" مَیں نے مؤدب ہو کر کہا۔

"میری ایک بات کا خیال رکھنا۔ جو کچھ گزر چکا ہے، یعنی رات ہم جس ہولناک واقعے سے دوچار ہوئے ہیں، عکران میں کسی سے اس کا ذکر نہ کرنا۔ سب کچھ بھول جاؤ، بلکہ ان واقعات کو ذہن کی گہرائی میں کہیں دفن کر دو۔ سمجھ لو کہ وہ واقعہ کبھی رُونما ہی نہیں ہُوا۔ قبیلہ قبروت اور بوڑھی قبروتی بُجارن کا قتل اور وہ لڑکی جسے قربان کیا گیا۔ تمھیں اپنے مفاد میں یہ سب کچھ بھُولنا ہوگا۔"

"جیسا حُکم سرکار کا..."

"خاص طور پر اُس مظلوم لڑکی کو تو بالکل ہی بھُول جاؤ۔ مجھے اس کے پیچھے کوئی گہری سازش نظر آتی ہے۔"

"اگر مجھے بھی اس بارے میں کچھ بتا دیا جائے تو میری اُلجھن دُور ہو جائے گی۔"

"ہاں، مَیں اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتی۔" تاشیہ سوچ میں ڈوبے ہُوئے لہجے میں بولی: "اس لڑکی کی ہلاکت میں مجھے ردمہ کا ہاتھ نظر آتا ہے۔ ردمہ، یوطابا کی بیوی ہے۔ وہ عورت نہیں بلکہ کُتیا ہے۔ بہت تُند خُو اور ظالم... مَیں اُسے بالکل پسند نہیں کرتی۔ جب کہ میرا عم زاد بڑا احمق بلکہ گھامڑ ہے۔ وہ ایک ایسے مُرغ کی مانند ہے جو ہر چُگتی ہُوئی مُرغی کو اپنی ملکیت سمجھ کر اس پر میٹھنا اپنا پیدائشی حق سمجھتا ہے۔ مَیں نے یوطابا اور اس لڑکی کے بارے میں، جو اس کی ملازمہ خاص تھی اور جو اب مرچکی ہے، جس افواہ کا ذکر کیا تھا، وہ اپنی جگہ سچ ہے۔ وہ اُس ملازمہ سے لُطف اندوز ہوتا رہا تھا۔ ردمہ کو اس حقیقت کا علم ہُوا تو اس نے انتقاماً اس لڑکی کو قربانی کے لیے قبیلہ قبروت کے حوالے کر دیا۔ یوطابا اس سلسلے میں بے خبر ہے اور اپنی حسین ملازمہ کی گم شدگی سے پریشان ہے۔ اگر اُسے حقیقت معلوم ہو گئی تو وہ جوشِ غضب میں نہ جانے کیا کر بیٹھے۔ سب سے پہلے تو وہ ردمہ کا قِصّہ پاک کر دے گا پھر قبیلہ قبروت پر لشکرکشی کرنے دوڑے گا۔ اُسے قبروتیوں سے شدید نفرت ہے کیوں کہ یہ لوگ اُس کے معاملات میں دخل دینے لگے ہیں۔ وہ ان لوگوں کا صفایا کرنے کے لیے موقعے کی تاک میں ہے۔ اس واقعے سے اُس کو ایک بہانہ مِل جائے گا پھر مَیں کہہ نہیں سکتی کہ کیا ہو جائے گا۔"

مَیں خاموش رہا تو تاشیہ نے سلسلۂ کلام دوبارہ جوڑ دیا۔

"موآبہ کے باشندے بے حد سفاک ہیں۔ یہ لوگ اجنبیوں کو بالکل پسند نہیں کرتے، انھیں شک و شُبہے کی نظر سے دیکھتے ہیں موآبہ میں کوئی اجنبی مارا جائے تو کوئی پلٹ کر دیکھتا بھی نہیں۔ اگر ہم اپنا مُنہ بند رکھیں اور یوطابا خوش گوار حالت میں ہُوا تو ہمارا کام بن سکتا ہے۔ مَیں اُس سے کہوں گی کہ وہ اپنی سپاہ کے ساتھ ہمیں میرے باپ، شاہِ احباز کے پاس پہنچا دے۔ مَیں تمھاری احسان مند ہُوں کہ تم نے مجھے ملکہ رُوبا سے بچایا۔ میرا باپ بھی اس کے لیے ذاتی طور پر تمھارا شکر گزار ہوگا۔"

عکران کی طرف بڑھتے ہُوئے تاشیہ نے مجھے اور بھی بہت سی باتیں بتائیں۔ اس دَور کی مختلف حکومتوں، عکران، احباز اور ملکہ رُوبا کی مملکت کے بارے میں، اُن مملکتوں کے مذاہب اور رسم و رواج کے بارے میں۔ وہاں کے رہن سہن اور طور طریقوں کے بارے میں کئی انکشاف کیے۔ تاشیہ نے بتایا کہ قبروتیوں کی حیثیت مذہبی نہیں ہے بلکہ انھیں ساحر سمجھا جاتا ہے۔ وہ بدی کی علامت ہیں۔ لوگ ڈرتے ہیں اور ان سے نفرت کرتے ہیں۔ انھیں مجبوراً قبول کیا جاتا ہے کیوں کہ ان کے قبضے میں بدی کی قوتیں ہیں اور وہ عوام الناس کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ وقتاً فوقتاً قربانی کے ذریعے قبروتیوں کو خوش رکھا جاتا ہے تاکہ وہ لوگوں پر بدی کی قوتیں نہ چھوڑیں اور لوگ محفوظ و مامون رہیں۔ کچھ عرصے سے محسوس کیا جارہا تھا کہ قبروتی مملکتوں کے معاملات میں دخل دینے لگے ہیں اور اُن پر اپنا اثر و رسوخ جمانا چاہتے ہیں۔ یہ بات بادشاہوں اور ملکاؤں کو پریشان کیے ہُوئے ہے۔ اس لیے سبھی اپنی اپنی جگہ ان سے نجات کی تدبیریں سوچتے رہتے ہیں۔

شہزادی تاشیہ نے مجھے معلومات سے مالامال کر دیا تھا۔ میں ایک اجنبی تھا اور نہ جانے کتنے عرصے تک مجھے یہاں رہنا تھا۔ یہ باتیں میرے لیے بے حد کارآمد ثابت ہو سکتی تھیں۔ اپنی بقا کی جنگ لڑنے کے لیے صحیح اور دُرست معلومات بھی مؤثر ہتھیاروں سے کم نہیں ہوتیں۔

ہم ایک ٹیلے پر پہنچ گئے تھے۔ نیچے عکران اپنی شان و شوکت کے ساتھ دُور تک پھیلا ہُوا تھا لیکن اس وقت وہاں غیر معمولی بے چینی اور نقل و حرکت محسوس ہو رہی تھی۔ ایک وسیع میدان میں دُور دُور تک خیمے نصب تھے۔ اُسے جشن تو نہیں کہا جاسکتا تھا لیکن بظاہر سماں ایسا ہی تھا۔ خیموں سے باہر سپاہیوں اور افسروں کا لشکر مختلف ٹکڑیوں میں بٹا ہُوا تھا۔ سب کے سب مسلّح تھے لیکن ناؤ نوش اور عیش کوشیوں میں مصروف تھے۔ غازے میں لپی پتی عورتیں، اُن کے درمیان گردش کر رہی تھیں۔

"سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟" تاشیہ بڑبڑائی۔ میں نے

"میں بھی کچھ سمجھنے سے قاصر ہوں۔" میں نے دھیمی آواز میں تبصرہ کیا۔

دفعتاً مجھے اپنے پیچھے کسی وزنی ہتھیار کی جھنکار سنائی دی۔ میں نے برق رفتاری سے پلٹ کر تلوار سونت لی۔ تاشیہ بھی میرے ساتھ ہی گھوم گئی تھی۔

دیکھا تو سامنے سے سپاہیوں کا ایک دستہ چلا آرہا تھا۔ آگے آگے اُن کا افسر تھا۔ افسر پر نظر پڑتے ہی تاشیہ کے چہرے کا کھچاؤ ختم ہوگیا۔ اُس نے میرا تلوار والا ہاتھ پکڑتے ہُوئے سرگوشی کی "خطرے کی کوئی بات نہیں، سرفروش! وہ شخص جو سب سے آگے ہے، قنبر ہے۔ وہ سپہ سالار کا نائب اور یوطابا کا خاص آدمی ہے... تم خاموش رہنا، میں سب کچھ ٹھیک کرلوں گی۔"

قریب آکر دستہ رُک گیا اور قنبر آگے بڑھ کر تاشیہ کو غور سے دیکھنے لگا۔ وہ اونچے قد کا مضبوط آدمی تھا۔ اُس کے چہرے پر داڑھی تھی اور سر کے بال چاندی کی طرح سفید تھے۔ اس کے سر پہ آہنی خُود تھا جس پر اُڑتے ہُوئے عقاب کی شبیہ کندہ تھی۔ اس کے طور طریقے میں رُعب اور دبدبہ تھا۔ اُس نے مجھ پر سرسری نظر بھی نہیں ڈالی تھی، جیسے میں وہاں سرے سے موجود ہی نہیں تھا۔ وہ بڑے انہماک سے تاشیہ کو دیکھ رہا تھا پھر اس کے لبوں پر بھی مُسکراہٹ نمودار ہُوئی۔ اس نے سلامی دینے کے انداز میں تلوار سر تک اُٹھاتے ہُوئے کہا "ایک عرصے بعد شہزادی کو دیکھنے کا شرف حاصل کررہا ہوں، شہزادی پہلے بھی خوب صورت تھی اور اب تو اس حُسن میں چار چاند لگ گئے ہیں۔"

"تم وہی پُرانے قنبر ہو، ذرا بھی نہیں بدلے۔" تاشیہ اس کے چاندی جیسے چمک دار بالوں کو چھُوتے ہُوئے ہنس کر بولی "لیکن قنبر! یہ عکران میں کیا ہو رہا ہے؟ یہ سپاہ کیوں جمع ہے؟"

"یہ راخیل کا شاخسانہ ہے۔ وہ ایک بار پھر ہم پر حملہ کرنے آرہا ہے۔ وہ اپنے قزاقوں کے ساتھ سمندر سے نکل آیا ہے۔ راستے میں اُس نے کئی بستیوں کو لُوٹا، جگہ جگہ آگ لگائی اور سینکڑوں افراد کو تہ تیغ کردیا۔ ہمارے مخبروں کی اطلاع کے مطابق وہ بہت جلد عکران میں قدم رکھنے والا ہے۔ اگر اس کا راستہ نہ روکا گیا تو وہ یہاں بھی تباہی و غارت گری کا بازار گرم کردے گا۔ یہی وجہ ہے کہ عکران کا ہر سپہ گر میدان میں جمع ہو رہا ہے۔ راخیل کا مقابلہ کرنے کے لیے بڑے زور و شور سے تیاری کی جارہی ہے۔"

قنبر ابھی تک مجھے نظر انداز کیے ہُوئے تھا، جو میرے لیے حیرت کی بات تھی۔ وہ شہزادی تاشیہ کو غور سے دیکھتے ہُوئے دوبارہ بولا "میں تمھاری یہاں اچانک موجودگی پر حیران ہُوں شہزادی! لیکن میں وجہ نہیں پوچھوں گا کیوں کہ مجھے اس کا اختیار نہیں ہے۔ اس وقت میں عجلت میں ہُوں، میرے جوان بھوک سے بے تاب ہو رہے ہیں۔ ہم پڑاؤ میں جاکر آرام کریں گے۔ لگتا ہے، بھوک تمھیں بھی ستا رہی ہے۔ کیا تم شاہ یوطابا سے مِل چکی ہو؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں، ہمارا ارادہ شاہ یوطابا کے ساتھ دسترخوان پر شریک ہونے کا ہے۔" تاشیہ نے مُسکرا کر کہا۔

لفظ "ہمارا" پر قنبر نے پہلی بار مجھ پر نظر ڈالی۔ اس کی نگاہ میں میرے لیے تحقیر تھی۔ تاشیہ کی مُسکراہٹ گہری ہوگئی۔ وہ سر ہلاتے ہُوئے بولی "اس کی طرف سے مطمئن رہو، میں اس کی ضامن ہُوں۔"

تاشیہ کی یقین دہانی کے باوجود قنبر کے رویّے میں تبدیلی نہ آئی تو وہ دوبارہ بولی "یہ میرا خاص آدمی ہے۔ یہ آزاد ہے اور ہتھیار سجانے کا حق رکھتا ہے۔ البتہ یہ ہماری حیثیت اور مرتبے کا نہیں ہے لیکن اس نے غیر معمولی خدمت کی ہے اس لیے میں اس کا خیال رکھتی ہُوں۔"

قنبر نے اس بار سر سے پیر تک میرا جائزہ لیا پھر تاشیہ کی طرف دیکھتے ہُوئے بولا "کہا جاتا ہے، راخیل دُشمن پر غلبہ پانے کے لیے اپنی عیارانہ چال بازی سے کام لیتا ہے۔ حملہ آور ہونے سے پہلے وہ دُشمنوں کے درمیان اپنے مخبر چھوڑ دیتا ہے۔ مخبر آبادی میں گھُل مِل جاتے ہیں۔ ہر طبقے کے افراد سے ربط و ضبط بڑھا لیتے ہیں اور کمزوریاں تلاش کرکے راخیل کو آگاہ کردیتے ہیں پھر راخیل کے لیے اس مملکت کی اینٹ سے اینٹ بجا دینا چٹکی بجانے کی بات ہوتی ہے۔"

تاشیہ کے چہرے کے تاثرات تبدیل ہوگئے اور وہ قدرے سخت لہجے میں بولی "میں کہہ چکی ہُوں کہ اس کی میں ضامن ہُوں۔ کیا یہ کافی نہیں ہے؟"

قنبر معذرت چاہنے کے انداز میں بولا "عام حالات میں یہ کافی سے بھی بہت زیادہ ہوتا لیکن اس وقت حالات دوسرے ہیں۔ تم ابھی نوخیز اور نوعمر ہو۔ تم وہ باتیں نہیں جانتیں جو ایک سپاہی جانتا ہے۔ اس وقت عکران جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہے اور راخیل کے مخبر بہت چالاک اور فطین ہیں۔ اگر یہ شخص تمھارے بقول ایک آزاد شخص ہے اور ہتھیار سجانے کا حق رکھتا ہے تو یہ مسلح کیوں نہیں ہے۔ اس کا خُود، زرہ، ڈھال اور برچھی بھالا کہاں

ہیں؟ اس کے پاس ایک کند تلوار کے سوا کچھ بھی نہیں نظر آتا اور پھر اس کا لباس؟ کیا یہ ایک جاں باز کا لباس ہے؟ اس کے جسم پر سوائے ایک چوغے کے کچھ نہیں ہے اور یہ چوغہ بھی کہیں سے چُرایا ہُوا معلوم ہوتا ہے۔"

میں بڑی مشکل سے اپنی مُسکراہٹ پر قابو رکھ سکا۔ تاشیہ بھی بڑی کوشش سے ہنسی روک پائی اور قنبر کو گھُور کر بولی "مجھے تمھاری بات پسند نہیں آئی۔ میں ایک بار پھر کہوں گی کہ یہ شخص جس کا نام سرفروش ہے، اس کی ذمّے داری مجھ پر عائد ہوتی ہے۔ اَب میں اپنی بات دُہرانا پسند نہیں کروں گی۔ ہمیں شہر تک لے چلو اور مجھے مزید مشتعل کرنے کی کوشش نہ کرو۔ میں اپنے عم زاد، شاہ یوطابا کو خود ہی سمجھا لُوں گی۔ اس سلسلے میں تمھیں یا کسی اور کو فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ سمجھ گئے؟"

قنبر تاشیہ کے آگے جھُکا اور پھر ایک طرف ہٹتے ہُوئے مؤدب لہجے میں بولا "مجھے افسوس ہے شہزادی! میں نے جو کچھ کہا، اس لیے کہا کہ آج کل موآبہ میں ہر اجنبی کو شک و شُبہے کی نظر سے دیکھا جا رہا ہے۔ شاہ یوطابا کے وفادار اور نمک خوار کی حیثیت سے میں نے اپنا فرض ادا کیا ہے۔"

قنبر اپنے دستے کو لے کر ٹیلے سے اُترنے لگا۔ میں اور تاشیہ، دستے سے کافی پیچھے رہ کر چل رہے تھے۔ راستے میں، میں نے تاشیہ سے پوچھا "یہ راخیل کون ہے؟"

"اسے ایک عفریت سمجھو۔ وہ بحری قزاق ہے۔ کچھ لوگ اسے سُرخ شیطان بھی کہتے ہیں، کیوں کہ اس کے چہرے پر سُرخ داڑھی ہے۔ وہ چند سال بعد اپنے قزاقوں کے ساتھ سمندر سے نکلتا ہے پھر آبادیوں کو لُوٹ کر اور انھیں تہس نہس کرکے واپس چلا جاتا ہے۔ وہ ترس اور رحم جیسے الفاظ سے ناواقف ہے۔ اس کے ساتھی بے حد وحشی اور سفّاک ہیں۔ لُوٹ مار اور عصمت دری اُن کا شعار ہے اور راخیل تو وحشیوں کا وحشی ہے۔ اس کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ وہ دیو نژاد ہے۔ کوئی حربہ، کوئی ضرب اس پر کام نہیں کرتی۔ اُسے کسی طرح بھی ہلاک نہیں کیا جاسکتا..." تاشیہ کچھ دیر خاموش رہی پھر سرگوشی میں بولی "میں نہیں سمجھتی کہ یوطابا جیسا احمق اس کے آگے ٹھہر سکے گا۔ بہادر ہونے کے باوجود شکست ہی اس کا مقدر ٹھہرے گی۔"

"لیکن یوطابا کے علاوہ یہاں اور بھی تو حکمران ہیں۔ سب مِل کر راخیل کا مقابلہ کیوں نہیں کرتے؟ سب مِل جائیں تو اسے ختم کرنا دُشوار نہ ہوگا۔" میں نے کہا۔

"یہی تو مشکل ہے۔" تاشیہ بولی "سب کے سب آپس میں ناچاقی کے شکار ہیں۔ دِل ہی دِل میں ایک دوسرے سے حسد کرتے ہیں اور بغض و عناد رکھتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اُن کی حریف مملکتیں ختم ہوجائیں تاکہ اُن کے ہاتھ پیر پھیلیں۔ مشترکہ مقاصد کے لیے بھی اُن سب کو ایک جگہ جمع کرنا بہت مشکل ہے۔"

"مشکل تو ہے، مگر ناممکن نہیں ہے۔ اگر وہ سب مِل کر ایک جنگی مشاورتی جماعت قائم کرلیں تو راخیل کے دانت کھٹّے کیے جاسکتے ہیں۔ اس طرح وہ سمندر تک محدود ہوکر رہ جائے گا اور کبھی خشکی کا رُخ نہیں کرے گا۔"

"اور یہ جنگی مشاورتی جماعت کون قائم کرے گا...؟ میں؟" تاشیہ استہزا کے ساتھ بولی "تمھیں شاید معلوم نہیں کہ یہاں عورتوں کو جنگ کے معاملات میں دخل دینے کی اجازت نہیں ہے۔ اس سلسلے میں اُن کی کوئی بات نہیں سُنی جاتی، کوئی مشورہ قبول نہیں کیا جاتا... بہرحال ایک بات طے ہوگئی کہ تم بے حد ذہین اور دانش مند آدمی ہو۔ بلا کی سمجھ بُوجھ رکھتے ہو۔ میں کوشش کروں گی کہ یوطابا کو تمھاری طرف متوجہ کردوں کہ وہ اس نازک گھڑی میں تمھارے مشوروں سے فائدہ اُٹھائے لیکن اس عرصے میں، میں تم سے دُور رہوں گی۔ مجھے افسوس ہے کہ میں، تمھیں شاہی محل میں نہ لے جاسکوں گی۔ تم مجھ سے الگ رہو گے لیکن پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، میں تمھارے لباس، خوراک اور قیام کا بندوبست کردوں گی۔ جب میں یوطابا کو ہموار کرلوں گی تو اُس سے تمھاری ملاقات کراؤں گی۔ اب یہ تمھاری ذہانت پر منحصر ہے کہ تم اُسے متاثر کرلیتے ہو یا نہیں... بس تم سے ایک درخواست ہے کہ اپنی زبان پر اور اپنے اشتعال پر قابو رکھنا۔"

ہم ٹیلے سے اُتر کر پڑاؤ کے قریب پہنچ گئے۔

قنبر نے اپنے دستے کو رخصت کردیا اور اَب ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ ہم قریب پہنچے تو تاشیہ نے اسے ایک طرف لے جاکر کچھ بات کی۔ قنبر اِثبات میں سر ہلاتا رہا پھر اس نے ایک سپاہی کو بُلایا اور ضروری ہدایات دے کر مجھے اس کے حوالے کردیا۔ جب میں تاشیہ سے رُخصت ہو رہا تھا تو اس کی آنکھوں میں ایک خاموش التجا دیکھی۔ اور اس التجا کا مفہوم میرے ذہن میں بالکل واضح تھا... کہ دیکھو سرفروش! خود پر قابو رکھنا!

★★

وہ ایک تاریک اور سیلن زدہ جھونپڑا تھا، جس میں، میں نے

اپنا سارا دن بے کیفی اور بے زاری میں گزارا تھا۔ چھت میں ایک سُوراخ تھا جو ہَوا اور روشنی کا واحد وسیلہ تھا۔ میری تلوار لے لی گئی تھی اور جھونپڑے کے دروازے پر ایک نگراں متعین کر دیا گیا تھا۔ نگراں کیا تھا، تیجا خاصا مسخرا تھا۔ اس کی ہیئت کذائی دید نی تھی۔ چھوٹا قد، سَر پر چھدرے بال، خرگوش جیسے ہونٹ اور ٹھوڑی پر داڑھی کے نام پر دو چار بال۔ میرے ساتھ اس کا رویہ دوستانہ نہیں تو مزاحمانہ بھی نہیں تھا۔ اس نے اپنا نام سِلارد بتایا تھا۔ وہ ایک غلام تھا، جسے اب آزاد کر دیا گیا تھا۔ نہ جانے کیوں، وہ مجھے بالکل پسند نہ آیا تھا۔

مَیں یوں بھی بے حد بیزار تھا لیکن جب چھت کے سُوراخ سے مجھے شام کا پہلا تارہ دکھائی دیا تو میرے صبر کا پیمانہ چھلک پڑا، غُصہ نقطۂ عروج کو پہنچ گیا۔ تاشیہ، قنبر کے حوالے کر کے یا تو مجھے بھول گئی تھی یا پھر نظرانداز کر دیا تھا۔ قنبر کے آدمی نے مجھے لا کر اس جھونپڑے میں دھکیل دیا تھا، پھر دروازہ مقفل کرنے اور ایک نگراں متعین کرنے کے بعد غائب ہو گیا تھا۔ اس کے بعد کسی نے میری خبر تک نہیں لی تھی۔

رات ہوتے ہی نہ جانے کہاں سے کیڑے مکوڑے نکل آئے اور انھوں نے مجھ پر یلغار کر دی۔ آدمیوں سے جارحانہ جنگ لڑتے لڑتے مَیں نے اُن حشرات سے مدافعتی جنگ شروع کر دی۔ اچانک جھونپڑے کا دروازہ کھُلا اور سِلارد داخل ہُوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چوبی طشت تھا، جس میں گوشت کے پارچے اور سیاہ روٹی رکھی ہُوئی تھی۔ ساتھ ہی ایک پیالہ بھی تھا جس میں موجود مشروب سے ابھی تک جھاگ اٹھ رہی تھی۔

سِلارد کے دائیں ہاتھ میں ایک چھوٹا سا بھالا دبا ہُوا تھا۔ اس نے دُور سے بھالے کی نوک میری طرف اُٹھاتے ہُوئے کہا: "مالک! تم اُس کونے میں چلے جاؤ۔ مجھے تم سے ڈر لگتا ہے۔ ہُرمزد کی قسم... تمھارے بازو ایسے ہیں کہ مضبوط سے مضبوط سانڈ کی گردن دبا سکتے ہیں"۔

وہ اپنا فرض انجام دے رہا تھا، اس لیے مَیں مُسکراتا ہُوا، ایک گوشے میں چلا گیا اور وہیں سے پوچھا: "مَیں اِس ڈربے میں کتنے دن بند رہوں گا؟"

جواب میں سِلارد کے خرگوش نُما ہونٹ پھیل کر رہ گئے۔ شاید وہ مُسکرا رہا تھا اور وہ مُسکراہٹ لاعلمی کا اظہار تھی۔ کھانا رکھنے کے بعد وہ دروازے کے قریب جا کر بیٹھ گیا اور میری طرف دیکھنے لگا۔ مَیں نے روٹی کے ٹکڑے پر گوشت کا پارچہ رکھا اور مُنہ میں ڈال کر چبانے لگا پھر مشروب کا گھونٹ لیتے ہُوئے بولا: "مَیں تمھارا شکر گزار ہُوں، دوست! اگرچہ تم میرے نگراں ہو... مگر میں تمھیں نگراں نہیں سمجھتا۔ مجھ پر یہ قید تم نے نہیں مسلط کی... بلکہ تم ایک درمیانی کڑی ہو، مجبورِ محض۔ میں تمھارا اس لیے شکر گزار ہُوں کہ اس سرزمین پہ قدم رکھنے کے بعد تمھارے توسط سے مجھے پہلی بار دانہ پانی نصیب ہُوا ہے ورنہ وہ لوگ تو مجھے بھُول ہی گئے تھے"۔

سِلارد کے چہرے کی کیفیت تبدیل ہو گئی۔ اُس کی چھوٹی چھوٹی دھنسی ہُوئی آنکھیں کسی اندرونی جذبے سے چمک اُٹھیں۔

"اس تخاطب کے لیے تمھارا بھی شکریہ مالک!" آخر وہ بول اُٹھا: "غریب سِلارد سے آج تک کسی نے ایسے لہجے میں بات نہیں کی۔ میرے کانوں نے کبھی ایسے مہربان الفاظ نہیں سُنے۔ مجھے ہمیشہ ملامتیں، تضحیک اور ٹھوکریں ہی ملتی رہی ہیں۔ مَیں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ایسے الفاظ سُننے کا بھی اہل ہُوں۔ میرے نزدیک محبت کے الفاظ اپنا مفہوم کھو چکے تھے۔ اس پذیرائی کے لیے تمھارا بہت بہت شکریہ مالک!"

"مَیں کب تک یہاں قید رہوں گا؟" مَیں نے دوبارہ پوچھا۔

"مَیں اس کا جواب دوں گا تو وہ جھُوٹ ہی ہو گا مالک! اور سِلارد، جو بڑا گناہگار ہے، اس نے سب کچھ سیکھا ہے، مگر جھوٹ بولنا نہیں سیکھا۔ صحیح جواب تو شاہ یوطابا ہی دے سکے گا۔ صبر کرو صبر، میری طرح... میں تم سے مختلف نہیں ہوں۔ بس فرق یہ ہے کہ تم اس جھونپڑے میں قید ہو اور میں آزاد رہتے ہُوئے بھی حالتِ قید میں ہُوں"۔

دفعتاً دروازے پر ہلکی سی دستک سُنائی دی۔

سِلارد بوکھلا گیا اور فوراً ہی دروازے تک گیا۔

دروازے سے باہر جو کوئی بھی تھا، سرگوشی میں اس سے گفتگو کرنے لگا۔ سِلارد کی حالت غیر تھی۔ اس کے مُنہ سے الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر نکل رہے تھے۔ مَیں نے اپنی سماعت پر زور ڈالا تو محسوس ہوا کہ باہر سے آنے والی آواز نسوانی تھی۔

میرا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔

کیا وہ تاشیہ تھی؟ کیا اُسے میری حالت پر رحم آ گیا تھا؟ خدا کا شکر ہے کہ وہ مجھے بھولی نہیں تھی، ورنہ شاہی محل میں داخل ہونے کے بعد بیرونی دُنیا سے رشتے کٹ جانا کوئی بڑی بات نہیں ہوتی ہے۔

کچھ دیر بعد سِلارد پلٹا تو وہ بہت خوش دکھائی دیا۔ اُس نے میرے سامنے ہتھیلی کھولی تو اس پر ایک بڑا سا طلائی سکہ چمک رہا تھا۔

"غریب سِلارد کی قسمت ہی چمک گئی۔ اب تو میں بہت کچھ کر سکوں گا۔ آج خدائے ہُرمزد مجھ پر بہت مہربان ہے"۔ وہ سرشاری سے بولا۔

"بکواس بند کرو"۔ مَیں نے غصّے سے کہا: "کیا شہزادی تاشیہ آئی تھی؟ کیا وہ میرے لیے کوئی پیغام چھوڑ گئی ہے؟"

"تم نے غلط اندازہ لگایا مالک! دروازے پر شہزادی تاشیہ نہیں بلکہ ملکہ رودمہ کھڑی ہے۔ وہ تم سے ملنا چاہتی ہے لیکن شرط یہ ہے کہ تم اس ملاقات کا کسی سے ذکر نہیں کرو گے۔ جب تم اس شرط پر قائم رہنے کا وعدہ کر لو گے تو وہ اندر آئے گی اور تم سے کچھ بات کرے گی۔ بولو! رازداری کا وعدہ کرتے ہو؟"

"اُسے اندر لے آؤ، بے وقوف! مَیں اس ملاقات کا کسی سے ذکر نہیں کروں گا"۔ مَیں دبے دبے جوش کے ساتھ بولا: "وہ یقیناً شہزادی تاشیہ کی طرف سے کوئی پیغام لے کر آئی ہے"۔

"ٹھیک ہے مالک! تم رازداری کا خیال رکھنا، ورنہ دو بڑوں کے بیچ میں یہ غریب سِلارد مارا جائے گا"۔ وہ پلٹا اور تیزی سے دروازے کی طرف چلا گیا۔

وہ جیسے ہی دروازے سے نکلا مجھے خُوشبو کی زبردست لپٹیں محسوس ہونے لگیں۔ اس کے ساتھ ہی بھاری لبادے میں لپٹا ہُوا ایک نسوانی وجود اندر آ گیا۔ ملکہ رودمہ کا قد پانچ فٹ سے کسی طرح کم یا زیادہ نہیں تھا۔ اس کے بال سُنہرے تھے اور طلائی تاروں سے بندھے ہُوئے تھے۔ اس کے چہرے پر سفید نقاب تھی۔ وہ سُبک رفتاری سے میرے قریب آئی اور بولنے میں سبقت کی: "تمھارا نام سرفروش ہے؟ وہی جو شہزادی تاشیہ کے ساتھ یہاں آیا ہے؟"

"ہاں، مَیں وہی ہُوں، ملکہ عالیہ!" مَیں نے مؤدب ہو کر کہا۔

اس بار ملکہ رودمہ فوری طور پر کچھ نہ بولی بلکہ دیر تک میری طرف انہماک سے دیکھتی رہی پھر اس نے ایک گہری سانس لیتے ہُوئے کہا: "تاشیہ نے کم از کم ایک بات تمھارے بارے میں بالکل سچ کہی ہے کہ تم ایک لاجواب جانور ہو، صحیح معنوں میں ایک وحشی آدمی"۔ وہ رُکی اور قدرے توقف کے بعد دوبارہ بولی: "تاشیہ نے یہ بھی بتایا تھا کہ تم بڑے دانا اور بینا آدمی ہو، تم میں پیش بینی کی بھی صلاحیت ہے۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے؟ ہمارے ملک میں ایسے شخص کو ساحر کہتے ہیں۔ کیا یہ بات سچ ہے؟"

"ہاں، یہ سچ ہے، ملکۂ عالیہ!" مَیں نے اَدب سے جھکتے ہُوئے کہا: "میرا علم کہتا ہے کہ تمھیں ایک ایسے ہی ساحر کی ضرورت ہے"۔

"ہاں، سرفروش! تم سچ کہتے ہو۔ مجھے ایک ساحر کی ضرورت ہے، جو میرے لیے کچھ کر سکے لیکن مجھے ایک جانباز کی بھی ضرورت ہے۔ تاشیہ نے بتایا ہے، تم زبردست لڑاکے بھی ہو؟"

ملکہ رودمہ نے گفتگو کے دوران میں کئی بار تاشیہ کا نام لیا تھا لیکن مَیں نے پہلی بار محسوس کیا کہ تاشیہ کا نام لیتے وقت اس کے لہجے میں ایک عجیب سی کاٹ پیدا ہو جاتی ہے جو تاشیہ سے نفرت اور کدورت کی عکاسی کرتی تھی۔ میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی، مَیں فوراً سنبھل گیا۔ تاشیہ نے بتایا تھا کہ وہ ملکہ رودمہ کو ناپسند ہی نہیں کرتی... بلکہ اُس سے نفرت بھی کرتی تھی۔ ملکہ رودمہ یقیناً تاشیہ سے حسد میں مبتلا ہے اور جانے کیا سازش اور شیطانی منصوبہ لے کر آئی ہے؟

مَیں نے محتاط لہجے میں کہا: "ہاں ملکہ عالیہ! تاشیہ نے تمھیں دُرست بتایا ہے۔ مَیں اپنے دُشمنوں کو بہت بُری طرح موت سے ہمکنار کرتا ہُوں"۔

جھونپڑے میں آویزاں مشعل کی زرد اور بیمار روشنی میں وہاں کا ماحول بے حد پُراسرار ہو گیا تھا۔ ملکہ رودمہ کسی سوچ میں گُم ہو گئی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ چونک پڑی اور میرے قریب آتی ہُوئی بولی: "وعدہ کرو سرفروش کہ یہاں ہمارے درمیان جو گفتگو ہو گی، وہ ہمیشہ راز رہے گی"۔

"مَیں اس ملاقات کو ہمیشہ راز ہی رکھوں گا۔ سِلارد کے ذریعے یہ بات کچھ دیر پہلے بھی میں تم تک پہنچا چکا ہوں"۔

"وقت بہت کم ہے، اس لیے میں اختصار سے کام لوں گی لیکن اس کے باوجود تم میرے معاملے کو سمجھ لو گے۔ بہت پہلے، جب میری شادی نہیں ہُوئی تھی تو قبروتیوں نے پیش گوئی کی تھی کہ ایک روز مَیں موآبہ پر حکمرانی کروں گی۔ قبیلہ قبروت کی بوڑھی بڑی پجارن نے، جو اب مر چکی ہے، مجھے بتایا تھا کہ میری شادی کسی بادشاہ سے ہو گی۔ اس کی یہ بات سچ نکلی، میری شادی یوطابا سے ہو گئی، اس لیے مجھے یقین ہے کہ دوسری بات بھی سچ ثابت ہو گی، یعنی میں کسی نہ کسی روز موآبہ کی حکمراں بن جاؤں گی لیکن اس پیش گوئی کے مطابق میرے حکمراں بننے میں ایک اجنبی میری مدد کرے گا۔ وہ کسی دُور

دیس اور کسی اجنبی سرزمین سے آیا ہوگا۔ وجیہہ اور بہادر ہوگا۔ عقل مند، بے پناہ قوت کا مالک، زبردست لڑاکا اور جانباز بھی ہوگا۔ میں سمجھتی ہوں کہ وہ شخص تمھی ہو۔"

میں خاموش رہا۔

"جب میں کنواری تھی تو کبر دتیوں کے قول و فعل پر مجھے یقین نہیں تھا۔ میں انھیں جھوٹا سمجھتی تھی لیکن اب تمھیں دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ جھوٹے نہیں بلکہ سچے ہی ہوتے ہیں۔"

موقع ایسا تھا کہ میرا خاموش رہنا ہی مناسب تھا، چنانچہ وہی بولتی رہی۔

"میں نے اندازہ لگایا ہے کہ تاشیہ تم سے بے حد متاثر ہے۔ اگر تم بھی اس میں دل چسپی لیتے ہو تو میں تمھارے لیے راہ ہموار کروں گی۔ . . تاشیہ یہاں آنے کے بعد فوراً مجھ سے ملی اور تمھارے بارے میں بتانے کے بعد سفارش کی کہ میں کسی طرح تمھیں جنگی مشاورتی جماعت میں شامل کروادوں چنانچہ میں نے اس کا انتظام کردیا ہے۔ تم آج رات مشاورتی جماعت میں بیٹھو گے۔"

"مگر . . مگر میں نے تاشیہ سے یہ تو نہیں کہا تھا۔" میں چونک پڑا۔ "بلکہ میں نے تو یہ کہا تھا کہ اگر تمام حکمران مل کر جنگی مشاورتی جماعت قائم کرلیں تو وہ راخیل سے نجات حاصل کرسکتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" ملکہ رومہ مسکرادی۔ "مگر اس میں تھوڑا سا میرا اپنا اضافہ بھی ہے۔"

"وہ کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"مشاورتی جماعت میں شریک ہوکر، تم یوطابا کے خاص آدمیوں کو قریب سے دیکھ سکو گے۔"

"مگر کیوں؟ مجھے اس سے کیا دل چسپی ہوسکتی ہے؟ میں تو شہزادی تاشیہ کو لے کر یہاں سے نکل جانا چاہتا ہوں۔ مجھے شہزادی کو بہ حفاظت تمام اس کے باپ شاہ اعجاز تک پہنچانا ہے۔"

"صبر، صبر . . ." ملکہ رومہ کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔ "میں تمھارے تمام سوالوں کے جواب ایک ساتھ نہیں دے سکتی۔ اپنے پہلے سوال کا جواب سُنو۔ تمھارا مشاورتی جماعت میں بیٹھنا اور یوطابا کے خاص آدمیوں کو قریب سے دیکھنا یا سمجھنا اس لیے ضروری ہے کہ یوطابا کی ہلاکت کے بعد انھیں تمھی سنبھالو گے . . . رہی شہزادی تاشیہ . . . تو وہ اس قابل نہیں ہے کہ سفر کرسکے۔ وہ بیمار ہے اور یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ اُس کی بیماری کس قدر طول کھینچے گی۔"

میرے رگ و پے میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔

ملکہ بہت گہرا کھیل کھیل رہی تھی۔ ایک طرف تو وہ میرے ذریعے یوطابا کو اپنی راہ سے ہٹا کر عکران کی ملکہ بننا چاہتی تھی، دوسری طرف، تاشیہ سے اُس کی نفرت اس حد تک بڑھی ہوئی ہے کہ وہ ہماری آپس کی دل چسپی کو سمجھنے کے باوجود مجھے اُس سے چھین کر اپنے تصرّف میں لانا چاہتی تھی۔

دفعتاً مجھے محسوس ہوا کہ تاشیہ کی زندگی خطرے میں ہے . . . وہ بیمار نہیں ہے بلکہ اس خبیث ملکہ نے اُسے کسی مہلک اور ضرر رساں دوا کے زیرِ اثر رکھا ہوگا۔ کیا یہ تاشیہ کی زندگی کا چراغ گل کردینا چاہتی ہے؟ یہ تاشیہ کو اس طرح ختم کرے گی کہ کسی کو اس پر شبہ تک نہیں ہوگا، سب یہی سمجھیں گے کہ تاشیہ کسی مہلک بیماری کا شکار ہوئی اور جاں بر نہ ہوسکی۔ اس ہوس پرست عورت نے ایک تیر سے دو شکار کا منصوبہ بنایا تھا: تاشیہ اور یوطابا کا خاتمہ، پھر عکران اور سرفروش پر قبضہ۔

میں نے اسی لمحے فیصلہ کرلیا کہ اس سازشی ملکہ کا کوئی حربہ کامیاب نہیں ہونے دوں گا لیکن اس وقت صورتِ حال کچھ ایسی تھی کہ میں کھُل کر اس سے اختلاف نہیں کرسکتا تھا۔ مجھے آج رات بہرحال جنگی مشاورتی جماعت میں شریک ہونا تھا۔ اس کے بعد کی صورتِ حال کے متعلق کچھ کہنا قبل از وقت تھا لیکن ایک بات طے تھی کہ میں موقع ملتے ہی تاشیہ کو لے کر وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کروں گا۔ مجھے تاشیہ کو ہرحال میں اس کے باپ تک پہنچانا تھا۔ وہ ملکہ اژدہا سے بچ نکلی تھی لیکن ملکہ رومہ کے چنگل میں پھنس گئی، آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا۔

میں سوچوں کی دنیا سے واپس آیا تو دیکھا کہ رومہ میری طرف غور سے دیکھ رہی تھی۔

"کیا سوچنے لگے تھے؟" اس نے پوچھا۔

"ایک دو باتیں ہیں سوچنے کی . ." میں نے بات بنائی۔ "تم نے تو مجھے امتحان میں ڈال دیا ہے۔"

"جری اور بہادر لوگوں کا کام ہی آزمائش میں پڑتے رہنا ہے، اس سے انھیں جِلا ملتی ہے۔" رومہ مسکراتی ہوئی بولی۔

دفعتاً وہ میرے بے حد قریب آگئی . . .

اس کے لبادے سے اُٹھتی ہوئی تیز خوشبو سے میرا چہرہ تمتمانے لگا۔ اُس نے اپنا سفید، ریشمیں ہاتھ میرے شانے پر رکھا، اور مخمور لہجے میں بولی۔ "سرفروش! تم اپنے دل میں میرے لیے کیسے جذبات محسوس کرتے ہو؟"

دل تو یہی چاہا کہ کہہ دوں، نفرت اُبلی پڑ رہی ہے میرے وجود سے . . . لیکن یہ کہنا، اپنی زندگی کے باقی ماندہ دن کم کرنے

کے مترادف تھا، وہ ایک خونخوار عورت تھی۔ میں نے خود کو سنبھالا، اور بات بناتے ہوئے کہا۔ "اس سلسلے میں، میں اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا ہوں ملکہ عالیہ! کہ میں ایک مرد ہوں، کسی خوب صورت اور دل کش عورت کے لیے، کسی مرد کے دل میں جو جذبات موجزن ہوسکتے ہیں، وہ میرے دل میں بھی ہیں اور میں، اس معاملے میں، دوسروں سے مختلف تو نہیں ہوسکتا۔"

"تم نے میری صورت دیکھی ہے؟" اُس نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

"یہ میری بدقسمتی ہے کہ میں . . ."

"دیکھو گے؟" اس نے میری بات قطع کرکے جلدی سے کہا۔

"کفرانِ نعمت کون کرتا ہے۔"

"اچھا تو یہ لو . . ." رومہ نے ایک جھٹکے سے نقاب، چہرے سے الگ کردی۔

اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی اور رومہ کے چہرے پر زہرخند دوڑ گیا۔

ملکہ رومہ کا چہرہ دو حصّوں میں تقسیم تھا۔ دایاں حصّہ صاف و شفاف اور مخملیں جلد لیے ہوئے تھا۔ اس حصّے کی رنگت گلابی تھی۔ ہونٹ شاداب اور آنکھ بے حد پُرکشش تھی لیکن دوسرا حصّہ بے حد مکروہ تھا۔ اس حصّے پر آنکھ نہیں تھی بلکہ ضائع ہوچکی تھی۔ رومہ ایک چہرہ رکھنے کے باوجود دو چہروں کی مالک تھی۔ ایک چہرہ حسین اور دوسرا بھیانک . . . چہرہ بیچوں بیچ تقسیم ہوا تھا جیسے کسی نے تلوار سے الگ الگ کردیا ہو۔

"کیا خیال ہے؟" اُس نے زہر میں ڈوبی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔ "اب تمھارے دل میں میرے لیے کیسے جذبات ہیں؟"

میں خاموش رہا۔

اب مزید حاشیہ آرائی اور لیپا پوتی، مکاری ہی کے مترادف ہوتی۔ رومہ نے دوبارہ چہرے پر نقاب ڈال لی اور دکھ بھرے لہجے میں بولی۔ "کبھی میں واقعی دل کش ہوا کرتی تھی لیکن بحری قزاقوں کے ایک حملے میں کچھ اس طرح زخمی ہوئی کہ کسی کو صورت دکھانے کے قابل بھی نہیں رہ گئی اور کسی کو کیا کہوں، آئینے میں خود اپنی شکل دیکھتی ہوں تو خوف سے چیخ پڑتی ہوں۔ اب تو عادت سی ہوگئی ہے۔ قزاق مجھے مُردہ سمجھ کر چھوڑ گئے تھے۔ کاش وہ مجھے مار ہی ڈالتے۔" رومہ خاموش ہوگئی۔ کچھ دیر بعد افسردہ لہجے میں بولی۔ "اس واقعے کا دردناک اور افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ اس حملے کے دوران یوطابا مجھے تنہا چھوڑ کر بھاگ گیا تھا، بزدل، بھگوڑا اور خود غرض۔" رومہ کے لہجے سے نفرت اُبل رہی تھی۔ "اور اب وہ ہر اُس عورت کی طرف متوجہ ہوجاتا ہے، جو ایک بار بھی اس کے قریب سے گزر جاتی ہے۔"

"مجھے بے حد افسوس ہوا، ملکہ عالیہ!" میں نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

واقعی مجھے بے حد صدمہ پہنچا تھا . . .

"اگر یوطابا اُس وقت نہ بھاگتا تو شاید میری اب یہ کیفیت نہ ہوتی۔"

"تمھارا خیال درست ہے، ملکۂ عالیہ۔ مرد کو آخر دم تک اپنی عورت کی حفاظت کرنی چاہیئے۔"

"کاش ایسا ہی ہوتا . ." رومہ نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ پھر وہ قدرے شوخ لہجے میں بولی۔ "اس کے باوجود تمھیں مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ چہرہ میرے پاس نہیں رہا لیکن میرے پاس ایک ایسا سراپا ہے، جس کی مثال اس سرزمین پر نہیں مل سکتی۔ اگر تم نے یوطابا کو مار ڈالا تو اسے اپنا انعام سمجھنا۔ تم چاہو گے تو ساری عمر اسے اپنے قریب رکھ سکو گے۔"

اس نے مجھے جو انعام دینے کا وعدہ کیا تھا، اگلے ہی لمحے وہ انعام میرے سامنے بے حجاب کردیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا، وہ غلط نہیں کہہ رہی تھی۔

میرے جسم کا سارا خون میرے چہرے پر کھنچ آیا۔

"اب میں چلوں۔" اس نے خود کو ملفوف کرکے کہا۔ "میری بات ذہن میں رکھنا۔ مشاورتی جماعت سے نمٹنے کے بعد میں دوبارہ تم سے ملاقات کروں گی۔ اب تم جماعت میں شریک ہونے کے لیے تیار ہوجاؤ۔ سِلارد تمھاری رہ نمائی کرے گا۔" یہ کہہ کر وہ جھونپڑے سے چلی گئی۔

اُس کے جاتے ہی سِلارد سرپٹ بھاگتا ہوا آیا۔ "مالک! شاہ یوطابا کے محل میں چلنے کے لیے تیار ہوجاؤ۔" اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"تیاری کیا خاک کرنی ہے۔" میں نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "چلو۔ میں تیار ہوں۔"

★★

مشاورتی جماعت میں شریک، میں ایک کشادہ لیکن کھُردری سی کرسی پر بیٹھا ہوا، خود کو ایک ایسا مجرم تصور کر رہا تھا، جسے موت کی سزا دی جانے والی ہو۔ کمرہ خوب روشن تھا اور فضا میں مچھلی کے تیل کی بُو چکرا رہی تھی۔ ایک بہت بڑے آتشدان

میں آگ جل رہی تھی، جس کے قریب متعدد خونخوار اور جسیم کتے آنکھیں میچے، سو رہے تھے۔ وہ کتے اُسی نسل کے تھے، جس کتے کو میں تاشیہ کا دفاع کرتے ہُوئے ہلاک کر چکا تھا۔

اس وقت کمرے میں کل دس آدمی موجود تھے، جن میں میرا واحد شناسا قنبر بھی شامل تھا لیکن وہ مجھے مسلسل نظر انداز کر رہا تھا۔

وہ دس آدمی ایک لمبی میز کے گرد بیٹھے ہُوئے تھے۔ ٹھیک میرے سامنے، کمرے کے گوشے میں ایک عمر رسیدہ قبرتی عورت بیٹھی تھی۔ اس کا جسم بھاری لبادے میں لپٹا ہُوا تھا۔ چہرے پر سفید نقاب تھی۔ کمرے میں چکراتے ہُوئے دُھوئیں کی وجہ سے وہ بار بار کھانسنے لگتی تھی۔ اس کے سامنے چوکور شکل میں کسی درخت کی چھال کے بڑے بڑے ٹکڑے رکھے ہُوئے تھے اور وہ اُن پر کچھ لکھتی جا رہی تھی۔

میز کے ایک سرے پر شاہ یوطابا براجمان تھا۔ اس کی حیثیت مشاورتی جماعت کے سربراہ کی تھی۔ اس کے دائیں طرف قنبر تھا اور بائیں طرف ایک کسرتی جسم کا لحیم شحیم، گنجا آدمی بیٹھا تھا۔ وہ بہت دیر سے بحث میں معروف تھے۔ موضوعِ بحث میری ذات تھی لیکن بحث کے دوران، وہ مجھے یُوں نظر انداز کیے ہُوئے تھے جیسے میں کوئی بے حد حقیر سی شے تھا اور میری طرف توجہ دینا ان کے لیے باعثِ توہین تھا۔

اس وقت وہی لحیم شحیم گنجا اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیرتے ہُوئے کہہ رہا تھا: "اس کا کہنا ہے، یہ ایک دانش مند درویش ہے۔ اس کے خیال کے مطابق یہ ایک بہترین لڑاکا اور فنِ حرب کا ماہر ہے لیکن میں کہتا ہُوں کہ یہ کچھ اور بھی ہے۔ میں اسے سُرخ شیطان کا بھیجا ہُوا بہترین مخبر کہوں گا، لہٰذا اِسے وہی سزا ملنی چاہیے، جو ایک مخبر کی ہوتی ہے۔ . . یعنی سزائے موت"

"میں اِس سلسلے میں شہزادی تاشیہ کی بات ایک بار پھر دُہراؤں گا" قنبر نے مداخلت کی: "یہ شہزادی تاشیہ ہے، جو اس کو دانش مند کہتی ہے۔ وہ قسم کھاتی ہے کہ اس شخص نے اُسے ملکہ ریبلہ کے آدمیوں سے بچایا ہے اور اس سلسلے میں ایک خوف ناک کتے کو بھی ہلاک کیا تھا"

"اس میں جھگڑے کی کیا بات ہے۔ ایک معمولی بات کو اتنا بڑھایا کیوں جا رہا ہے" میز کے دوسرے سرے پر بیٹھا ہُوا ایک بھُورے بالوں والا شخص بول اُٹھا: "اس سلسلے میں ہمارے ہاں ایک رسم ہے، اُسے کیوں نہیں آزما لیتے؟" آخری جملہ کہتے ہُوئے اُس نے شاہ یوطابا کی طرف دیکھا۔

اَب مجھے اندازہ ہو چلا تھا کہ میری قسمت کا فیصلہ یوطابا ہی کے ہاتھوں میں ہے، وہی حرفِ آخر تھا۔ میں نے یوطابا کی طرف دیکھا۔ . . چالیس کے پیٹے میں، فربہی مائل، ایک سست اور آرام طلب شخص۔ . . جس کی باریک، لمبی مونچھیں اس کی ٹھوڑی تک لٹکی ہُوئی تھیں۔ اس کے سر پر ایک خُود رکھا ہُوا تھا، جس پر تاج کے نمونے کی کندہ کاری کی گئی تھی۔ وہ آگے کو جُھکا ہُوا مسلسل پیئے جا رہا تھا۔ بھُورے بالوں والے نے اپنی بات ختم کی تو اس نے بولنا شروع کیا۔

یوطابا کا لب و لہجہ نسوانیت لیے ہوئے تھا۔ وہ موخر الذکر کو مخاطب کرتے ہُوئے بولا: "جو کچھ تمھاری نظروں کے سامنے ہے، بات اُس سے کچھ آگے ہے، بارتھو! اگر شہزادی تاشیہ درمیان نہ ہوتی تو ہم اَب تک اس شخص کو آزما چکے ہوتے یا اسے قبیلہ قبردت کے حوالے کر دیتے۔ معاملہ اتنا سہل نہیں ہے، جتنا تم سمجھ رہے ہو۔ شہزادی تاشیہ نے اس کی ذمے داری لی ہے، وہ اس کی ضامن ہے۔ اگر۔ . ."

دفعتاً وہ گنجا، لحیم شحیم شخص زور سے ہنس پڑا اور یوطابا کی بات کاٹتے ہُوئے بولا: "مانا کہ شہزادی تاشیہ تمھاری عم زاد ہے، لیکن اس کے سِوا اور کیا ہے؟ اس کی وجہ سے اجنبیوں کے بارے میں قانون تو تبدیل نہیں کیا جا سکتا پھر وہ ایک نوعمر اور ناتجربہ کار دوشیزہ ہے۔ وہ ان معاملات کے بارے میں کیا جانے۔ عکران اس وقت دُشمن کی زد پر ہے۔ سُرخ شیطان کسی وقت بھی چڑھائی کر سکتا ہے۔ اس وقت کسی اجنبی کو پناہ دینا خودکشی کے مترادف ہے۔ یہ یقیناً سُرخ شیطان کا مخبر ہے۔ اس نے شہزادی تاشیہ کو بہلا پھُسلا کر رام کر لیا ہے۔ اُسے شیشے میں اُتار لیا ہے۔ میں کہتا ہُوں کہ مزید بحث میں پڑے بغیر اسے فوراً مار ڈالنا چاہیے"

یوطابا کا جسم ایک دم تن گیا اور سارا خون جیسے اس کے چہرے پر سمٹ آیا۔ وہ مخاطب کو شعلہ بار نظروں سے دیکھتے ہُوئے بولا: "تمھیں میری بات کاٹنے کی جرأت کیسے ہُوئی، ہورسا۔ . . زبان کو لگام دو۔ کیا تم نہیں دیکھ رہے کہ کس سے مخاطب ہو"

مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہُوئی کہ وہ اپنے بادشاہ کو اتنی ہی اہمیت دیتے ہیں۔

یوطابا بات جاری رکھتے ہُوئے بولا: "میں ایک بار پھر کہوں گا کہ یہ اتنا آسان معاملہ نہیں ہے۔ بات صرف اتنی سی نہیں ہے کہ جس ہستی نے اس اجنبی کی ذمے داری لی ہے اور ضامن بنی ہے، وہ میری عم زاد ہے۔ اہم پہلو یہ ہے کہ وہ شہنشاہِ احباز کی

بیٹی بھی ہے۔ میں شہنشاہِ احباز کا دِل میلا نہیں کر سکتا۔ یہ بات تم سبھی جانتے ہو۔ وہ زبردست، طاقت وَر اور جنگ باز ہے۔ . ."

یوطابا نے شراب کا ایک گھونٹ لیا اور موٹے موٹے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہُوئے بولا: "اگر تم لوگ اس سلسلے میں میری مدد نہیں کر سکتے تو میں اس اجنبی کو قبیلہ قبردت کے حوالے کر دیتا ہوں، وہ اس مسئلے کو بخوبی حل کر لیں گے"

"ہرمزد کی مار ہو، ان قبردتیوں پر اور شہنشاہِ احباز پر، میں ان دونوں سے نہیں ڈرتا" ہورسا میز پر گھونسہ مارتے ہُوئے بولا۔ "تمھیں ایک دوشیزہ کی زبان پر اتنا بڑا کھیل نہیں کھیلنا چاہیے۔ اس مخبر سے فوراً چھٹکارا حاصل کر لو۔ اس کا سر کاٹ کر سُرخ شیطان کو پہنچا دو تاکہ دوسرے مخبروں کو عبرت ہو"

ہورسا اس جماعت پر حاوی ہوتا جا رہا تھا کہ اچانک قنبر اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اس نے اُنگلی اُٹھا کر میری طرف اشارہ کرتے ہُوئے کہا: "یہاں موجود لوگوں میں، میں واحد شخص ہوں جس نے سب سے پہلے عکران کی حدود میں اس اجنبی کو دیکھا تھا۔ پہلی نظر میں مجھے بھی شُبہ ہُوا تھا کہ یہ مخبر ہے اور میں نے اپنے شُبہے کا اظہار شہزادی تاشیہ سے بھی کر دیا تھا لیکن اس نے میری بات سختی سے رَد کر دی تھی۔ افسوس کہ شہزادی تاشیہ کو یہاں نہیں بُلایا جا سکتا۔ یہ ہماری روایت کے خلاف ہے کہ کسی عورت کو اس قسم کی محفلوں میں شریک کیا جائے۔ اس کے علاوہ شہزادی شدید بیمار بھی ہے، مسلسل غفلت اور بے ہوشی کی کیفیت میں رہتی ہے، اس لیے اُس کے پاس جا کر بھی کچھ نہیں پوچھا جا سکتا" قنبر ذرا دیر کے لیے رُکا اور محفل کے ارکان پر نظر دوڑاتے ہُوئے دوبارہ بولنے لگا: "یہ تمام باتیں اپنی جگہ لیکن ہم ایک سنگین حقیقت سے چشم پوشی کر رہے ہیں۔ سُرخ شیطان اپنے درندوں کے ساتھ ہمارے دروازے پر دستک دے رہا ہے اور ہم بجائے اس کے بارے میں کچھ سوچنے کے ایک اجنبی کو پکڑ کر اس پر اپنا وقت اور توانائی ضائع کر رہے ہیں!"

میں نے قنبر کی طرف غور سے دیکھا۔ یہ شخص میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ میں اُسے اپنا دوست سمجھوں یا دُشمن؟ آخر وہ میری حمایت کیوں کر رہا تھا؟ کیا شہزادی تاشیہ کی وجہ سے؟ قنبر مسلسل بولے جا رہا تھا: "یہ مسئلہ اس قدر پیچیدہ نہیں ہے، جتنا اسے سمجھا جا رہا ہے۔ میرے نزدیک اس مسئلے کا حل بے حد آسان ہے۔ ہمارے پاس ایک ایسا قانون ہے جس کے تحت ہم اس مشکل سے نمٹ سکتے ہیں۔ اجنبیوں کے لیے ہمارے ہاں کا قانون ہے کہ اُسے ہمارے کسی آدمی سے دست بہ دست لڑنا ہوتا ہے۔ اس طرح یا تو وہ مارا جاتا ہے یا پھر سُرخ رو ہونے کی صورت میں ہم اُسے گلے لگا لیتے ہیں اور وہ ہم میں شامل ہو جاتا ہے۔ . . میں سمجھتا ہُوں کہ اس میں شہزادی تاشیہ کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہو گا اور نہ ہی شہنشاہِ احباز کی ناراضگی کا سوال پیدا ہوتا ہے کیوں کہ یہ سب کچھ ایک قانون کے تحت ہو گا، اور یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ شہنشاہِ احباز قانون کا کتنا احترام کرتا ہے"

ایسا لگتا تھا جیسے محفل کے ارکان کو قنبر کی یہ بات بے حد پسند آئی ہو۔ یوطابا کے چہرے کا تناؤ بھی کم ہو گیا تھا۔

"میں سمجھتا ہُوں کہ بہتر ہو گا، اب اس اجنبی کو کچھ بولنے کی اجازت دی جائے کیوں کہ اس وقت اس کے پاس زبان ہی ایک واحد ہتھیار ہے جسے یہ استعمال کر سکتا ہے" قنبر بات جاری رکھتے ہُوئے بولا: "میں چاہتا ہُوں کہ اس سلسلے میں رائے طلب کر لی جائے تو اچھا ہے۔ کتنے لوگ ہیں، جو چاہتے ہیں کہ اس اجنبی کو بات کرنے اور اپنا مؤقف ظاہر کرنے کی اجازت دی جائے؟" یہ کہتے ہُوئے خود اس نے اپنا ہاتھ اُٹھا دیا۔

یکے بعد دیگرے آٹھ ارکان نے بھی ہاتھ اُٹھا دیے۔

ہورسا کچھ دیر تو ان لوگوں کو کینہ توز نظروں سے دیکھتا رہا پھر اُس نے بھی، بادلِ ناخواستہ ہاتھ اُٹھا دیا اور خونخوار لہجے میں بولا۔ "میں نہیں جانتا کہ یہ شخص کون ہے؟ اشراف میں سے ہے، آزاد ہے، نچلی ذات کا ہے۔ . . یا کوئی مفرور غلام ہے۔ بہرحال معزز ارکان چاہتے ہیں کہ اسے زبان کھولنے کی اجازت دی جائے، تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے"

میرے لبوں پر بے ساختہ مُسکراہٹ دوڑ گئی، قسمت میری مدد کر رہی تھی۔ مجھے اپنا واحد ہتھیار زبان، استعمال کرنے کا موقع مل رہا تھا۔

یوطابا میری طرف دیکھتے ہُوئے بولا: "اجنبی! تم بول سکتے ہو۔ انتخاب کے ذریعے تمھیں بولنے کی رعایت مل گئی ہے۔ ہم صبر و تحمل سے سُنیں گے لیکن یہ بات ذہن نشین کر لو کہ محض الفاظ ہی تمھاری جاں بخشی نہیں کر سکیں گے۔ تمھیں ہم میں سے کسی ایک سے بہرحال لڑنا ہو گا اور اس مقابلے کا اختتام کسی ایک کی موت پر ہو گا۔ تم جس سے لڑنا چاہو، اُسے خود ہی منتخب بھی کر سکتے ہو۔ ہم اجنبیوں کو اپنا حریف منتخب کرنے کی اجازت ضرور دیتے ہیں"

میں اپنی کرسی سے اُٹھ کھڑا ہُوا۔

محفل پر گہرا سکوت چھا گیا۔
اس سکوت میں سرسراہٹ ہی وہ واحد آواز تھی، جو قبردتی عورت کے چھال کی تختی پر لکھنے سے پیدا ہو رہی تھی۔ اس کا ہاتھ بہت تیزی سے حرکت کر رہا تھا اور وہ بظاہر اس سارے جھگڑے سے لاتعلق معلوم ہوتی تھی۔
سب کی نگاہیں مجھ پر جمی ہُوئی تھیں۔
دفعتاً آتش دان کے قریب ایک کتا سوتے سوتے غرایا۔
یوطابا نے چھڑی گھما کر اُسے خاموش کر دیا۔
"میں ایک اجنبی ہوں۔" مَیں نے بولنا شروع کیا۔ "اور تمہارے طور طریقوں سے زیادہ واقف نہیں ہوں۔ البتہ جتنا کچھ بھی مجھے معلوم ہو سکا ہے، اس سے پتہ چلا کہ تم سب بے حد بہادر لوگ ہو لیکن اس کے ساتھ ہی میں تمہیں احمقوں کا ٹولہ بھی سمجھتا ہوں۔"
محفل میں بھنبھناہٹ اور تیز سرگوشیاں گونج اُٹھیں۔
ہورسا پاؤں پٹختا ہُوا اُٹھ کھڑا ہُوا۔ "تمہیں یہ جرأت کیسے ہوئی کہ تم جماعت کے ارکان کی اس انداز میں توہین کرو؟"
"بیٹھ جاؤ، ہورسا۔ . . اور سکون سے سُنو۔" قنبر ہاتھ لہراتا ہُوا بولا۔ "ہم انتخاب کے ذریعے اِسے بولنے کی اجازت دے چکے ہیں جو یہ کہتا ہے، کہہ لینے دو۔"
ہورسا غراتا ہُوا بیٹھ گیا۔
مَیں نے دوبارہ بولنا شروع کیا۔ "اگر میں راخیل، جسے تم لوگ سُرخ شیطان کہتے ہو، اس کا ممبر ہوتا تو میں اسی لمحے تمہارے سَر اُتار کر شہر کے سب سے اُونچے ستون پر آویزاں کر دیتا۔ تم یہاں بیٹھے سال خوردہ بھیڑوں کی طرح ممیا رہے ہو جب کہ سُرخ شیطان ہر لمحے آگے ہی بڑھتا آرہا ہے۔ تم میں سے ایک کہتا ہے کہ اس اجنبی کو، یعنی مجھے مار ڈالو اور دوسرا کہتا ہے کہ نہ مارو۔ کہیں شہزادی تاشیہ اور شہنشاہِ احباز ناراض ہو جائیں۔ . . تم کچھ بھی نہیں کر رہے ہو۔ باتیں بنا رہے ہو اور مجھے باتیں بنانے پر مجبور کر رہے ہو جبکہ اس عرصے میں سُرخ شیطان کی پیش قدمی بڑھتی جا رہی ہے۔"
مَیں نے اُنگلی سے شاہ یوطابا کی طرف اشارہ کیا۔
"اور تم! تم سب سے بڑے احمق ہو۔ تم ایک حکمراں ہوتے ہُوئے بھی حکمراں نہیں ہو۔ یہاں موجود لوگ، شہر اور شہر کے لوگ تمہارے قبضہ و اختیار میں نہیں ہیں۔ تم جنگ کی تیاری کر رہے ہو، میدان میں خیمے لگے ہُوئے ہیں لیکن ان خیموں میں کیا ہو رہا ہے؟ تمہاری سپاہ کیا کر رہی ہے؟ وہ لوگ جام پہ جام لنڈھا رہے ہیں۔ قحباؤں اور فاحشاؤں کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ حکمران میں داخل ہوتے وقت یہ سب کچھ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ تمہارے سپاہی یہ بات جانتے ہیں اور تم بھی بے خبر نہیں ہو۔ کیا تم اسی انداز اور اسی تیور کے ساتھ سُرخ شیطان کا مقابلہ کرنا چاہتے ہو؟ ایسا لگتا ہے، تمہاری سپاہ، سپاہ نہیں بلکہ زنخوں کا طائفہ ہے۔ سُرخ شیطان، خرگوشوں کی طرح تمہارا شکار کرے گا کیوں کہ تم لوگ اس کے لیے نرم چارہ ہو۔
"تم میرے بارے میں سُن چکے ہو کہ مَیں عام لوگوں سے مختلف ہوں۔ شعور اور فیصلوں میں ایک عام آدمی سے بہت بلند ہوں۔ یہ بات بالکل دُرست ہے۔ مَیں ایک ایسے دَور سے آیا ہُوں. . . جس کے بارے میں تم کچھ نہیں جانتے اور نہ ہی اتنا وقت ہے کہ اس دُور افتادہ دَور کے بارے میں تمہیں کچھ بتاؤں۔ صرف یہ ذہن نشین رکھو کہ میرے دماغ میں تمہاری طرح بھُس نہیں بھرا ہُوا ہے۔ میرے دماغ میں بہترین صلاحیتیں پوشیدہ ہیں۔ مَیں، سُرخ شیطان پر غالب آنے کے لیے تمہیں ایسے جنگی حربے بتاؤں گا جو اس کے ذہن میں کبھی پیدا نہیں ہُوئے ہوں گے اور تمہارا دماغ تو اُن کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا لیکن یہ سب کچھ مَیں اُسی وقت کروں گا جب اپنے منتخب آدمی سے دست بہ دست لڑ کر اُسے ہلاک کر چکا ہوں گا۔ تم اپنے ایک آدمی سے محروم ہونے کے لیے تیار ہو جاؤ، شاہ یوطابا! مَیں لڑنے کے لیے ہورسا کو منتخب کرتا ہُوں۔"
مَیں نے ہورسا کی طرف دیکھتے ہُوئے، حقارت سے تھُوک دیا۔
"مَیں نے قتل کرنے کے لیے تمہیں منتخب کیا ہے، ہورسا! اگر تمہیں خوف آرہا ہے، تو مَیں کسی اور کو منتخب کر لیتا ہُوں۔"
ہورسا غضب کے عالم میں کھڑا ہو گیا۔
اس کا چہرہ غصّے کی شدت سے مسخ ہو گیا۔ . .
وہ میز پر گھونسے مارتا اور مُنہ سے جھاگ اُڑاتا ہوا چنگھاڑنے لگا۔ "تم . . . تم بھگوڑے مخبر، غلام، بدذات، طوائف زادے، تمہیں مجھ سے اس انداز میں بات کرنے کی جرأت کیسے ہُوئی؟" وہ اشتعال سے بُری طرح کانپ رہا تھا۔ "مَیں، ہورسا، موآبہ کا شہ زور اور سب سے بڑا جانباز ہوں۔ مَیں نے کتنوں کے سَر جھکائے ہیں، کتنوں کی گردنیں توڑی ہیں۔ اگر مَیں تمہارا کلیجہ نہ چبا جاؤں تو مجھ پر ہُرمزد کا قہر نازل ہو۔"
مَیں ہورسا کی لاف گزاف پر مُسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔
میری تدبیر کارگر ثابت ہُوئی۔ مَیں اپنے مقصد میں کامیاب

ہو رہا تھا۔ مَیں نے ہورسا کو اشتعال دِلا کر اُسے پرکھ لیا تھا۔ وہ جلد مشتعل ہو جانے والا آدمی تھا۔ جو اشتعال سے بے قابو ہو جاتے ہیں اور جو جذبات سے مغلوب ہو جاتے ہیں، اُنھیں مغلوب کرنا مجھے آتا تھا۔
"ہورسا! تم نے جو بکواس کی ہے، اگر اس میں نصف صداقت بھی ہُوئی، تو تم مجھے بلاشُبہ ابھی سے ایک مُردہ انسان سمجھ لو۔" مَیں نے مُسکرا کر کہا اور اس کی طرف دوبارہ تھُوک دیا۔
"اجنبی. . ." یوطابا نے میری طرف دیکھا اور بولنا شروع کیا۔ اس بار اس کے نسوانی لب و لہجے میں عجیب سی تبدیلی آگئی تھی۔ اس کے دیکھنے کے انداز اور طرزِ تخاطب میں میرے لیے احترام تھا۔ "اب جب کہ تم نے اپنا انتخاب ظاہر کر دیا ہے تو تم آج ہی رات ہورسا سے مقابلہ کرو گے۔ . . لیکن مَیں تمہیں ایک بات بتا دوں۔"
جھُولتی ہُوئی باریک مونچھوں کے نیچے اُس کے ہونٹ بھنچ گئے۔
"ہورسا نے اپنے بارے میں جو کچھ کہا ہے، اس میں مبالغہ نہیں ہے۔ یہ بلاشُبہ سارے موآبہ کا شہ زور ہے اور آج تک کوئی بھی حریف اس کی ضرب نہیں سہار سکا۔ ہُرمزد نے اتنی عورتوں کو بیوہ نہیں کیا ہو گا، جتنی کہ ہورسا کے ہاتھوں بیوگی کی زندگی گزار رہی ہیں۔"
"اس طرح تو ہورسا گھاٹے میں رہا۔" کسی کی چہکتی ہُوئی آواز سُنائی دی۔ "یہ اجنبی اپنے پیچھے کوئی بیوہ نہیں چھوڑے گا۔"
اس پر محفل میں قہقہوں کا طوفان اُمنڈ پڑا۔ لوگ ہورسا پر فقرے چُست کرتے ہُوئے بے ہودہ مذاق کرنے لگے جس سے مجھے اندازہ ہُوا کہ یہ سب کے سب عیاش اور پرلے درجے کے احمق ہیں جنھیں وقت کی نزاکتوں کا بھی احساس نہیں رہتا۔
یوطابا نے بڑی مشکل سے اُنھیں خاموش کرایا۔
ہورسا جھُومتا ہُوا، اپنی جگہ پر بیٹھ گیا اور یوطابا کی طرف دیکھتے ہُوئے بولا۔ "چونکہ اس بانکے نے مجھے للکارا ہے، اس لیے قاعدے کے مطابق مقابلے کی نوعیت مجھے اپنی پسند سے ظاہر کرنی ہے۔ یہی بات ہے نا، یوطابا؟" اس نے اپنی شہ زوری کے زعم میں اپنے بادشاہ کو عجیب سے انداز میں مخاطب کیا۔
"بے شک، یہ تمہارا حق ہے۔" یوطابا نے اثبات میں سَر ہلاتے ہُوئے کہا۔ "تم اپنی پسند ظاہر کرو۔"
ہورسا دوبارہ کھڑا ہو گیا اور میری طرف چُبھتی نظروں سے دیکھ کر بولا۔ "مقابلے کے لیے مَیں آگ کا حصار پسند کروں گا، الاؤ روشن کرنے کا حکم دیا جائے۔ مَیں دیکھنا چاہتا ہُوں کہ جلتے پیر دل کے

ساتھ یہ کس طرح رقص کرتا ہے"۔
یوطابا نے ایک معمر آدمی کو اشارہ کیا اور وہ فوراً ہی محفل سے اُٹھ کر باہر چلا گیا۔

ہورسا کے بیٹھنے کے بعد قنبر ایک بار پھر کھڑا ہُوا۔ اس نے باری باری سب پر نظر ڈالی، پھر میری طرف دیکھتے ہُوئے کہا: "اب جب کہ مقابلہ طے پا چکا ہے۔ قاعدے کے مطابق ان لڑاکوں کو ایک ایک معاون چاہیے، جو بوقتِ ضرورت ان کے قریب ہوں گے... اُن کے لیے اسلحہ برداری کریں گے۔ تم میں سے کون اس اجنبی کا معاون بننا پسند کرے گا؟"

محفل پر ایک بار پھر سکوت چھا گیا۔

سب نے نظریں پھیر لیں۔

"ان میں سے کوئی بھی میرا معاون نہیں بننا چاہتا۔" میں نے قنبر کو مخاطب کرتے ہُوئے کہا۔ "ان کے نزدیک میں ایک مُردہ شخص ہوں، یہ چشمِ تصور سے میری لاش دیکھ رہے ہیں اور ایک مُردہ شخص کا معاون بننا کوئی بھی پسند نہیں کرے گا لہٰذا اگر مجھے اجازت دی جائے تو میں اپنے طور پر کسی کو منتخب کر لوں... میں سِلارد کو اپنا معاون منتخب کرتا ہوں۔ سِلارد، وہی شخص ہے، جو میرے جھونپڑے پر پہرہ دے رہا ہے۔"

کمرے کا سکوت بھنبھناہٹ سے تار تار ہو گیا۔

لوگ ایک دوسرے سے مختلف سوالات کرنے لگے۔

"یہ سِلارد کون ہے؟ نام تو اس کا سُنا ہُوا ہے لیکن یاد نہیں آ رہا... نام تو میں نے بھی سُنا ہے لیکن یہ ہے کون؟ کیا کوئی غلام ہے یا آزاد ہے؟ طبقۂ اُمرا میں سے تو ہرگز نہیں ہے، ورنہ ہم اُسے ضرور جانتے ہوتے۔"

سُرخ بالوں والا ایک دُبلا پتلا آدمی اُٹھ کھڑا ہُوا اور مُنہ بناتے ہُوئے بولا: "میں سِلارد کو اور اس کے بارے میں خوب جانتا ہوں۔ وہ یہیں کا باشندہ ہے۔ کاش! وہ ہماری مملکت کا باشندہ نہ ہوتا۔ وہ اوّل درجے کا بدمعاش، مسخرا، اور لالچی ہے۔ شراب اور عورت کا رسیا ہے۔ بدصورت اتنا ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا، ہُرمزد نے کیا سوچ کر اسے پیدا کیا ہے؟ وہ ایک چور اور اُٹھائی گیرا ہے لیکن اس میں ایک صفت ہے کہ وہ جری اور بہادر ہے۔ یہی ایک صفت ہے، جس کی وجہ سے وہ اب تک محفوظ ہے، ورنہ اُسے کب کا پھانسی پر لٹکا دیا گیا ہوتا۔" وہ میری طرف مُڑا۔ "اگر تم اس بدمعاش کو معاون کے طور پر منتخب کر رہے ہو تو ہُرمزد ہی تمہارا حافظ ہے۔ اس بات کا خیال رکھنا کہ کہیں وہ تمہارا یہ واحد بچا کھچا چوغہ بھی نہ اُتار لے جائے۔"

اس پر بڑے زور کا قہقہہ پڑا۔

میں بھی بے حد خوش گوار طبیعت میں تھا اس لیے م[illegible] پن سے اُنھیں جُھک جُھک کر سلام کرنے لگا۔

شاہ یوطابا نے نشست برخاست کا اشارہ کیا اور اپنے محافظ کے ساتھ محفل سے اُٹھ کر چلا گیا۔ باقی لوگ بھی ہنستے اور مذاق کرتے ہُوئے باہر جانے لگے۔

میں دروازے کی طرف بڑھا تو ہورسا نے عقب سے [illegible] کر کہا: "جاؤ اجنبی! اپنی موت کی گھڑیاں گننا شروع کر دو۔ یہ رات تمہاری زندگی کی آخری رات ہے، اب تمہاری زندگی میں [illegible] سورج طلوع نہ ہو گا۔"

میں جھونپڑے میں پہنچا تو سِلارد میرا منتظر تھا۔

مجھے دیکھتے ہی اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں مسرت، ذہانت اور تجسس سے چمکنے لگیں۔

"آہ مالک! آج تم نے پورے عکران کو جھنجوڑ کر رکھ دیا ہے۔ آج شہرِ عکران کی ساری خلقت آگ اور خون کا تماشہ دیکھنے کے لیے ٹوٹ پڑے گی۔ کوئی بھی تمہاری موت کے سنسنی خیز منظر سے محروم رہنا ہرگز پسند نہیں کرے گا۔"

"میری موت...؟" میں نے اُسے سرد نگاہوں سے دیکھتے ہُوئے کہا۔ "کیا میں سمجھ لوں کہ تمہیں ہُرمزد کی نیابت مل گئی ہے، جو یوں بے دھڑک پیش گوئی کر رہے ہو؟"

سِلارد اپنی چیکٹ داڑھی کے بال نوچتے ہُوئے بولا: "یہ نہیں مالک! جیت تمہاری ہی ہو گی اور اُس موٹے بھینسے کو آگ لگ جائے گی۔ مجھے ہورسا سے شدید نفرت ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ ہلاک ہو جائے کیوں کہ اس نے مجھے ایک بار محض اس لیے کوڑے لگوائے تھے کہ میں اُسے سلام کرتے ہُوئے زیادہ نہیں جُھکا تھا۔ مجھے ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی، مالک؟ میں ایک آزاد انسان ہوں، غلام تو نہیں ہوں۔"

میں نے ہنستے ہُوئے اس کا شانہ تھپتھپایا: "تو پھر ٹھیک ہے، اس مقابلے میں تم میرے معاون کے فرائض انجام دو گے اور ہورسا کو جہنم رسید کرنے میں میرا ہاتھ بٹاؤ گے۔" میں نے کہا۔

سِلارد ایک گھٹنے کے بل جُھک گیا...

"تمہاری خدمت کے لیے بسر و چشم حاضر ہوں، مالک۔" سِلارد نے ادب سے کہا۔

"بہت خوب! تو اب سیدھے کھڑے ہو جاؤ۔ آئندہ میرے

آگے اس طرح کبھی نہ جھکنا۔ ہمیشہ مجھ سے برابری سے بات کرو اور جو کچھ کہنا ہو، بے خوف و خطر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہو... بلاشبہ تم مجھے مالک کہتے ہو لیکن میں، اپنے اور تمہارے درمیان کوئی فرق محسوس نہیں کرتا کیوں کہ تم آزاد ہو... اب میں تم سے جو کہوں، اسے غور سے سنو کیوں کہ اس پر حرف بہ حرف عمل کرنا ضروری ہے۔"

میں نے اُسے آئندہ کا لائحہ عمل بتانا شروع کیا۔ وہ بڑی توجہ اور انہماک سے سُنتا رہا اور اثبات میں سر ہلاتا رہا۔

جب میں نے بات ختم کی تو وہ آنکھیں پھاڑتے ہُوئے بولا۔

"تم نے تو اپنی اور میری موت کا بندوبست کر لیا ہے، مالک!"

"ایسا نہیں ہے، سِلارد..." میں نے اس کی ڈھارس بندھاتے ہُوئے کہا۔ "شاید تم بھول گئے ہو کہ ہورسا کی موت کے بعد اس کا مرتبہ اور اختیار میری طرف منتقل ہو جائے گا۔ لوگ پینے پلانے میں مصروف ہوں گے تو اس سے ہمارا کام آسان ہو جائے گا۔ بس شرط صرف یہ ہے کہ تم اپنے حِصّے کا کام ہوشیاری اور ذمے داری سے انجام دو۔ اچھا اب وہ باتیں دُہراؤ جو میں نے تمہیں بتائی ہیں اور جو کام تمہیں انجام دینا ہیں، ان کی تفصیل مجھے سُنا دو۔"

سِلارد کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی: "مالک جو کام بھی تم نے مجھے سونپے ہیں، ان میں سے ایک کے بارے میں تو میں پہلے بھی سوچتا رہا ہوں لیکن وقت کی کمی کے سبب نہ کر سکا... مجھے ملکہ رومہ کے محل میں داخل ہونا ہے اور کسی ملازمہ پر دست درازی کرنا ہے لیکن مجھے یہ بات پسند نہیں اس لیے میں ایسا نہیں کر سکوں گا، مالک!"

"احمق آدمی! تم دست درازی نہیں کرو گے بلکہ تمہیں یہ ظاہر کرنا ہے کہ دست درازی کر رہے ہو اور یہ خیال رکھنا کہ وہ کوئی ملازمہ ہی ہو۔ بس اس کا لباس چاک کر دینا اور اُسے اس حد تک خوفزدہ کر دینا کہ وہ چیخنے لگے۔ وہ جس قدر زور سے چیخے گی اتنا ہی بہتر ہو گا۔ محل کے سارے لوگ اس جگہ جمع ہو جائیں گے اور میرا کام بھی آسان ہو جائے گا۔"

سِلارد کے چہرے پر خوف پھیل گیا۔

وہ اپنے خرگوش جیسے ہونٹ سکیڑ کر بولا: "مالک! شاید تمہیں معلوم نہیں کہ یہاں کسی عورت پر دست درازی کی سزا کتنی بھیانک ہے۔ ایسے اخلاقی مجرم کو کھولتے ہُوئے تیل میں پھینک کر ہلاک کر دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک بات اور بھی ہے۔ ملکہ رومہ نے شہزادی تاشیہ کو بے ہوشی کی دوا دے کر محل کے کسی خفیہ حِصّے میں رکھا ہو گا۔ اُسے تلاش کرنے میں تمہیں یقیناً دیر لگے گی... اس عرصے میں مجھے ملازمہ کے پاس ہی رُکے رہنا ہو گا۔ اتنی دیر میں تو لوگ وہاں پہنچ کر میرا ریشہ ریشہ الگ کر دیں گے۔"

"میں دیر نہیں لگاؤں گا۔" میں نے وعدہ کیا۔ "ملکہ رومہ نے کہا ہے کہ شہزادی تاشیہ بیمار ہے، اس لیے اس نے اُسے چُھپا کر نہیں رکھا ہو گا۔ چُھپانے کی صورت میں لوگ اس پر شک کر سکتے ہیں۔ لہٰذا شہزادی، محل کے کسی ایسے ہی حِصّے میں ہو گی، جہاں وہ دوسروں کی نظروں میں رہے اور لوگ ملکہ رومہ کی نیت پر کسی قسم کا شُبہ نہ کر سکیں۔ میں شہزادی کو لے کر سیدھا اصطبل پہنچوں گا، تم وہاں موجود رہنا... اور دیکھو، گھوڑے بالکل تیار رہنے چاہئیں۔"

"ہُرمزد ہماری حفاظت کرے۔" سِلارد سینے پر ہاتھ لے جاتے ہوئے بولا۔ "گھوڑے چُرانا ایک اور جُرم ہے۔ معلوم ہے، اس کی کیا سزا ہے؟ یہ ایک بدترین سزا ہے۔ بُغدے سے چور کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیے جاتے ہیں پھر اس کی کھال اُتار کر، سانپ کی کھال سے تیار کی گئی بوری میں سی دی جاتی ہے۔ اگر ہم ناکام رہے تو ہمارا انجام یہی ہو گا۔"

"ہم ناکام نہیں رہیں گے، ابھی سے ہاتھ پاؤں مت ڈال دو۔" میں نے اُسے سمجھایا۔

دفعتاً دو مسلح سپاہیوں کی معیت میں ایک افسر جھونپڑے میں داخل ہُوا۔ سِلارد کو نظر انداز کرتے ہُوئے، وہ براہِ راست مجھ سے مخاطب ہُوا: "الاؤ تیار ہے، اجنبی! ہمارے ساتھ اسلحہ خانے چل کر اپنی پسند کے ہتھیار لے لو۔"

میں نے سِلارد کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے کہا: "یہ بھی میرے ساتھ جائے گا۔ یہ میرا مددگار ہے۔"

"جیسی تمہاری مرضی... لیکن جلد کرو۔ ہورسا بہت بے چین ہو رہا ہے۔"

اسلحہ خانے کی طرف جاتے ہُوئے، میں نے سرگوشی میں سِلارد سے پوچھا: "یہ ہورسا کس طرح لڑتا ہے، لڑائی میں کون سا ہتھیار استعمال کرتا ہے؟"

"وہ کانسی کا ایک بھاری کلہاڑا استعمال کرتا ہے، مالک..." سِلارد نے سرگوشی میں جواب دیا۔ "اس کے ساتھ ایک ڈھال بھی استعمال کرتا ہے لیکن چونکہ مقابلے کے دوران اپنے حریف پر حملے ہی کرتا رہتا ہے۔ اس لیے ڈھال استعمال کرنے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ وہ جنونی اور وحشیانہ انداز میں حملے کرتا ہے، مالک... اس لیے ہورسا کے وار سے بچ جانا معجزہ ہی تصور کیا جاتا ہے۔"

اس کا کلہاڑا اس قدر بھاری ہے کہ مجھ جیسا آدمی شاید اُسے اُٹھا بھی نہ سکے۔"

مَیں نے اسلحہ خانے میں سے اپنے لیے کانسی اور چمڑے کی بنی ہُوئی ایک مضبوط ڈھال اور لمبی، دو دھاری تلوار منتخب کی۔ تلوار وزنی تھی لیکن میں اسے بہ آسانی اُٹھا سکتا تھا اور اسے چلانے میں کوئی مشکل بھی پیش نہیں آ سکتی تھی۔

مجھے دُور سے ہجوم غفیر کا شور صاف سُنائی دے رہا تھا۔ یہ آوازیں خون کی پیاسی تھیں۔ ۔ ۔ میرے خون کی پیاسی۔ مَیں نے اپنے لبوں پر تلخ سی مسکراہٹ کی ایک لکیر کھینچ لی کیوں کہ یہ آوازیں تبدیل بھی کی جا سکتی تھیں۔ مَیں مجمعے کی نفسیات سے آگاہ تھا۔ اُنھیں تو صرف خون چاہیے تھا، خواہ وہ کسی کا بھی ہو۔ ۔ ۔ میرا اپنا۔ ۔ ۔ یا ہورسا کا۔ ۔ ۔ مجھے یقین تھا کہ ہورسا کا خون گرتے ہی ان آوازوں کا آہنگ تبدیل ہو جائے گا۔

اُفسر کے جھنجھلانے اور ناک بھوں چڑھانے کے باوجود، مَیں نے تلوار پہ نئے سرے سے دھار چڑھائی۔ اُفسر جلدی جلدی، کی رٹ لگائے جا رہا تھا اور مجھے تاخیر میں لُطف آ رہا تھا۔ ہورسا کو انتظار اور اضطراب کی آگ میں جلنے دینا چاہیے تھا۔ اس طرح تاخیر کا ہر لمحہ میرے حق میں جا سکتا تھا۔

ہم میدان میں پہنچے تو وہاں موجود مجمع دیدنی تھا۔ لگتا تھا، جیسے پورا عکران اُمنڈ آیا ہو۔ ہمیں ہجوم کے درمیان سے گزرنے اور الاؤ کے حصار تک پہنچنے میں خاصے جوکھم سے کام لینا پڑا۔ ۔ ۔ مجمع آسمان سَر پر اُٹھائے ہوئے تھا۔ کچھ لوگ مجھ پر فقرے بازی کر رہے تھے تو کچھ میری حوصلہ افزائی بھی کر رہے تھے لیکن زیادہ تر لوگوں کے طنز کا نشانہ ہورسا ہی بن رہا تھا۔

آگ دہکائی جا چکی تھی اور مزید دہکائی جا رہی تھی۔ سپاہی آگ کے دائرے پر لکڑیاں اور مچھلی کا تیل لا لا کر ڈال رہے تھے، جس سے آگ کچھ زیادہ ہی بھڑک اُٹھی تھی اور شعلے میری کمر تک آ رہے تھے۔

مَیں اور سِلارد الاؤ کے قریب پہنچ کر رُک گئے۔

یوطابا کا تخت بھی لایا جا چُکا تھا۔ ۔ ۔

وہ اب بھی بُری طرح پینے میں مصروف نظر آیا۔ گاہے گاہے وہ اپنے دائیں بائیں موجود مصاحبین سے بات بھی کر لیتا تھا۔ یوطابا کے تخت کے پیچھے ایک اور تخت بھی تھا جس پر بھاری لبادے میں ملبوس ایک عورت بیٹھی ہُوئی تھی۔ اس کے چہرے پر نقاب تھی اور وہ اپنے قریب موجود عورتوں سے باتوں میں معروف تھی۔

ایک بار اس کا کھنکتا ہُوا قہقہہ فضا میں بلند ہُوا تو میں نے پہچان لیا کہ یہ ملکہ رومہ ہے۔

یک بہ یک مجمعے کا شور بڑھ گیا۔

ہورسا نمودار ہوا۔ ۔ ۔

وہ شعلوں کو پھلانگ کر دائرے میں داخل ہو گیا۔ مجمعے کے تیور اور وہ منظر اس قدر ہیجانہ تھا کہ میری طبیعت عجیب سی ہو گئی۔

مَیں نے غور سے ہورسا کی طرف دیکھا۔

اس کے سر پر خود نہیں تھی۔ اس کا گنجا سر شعلوں کی روشنی سے چمک رہا تھا۔ وہ ننگے پاؤں تھا لیکن جسم پر سُرخ رنگ کا کھُلا لبادہ تھا۔ اس کے بائیں ہاتھ میں ایک چھوٹی گول ڈھال تھی اور دائیں ہاتھ میں، جس پر کسی پُرانے زخم کا مندمل نشان بھی تھا، اُس نے وزنی کلہاڑا تھام رکھا تھا۔ مجھ سے نگاہیں چار ہوتے ہی اس نے جارحانہ انداز میں کلہاڑا لہرانا شروع کر دیا، جیسے مجھے اپنی حرکات سے مرعوب کرنا چاہتا ہو۔

ہورسا، کلہاڑا لہراتے ہُوئے داد طلب نظروں سے مجمعے کی طرف دیکھنے لگا۔ اُس نے کلہاڑے کو کئی بار اپنے سر سے اُوپر گھُمایا تھا۔ میری نگاہ ہورسا سے زیادہ اس کے کلہاڑے پر تھی۔ ایک لمبے دستے والا کلہاڑا تھا جس کے ذریعے حریف کی رسائی سے دُور رہتے ہُوئے وار کیا جا سکتا تھا۔ کلہاڑے کا پھل دو طرفہ تھا اور اس پر منعکس ہوتی ہُوئی شعلوں کی چمک آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی۔

مَیں اپنے طور پر مقابلے کا ڈھب متعین کرنے لگا۔

مَیں نے سوچا کہ زیادہ تر اُسی کو وار کرنے کا موقع دوں گا اور ہر وار خالی دوں گا پھر اسی دوران موقع دیکھ کر اپنا کام کر جاؤں گا۔ یہ میری اپنی منطق تھی۔ باقی آیندہ صورتِ حال پر منحصر تھا۔

ہورسا نے اپنا سُرخ لبادہ اُتارا اور دُور پھینک دیا۔ اب وہ کمر تک بے لباس تھا۔ اس کا ڈھول جیسا سینہ، گھنے سیاہ بالوں سے ڈھکا ہُوا تھا۔ اگرچہ وہ قد میں مجھ سے چھوٹا تھا اور جسم بھی میرے جیسا نہیں تھا تاہم مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ طاقت میں مجھ سے کسی طرح بھی کم نہیں ہے اور میرا بہترین حریف ثابت ہو سکتا ہے۔

دفعتاً وہ کلہاڑے کے دستے کے بل جُھکا اور لپکتے ہُوئے شعلوں میں میری طرف استہزائی نظر سے دیکھ کر بولا: "تم نے شیر کے مُنہ میں ہاتھ دیا ہے، اجنبی! تمھاری زندگی کے دن پُورے ہو چکے ہیں۔ سر اُٹھا کر اچھی طرح آسمان دیکھ لو، یہ تمھاری زندگی کی آخری رات ہے پھر میں تمھارا سَر تن سے جُدا کر کے تمھارے آقا

سُرخ شیطان کے پاس روانہ کر دوں گا۔ ہورسا کا تحفہ!" یہ کہہ کر اُس نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا۔

مجمع بُری طرح چیخ چلّا رہا تھا۔

شاہ یوطابا کی بے چینی بھی بڑھ گئی تھی۔

مَیں نے ہورسا کی لاف و گزاف نظر انداز کرتے ہُوئے قریب ہی کھڑے سِلارد سے سرگوشی کی: "جو کچھ مَیں نے کہا ہے، اسے یاد رکھنا۔ اس پورے قضیے میں وقت کا عنصر بے حد اہم ہے۔ وقت آگے پیچھے ہُوا تو سمجھو کہ مارے گئے۔ سارا کھیل صحیح وقت پر، صحیح کام ہونے کا ہے۔ ہورسا کو ہلاک کرتے ہی میں آرام کے لیے تخلیہ چاہوں گا اور اسی بہانے میں تمھارے قریب پہنچ جاؤں گا۔ جیسے ہی مجھے نسوانی چیخ سُنائی دے گی، مَیں فوراً محل میں جا کر شہزادی تاشیہ کو اُٹھا لاؤں گا پھر تمھیں کیا کرنا ہے، وہ تو تمھیں معلوم ہے نا؟"

"مَیں فوراً بھاگ اُٹھوں گا، مالک!" جواب میں سِلارد کی سرگوشی سُنائی دی۔

"ٹھیک ہے۔ میرا یہ کام کر دو، پھر تم دیکھو گے کہ گھاٹے میں نہیں رہے ہو۔" مَیں نے کہا اور سِلارد، الاؤ کے قریب ہوتے ہُوئے دوسری طرف پھلانگ گیا۔ مَیں نے ہورسا پر نگاہ رکھتے ہُوئے تلوار اُٹھا کر یوطابا کو سلامی دی۔ میری یہ احتیاط اور پیش قدمی ہی کام آئی۔ ہورسا چیخ مار کر وحشیانہ انداز میں میری طرف جھپٹا تھا۔ لپکتے شعلوں کی تیز روشنی میں، اس کے کلہاڑے کے تیز دھار پھل کی چمک میرے سر پر لہرائی تھی۔ اگر میں نے اپنا سر فوراً ہی ایک طرف نہ ہٹا لیا ہوتا تو شعلوں کی سُرخی میں، میرے خون کی سُرخی بھی شامل ہو گئی ہوتی۔

اس نازک ترین لمحے میں، مجھے سِلارد کی ڈوبتی اُبھرتی سانس اور پھر اس کی گھُٹی گھُٹی سی آواز سُنائی دی: "میرے مالک کو فتح نصیب کر، اُہرمزد! مَیں صدقِ دل سے وعدہ کرتا ہُوں کہ آیندہ پُورے ایک سال تک چوری نہیں کروں گا۔ مَیں قسم کھاتا ہوں!"

★★

مقابلہ میں اپنے ڈھب سے کر رہا تھا۔ ہورسا دیوانہ وار مجھ پر حملے کر رہا تھا۔ مَیں اُس کے ہر حملے کو، وار خالی دے کر ناکام بناتا رہا۔

مَیں نے اَب تک اپنا دفاع ہی کیا تھا۔ اس پر حملہ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس صورتِ حال سے ہورسا کچھ زیادہ ہی جوش میں آ گیا۔ اُس نے میرے دفاع کو میری کمزوری اور بے طاقتی پر محمول کیا، چنانچہ وہ اور شد و مد سے وار کرنے لگا۔ اِدھر مجمع تھا کہ اس کی چیخ و پکار سے آسمان میں شگاف ہو رہا تھا۔ عکران کے لوگ حلق پھاڑ پھاڑ کر اپنے شہ زور ہورسا کو بڑھاوا دے رہے تھے۔ وہ مطالبہ کر رہے تھے کہ ہورسا میرے ٹکڑے اُڑا دے۔ ۔ ۔ اور اگر مَیں نے ساری توجہ اپنے دفاع پر مرکوز نہ کی ہوتی تو یقیناً وہ میرے ٹکڑے ہی اُڑا دیتا۔

پھر مجمع میری بُزدلی اور پست ہمتی پر لعن طعن کرنے لگا۔ اُن کے نزدیک میرا دفاع، میری کمزوری پر دلالت کرتا تھا۔

ہورسا مجھے کئی بار رگیدتا ہُوا آگ کے قریب لے گیا۔ اتنے قریب کہ شعلوں کی تپش سے مجھے اپنا جسم جُھلستا ہُوا محسوس ہُوا لیکن مَیں ہر بار بڑی خوب صُورتی سے جھکائی دے کر اس کے دباؤ سے نکل آتا۔ اگر ہورسا اشتعال کی کیفیت میں نہ ہوتا اور ٹھنڈے دماغ سے کام لیتا تو شاید اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا لیکن اس نے عقل و تدبر کو ایک طرف رکھ دیا تھا اور اندھا دُھند کلہاڑا گھُما رہا تھا۔

سچ تو یہ ہے کہ مجھے اپنے دفاع سے مہلت ہی نہیں مل رہی تھی کہ اس پر حملہ آور ہونے کی سوچتا۔ میری ایک ذرا سی چُوک، غلط اندازہ یا غلط حرکت میرے کاسہ سر کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیتی یا پھر میں اپنے جسم کے کسی عضو سے محروم ہو جاتا۔ یہ دیکھ کر مجھے مزید سنبھل کر اور پورے ہوش و حواس کے ساتھ اس کا ہر وار روکنا یا خالی دینا پڑ رہا تھا۔ اسی کوشش میں ہر بار آگ کے قریب پہنچ جاتا، جو میرے لیے دُہری مصیبت کا باعث بنتی۔

ہورسا میری پسپائی اور بے بسی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس کے جبڑے کسی خون آشام بھیڑیے کی مانند کھُلے ہُوئے تھے اور دہانے سے سفید دانتوں کی قطار جھانک رہی تھی۔ وہ وقتاً فوقتاً مجھ پر فقرے کستا، میری تذلیل کرتا اور بجائے دفاع کرنے کے حملہ آور ہونے کی دعوت دیتا لیکن میں جذباتی یا مشتعل نہیں ہُوا کیوں کہ اسی میں میری سلامتی تھی۔ میں جانتا تھا کہ دفاع کرتے رہنے میں ہی میری عافیت ہے۔ وہ اپنا کھیل، کھیل رہا تھا اور مَیں اپنے کھیل میں معروف تھا۔

مقابلہ ہوتے کافی دیر ہو گئی اس لیے مجمعے کا رویّہ بھی تبدیل ہونے لگا۔ اَب لوگ میری بُزدلی نظر انداز کر کے ہورسا کے پیچھے پڑ گئے تھے۔ اُنھیں حیرت تھی کہ اُن کا شہ زور ابھی تک مجھے خاک و خون میں کیوں نہیں نہلا سکا، ایک طرح سے یہ بھی اُس کی جاں بازی پر ایک دھبہ تھا۔ اجنبی کو ہلاک کرنے میں اتنی دیر۔ ۔ ۔ ہجوم کی، خون کی پیاس نکتۂ عروج کو پہنچ گئی تھی۔ تماشائیوں کے ضبط کا دامن چھُوٹ رہا تھا پھر وہ برملا ہورسا کو بُرا بھلا کہنے لگے۔ شاید اُس

نے کسی کو ہلاک کرنے میں اتنا وقت کبھی نہیں لیا تھا۔"

اِدھر میں اپنے ضبط اور برداشت کی انتہائی منزل پر تھا۔ مجھے مناسب وقت اور مناسب گھڑی کا انتظار تھا، میں ہورسا پر بھرپور ضرب لگانے کے لیے وقت کا انتظار کر رہا تھا۔

... پھر وہ وقت بھی آ گیا۔

میں نے ہورسا کو گھبراہٹ کا شکار، تھکا ہُوا اور مضمحل محسوس کیا۔ وہ اپنے حملوں کی ناکامی پر بُری طرح جھلا گیا تھا، اوپر سے مجمعے کی لعن طعن جلتے پر تیل کا کام کر رہی تھی۔ وہ بُری طرح کھسیا رہا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا، اُس کے سر اور پیشانی پر پسینے کی بوندیں اُبھر آئی تھیں۔ شاید اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے فنا کرنے کے لیے کیا کرے۔ اُس نے حرب، ضرب اور گالی گلوچ سبھی کچھ آزما ڈالا تھا لیکن مجھے ذرا بھی تاؤ نہیں آیا۔ میں نے یہ سب کچھ مقدر سمجھ کر قبول کر لیا تھا۔ آخر ہورسا ہانپتا کانپتا ہُوا، پیشانی اور آنکھ پر سے پسینہ پونچھتا ہُوا، مجھ سے دُور جا کھڑا ہُوا۔

میں نے اپنے لبوں پر زہریلی مسکراہٹ سجالی... پھر ایک نظر مجمعے پر دوڑانے کے بعد براہِ راست ہورسا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہُوئے کہا: "کیا بات ہے مداری! حملہ کیوں نہیں کرتے؟"

یہ سنتے ہی ہورسا نے ایک زوردار چیخ ماری اور کلہاڑا بلند کرتے ہُوئے مجھ پر جھپٹ پڑا۔ اُس کا یہ حملہ پہلے حملوں کے مقابلے میں شدید تھا۔ میرے لیے، خود کو بچانا دُشوار ہو گیا۔ وہ جنونی کیفیت میں مجھ پر کلہاڑا برسا رہا تھا۔ مجمعے میں ایک بار پھر جان پڑ گئی تھی اور وہ ایک بار پھر ہورسا کے ہم نوا بن گئے تھے۔

میں ہورسا کے وار روکتا، جھکائی دیتا ہُوا ایک بار پھر آگ کے قریب پہنچ گیا۔ دفعتاً مجھے محسوس ہُوا کہ ہورسا کے حملوں میں پہلے جیسی جان اور قوت نہیں رہی۔ وہ محض بھرم قائم رکھنے کے لیے کلہاڑا گھما رہا تھا، اندھا دُھند، چاہے وہ میرے جسم پر لگے یا نہ لگے۔ اب اس کا سینہ دھونکنی بنا ہُوا تھا اور سارے جسم پر پسینہ بہہ رہا تھا۔

ہورسا اپنے حصّے کا کھیل، کھیل چکا تھا، اب میری باری تھی۔ مجھے اپنے کھیل کا آغاز کرنا تھا اور اُس کے ساتھ ہی اختتام بھی کرنا ضروری تھا۔

ہورسا نے بچی کھچی قوت کا سہارا لے کر، اپنے جسم کا پُورا زور استعمال کیا اور مجھ پر حملہ آور ہُوا۔ میں نے پھرتی سے خود کو جھکایا اور ایک طرف ہٹتے ہُوئے، بھرپُور لات، اس کی کمر پر جمادی۔ ہورسا مُنہ کے بل شعلوں پر گر پڑا لیکن اگلے ہی لمحے حیرت انگیز پھرتی سے دوبارہ اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اُس کا کلہاڑا کہیں دُور جا گرا تھا، ہاتھ میں صرف ڈھال رہ گئی تھی، جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ اُسے استعمال کرنے کی کبھی نوبت ہی نہیں آتی تھی۔ ہورسا کے ستارے گردش میں آ گئے تھے اور اُسے اپنے دفاع کے لیے اُس ڈھال کا سہارا لینا پڑ رہا تھا۔

مجمعے کی چیخ و پکار دیوانگی کو چھُونے لگی۔

مقابلے کا یہ غیر متوقع رُخ اُنھیں پسند آیا تھا۔ اس پورے خونی کھیل کے دوران پہلی بار کسی حریف نے خاک چاٹی تھی اور شعلوں نے اس کے جسم کو چھُوا تھا۔ میں نے سکون سے ہورسا کا جائزہ لیا۔ اس کا چہرہ جھلس گیا تھا۔ اس کے پائنچوں نے آگ پکڑ لی تھی جو کھُلے میدان کی تیز ہوا میں لمحہ بہ لمحہ پھیلتی جا رہی تھی لیکن ہورسا آگ اور اذیت سے بے پروا مجھ پر نظر جمائے ہُوئے تھا۔ وہ ڈھال سنبھالے، دفاعی انداز میں تنا کھڑا تھا اور متحیر تھا کہ میں اُس پر حملہ کیوں نہیں کر رہا ہوں۔

آگ پائنچوں سے اس کی کمر تک پہنچ گئی اور اس کے ساتھ ہی فضا میں گوشت جلنے کی بُو پھیل گئی۔ مجھے پہلی بار ہورسا کے چہرے پر کرب کے آثار دکھائی دیے لیکن وہ پھر بھی ٹس سے مس نہ ہُوا۔

"کیا حال ہے، دوست! ہکران کے لوگوں نے اس سے پہلے اپنے کسی جانباز کی ایسی درگت بنتے ہُوئے نہیں دیکھی ہو گی، اور تم تو پُورے موآبہ کے شہ زور ہو:" میں نے مسکراتے ہُوئے کہا۔

جواب میں ہورسا کے حلق سے ایک غراہٹ بلند ہُوئی اور اُس نے ڈھال میرے مُنہ پر کھینچ ماری لیکن میں نے سر ایک طرف کر کے خود کو بچا لیا۔ میرا دُشمن ایک دفاعی ہتھیار سے بھی محروم ہو گیا تھا۔

شعلوں نے ہورسا کے پورے جسم کا احاطہ کر لیا تھا اور فضا میں جلتے گوشت کی بُو پھیل رہی تھی۔ اس نے شعلوں کے گرداب سے نکلنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے مُنہ سے ایک معمولی سی سِسکی یا کراہ بھی نہیں نکلتی تھی، البتہ چہرے پر زلزلے کے آثار طاری تھے۔

ہورسا اگرچہ عقل و تدبر سے کورا تھا لیکن وہ بہرحال ایک جری اور غیور حریف ثابت ہُوا تھا۔ ایسے شخص کو ایک عام دُشمن کی طرح برتنا قرینِ انصاف نہیں تھا۔ تقاضا یہ تھا کہ میں اُس کی موت کو آسان بنا دیتا۔ چنانچہ میں نے پورے مقابلے میں اس پر

اپنی تلوار پہلی اور آخری بار بلند کی اور ایک بھرپُور ضرب کے ساتھ اس کے سر کو سینے تک دو حصّوں میں تقسیم کر دیا۔

میں نے تلوار کھینچی تو اس کے جسم سے خون کا فوارہ اُبل پڑا اور اُس کا بھاری بدن دہکتے شعلوں میں جا گرا۔ چٹ چٹ کی آوازوں کے ساتھ اس کے جسم پر آتشی بگولے رقص کرنے لگے... فضا میں جلتے گوشت کی بدبُو کچھ اور بڑھ گئی۔

میں نے ہورسا کا کلہاڑا تلاش کر کے اُٹھا لیا پھر اپنی تلوار گھاس پر رگڑ کر صاف کی۔ اس کے بعد دائرے کے دوسری طرف جا کر ہورسا کا سُرخ لبادہ اُٹھا کر اپنے جسم پر ڈال لیا۔ ایک ہاتھ میں اپنی تلوار اور دوسرے ہاتھ میں ہورسا کا کلہاڑا اُٹھا کر، سر سے بلند کر کے میں یوطابا کی طرف رُخ کر کے تعظیم کے انداز میں جھک گیا تھا...

مجمع، جو چند لمحے پہلے کے خونیں لمحات میں گنگ ہو کر رہ گیا تھا، یک بہ یک چیخنے لگا۔

لوگ میری تعریف و توصیف اور مدح سرائی میں چیخ رہے تھے... میں نے ان کی خون کی پیاس بجھا دی تھی۔ ان کے سفاک اور وحشیانہ جذبے کی تسکین کر دی تھی۔

یکایک مجھے ایک خیال آیا اور میں نے مُڑ کر اُس طرف دیکھا، جہاں سلارد کھڑا ہُوا تھا۔

اب وہ اپنی جگہ پر نہیں تھا...

میں نے پورے مجمعے کا جائزہ لیا لیکن وہ کہیں بھی نظر نہ آیا۔ گویا وہ طے شدہ منصوبے کے مطابق اپنے حصّے کا کام انجام دینے کے لیے جا چکا تھا... میں نے اُس سے کہا تھا کہ وقت، ایک اہم عنصر ہے، ہماری کامیابی کا دارومدار، بروقت اقدام پر ہے۔ وقت کے آگے پیچھے ہونے سے ہمارا کام بگڑ بھی سکتا تھا۔ چنانچہ اب میرے لیے بھی تاخیر کرنا کسی طور مناسب نہیں تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہاں سے نکلا کس طرح جاتا۔ اس قسم کے خونیں مقابلوں کے بعد وہاں کی روایات کا مجھے علم نہیں تھا۔ اگر جشنِ رقص و سرود کی ٹھن گئی تو میرا استیاناس ہو جانا ضروری تھا۔

اسی وقت شاہ یوطابا کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"سیدھے کھڑے ہو جاؤ، اجنبی! تم مبارک باد کے مستحق ہو، تم نے ایک قوی دُشمن کو زیر کیا ہے۔"

میں سیدھا کھڑا ہُوا تو ایک بار پھر غلغلہ مچا اور اس کے درمیان شاہ یوطابا نے بلند آواز سے دوبارہ کہا: "دستور کے مطابق اب ہورسا کی دولت، جائداد، مکان اور عورتیں غرضیکہ ہر چیز تمھاری ہے:"

میں تعظیماً دوبارہ جھکا...

پھر سیدھا ہوتے ہُوئے بولا: "شاہ یوطابا پر ہُرمزد اپنی برکتیں نازل کرے، میں خود کو بے حد تھکا ہُوا محسوس کر رہا ہوں، اس وقت مجھے آرام اور نیند کی سخت ضرورت ہے:"

"قنبر، ہورسا کے مکان تک تمھاری رہ نمائی کرے گا۔ ہم کل تم سے ملاقات کریں گے اور سُرخ شیطان کے شر سے بچنے کے لیے تمھاری تجاویز سُنیں گے۔" اس کے ساتھ ہی یوطابا نے مجمعے کو منتشر ہونے کا اشارہ کر دیا۔

قنبر کے آنے تک میں اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔

مجمع منتشر ہُوا تو قنبر میرے پاس آیا اور میرے شانے پر تھپکی دیتے ہُوئے مسکرا کر بولا: "میری طرف سے مُبارک باد قبول کرو، تمھیں، ایک نئی زندگی ملی ہے، ہورسا کا کوئی حریف آج تک اپنا سر سلامت نہیں لے جا سکا تھا:"

"یہ تجویز تمھاری ہی پیش کردہ تھی۔ ہورسا واقعی ایک سخت جان اور مشکل حریف تھا لیکن اُس میں عقل کی کمی تھی۔ ویسے قنبر:" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہُوئے کہا: "کیا اس تجویز کے پیش کرنے میں تمھاری یہ حکمت نہیں تھی کہ مجھ سے پیچھا چھُوٹ جائے اور شہزادی تاشیہ اور شہنشاہِ احباز بھی ناراض نہ ہوں؟"

"اب گزری باتوں کے ذکر سے کیا حاصل؟ اُن باتوں کو بھول جاؤ۔ اس وقت تمھاری حیثیت فاتح کی ہے اور شاہ یوطابا تم سے بے حد خوش ہے۔" قنبر نے بڑی خوب صورتی سے میری بات ٹال دی۔

ہم میدان سے گزر کر تاریک گلیوں میں چل رہے تھے... کافی آگے جا کر بڑے مکانوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ میں نے ایک محل نُما مکان کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے پوچھا: "یہ کس کا مکان ہے؟"

"یہ ملکہ رومہ کا محل ہے۔ اس مکان میں کبھی بھُول کر بھی داخل ہونے کی کوشش نہ کرنا۔ وہ ایک خونخوار عورت ہے، نہ صرف خونخوار بلکہ مردم خور بھی ہے۔" قنبر نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

ملکہ رومہ کے محل سے کچھ فاصلے پر ہورسا کا حویلی نُما مکان تھا۔ قنبر نے دروازے پر لے جا کر چھوڑ دیا۔

"جاؤ آرام کرو دوست! یہ تمھاری بدقسمتی ہے کہ ہورسا شادی شدہ نہیں تھا۔ بہرحال شہر میں اس کی عورتیں موجود ہیں، تم جب چاہو، اُن سے مل سکتے ہو۔ وہ بھی بے چینی سے تمھاری

منتظر ہوں گی۔"

قنبر نے ایک بار پھر میری پیٹھ پر تھپکی دی اور واپس چلا گیا۔ اُسے دِکھانے کے لیے میں دروازے کی طرف بڑھا لیکن پھر ایک ستون کی اوٹ میں چھُپ گیا۔ جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہو گیا، میں وہیں کھڑا رہا۔

جب مجھے یقین ہو گیا کہ قنبر بہت دُور جا چُکا ہو گا تو مَیں ستون کی اوٹ سے نکل آیا۔ میرا رُخ ملکہ رودمہ کے محل کی طرف تھا۔ . . اور پھر سب کچھ منصوبے کے مطابق ہی عمل میں آیا۔ خُدا کا شکر ہے کہ ذرا سی بھی گڑبڑ نہیں ہُوئی اور میں شہزادی کو ملکہ رودمہ کے محل سے نکال لے جانے میں کامیاب ہو گیا۔

★★

کوئی مجھے بُری طرح جھنجوڑ رہا تھا۔ . .

پھر کسی کی چیختی ہُوئی آواز سُنائی دی: "مالک، مالک . . ."

مَیں نے آنکھیں کھول دیں۔ . . سِلارو میرے اوپر جھکا ہُوا تھا۔ مَیں ناراضگی سے بولا: "کیا بات ہے، کیوں شور مچا رہے ہو؟"

"مالک، تم سوتے میں بُری طرح چیخ رہے تھے اور درسیلا نامی کسی عورت کا نام لے کر بار بار پکار رہے تھے۔" سِلارو مسمسی صورت بنا کر بولا: "مجھے خوف ہُوا کہ کہیں کوئی تمہاری چیخ سُن کر اس طرف نہ آ جائے۔"

مَیں آنکھیں ملتا ہُوا اُٹھ بیٹھا۔

سورج ابھی نہیں نکلا تھا، ہر طرف صبح کاذب کے آثار ہویدا تھے۔ آسمان پر اس وقت بھی دُھند چھائی ہُوئی تھی۔ ہم ایک دلدلی علاقے میں تھے اور سرکنڈوں کے درمیان ایک صاف سُتھری جگہ آرام اور شب بسری کے لیے رُک گئے تھے۔

رات کے پچھلے پہر کی سرد ہَوا نرکلوں کے درمیان سرسرا رہی تھی اور مجھے گزرا ہُوا واقعہ یاد آ رہا تھا۔

منصوبہ حسبِ توقع کامیاب رہا تھا۔ . . سِلارو نے میری ہدایت پر عمل کرتے ہُوئے اپنے حصّے کا کام بڑے احسن طریقے سے انجام دیا تھا۔ البتہ اس سلسلے میں ہمیں خون سے ہاتھ رنگنے پڑے تھے۔ فرار ہوتے وقت مجھے دو اور سِلارو کو ایک محافظ ہلاک کرنا پڑا تھا پھر اس کے بعد راستہ صاف تھا۔ ہم عکران کی حدود سے نکل آئے تھے، اس کے بعد دُھند اور رات کی سیاہی نے ہمیں اپنی پناہ میں لے لیا تھا۔

شہزادی تاشیہ ہمارے ساتھ تھی اور اُس کی حالت اچھی نہیں تھی۔ وہ مسلسل بے ہوشی کی کیفیت میں تھی۔ میرا خیال دُرست ہی نکلا۔ تاشیہ کو دیکھنے سے پتہ چلتا تھا کہ اُسے کوئی خواب آور دوا [illegible] آہستہ آہستہ سرایت کرنے والا زہر دیا جا رہا تھا۔ اگر تاشیہ کچھ د[illegible] اور ملکہ رودمہ کے قبضے میں رہ جاتی تو اس کی ہلاکت یقینی تھی اور [illegible] یہی سمجھتے کہ وہ کسی شدید بیماری کے باعث مر گئی ہے۔

ہورسا سے مقابلے کے بعد مَیں بے حد تکان محسوس کر [illegible] تھا۔ دو رات سے میں سویا بھی نہیں تھا پھر اس کے علاوہ تاشیہ کی حالت بھی کچھ اچھی نہیں تھی۔ اُسے گھوڑے پر سنبھالنا مشکل رہا تھا چنانچہ یہی بہتر سمجھا گیا کہ عکران سے کافی فاصلے پر نکل آ[illegible] کے بعد آرام کر لیا جائے تاکہ اگلی صبح سفر کے لیے تازہ دم ہو سکیں۔ ایک مناسب اور محفوظ جگہ دیکھ کر ہم گھوڑوں سے اُتر آئے تھے۔

گھوڑوں سے اُترتے ہی مَیں ایسا بے سُدھ ہُوا تھا کہ مجھے کچھ ہوش ہی نہیں رہا تھا اور اب جب کہ کچھ دیر بعد صبح ہونے وا[illegible] تھی . . . سِلارو مجھے جھنجوڑ کر جگا رہا تھا۔

مَیں نے جماہی لی اور اطراف کا جائزہ لینے لگا۔

سرکنڈوں کے درمیان ننھی مُنّی چڑیاں پھُدکنے لگی تھیں۔ قریب ہی تینوں گھوڑے ایک درخت سے بندھے، گھاس پر مُنہ [illegible] رہے تھے۔ میری نگاہ گھوم پھر کر سِلارو پر جم گئی: "مَیں ایک ڈراؤ[illegible] خواب دیکھ رہا تھا۔ کیا مَیں زور زور سے چیخ رہا تھا؟" مَیں نے پوچھا۔

"کوئی ایسی ویسی چیخ تھی وہ، میرا تو کلیجہ دہل گیا تھا۔ . . [illegible] کے مارے مجھے یوں بھی نیند نہیں آ رہی تھی کہ تمہاری چیخ نے تو [illegible] ہی خشک کر دیا۔ اندھیری رات ہے، مَیں نے سوچا کہیں کسی دُشم[illegible] نے تو نہیں آ لیا۔ اُٹھ کر دیکھا تو تم گہری نیند سو رہے تھے لیکن چی[illegible] جا رہے تھے۔ مالک یہ درسیلا کون ہے، جس کا نام لے کر تم چیخ [illegible] رہے تھے؟"

"میرا سابقہ آج تک اس نام کی کسی ہستی سے نہیں پڑا۔ مَیں خود حیران ہُوں کہ یہ نام میری زبان پر آیا کیسے؟"

"تم نے خواب میں کیا دیکھا تھا؟" سِلارو نے پوچھا۔

"مجھے کچھ یاد نہیں، ذہن اس سلسلے میں بالکل خالی ہے لیکن ٹھہرو! شاید وہ کسی عورت کی شبیہہ تھی، جو سر سے پیر تک سفید لبادے میں لپٹی ہُوئی تھی۔ اُس کے ہاتھ میری طرف بڑھا ہُوئے تھے اور اس کے ہاتھوں سے خون ٹپک رہا تھا۔ اُس نے خون آلود ہاتھ میرے گلے میں حمائل کرنا چاہے تھے کہ میری چیخ نکل گئی۔"

"تو پھر درسیلا اسی عورت کا نام ہو گا؟"

"مَیں وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔ بس یہ نام خود بخود میرے مُنہ سے نکل گیا تھا۔ . . شہزادی تاشیہ کا کیا حال ہے؟" مَیں نے خوابید[illegible]

شہزادی کی طرف دیکھتے ہُوئے کہا: "یہ میری چیخ پر نہیں جاگی؟"

سِلارد بے بسی سے سر ہلاتے ہُوئے بولا: "اس کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی، مالک! یہ کسی شیر خوار کی مانند گہری نیند میں ڈوبی ہُوئی ہے لیکن شیر خوار بچے بھی اتنی دیر نہیں سوتے اور وہ بھی چیخ پکار سُن کر جاگ پڑتے ہیں۔ میرا خیال ہے، اسے جگا دینا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ یہ سوتی ہی رہ جائے۔ اس حالت میں یہ نیند، ابدی نیند میں بھی تبدیل ہو سکتی ہے۔"

مَیں اُٹھ کر تاشیہ کے قریب گیا۔

وہ میرے سُرخ لبادے میں، جو کبھی ہورسا کا ہُوا کرتا تھا، لپٹی سو رہی تھی تاہم اس کا چہرہ لبادے سے باہر تھا۔ اس کے سُرخی مائل بھورے بال بے ترتیب تھے اور مُنہ کھلا ہُوا تھا۔ چہرے پر تشنج کی سی کیفیت طاری تھی اور سانس کی آمد و رفت معمول کے مطابق نہیں تھی۔ آنکھوں کے نیچے سُرخ جھُرّیاں اور چتیاں سی پڑی ہُوئی تھیں۔ اُس کی سیمیں پیشانی پر پسینہ چمک رہا تھا۔ مَیں اُس کے چہرے پر جھُک گیا اور سُرخ لبادے کے ایک کونے سے اس کا پسینہ پونچھ دیا۔

یہ تاشیہ، میرے سامنے لیٹی ہُوئی تاشیہ، اَب وہ تاشیہ نہیں تھی، جو چشمے کے کنارے، اس سرزمین پر میری آمد کی پہلی شام کو ملی تھی۔ یہ تاشیہ، وہ تاشیہ بھی نہیں تھی، جس نے ایک بھرپُور چاندنی رات میں ہنستے کھیلتے میرے ساتھ حکران تک سفر کیا تھا۔۔۔ بلکہ یہ تاشیہ، ایک ایسی تاشیہ تھی جس کا گلاب جیسا چہرہ کمھلا گیا تھا اور وہ قریب المرگ تھی۔

مَیں خود کو اور ملکہ رومہ کو کوسنے لگا۔

تاشیہ کی اس حالت کے ذمّے دار ہم دونوں ہی تھے۔۔۔ ملکہ رومہ نے اُسے اس حال تک پہنچایا تھا اور مَیں نے اس کی بڑی دیر بعد خبر لی تھی۔

سِلارد میرے پاس آیا اور تاشیہ کی طرف دیکھتے ہُوئے بولا۔ "زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، مالک! میں ایک ایسی دَوا تیار کر سکتا ہُوں، جس سے شہزادی کی طبیعت کافی حد تک سنبھل جائے گی۔ دَوا پیتے ہی اسے قے ہو گی اور معدے سے وہ سارا زہر خارج ہو جائے گا جس کی وجہ سے اس کی یہ حالت ہو رہی ہے۔ میرا خیال ہے، اس کام میں تاخیر نہیں کرنی چاہیئے شہزادی کی جان کو خطرہ ہے۔"

"یہ تم طبیب کب سے بن گئے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

اُس نے جواب دینے میں وقت ضائع نہیں کیا بلکہ فوراً ہی گھوڑوں کی طرف گیا۔

ایک گھوڑے پر بیٹھ کر وہ کہیں چلا گیا۔۔۔

کافی دیر بعد واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں کانسی کا ایک چھوٹا سا برتن تھا۔

"جب مجھے یقین ہو گیا مالک! کہ تم ہورسا پر فتح پا لو گے، تو مقابلہ ختم ہونے سے پہلے ہی میں ہورسا کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔ میں نے اس کے گھر سے کچھ چیزیں اکٹھا کیں اور ہر مزد کی قسم۔۔۔ یہ چوری نہیں کہلائی جا سکتی کیوں کہ یہ تمام چیزیں تمھاری ملکیت بننے والی تھیں، میرے مالک کی ملکیت۔۔۔ اور تمھارا خاص خادم ہونے کی وجہ سے مجھے ان چیزوں کو اٹھانے اور قبضے میں رکھنے کا حق پہنچتا تھا۔" اس نے میری طرف دیکھے بغیر وضاحت کی۔

مَیں ہنس پڑا۔

سِلارد میری توقع سے کچھ زیادہ ہی پیش بیں ثابت ہُوا۔

"اچھا اَب اس دَوا کی طرف آ جاؤ شاہی طبیب!" مَیں نے اُسے تحسین آمیز نظروں سے دیکھتے ہُوئے کہا۔

سِلارد نے قریبی جوہڑ سے برتن میں پانی بھرا، اس میں تھوڑی سی کیچڑ شامل کی۔ پھر اس برتن میں کچھ پتیاں کُچل کر ڈالیں۔ اس کے بعد کمر کی پٹی کے ایک خانے سے بھُورے رنگ کا سفوف نکال کر برتن میں ڈالا۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے اپنا خنجر سنبھالا اور دلدل کے قریب کچھ تلاش کرنے لگا۔ اس کی تلاش کامیاب رہی۔۔۔ اُس نے ایک مینڈک خنجر کی نوک میں پرو دیا اور ٹکڑوں میں تبدیل کر کے برتن میں ڈال دیا پھر اُس نے کچھ کیڑے مکوڑے تلاش کیے اور اُنھیں بھی برتن میں ڈال دیا۔

مَیں حیرت سے اس نیم حکیم کو دیکھتا رہا جو ایک دم توڑتی ہُوئی شہزادی کے لیے دَوا تیار کر رہا تھا۔ نہ جانے یہ محلول پی کر تاشیہ کی کیا حالت ہو گی؟

مَیں اس برتن کو ٹھوکر مار کر پھینکنے ہی والا تھا کہ سِلارد نے برتن ہلانا شروع کر دیا اور بولا: "میں اس خاص دَوا کے سلسلے میں بڑی شہرت رکھتا ہوں مالک!" اس کے ہونٹوں پر فخریہ مسکراہٹ آ گئی۔ "پورے موآبہ میں، کوئی میری طرح یہ محلول نہیں تیار کر سکتا۔ مَیں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہ محلول ایک گھوڑے کا معدہ بھی اُلٹ دینے کی خاصیت رکھتا ہے۔"

"کیوں نہ اس محلول کو پہلے تمھی پر آزما لیا جائے۔" مَیں نے تلخی سے کہا۔

"مَیں مذاق نہیں کر رہا ہوں، مالک! میری یہ جرأت نہیں ہو سکتی۔ میرے دعوے کی تصدیق ابھی ہو جاتی ہے۔ بس، تمھیں شہزادی کا مُنہ کھولنا ہو گا تاکہ مَیں یہ محلول اس کے حلق میں اُنڈیل سکوں۔"

سِلارد اپنے دعوے میں بہت سنجیدہ نظر آ رہا تھا اس لیے میں نے تاشیہ کا سر اپنے زانو پر رکھا اور اس کا مُنہ کھول دیا۔ وہ جھُک کر شہزادی کے حلق میں محلول اُنڈیلنے لگا۔

تاشیہ کھانسنے لگی۔۔۔

پھر اُس نے سر میری گرفت سے آزاد کرانے کی کوشش کی اور اس کوشش میں بُری طرح کھانسنے لگی۔

"ٹھہرو۔۔۔ ذرا یہ سانس لے لے۔" مَیں نے مُنہ پھیرتے ہُوئے کہا۔

سِلارد خالص حکیمانہ انداز میں معترض ہو کر بولا: "اسے یہ سارا محلول پینا ہے، مالک! ذرا اس کا سر اُوپر اُٹھاؤ تاکہ دَوا آسانی سے حلق سے اُتر جائے۔"

مَیں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔

محلول کا آخری قطرہ بھی تاشیہ کے حلق سے اُتر گیا تو اس کا چہرہ، جو زرد پڑا ہُوا تھا، یکا یک اس کی رنگت تبدیل ہونے لگی۔ لمحہ بہ لمحہ چہرے کی رنگت کاہی ہوتی جا رہی تھی۔۔۔ اچانک تاشیہ کے جسم میں بھنچاؤ سا پیدا ہُوا اور وہ لڑھک کر پیٹ کے بَل لیٹ گئی۔

"دَوا نے اپنا کام شروع کر دیا ہے، مالک!" سِلارد تاشیہ سے دُور ہٹتے ہُوئے بولا: "اَب تم ایک ایسا منظر دیکھو گے، جو تم نے شاید ہی پہلے کبھی دیکھا ہو۔"

سِلارد دُرست ہی کہہ رہا تھا۔

تاشیہ کے جسم پر تشنج طاری تھا۔ اس کا چھریرا اور نازک بدن مُڑا تُڑا جا رہا تھا پھر ہلکی چیخوں اور کراہوں کے ساتھ اُس نے ایک بڑی قے کی۔ اس نے آنکھیں کھول دیں اور خوف زدہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ اس کا جسم آہستہ آہستہ کانپ رہا تھا۔

"تم سخت بیمار تھیں تاشیہ! لیکن اَب تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔" مَیں نے اُسے تسلی دی۔

"یہ سب کیا ہے، سرفروش! ہم کہاں ہیں؟" اُس نے کمزور آواز میں پُوچھا۔

"مَیں، تمھیں سب کچھ تفصیل سے بتا دوں گا لیکن اس وقت بات نہ کرو تو اچھا ہے۔ کوشش کرو کہ جو کچھ تمھارے معدے میں ہے وہ نکل جائے، اس سے تمھاری طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔"

دُور کھڑے سِلارد نے بڑے مطمئن انداز میں اپنی مریضہ کی طرف دیکھا اور ہاتھ باندھتے ہُوئے، سر ہلا کر بولا: "مَیں نے اپنی گناہگار زندگی میں اس سے زیادہ خراب حال مریض نہیں دیکھا۔"

تاشیہ نے بڑے وقار سے اپنا سر اُٹھایا اور سِلارد کو گھُورتے ہُوئے برہم لہجے میں بولی: "یہ بدشکل اور بدہئیت شخص کون ہے؟ اور یہاں کیا کر رہا ہے؟" اس کے ساتھ ہی اُسے زور کی اُبکائی آئی اور وہ دونوں ہاتھوں سے چہرہ تھام کر جھُک گئی۔

وہ سنبھلی تو مَیں نے سِلارد کا تعارف کرایا۔

"یہ بدہئیت اور کریہہ المنظر شخص، تمھارا معالج ہے، شہزادی تاشیہ! اس نے تمھیں نئی زندگی دی ہے۔ اس وقت تمھاری حالت جو سنبھلی ہے تو یہ اسی علاج کا نتیجہ ہے۔" مَیں نے کہا۔ "اَب تم خود کو سنبھالنے کی کوشش کرو، ہمیں بہت لمبا سفر درپیش ہے۔ تمھارے ذہن میں جو سوالات مچل رہے ہیں۔۔۔ اُن کا جواب مَیں بعد میں دوں گا۔ مزید تاخیر سے ہم دُشواری میں پڑ سکتے ہیں۔ سب کیے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔"

مَیں سِلارد کی طرف متوجہ ہُوا۔

"جیسے ہی شہزادی تاشیہ گھوڑے پر بیٹھنے کے قابل ہو گی، ہم چل پڑیں گے۔" مَیں نے سِلارد سے کہا اور اُسے گھوڑے تیار کرنے کا حکم دیا۔

"لیکن مالک۔۔۔" سِلارد ہچکچاتے ہُوئے بولا: "میرے خیال میں سفر رات کی تاریکی میں بہتر رہے گا۔"

"جو کہہ رہا ہُوں، وہی کرو۔ مجھے توقع ہے کہ اَب ہمارا تعاقب نہ کیا جائے گا۔ کچھ ہونا ہوتا تو رات ہی کو ہو جاتا۔ اس وقت تو شاہ یوطابا اور اس کے حواری، سُرخ شیلان کے خوف سے نیم جاں ہو رہے ہوں گے۔ کیا تم اس راستے سے ہمیں شمال کی طرف لے جا سکتے ہو؟"

"مَیں اِن اطراف کے چپے چپے سے واقف ہوں۔ میں اِن راستوں سے اس طرح واقف ہوں، جیسے اپنے ہاتھ کی لکیروں سے۔ کوئی بیس کوس چلنے کے بعد ہم دوبارہ ایک جنگل میں داخل ہو جائیں گے۔"

اگرچہ تاشیہ زندگی اور موت کی کشمکش سے نکل آئی تھی۔ بہرحال وہ کسی نہ کسی طرح گھوڑے پر جم کر بیٹھ ہی گئی اور ہمارا مختصر، سہ نفری قافلہ سُست رفتاری سے شمال کی طرف چل پڑا۔

سورج نکل آیا لیکن دُھند کی وجہ سے دِکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کبھی کبھی ایک چمک دار ٹکیہ سی دِکھائی دیتی، پھر وہ بھی

رُوپوش ہوجاتی۔ ہمارا سفر خاموشی سے جاری تھا۔ کوئی بھی کسی سے بات نہیں کر رہا تھا۔ تاشیہ اس وقت بھی سُرخ لبادے میں لپٹی ہُوئی تھی۔ صبح کی خنکی میں، وہ بھاری لبادہ اس کے لیے بے حد کارآمد ثابت ہو رہا تھا۔ میں نے رات، فرار ہوتے وقت بہ عجلت اپنے لیے ایک جوڑا حاصل کیا تھا اور وہی اس وقت میرے جسم پر تھا۔ اس کے علاوہ ہورسا کا کلہاڑا بھی اب میرے قبضے میں تھا۔ یہی کچھ میرا مال و متاع تھا لیکن سِلارد کے گھوڑے کی جانب دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اُس نے بھاگتے بھاگتے بھی کافی کچھ ہتھیا لیا تھا۔ اس کے گھوڑے پر ایک بڑا سا تھیلا لدا ہُوا تھا اور اُس میں نہ جانے کیا کچھ ٹھنسا ہُوا تھا۔ وہ ہمارے آگے کسی قائد کے انداز میں چل رہا تھا۔

کافی دور نکل آنے کے بعد تاشیہ نے ہمیں رُکنے کا اشارہ کیا۔ وہ جھاڑیوں کی طرف چلی گئی۔ ہم نے اپنا سفر ذرا دیر کے لیے روک دیا۔ میں اور سِلارد تنہا ہُوئے تو میں نے اُ ا ، کے گھوڑے پر بار تھیلے کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے کہا: "ہورسا کے گھر سے کیا کچھ لُوٹ لائے ہو؟"

"بات یہ ہے مالک! کہ میں ایک ماہر اور تجربہ کار چور ہُوں کسی کے گھر میں داخل ہوتا ہُوں تو ہتھیلی میں خارش ہونے لگتی ہے اور ہاتھ بے قابو ہو جاتے ہیں۔ اس تھیلے میں ضرورت کی بہت ساری چیزیں بھری ہُوئی ہیں جو دورانِ سفر ہمارے کام آئیں گی۔ کچھ کپڑے، کچھ اہم دوائیں اور دیگر چھوٹی موٹی چیزیں۔ . . تم نے زیادہ وقت نہیں دیا ورنہ کچھ اور چیزیں بھی ڈال لیتا۔"

"اور کیا لے آتے؟" میں نے ہنس کر کہا: "اس تھیلے کے علاوہ تین گھوڑے، ایک خنجر اور ایک شہزادی چُرا لائے ہو۔ کیا یہ کم ہے؟"

"کھانے پینے کی چیزیں بھی اُڑا لاتا مگر افسوس کہ موقع نہیں ملا۔ اب منزل آنے تک بھوکا رہنا پڑے گا۔"

"ہم اس وقت تمھاری رہنمائی میں چل رہے ہیں۔ ہمارے کھانے پینے کا بندوبست تو تمھی کو کرنا پڑے گا۔"

"ہرمزد نے چاہا تو یہ بھی ہو جائے گا۔" سِلارد درویشانہ انداز میں بولا پھر یک بہ یک وہ چونک کر معذرت خواہانہ لہجے میں بولا: "معاف کرنا مالک! مجھے ایک بات یاد نہیں رہی تھی۔ میں ہورسا کے گھر سے کچھ اور بھی لے آیا ہُوں۔"

میں نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔

اس نے، کمر سے بندھی ہُوئی ایک تھیلی کھولی۔ میری نگاہ اس تھیلی پر نہیں پڑ سکی تھی۔ وہ، تھیلی میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "ذرا اس تھیلی کو کھول کر دیکھو۔ میں چور ضرور ہُوں لیکن احسان فراموش نہیں ہوں۔ تمھارا برتاؤ میرے ساتھ بہت اچھا رہا ہے اس لیے میں اس تھیلی کو تم سے چُھپا کر نہیں رکھ سکتا۔ یہ سب تمھارے ہیں مالک!"

میں نے تھیلی لے کر کھولی اور اُسے زمین پر اُلٹ دیا۔

اس میں سے بہت سارے سِکّے برآمد ہوئے۔ چھوٹے اور بڑے، طلائی اور نقرئی سِکّے۔ . . اس کے علاوہ اُس تھیلی میں سے ایک چھوٹی سی تھیلی بھی برآمد ہُوئی۔

"کافی دولت ہے، مالک!" اس کے لہجے میں دبا دبا جوش تھا۔ "ان سے مین کھیت، مویشی، گھوڑے اور خدمت کے لیے غلام خریدے جا سکتے ہیں۔ ایک بیوی بھی حاصل کی جا سکتی ہے۔ اس کے بعد بھی کچھ نہ کچھ بچ رہے گا۔"

میں نے چھوٹی تھیلی کا مُنہ کھول کر اُسے ہتھیلی پر اُلٹ لیا۔

میری ہتھیلی پر بیس سیاہ موتی پڑے دمک رہے تھے۔ اُس وقت دُھوپ نکلی ہُوئی تھی۔ موتی سُنہری دُھوپ میں بڑا عجیب منظر پیش کر رہے تھے۔ میں نے تھیلی سِلارد کو واپس کرتے ہُوئے کہا: "یہ ہورسا اِس قدر امیر و کبیر کیسے بن گیا؟"

سِلارد اُن موتیوں سے متاثر نظر نہیں آ رہا تھا، وہ شانے اُچکا کر بولا: "اگرچہ میں ان چیزوں کو پہلے بھی دیکھ چُکا ہُوں لیکن ان کے بارے میں میری معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ یہ موتی سمندر کے ایک دُور افتادہ ساحل پر پائے جاتے ہیں اور کہا جاتا ہے، بحری قزاق انھیں دوسری تمام چیزوں پر فوقیت اور ترجیح دیتے ہیں۔ وہ ان پر جان چھڑکتے ہیں۔ ہورسا نے انھیں یقیناً جنگ کے دوران اپنے کسی مُردہ دُشمن سے حاصل کیا ہوگا۔"

میں نے سِکّے سِلارد کو واپس کر دیے اور موتیوں کی تھیلی اپنے پاس رکھتے ہُوئے کہا: "سِکّے تمھارے اور موتی میرے۔ . . اب ہمیں چل دینا چاہیے تاکہ سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے جنگل میں داخل ہو جائیں۔"

تاشیہ واپس آئی تو بے حد ہشاش بشاش تھی۔

. . . ہم دوبارہ چل پڑے۔

راستے میں، میں نے تاشیہ کو وہ واقعات تفصیل سے بتائے جو اُس سے الگ ہونے کے بعد پیش آئے تھے۔ وہ بڑی توجہ سے سُنتی رہی۔

جب میں نے بات ختم کی تو وہ نفرت سے اپنے ہونٹ سکوڑتے ہُوئے بولی: "ملکہ رومہ بہت کینہ پرور اور منتقم مزاج عورت ہے۔ تم نے اُس سے غدّاری کی ہے اس لیے وہ تمھیں کبھی معاف نہیں کرے گی اور بدلہ لینے کی ہر ممکن کوشش کرے گی۔ ہرمزد سے میری دُعا

ہے کہ سُرخ شیطان داخیل جلد از جلد علکران کی اینٹ سے اینٹ بجا دے اور یوطابا اور رومہ کو تہ تیغ کر دے۔"

"مگر یوطابا تو تمھارا عمزاد ہے۔ اُس نے تمھارا کیا بگاڑا ہے؟"

"اُس کے گناہ بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ موقع ملے تو وہ بھی ڈسنے سے باز نہیں آتا۔" تاشیہ نے کہا پھر قدرے توقف سے سَر جھٹکتے ہُوئے بولی: "میں بھی کس قدر احمق تھی جو رومہ کے دھوکے میں آ گئی۔ پہلے تو اُس نے باتوں باتوں میں تمھارے بارے میں تفصیلاً پوچھا پھر نہ جانے کیا کِیا کہ میری طبیعت خراب ہو گئی۔ دسترخوان سے اُٹھتے ہی میرے ہاتھ سنسنانے لگے اور سر بُری طرح گھومنے لگا پھر میرا ذہن ایک دم تاریک ہو گیا اور کچھ ہوش نہ رہا۔ ہوش آیا تو محل سے دُور تم دونوں کے ساتھ تھی۔ یہ تو اب پتہ چلا کہ وہ مجھے بے ہوشی کی دوا دے کر تم سے ساز باز کرنے والی تھی۔ کتنی خطرناک عورت ہے وہ۔ . . یوطابا اور مجھ سے بہ یک وقت چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی تھی اور وہ بھی اِس انداز میں کہ اُس پر کسی کو شک نہیں ہو سکتا تھا۔ میں سمجھتی ہوں کہ یوطابا کی ہلاکت کے بعد وہ تمھیں بھی مروا دیتی کیوں کہ تم راز دار تھے۔ وہ ایک ہرجائی عورت ہے۔ اُس کے لیے عاشقوں کی کمی نہیں ہے۔"

"اب تو اُسے بھول ہی جاؤ، شہزادی!" میں نے سامنے اُفق کی طرف دیکھتے ہُوئے کہا: "وہ خود بخود اپنے انجام کو پہنچ جائے گی۔ یہ بتاؤ کہ تم اس علاقے کے بارے میں کچھ جانتی ہو؟ احباز یہاں سے کتنی دُور ہوگا؟"

تاشیہ کی آنکھیں سوچنے کے انداز میں سُکڑ گئیں۔ . . پھر وہ سر نفی میں ہلاتے ہُوئے بولی: "مجھے یاد نہیں پڑتا کہ کبھی اس راستے سے گزری ہوں۔ یہ راستہ اور یہ علاقہ میرے لیے انجانا ہے۔ تمھارا یہ غلام کام آئے گا، کچھ دیر پہلے تو بڑے بڑے دعوے کر رہا تھا۔" اس نے سِلارد کی طرف اشارہ کیا جو ہم سے کافی آگے چل رہا تھا۔

میں خاموش رہا۔

سورج غروب ہونے والا تھا اور دُھند دوبارہ دبیز ہوتی جا رہی تھی۔ سامنے گھنا جنگل نظر آ رہا تھا۔

. . . یہی جنگل رات کو ہماری قیام گاہ اور پناہ گاہ بن سکتا تھا۔

"راستہ معلوم کرنے کے معاملے میں قبرولی بہت تیز ہوتے ہیں۔" تاشیہ گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے بولی: "وہ چاند اور ستاروں کی مدد سے سمت اور منزل کا تعین کر لیتے ہیں۔"

"قبرولی۔ . . اور درسیلا۔" میرے ذہن میں خواب میں دیکھی عورت کا نام گونجنے لگا لیکن میں مصلحتاً خاموش رہا۔ ایک عورت مجھے ڈس چکا تھا لہٰذا دوسری عورت کا ذکر نہیں سُننا چاہتا تھا۔ میرے ستارے بتاتے تھے کہ عورتیں مجھے راس نہیں آتیں۔ وہ ہمیشہ میرے لیے کسی نہ کسی مصیبت کا باعث بن جاتی ہیں۔ اب درسیلا کا شجرۂ نسب پوچھنا، گویا خود کو ہلاکت میں ڈالنے کے مترادف تھا۔

ڈوبتے سورج کی سُرخی ابھی تحلیل نہیں ہُوئی تھی کہ ہم جنگل کے قریب پہنچ گئے۔

بلند و بالا درختوں پر دُھند گہری ہو گئی تھی اور یک لخت خنکی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ مجھے خنکی نہیں، گرسنگی ستا رہی تھی۔ میں نے تاشیہ کی طرف دیکھتے ہُوئے کہا: "تمھاری سرزمین پر آنے کے بعد پیٹ بھر کھانا بھی نصیب نہیں ہُوا۔ آج رات بھی یوں ہی گزرے گی۔"

"میں تم سے مختلف نہیں ہوں مگر اس فرق کے ساتھ کہ مجھے کھانا تو مِلا لیکن بے حد مہنگا پڑا۔ جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ آج رات تم بھوکے رہو گے تو میں بھی بھوکی رہوں گی۔" تاشیہ نے مُسکراتے ہُوئے جواب دیا۔

ہم جنگل میں داخل ہو گئے تھے۔

سِلارد نے گھوڑے سے اُتر کر ایک صاف ستھری جگہ تلاش کی پھر گھوڑے درخت سے باندھنے کے بعد وہ خشک لکڑیاں تلاش کرنے لگا۔ ہم بیٹھے، اُسے کام کرتے دیکھتے رہے۔ لکڑیوں کا ایک انبار لانے کے بعد وہ اپنے گھوڑے تک گیا اور تھیلے سے چقماق نکال لایا۔

لکڑیوں کو آگ دِکھانے کے بعد وہ ہماری طرف متوجہ ہو کر بولا۔ "تم لوگ اِدھر آ جاؤ۔ جب تک آگ تاپو گے، میں کوئی خرگوش مار لاؤں گا۔" اس نے اپنے خنجر کی طرف اشارہ کیا: "تجربہ بتاتا ہے کہ آدمی ہاتھ پیر ہلائے تو جنگل میں بھوکا نہیں سو سکتا۔"

پھر سِلارد گھنے درختوں میں غائب ہو گیا۔

میں سوچنے لگا کہ خنجر سے کسی آدمی کو تو ہلاک کیا جا سکتا ہے کیا خرگوش کا شکار بھی کیا جا سکتا ہے؟ میں نے اس مسئلے کو ذہن سے جھٹک دیا۔ یہ سِلارد کا مسئلہ تھا۔ اس نے از خود ایک ذمّے داری لی تھی اور ہمیں اُس پر تکیہ کرنا تھا۔ اب تک تو اس نے کسی معاملے میں مایوس نہیں کیا تھا، ذمّے داری اور بیدار مغزی کا ثبوت دیتا آیا تھا لہٰذا توقع تھی کہ اب بھی وہ کامیاب و کامران ہی واپس آئے گا۔

سِلارد کے جاتے ہی میں اور تاشیہ اُٹھ کر آگ کے قریب چلے گئے۔ وہ ہاتھ سینکنے لگی تو میں نے بغور اس کا چہرہ دیکھا۔ ہمّت اور حوصلے میں وہ بھی کسی سے کم نہیں تھی۔ اس کی دو راتیں خاصے ہنگاموں اور خطرات میں گزری تھیں اور اِس رات بھی ہمارے سر پر کوئی سائبان یا کوئی چھت نہیں تھی۔ تاشیہ اس گھنے، پُرخطر اور دہشت ناک جنگل اور غیر یقینی صورتِ حال اور نامساعد و ناموافق حالات میں ذرا بھی خوف

زدہ نظر نہیں آئی تھی۔ اس کے چہرے پر تکان اور نقاہت کے آثار ضرور تھے اور وہ اس عالم میں بھی پُرکشش لگ رہی تھی۔ میں اس کی دل کشی اور معصومیت سے مسحور ہو کر رہ گیا۔

دفعتاً تاشیہ نے سر اٹھایا اور مجھے اپنی طرف محویت سے دیکھتے پا کر اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ "کیا بات ہے؟" اُس نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔

"کچھ نہیں شہزادی! یُونہی تمھیں دیکھ رہا تھا۔"

"کوئی خاص بات؟ تم پرسوں شام سے مجھے دیکھتے ہُوئے آ رہے ہو۔"

"سوچ رہا ہُوں کہ اِس سرزمین پر قدم رکھتے ہی مجھے کیسا انوکھا ساتھی مِلا ہے۔" مَیں نے مُسکراتے ہُوئے کہا۔

"مَیں تمھاری ساتھی ہُوں؟" وہ آنکھیں نکال کر بولی۔ "ہوش میں رہو ورنہ احباز پہنچتے ہی کوڑے لگواؤں گی۔"

"خادم حاضر ہے، بشرطیکہ زندہ و سلامت منزل تک پہنچ جائیں۔"

"تمھارا ساتھی ابھی تک واپس نہیں آیا، بڑی دیر ہو گئی۔" وہ بات بدلتے ہُوئے بولی۔

مَیں بھی چونکے بغیر نہ رہ سکا۔

واقعی اُسے بہت دیر ہو گئی تھی...

مَیں نے باتوں اور محویت میں محسوس ہی نہیں کیا تھا۔

"تم یہیں ٹھہرو! مَیں اُسے تلاش کر کے لاتا ہُوں۔" مَیں نے اُٹھتے ہُوئے کہا۔

"نہیں، مَیں یہاں اکیلی نہیں رہوں گی، تمھارے ساتھ چلوں گی۔ تمھاری غیر موجودگی میں نہ جانے کیا حالات پیش آئیں۔" وہ بھی اُٹھ کھڑی ہُوئی۔

"اچھا تو پھر ایک بات کا خیال رکھنا، میرے بالکل قریب نہ رہنا تاکہ کسی خطرے کے وقت مَیں آسانی سے کلہاڑا چلا سکوں۔"

ہم دونوں اسی طرف چل دیے جدھر سِلارو گیا تھا...

لیکن ابھی ہم بمشکل پچاس قدم ہی چلے ہوں گے کہ ایک بڑا سا جال ہمارے اوپر آ گرا...

ہم ہاتھ پاؤں مارنے سے پہلے ہی بُری طرح جکڑے گئے۔

... پھر جنگل متعدد انسانی آوازوں سے گونج اُٹھا۔

متعدد لوگ چیختے چلّاتے، درختوں اور جھاڑیوں کی اُوٹ سے نکل کر ہماری طرف جھپٹ پڑے، کچھ درختوں پر سے بھی کُود پڑے تھے۔

مَیں مچھلی کی طرح تڑپا۔

... کلہاڑے والا ہاتھ بلند کیا۔

لیکن مضبوط جال اس قدر تن گیا کہ مَیں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

تاشیہ بُری طرح چیخ رہی تھی: "یہ ملکہ رُدبا کے آدمی ہیں، ہمیں گرفتار کر لیا گیا ہے۔"

کلہاڑا میرے لیے بے کار ثابت ہو رہا تھا۔

مَیں نے کلہاڑا پھینک کر اپنے اوپر جُھکے آدمیوں کو دبوچ لیا، اور اُن کے سر ٹکرانے لگا۔

اُن میں سے کئی کے سَر، تربوز کی طرح چٹخ گئے۔

وہ بُری طرح چیخنے لگے...

مجھ سے نصف درجن آدمی چمٹے ہُوئے تھے اور نقصان اُٹھا رہے تھے لیکن پھر اُن کا زور بڑھ گیا اور پلّہ بھاری ہونے لگا۔ کسی مردِ دانا نے اُن کی مشکل آسان کرنے کے لیے میرے سَر پر بھالے کی بھرپور ضرب لگائی۔

کھوپڑی میں میرا بھیجا تک ہل گیا...

مَیں دو آدمیوں کو اپنی گرفت میں لیے ہُوئے، زمین پر ڈھیر ہو گیا۔

ذہن تاریک ہونے سے پہلے، ہوش و حواس کے بالکل آخری لمحے میں، میری سماعت سے کسی کی چیختی ہُوئی تحکمانہ آواز ٹکرائی: "اِسے جان سے نہ مارنا، یہ ملکہ رُدبا کا حکم ہے۔ وہ اِسے زندہ دیکھنا چاہتی ہے۔"

★★

میری آنکھ کھلی تو مَیں ایک کوٹھری میں تھا۔ پتھریلے فرش پر پڑے پیال پر میرا بے حرکت جسم شل پڑا تھا۔ ایک بڑے سے پیالے میں مچھلی کے تیل میں جلتا ہُوا ایک فتیلہ تھا جو اس کوٹھری میں روشنی کا واحد وسیلہ تھا۔ میرے ہاتھ پیر زنجیر سے جکڑے ہُوئے تھے اور زنجیر کا سِرا سنگی دیوار میں پیوست ایک آہنی حلقے سے جُڑا ہُوا تھا... اپنی بے بسی کا احساس ہوتے ہی غصّے کی ایک شدید لہر میرے وجود میں دوڑ گئی۔ اس قسم کی صورتِ حال میرے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ میں نے جسم کے عضلات پر زور ڈالا اور زنجیر پر قوت آزمائی کرنے لگا۔ زنجیر کی کھڑکھڑاہٹ کوٹھری میں گونج گئی اور اس کے ساتھ ہی مجھے اپنے سر میں شدید تکلیف کا احساس ہُوا۔ کھوپڑی کے پچھلے حصّے میں درد کی تیز ٹیس اُٹھی تھی۔ مَیں نے جسم ڈھیلا چھوڑ دیا۔

"بیکار ہے مالک!" کمرے کے نیم تاریک گوشے سے آواز سُنائی دی: "ہم بُری طرح پھنس چکے ہیں۔ ملکہ رُدبا نے ہمیں قید کر لیا ہے اور

وہ ملکہ رودمہ کے مقابلے میں کہیں زیادہ سفاک ہے۔ جب سے ہم یہاں لائے گئے ہیں، مَیں مسلسل اس مسئلے پر غور کر رہا ہُوں۔ تم تصوّر بھی نہیں کر سکتے کہ ہم کتنی بڑی مشکل میں آ پھنسے ہیں۔ اَب دیکھو، آگے کیا ہوتا ہے۔"

سِلارو بول رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی مجھے اس کے قریب سے زنجیر کی جھنکار سُنائی دے رہی تھی۔ تو سِلارو میرے ساتھ ہی پھنس گیا! مَیں نے سوچا اور اُسی لمحے مجھے شہزادی تاشیہ کا خیال آیا: "شہزادی کا کیا حال ہے اور وہ کہاں ہے؟ مجھے اس کی آواز نہیں سُنائی دے رہی ہے۔" مَیں نے سِلارو سے پوچھا۔

زنجیر کی جھنکار ایک بار پھر سُنائی دی۔

پھر نیم تاریک گوشے سے سِلارو کی آواز اُبھری۔

"وہ خیریت سے ہے مالک! اُسے کوئی نقصان نہیں پہنچا، اس کا بال بھی بیکا نہیں ہُوا۔ ملکہ رُدبا نے شاہِ احباز سے زرِ تاوان حاصل کرنے کے لیے اُسے بطور یرغمال روک رکھا ہے۔ وہ ایک بار پہلے بھی کوشش کر چکی تھی لیکن تم شہزادی کو اس کے چنگل سے نکال لے جانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔" سِلارو کے ہنسنے کی آواز سُنائی دی: "تم اور شہزادی ایک بار پھر اُسی مقام پر آ گئے ہو، جہاں سے چلے تھے۔ بہرحال رقم ملنے کے بعد ملکہ رُدبا، شہزادی تاشیہ کو تو بحفاظت تمام اس کے باپ تک پہنچا دے گی لیکن ہمارا کیا بنے گا، یہ ہُرمزد ہی جانتا ہے۔ مجھے تو اس سلسلے میں سوچتے ہُوئے بھی خوف آتا ہے۔ ہمارا انجام اچھا نہیں ہو گا مالک! تم خود دیکھ لینا!"

مَیں اپنے جسم پر زور ڈال کر ایک بار پھر زنجیر کی مضبوطی کو آزمانے لگا۔ خاصی مضبوط زنجیر تھی... بے دم ہو کر مَیں نے جسم پیال پر ڈال دیا اور سِلارو کی تشفی کے لیے بولا: "تم دل مضبوط رکھو سِلارو۔ کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہوتا جو حل نہ ہو سکے اور کوئی مشکل ایسی نہیں ہوتی جو ٹل نہ سکے۔ کوئی بات یقینی نہیں ہوتی بلکہ ہر بات امکانی ہوتی ہے۔"

مَیں نے کہنے کو تو یہ بات کہہ دی تھی لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ مسئلہ کیسے حل ہو گا؟

... یہ مصیبت کیسے ٹلے گی؟

"مجھے تمھاری بات کا یقین ہے، مالک!" سِلارو کی آواز سُنائی دی۔ اس بار اس کا لہجہ پژمُردہ نہیں تھا۔

اُسے میری بات سے سہارا مِلا تھا...

"مَیں بھُول گیا تھا کہ تم ایک دانش مند آدمی ہو اور ہر مشکل سے نِکل آتے ہو۔ مجھے اس کا اندازہ یوں ہے کہ تم نے ہورسا جیسے وحشی اور جنگجو کا خاتمہ کر دیا۔ تم سے پہلے کوئی مائی کا لال اس کے جسم پر خراش بھی نہیں ڈال سکا تھا۔" اُس نے خوش دِلی سے کہا۔

مَیں نے ایک بار پھر عضلات پر زور ڈالا اور زنجیر پر قوت آزمائی کی لیکن اگلے ہی لمحے احساس ہو گیا کہ ہر جگہ دانش مندی نہیں چلتی۔ یہاں دانش مندی کے علاوہ بھی کچھ چیزوں کی ضرورت تھی، جو اس وقت دستیاب نہیں تھیں۔ مَیں نے سوچا کہ سِلارو سے کچھ معلومات ہی کیوں نہ حاصل کی جائیں۔ کبھی کبھی دُرست معلومات بھی کام دے جاتی ہیں۔

"یہ کون سی جگہ ہے، سِلارو؟" مَیں نے پوچھا: "اُنھوں نے مجھے جکڑ لیا تھا اور مجھ پر بے ہوشی طاری ہو گئی تھی۔ اس کے بعد کیا ہُوا؟"

"یہ ایک بہت بڑا قلعہ ہے، مالک! یہ علاقہ سمندر کے مغربی ساحل پر ہے۔ مجھے یہاں تک پیدل لایا گیا تھا۔ شہزادی تاشیہ گھوڑے پر سوار تھی اور تمھیں ڈولی میں لایا گیا تھا۔ تمھیں بے ہوش رکھنے کے لیے دَوا دی گئی تھی، مالک! ملکہ رُدبا کے آدمی تم سے بے حد خوف زدہ تھے۔"

دُکھتے ہُوئے سر کے ساتھ مجھے ہلکی بُو بھی محسوس ہُوئی تھی۔ اب پتہ چلا کہ وہ کسی دَوا کی بُو تھی، جو ملکہ رُدبا کے بُزدلوں نے مجھے قابو میں رکھنے کے لیے دی تھی۔

"ہمیں قابو کرنے کے لیے اُنھوں نے جال استعمال کیا تھا۔" میں نے کہا: "لیکن مجھے تعجب ہے سِلارو! کہ اُنھیں ہماری نقل و حرکت، مقام اور وقت کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کیسے ہو گیا۔ وہ تو باقاعدہ ہماری گھات میں بیٹھے ہُوئے تھے۔"

"اس پر خود مجھے بھی حیرت ہُوئی تھی، مالک! میں تو کسی خرگوش کی طرح پکڑ لیا گیا تھا۔ بعد میں غور کیا تو احساس ہُوا کہ ملکہ رودمہ نے یقیناً ملکہ رُدبا کے پاس ہمارے فرار کی اطلاع پہنچوا دی ہو گی۔ اُن کے مزاج اور خیالات میں بڑی ہم آہنگی ہے۔ شاہِ یوطابا تو ایسا ہرگز نہیں کر سکتا کیوں کہ ملکہ رُدبا اور شاہِ یوطابا ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں۔"

"تو یہ بات ہے۔" مَیں نے سوچا۔ ملکہ رودمہ نے بڑی گہری چال سوچی تھی۔ میرے اور تاشیہ کے سلسلے میں اُسے ناکامی ہُوئی تو اس کی سازش بھی ناکام ہو گئی۔ وہ تاشیہ سے حسد کرتی تھی اور مجھے اپنا آلۂ کار بنانا چاہتی تھی لیکن اس کا گھناؤنا اور شیطانی منصوبہ، ہمارے فرار کے نتیجے میں دَھرا کا دَھرا رہ گیا۔ اس لیے وہ اب اپنی

سازش کی تکمیل ملکہ رُوبا کے ہاتھوں کروانا چاہتی ہے۔

"کچھ اس ملکہ رُوبا کے بارے میں بھی بتاؤ" میں نے رومہ کا خیال ذہن سے جھٹکتے ہُوئے کہا۔

سیلارود نے ملکہ رُوبا کے بارے میں جو کچھ بتایا، وہ رونگٹے کھڑے کر دینے کے لیے کافی تھا۔ مجھے سیلارود کی بات میں مبالغے کا شائبہ تک محسوس نہیں ہُوا۔

"وہ ایک حرافہ عورت ہے، مالک!" سیلارود کہہ رہا تھا "بے حد اوباش اور پرلے درجے کی عیاش ہے اور اس میں خرابی یہ ہے کہ لذت کوشی کے بعد اپنے ہر محبوب کو قتل کر دیتی ہے تاکہ خواب گاہ کی داستانیں باہر نہ جا سکیں لیکن یہ باتیں بھی کہیں چھپی رہ سکتی ہیں۔ اپنے خادموں اور غلاموں کے ساتھ، اس کی زیادتیاں اور سفاکیاں میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں۔ اس کے بہت سے آدمی اپنے بائیں کان اور عورتیں جسم کے حسین حصّوں سے محروم ہیں۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ اس کی رفاقت میں رہ چکے ہیں۔ جب ہم قلعے میں داخل ہُوئے تھے تو میں نے کئی محافظوں کو دیوار کے ساتھ آہنی شکنجوں میں لٹکے ہُوئے دیکھا تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ یہ، وہ لوگ ہیں جن کی غفلت سے شہزادی تاشیہ نکل بھاگی تھی۔ ان میں سے ایک اُس وقت بھی جانکنی کے عالم میں تھا"

"ملکہ رُوبا کس عمر کی ہوگی؟" میں نے پوچھا۔

"کون بتا سکتا ہے" سیلارود، زنجیر کی کھڑکھڑاہٹ کے ساتھ بولا "کچھ کہتے ہیں پچاس سال کی ہے اور کچھ پانچ سو سال کی بتاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ساحرہ ہے، چڑیل ہے لیکن اس کے باوجود، میرے خیال میں وہ پانچ سو سال کی تو ہرگز نہیں ہو سکتی۔ بہرحال ایک بات بالکل دُرست ہے کہ وہ بے حد حسین اور زہرہ شکن ہے لیکن وہ کسی کو اپنے قریب آنے کی اجازت نہیں دیتی۔ عورتیں بڑی مکّار ہوتی ہیں، مالک! چاہے وہ چڑیل ہی کیوں نہ ہو۔ چال بازی عورتوں کی سرشت ہے"

سیلارود کا تجزیہ ابھی مکمل نہیں ہُوا تھا کہ چھت پر ایک دروازہ کُھلا اور ایک چہرہ جھانکتے ہُوئے بولا "تم میں سے جس کا نام سرفروش ہے، ملکہ رُوبا اُسے فوراً اپنے حضور دیکھنا چاہتی ہے۔ . . اور کان کھول کر سُن لو، کوئی چال بازی نہیں چلے گی۔ زیادہ ہوشیار اور چالاک بننے کی صُورت میں تمھارا سَر دھڑ سے جُدا ہو جائے گا"

کمرے میں ایک سیڑھی لٹکائی گئی . . .

پھر چند مسلح آدمی نیچے آ گئے۔ ان کے جسم پر مخصوص وردی تھی لیکن اُن میں سے ہر ایک اپنے بائیں کان سے محروم تھا۔ اُنھوں نے مجھے زنجیر سے آزاد کیا اور سیڑھی کی طرف دھکیل دیا تھا۔

اچانک سیلارود کی غصّے بھری آواز سُنائی دی۔ وہ شکوہ کرنے کے انداز میں کہہ رہا تھا "مجھے کھانے پینے کو کچھ نہیں دیا گیا۔ کیا تم لوگ اپنے ہی جیسے ایک آدمی کو بھوکا پیاسا مر جانے دو گے؟ اس کے علاوہ یہ جگہ بڑی غلیظ ہے۔ یہاں چوہے دوڑتے پھر رہے ہیں۔ میں نے اس سے زیادہ گھناؤنا بدبُودار تہ خانہ تو زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا"

جواباً وہ لوگ زور سے ہنس پڑے۔

پھر اُن میں سے ایک سیلارود کے قریب گیا اور اُسے ٹھوکر رسید کرتے ہُوئے بولا "میں تمھاری اوقات جانتا ہُوں اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تم تہ خانوں ہی میں رہتے آئے ہو لیکن اپنا گندا مُنہ بند رکھو، ورنہ مقررہ وقت سے پہلے ہی جہنم رسید کر دیے جاؤ گے"

میں سیڑھی کی طرف بڑھا اور یہ دیکھ کر مُسکرائے بغیر نہ رہ سکا کہ وہ مجھ سے دُور دُور چل رہے تھے، کوئی میرے قریب نہیں آ رہا تھا۔ گویا وہ مجھ سے بُری طرح خوف زدہ تھے۔ میں دروازے سے گزر رہا تھا کہ نیچے سے سیلارود کی آواز سُنائی دی۔

"خوش رہو، مالک! لیکن اپنے غلام کو فراموش نہ کر دینا"

ملکہ رُوبا کا قلعہ بے حد وسیع و عریض ثابت ہُوا۔ مجھے کئی ایسی طویل راہ داریوں سے گزرنا پڑا جن میں مشعلوں کی روشنی پھیلی ہُوئی تھی پھر راستے میں کئی زینے بھی آئے۔ اوپر پہنچ کر مجھے ہَوا میں تُرشی کا احساس ہُوا۔ قریب ہی سمندر کی سرکش لہروں کے ساحل سے سر ٹکرانے کی آواز آ رہی تھی۔ قلعے کے اطراف میں گہری دُھند کا حصار تھا۔ اوپر آسمان تاریک نظر آیا . . . چاند یا کوئی ستارہ دیکھنے میں نہیں آ رہا تھا۔

ہم قلعے کے ایک بلند و بالا مینار کے قریب پہنچ گئے پھر مزید زینے طے کرنے پڑے۔ اس کے بعد مجھے ایک بڑے کمرے میں دھکیل دیا گیا اور اس کے ساتھ ہی عقب میں زور سے دروازہ بند کرنے اور اسے مقفل کرنے کی آواز سُنائی دی۔

اَب میں کمرے میں اکیلا تھا۔

لیکن میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ میں تنہا نہیں ہُوں۔ یہ احساس مجھے کمرے میں داخل ہوتے ہی ہو گیا تھا لیکن میں نے کوئی ایسی حرکت نہیں کی جس سے ظاہر ہوتا کہ کمرے میں اپنے علاوہ کسی اور کی موجودگی سے باخبر ہو گیا ہُوں۔

میں گھوم پھر کر اس بڑے کمرے کا جائزہ لینے لگا۔

اگر ملکہ رُوبا میرے ساتھ بلی چوہے کا کھیل کھیلنا چاہتی تھی تو یہی سہی۔ میں بارہا ایسے کھیل کھیل چکا تھا۔ میری طمانیت کے لیے یہ احساس ہی کافی تھا کہ مجھے اور سیلارود کو فوری طور پر ل نہیں کیا گیا۔ لہٰذا اس ایک گنجائش سے بہت سی گنجائشیں ل آنے کا امکان تھا۔

وہ کمرہ کئی کمروں سے جُڑا ہُوا تھا اور اس کی سجاوٹ میں ی خوب صورت برتی گئی تھی۔ جس سے مکین کی طبیعت کی نفاست ندی کے علاوہ عیش کوشی کا بھی پتہ چلتا تھا۔ فرش پر نہایت قیمتی اور گداز کھالیں بچھی ہُوئی تھیں۔ ایک کھال ریچھ کی تھی نی زندگی میں یقیناً دس فٹ کا رہا ہوگا۔ کمرے میں نرم اور ملائم ان بھی تھے، جن پر کھال ہی کے غلاف چڑھے ہُوئے تھے، البتہ ں کوئی کھڑکی نہیں دِکھائی دے رہی تھی۔ کمرہ حیرت انگیز طور پر تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے گرم رکھنے کے لیے ریقہ اختیار کیا گیا ہوگا۔

کمرے کے ایک گوشے میں بڑی سی میز پر، طشت میں گوشت پچے اور سفید روٹی رکھی ہُوئی تھی اور اسی میز پر ایک طرف ب اور متعلقہ ظروف رکھے ہُوئے تھے۔ میں نے بے دھڑک ی آگ بُجھانا شروع کی لیکن شراب کو ہاتھ نہیں لگایا کہ اس ع نہیں تھا۔ میں خود پر اپنی گرفت مضبوط رکھنا چاہتا تھا . . .

م پُری کے دوران میں، دیواروں پر آویزاں منقش اور طلائی کام ردوں کو دیکھ رہا تھا کہ اچانک میں نے پردوں کے بیچ، ایک واپنی جانب نگراں دیکھا۔ دائیں ہاتھ میں گوشت کا پارچہ ور تیز تیز مُنہ چلاتے ہُوئے، میں ذرا سا جُھکا اور مؤدب لہجے ولا "اس ضیافت کے لیے تمھارا شکریہ، اے مہربان ملکہ! ھوکا تھا۔ یہ کھانا واقعی بے حد عُمدہ اور لذیذ ہے۔ کیا یہ ممکن اس میں سے کچھ میرے اُس ساتھی تک بھی پہنچا دیا جو تمھارے تہ خانے میں قید ہے اور مجھ سے زیادہ ہی ے"

آنکھ چمک اُٹھی اور اس کے ساتھ ہی دبی دبی سی ہنسی کی نائی دی . . . پھر بھاری اور گہری آواز اُبھری "میں نے ے بارے میں سچ ہی سُنا تھا۔ تم واقعی دلیر اور خبری نظر رومہ نے تمھارے چہرے اور جسم کے بارے میں بھی نہیں لکھا، سرفروش! کیا تم وہی ہو، جو نظر آتے ہو؟ ں سوال کے جواب پر تمھاری زندگی کا انحصار ہے، یہ بات میں پہلے ہی واضح کیے دیتی ہُوں"

ملکہ رُوبا کے لب و لہجے میں ایسی تنبیہہ تھی کہ میری ریڑھ کی ہڈی میں سرد سی لہر دوڑ گئی۔ میں ایک کڑی آزمائش کے مرحلے سے گزر رہا تھا۔ میں دوبارہ خم ہوتے ہُوئے ذومعانی انداز میں بولا۔ "میں کیا ہُوں اور کیا نہیں ہُوں، یہ تو وقت ہی بتائے گا، ملکہ عالیہ! اگر کوئی آزمائش یا کوئی امتحان مقصود ہو تو میں اس کے لیے تیار ہُوں"

. . . پھر وہی ہنسی . . . بھاری ہنسی . . . جیسے کوئی مرد ہنسا ہو۔

"تم قرنِ قدیم کے انداز میں لفاظی بھی کر لیتے ہو، مجھے یہ انداز پسند نہیں آیا لیکن تم مجھے پسند آئے ہو . . . اور یہ پسند تمھیں عملی طور پر ثابت کرنا ہوگی۔ تمھیں اس کے لیے ایک موقع دیا جائے گا۔ اگر تم اس حسّاس اور لطیف آزمائش پر پورے اُترے . . . دوسرے الفاظ میں اگر تم جیت گئے تو تمھاری جاں بخشی کی جا سکتی ہے"

"اور میرا وہ ساتھی ملکہ عالیہ . . . ؟ کیا اُس کی بھی جاں بخشی کر دی جائے گی؟ اور کیا شہزادی تاشیہ کو بھی رہا کر کے، اس کے باپ شاہ اخباز کے پاس بھیج دیا جائے گا؟"

پردے کی اوٹ میں کچھ دیر خاموشی چھائی رہی . . .

پھر ایک بے حد سرد آواز اُبھری "تم بہت دُور چلے گئے ہو، سرفروش! تم نے مجھ سے سودے بازی کی جرأت کیسے کر لی؟ ایسا لگتا ہے، جیسے یہاں تمھیں کچھ حقوق حاصل ہیں!"

میں نے اس معرکے کا آغاز جرأت سے کیا تھا اور معاملہ جرأت سے ہی جاری رہنا چاہیے تھا۔ میں نے اس آنکھ کی طرف گھورتے ہُوئے، اُسی جیسے سرد لہجے میں کہا "میں درخواست تو بہرحال کر سکتا ہوں، ملکہ عالیہ! وہ مرد، مرد ہی کیا، جو اپنے ساتھیوں کے کام نہ آیا"

"کافی ہے" دوسری طرف سے کہا گیا "تمھیں، میرے لیے تیار کیا جائے گا اور تمھارے لیے میرا یہ مشورہ ہے کہ زبان کو اپنے قابو میں رکھو"

اس کے ساتھ ہی وہ آنکھ غائب ہو گئی۔

کہیں قریب ہی سے متعدد قدموں کی آوازیں اُبھرتی سُنائی دیں . . .

اگلے ہی لمحے دروازہ کُھلا اور چار دوشیزائیں کمرے میں داخل ہُوئیں۔ اُنھوں نے جو لباس زیب تن کر رکھا تھا، وہ بے لباسی

کا مظہر تھا اور مجھے ایک ہی نظر میں معلوم ہوگیا کہ وہ قدرت کی عنایت کردہ نسوانی دل کشی اور سرمایۂ فخر سے یکسر محروم ہیں۔ اس حِصّے پر فقط ایک طشتری نُما سُرخ نشانی ہی باقی رہ گیا تھا اور یہ غالبًا ملکہ رُدبا کی طرف سے عطا کردہ تمغۂ خدمت تھا۔ وہ اپنی ظالم اور سفّاک ملکہ کی درندگی اور بہیمیت کا شکار ہُوئی تھیں۔

وہ خاموشی سے اپنے کام میں مصروف ہوگئیں۔ اُن میں سے کسی نے ہنسنا تو درکنار، مجھے دیکھا تک نہیں اور نہ ہی آپس میں کلام کیا۔ یہ میرے لیے ایک حیرت انگیز بات تھی۔ یہ خاموشی جنسِ لطیف کی فطرت کے خلاف تھی۔ مَیں نے سُنہرے بالوں والی ایک نازک بدن لڑکی کو پکڑ لیا اور اُس کا مُنہ کھول کر دیکھا تو میں سر سے پاؤں تک کانپ گیا۔

لڑکی کی زبان کٹی ہُوئی تھی۔

اُس سے گویائی چھین لی گئی تھی۔

مَیں جُھرجُھری سی لے کر رہ گیا۔

سِلارو کی بتائی ہُوئی ہر بات دُرست ثابت ہوتی جا رہی تھی۔ مَیں نے ملکہ رُدبا کو کچھ دیر پہلے اس کی دی ہُوئی دھمکی کی روشنی میں تصوّر کی آنکھ سے دیکھا تو وہ مجھے ایک خونخوار اور خون آشام چڑیل نظر آئی۔ وہ ملکہ رومر سے بھی بہت آگے کی چیز تھی۔

چاروں لڑکیوں نے کانسی کے ایک بڑے برتن میں پانی بھرا اور مجھے غسل دینے لگیں۔ پانی گرم اور جھاگ دار تھا۔ نہانے سے فارغ ہُوا تو اُنھوں نے معطّر تولیوں سے میرا جسم خشک کیا . . . پھر مجھے بہترین اور شان دار لباس پہنایا گیا۔ پہننے کے لیے ملائم چمڑے کے جُوتے دیے گئے جن کے تسمے گھٹنوں تک آتے تھے۔ اس سرزمین پر مَیں نے پہلی بار پیٹ بھر کھانا کھایا اور قاعدے کا لباس پہنا تھا۔ میرا لباس کچھ ایسا تھا جو میں نے یہاں طبقۂ اُمرا اور جانبازوں ہی کو پہنے ہُوئے دیکھا تھا اور یہ سب کچھ ایک ایسی عورت نے فراہم کیا تھا جو میرے اور میرے ساتھیوں کے مستقبل پر اپنا منحوس سایہ ڈالنے والی تھی۔

لڑکیاں اپنی ذمّے داری سے سُبک دوش ہوکر مجھے کمرے میں تنہا چھوڑ کر چلی گئیں۔

کچھ دیر بعد پردے کی دوسری طرف قدموں کی چاپ سُنائی دی . . .

پھر پردہ درمیان سے سرکا اور ملکہ رُدبا اندر آگئی۔

وہ سادہ سا سیاہ رنگ کا لبادہ پہنے ہُوئے تھی جو اس کے جسم پر کَسا ہُوا تھا۔ اس کا چہرہ لمبوترا تھا اور اُس پر زردی کھنڈی ہُوئی تھی۔ اس کی ناک اور ٹھوڑی بھی لمبوتری تھی . . . دہانے پر کسی سُرخ لکیر کا گمان ہوتا تھا۔ اُس کے بال آراستہ نہیں تھے اور ان میں سیاہی کے درمیان، کہیں کہیں سفیدی بھی جھلک رہی تھی۔

مَیں نے سینے پر دونوں ہاتھ باندھے اور سَر جُھکاتے ہُوئے کہا: "تم ایک حسین وجمیل عورت ہو، ملکہ عالیہ!" یہ کہتے ہُوئے مَیں نے مبالغے سے کام نہیں لیا تھا۔ وہ جوان نہیں تھی لیکن خوبصورت ضرور تھی۔ اس کے سراپا میں پاگل کر دینے والی کشش تھی۔

جواب میں وہ خاموش رہی . . . اور اپنی بادامی آنکھوں سے میرا جائزہ لیتی رہی پھر تحکمانہ لہجے میں بولی: "جو میری رضامندی کے طلب گار ہوتے ہیں، اُن کی طرف سے یہ ایک فرسودہ اور روایتی جُملہ میرے نزدیک کوئی معنی نہیں رکھتا۔ مجھ سے عقیدت اور ارادت کے اظہار کی یہاں ایک اور رسم رائج ہے۔ تم گھٹنوں کے بَل چلتے ہُوئے میرے قریب آؤ گے:"

میں اس کی رضامندی کا طلب گار ہرگز نہیں تھا بلکہ یہ رضامندی مجھ پر مسلط کی جا رہی تھی۔ تاہم حُکم کی تعمیل ضروری تھی کیوں کہ اس میں میری اور میرے ساتھیوں کی زندگی مضمر تھی۔

میں گھٹنوں کے بَل جُھکا اور آہستہ آہستہ اُس کی طرف بڑھنے لگا۔ قریب پہنچا تھا کہ ملکہ ردبا نے اوڑھی ہُوئی سیاہی فرش پر پھینک دی۔ مَیں نے سیاہ لبادے کی طرف دیکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔

ہوش کی آنکھیں بیدار ہُوئیں تو ملکہ رُدبا آنکھیں بند کیے، ہنستے ہُوئے بولی: "واقعی تم اپنے قول وفعل میں پورے اُترے ہو اور آزمائش میں کامیاب رہے ہو۔ مَیں تمھاری جاں بخشی کرتی ہوں۔ فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔ تم خوش نصیب ہو، جو اس خواب گاہ سے یوں زندہ وسلامت جا رہے ہو۔ اگر تم کوئی عام آدمی ہوتے تو یہ تمھاری زندگی کی آخری رات ہوتی۔ جاؤ، جلدی سے نکل جاؤ۔ اور پھر کبھی اِدھر کا رُخ نہ کرنا۔ جلدی جاؤ، ایسا نہ ہو کہ میرا ارادہ بدل جائے اور میرے دِل میں خون کی پیاس جاگ اُٹھے۔" یہ کہتے ہُوئے ملکہ رُدبا نے مجھے ایک طرف دھکیل دیا۔

مَیں اُٹھ کھڑا ہُوا لیکن تن ڈھانپتے ہُوئے یہ کہے بغیر نہ رہ سکا: "میرے ساتھی سِلارو کا کیا ہوگا، اور کیا شہزادی تاشیہ بحفاظت اپنے باپ تک پہنچا دی جائے گی؟"

ملکہ رُدبا نے آنکھیں کھول دیں: "تمھیں میرا احسان مند ہونا چاہیے کہ تم زندہ ہو۔ کیا یہ تمھارے لیے کافی نہیں ہے، جو اپنے ساتھی اور تاشیہ کی رٹ لگائے ہُوئے ہو؟"

مَیں بے خوف وخطر بول پڑا: "تم نے میرے بارے میں بالکل صحیح اندازہ لگایا تھا کہ میں ایک عام آدمی نہیں ہُوں۔ چونکہ مَیں چھوٹا آدمی نہیں ہُوں اس لیے کوئی چھوٹی سی رعایت بھی قبول نہیں کر سکتا۔ اپنی زندگی بچا لے جانا کوئی بڑی بات نہیں۔ بڑی بات یہ ہے کہ اپنے ساتھیوں کے بارے میں بھی سوچا جائے۔ مَیں سِلارو اور شہزادی تاشیہ کو ساتھ لیے بغیر یہاں سے نہیں جاؤں گا، چاہے اس کے لیے مجھے اپنی زندگی سے ہی ہاتھ کیوں نہ دھونا پڑیں۔"

ملکہ رُدبا مجھے غور سے دیکھنے لگی: "آج تک کسی نے مُجھ سے اس انداز اور اس لہجے میں بات نہیں کی۔ کیا تمھیں مجھ سے خوف نہیں آ رہا؟ کیا تم نے لوگوں سے میری سفّاکی اور درندگی کی داستانیں نہیں سُنیں؟ کیا تمھیں اپنی زندگی عزیز نہیں ہے؟"

"مَیں مَرد ہُوں ملکہ عالیہ اور ایک مَرد کی ہی موت مَرنا چاہتا ہوں۔ مجھے مَرتے ہُوئے کوئی دُکھ نہیں ہوگا کیوں کہ مَیں اِس لیے نہیں مَروں گا کہ تمھارے امتحان میں ناکام رہا بلکہ میری موت اس لیے ہوگی کہ مَیں اپنے ساتھیوں کی زندگی کی ضمانت حاصل نہیں کر سکا!"

"تم بے حد دلیر آدمی ہو۔" ملکہ رُدبا اُٹھ بیٹھی۔

مجھے ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں میں اپنے لیے تحسین وستائش کی جھلک دکھائی دی۔

. . . پھر یک بہ یک اس کی آنکھوں میں اُداسی تیر گئی: "میری بھی کچھ مجبوریاں ہیں۔ مَیں آخر ایک عورت ہی تو ہُوں۔ میری رعایا اپنے حکمران کو طاقت ور اور جابر دیکھنا پسند کرتی ہے۔ اگر میں ذرا بھی کمزور پڑ جاؤں تو وہ میری بوٹیاں اُڑا دیں۔ میری حکمرانی اسی وقت تک ہے جب تک مَیں ظالم اور جابر ہُوں۔ یہی وجہ ہے کہ مَیں سفّاکی اور درندگی کے مظاہرے کرتی رہتی ہُوں۔ اس طرح عوام قابو میں رہتے ہیں۔ کبھی کبھی مَیں اُن کی تسکین کے لیے خونی تماشے بھی کرتی ہوں۔ میری رعایا ایک ایسی رعایا ہے، جس کی خون کی پیاس کبھی نہیں بُجھتی۔ چنانچہ مجھے ایک ایسا رُوپ دھارنا پڑتا ہے، جیسے میں ایک خوں آشام ملکہ ہُوں، اس سے وہ بہت خوش ہوتے ہیں۔ تمھیں، مَیں ایک خطرہ مول لیتے ہُوئے یہاں سے نکل جانے کی اجازت دے رہی ہُوں لیکن اگر تاشیہ اور تمھارے ساتھی سِلارو کو بھی نکل جانے دیا تو اسے میری کمزوری اور نااتفاقی پر محمول کیا جائے گا۔ رعایا پر میری گرفت کمزور ہو جائے گی اور اس طرح کسی بھی وقت میرا خاتمہ ہو سکتا ہے:"

ملکہ رُدبا کچھ دیر خاموش رہی پھر دوبارہ بولنے لگی: "مجھے افسوس ہے، سرفروش! مَیں تمھارے ساتھیوں کے معاملے میں کوئی رعایت نہیں دے سکتی۔ اُن کو رعایت دے کر میں اپنی رعایا کو اُن کے مخصوص خونی کھیل اور تفریح سے محروم نہیں کر سکتی۔ مجھے عوام کو بھی خوش رکھنا پڑتا ہے . . . اُن پر حکومت کرنے کا یہی ایک طریقہ ہے۔ ہاں اگر تم اُنھیں بچانا چاہو تو تمھیں کوشش کرنے کا موقع ضرور دے سکتی ہوں۔ اس طرح لوگ بھی لُطف اندوز ہوں گے اور میری کمزوری بھی ظاہر نہیں ہوگی۔ تمھیں موقع دیا جائے گا کہ خود کو اور اپنے ساتھیوں کو ہلاکت سے بچا سکو۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ تم خواب گاہ کے شہ زور ثابت ہوگئے ہو، اب دیکھنا ہے کہ مردِ میدان بھی ثابت ہوتے ہو یا نہیں:"

ملکہ رُدبا نے اشارہ کیا تو اگلے ہی لمحے دو لڑکیاں کمرے میں داخل ہُوئیں۔ اُنھوں نے فرش پر پڑی لبادے کی سیاہی ملکہ کے جسم پر ڈال دی اور پھر مجھے خواب گاہ سے باہر لے گئیں، جہاں مسلّح محافظ پہلے سے موجود تھے۔

اس بار مجھے اس کمرے میں نہیں لے جایا گیا، جہاں سلارو قید تھا بلکہ یہ کوئی اور ہی کمرہ تھا۔ بڑا کُشادہ اور بےحد آرام دہ۔ وہاں کھانے پینے کی مزید اشیا موجود تھیں۔ ایک گوشے میں اوڑھنے اور بچھانے کے لیے نرم اور نفیس کھالوں کا بھی انبار لگا ہُوا تھا۔

مسلّح محافظ مجھے کمرے میں چھوڑ کر چلے گئے لیکن جاتے ہُوئے دروازے کو مقفل کرنا نہیں بھولے تھے۔

مَیں، کمرے کی چھوٹی سی سلاخ دار کھڑکی کے قریب جا کھڑا ہُوا اور سوچنے لگا کہ دیکھو کل کا دِن میرے اور میرے ساتھیوں کے لیے اپنے جلو میں کیا لے کر آتا ہے؟ یہ حقیقت تھی کہ مَیں شہزادی تاشیہ اور سِلارو کے لیے بے حد پریشان تھا۔ شہزادی تاشیہ میری ذمّے داری تھی۔ اُس نے مجھ سے مدد مانگی تھی اور اَب یہ میرا فرض تھا کہ مَیں اُسے بخیریت اس کے باپ شہنشاہ اجباز تک پہنچاتا . . . رہا سِلارو کا معاملہ، تو وہ بھی اپنی جاں نثاری کے باعث میری ذمّے داری بن چکا تھا۔ اُس غریب نے میری خاطر بہت بڑا خطرہ مول لیا تھا۔ میرے لیے جلاوطن ہوگیا تھا۔ اب وہ، یوطاباؤ ملکہ رومر کی زندگی میں، کبھی موآبہ میں داخل نہیں ہو سکے گا۔ اس کے لیے دُنیا میں کوئی ہستی، کوئی سہارا تھا تو صرف میں ہی تھا۔ اس لیے مَیں اسے مایوس نہیں کر سکتا تھا۔ شہزادی تاشیہ کے لیے کم از کم مجھے ایک بات کا اطمینان تھا کہ ملکہ رُدبا اُسے کوئی گزند

نہیں پہنچائے گی بلکہ کسی نہ کسی بہانے بچانے کی کوشش کرے گی کیوں کہ شہنشاہ احباز بہرحال اس کا بھائی تھا۔ بھاری تاوان لے کر وہ تاشیہ کو رہا کر دے گی۔ تاشیہ کو شہنشاہ احباز تک پہنچانے سے میرے بھی کئی مفاد وابستہ تھے۔ ظاہر ہے، انعام و اکرام کے طور پر میرے وقار اور مرتبے میں اضافہ ہوتا اور میں اس سرزمین پہ، جہاں مجھے نہ جانے کتنا عرصہ رہنا تھا، باعزت طور پر رہ سکتا تھا۔

رات دم توڑ رہی تھی اور سپیدۂ سحر نمودار ہو رہا تھا۔ ساحل پر لہروں کا شور بدستور جاری تھا اور قلعہ آہستہ آہستہ انگڑائی لے کر بیدار ہو رہا تھا۔

میرے سامنے پورا ایک دن تھا اور آزمائش بھی کڑی تھی، پھر اس کے علاوہ تھکن اور نیند سے میری بُری حالت ہو رہی تھی۔ میں کھڑکی سے ہٹ آیا اور کھالوں کو دبیز اور آرام دہ بستر کی صورت دے کر بہتر فردا کی اُمید لیے ہُوئے، سونے کے ارادے سے لیٹ گیا۔

★★

اِس خونیں کھیل کے آغاز سے پہلے مجھے تاشیہ اور سِلارُو سے تفصیلی ملاقات کی اجازت دے دی گئی تھی۔ وہ دونوں، قلعے کے اندر ایک بڑے سے احاطے میں الگ الگ ستونوں سے بندھے ہُوئے تھے اور ملکہ رُوبا کی پاگل اور خون کی پیاسی رعایا اس تماشے کو دیکھنے کے لیے جمع ہو چکی تھی۔ اسی احاطے میں ایک طرف تین بڑے آہنی پنجرے رکھے ہُوئے تھے جن میں تین جسیم اور قوی ہیکل ریچھ مشتعل اور غضب ناک ہو کر بُری طرح غرا رہے تھے۔

"ہُرمزد ہماری حفاظت کرے۔" سِلارُو پنجروں کی طرف دیکھتے ہُوئے بولا۔

مَیں نے پہلی بار اُسے حقیقی معنوں میں خوف زدہ ہوتے دیکھا۔ اس کے دونوں ہاتھ پُشت پر بندھے ہُوئے تھے اور ایک موٹی ڈوری کمر سے گزار کر اُسے ستون سے باندھ دیا گیا تھا۔ سِلارُو خوف زدہ ہونے کے باوجود مستعد اور چاق و چوبند نظر آتا تھا۔ اس کی آنکھیں کسی اندرونی جذبے سے چمک رہی تھیں اور وہ سرگوشی میں کہہ رہا تھا "مجھے معلوم ہے، مالک! اگر ہُرمزد نے ہمیں بچایا، تو تمھارے ذریعے ہی بچائے گا۔ میری بات غور سے سُنو! اگر تم ان میں سے کسی ایک ریچھ کو فوری طور پر ہلاک کر دو، تو ہمارے بچ نکلنے کی صُورت بن سکتی ہے۔ یہ وحشی جانور ایک دوسرے کو کھا جاتے ہیں۔ اگر تم ایک ریچھ کو ہلاک کر کے ڈال دو تو باقی دونوں ریچھ اس پر ٹوٹ پڑیں گے۔ اس وقفے سے فائدہ اُٹھاتے ہُوئے تمھیں بہت کچھ کرنے کا موقع مِل جائے گا۔ . . اور مالک! تم جانتے ہی ہو کہ اصل چیز وقت کا صحیح استعمال ہے، بروقت فیصلہ، بروقت اقدام، یہ ملکہ رُوبا . . . ہُرمزد اس کا قلب پارہ پارہ کرے، اس نے تمھارے لیے ایک چھوٹی سی گنجائش چھوڑی ہے۔ ذرا میرے اور شہزادی تاشیہ کے ستونوں کی طرف دیکھو۔ یہ اتفاقی بات نہیں ہے۔"

مَیں نے پہلے سِلارُو اور پھر شہزادی تاشیہ کے ستون کی طرف دیکھا . . .

سِلارُو ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔

مَیں نے پہلے یہ بات محسوس نہیں کی تھی۔ اب جو غور سے دیکھا تو پتہ چلا کہ دونوں ستونوں کے درمیان تقریباً پچاس قدم کا فاصلہ ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میں بیک وقت اِن دونوں کو نہیں بچا سکتا تھا۔ صرف ایک کو بچانا ممکن تھا۔ اب، میری مرضی پر منحصر تھا کہ مَیں کسے بچاتا ہُوں اور کسے ریچھوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا ہُوں۔ گویا ملکہ رُوبا نے یہاں بھی میرا امتحان لیا تھا۔ اس کے خیال میں، مَیں تاشیہ کو بچاتا کیوں کہ اس سے شہنشاہ احباز کی خوشنودی حاصل ہوتی اور سِلارُو کو یوں ہی مَر جانے دیتا کیوں کہ وہ کوئی اہم آدمی نہیں تھا : . . لیکن کیا واقعی سِلارُو ایک اہم آدمی نہیں تھا؟ میرے نزدیک ایسا نہیں تھا۔ وہ میرے لیے بے حد اہم تھا۔ میری نگاہ میں اس کی قدر و قیمت شہزادی تاشیہ سے کسی طرح بھی کم نہیں تھی۔ میں اس کے ضائع ہونے کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا۔ شہزادی کی جان تو، اُسی کی مرہونِ منت تھی۔ مَیں نے دائیں ہاتھ میں کانسی کا بھاری کلہاڑا سنبھالتے ہُوئے، دُور چبوترے پر ایک چوبی تخت پر براجمان ملکہ رُوبا کی طرف دیکھا اور اس کے خیالات پڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ میں شہزادی تاشیہ کو سِلارُو پر فوقیت دوں گا اور اُسے ریچھوں کا لقمۂ تر بننے دوں گا۔ اس طرح ریچھ شہزادی تاشیہ کی طرف سے مایوس اور ناکام ہو کر سِلارُو پر چڑھ دوڑیں گے اور اس کی رعایا کو تفریح کا سامان مہیا ہو جائے گا۔ اس طرح ملکہ رُوبا سب کچھ مجھی پر ڈال رہی تھی۔ ایک تیر سے دو نہیں بلکہ تین شکار . . . زرِ تاوان حاصل کرنے کے لیے شہزادی تاشیہ محفوظ رہتی۔ سِلارُو کی ہلاکت سے رعایا کے سفاک جذبوں کی تسکین ہو جائے گی اور مَیں اپنی جگہ سمجھتا رہوں گا کہ ملکہ نے مجھے اپنے ساتھیوں کو بچانے کا موقع فراہم کیا تھا . . . لیکن مَیں کامیاب نہ ہو سکا اس لیے ایک ساتھی سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ واقعی کیا دماغ پایا تھا اس بدبخت عورت نے . . . مَیں اس کی ذہانت کو سراہے بغیر نہ رہ سکا۔

مَیں نے احاطے کے چاروں طرف نظر دوڑائی۔

مجھے ایک اور حیرت کا سامنا کرنا پڑا . . .

ہر ستون کے قریب، چوبی رُکاوٹوں کے عقب میں . . . تیر اندازوں کا ایک ایک دستہ متعین تھا اور قلعے کا ایک افسر انھیں کچھ ہدایات دے رہا تھا۔ اس رمز کو سمجھنے میں بھی مجھے زیادہ دیر نہیں لگی۔ اس انتظام و انصرام میں دو ہی باتیں پوشیدہ تھیں۔ پہلی یہ کہ ملکہ ہم تینوں کو تحفظ دینا چاہتی ہے۔ اس سے پہلے کہ ریچھ ہمیں ختم کر دیں، تیر انداز تیروں کی بوچھار کر کے انھیں ختم کر دیں گے۔ ریچھوں کی موت کی صورت میں بھی رعایا کی تفریح ہو جاتی، یا پھر ملکہ نے اس خیال کے تحت تیر اندازوں کا دستہ متعین کیا تھا کہ اگر میں نے شہزادی تاشیہ کو چھوڑ کر سِلارُو کو بچانا چاہا تو تیر انداز شہزادی کے قریب پہنچنے والے ریچھ کو چھلنی کر دیں گے۔ بہرحال ملکہ ایک ذہین عورت تھی اُس نے سب کو خوش کرنے کے لیے بہت اچھا منصوبہ بنایا تھا۔ دونوں صورتوں میں اگر کوئی ملزم ٹھہرتا تھا، تو وہ صرف میری ہی ذات تھی۔

سِلارُو بھی ان تمام باتوں کو بخوبی سمجھ رہا تھا۔ وہ پلکیں جھپکاتے ہوئے بولا "مَیں جانتا ہُوں، مالک! کہ تم ہمیں بچانے کی پوری پوری کوشش کرو گے لیکن مجھے یہ بھی احساس ہے کہ مَیں شہزادی تاشیہ کی خاکِ پا بھی نہیں ہُوں، اس کے سامنے میری حیثیت حقیر ہے . . . لیکن مالک اگر کوئی ایسا لمحہ آئے اور تمھیں کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑے تو بے دھڑک شہزادی کو تحفظ دینا میں ایک بے نام و نشان آدمی ہوں، میری کمی کسی کو بھی محسوس نہیں ہو گی۔"

میں نے سِلارُو کی پیٹھ پر آہستہ سے تھپکی دی اور اس کے پاس سے ہٹ گیا۔ اب اس سے کچھ کہنے کے لیے وقت ہی کہاں رہ گیا تھا۔ مَیں، تاشیہ کے قریب پہنچا تو اُسے مطمئن اور بے خوف پایا۔ اُس کی گردن تنی ہُوئی تھی اور سر فخر سے اُٹھا ہُوا تھا۔ مجھے اس کی مضبوطی اور استقامت پر حیرت ہُوئی۔ وہ ایک متوقع موت کو گلے لگانے کے لیے پُوری طرح تیار تھی۔

"وہ میری موت کی خواہاں ہے، سرفروش!" مجھے اپنے قریب پاکر اس نے سرگوشی کی "البتہ اپنے گھناؤنے مقاصد کے حصول کی خاطر وہ تمھیں مَرنے نہیں دے گی۔ مجھ سے وعدہ کرو کہ تم میری موت کا بدلہ ضرور لو گے۔ وعدہ کرو۔ اجنبی سرزمین کے شہزادے۔ مجھ سے وعدہ کرو؟"

"کسی وعدے کی ضرورت نہیں ہے، شہزادی! وہ نہ تمھاری موت کی خواہاں ہے اور نہ ہی مجھے ہلاک کرنا چاہتی ہے۔ ہم دونوں اس کے شکار نہیں ہیں بلکہ اس کا اصل شکار تو بیچارہ سِلارُو ہے۔ جس کی موت پر آنسو بہانے والا بھی کوئی نہیں ہے۔"

تاشیہ کی بھَووں میں کھنچاؤ پیدا ہو گیا اور اس کی بھُوری آنکھوں میں اضطرابی سی کیفیت اُبھری "تو پھر تم اپنے اسی ساتھی کو بچاؤ۔ اُسے تحفظ دینا، تمھارا فرض ہے . . . لیکن وعدہ کرو کہ بعد میں تم اس غلیظ عورت سے میرا انتقام ضرور لو گے۔"

عجیب بات تھی . . . سِلارُو اور تاشیہ، دونوں ہی ایک دوسرے کے لیے ایثار سے کام لے رہے تھے۔ مَیں نے مسکراتے ہُوئے کہا "تم بے فکر رہو۔ خدا نے چاہا تو مَیں، تم دونوں کو بچاؤں گا اور اگر مَرنا ہے تو ہم تینوں ساتھ ہی مریں گے۔"

مجمع بے چین ہو رہا تھا۔

ریچھوں کی غراہٹ بھی بڑھتی جارہی تھی۔
مجھے فوری طور پر ملکہ کے حضور طلب کرلیا گیا۔
میں اس کے تخت کے قریب پہنچا تو وہ کچھ آگے جھک گئی۔ کچھ دیر اپنی گہری سیاہ آنکھوں سے مجھے گھورتی رہی پھر مسکرا کر بولی: "میں نے اس صورتِ حال کے بارے میں بہت غور کیا ہے، سرفروش، تمھیں بہرحال کسی ایک کو بچانا ہے۔۔۔ اور تم اس لڑکی کو بچاؤ گے۔ اس حقیر شخص کو مرجانے دو گے۔ میں نے اس سلسلے میں احکامات دے دیے ہیں لیکن تمھیں بہادری اور جواں مردی کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔ میری احمق اور گنوار رعایا تفریح چاہتی ہے اور یہ تفریح ایک دو ریچھ اور تمھارے حقیر ساتھی کی موت کی صورت میں ہی انھیں مل سکتی ہے۔ جاؤ، میں آج رات تم سے پھر ملوں گی۔"
میں نے کلہاڑا سر سے بلند کیا اور مؤدب ہو کر کہا: "میں تیار ہوں، ملکہ معالیہ۔ ریچھوں کو پنجروں سے نکالنے کا حکم دے دو۔"
میں واپس اس جگہ آگیا، جسے میں نے بہت غور و فکر کے بعد منتخب کیا تھا۔ یہ جگہ دونوں ستونوں کے درمیان تھی۔ میں اس جگہ سے بیک وقت اور ضرورت کے مطابق کسی بھی ستون تک پہنچ سکتا تھا۔
تینوں پنجرے دھکیل کر ستونوں سے کچھ فاصلے پر رکھ دیے گئے۔
میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ یہ محض اتفاق تھا یا پھر سوچا سمجھا منصوبہ۔۔۔ کہ تینوں پنجرے ایک ساتھ نہیں کھولے گئے بلکہ انھیں ایک ایک کر کے کھولا گیا۔ یہ میرے لیے ایک بہتر صورت تھی۔ مجھے کچھ کر گزرنے کے لیے چند قیمتی لمحے مل گئے تھے۔۔۔
پہلا ریچھ پنجرے سے باہر آیا تو اس کی تھوتھنی کھلی ہوئی تھی۔ جس سے غیر معمولی بھیانک جبڑے جھانک رہے تھے۔ وہ پچھلے دو پیروں پر کھڑا ہوگیا اور بُری طرح غرانے لگا۔
اس کا قد دس ہاتھ سے کم نہ رہا ہوگا، اس کا جسم کوئلے کی مانند سیاہ تھا۔ اس کے دونوں بازو پھیلے ہوئے تھے اور وہ اپنی چھوٹی چھوٹی کینہ توز آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا پھر اس نے تھوتھنی اوپر اٹھائی اور ہوا میں کچھ سونگھنے لگا۔ اس کے نتھنوں میں انسانی جسم کی مخصوص بو پہنچ گئی تھی۔ اس کے ڈھول جیسے سینے سے زوردار غراہٹ بلند ہوئی اور وہ جھومتا ہوا تاشیہ کی طرف بڑھا۔
میں نے کلہاڑے پر گرفت مضبوط کی اور اسے سر سے بلند کر کے، لہراتا ہوا ریچھ کی طرف بڑھا۔ ساتھ ہی بلند آواز سے چیختا بھی رہا تاکہ ریچھ کی توجہ میری طرف ہوجائے لیکن ریچھ نے ایک نسوانی جسم کی خوشبو محسوس کر لی تھی، لہٰذا اس نے مجھے نظرانداز کر دیا اور تاشیہ کی طرف بڑھتا رہا۔۔۔
اسی لمحے مجھے دوسرا ریچھ پنجرے سے نکلتا دکھائی دیا۔
میں نے سوچنے میں مزید وقت ضائع کیے بغیر پہلے ریچھ پر حملہ کر دیا۔
کلہاڑے کا پھل ریچھ کی موٹی گردن میں دھنس گیا۔ وہ زور سے غرایا اور غضب ناک ہو کر مجھ پر حملہ آور ہوا۔ اس کا طاقت ور پنجہ پوری قوت سے میری طرف آیا، جسے میں پھرتی سے، ایک طرف ہٹ کر بچا گیا۔
بچتے بچتے میں نے کلہاڑے کا دوسرا وار کیا۔
ریچھ اس کوشش میں تھا کہ کسی طرح مجھے اپنی گرفت میں لے کر، سینے سے بھینچ کر، مار ڈالے۔ اس کے جبڑے بھیانک انداز میں کھلے ہوئے تھے۔ حملے کے دوران کئی بار میرے کلہاڑے کا پھل اس کی موٹی کھال میں دھنس گیا اور پھل نکالتے ہوئے میں ریچھ کی گرفت میں آنے سے بال بال بچا۔ میرے مسلسل حملے اور اپنی ناکامی سے ریچھ پاگل ہونے لگا۔ اس کے چیخنے اور اس کے غرانے کا انداز دیدنی تھا۔ اب وہ تاشیہ کو بھول چکا تھا اور اس کی ساری توجہ میری طرف ہو چکی تھی۔
اس وحشی ریچھ سے نبرد آزما ہوتے ہوئے، ایک لمحے کے لیے پلٹ کر میں نے دوسرے ریچھ کی طرف دیکھا۔
۔۔۔ میرے پسینے چھوٹ گئے۔
وہ سیدھا سلارو کی طرف جا رہا تھا۔۔۔ اب پہلے ریچھ سے جنگ کو مزید طول نہیں دیا جا سکتا تھا۔ میں نے کلہاڑا بلند کیا اور قوت پیدا کرنے کے لیے اسے تیزی سے سر کے اوپر گھمایا۔۔۔ پھر ایک چیخ مار کر تمام تر توانائی کے ساتھ ریچھ کے سر پر دے مارا۔ یہ ضرب بہت گہری اور کاری ثابت ہوئی۔ پھل ریچھ کی کھوپڑی کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہوا مغز تک اتر گیا۔
ریچھ کے سر سے خون کا فوارہ ابل پڑا۔
وہ زور سے غرایا اور لڑکھڑا کر میرے قدموں میں گر پڑا۔
پھر اس کی غراہٹ مدھم پڑتی گئی اور ارد گرد خون کا چھوٹا سا تالاب بنتا گیا۔ یک بہ یک ریچھ کا جسم زور سے کانپا اور ہمیشہ کے لیے ساکت ہوگیا۔

میں فوراً پلٹا۔۔۔
اور دوسرے ریچھ کی طرف دوڑنے لگا۔
وہ ریچھ سلارو کے قریب پہنچ چکا تھا اور سلارو کے حلق سے خوف زدہ چیخیں بلند ہو رہی تھیں۔ اس کے چیخنے کی وجہ سمجھ میں آتی تھی۔ دوسرا ریچھ پہلے ریچھ کے مقابلے میں کہیں زیادہ جسیم و قدآور تھا اور غراتا ہوا، حملہ آور ہونے کے انداز میں سلارو کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ان کا درمیانی فاصلہ قریب الختم تھا ریچھ کے غیر معمولی بازو سلارو کو اپنی گرفت میں لینے کے لیے بڑھے تو وہ بے چارا دہشت سے چیخ اٹھا لیکن اس وقت میں نے کلہاڑے کا بھرپور وار ریچھ کی گردن پر کیا۔
ریچھ جھجک کر پیچھے ہٹ گیا۔
یہی وہ لمحہ تھا جب میری نگاہ ایک اور دہشت ناک منظر پر پڑی۔
تیسرا ریچھ تاشیہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔
میرا دل بیٹھنے لگا۔
وہ نازک گھڑی آگئی تھی جس سے میں خوف زدہ تھا۔ دو میں سے کوئی ایک۔۔۔ تاشیہ یا سلارو۔۔۔ اور تاشیہ کے پاس پہنچنے کے لیے وقت نہیں تھا۔
یہ سب کچھ ایک ثانیے سے بھی کم وقت میں ہوگیا تھا۔ میں نے دوبارہ سلارو کی طرف دیکھا تو ریچھ کے پنجے اسے اپنی گرفت میں لینے کے لیے جسم کے قریب پہنچ چکے تھے اور سلارو کے چہرے پر موت کی زردی چھا گئی تھی۔ اب اس کے حلق سے آوازیں نہیں نکل رہی تھی۔ اس نے غالباً اس موت کو اپنا مقدر سمجھ کر قبول کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ چشم زدن میں، میں اچھل کر سامنے آیا اور پوری قوت سے کلہاڑے کا وار کیا۔ ریچھ کا ایک پنجہ کٹ کر دور جا گرا۔
ریچھ غرا کر پیچھے ہٹا۔
میں نے دوسرا وار کر دیا۔۔۔
یہ ضرب پہلے ریچھ کی مانند اس کی کھوپڑی پر ثبت ہوئی۔ ریچھ کا سر کھل گیا اور خون کا فوارہ ابل کر میرے چہرے، جسم اور کپڑے بھگو گیا۔ گرم گرم خون کی تلخی مجھے اپنی زبان پر بھی محسوس ہوئی۔۔۔ ریچھ غراتا ہوا زمین پر ڈھیر ہوگیا۔ میں نے آخری وار کیا اور اس کا سر الگ کر دیا۔۔۔ پھر میں اضطراری طور پر پلٹا اور تاشیہ کی طرف دوڑنے لگا۔
اچانک میرے حلق سے ایک بے ساختہ قہقہہ ابل پڑا۔
سلارو کی بات درست ہی ثابت ہوئی تھی۔ وہ واقعی دانش مندوں کا دانش مند تھا۔ تیسرا ریچھ تاشیہ کو بھول کر اپنے مردہ ساتھی کے جسم سے ضیافت اڑا رہا تھا۔ اس نے مردہ ریچھ کے ٹکڑے کر دیے تھے اور شکم پُری میں اس قدر منہمک تھا کہ میں اس کے عقب سے دوڑتا ہوا تاشیہ کی طرف گیا تو اس نے میری طرف توجہ تک نہیں دی۔ میں نے تاشیہ کے قریب پہنچتے ہی پلٹ کر کلہاڑے کے ایک ہی بھرپور وار سے تیسرے ریچھ کا سر بھی تن سے جدا کر دیا۔
میں نے تاشیہ کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں اپنے لیے ایک ایسا جذبہ امڈتے دیکھا، جو کسی بھی مرد کے لیے سرمایۂ حیات اور حاصلِ زندگی ہوتا ہے۔ اس جذبے، اس تحسین اور اس پیار کو ایک اندھا آدمی بھی محسوس کر سکتا تھا۔ تاشیہ مجسم خود سپردگی بنی ہوئی تھی۔ اس کیفیت میں کئی لمحے گزر گئے کہ اچانک مجمعے نے شور مچانا شروع کر دیا۔
"مار ڈالو، ان تینوں کو مار ڈالو۔۔۔ اور ریچھ لائے جائیں۔ اس لڑکی کو ہمارے حوالے کر دو اور دونوں مردوں کو مار ڈالو۔"
۔۔۔ پھر چیختی پکارتی آوازوں کا ایک دوسرا ریلا آیا۔
"ہمارے تین بہترین ریچھوں کا نقصان ہوا، اس سے کیا حاصل ہوا؟ یہ شخص شیطان ہے، جادوگر ہے، اسے تیروں سے چھلنی کر دو۔"
مجمع چیختا چلاتا اور احتجاج کرتا رہا لیکن ملکہ کے سپاہیوں نے ان آوازوں پر کان نہیں دھرا۔ اس کے برعکس ملکہ زوبا کچھ مشتعل ہوگئی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور قلعے کے افسروں کو کچھ احکامات جاری کیے۔ اگلے ہی لمحے مجھ پر تیروں کی بارش ہونے لگی۔۔۔ مجمع چیختا چلاتا، بے قابو ہو کر اندھا دھند بھاگ اٹھا۔
میں نے کلہاڑے کی مدد سے تاشیہ کے بند کاٹ دیے پھر اس کا ہاتھ تھام کر سلارو کی طرف دوڑنے لگا۔ میں نے اسے بھی آزاد کر دیا۔ اس وقت تک مجمع یا تو منتشر ہو چکا تھا یا پھر قابو میں آ چکا تھا۔ سلارو بندشوں سے آزاد ہوتے ہی سرگوشی میں بولا۔
"جلدی سے میرے ساتھ نکل چلو، مالک! میں نے اس قلعے میں ایک خفیہ راستہ دیکھا ہے۔ اگر ہم عجلت سے کام لیں تو یہاں سے نکل سکتے ہیں۔"
میں نے سلارو کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے وہاں سے نکلنے کا ارادہ کیا لیکن میری امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ تیر اندازوں

کا ایک دستہ ہماری طرف بڑھ رہا تھا۔ ملکہ رُوبا یقیناً ایک میری آنکھ بھی رکھتی تھی جو بہت دُور تک دیکھنے کے علاوہ لوگوں کے پوشیدہ ارادے بھی بھانپ لیتی تھی۔ وہ ہم سے ہاتھ نہیں دھونا چاہتی تھی۔ یعنی تاشیہ کی شکل میں بھاری زرِتاوان سے اور میری صورت میں اپنی لذت کوشیوں سے محرومی کے احساس نے اُسے مجبور کردیا تھا اور تیر انداز ہمیں گرفتار کرنے کے لیے بڑھ رہے تھے۔ ۔ ۔ لیکن مَیں یا میرے دونوں ساتھی کوئی لوٹ کا مال نہیں تھے کہ اب یوں آسانی سے خود کو اُن کے حوالے کر دیتے۔ اس وقت میں آزاد تھا، مسلح تھا اور میری رگوں میں خون کا بہاؤ بھی بہت تیز ہو چکا تھا۔ ملکہ رُوبا مجھے یوں تو نہ چھوڑ دیتی۔ جان سے نہ مارتی لیکن میرے جسم کا ایک ایک قطرۂ خون نچوڑ لیتی۔ وہ بھی ایک طرح کی موت ہی ہوتی اور جب جلد یا بدیر مرنا ہی ٹھہرا تو تاخیر کس بات کی۔ ۔ ۔ لڑو۔ ۔ ۔ مارو اور مر جاؤ۔

مَیں نے کلہاڑا سر سے بلند کرلیا تو قلعے کے اَفسر کا اشارہ پاکر تیر اندازوں کا دستہ ایک گھٹنے کے بَل زمین پر جُھک گیا۔ اُنھوں نے تیر اپنی کمانوں میں چڑھا لیے تھے۔

"نہیں مالک!" سِلارد چیخ پڑا۔ "یہ تعداد میں ہم سے کہیں زیادہ ہیں۔ ہتھیار ڈال دو۔"

"نہیں، سرفروش۔" تاشیہ میرے قریب آکھڑی ہُوئی۔ اس کے لہجے میں بَلا کی کاٹ تھی۔ "تم ان سے ضرور لڑو گے۔ ہم یہیں اور اس وقت مریں گے۔ اس طرح ہم اس کُتیا کے قابو میں نہیں آسکیں گے اور اس کے شیطانی منصوبوں کو خاک میں مِلا دیں گے۔ وہ ہمیں زندہ پکڑنا چاہتی ہے لیکن ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ ہم لڑتے ہوئے مریں گے اور مَیں بھی تمھارے ساتھ ہی مروں گی۔"

دفعتاً قلعے میں سنکھ اور قرنا پھُونکے جانے لگے۔ اُن کی آوازیں بڑی کریہہ اور بھیانک تھیں۔ یہ سنکھ اور قرنے اس وقت پھُونکے جاتے تھے جب قلعے پر کوئی تباہی نازل ہوتی تھی۔ معاً قلعے کے دَر و دیوار سے عجیب وحشیانہ ہاہاکار گونجنے لگی۔ قرنوں اور سنکھوں کی آوازیں مہیب سے مہیب تر ہوتی گئیں۔ ان ہیبت ناک آوازوں میں قلعے کے لوگوں کی چیخ و پکار بھی شامل ہوگئی۔

اچانک احاطے میں ملماتی سناٹا چھا گیا پھر اس سناٹے کی جگہ دہشت نے لے لی۔ سپاہیوں اور قلعے کے افسروں کے چہرے اُتر گئے اور ان پر موت کی زردی چھا گئی۔ یہ سکوت۔ ۔ ۔

سکوتِ مرگ تھا۔ ہر شخص کی آنکھیں ویران قبروں کا منظر پیش کررہی تھیں۔ ۔ ۔ پھر ایک جھٹکے سے سکوت اور سناٹا ٹوٹ گیا۔ عورت اور مرد سبھی، جِس کے جِدھر سینگ سمائے، بھاگ کھڑا ہُوا۔ مائیں اپنے بچّوں کو بھُول گئیں۔ دوست، دُشمن کی تفریق ختم ہوگئی۔ اعصاب کو چٹخا دینے والا شور برپا ہوگیا۔ کان پڑی آواز نہیں سُنائی دے رہی تھی۔ مَیں نے تیر انداز دستے کی اَفسر کی طرف دیکھا، اُس نے کوئی حُکم دیا تھا جِس کے ساتھ ہی تیر اندازوں نے ہمیں نظر انداز کر دیا اور وہ سب داخلی دروازے کی طرف دوڑ پڑے۔

اسی لمحے قیامت کے اس شور میں کسی کی، آسمان کو چیرتی ہُوئی چیخ سُنائی دی۔

"سُرخ شیطان۔ ۔ ۔"

۔ ۔ ۔ اور یہ چیخ احاطے میں منجمد ہو کر رہ گئی۔

سب سے پہلے سِلارد کی نظر اس پر پڑی تھی۔ اس نے میرا بازو مضبوطی سے پکڑتے ہوئے ایک طرف اشارہ کیا: "اُدھر دیکھو مالک! اس عظیم مینار کی طرف۔ ہُرمزد ہماری حفاظت کرے، وہ بلاشبہ راخیل ہے، جو سُرخ شیطان کے نام سے مشہور ہے۔"

تاشیہ میرے قریب کھڑی بُری طرح کانپ رہی تھی۔ اس کی ساری دلیری اور جرأت رُخصت ہو چکی تھی اور اس کا چہرہ خوف سے سفید پڑ گیا تھا۔

"اب ہمارا خاتمہ ہی سمجھو سرفروش! اب ہم کسی طرح بچ نہیں سکتے۔ وہ ایک ایسا شیطان ہے کہ ہُرمزد بھی بدی کی اس قوت کو شکست نہیں دے سکا۔" وہ بولی تو اس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔

کلہاڑے کے دستے پر میری گرفت مضبوط ہوگئی۔ میں اس مینار کی طرف دیکھنے لگا۔ جہاں گزشتہ رات مَیں نے

ملکہ رُوبا کے لیے ایک خصوصی خدمت انجام دی تھی۔ میرے ذہن میں ایک نیا منصوبہ جنم لے رہا تھا۔ نئے خطرات کے پیشِ نظر اپنی بقا کے لیے نئے حربوں کی ضرورت تھی۔ اب کسی اور ہی انداز سے کام لینا ہوگا۔

میری نگاہوں کے سامنے، مینار کے قریب جو شخص کھڑا تھا، اس کا قد سات فٹ سے کسی طرح بھی کم نہیں تھا۔ اس کا جسم متناسب۔ ۔ ۔ اور بے حد مضبوط نظر آتا تھا۔ اس کے سر پر رکھا ہُوا فولادی خود اس کی گردن تک آتا تھا۔ خُود کے بالائی حِصّے پر ایک نوک دار طلائی میخ اُبھری ہُوئی تھی۔ چوڑے چکلے شانے پر ایک ارغوانی رنگ کا قیمتی لبادہ پڑا ہُوا تھا، جو ہَوا میں کسی زخمی پرندے کی مانند پھڑپھڑا رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ صلیب کی شکل میں سینے پر بندھے ہُوئے تھے۔ وہ خود مسلح نہیں تھا البتہ اپنے مسلح ساتھیوں کو بھاری اور گونجدار آواز میں احکامات دے رہا تھا۔ اس کے ساتھی بڑی دلجمعی کے ساتھ قتلِ عام اور قلعے کی اینٹ سے اینٹ بجانے میں مصروف تھے۔

راخیل کی شخصیت میں، جو چیز سب سے نمایاں تھی، وہ اس کی داڑھی تھی جس کا سِرا اُس کی ناف کو چھُو رہا تھا۔ یہ داڑھی شعلے کی مانند سُرخ تھی اور درمیان سے دو حِصّوں میں بٹی ہُوئی تھی، جنھیں رنگین پٹیوں کی مدد سے باندھا گیا تھا۔ وہ بار بار اپنی داڑھی سے کھیلنے لگتا اور رنگین پٹیوں کو دُرست کرنے لگ جاتا تھا۔

اچانک میری نگاہ ایک عورت پر پڑی۔

وہ صرف ایک لمحے کے لیے مجھے دِکھائی دی پھر کسی سائے کی مانند غائب ہوگئی۔ ۔ ۔ لیکن اُس ایک ہی لمحے میں، میں نے اسے پہچان لیا۔ ۔ ۔ اور میرا دِل اپنے قالب میں بڑے زور سے اُچھل پڑا تھا میری حالت اتنی عجیب ہوگئی کہ مجھے اپنی ہستی پر سناٹوں کا پہرہ محسوس ہونے لگا۔ ان سناٹوں میں جسم پر بہنے والے پسینے کی سرسراہٹ تک مجھے سُنائی دینے لگی تھی۔ وہ میرا واہمہ یا التباسِ نظر نہیں تھا بلکہ ایک زندہ حقیقت تھی۔ میں اس عورت کو پہچانتا تھا۔

میرے ذہن میں ایک گزرا ہُوا منظر گھوم گیا۔

بلوط کے درخت، سفید لبادے اور سفید نقاب میں دلکش چہرہ اور سُنہرے بال۔ ۔ ۔ یہ سب کچھ ایک خواب کی مانند تھا لیکن میں نے ایک جھلک میں بھی اسے پہچان لیا تھا، وہ درسیلا تھی، قبر وتیوں کی بڑی پُجارن!

مَیں حیران تھا کہ آخر وہ سُرخ شیطان کی رفاقت میں یہاں کیا کر رہی ہے؟

درسیلا غائب ہو چکی تھی اور میں دوبارہ راخیل اور اس کے آدمیوں کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ لُوٹ مار اور قتلِ عام کا وحشیانہ اور سفاکانہ کھیل وسیع پیمانے پر جاری تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے سُرخ شیطان اور اس کے چیلے چانٹے وہاں موجود کسی کو بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے اور قلعے کو خاک میں مِلا کر ہی دم لیں گے۔

دفعتاً سِلارد میری آستین کھینچتے ہوئے بولا: "تم دیر کیوں کر رہے ہو، مالک؟ اس خفیہ راستے سے بھاگ نکلنے کا اب بھی امکان ہے اور ہر گزرتے ہُوئے لمحے کے ساتھ یہ امکان کم ہوتا جا رہا ہے۔"

سِلارد کی بات اپنی جگہ دُرست تھی لیکن میں ایک فیصلہ کرچکا تھا۔ میں، تاشیہ اور سِلارد کو لیے ہوئے ایک دیوار سے ٹِک گیا۔ اب اگر کوئی خطرہ درپیش ہوتا تو سامنے کی جانب سے ہوتا۔ ۔ ۔ عقبی حِصّے کی طرف سے بے فکری ہوگئی تھی۔ سِلارد میری طرف پریشان نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"یہ تم کیا کرنے جا رہے ہو، مالک! کیا یہاں سے نکلنے کا ارادہ نہیں ہے؟"

"سِلارد۔ ۔ ۔" میں نے کہا: "اب مَیں جو کچھ بھی تم سے پُوچھوں تم خوب سوچ سمجھ کر اس کا جواب دینا۔ اس لیے کہ صحیح معلومات ہی پر ہماری زندگی کا دار و مدار ہے۔ یہ بحری قزاق اپنی زندگی میں کس چیز کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں؟ میرا مطلب ہے، انھوں نے اپنی اس پیشہ ورانہ زندگی کی بُنیاد کن قدروں پر رکھی ہے؟ اُن کے کچھ اصول اور کچھ ترجیحات ضرور ہوں گی؟ کیا تم اس سلسلے میں کچھ بتا سکتے ہو؟"

غریب سِلارد، میری طرف یوں دیکھنے لگا جیسے شبہ ہو کہ میرا دماغ چل گیا ہے۔ تاشیہ مداخلت کرتے ہُوئے بولی: "یہ تم نے کیسی گفتگو چھیڑ دی، سرفروش! اب جب کہ ہم موت کے مُنہ میں ہیں، کیا اس قِسم کی گفتگو ضروری ہے؟"

"بے حد ضروری ہے۔" میں نے سخت لہجے میں کہا: "تمھارا نازک دماغ ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتا۔" میں ایک بار پھر سِلارد کی طرف متوجہ ہو گیا: "ہاں! تم نے بتایا نہیں؟"

سِلارد نے کچھ کہنے کے لیے مُنہ کھولا ہی تھا کہ اچانک اُچھل کر جلدی سے ایک طرف ہٹ گیا۔ ایک بھالا سنسناتا ہُوا آیا اور ہمارے عقب میں دیوار سے جا ٹکرایا۔ اگر سِلارد اپنی پہلی جگہ پر ہوتا تو بھالے کی اَنی اس کی کھوپڑی میں پیوست ہو چکی ہوتی۔

"مالک!" سِلارد گہری گہری سانس لیتے ہُوئے بولا: "یہ بحری

قزاق شیطان سے کم نہیں ہیں۔ بلاشبہ ان کے بھی اپنے کچھ اصول ہیں۔ زندگی کے بارے میں ان کے اپنے مخصوص معیار مقرر ہیں۔ یہ اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں ہمت و جرأت اور مردانگی و شجاعت کو اہمیت دیتے ہیں۔ یہ لڑتے لڑتے ماردینا یا مرجانے ہی کو سب کچھ جانتے ہیں۔ یہ بہادر، دلیر اور جاں باز لوگوں کی عزت کرتے ہیں۔ اُن کے نزدیک جاں باز ہونا زندگی کی معراج ہے۔۔۔ لیکن مالک! ہم بحری قزاق نہیں، جو اِن کے زمرے میں آئیں۔ یہ اپنے آدمیوں کے سوا ہر ذی نفس کو قتل کردیتے ہیں، خواہ وہ کوئی بھی کیوں نہ ہو۔ یہ تو کسی کو قیدی بھی نہیں بناتے البتہ عورتوں کو ساتھ لے جاتے ہیں۔"

سلارد کی بات ختم ہوتے ہی تاشیہ بول پڑی: "وعدہ کرو، سرفروش! کہ وقت آنے پر تم مجھے اپنے ہاتھ سے ختم کردگے۔ میرا سر بہت نازک ہے۔ تمھارے کلہاڑے کے ایک ہی وار سے میرا کام تمام ہو جائے گا۔ مجھے اُن کے حوالے نہ کرنا۔"

مَیں نے تاشیہ کی بات نظر انداز کرتے ہُوئے اُن دونوں کو حکم دیا کہ میرے عقب میں، دیوار سے لگ کر کھڑے ہو جائیں اور تاحکمِ ثانی دونوں وہیں کھڑے رہیں۔

"اور تم لوگ کوئی بات نہیں کروگے، بالکل خاموش رہوگے، سلارد! تمھیں میری مدد کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں اور تاشیہ! یہی ہدایت تمھارے لیے بھی ہے۔ تم لوگ میری راہ میں بالکل نہیں آؤ گے ورنہ میرے سارے کیے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔ میں، اپنے اور تم دونوں کے لیے ایک بے حد خطرناک کھیل کھیلنے جارہا ہُوں اور یہ کام مجھے تنہا ہی کرنا ہوگا۔ اس کے علاوہ ایک بات کا تم دونوں کو خاص طور سے خیال رکھنا ہوگا۔ میں کتنا ہی جھُوٹ بولوں، تم دونوں اس پر حیرت کا اظہار نہیں کروگے۔ اگر تم دونوں خاموش رہو تو بہتر ہے لیکن اگر بولنا ضروری ہُوا تو تمھیں میرے ہر جھُوٹ کی تائید کرنا ہو گی خواہ وہ کتنا ہی بڑا جھُوٹ کیوں نہ ہو۔ اب میں کھیل شروع کرتا ہوں، تم دونوں دیوار سے لگ کر کھڑے ہو جاؤ اور خود کو خوف زدہ ظاہر کرنے کی کوشش کرو۔"

قلعے میں برسرِپیکار لوگوں کی لڑائی اختتام کو پہنچ رہی تھی اور ملکہ رُدبا کے کچھ ہی آدمی باقی رہ گئے تھے جو اب بھی بے جگری سے لڑ رہے تھے۔ بقیہ نے یا تو ہتھیار ڈال دیے تھے یا مارے گئے تھے لیکن بحری قزاق امان چاہنے والوں کو بھی نہیں بخش رہے تھے اور انھیں بڑی سفاکی سے گاجر مولی کی مانند کاٹا جارہا تھا۔

احاطے کے ایک گوشے میں، کچھ قزاقوں کی نگرانی میں، قیدی عورتیں کھڑی تھیں۔ مَیں نے اُن کے درمیان ملکہ رُدبا کو تلاش کیا لیکن وہ کہیں دکھائی نہ دی۔ یا تو وہ مار ڈالی گئی تھی یا پھر کسی خفیہ راستے سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ بہرحال جو بھی صُورت رہی ہو، مجھے ملکہ رُدبا کی اتنی پروا بھی نہیں تھی کیونکہ اب میدان رُدبا کی بجائے سُرخ شیطان کے ہاتھ میں تھا اور ہماری حیثیت ایک بار پھر پہلے جیسی ہو گئی تھی۔ احاطہ، چبوترہ اور زینے لاشوں سے پٹے پڑے تھے۔ بہت سے اعضا بریدہ جسم جان کنی کی اذیت سے تڑپ رہے تھے۔

بحری قزاق قتل و غارت گری سے فارغ ہو کر راہ میں آئی ہوئی لاشوں کو ٹھوکروں میں اُڑاتے ہُوئے ایک جگہ جمع ہو رہے تھے۔ پھر اُنھوں نے نادونوش اور قیدی عورتوں کے ساتھ انسانیت سوز سلوک شروع کردیا۔

مَیں نے اس گھناؤنے پن سے نگاہ ہٹائی اور مینار کی طرف دیکھنے لگا۔ راخیل اپنے دو آدمیوں سے گفتگو میں مصروف تھا۔ وہ دونوں اس کے نائب معلوم ہوتے تھے۔ اُن کے جسموں پر بھی ارغوانی لبادے اور سر پر خود تھے لیکن اُن میں اور راخیل میں فرق یہ تھا کہ اُن کے خود کے بالائی حصّے پر اُبھری ہُوئی نوک دار میخ راخیل کی مانند طلائی نہیں بلکہ نقرئی تھی۔ وہ دونوں خاصے جسیم اور قدآور تھے لیکن راخیل کے دائیں بائیں کھڑے ہونے نظر آتے تھے۔

راخیل نے اُن میں سے ایک آدمی کو کوئی حکم دیا۔

وہ شخص جواباً جھک کر کورنش بجا لایا اور وہاں سے چلا گیا۔ مَیں نے راخیل کے اردگرد متجسس نظر دوڑائی لیکن نقرئی بالوں والی حسینہ درسیلا پھر دکھائی نہیں دی۔ مَیں سوچنے پر مجبور ہوگیا کہ اس کی جھلک محض ایک واہمہ تھی؟ جنگ و جدل کا عالم ہو اور بے دریغ خُون بہہ رہا ہو تو اچھے اچھے سورماؤں کا ذہن آئیں بائیں شائیں ہو جاتا ہے۔ ایسے میں اگر مجھے کسی پر حسین درسیلا کا دھوکا ہوگیا تھا تو کوئی بڑی بات نہیں تھی۔

اُس وقت تک اچھی خاصی دُھند چھا چکی تھی اور اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ دُھند اس قدر دبیز اور گہری تھی کہ بارش میں تبدیل ہُوا چاہتی تھی۔ ہم تاریکی کا حصّہ بن جانے کی وجہ سے اُن میں سے کسی کی نظر میں نہیں آتے تھے۔ ہم نے کوئی حرکت کی ہوتی تو شاید اُن کی نظر میں آجاتے ورنہ وہ اپنی فاتحانہ سرگرمیوں میں اس قدر مصروف تھے کہ ہماری طرف متوجہ ہونا محال ہی تھا اور وہاں مستقل طور پر اس طرح معطل کھڑے رہنا بھی میرے منصوبے میں

شامل نہیں تھا۔ اس طرح تو پُوری رات بیت جاتی۔ اُن کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کے لیے مَیں کلہاڑا سر سے بلند کر کے اسے ہوا میں گھُماتا ہُوا اُن کی طرف چل پڑا۔

معاً اُن میں سے ایک کی نگاہ مجھ پر پڑ گئی۔

وہ بھاری بدن کا پستہ قد آدمی تھا۔ اس نے ریچھ کے خُون میں لتھڑے ہُوئے میرے چہرے، لباس اور فضا میں بلند میرے کلہاڑے کو دیکھا تو اس کا مُنہ حیرت و استعجاب سے کھُل گیا۔ فوراً ہی اس کے چند ساتھی بھی اس کے عقب میں آکھڑے ہُوئے اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھنے لگے۔

مَیں نے کلہاڑا ہَوا میں، دائرے کی صُورت میں گھمایا اور چیخ کر کہا: "سُرخ شیطان کے بھیڑیو! تم آگے بڑھتے ہوئے ہچکچا کیوں گئے۔ اتنی عورتوں سے نمٹ رہے تھے، اب ایک تنہا مرد سے پنجہ آزمائی کرتے ہُوئے تمھیں شرم کیوں آرہی ہے؟"

یہ سُنتے ہی وہ بھڑک اُٹھے۔

سب نے بہ یک وقت غیظ و غضب سے چیخنا شروع کردیا۔ اُن کا شور اتنا بلند تھا کہ سُرخ شیطان بھی اُن کی طرف متوجہ ہوگیا۔ میرا مقصد حاصل ہوگیا تھا۔

مَیں نے کن انکھیوں سے سُرخ شیطان کو مُڑتے اور احاطے کی طرف گھُورتے ہُوئے دیکھا تو سوچا کہ مجھے اس سُنہرے موقعے سے استفادہ کرنا چاہیے۔

مَیں نے کلہاڑے کو ایک بار پھر گھمایا اور دھاڑتے ہُوئے بولا: "سُرخ شیطان کے چیلو! مَیں نے تمھارے بارے میں سُنا تھا کہ تم لوگ طاقت، ہمّت اور جرأت و شجاعت کے پُجاری ہو۔ میدانِ جنگ میں لڑتے ہُوئے مرجانا ہی تمھارے نزدیک عظیم کارنامہ ہے۔ اس لیے مَیں تمھیں اپنی طاقت آزمانے کا موقع دیتا ہُوں۔ آؤ، تم میں سے کون پہلے مرنا پسند کرے گا؟ اس لمحے اور اس ساعت کو، کون اپنے لہُو سے رنگین کرنے کی سعادت حاصل کرنا چاہتا ہے؟ جلدی کرو، آگے بڑھو اور ایک جاں باز کی طرح موت کو خوش آمدید کہو۔ میرا کلہاڑا پیاس بجھانے کے لیے بے قرار ہے۔"

ایک قزاق نے شانے سے کمان اُتاری اور ترکش سے تیر نکال کر کمان میں جوڑنے لگا لیکن اس کے قریب کھڑے قزاق نے جلدی سے کمان پر ہاتھ مارا اور غرّا کر بولا: "احمق آدمی! تم اسے اس طرح مارو گے؟ کیا تم چاہتے ہو کہ سب بُزدل کہلائیں؟ یہ سُورما ہمیں بُزدل کہہ رہا ہے اور تم اس الزام کی تائید کرنا چاہتے ہو۔ کیوں اچھی بھلی لڑائی کو ضائع کر رہے ہو۔ ہمیں خوش ہونا چاہیے کہ ملکہ کے

گیدڑوں میں ایک تو جاں باز نکلا جو گڑگڑا کر زندگی کی بھیک نہیں مانگ رہا۔۔۔ بلکہ ہمیں بیچ میدان میں کھڑا، تن تنہا للکار رہا ہے۔ ہم نے اس وقت بڑی گھٹیا اور بے ہودہ لڑائی لڑی ہے، کچھ مزا نہیں آیا۔ شکر ہے کہ ہمیں اپنا جوہر دکھانے کا ایک خوبصورت موقع ہاتھ آگیا۔ تم میں سے کون پہلے اس سے لڑے گا؟"

وہ تیز لہجے میں آپس میں صلاح مشورہ کرنے لگے کہ کون پہلے میرے مقابلے پر آئے گا۔

مَیں نے دیکھا کہ راخیل پُوری طرح اس طرف متوجہ ہو چکا ہے۔ وہ سینے پر ہاتھ باندھے بڑی دل چسپی سے احاطے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے موٹے اور بھدّے لبوں پر بھرپُور مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

"مَیں ملکہ رُدبا کا پروردہ نہیں ہُوں!" مَیں نے چیخ کر کہا۔ "میری اپنی ایک حیثیت ہے۔ مَیں اپنے مُلک کا شہزادہ ہوں۔ نہ صرف شہزادہ بلکہ ایک دانش مند شخص بھی ہُوں۔ اس کے علاوہ ایک لڑاکا اور جاں باز ہُوں۔ مَیں اس سرزمین پر اپنے اس خادم اور خادمہ کو بچانے آیا ہُوں جو اس طرف، میرے پیچھے، دیوار کے ساتھ کھڑے ہیں۔ مَیں اُنھیں بچانے میں کامیاب ہوگیا تھا اور ہم یہاں سے رُخصت ہونے ہی والے تھے کہ تم لوگ آگئے۔ اس لیے اب مجھے دوبارہ لڑنا ہوگا۔ یہ سب مَیں نے اس لیے کہا کہ واضح ہو جائے، ہم لوگ ملکہ رُدبا کے ساتھی نہیں ہیں۔ ہاں، تم میں سے کون پہلے لڑنے اور مرجانے کے لیے میرے سامنے آرہا ہے؟"

چند ہی لمحوں میں ان کا ایک منتخب آدمی کُود کر میرے سامنے آیا۔ وہ ایک سیاہ فام، کالا بھجنگ آدمی تھا۔ اس کی ٹانگیں چھوٹی

تھیں لیکن سینہ اور شانے غیر معمولی چوڑے تھے۔ اس کے پاؤں میں بھدے جوتے تھے اور جسم پر بھیڑیئے کی کھال کا لباس تھا۔ اس کے بال پیال کی مانند خشک اور پیلے تھے۔ آنکھیں گہری نیلی تھیں، اُن سے سفاکی اور درندگی ٹپکتی تھی۔ اس کے سر پر ایک ایسا خود تھا جس پر دو سانپوں کے نشان کندہ تھے۔ اس کے ہاتھ میں بھی ایک وزنی کلہاڑا دبا ہُوا تھا۔ میں نے دیکھا کلہاڑے کے دستے پر دو سانپوں کے نشان کندہ ہیں۔

حریف میرے سامنے آیا تو بقیہ قزاقوں نے پھیل کر ہمارے نزدیک ایک دائرہ بنا لیا... پھر وہ فلک شگاف آوازوں میں چیخنے لگے: "دُلفا... دُلفا! اسے اپنے کلہاڑے کا ایک نغمہ سناؤ۔ میں شرط لگاتا ہُوں کہ یہ اس نغمے کو ناپسند نہیں کرے گا۔"

دُلفا نامی اس قزاق کے دُوسرے ہاتھ میں لکڑی اور چمڑے کی ایک ڈھال بھی تھی۔ اس کا کلہاڑا میرے کلہاڑے سے چھوٹا تھا۔ اُسے شاید اپنے کلہاڑے کو صاف کرنے کا موقع نہیں ملا تھا کیوں کہ کلہاڑے کے پھل پر خون کے دھبے جمے ہُوئے تھے۔

دُلفا نے اُچھل کر مجھ پر کلہاڑے کا پہلا وار کیا۔ میں نے پھُرتی سے ایک طرف ہٹ کر اس کا وار خالی کر دیا اور ہنس کر بولا: "تم کچھ بہکے ہُوئے ہو دُلفا۔ تمھاری زبان میں ایسے شخص کو کیا کہتے ہیں؟... بُزدل؟"

مجمعے میں شور مچ گیا۔

"اسے بدزبانی کا مزا چکھا دو دُلفا! اس کی گندی زبان کاٹ ڈالو۔" ایک قزاق غرّایا۔

دُلفا اس چڑھاوے پر جنونی انداز میں آگے بڑھا اور کلہاڑا میرے سینے پر دے مارا۔ میں نے اپنے کلہاڑے پر اس وار کو روکا اور اس کے ساتھ ہی پوری قوت سے جوابی حملہ کیا۔ دُلفا نے جلدی سے ڈھال سامنے کر دی۔ میرے کلہاڑے کا پھل اس کی ڈھال پر سے پھسلا اور اس کا ہاتھ زخمی کر گیا۔ چشمِ زدن میں اس کی دو انگلیاں کٹ کر کیچڑ میں جا گریں۔ میں اُچھل کر پیچھے ہٹا اور دوبارہ دفاعی حالت اختیار کر لی۔

اپنی کٹی ہُوئی انگلیوں پر نظر پڑتے ہی دُلفا پاگل ہو گیا۔ وہ دیوانہ وار مجھ پر وار کرنے لگا۔ اس کے تابڑ توڑ حملوں سے میں بہ مشکل سنبھل پا رہا تھا۔ اس کا کوئی وار کارگر نہیں ہو رہا تھا۔ اس کے ساتھی مسلسل اس کی ہمت بڑھا رہے تھے لیکن دُلفا پر تو گویا جنون سوار تھا۔ وہ سوچے سمجھے اور دیکھے بھالے بغیر ہی اندھا دھند وار کیے جا رہا تھا۔ کبھی کبھی ہمارے کلہاڑوں کے پھل آپس میں ٹکرا جاتے تو فضا میں چنگاریاں بکھر جاتیں۔

میں نے دُلفا کی جنونی کیفیت سے فائدہ اُٹھایا۔ اس نے ایک موقع پر کلہاڑے کا بھرپور وار میری گردن پر کیا۔ میں جھکائی دے کر اس کی زد سے نکل آیا اور دُوسرے وار کا موقع دیے بغیر پوری قوت سے اس کے سر پر ضرب لگائی۔

دُلفا اپنا کلہاڑا بلند کر ہی رہا تھا کہ میرے کلہاڑے کا پھل اس کی کھوپڑی میں پیوست ہو گیا۔ مجھے ضرب کی شدت کا اندازہ اس وقت ہُوا جب پھل اس کے سر سے گزر کر سینے کو چیرتا ہُوا دُلفا کی ناف تک جا پہنچا۔

میں نے کلہاڑے کو ایک جھٹکے سے کھینچا تو وہ مُنہ کے بل کیچڑ میں گر پڑا۔ فوراً اس کے دو ساتھی دوڑتے ہُوئے آئے اور تڑپتے ہُوئے دُلفا کو ٹانگوں سے پکڑ کر دُور گھسیٹ لے گئے۔

میں کلہاڑے کے لمبے دستے پر جھکا اور اُن کی طرف دیکھتے ہوئے مُسکرا کر بولا: "دُوسرا کون ہے؟"

مجمعے پر سناٹا چھا گیا۔

وہ آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے۔ کچھ مضطرب ہو کر اُوپر مینار کی طرف دیکھنے لگے تھے، جہاں سُرخ شیطان کھڑا اس منظر سے لُطف اندوز ہو رہا تھا۔

میرا دُوسرا حریف میرے ہی قد و قامت کا تھا۔ اس کے چہرے پر سیاہ داڑھی لیکن سر گُٹھا ہُوا تھا۔ وہ ایک ہاتھ میں تلوار اور دُوسرے میں خنجر لیے میرے مقابلے پر آیا تھا۔ میں نے اس مقابلے کو طول دینا مناسب نہیں سمجھا۔ مجھے کس تک گنتی گِننا تھی، اس سے آگے خود کو تھکانا وقت کی بربادی تھی۔ میں نے نو تک گنتی گِنی تھی کہ مقابل کا سر اس کے تن سے جُدا ہُوا اور کیچڑ میں لتھڑ گیا۔

"اگلا کون ہے؟" میں نے مجمع کی طرف دیکھتے ہُوئے پُوچھا۔ "اور دیکھو جانبازو! اس معاملے میں دیر نہ کرو۔ زندہ رہنے میں بھلا کیا شہرت ہے۔ اس لیے جلدی جلدی آتے جاؤ اور مرتے جاؤ۔"

اپنے تیسرے حریف کے سلسلے میں میں نے ایک جُوا کھیلا۔ اسے دُوسرے ہی وار میں خاک و خون میں سُلا دیا۔ میرے کلہاڑے کے تیز دھار پھل نے اس کا نرخرہ کاٹ کر رکھ دیا تھا۔ اس کے حلق سے بھل بھل خون بہنے لگا۔ جیسے برسات میں پرنالہ بہتا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے کیچڑ کی سیاہی سُرخی میں تبدیل ہو گئی۔ میرے پاؤں کے نیچے خون کا ایک چھوٹا سا تالاب کھڑا ہو گیا تھا۔

اب میں بے پناہ تھکن محسوس کر رہا تھا لیکن اُن پر ظاہر نہیں

کرنا چاہ رہا تھا۔ میں نے اپنی ناہموار سانس پر قابو پاتے ہُوئے کہا: "لگتا ہے جیسے آج میرا کلہاڑا پیاسا ہی رہے گا۔ ویسے اس کی پیاس اَمر ہے۔ اگلا کون ہے؟ کون ہے، جو میرے کلہاڑے کی پیاس بجھانے آئے گا؟"

اُن سب کو جیسے سانپ سُونگھ گیا۔ اُن میں سے کسی نے بھی اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔

ہوا میں نمی بڑھ گئی تھی پھر ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی۔ میرا خون آلود جسم بھیگ رہا تھا اور اس پر جما ہُوا سیاہی مائل خون بہہ رہا تھا۔ دفعتاً قزاق بیک آواز چیخے: "جارل... جارل... جارل!"

مجمع کو چیرتا ہُوا جو شخص میرے سامنے آیا، وہ خاصے قد و قامت کا تھا اور اس کے بازو میرے بازوؤں کی طرح ٹھوس اور مضبوط تھے۔ بازوؤں کی مچھلیاں پھڑک رہی تھیں۔ اس کی ٹانگیں موٹی اور قدرے خمیدہ تھیں۔ ان پر بڑے بڑے بال تھے۔ وہ ارغوانی رنگ کا لبادہ جسم پر ڈالے ہوئے تھا۔ سر پر خود تھا جس کے بالائی حصے پر ایک نقرئی میخ ابھری ہُوئی تھی۔ میں اس شخص کو پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ وہ اُن دو افراد میں سے ایک تھا جو مرتبے اور عہدے کے اعتبار سے قزاقوں کے افسر تھے اور مینار پر سُرخ شیطان کے دائیں بائیں کھڑے دکھائی دیے تھے۔

جارل ایک پُراسرار مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر سجائے میرے سامنے آ کھڑا ہُوا۔ بحری قزاقوں کے مخصوص حُلیے کے برعکس اس کے چہرے پر داڑھی نہیں تھی۔ وہ دُوسری وضع قطع کا آدمی تھا۔ باقاعدہ شیو کرنے کا عادی معلوم ہوتا تھا۔ اس کی بڑی بڑی بھُوری آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی تھی۔ وہ ارغوانی لبادے کے نیچے چمڑے اور کانسی کی زرہ پہنے ہوئے تھا۔ پہلی نگاہ میں اندازہ ہوتا تھا کہ وہ باوقار شخصیت کا مالک ہے۔ اُس نے تلوار سر سے بلند کرتے ہُوئے مجھے سلام کیا۔ اس کی تلوار بالکل ویسی تھی، جیسی تلوار سے میں نے ہورسا نامی شہ زور کو قتل کیا تھا۔

"مجھے ایسا لگتا ہے، جیسے میرے ان کتوں نے تمھیں کافی پریشان کیا ہے۔" جارل نے بولنا شروع کیا: "لیکن میں انھیں کچھ زیادہ موردِ الزام نہیں ٹھہرا سکتا۔ کیوں کہ تم بھی تو کسی شیطان کی مانند لڑ رہے تھے۔ ہو سکتا ہے، تم شیطان ہی ہو لیکن مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔ کیوں کہ تمھیں بہرحال مرنا ہے اور مجھے اس کا افسوس رہے گا کیوں کہ تم بلاشبہ ایک اچھے لڑاکے اور جانباز ہو۔ تمھارا، کلہاڑا برتنے کا انداز مجھے پسند آیا۔"

جارل کے بارے میں میرا خیال دُرست ہی ثابت ہُوا۔ وہ بلاشبہ دُوسرے قزاقوں سے مختلف تھا اور اس کے بات کرنے کا انداز بھی منفرد تھا۔ وہ اپنے طور طریقے اور لب و لہجے سے تعلیم یافتہ معلوم ہوتا تھا۔ تاہم میں اپنے کھیل کو سمجھتا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ میں آزمائش کے ایک نئے مرحلے میں داخل ہو رہا ہُوں۔

میرے سامنے کھڑا ہُوا شخص کچھ ایسا پُختہ اور منجھا ہُوا تھا کہ اس سے قبل اس قدیم سرزمین پر اُس جیسے کسی آدمی سے میرا سابقہ نہیں پڑا تھا۔ میں ایسا کوئی تاثر نہیں چھوڑنا چاہتا تھا جس سے وہ نتیجہ اخذ کرتا کہ میں اس سے متاثر ہو گیا ہُوں۔ مجھے بہر طور اپنی اہمیت اور قدر و قیمت کو برقرار رکھنا تھا۔ میں نے ترش روئی سے کہا: "آؤ میرے کلہاڑے سے ملاقات کرو لیکن مجھے شُبہ ہے کہ تمھیں میرے کلہاڑے کی کاٹ پسند نہیں آئے گی!"

جارل اپنی ٹھوڑی سہلاتے ہوئے بڑے سکون سے بولا۔ "ہتھیار ڈال دو نوجوان! میرا جی نہیں چاہتا کہ تمھیں ہلاک کروں۔ باعزت طریقے سے ہتھیار ڈال دو، ہو سکتا ہے ہم تمھارے بارے میں کچھ غور کر ہی لیں!"

"میں ہتھیار ڈال سکتا ہُوں لیکن فقط وعدوں پر ٹلنے والا آدمی نہیں ہُوں۔ میں اپنے ملک کا شہزادہ ہوں اور چاہوں گا کہ شاہی کے شایانِ شان میرے ساتھ سلوک کیا جائے۔ میں یہ بھی چاہوں گا کہ میرے خادم اور خادمہ کو بھی تحفظ فراہم کیا جائے۔" میں نے بدستور سخت لہجے میں کہا۔

"میں چاہوں گا! بہت خوب!" جارل کی آنکھیں سکڑ گئی تھیں: "کیا تم اس حالت میں ہو کہ اس لب و لہجے میں بات کر سکو؟" جارل نے مجھے گھور کر دیکھا لیکن اس کا لہجہ نرم ہی رہا۔

"میں سمجھتا ہُوں کہ یہی لب و لہجہ مجھ پر سجتا ہے۔" میں نے اپنے کلہاڑے کو لہراتے ہوئے کہا۔

"مجھے افسوس ہے، مجھے اختیار نہیں کہ کسی کا کوئی مطالبہ منظور کروں۔ یہ اختیار صرف عظیم راخیل ہی کو ہے لیکن ہر مطالبے کے جواب میں اس کے پاس صرف ایک ہی جواب ہوتا ہے... اور وہ جواب ہے... موت۔ میں سمجھتا ہُوں کہ تم ایک سمجھدار آدمی ہو۔ ہمارے خلاف لڑنے کی بجائے ہمارے ساتھی کیوں نہیں بن جاتے۔ تم جیسے جانباز مشکل ہی سے پیدا ہوتے ہیں! اس لیے اپنا آپ ضائع نہ کرو۔"

"تو پھر اپنے عظیم راخیل کو یہاں بلاؤ، اُسی سے سودے بازی ممکن ہو گی۔ میں ماتحتوں اور نچلے درجے کے لوگوں سے مذاکرات نہیں کیا کرتا!"

یک لخت جارل کا چہرہ سُرخ ہوگیا۔ وہ تلوار سونت کر بولا۔" تو پھر ٹھیک ہے، ابھی دیکھ لیتے ہیں کہ نچلے درجے کا آدمی کون ہے۔ اپنا دفاع کرو، نوجوان!" جارل کا لہجہ اب بھی نرم تھا۔

بات ختم کرتے ہی جارل نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ حملہ اس قدر بھرپور اور جچا تُلا تھا کہ خوف کی سرد لہر میرے وجود میں دوڑ گئی۔ مَیں نے پہلی بار موت کو اپنے سر پر منڈلاتے دیکھا۔ پھر مَیں سر جھٹکتے ہُوئے اُچھل کر ایک طرف ہٹ گیا۔ ہر آدمی کو کبھی نہ کبھی مرنا ضرور ہوتا ہے، پھر موت سے کیا ڈرنا۔ جارل کی تلوار سنسناتی ہُوئی میرے قریب سے گزر گئی۔ اگر مَیں نے بروقت خود کو نہ بچایا ہوتا، تو میرا سر دھڑ سے جُدا ہو چکا ہوتا۔

میرے سنبھلتے سنبھلتے جارل نے فوراً ہی دوسرا وار کیا۔ بچتے بچتے بھی تلوار کی نوک میرے بازو پر گہری خراش ڈال گئی۔

قزاق دائرے میں کھڑے تھے اور خوشی سے چیخ رہے تھے۔"جارل ... جارل ... جارل!"

جارل کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ وہ غیر معمُولی اور ناقابلِ یقین سکون اور نرمی سے بولا۔" جب مرنا تمھارا مقدر ہی ٹھہرا تو اے بہادر شخص! کیا مَیں تمھارا نام پُوچھ سکتا ہوں؟"

"میرا نام سرفروش ہے۔" مَیں نے ہانپتے ہُوئے کہا۔"فارس کا شہزادہ سرفروش۔" اور اس کے ساتھ ہی مَیں نے اُچھل کر کلہاڑے کا وار کیا۔

جارل جست لگا کر پیچھے ہٹ گیا۔

مَیں تھکا ہُوا تھا، جسم کی ساری توانائی مسلسل پیکار میں صَرف ہو چکی تھی، خُود کو نہ سنبھال سکا۔ اس لیے اپنے ہی زور میں کلہاڑا لیے ہُوئے مُنہ کے بل زمین پر گر گیا ... پھر اس سے پہلے کہ مَیں جنبش کرتا، تلوار کی سرد نوک میری گردن سے آ لگی۔

"رُک جاؤ!" اچانک مینار کی طرف سے ایک گرجتی ہُوئی آواز سنائی دی۔ وہ تنہا آواز، دائرے کی صُورت میں خوشی سے چیختے چلّاتے قزاقوں کی آواز پر بھاری تھی۔

احاطے میں گہرا سکوت چھا گیا۔

قزاقوں کی سانسیں تک رُک گئی تھیں۔ یک لخت میری گردن پر نوک کا دباؤ کم ہو گیا ... پھر تلوار ہٹا لی گئی۔

مَیں پسینے میں نہایا ہُوا، اُٹھ کھڑا ہُوا۔ قزاق مکھیوں کی مانند بھنبھنا رہے تھے۔ عین موقعے پر اُن کے آقا کی مداخلت سے اُن کا لُطف غارت ہو گیا تھا۔ اُن کی آنکھوں سے مایوسی اور ناگواری جھلک رہی تھی لیکن وہ کھُل کر اس کا اظہار بھی نہیں کر سکتے تھے۔

مَیں نے مُڑ کر مینار کی طرف دیکھا۔ سُرخ شیطان مُنہ کے گرد دونوں ہاتھوں کا بھونپو بنائے، بلند آواز میں جارل کو ہدایت دے رہا تھا۔"اس شخص کو زندگی اور وقار بخش دو اور اس کے ساتھیوں کو بھی۔ ایسے جاں باز کو اس طرح نہیں مرنا چاہیے۔ اگرچہ اس کی گردن پر میرے تین ساتھیوں کا خُون ہے ... پھر بھی مَیں اس سے مہربانی سے پیش آؤں گا۔ تم اس سے بات شروع کرو، جارل!"

"اور تم اجنبی!" سُرخ شیطان نے مجھے مخاطب کیا۔"جارل کی بات غور سے سُنو۔ اس کے مُنہ سے نکلے ہُوئے الفاظ میرے ہی الفاظ ہوں گے۔ تم چاہو تو میری پیش کش قبول کر سکتے ہو اور چاہو تو اسے ٹھکرا سکتے ہو۔ یہ تمھاری اپنی مرضی پر منحصر ہے۔ مَیں دوبارہ یہ پیش کش نہیں کروں گا۔"

سُرخ شیطان نے بات مکمل کی اور اپنے دُوسرے افسر کے ساتھ وہاں سے ایک طرف چلا گیا۔

جارل تلوار کو نصف قد سے بلند کرتے ہُوئے بولا۔" اب کیا کہتے ہو، سرفروش! کیا ارادے ہیں؟"

قزاق سرگوشیوں میں مصروف ہو گئے تھے۔ پھر اُن کے ایک آدمی نے جارل کو مخاطب کرتے ہُوئے کہا۔"اسے مار ڈالو جارل! ہم تمھاری خاطر جھُوٹ بول دیں گے کہ اس نے زندگی کی پیش کش قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔"

ایک اور قزاق نے اپنے تین ساتھیوں کی لاشوں کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے کہا۔"اُن کے خُون کی قیمت کون ادا کرے گا؟"

جارل اُن کی طرف شعلہ بار نظروں سے دیکھتے ہُوئے بولا۔ "چُپ ہو جاؤ، کُتّو! تم سب نے عظیم راخیل کی بات سُن لی ہے۔ اب اگر کسی نے مداخلت کی تو اُس کا سر اُڑا دیا جائے گا۔"

دھمکی کا خاطر خواہ اثر ہُوا۔ اُن سب نے چُپ سادھ لی۔

جارل دوبارہ میری طرف متوجہ ہُوا۔"کیا تم ہتھیار ڈالتے ہو؟"

دیوار کے قریب سے سلارد کی آواز سُنائی دی۔"ہتھیار ڈال دو مالک! اس وقت یہی بہتر ہے۔ ہمارے جسم پر سر سلامت ہیں۔ یہ میری توقع سے کہیں زیادہ ہے۔ قرد تیوں کا قول ہے کہ جب تک سانس ہے تب تک آس ہے۔"

"اور تم تاشیہ! تمھارا اس بارے میں کیا خیال ہے؟" مَیں نے تاشیہ کو مخاطب کیا۔

"جو تمھاری مرضی، وہی میری مرضی ہے۔ مَیں تو تمھارے ساتھ جیوں گی اور تمھارے ساتھ ہی مروں گی۔"

مَیں جارل کی طرف متوجہ ہو گیا۔

ہم دونوں کچھ دیر ایک دُوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے رہے۔ پھر مَیں نے اپنا کلہاڑا جارل کے قدموں میں پھینک دیا۔"مَیں عظیم راخیل کی پیش کش قبول کرتا ہُوں۔"

جارل نے جھُک کر کلہاڑا اُٹھا لیا۔ کچھ دیر غور سے اس کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر مجھے واپس کرتے ہُوئے بولا۔" اچھا اور خوب صُورت کلہاڑا ہے ... لیکن افسوس، ہماری طاقت آزمائی درمیان ہی رہ گئی۔ اب یہ کبھی معلوم نہ ہو سکے گا، ہم میں سے برتر کون ہے۔" وہ رُکا اور قدرے توقف کے بعد دوبارہ بولا۔" تاہم، کون کہہ سکتا ہے کہ وہ وقت دوبارہ آ جائے۔ پھر اس کا فیصلہ، ہم نہیں مقدر ہی کرے گا۔"

مَیں نے اس کی حسرت کو نظر انداز کرتے ہُوئے مسکرا کر کہا۔"مجھے اور میرے ساتھیوں کو فوری طور پر آرام کرنے کے لیے جگہ چاہیے لیکن اس سے پہلے ہم غسل کرنا چاہیں گے۔ ہمیں عمدہ لباس بھی چاہیے۔ اس کے بعد بہترین کھانا درکار ہو گا۔ اپنے سُرخ شیطان سے کہو کہ یہ چیزیں ہمیں فوراً مہیا کر دے ... پھر وہ جب بھی ملنا چاہے، مَیں اُسے تیار ملوں گا۔"

جارل کے لبوں پر پہلے جیسی پُراسرار مسکراہٹ نمُودار ہُوئی۔"عظیم راخیل سے تو رات ہی کو ملاقات ہو سکے گی۔ اُسے ابھی کئی اہم کام انجام دینے ہیں۔ لُوٹ کے مال کی تقسیم، ملکہ کے لیے کوئی عبرت ناک سزا اور ایسی کئی باتیں فوری طور پر توجہ طلب ہیں لیکن جب ہم آج رات جشنِ فتح منائیں گے تو مجھے یقین ہے کہ اس وقت عظیم راخیل سے تمھاری ملاقات ہو جائے گی۔ آؤ، میرے ساتھ۔" جارل نے میرے شانے پر ہاتھ رکھتے ہُوئے دوستانہ لہجے میں کہا۔

مَیں اس کی اعلا ظرفی سے متاثر ہُوئے بغیر نہ رہ سکا۔

چلتے چلتے مَیں نے بھی جارل کے شانے پر ہاتھ رکھا اور میٹھے لہجے میں کہا۔"تم اپنی اور میری ادھوری لڑائی کے بارے میں اپنا دل چھوٹا نہ کرو، دوست! حسرتِ مبارزت میں خُود کو ہلکان مت کرو۔ کبھی نہ کبھی ایسا موقع ضرور آئے گا جب ہم ایک دُوسرے کے سامنے کھڑے ہوں گے۔ مردوں اور جاں بازوں کی زندگی میں ایسے موقعے آئے دن آتے ہی رہتے ہیں۔"

جارل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ البتہ میرے شانے پر اس کی گرفت بے حد مضبُوط ہو گئی تھی۔

★★

میرے ذہن میں جس منصُوبے نے جنم لیا تھا اس کا نصف حصّہ مکمل ہو چکا تھا اور بقیہ نصف حصّے کی تکمیل باقی تھی۔

ہمیں جو کمرہ دیا تھا، وہ خاصا کشادہ اور آرام دہ تھا لیکن میرے ساتھ صرف سلارد کو رہنے کی اجازت دی گئی تھی۔ جارل نے کہا تھا کہ تاشیہ کو ہم سے الگ رکھا جائے گا اور یقین دلایا تھا کہ اُسے کوئی گزند نہیں پہنچے گی۔ کیوں کہ اس کی حیثیت ہمارے ساتھی کی سی ہے، ہماری ہی طرح اس کے آرام اور ضروریات کا خیال رکھا جائے گا۔

مَیں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کے علاوہ ہمارے پاس کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔

ضرورت کی تمام اشیا ہمیں فراہم کر دی گئیں۔ ہم نے نہا دھو کر لباس تبدیل کیا اور خُوب ڈٹ کر کھانے کے بعد سو گئے۔ سہ پہر کو آنکھ کھُلی تو جارل کے ایک آدمی نے آ کر بتایا کہ مَیں رات کو ملکہ رُدبا کے بڑے کمرۂ طعام میں عظیم راخیل سے مِل سکوں گا۔ ملکہ رُدبا کا ذکر آیا تو مَیں نے اس شخص سے ملکہ کے بارے میں دریافت کیا۔ معلوم ہُوا کہ اُسے بڑی درندگی سے بے آبرُو کرنے کے بعد پھانسی دے دی گئی ہے۔ اس کے تمام آدمیوں کو ہلاک کر دیا گیا تھا اور اب عورتیں اور بچّے غلام بنا کر ساتھ لے جائے جائیں گے اور پھر اُنھیں کہیں فروخت کر دیا جائے گا۔

ملکہ رُدبا جیسی عورتوں کو ایک نہ ایک روز اسی انجام پر پہنچنا ہوتا ہے! مَیں اس کے انجام پر ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا۔

جارل کا آدمی چلا گیا تو مَیں سوچ میں پڑ گیا۔ مجھے اپنے منصُوبے کے دُوسرے اور آخری حصّے کی فکر تھی اور وہ وقت آ رہا تھا جب مجھے منصُوبے کے اس حصّے کو عملی جامہ پہنانا تھا۔ یہی سوچتے ہُوئے مَیں سلارد کی طرف متوجہ ہُوا۔

"کیا تمھارے پاس کچھ اور سیاہ موتی موجود ہیں؟ میرے موتی تو شاید ملکہ رُدبا کے آدمیوں نے میری بے ہوشی کے دوران نکال لیے تھے۔"

"کچھ اور تو نہیں مالک! البتہ وہی موتی ہیں، جو پہلے تمھیں دیے تھے۔" سلارد نے بڑے انکسار سے جواب دیا۔

"کیا مطلب؟" مَیں حیرت زدہ رہ گیا۔

"اُن بدمعاشوں نے میری تلاشی لے کر میری رقم کی تھیلی نکال لی تھی۔ اُسی وقت مجھے خیال آیا کہ اُنھوں نے ضرور تمھاری بھی تلاشی لی ہو گی اور تمھارے موتیوں پر ہاتھ صاف کر دیا ہو گا۔ پھر مَیں موقعے کی تلاش میں لگ گیا اور جیسے ہی موقع مِلا، مَیں نے رقم کی تھیلی اور تمھارے موتی اُن کے قبضے سے واپس لے لیے۔ معاف کرنا مالک! مَیں نے قسم کھائی تھی اور ہُرمزد کو درمیان لا کر عہد کیا تھا کہ آئندہ ایک سال تک چوری نہیں کروں گا لیکن یہ ایک ایسی مجبوری تھی کہ مَیں بے بس ہو گیا ... اور پھر مالک! یہ چوری تو نہ ہُوئی۔ اپنی چیز واپس لینا

چوری نہیں ہوتی نا؟"

میں بے ساختہ ہنس پڑا۔ اور سلارد کی پیٹھ پر تھپکی دیتے ہوئے کہا: "مجھے تمھاری یہ چوری پسند آئی۔ تم نے بتایا تھا کہ یہ بحری قزاق ان سیاہ موتیوں پر جان دیتے ہیں؟"

"ہاں مالک! یہ درست ہے۔ میری معلومات اب تک بہت کم غلط ثابت ہوئی ہیں" سلارد نے کہا اور پھر کسی خیال کے تحت ہنس پڑا۔ "بڑا لطف آیا تھا مالک! ملکہ رُوبا کے آدمی آپس ہی میں لڑ پڑے تھے۔ وہ ایک دوسرے کو الزام دے رہے تھے کہ ان میں سے کسی نے وہ رقم کی تھیلی اور موتی چرا لیے ہیں۔ انھوں نے مارے خوف کے ملکہ رُوبا سے اس بات کا ذکر تک نہ کیا ہوگا۔"

"لاؤ، ذرا وہ موتی دکھاؤ" میں نے کہا۔

سلارد نے موتیوں کی تھیلی میرے حوالے کی تو میں نے اُسے تھیلی پر اُلٹ دیا۔ سیاہ موتی میری ہتھیلی پر چمکنے لگے۔ میں نے سب سے بڑے موتی کو منتخب کر کے اپنی جیب میں ڈالا اور باقی موتی اُسے واپس کر دیے۔

سلارد میری اس حرکت کو حیرت اور دلچسپی سے دیکھ رہا تھا لیکن اُس نے اس سلسلے میں کوئی سوال نہیں کیا کیوں کہ اُس کے نزدیک میں ایک دانش مند آدمی تھا۔

رات ہوتے ہی جارل بذاتِ خود مجھے لینے آ پہنچا۔ میں اس کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ ہمارا رُخ بڑے ہال کی طرف تھا۔ راستے میں جارل کی زبانی مجھے ایک بڑی عجیب بات معلوم ہوئی۔ جارل راخیل کا بہنوئی تھا اور شاید یہی وجہ تھی جو اُسے دُوسروں کے مقابلے میں ایک خاص اہمیت حاصل تھی۔

"میں تمھیں پسند کرنے لگا ہوں سرفروش!" جارل نے دوستانہ لہجے میں کہا: "لیکن راخیل کسی کو پسند نہیں کرتا۔ اُسے صرف ایسے لوگ پسند ہیں جو میدانِ جنگ میں ہمت و جرأت اور مہارت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اُسے اچھے رہنماؤں کی شدید ضرورت ہے۔ ہمارے یہ گُتے لڑتے تو اچھا ہیں لیکن اس کے لیے رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر کوئی اُن کے سر پر نہ ہو تو آپس ہی میں ایک دُوسرے کو بھنبھوڑنا شروع کر دیتے ہیں۔ میں نے راخیل سے بات کر لی ہے۔ وہ تمھیں سالار کے عہدے پر فائز دیکھنا چاہتا ہے لیکن اس کے لیے تمھیں ایک کڑی آزمائش سے گزرنا ہوگا۔ ایک بات ذہن نشین کر لو، ابھی تمھارا مرتبہ ایسا نہیں ہے کہ تمھیں سوالات کرنے کا حق دیا جا سکے۔ مجھے تو خیر اس کی پروا نہیں لیکن راخیل کو سوالات سے اور سوال کرنے والوں سے شدید نفرت ہے۔ وہ ایسے لوگوں پر اعتماد نہیں کرتا اور اُنھیں شک و شبہے کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اُسے صرف تابع داری اور بے چون و چرا حکم کی تعمیل کرنے والے پسند ہیں۔ بات تمھاری سمجھ میں آ رہی ہے نا؟"

"شکریہ جارل! میرا خیال ہے ہم اچھے دوست بنتے جا رہے ہیں" میں ذرا سا جھکا اور انگلیوں کو پیشانی تک لے جاتے ہوئے کہا: "لیکن میں ایک سوال پوچھے بغیر نہ رہ سکوں گا۔ جب راخیل پر پہلی بار میری نگاہ پڑی تھی تو میں نے اس کے قریب ایک عورت کو دیکھا تھا۔ وہ سفید لبادہ اوڑھے ہوئے تھی جیسا کہ قبر دوتی پہنتے ہیں۔ اس کے بال چاندی جیسی رنگت کے تھے۔ کہیں وہ عورت میری نگاہ کا دھوکا تو نہیں تھی؟"

جارل گڑبڑا کر مجھ سے دو قدم دُور ہٹ گیا اور غیر دوستانہ لہجے میں بولا: "تم نے کچھ زیادہ ہی دیکھ لیا ہے سرفروش! بہتر ہے کہ اس بات کو بھُول جاؤ۔"

"گویا درسیلا یہاں موجود ہے" میں نے زیرِ لب کہا اور مجھے اپنا بھُولا بسرا خواب یاد آ گیا۔

"درسیلا نام نہیں بلکہ خطاب ہے" جارل نے ناگواری سے کہا اور پھر تنبیہ کے انداز میں بولا: "اب تم اس موضوع کو ذہن سے جھٹک دو اور زبان کو لگام دو، ورنہ ہماری دوستی کی مدت بہت مختصر ہو گی۔"

میں نے جارل کی دوستی کا لحاظ کرتے ہوئے زبان کو لگام دے دی۔

ہم ایک وسیع کمرے میں داخل ہوئے تو وہاں قیامت کا شور بپا تھا۔ محفلِ نشاط جاری تھی۔ مشعلوں کی روشنی میں دو سو کے قریب قزاق لمبی لمبی میزوں پر رکھی ہوئی گوشت کی قابوں پر ہاتھ مارنے اور بے ڈھنگے پن سے جام لنڈھانے میں مصروف تھے۔ اُن کے درمیان تندرست و توانا اور دلکش عورتیں گھوم پھر کر ان کی ضروریات کا خیال رکھ رہی تھیں۔ کچھ قزاق بے قابو ہو کر دست درازی پر اُتر آئے تھے لیکن عورتوں کی پیشانی پر ایک شکن بھی نمودار نہیں ہوئی۔ اس کے برعکس وہ ہنس کر اُن کی حوصلہ افزائی کر رہی تھیں اور اُن کی آتشِ شوق کو ہوا دے رہی تھیں۔

جارل نے بتایا کہ یہ عورتیں جنگ باز دوشیزائیں کہلاتی ہیں لیکن یہ میدانِ جنگ میں جا کر دشمنوں سے نبرد آزما نہیں ہوتیں۔ بلکہ لڑاکوں کی دل جوئی کرتی ہیں۔ راخیل ہمیشہ انھیں ساتھ لے کر چلتا ہے اور اپنے آدمیوں کو تازہ دم رکھنے کے لیے ان کا وجود ضروری سمجھتا ہے جب کہ خود جارل کو یہ بات پسند نہیں تھی۔

سُرخ شیطان کچھ فاصلے پر ملکہ رُوبا کے تخت پر بیٹھا ہُوا تھا۔ اس کے دائیں بائیں اس کے افسر براجمان تھے۔ جن سے وہ گفتگو میں مصروف تھا۔ میں اور جارل ایک چھوٹی میز کے گرد بیٹھ گئے۔ مجھے یہ بات بڑی عجیب لگی تھی کہ ہال میں ہمارے داخلے پر راخیل نے توجہ نہیں دی تھی۔ میں نے سوچا کہ اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے یہ بڑا بہترین وقت ہے اور اس کا آغاز جارل سے کرنا چاہیے حالانکہ وہ میرا اصل ہدف نہیں تھا۔

جارل نے سامنے رکھی ہُوئی صراحی سے شراب کی اچھی خاصی مقدار حلق میں انڈیل لی تھی۔ میں نے اس کے شانے پر ہاتھ مارتے ہوئے بلند آواز میں کہا: "میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ مجھے اس طرح الگ تھلگ بٹھایا جائے گا۔ میں اتنا گرا پڑا تو نہیں کہ اس بھاری تن و توش والے آدمی کے ساتھ بیٹھ کر دو گھونٹ بھی نہ پی سکوں، جو بالوں میں لڑکیوں کی طرح رنگ برنگے ربن باندھتا ہے۔"

میں نے راخیل کی طرف اشارہ کیا تھا اور آواز اتنی بلند رکھی تھی کہ وہ خوب اچھی طرح سُن لے۔ جارل کا منہ مارے حیرت کے کھُل گیا۔ اُس نے جام اتنی زور سے میز پر رکھا کہ اس میں بچی ہُوئی شراب چھلک کر میز پر آ رہی۔

"یہ تم کیا بک رہے ہو سرفروش! کیا تم خود کو اور مجھے تباہ و برباد دیکھنا چاہتے ہو؟"

"بالکل درست" میں نے اپنی آواز کچھ اور بلند کرتے ہوئے کہا: "میں سمجھتا ہوں کہ میں نے ایک عظیم جال باز کا درجہ حاصل کر لیا ہے... پھر میرے ساتھ اس کے شایانِ شان سلوک کیوں نہیں کیا جا رہا؟"

"تم ہمارے رواج سے واقف نہیں ہو" جارل بڑی رسانیت سے بولا: "تمھیں وہ عظیم درجہ دیا جا چکا ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ عظیم راخیل کا ایک اہم آدمی اور ایک خاص نمایندہ، یعنی میں تمھارے پاس بیٹھا ہوں۔ میں ایک دوست اور ایک بھائی کی حیثیت سے تمھیں یہاں کے طور طریقوں کی تعلیم دُوں گا... پھر تمھیں ایک آزمائش سے گزرنا ہو گا۔ اس کے بعد تم آزادانہ عظیم راخیل کے ساتھ بیٹھ سکو گے، جیسے کہ دُوسرے افسران بیٹھے ہوئے ہیں۔"

"میں کسی ایسے شخص کو پسند نہیں کرتا جو خود تو اپنی جگہ اکڑا بیٹھا رہے اور دُوسرے کو مہمان نوازی کے لیے بھیج دے۔" یہ کہتے ہوئے میں نے کن انکھیوں سے سُرخ شیطان کی طرف دیکھا۔ اب وہ اور اس کے ساتھی میری طرف پوری طرح متوجہ ہو چکے تھے۔ گویا میرا کام بن رہا تھا۔

"کیا تم چاہتے ہو کہ ہم دُشمن بن جائیں؟" جارل غرّایا۔ وہ واقعی بہت ضبط سے کام لے رہا تھا۔

"تم دوستی کا دم تو بھرتے ہو لیکن حمایت سُرخ شیطان کی کرتے ہو۔ آخر ہو نا اس کے بہنوئی!" میں نے چیخ کر کہا۔

میری زبان سے آخری الفاظ نکلے ہی تھے کہ راخیل اپنی جگہ سے اٹھتا دکھائی دیا۔ قریب سے دیکھنے پر مجھے اس کی دیو قامتی کا صحیح اندازہ ہُوا۔ وہ پہاڑ کا پہاڑ نظر آ رہا تھا۔ ایک متحرک چٹان۔

اُس نے میرے اور جارل کی طرف دیکھتے ہُوئے بھاری اور گونج دار آواز میں حکم دیا: "اس شخص کو میرے پاس لایا جائے۔"

"میں نے تمھیں دوست اور بھائی کہا تھا اور دشمنی سے کترا رہا تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے دشمن بناتے رہنا تمھارا خاص مشغلہ ہے۔ اب جاؤ، اس سے دُشمنی کا لطف اُٹھاؤ۔" جارل کے دبے دبے لہجے سے تاسف جھلک رہا تھا۔

راخیل کا ایک نائب تخت سے اُتر کر میرے پاس آیا اور مجھے بازو سے پکڑتے ہُوئے کرخت لہجے میں بولا: "تم نے ہمارے سردار کا حکم سُن لیا ہو گا۔"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

وہ مجھے سُرخ شیطان کے قریب لے گیا، تب مجھے اپنی اوقات کا پتہ چلا۔ میں قد و قامت میں کچھ کم نہیں تھا لیکن راخیل کے آگے بونا نظر آ رہا تھا۔ وہ کسی مینار کی مانند مجھ پر جھُکا ہُوا تھا۔ تب پہلی بار مجھ پر خوف کا غلبہ ہُوا۔ میں سوچنے لگا کہ کہیں میں غلط فیصلہ تو نہیں کر بیٹھا۔ بہرحال اب تو تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ بات بہت آگے بڑھ چکی تھی۔ میں خود کو سمجھانے لگا کہ ڈیل ڈول ہی سب کچھ نہیں ہوتا۔ دماغ اور قوتِ ارادی بھی کوئی چیز ہے۔

ہال میں سناٹا چھا گیا اور قزاق اپنے مشاغل سے دست کش ہو کر ہماری طرف متوجہ ہو گئے۔ راخیل کچھ دیر تو اپنی چھوٹی چھوٹی سفاک آنکھوں سے میرا جائزہ لیتا رہا... پھر خلافِ معمول نرم لہجے میں بولا: "تم جارل سے لڑ رہے تھے، اجنبی؟"

میں نے دونوں ہاتھ کولھے پر رکھے اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہُوئے پُرسکون لہجے میں کہا: "نہیں، سُرخ شیطان! میری لڑائی تو تم سے ہے۔"

وسیع کمرے میں یہاں سے وہاں تک لوگوں کی گہری گہری سانسیں لینے کی آواز سُنائی دی۔

"وہ کیوں اجنبی؟" راخیل نے اپنی شعلہ رنگ اور ناف تک آئی ہُوئی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہُوئے اطمینان سے پوچھا: "میں

سمجھتا ہوں کہ تمھارے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا گیا ہے۔"

"بے شک میرے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا گیا ہے اور اس کے لیے تمھارا شکریہ۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ وہ سلوک میرے شایانِ شان نہیں ہے۔ میں کوئی گرا پڑا آدمی نہیں ہوں۔ میں شہزادہ ہوں۔ شاید یہ بات میں تمھیں بتا بھی چکا ہوں۔ چونکہ میں بھی ایک سردار ہوں، اس لیے سربراہی میرے حصے میں آنی چاہیے۔" میں نے ملکہ رُوہا کے تخت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہا۔ "تم وہاں بیٹھے ہوئے ہو اور میں بھی وہاں بیٹھوں گا لیکن وہ جگہ ہم دونوں کے لیے کافی نہیں ہے۔ ایک تخت پر دو حکمراں نہیں بیٹھ سکتے۔"

راخیل کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں مجھ پر جم گئیں پھر اس کے موٹے اور بھدّے ہونٹوں پر سفاک مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ہونٹ کھلے تو درمیان سے سیاہ بے ترتیب دانت جھانکنے لگے۔ اُس نے جمے ہوئے لہجے میں بولنا شروع کیا۔

"تم ایک جاں باز ہو اجنبی، یہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں اور میں اب تمھاری موت تک تمھیں شہزادہ ہی تسلیم کروں گا، جیسا کہ تم نے اپنے بارے میں بتایا ہے۔ ہوسکتا ہے، تم شہزادے ہی ہو۔ اس لیے کہ تم جرأت مندی سے بات کرتے ہو۔ کوئی معمولی درجے کا آدمی مجھ سے اس لہجے میں بات کرنے کا تصوّر بھی نہیں کرسکتا جبکہ تم وقت ضائع کیے بغیر مطلب پر آ گئے۔ میں اس بات کو بہت پسند کرتا ہوں۔ میں ایک سیدھا سادا آدمی ہوں اور لفاظی بالکل نہیں جانتا۔ یہ کام جارل خوب کر لیتا ہے۔ جب کوئی ایسا موقع آتا ہے تو وہی میری ترجمانی کرتا ہے اور وہی اس وقت میری جگہ تم سے لڑے گا۔ اگرچہ پڑھا لکھا ہونے کی وجہ سے اس میں تھوڑی سی لچک آ گئی ہے لیکن وہ ایک عظیم جاں باز ہے۔"

"لیکن میں نے جارل سے نہیں، تم سے لڑنے کی خواہش ظاہر کی ہے۔"

راخیل نے مجھ پر ایک سرد نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ "میں نے اس فاحشہ ملکہ کو بدترین سزا دینے کے بعد ایک ستون سے لٹکا دیا ہے اور ابھی اسے موت نہیں آئی۔ موت کی آخری گھڑی تک اسے سسکتے رہنا ہوگا۔ کیا تمھیں خوف نہیں آتا، تمھارا بھی وہی انجام ہوسکتا ہے۔ یہاں اب میری حکمرانی ہے۔"

"بے شک تم ایسا کر سکتے ہو۔" میں نے بے خوفی سے کہا۔ "لیکن ایسا کر کے تم ایک بزدل کہلاؤ گے کیوں کہ میں نے تمھیں ایک کھلی دعوت دی ہے۔ اصولاً تمھیں یہ دعوت قبول کر کے مجھ سے لڑنا چاہیے۔"

میں نے کن انکھیوں سے لوگوں کے تاثرات کا جائزہ لیا اور اندازہ ہوا کہ صورتِ حال میرے حق میں جا رہی تھی۔ میں جو چاہتا تھا، بتدریج منزلِ مُراد میرے قریب آتی جا رہی تھی۔

میں نے جیب سے سیاہ موتی نکالا اور راخیل پر ایک بھرپور ضرب لگانے کے لیے موتی کو انگوٹھے اور انگشتِ شہادت کے درمیان دبا کر سر سے بلند کیا تاکہ وہاں موجود تمام قزاق اسے اچھی طرح دیکھ لیں۔ موتی کبوتر کے انڈے کے برابر تھا اور مشعل کی روشنی میں کسی عفریت کے آنسو کی مانند چمک رہا تھا۔

"میں نے سنا ہے کہ تم اور تمھارے ساتھی سیاہ موتیوں پر جان چھڑکتے ہیں۔ میرے پاس اس جیسے بہت سے موتی ہیں۔ اگر تم مجھ سے خوف زدہ ہو تو میں تمھارے ان آدمیوں کو اور تمھاری حکمرانی کو خریدنے کے لیے تیار ہوں۔"

سُرخ شیطان بلاشبہ دلیر اور جاں باز تھا لیکن یہ اس کے لیے ایک تلخ گھونٹ تھا۔ اُسے غصّے اور اشتعال سے پھٹ پڑنا چاہیے تھا لیکن میں نے دیکھا کہ وہ مسکرا رہا ہے۔ قزاق بے قابو ہو کر بُری طرح چیخنے اور چلّانے لگے۔

"اسے مار ڈالو۔ اس کا سر اُڑا دو۔ اس نے بہت گھٹیا بات کی ہے۔"

راخیل نے ہاتھ اُٹھا کر اُنھیں خاموش کرا دیا... پھر اُس نے قریب ہی کھڑے ایک افسر کی طرف جھک کر سرگوشی میں کچھ کہا۔ افسر نے سر ہلایا اور وہاں سے چلا گیا۔ افسر کے جانے کے بعد راخیل نے اپنا ریچھ جیسا بڑا اور بھدّا ہاتھ اُٹھایا اور ایک موٹی انگلی سے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے پُرسکون لہجے میں بولا۔

"شہزادے! اب تک تم ہی بولتے رہے ہو اور میں بڑے صبر اور ضبط سے سُنتا رہا ہوں... لیکن اب میری باری ہے۔ کچھ مجھ سے بھی سُنو۔" یہ کہتے ہوئے اس کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔ "میں تمھارا شکر گزار ہوں گے۔ تم نے میری ایک مشکل دُور کر دی۔ تمھارے ساتھ جو عورت ہے وہ خود کو شہزادی تاشیہ اور شہنشاہ اعجاز کی بیٹی کہتی ہے۔ اُس نے بتایا ہے کہ تم دونوں منسوب ہو... اور اعجاز پہنچنے کے بعد تمھاری شادی ہو جائے گی۔ کیا یہ دُرست ہے؟"

"ہاں، یہ دُرست ہے لیکن شہزادی تاشیہ کا ہمارے معاملے سے کیا تعلق ہے؟" میں نے کہا۔ "تم کیسے جاں باز ہو جو لڑنے سے کترا رہے ہو اور اِدھر اُدھر کی ہانک رہے ہو۔" میں نے سیاہ موتی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یا تو مجھ سے لڑو یا اس کے عوض خود کو اور اپنے آدمیوں کو میرے ہاتھ فروخت کر دو۔"

راخیل نے میرے ہاتھ سے موتی لے کر دُور پھینک دیا اور حقارت سے بولا۔ "بات یہ ہے شہزادے! کہ میں سفید موتی پر مرتا ہوں... اور وہ سفید موتی شہزادی تاشیہ ہے۔ اگر میں شہزادی تاشیہ کو یوں ہی ہتھیا لوں تو یہ خلافِ اُصول اور میرے شایانِ شان بات نہ ہوگی کیونکہ میں نے تم لوگوں کو بحیثیت دوست قبول کیا ہے... لیکن اب جبکہ تم حریف بن کر مجھ سے لڑنا چاہتے ہو تو شہزادی تاشیہ کو حاصل کرنا میرے لیے دُشوار نہیں رہا۔ یہ ہمارا دستور ہے کہ دُشمن کے مرنے کے بعد فاتح کو دُشمن کی چیزوں پر قبضہ کرنے کا حق مل جاتا ہے۔ میں ایک بار پھر تمھارا شکریہ ادا کرتا ہوں۔"

'تو یہ شیطان شہزادی تاشیہ پر نگاہ رکھتا ہے' میں نے سوچا اور میرا خون کھولنے لگا۔ اچانک کمرے میں سرگوشیاں شروع ہوگئیں۔ میں نے دیکھا کہ راخیل کا وہی افسر شہزادی تاشیہ کو لے کر آ رہا ہے۔

تاشیہ کا چہرہ تر و تازہ اور شاداب تھا۔ اس کا لباس بھی شاہانہ تھا اور سراپا کے تمام نشیب و فراز خوب نمایاں تھے۔ شاید اُسے موقعے کی نزاکت کا علم نہیں تھا۔ اس کے خیال میں اُسے مجھ سے ملاقات کے لیے لایا جا رہا تھا۔ قریب آ کر وہ بازو پھیلائے تیزی سے میری طرف لپکی لیکن افسر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر ایک جھٹکے سے قریب رکھی ہوئی کُرسی پر بٹھا دیا تو تاشیہ کو صورتِ حال کی سنگینی کا احساس ہوا اور اس کے ساتھ ہی اُس کا چہرہ پیلا پڑ گیا اور جسم ہلکے ہلکے کانپنے لگا۔

سُرخ شیطان غور سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے آدمیوں نے اِدھر اُدھر ہٹ کر کمرے کے درمیان لڑنے کے لیے جگہ بنا دی۔

"تم نے میرے آدمیوں کے سامنے مجھے لڑنے کی دعوت دی ہے، اس لیے مجھے ہتھیار منتخب کرنے کا حق پہنچتا ہے۔" راخیل نے کہا۔

"تمھاری مرضی، جو ہتھیار چاہو استعمال کرو لیکن میں اپنا کلہاڑا استعمال کروں گا۔" میں نے جواب دیا۔

"اس کی ضرورت نہیں شہزادے!" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "میں ان سے کام لوں گا۔" اُس نے اپنے دونوں ہاتھ اُٹھا دیے۔

میں نے اُس کے ریچھ جیسے بھاری اور مضبوط ہاتھوں کو غور سے دیکھا۔ اس کا ایک ہاتھ میرے دونوں ہاتھوں کے برابر... بلکہ بڑا نکلتا ہوا ہی تھا۔

راخیل نے اپنا لبادہ اُتار دیا اور تخت سے اُتر کر نیچے کھلی جگہ آ گیا۔ اب اس کے جسم پر صرف زیرِ جامہ ہی رہ گیا تھا۔ ہم ایک دُوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔ اُس نے حملہ کرنے میں پہل نہیں کی اور بجائے حملہ کرنے کے وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ "ایک آخری مرحلہ شہزادے! یہ ہماری روایت ہے کہ ہم کسی فیصلہ کُن لڑائی سے پہلے موت کا جام ضرور پیتے ہیں کیونکہ یہ لڑائی کسی ایک کی موت پر ختم ہوتی ہے۔"

اُس نے قریب کھڑے ایک قزاق کو اشارہ کیا۔ قزاق آگے آیا اور صراحی سے پیالے میں شراب اُنڈیل کر میری طرف بڑھایا۔ میں نے پیالے کو غور سے دیکھا تو وہ مجھے غیر معمولی اور عجیب سا نظر آیا۔ اسے انسانی کھوپڑی سے تیار کیا گیا تھا۔ بڑے بڑے سفید دانت ابھی تک کھوپڑی کے ایک حصّے سے جھلکتے نظر آ رہے تھے۔

میں نے پیالہ لے لیا اور اُسے جیسے ہی اپنے ہونٹوں کی طرف بڑھایا تو یوں محسوس ہوا جیسے وہ دانت مسکرا رہے ہوں۔

پیالہ خالی کر کے میں نے واپس کیا تو قزاق نے اسی پیالے کو دوبارہ لبریز کر کے سُرخ شیطان کی طرف بڑھا دیا۔ سُرخ شیطان نے پیالہ لے لیا اور اس کے ساتھ ہی اس کا بھیانک قہقہہ گونج اُٹھا۔ اس نے ایک ہی سانس میں پیالہ خالی کر دیا اور دُور پھینکتے ہوئے بولا۔ "یہ ٹھوٹھ کی کھوپڑی ہے، وہ آخری شخص جس نے مجھے لڑنے کی دعوت دینے کا حوصلہ کیا تھا۔ اب اس کی جگہ تمھاری کھوپڑی کا پیالہ بنایا جائے گا۔"

میری ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد سی لہر دوڑ گئی۔

میں نے پلٹ کر قزاقوں کی طرف دیکھا، جارل اُن کے درمیان موجود نہیں تھا۔ وہ اُن سے دُور ایک میز پر سر جھکائے بیٹھا تھا پھر میری نگاہ تاشیہ کی طرف چلی گئی جس کا چہرہ کسی لاش کے چہرے کی مانند سفید پڑ گیا تھا۔ اس کا نازک بدن تھر تھر کانپ رہا تھا اور خود پر قابو پانے کے لیے اُس نے نچلا ہونٹ اتنی سختی سے دبا رکھا تھا کہ اس سے خون چھلک پڑا۔

میں نے راخیل کی طرف دیکھا۔

اس کا دیو جیسا جسم میری طرف بڑھ رہا تھا۔

★★

راخیل میری طرف بڑھ رہا تھا اور اس کے دونوں بازو مجھے دبوچ لینے کے انداز میں پھیلے ہوئے تھے۔ میں آہستہ سے پیچھے ہٹا اور ہر قسم کی فوری جُنبش کے لیے سر اور جسم کو اکڑا لیا۔ مجھے صرف ایک بات کا خیال رکھنا تھا کہ کسی بھی طرح اس کی گرفت میں نہ آؤں۔ اس کی گرفت میں آنے کا مطلب تھا کہ وہ مجھے بھینچ کر مار ڈالتا۔ اس وقت صورت ایسی تھی جیسے کوئی عقاب کسی کبوتر پر جھپٹنے کے لیے پر تول رہا ہو۔

دفعتاً اس نے اپنا ہاتھ پوری قوت سے میرے سر کی طرف

چلایا۔ میں نے سر جھکا کر اس کا وار بچایا اور اُڑتا ہوا دُوسری طرف نکل گیا۔ نکلتے نکلتے میں نے ہاتھ کی ایک بھرپور ضرب اس کے پیٹ پر لگائی اور اس کے ساتھ ہی درد کی ایک چیخ میرے حلق سے نکلتے نکلتے رہ گئی۔ مجھے یُوں لگا تھا جیسے میرا ہاتھ کسی چٹان یا آہنی دیوار سے ٹکرا گیا ہو۔

مجھے فوراً ہی اندازہ ہو گیا کہ اگر اس شیطان کو جلد ہی ختم نہ کیا گیا تو یہ مجھے پیس کر رکھ دے گا۔ اس کے ساتھ ہو رسا جیسی لڑائی نہیں لڑی جا سکتی تھی۔ وہ تھکنے والا آدمی معلوم نہیں ہوتا تھا جبکہ حریف کو تھکا کر جھپٹنے اور شکار کرنے والا عفریت تھا۔ وہ ایک ایسا دُشمن تھا جو سارا دن اور ساری رات بغیر تھکے لڑ سکتا تھا۔ اس سے لڑنے کے لیے قوت کی نہیں' تدبّر کی ضرورت تھی۔ مجھے کوئی اور ہی صُورت اختیار کرنا تھی۔ اس وقت پھرتی اور حاضر دماغی ہی میرے کام آ سکتی تھی۔ میں یہ کسی طور پر گوارا نہیں کر سکتا تھا کہ ایک اجنبی دور میں، میرا کاسۂ سر شراب پینے کے لیے استعمال کیا جائے۔

سُرخ شیطان نے دونوں ہاتھ اُٹھائے اور مجھ پر چھلانگ لگائی۔ اس کا ایک ہاتھ میرے شانے پر پڑا اور میں ایک جھٹکے سے کئی قدم دُور جا گرا۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے کتنی لڑھکنیاں کھائی تھیں البتہ جب میں رُکا تو شانے میں قیامت کی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ لگتا تھا جیسے میرے شانے کی ہڈی اپنی جگہ سے سرک گئی ہو۔

قزاقوں کے شور سے چھت اُڑی جا رہی تھی۔ وہ بیک آواز چیخ چیخ کر راخیل کو اُکسا رہے تھے کہ مجھے فوراً مار ڈالے۔ راخیل نے مجھ پر دوبارہ چھلانگ لگائی اور اس بار اُس کے تیور ایسے تھے جیسے مجھے دبوچ لینے کا ارادہ رکھتا ہو۔

میں خود کو سنبھالتا ہوا فوراً ہی اُٹھ کھڑا ہوا۔

اس سے پہلے کہ سُرخ شیطان مجھ پر آتا' میں نے اپنا توازن درست کیا، جسم کو تولا اور پُوری قوت سے ہوا میں اچھلا۔ میرے دونوں ہاتھوں کی بند مٹھیاں بیک وقت دائیں بائیں اس کی ٹھوڑی پر پڑیں۔ حریف کا منہ کھل گیا اور وہ ایک زور دار آواز کے ساتھ زمین پر گر پڑا۔

میں بھی زمین پر آ رہا۔

مجھے معلوم تھا کہ میرے تربیت یافتہ ہاتھوں نے بڑی بھرپور ضرب لگائی ہے۔ راخیل کی جگہ کوئی دُوسرا ہوتا تو اس کا جبڑا چکنا چور ہو چکا ہوتا لیکن اپنی ٹھوڑی کو وہ یُوں سہلا رہا تھا جیسے کسی کیڑے نے کاٹ لیا ہو۔ اس کے حلق سے خفیف سی کراہ بھی نہیں نکلی تھی۔

وہ ایک بار پھر اُٹھا لیکن میں نے زمین پر پڑے پڑے چھلانگ لگائی اور اس پر سولٹے کا داؤ آزمایا۔ میری لات اس کے چہرے پر پڑی اور اس کا منہ گھوم گیا۔ میرے جوتے کی ایڑی سے اس کا چہرہ کٹ گیا تھا۔

اس کی دائیں آنکھ کے قریب سے خُون جاری ہو گیا۔

وہ ہنستے ہُوئے بولا۔ "یہ تو تم کسی کنواری لڑکی کی طرح ٹانگیں چلا رہے ہو۔ مرد ہو تو آؤ ہاتھ ملاؤ اور زور آزمائی کرو... پھر دیکھتے ہیں کہ ہم میں سے کون شہ زور ہے۔"

جواب میں میں ایک بار پھر ہوا میں اچھلا۔ اس بار میری بھرپور ٹھوکر اس کے پیٹ پر پڑی لیکن وہ کسی مضبوط اور تن آور درخت کی مانند اپنی جگہ تنا اور جما کھڑا رہا۔

میں نے پے در پے اس پر گھونسے برسائے' لاتیں چلائیں لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ اس کے چہرے سے خُون بہہ بہہ کر اس کی داڑھی کو بھگو رہا تھا۔ وہ ہنستے ہوئے میرے ہر وار اور ہر ضرب کو شرفِ قبولیت بخش رہا تھا۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اب تک بھوسہ بن چکا ہوتا۔

میرے ہاتھ پیروں میں درد ہونے لگا اور پیٹ میں اینٹھن شروع ہو گئی۔ اس طرح تو میں اسے کبھی شکست نہیں دے سکوں گا' میں نے سوچا۔ وہ فولادی جسم کا مالک معلوم ہوتا تھا۔ کولہوں پر دونوں ہاتھ رکھے' وہ میری ہر کوشش ناکام کو مسکراتی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنی جگہ ڈٹا کھڑا تھا اور میں اپنے ہی زور میں تھک کر چور چور ہوتا جا رہا تھا۔

میری تھکن اور مایوسی محسوس کرتے ہُوئے اس کی مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی... پھر یک بیک اس نے چھلانگ لگائی اور میرے سنبھلنے سے پہلے ہی اپنے دونوں ہاتھ میری کمر کے گرد جما دیے۔

"آہا! اب میں دیکھوں گا کہ شہزادے کی ہڈیاں کس طرح کڑکڑاتی ہیں۔" اور اس کے ساتھ اُس نے اپنے ہاتھوں پر زور دیا۔

مجھے یُوں محسوس ہوا جیسے میں کسی چٹان کے نیچے دب گیا ہوں۔ موت کے تصور سے' میرے جسم سے پسینہ جاری ہو گیا اور یہی موت کا خوف میرے کام آ گیا۔ میں جسم کو ڈھیلا چھوڑتے ہوئے عقب میں جھکا اور پھر ایک جھٹکے سے آگے آتے ہوئے انگلیاں سُرخ شیطان کی آنکھوں میں گاڑ دیں اور اس کے ساتھ ہی دائیں گھٹنے کی بھرپور ضرب اس کی ناف کے نیچے لگائی۔

کوئی اور ہوتا تو دُہرا ہو کر نیچے گر پڑتا لیکن ردِ عمل یہ ہوا کہ اس کی گرفت بڑھ گئی اور مجھے یُوں محسوس ہوا جیسے میری پسلیاں توڑ کر باہر آ رہی ہوں۔ میں نے اضطراری طور پر اس کی دو

میں بٹی ہُوئی داڑھی پکڑ لی اور جسم و جاں کی پُوری قوت سے اُسے اپنی طرف کھینچ لیا۔

سُرخ شیطان کے حلق سے درد و اشتعال کی غراہٹ اُبھری۔ میرے جسم پر ایک ثانیے کے لیے اس کی گرفت ڈھیلی ہوئی اور اسی سے فائدہ اُٹھاتے ہُوئے میں ایک جھٹکے سے اُچھل کر پیچھے ہٹ گیا۔ نیم جاں ہونے کے باوجود میرے حلق سے قہقہہ اُبل پڑا۔ اس کی داڑھی کا ایک حصہ اُکھڑ کر میرے ہاتھ میں آ گیا تھا۔

"آؤ، اپنی یہ داڑھی واپس لے جا سکتے ہو تو مجھ سے چھین لو۔" زندگی اور موت کی اس جنگ کے دوران میں نے پہلی بار اپنے حریف کو مخاطب کیا۔

سُرخ شیطان زور سے دھاڑا اور کسی اندھے بھینسے کی مانند مجھ پر جھپٹ پڑا۔ اس کا بس چلتا تو مجھے حقیر کیڑے مکوڑے کی طرح مسل دیتا اور بھینچ کر ملغوبے میں تبدیل کر دیتا لیکن میں ایسا ہونے ہی کیوں دیتا۔ میں طاقت کے بل پر نہیں لڑ رہا تھا بلکہ نفسیاتی حربوں کو استعمال میں لا رہا تھا اور اس یقین کے ساتھ لڑ رہا تھا کہ ہر بشر میں خامی اور کمزوری ہوتی ہے۔ وہ فانی ہوتا ہے اور اُسے فنا کی طرف لے جانے کے لیے اس کا کوئی نہ کوئی کم زور پہلو ضرور ہوتا ہے۔ ہر آدمی کی مانند' موت سُرخ شیطان کا بھی مقدر تھی۔ وہ آدم زاد تھا اور اُسے بہرحال مرنا تھا... لیکن کس طرح؟

... اور پھر وہ پہلو میری سمجھ میں آ ہی گیا۔

میں نے ایک طرف ہٹتے ہُوئے سُرخ شیطان کا وار خالی جانے دیا۔ میرے ہاتھ میں اس کی داڑھی کے شعلہ رنگ بال اب بھی موجود تھے اور اس دبیز گچھے پر خُون کے چھینٹے جم گئے تھے۔ بال مضبوط تھے۔ ان کی لمبائی تین فٹ سے کم نہ رہی ہو گی۔ بالوں کا وہ طویل گچھا کسی سُرخ سانپ کی طرح میرے ہاتھ میں بل کھا رہا تھا۔

وہ دوبارہ پلٹ کر میری طرف آیا تو میں نے کوڑے کی مانند گچھا اُس کے منہ پر دے مارا۔ راخیل غصے اور اشتعال سے کانپنے لگا۔ اس کی ساری ہنسی مسکراہٹ اور شگفتگی غائب ہو چکی تھی۔ غیظ و غضب سے اس کے حلق سے عجیب عجیب آوازیں نکل رہی تھیں۔ اب وہ مجھے بھینچ کر مار ڈالنے کے ارادے پر بھی قائم نہیں تھا... بلکہ میری گردن مروڑ کر مار ڈالنا چاہتا تھا۔

مزید تاخیر اب میرے لیے بھی مناسب نہیں تھی۔ راخیل اپنے انتقام و اشتعال کے نقطۂ عروج پر تھا۔ وہ بُری طرح جھنجلایا ہوا تھا اور اندھوں کی طرح بے سوچے سمجھے وار کیے جا رہا تھا اور میں اس حالت سے فائدہ اُٹھا سکتا تھا۔ اس کی یہ کیفیت میرے لیے سُود مند تھی۔ جب آدمی دماغ اور عقل کی بجائے جذبات اور ہیجان کا اسیر ہو جائے تو چوہے سے بھی زیادہ بے بس اور ناتواں ہو جاتا ہے۔ میں نے طے کیا کہ اس دیو پیکر شیطان کو کسی چوہے ہی کی موت ماروں گا۔

وہ غراتا ہُوا ایک بار پھر میری طرف جھپٹا۔

میں نے تیزی سے ایک طرف ہٹتے ہُوئے اس کی پُشت پر لات جما دی۔ وہ کسی کٹے ہُوئے بھاری درخت کی مانند دُور جا گرا۔

قزاقوں کی بھنبھناہٹ ایک بار پھر گونجنے لگی۔ اُنھوں نے اپنے آقا کو غلاموں کی مانند لات کھاتے کبھی نہیں دیکھا ہو گا۔ میں تیزی سے اُس کی طرف بڑھا لیکن وہ فوراً ہی کھڑا ہو گیا... اس کے آگے بڑھنے سے پہلے ہی میں نے اُس کی داڑھی کے بٹے ہُوئے بالوں کو کوڑے کی طرح گھمایا اور اس کی آنکھ پر دے مارا۔

اس کے حلق سے عجیب عجیب آوازیں نکلنے لگیں۔

وہ دونوں ہاتھ پھیلائے مجھے جکڑ لینے کے لیے لپکا لیکن میں کسی لٹو کی طرح گھوما اور پُوری قوت سے اس کے کولھے پر لات جما دی۔ وہ اپنے ہی زور میں لڑکھڑاتا ہُوا آگے گیا اور شراب کے ایک بڑے برتن سے ٹکرا کر گر پڑا۔ اس کا سر شراب کے برتن میں ڈُوب گیا تھا۔

میں کسی ایسے ہی موقعے کا منتظر تھا۔

یہی وہ لمحہ تھا جس کی مجھے تلاش تھی۔

میں نے اس لمحے کو ضائع نہیں کیا۔ کبھی کبھی زندگی اور موت کے درمیان ایک ایسا لمحہ بھی آتا ہے جو حدِ فاصل کہلاتا ہے... لیکن وہ لمحہ بڑا مختصر ہوتا ہے۔ اس لمحے کے ایک طرف زندگی اور دُوسری طرف موت ہوتی ہے۔ وہ لمحہ درمیان سے ہٹ جائے تو فاصلہ مٹ جاتا ہے اور زندگی' موت سے ہمکنار ہو جاتی ہے۔ دُشمن کے سر اُٹھانے سے پہلے ہی اسے کچل دینا ضروری ہوتا ہے۔

میں نے ایک بھرپور جست لگائی اور سُرخ شیطان کی پیٹھ پر سوار ہو گیا پھر اس کے سنبھلنے سے پہلے ہی اس کی داڑھی کے بال سے بٹی ہُوئی رسّی گلے میں ڈال کر' پیچھے سے' دونوں ہاتھوں کے ذریعے تھام لی۔

وہ کھانستا ہُوا اُٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے گرفت قائم رکھنے کے لیے دونوں گھٹنے مضبوطی سے اس کے دونوں پہلوؤں میں جما دیے اور اس کے ساتھ ہی بالوں کی رسّی کا حلقہ تنگ کرنے لگا۔ رسّی سُرخ شیطان کی موٹی گردن میں کسنے لگی۔ اُس نے مجھے اپنی

پیٹھ پر سے پھینکنے کے لیے کسی مُنہ زور اور سرکش گھوڑے کی مانند اُچھلنا کودنا شروع کر دیا اور ساتھ ہی ساتھ اپنے دونوں لمبے لمبے ہاتھ پُشت پر لے جاکر میرے جسم سے بھی زور آزمائی کرنے لگا۔

یہ جنگ میری زندگی اور موت کی جنگ تھی۔ سُرخ شیطان کو ذرا بھی ڈھیل دینا، اپنی موت کو آواز دینے کے مترادف تھا۔ اُس کی آہنی اُنگلیوں اور بڑے بڑے ناخنوں سے اپنے زخمی ہوتے اور جسم کی طرف سے توجہ ہٹاتے ہُوئے مَیں نے رسّی کا حلقہ تنگ کرنے پر پُورا زور صرف کر دیا۔ مضبوط بالوں کی بٹی ہُوئی رسّی سُرخ شیطان کی موٹی گردن میں دھنسنے لگی۔۔

اس کے حلق سے خرخراہٹ بلند ہو رہی تھی۔ رسّی اُس کے حلقوم میں دھنستی چلی گئی۔ اپنی پیٹھ سے گرانے کی ساری کوششیں ناکام دیکھ کر وہ گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گیا۔ اس طرح بھی رہائی نہ ملی تو جسم کو جھٹکا دے کر مجھے سامنے گرانا چاہا لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ اُس کی قوت نچُڑ چکی تھی۔۔۔ پھر جان کنی کے عالم میں وہ اُلٹ گیا۔

اس کا پہاڑ جیسا جسم میرے اُوپر آ رہا۔

اس کے بوجھ سے مجھے اپنا دم گھُٹتا ہُوا محسوس کیا لیکن مَیں اپنی زندگی اور بقا ہی کے لیے تو لڑ رہا تھا۔ مَیں نے قوتِ ارادی سے کام لیتے ہُوئے اپنے حواس بحال کیے اور رسّی کا حلقہ تنگ سے تنگ کرتا چلا گیا۔

مجھے لگ رہا تھا جیسے وہ وحشی کبھی دم نہیں توڑے گا۔ شاید کاتبِ تقدیر اس عفریت کے لیے موت لکھنا بھُول گیا تھا لیکن یکلخت اس کے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے۔

اس کا بھاری سر ایک طرف ڈھلک گیا۔

مَیں نے بڑی مشکل سے خود کو اس کے نیچے سے نکالا اور اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھیں اُبل پڑی تھیں اور زبان لٹک گئی تھی۔

چہرے پر موت کی سیاہی پھیل گئی تھی۔

راخیل، جو سُرخ شیطان کہلاتا تھا اور جس سے ایک خلقت دہشت کھاتی تھی، وہ مر چکا تھا۔

مَیں لڑکھڑاتا ہُوا اُٹھ کھڑا ہُوا۔

میرا ایک ایک جوڑ چیخ رہا تھا۔

ایک ایک رُواں درد سے چیخ رہا تھا۔

سر بُری طرح چکرا رہا تھا:

آنکھوں کے آگے سُرخ و سیاہ دھبّے ناچ رہے تھے۔

مَیں نے آنکھیں مُوند لیں اور کچھ دیر اسی حالت میں کھڑا رہا۔ قزاقوں پر سنّاٹا سوار تھا۔ کسی کے سانس لینے کی بھی آواز نہیں آ رہی تھی۔ لگتا تھا اُن سب کو سانپ سُونگھ گیا ہو یا وہ سب کے سب اپنے سردار کے ساتھ ہی موت کی آغوش میں جا سوئے ہوں۔ کچھ دیر بعد مَیں نے آنکھیں کھولیں اور ایک ہاتھ بلند کر کے توانائی مجتمع کرتے ہُوئے بلند آواز میں بولنے لگا: "اب مَیں تمھارا سردار ہوں۔ مَیں جادل کو اپنا نائبِ اوّل مقرر کرتا ہُوں۔ تم اسی طرح اُس کی اطاعت کرو گے، جس طرح میری۔"

مَیں نے اپنے قدموں میں پڑے ہُوئے لحیم شحیم مُردہ جسم پر نظر ڈالی۔

"اس لاش کو ایک دلیر اور جاں باز کی لاش کے شایانِ شان اور پُورے اعزاز و احترام کے ساتھ دفن کیا جائے۔ اس کام کو جادل دیکھے گا اور تم سب لوگ جو اب میرے خادم ہو، بدستور اپنے مشاغل میں مصروف ہو جاؤ۔ راخیل کی تدفین ہوتے ہی ہم۔۔۔"

اچانک میری آواز حلق میں اٹک گئی۔

مجھے اپنی پُشت میں ایک تیز دھار خنجر دھنستا ہُوا محسوس ہُوا۔ درد کی ایک تیز لہر میرے وجُود میں دوڑ گئی۔ مَیں خود کو سنبھالتے ہُوئے نیم جاں کیفیت میں اپنے حملہ آور کی طرف مُڑا۔ میرا حملہ آور آنکھوں میں نفرت لیے مجھ پر دُوسرا وار کرنے ہی والا تھا کہ جادل اپنی جگہ سے اُچھلا اور اس نے بجلی کی مانند تڑپ کر تلوار کا ہاتھ گھُمایا۔ حملہ آور کا سر کسی خربوزے کی مانند کٹ کر دُور جا گرا۔

اس کی گردن سے گرم گرم خون اُبلنے لگا، جس کے چھینٹے مَیں اپنے جسم پر بھی محسوس کر رہا تھا۔۔۔ پھر میرا ذہن آہستہ آہستہ تاریک ہونے لگا۔ مَیں بتدریج تحت الثریٰ کی طرف جا رہا تھا اور ڈوبتے ذہن کی دہلیز پر جادل کی آواز دستک دے رہی تھی۔ شاید وہ مجھ ہی سے مخاطب تھا: "یہ ضحاک تھا شہزادے! راخیل کا حقیقی بیٹا۔ اس کا خنجر زہر میں بجھا ہُوا تھا۔ افسوس کہ ہمارے پاس زہر کا کوئی توڑ یا کوئی تریاق نہیں ہے۔۔۔ مگر نہیں، ہمارے درمیان قبوتی خاتون موجود ہے۔ وہی جو قبروتیوں کی بڑی پجارن ہے، جس کے بارے میں تم نے ذکر کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ قبروتی ہر قسم کے زہر کا علاج کر لیتے ہیں۔"

وہ تاریکی کا ایک طویل سفر تھا، جس میں مَیں کبھی ڈُوبتا اور کبھی اُبھرتا تھا۔

تاریکی چھٹی تو ایک چہرہ اُبھرتا ہُوا دکھائی دیا۔ وہ چہرہ جھُکا ہُوا تھا۔ مَیں نے آنکھیں پُوری طرح کھول دیں۔

ہاں وہ ایک چہرہ ہی تھا۔ نسوانی، دل کش اور مہربان۔ شہابی چہرے پر بڑی بڑی روشن آنکھیں، نگینے کی مانند جڑی ہُوئی تھیں۔ اُن آنکھوں میں مہربانی اور محبت تھی۔ اس کے نقرئی، لانبے بال میرے سینے کو چھُو رہے تھے اور اس کے یاقوتی لبوں پر دل نواز اور ہر زخم کو مندمل کر دینے والی مسکراہٹ تھی۔

مَیں نے اس چہرے کو پہچان لیا۔ یہ درسیلا تھی، جسے مَیں نے قربانی کی ایک شب قبروتیوں کے معبد میں رسمِ قربانی انجام دیتے دیکھا تھا۔۔۔ اور جو ایک بار ذرا دیر کے لیے میرے خواب میں بھی آئی تھی۔۔۔ پھر مَیں نے اُسے قلعے میں، مینار کے پاس راخیل کے قریب ایک لمحے کی جھلک کے طور پر دیکھا تھا۔۔۔ اور پھر ہوش و حواس سے بے گانہ ہوتے ہُوئے آخری لمحات میں جادل کے طفیل اس کا نام میرے ذہن میں محفوظ رہ گیا تھا۔

"درسیلا!" بے ساختہ یہ نام میری زبان سے ادا ہُوئے۔

"درسیلا نام نہیں بلکہ ایک خطاب ہے، جو قبروت قبیلے کی ہر بڑی پجارن کو دیا جاتا ہے۔" اس کے لبوں پر شرابی مسکان اُتر آئی۔ "میرا نام کلانسی ہے۔"

"بڑا خوبصُورت نام ہے۔" مَیں نے کہا اور اُٹھنے کی کوشش کی۔

کلانسی نے اپنا نرم و گداز ہاتھ میرے سینے پر رکھ کر مجھے دوبارہ لٹا دیا۔ "نہیں نہیں ابھی اُٹھنے کی کوشش نہ کرو۔ لیٹے رہو۔ ابھی تمھیں آرام کی ضرورت ہے۔"

لیٹے لیٹے مَیں نے اردگرد کا جائزہ لیا۔ یہ وہ کمرہ نہیں تھا جہاں مَیں نے راخیل کو شکست دی تھی اور پھر اُس کے بیٹے نے مجھے زہریلا خنجر گھونپ دیا تھا۔

"مَیں کہاں ہُوں؟" مَیں نے کلانسی کی طرف دیکھتے ہُوئے پوچھا۔

"مَیں جانتی تھی کہ تم یہ سوال ضرور پُوچھو گے۔" وہ مسکرائی۔ "ہم اس وقت سمندر کے سینے پر سفر کر رہے ہیں اور ہمارا رُخ احباز کی طرف ہے۔ تم پُورے دس روز بعد ہوش میں آئے ہو۔ زہر تمھارے جسم میں سرایت کر گیا تھا اور تم زندگی و موت کی کشمکش میں مبتلا تھے۔ تمھیں سنبھالنے میں میری صلاحیتوں کی اچھی خاصی آزمائش ہُوئی لیکن مجھے اپنی کوششوں کا ثمر مل گیا۔"

دس روز۔۔۔ مَیں پُورے دس روز بے ہوش رہا تھا۔ گویا میری زندگی کے دس دنوں کی نفی ہو گئی تھی۔ میری زندگی کے دس قیمتی دن چُپ چاپ میرے عرصۂ حیات سے خارج ہو گئے تھے اور وہ

دن میرے شعُور کی گرفت میں آئے بغیر نکل گئے تھے۔ ایک طرح سے مَیں دس روز مُردہ رہا تھا اور اب دوبارہ جی اُٹھا تھا اور اس حیاتِ نو کے لیے مَیں اس عورت کا مرہونِ منّت تھا جو میرے سامنے بیٹھی تھی۔ اگر درسیلا نہ ہوتی تو مَیں تہِ خاک جا سویا ہوتا۔ عالمِ بے ہوشی ہی میں زندگی کے اختتام کو پہنچ چکا تھا۔ مَیں اپنی محسنہ کو شکرگزار نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

"اس طرح کیا دیکھ رہے ہو؟" کلانسی نے پوچھا۔ اس کے یاقوتی لبوں پر مسکراہٹ، کسی سدابہار پھُول کی طرح کھِلی ہُوئی تھی۔

"سوچ رہا ہُوں کہ تمھارا شکریہ کس طرح ادا کروں۔ مر کر جیا ہُوں، اس لیے حیاتِ نو کے سلسلے میں تمھارا مقروض ہو گیا ہُوں۔ نہیں شاید مَیں غلط کہہ رہا ہُوں۔ زندگی قرض میں نہیں ملتی۔ مجھے تو یہ کہنا چاہیے کہ تم میری مسیحا ہو۔"

"بے شک زندگی کسی کو قرض نہیں دی جا سکتی۔ اگر ایسا ہوتا تو مَیں تمھاری جگہ خاک میں سو رہی ہوتی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ کسی کی ڈوبتی نبض کو سہارا دیا جا سکتا ہے، ڈوبتی ہُوئی کشتیٔ حیات کو کنارے لگایا جا سکتا ہے۔ اسے تم مسیحائی ہی کہہ سکتے ہو لیکن مسیحا کا شکریہ ادا نہیں کر سکتے۔ کیوں کہ یہ اُس کا فرضِ منصبی ہے اور اگر شکریہ ادا کرنا ضروری ہی ہے تو اس کے لیے تمھیں ایک بار نہیں، تین بار شکریہ ادا کرنا ہوگا کیونکہ مَیں نے تمھیں تین بار موت کے مُنہ سے نکالا ہے۔"

"تین بار۔۔۔!" مارے حیرت کے مَیں سکتے میں رہ گیا۔

"ہاں تین بار لیکن اس کی تفصیل بعد میں بتا دُوں گی۔۔۔ اور اگر تم اس سلسلے میں میرا شکریہ ادا کرنے پر مُصر ہی ہو تو اس کی بھی ایک صُورت ہے۔۔۔ بلکہ اس معاملے میں تم سے درخواست کروں گی اور مدد کی طالب ہُوں گی۔"

"تمھارے کام آتے ہُوئے مجھے بے حد خوشی ہو گی، کلانسی!" مَیں نے جذبات سے بے چین ہو کر کہا۔

"تمھیں معلوم ہے، سرفروش۔۔۔ کہ بڑی پجارن کا نام لینا گناہ ہے؟ اُسے صرف درسیلا ہی کہہ کر پُکارا جاتا ہے۔" کلانسی شوخ مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ "تم پر عتاب بھی نازل ہو سکتا ہے۔"

"اگر عتاب تم جیسا حسین ہو تو مَیں زندگی کے باقی دن معتوب ہو کر گزارنے کے لیے تیار ہوں۔ اگر یہ نام لینا گناہ ہے تو اس میں بڑی ہی لذت ہے۔ تم مجھے زندگی کے قریب لائی ہو تو زندگی سے دُور بھی لے جا سکتی ہو۔"

"بڑی خوبصُورت باتیں کر لیتے ہو۔ جب مَیں پجارن نہیں

بن تھی تو بھی جیسے آدمی کے خواب دیکھتی تھی لیکن تم بہت دیر سے ملے۔ پجارن شادی نہیں کر سکتی لیکن میرا وعدہ ہے کہ ہمارا رُوحانی تعلق ہمیشہ قائم رہے گا۔"

وہ بولتے بولتے اُداس ہو گئی۔ آخر وہ ایک عورت ہی تو تھی... نازک احساسات اور لطیف جذبات تو ہر ایک کے ساتھ ہوتے ہیں جو آخری سانس تک اسے ڈستے رہتے ہیں۔

"ابھی تین روز کا سفر باقی ہے۔ پھر ہم سلطنت اجاز کے شان دار ساحل پر پہنچ جائیں گے۔ وہاں پہنچتے ہی تمھاری اور شہزادی تاشیہ کی شادی ہو جائے گی۔ میں نے یہی سُنا ہے۔" کلانسی کا لہجہ حسرت زدہ تھا۔

تاشیہ! اچانک میرے ذہن میں ایک جھما کا سا ہُوا اور مجھے اپنے ساتھیوں کا خیال آ گیا۔ "میرے ساتھی کہاں ہیں؟ تاشیہ، سِلارد اور جارل...؟" میں نے بے تابی سے پُوچھا۔

"وہ سب اسی جہاز پر ہیں اور خیریت سے ہیں۔" کلانسی نے جواب دیا۔

"اُنھیں بُلاؤ، میں اُن سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"مجبُوری ہے۔ تم کل تک اُن سے نہیں مل سکتے۔ اگر درسیلا کسی کا علاج کر رہی ہو تو زیرِ علاج شخص کے پاس کسی کو نہیں جانے دیا جاتا۔ تم کل کے بعد اُن سے مِل سکتے ہو اور اُن کے ساتھ وقت گزار سکتے ہو۔"

میں خاموش رہا۔

"اب میں چلوں گی۔" وہ اُٹھتے ہُوئے بولی۔ "دوبارہ آؤں گی تو تم سے اپنے ایک مسئلے پر تفصیل سے گفتگو کروں گی۔ وہی جس کی طرف ابھی کچھ دیر پہلے میں نے اشارہ کیا تھا۔ شاید تم اسی لیے مجھے ملے ہو کہ وہ کام انجام کو پہنچ جائے۔"

"ابھی کیوں نہیں بتا دیتیں؟" میں نے کہا۔

"مناسب نہیں ہے۔ تم ابھی ہوش میں آئے ہو اور تمھارے ذہن پر کسی قسم کا بوجھ ڈالنا ٹھیک نہیں ہے۔ جب میں تمھارے لیے کھانا لے کر آؤں گی تو بتاؤں گی۔ اس وقت تک تم آرام کرو۔"

وہ چلی گئی لیکن مجھے اُلجھن میں ڈال گئی۔ وہ میرے دماغ پر بوجھ نہیں ڈالنا چاہتی تھی لیکن میرے دماغ پر بوجھ پڑ گیا تھا۔ اُس نے کسی مسئلے کا ذکر کیا تھا اور اس سلسلے میں میری مدد کی طالب تھی۔ پھر میں سوچے بغیر کیسے رہ سکتا تھا۔ اس نے مجھے دُوسری زندگی دی تھی۔

کلانسی کے جانے کے بعد مجھے اندازہ ہو گیا کہ ہم ایک بحری جہاز پر سفر کر رہے ہیں۔ میرا کمرہ ڈول رہا تھا اور مجھے اپنے نتھنوں میں سمندری پانی کی مخصوص بُو گھستی محسوس ہو رہی تھی۔ کبھی جہاز سے ٹکراتی ہُوئی سرکش لہروں کا شور اور مستول کی چرچراہٹ بھی کانوں میں در آتی تھی۔

اچانک کیبن کا دروازہ کُھل گیا۔

میں نے آنے والے کو دیکھا اور اپنی نقاہت کی پروا کیے بغیر ایک جھٹکے سے اُٹھ بیٹھا۔

کمرے میں داخل ہونے والی تاشیہ تھی۔

اُس نے احتیاط سے دروازے کا پٹ بند کیا اور دبے پاؤں میرے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ جس انداز میں مجھے دیکھ رہی تھی، میں کوئی نتیجہ اخذ کرنے سے قاصر تھا۔ اُس کی آنکھوں میں غصّہ بھی تھا اور پیار بھی... حکایت بھی تھی اور شکایت بھی... محبوبیت بھی تھی اور عداوت بھی...

میں نے اس تعطل کو توڑنے کی خاطر کہا: "کیسی ہو شہزادی؟"

"اُس نے مجھے دس روز سے یہاں نہیں آنے دیا۔ میں چُھپ کر آئی ہُوں۔" تاشیہ نے پیشانی پر بل ڈالتے ہُوئے کہا۔ وہ تو گویا بھری بیٹھی تھی۔

"ہائیں! یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ وہ بڑی پجارن ہے کیا تمھیں اُس سے خوف نہیں آتا؟"

"اب نہیں آتا۔"

"پہلے تو تم بہت ڈرتی تھیں، اب کیا معجزہ ہو گیا... اور بھلا یُوں چُھپ کر آنا، اچھا نہیں۔ یہ تمھارے وقار کے منافی ہے۔"

"اُس ساحرہ نے تم پر جادو چلا دیا، نا۔ مجھے تو پہلے ہی شُبہ تھا۔ دس بارہ دن وہ تمھارے پاس تنہا رہی ہے۔ کچھ نہ کچھ تو ہونا ہی تھا۔ خیر تمھیں تو میں دیکھ لوں گی۔ اجاز چلو، کوڑے نہ لگوائے تو میرا نام بھی تاشیہ نہیں۔"

میں بے ساختہ ہنس پڑا۔ "شہزادی! کیوں ناراض ہو رہی ہو۔ کوڑے تم مجھے شوق سے لگوا دینا لیکن اس بے چاری کا کیا قصُور؟ وہ میری معالج ہے۔ میرا علاج کر رہی ہے۔ مجھے موت کے مُنہ سے نکال کر لائی ہے۔ وہ نہ ہوتی تو تم کب کی میرا کفن دفن کر چکی ہوتیں۔ آدمی کو اتنا ناشکرگزار نہیں ہونا چاہیے۔"

"میں سب سمجھتی ہُوں۔ آج میں نے اس کی آنکھوں میں ایک خاص چمک دیکھی ہے۔ عورتیں اس چمک کا مفہوم خُوب سمجھتی ہیں۔ ایسی ہی چمک میں نے ملکہ رُومہ اور پھر ملکہ نُوبا کی آنکھوں میں بھی دیکھی تھی۔"

"تمھیں کلانسی کے بارے میں ایسی بات نہیں کہنی چاہیے۔ مجھے ابھی کچھ دیر ہُوئے ہوش آیا ہے۔ میں پُورے دس روز زندگی اور موت کی کش مکش میں مُبتلا رہا ہُوں اور وہ میرا علاج کرتی رہی تھی۔" میں نے قدرے ناگواری سے کہا۔

"اور ہوش میں آتے ہی اس کا نام تک معلوم کر لیا، کیوں؟"

"کسی کے نام سے واقف ہونا بُری بات تو نہیں۔" میرا لہجہ مزید بگڑ گیا۔

"کسی کے نام سے واقف ہونا بُری بات نہیں، یہ تو میں بھی جانتی ہُوں لیکن درسیلا کا معاملہ مختلف ہے۔ اُسے کوئی نام لے کر نہیں پُکار سکتا۔ تمھیں یہ اجازت کیسے مِل گئی؟"

تاشیہ کسی جھگڑالو بیوی کی طرح لڑ رہی تھی اور میں کسی خیانت کار شوہر کی طرح دونوں ہاتھوں سے سر پکڑے بیٹھا تھا۔ اس طویل اور ناگوار گفتگو سے میرے سر میں تکلیف شروع ہو گئی۔ تب کہیں اُسے مجھ پر رحم آیا۔ شاید اُس نے میری خستہ حالی محسوس کر لی تھی۔

وہ جانے کے لیے مُڑی اور جاتے جاتے تنبیہ کے انداز میں بولی: "میں وہ کچھ نہیں ہونے دوں گی، جو تم چاہتے ہو یا اُس کے دل میں ہے۔"

وہ جس خاموشی سے آئی، اسی خاموشی سے چلی گئی لیکن میرے دل و دماغ میں سینکڑوں طوفان اُٹھا گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں باقاعدہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ پھر بیٹھا نہ گیا تو لیٹ گیا۔ میرا سر بُری طرح چکرا رہا تھا اور کنپٹیوں پر درد کے دھماکے ہو رہے تھے۔

★★

مجھے وقت کا اندازہ نہیں... شاید شام ہو رہی تھی کہ کلانسی دوبارہ میرے پاس آ گئی۔ اُس نے مجھے ایک تلخ مشروب دیا پھر شوربہ پلانے لگی۔

"کل تم اپنے ساتھیوں سے مِل سکو گے۔" اُس نے مسکراتے ہُوئے کہا۔

اب میں اُسے کیا بتاتا کہ ابھی کچھ دیر پہلے میں اپنے ایک ساتھی سے تو مِل چکا ہُوں اور اس ملاقات نے میری کیا حالت بنا دی ہے۔

"تم نے اپنے کسی مسئلے کا ذکر کیا تھا؟" میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

"تمھیں میرا اتنا خیال ہے؟" اس کے چہرے پر بشاشت کی سُرخی بکھر گئی۔

"ہاں میں صنفِ نازک کے لیے اپنے دل میں بہت لطیف احساسات رکھتا ہُوں، خواہ وہ میری دُشمن ہی کیوں نہ ہو۔"

"لیکن میں تو تمھاری دُشمن نہیں ہُوں اگر دُشمن ہوتی تو تمھیں تین بار موت کے مُنہ سے نہ نکالتی۔ تمھارے عناصر کب کے بکھر گئے ہوتے۔" اس نے بڑی لگاوٹ سے پھر وہی پُراسرار بات کی جس نے مجھے حیرت میں شدید جھٹکا لگایا تھا۔

"تم ایک بار پہلے بھی اس طرف اشارہ کر چکی ہو۔ اگر تفصیل سے بتا دو تو میری اُلجھن دُور ہو جائے۔ اس سے پہلے وہ کون سے دو موقعے تھے، جب تم نے میری جان بچائی تھی؟" میں پُوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

کلانسی میرے بالکل قریب بیٹھ گئی تو میں اُس کے آتشیں سراپا کی حرارت اپنے رگ و پے میں دوڑتی محسوس کرنے لگا۔ ایک ٹھنڈی ٹھنڈی اور میٹھی میٹھی سی آگ میرے وجُود میں سرایت کرتی جا رہی تھی۔

"تمھیں وہ چاندنی رات یاد ہے، سرفروش! جب تم تاشیہ کے ساتھ قبروتی معبد کے قریب درخت کی اوٹ میں کھڑے تھے۔ اس وقت قربانی کی رسم ادا کی جا رہی تھی اور تم نے ایک قبروتی پہرے دار عورت کو ہلاک کر دیا تھا۔ تم اپنی دانست میں سمجھ رہے تھے کہ سب کی نظروں سے چھپے ہُوئے ہو لیکن یہ محض تمھارا خیال تھا۔ میں نے تمھیں دیکھ لیا تھا۔ دستور کے مطابق تمھیں گھیرے میں لے کر قتل کر دینا چاہیے تھا لیکن نہ جانے کیوں میں نے ایسا نہیں کیا اور تمھیں نظرانداز کر گئی... اور اب سوچتی ہُوں کہ میں نے اچھا ہی کیا تھا۔"

یہ سُن کر میں اُسے بے یقینی سے گھُورتا رہ گیا لیکن یہ ایک ایسی بات تھی جس کا میں نے اپنی زبان سے تذکرہ تک نہیں کیا تھا اور تاشیہ سے اس بات کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ اس نے وہ راز فاش کر دیا ہو گا۔ اس کا مطلب تھا کہ کلانسی ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ اس نے نہ صرف مجھے اس چاندنی رات کو دیکھ لیا تھا بلکہ وہ مجھے نظرانداز بھی کر گئی تھی۔ اچانک مجھے یاد آ گیا کہ اس رات مجھے بھی نہ جانے کیوں یہ احساس ہُوا تھا کہ بڑی پجارن مجھے دیکھ چکی ہے۔

وہ میری سوچوں کو، میرے چہرے کے تاثرات سے پڑھ کر مسکرانے لگی تو میں نے ایک طویل سانس لے کر کہا: "تم ٹھیک کہتی ہو۔ اس رات اگر تم مجھے نظرانداز نہ کرتیں تو میرے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے ہوتے... بہرحال دُوسری بار تم نے میری زندگی کب بچائی تھی؟"

"دُوسرا موقع وہ تھا جب تم عکران کی مشاورتی جماعت میں ایک ملزم کی حیثیت سے پیش ہُوئے تھے۔ اس وقت تمھارے بارے میں گفتگو کی جا رہی تھی کہ تمھیں موت کے حوالے کر دیا جائے یا تمھاری جان بخشی کر دی جائے۔ وہاں ایک قبروتی نمائندہ بیٹھی محفل کی کارروائی

قلم بند کر رہی تھی۔ اگر میں چاہتی تو کسی وقت بھی اپنا فیصلہ منسوخ کر دیتی اور کسی تردد میں پڑے بغیر تمھارا سر قلم کر دیا جاتا لیکن میں نے اپنی نمائندہ کو فیصلہ محفوظ رکھنے کی ہدایت کی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ تم ہر آزمائش پر پورے اُترو گے۔ چنانچہ یہی ہُوا، تم نے ہورسا کو شکست دے دی اور اپنی بقا کی جنگ جیت گئے۔ مجھے اس وقت بھی حیرت ہوئی تھی کہ آخر میں تمھیں کیوں بچاتی آ رہی ہُوں۔"

مَیں نے اس احسان کے لیے بھی اس کا شکریہ ادا کر دیا۔

"اور تیسرا واقعہ تو تمھارے علم میں ہی ہے اور اب پتہ چلا کہ میں تمھیں کیوں بچاتی آ رہی تھی اور مَیں بھی نہیں بلکہ کوئی نادیدہ ہاتھ تمھیں بچاتا آ رہا تھا۔"

میرے ذہن میں گزرے ہُوئے مناظر گھوم گئے۔

مَیں نے چشمِ تصوّر سے کلانسی کو بڑی پجارن کے رُوپ میں دیکھا، جو تلوار سر سے بلند کیے ایک مجبور و بے کس لڑکی کے سینے کی طرف بے جا رہی تھی۔

مجھے جُھرجُھری سی آگئی۔

مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ یہی عورت تھی، جو اپنے دلکش سراپا کے ساتھ مجھ سے لگی بیٹھی تھی۔

"میرا خیال ہے، تمھیں اپنا وہ کام بتانے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ مَیں اب پُوری طرح صحت مند ہُوں اور میرے ذہن پر کوئی بوجھ نہیں پڑے گا۔"

وہ خیالوں میں کھو گئی۔ اس کی سیمیں پیشانی پر شکنیں پڑگئیں۔ اور آنکھوں سے فکرمندی جھلکنے لگی۔ کچھ دیر بعد وہ کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولی۔

"کچھ عرصے سے ہم قبرِدتی محسوس کر رہے ہیں کہ یہاں کی مملکتوں اور بادشاہتوں میں ہماری مخالفت کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔ عام لوگ تو کچھ نہیں کہتے، البتہ بادشاہ اور ملکائیں درپردہ ہمارے خلاف سازشیں کر رہی ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ ہمارا قبیلہ اُن کے کاروبارِ مملکت میں کچھ زیادہ ہی مداخلت کرنے لگا ہے۔ اسی لیے وہ ہم سے چھٹکارا پانے کے لیے ہمارا قلع قمع کر دینا چاہتے ہیں۔ ہمارے مخالفوں میں شاہ یوطابا اور ملکہ رُدبا پیش پیش تھی۔ ان کی سرکوبی نہ کی جاتی تو ہمارا نام و نشان مِٹ جاتا۔ چنانچہ ان کے خاتمے کے لیے مَیں نے سُرخ شیطان رخیل سے مدد لی۔ اُسے عظیم حکمران بننے کا خبط تھا چنانچہ مَیں نے اُس کی اس کمزوری سے فائدہ اُٹھایا۔ ملکہ رُدبا کا حشر تو تم نے دیکھ ہی لیا۔ اس سے ایک روز قبل عمران کی اینٹ سے اینٹ بجائی جا چکی تھی۔ شاہ یُوطابا، ملکہ رُمرا اور دُوسرے حواری تہ تیغ کر دیے گئے تھے۔ شہنشاہ احباز اور دُوسری مملکتیں ابھی قبرِدتیوں کے خلاف تو نہیں ہوئیں لیکن کسی وقت اُن کے ذہن بھی بدل سکتے ہیں۔ چنانچہ مَیں نے فیصلہ کیا تھا کہ سُرخ شیطان کو اُن پر مُسلّط رکھوں گی اور اس طرح وہ قبرِدتیوں کے آگے سر نہیں اُٹھا سکیں گے لیکن تم نے سُرخ شیطان کو ہلاک کر دیا۔ پتہ چلا کہ اس سرزمین پر کوئی اس سے بھی زیادہ طاقت ور ہستی موجود ہے اور اتفاق سے وہ تم نکلے۔"

"تمھارے دُشمن تو مارے جا چکے ہیں، اب تم کیا چاہتی ہو؟" مَیں نے پُوچھا۔

"ابھی متوقع دُشمن تو موجُود ہیں۔ مثلاً شہنشاہ احباز، لیکن میرا ارادہ اُسے ہلاک کرنے کا نہیں ہے۔ تم طاقت ور ہونے کے علاوہ دانش مند بھی ہو۔ سُرخ شیطان بھی طاقت ور تھا لیکن اس میں دانش مندی نہیں تھی۔ تمھاری شادی شہزادی تاشیہ سے ہونے والی ہے . . . اس لحاظ سے شہنشاہ پر تمھارا اثر و رسُوخ بھی ہو گا۔ مَیں چاہتی ہُوں کہ تم اپنے اثر و رسُوخ اور دانش مندی سے کام لیتے ہُوئے شہنشاہ کے خیالات کو ہمارے لیے ہموار کر دو۔ مَیں جانتی ہُوں تم یہ کام آسانی سے کر سکتے ہو۔ مَیں نے تمھارے ساتھ پیش آنے والے جن نازک واقعات کی طرف اشارہ کیا، اس کا مقصد احسان جتانا نہیں تھا اور نہ ہی مَیں اس کا معاوضہ تم سے مانگتی ہُوں بلکہ میری یہ درخواست ہے کہ میرے کام آؤ، جس طرح مَیں تمھارے کام آئی تھی۔ ہمیں بچاؤ، جس طرح ہم نے تمھیں بچایا تھا۔"

"یہ کون سا مشکل کام ہے، کلانسی! مَیں ہر طرح سے حاضر ہوں۔" مَیں نے اس کا مرمریں ہاتھ تھامتے ہُوئے نرمی سے کہا۔

کلانسی کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ وہ تپتے ہُوئے رُخساروں کے ساتھ بولی: "پہلے تم نے میرا نام لیا . . . اور اب میرا ہاتھ تھام لیا۔ جانتے ہو، قبیلۂ قبروت کا دستور ہے کہ کسی بڑی پجارن کا ہاتھ پکڑنے والے کو سزائے موت دے دی جاتی ہے۔"

"عجیب مخمصے میں پھنس گیا ہُوں،" مَیں نے مسکرا کر سوچا۔ "کوئی کوڑے لگوانے کی دھمکی دیتی ہے اور کوئی قتل کی سزا کا مستوجب قرار دے رہی ہے۔" مَیں نے نتائج سے بے پروا ہو کر کلانسی کے ہاتھ پر گرفت مضبُوط کر دی۔

"تین بار بچایا ہے، چوتھی بار قتل کر دو۔" مَیں نے مسکرا کر کہا۔

"تم خوبصورت جسم ہی نہیں خوبصورت ذہن کے مالک بھی ہو، کاش! مَیں تمھیں اپنا سکتی۔" اُس نے مخمور لہجے میں کہا اور مَیں قبیلہ قبروت کے دستوروں کی سنگینی کو بالائے طاق رکھ کر نقب لگانے میں مصروف ہو گیا۔

●

اگلا روز میرے لیے ایک بھرپُور، خوش گوار اور مسرتوں کا دن تھا۔ مجھے کلانسی کا انتظار تھا اور مَیں اپنے ساتھیوں سے بھی ملنا چاہتا تھا جن سے ملاقات ہُوئے غالباً بارہ دن بیت گئے تھے۔ وہ میرے بُرے بھلے کے ساتھی تھے۔ تاشیہ، سلارو اور جارل . . . یہ تین نام میرے ذہن پر نقش ہو کر رہ گئے تھے۔

دن گزر گیا، سہ پہر ہو گئی لیکن کلانسی نہیں آئی۔ البتہ اُس کے بجائے سلارو مجھ سے ملنے آیا۔ مجھے دیکھ کر اس کی جو کیفیت ہوئی۔ اس کا احاطہ الفاظ میں نہیں کیا جا سکتا۔ بس یُوں لگ رہا تھا جیسے کسی یتیم بے بس بچے کو اچانک پتہ چل جائے کہ اس کا باپ مرا نہیں بلکہ زندہ ہے۔ اس کے 'نہیں نہیں' کرنے کے باوجود مَیں نے اُسے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ اُس نے بتایا کہ تاشیہ مجھ سے ناراض ہے، اس لیے نہیں آئی۔ جارل کے بارے میں بتایا کہ وہ مصروف ہے اور کچھ دیر بعد ملنے آئے گا۔

جب مَیں نے کلانسی کے بارے میں پوچھا تو اس کے چہرے پر خوف چھا گیا۔ وہ سہمی ہُوئی آواز میں بولا۔

"وہ رات سے دکھائی دی نہیں مالک؛ وہ بڑی پُراسرار قوتوں کی مالک ہے۔ سب کہتے ہیں، چونکہ تمھارا علاج ہو گیا اور اس کی ضرورت نہیں رہی، اس لیے وہ کسی پُراسرار عمل کے ذریعے غائب ہو گئی۔ وہ جہاز پر موجُود نہیں ہے۔"

میرے لیے یہ بات بے حد عجیب تھی اور مَیں اس پر یقین کرنے کے لیے آمادہ نہیں تھا۔

تیسرے روز بادبانی جہاز احباز کے ساحل پر لنگر انداز ہو گیا۔ اس وقت تک مَیں حیرت انگیز طور پر سنبھل چُکا تھا۔ تاشیہ مجھ سے بدستور کھنچی کھنچی رہی۔ اس نے مجھ سے بات کرنا بھی چھوڑ دی تھی۔

جہاز ساحل پر رُکا تو جارل میرے پاس آیا اور مؤدب ہو کر بولا: "میرے بارے میں کیا حکم ہے؟"

اُس لمحے مجھ پر انکشاف ہُوا کہ مَیں نے سب کے بارے میں تو سوچا تھا لیکن جارل کے بارے میں کچھ نہیں سوچا۔ وہ کب تک میرے ساتھ رہ سکتا تھا؟ اور کہاں تک جا سکتا تھا؟ تبھی مَیں نے اس کے بارے میں ایک بڑا فیصلہ کر ڈالا، جو اس کے شایانِ شان تھا۔

"تم میرے ساتھ کہاں تک جاؤ گے، دوست! مَیں تو ایک سیلانی آدمی ہُوں، مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ میرا مستقبل کیا ہے۔" مَیں نے کہا۔

جارل تعظیم کے طور پر جھکتے ہُوئے بولا: "مَیں تمھارا خادم ہوں، میرے لیے جو بھی حکم ہو، مَیں اس پر عمل کروں گا۔"

مَیں نے اُسے سینے سے لگا لیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہُوئے کہا: "یہ سر جھکنے کے لیے نہیں، جارل۔ یہ ایک جاں باز کا سر ہے اور تم میرے خادم کیسے ہو گئے؟ کیا تم نے نہیں سُنا کہ مَیں نے تمھیں دوست کہہ کر مخاطب کیا ہے؟"

جارل شدّتِ جذبات سے خاموش ہو گیا۔

"سُنو جارل! میرے دوست! مَیں تمھیں ایک حقیر سا تحفہ دینا چاہتا ہُوں۔ اُمید ہے کہ تم اپنے دوست کا تحفہ قبول کر لو گے۔ ملکہ رُدبا اور سُرخ شیطان رخیل کی موت کے بعد آج وہ سارا علاقہ خالی پڑا ہے۔ تم جا کر اُسے آباد کرو۔ اپنے آدمیوں کے ساتھ اس مملکت پر حکومت کرو کہ تمھی اس کے صحیح حق دار ہو۔ تم اسی جہاز سے واپسی کا سفر شروع کر دو۔ میری منزل اب احباز ہے۔"

جارل کے لب کانپے اور کانپ کر رہ گئے . . . پھر اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

کبھی کبھی ایک جاں باز بھی روتا ہُوا اچھا معلوم ہوتا ہے۔ مَیں اُسے توجہ سے دیکھتا رہا اور میری دھڑکنیں بے ترتیب ہوتی رہیں۔

★★

تاشیہ راستے بھر مجھ سے کھنچی کھنچی رہی لیکن ابھی تک ہم دونوں کے درمیان کوئی فیصلہ کن مرحلہ نہیں آیا تھا اس لیے مَیں بھی اس کے رویّے کی تبدیلی خاموشی سے برداشت کرتا رہا۔

سفر دُشوار ثابت نہیں ہُوا۔

ہم کسی زحمت میں پڑے بغیر احباز پہنچ گئے لیکن وہاں ہر طرف خوف و دہشت کی فضا چھائی ہُوئی تھی۔ لوگ سُرخ شیطان کے متوقع حملے سے بُری طرح سہمے ہُوئے تھے۔ تاشیہ ہمارے ساتھ نہ ہوتی تو بلاشبہ ہمیں سُرخ شیطان کے مخبر ہونے کے الزام میں دھر لیا جاتا۔

اپنی مملکت میں پہنچتے ہی شہزادی تاشیہ بااختیار ہو گئی۔ اُس نے مجھے اور سلارو کو ایک مسلح دستے کے حوالے کرتے ہُوئے کہا کہ کل ہمیں شہنشاہِ احباز کے حضور پیش کیا جائے گا۔ اُس نے ہدایت کی کہ مجھے اور سلارو کو الگ الگ رکھا جائے کیونکہ ہمارے مراتب میں فرق تھا۔

مَیں تاشیہ کے سرد رویّے پر حیران تھا۔ وہ چاہتی تو اُسی وقت ہمیں شہنشاہِ احباز کے پاس بھیج سکتی تھی لیکن اُس نے ایسا نہیں

کیا بلکہ معاملہ اگلے روز پر ٹال دیا تھا۔ مَیں نے سوچا کہ ایک ہی بات کی تو بات ہے، ہو سکتا ہے، وہ اس عرصے میں اپنے باپ کو طولانی اور پُرخطر سفر کی داستان سنانا اور پھر میرے لیے راستہ ہموار کرنا چاہتی ہو۔

ایک شاندار عمارت میں داخل ہونے کے بعد مجھے اور سلارڈ کو الگ الگ کر دیا گیا۔ سلارڈ نے موقع دیکھ کر جیب سے سیاہ موتیوں کی تھیلی نکالی اور میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا: "اسے تم رکھ لو، مالک! تمھاری تلاشی لینے کی شاید وہ جرأت بھی نہ کریں لیکن مجھے کھنگال ڈالیں گے۔"

سپاہی اُسے لے کر چلے گئے تو مَیں اس کمرے میں آ گیا جو میرے لیے مخصوص تھا۔ مَیں نہیں جانتا کہ سلارڈ کو کیسا کمرہ دیا گیا تھا، البتہ مجھ جو کمرہ ملا تھا، وہ کشادہ اور آرام دہ تھا۔

رات سر پر آئی تو مجھے خوش ذائقہ کھانا دیا گیا۔ تب مجھے قدرے اطمینان ہوا۔ ورنہ خدشہ تھا کہ کمرے میں مقید کر کے سب لوگ مجھے بھول نہ گئے ہوں۔

کھانا کھا کر مَیں لیٹ گیا اور زندگی کی بوقلمونی پر غور کرنے لگا۔ اس عجیب دَور میں آنے کے بعد مجھے سکون کا ایک دن بھی نہیں ملا تھا اور ایک رات بھی سُکھ کی نیند نصیب نہیں ہوئی تھی۔ مَیں نے سوچا کہ آج رات اگلی پچھلی کسر پوری کرتے ہوئے صبح کی ہی کی خبر لاؤں گا۔

پلکیں نیند سے بوجھل ہوئی تھیں کہ کمرے کا دروازہ آہستہ سے کھلا۔

مَیں چونک پڑا اور فوراً اُٹھ بیٹھا۔

تاشیہ کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔

اُس نے لباس تبدیل کر لیا تھا۔ اب اُس کے نوخیز جسم پر ایک ڈھیلا ڈھالا سفید رنگ کا لبادہ پڑا ہوا تھا۔ کمر کے گرد ایک ریشمی ڈوری کسی ہوئی تھی۔ وہ شاہانہ وقار سے چلتی ہوئی میرے قریب آ کھڑی ہوئی۔

کچھ دیر وہ مجھے گھورتی رہی... پھر اس کے ہونٹ مسکرانے لگے۔

"کیسے ہو، سرفروش؟" اس کے لہجے میں طنز تھا۔

"میرا حال تم سے چھپا ہوا نہیں البتہ مَیں تمھارا حال سمجھنے سے قاصر ہوں۔"

"میرا حال یہ ہے کہ تمھیں قیدی بنا کر مَیں بے حد خوش ہوں۔" اس نے طنزیہ لہجہ برقرار رکھا: "چونکہ تم نے اب تک مجھے بے حد پریشان کیا ہے اس لیے کل علی الصباح تمھیں کوڑے لگائے جائیں گے۔"

"صرف یہی اطلاع دینے آئی تھیں؟" مَیں نے مسکرا کر کہا۔

"نہیں... ایک اور بھی اطلاع ہے۔" اس کے ہونٹوں سے مسکراہٹ رخصت ہو گئی اور ان میں نفرت آمیز کھنچاؤ پیدا ہو گیا جسے محسوس کر کے مَیں چونکے بغیر نہ رہ سکا۔

مَیں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا: "وہ کیا؟"

"مَیں نے دکسیلا... یعنی تمھاری کلاسنی کو سمندر میں دھکا دے دیا تھا۔" اس نے بڑے سفاک لہجے میں کہا۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے میرے سینے میں تیز دھار خنجر اُتار دیا ہو۔ میرے حلق سے چیخ نکل گئی: "نہیں...!"

"خاموش رہو!" وہ نفرت سے پاؤں پٹخ کر بولی: "یہ ملکہ رعنہ یا ملکہ رُدبا کا عشرت کدہ نہیں ہے۔ یہاں میری حکمرانی ہے اور مَیں زیادہ شور پسند نہیں کرتی۔ اُس نے بھی جہاز میں بہت شور مچا رکھا تھا اس لیے مَیں نے اُسے خاموشی کے کفن میں لپیٹ کر سمندر کی تہ میں بھیج دیا۔"

"تم جھوٹ بول رہی ہو۔" میرا لہجہ اب بھی سخت تھا۔

"حدِ ادب سے باہر نہ جاؤ۔" اس نے متانت سے تنبیہ کی: "مَیں نے اُسے سمندر میں دھکا دے دیا تھا۔ چاندنی رات میں وہ عرشے پر کھڑی چاند کی کرنوں اور سمندر کی لہروں میں ہونے والی آنکھ مچولی دیکھ رہی تھی کہ مَیں نے پیچھے سے جا کر اسے دھکا دے دیا۔"

"تم نے ایسا کیوں کیا؟ تمھیں اس کی ضرورت کیوں پیش آئی؟" مَیں نے کراہ کر پوچھا: "تم اتنی ظالم تو نہیں تھیں۔"

"جب رقابت کی آگ بھڑک اُٹھتی ہے تو عورت دُنیا کی سب سے ظالم ہستی بن جاتی ہے۔" اس نے فخریہ لہجے میں کہا جیسے یہ کارنامہ سرانجام دے کر وہ فتح و کامرانی کی خوشی سے پھولی نہ سما رہی ہو۔ "وہ تمھیں مجھ سے چھین رہی تھی۔"

"یہ غلط ہے۔" مَیں نے احتجاج کیا۔

"اور تم بھی مجھے نظر انداز کرنے لگے تھے۔" تاشیہ کا لہجہ برہمی سے ہمکنار ہو گیا: "تم نے شروع ہی سے مجھے توجہ کے قابل نہیں سمجھا۔ مَیں تمھارے نزدیک شاید کوئی ناسمجھ سی بچی ہوں۔ تم نے میرے جذبات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ آخر برداشت کی بھی حد ہوتی ہے۔ اب مَیں تمھیں بتاؤں گی کہ مَیں کیا ہوں۔ تم نے مجھے سمجھا کیا ہے؟" اُس نے کمر کے گرد لپٹی ہوئی پھندنے دار ڈوری کو جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔

"اِدھر دیکھو... میری طرف!"

مَیں نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور نگاہ جھکا لی۔

سُورج کی طرف نظر بھر کر زیادہ دیر کون دیکھ سکتا ہے۔ یہی حالت اس وقت میری بھی ہو رہی تھی... لیکن یہ سُورج اپنی تابناکیوں سمیت

شاید مجھے جھلسا کر راکھ ہی کر ڈالنا چاہتا تھا۔ مَیں حرارتوں کی شدت سے گھبراہٹ محسوس کرنے لگا... اور اُسی لمحے میرا سر کسی چیز سے ٹکرا گیا یا پھر خود مَیں نے ہی جھٹکا کھایا تھا۔ تاشیہ مجھ سے دُور ہٹ گئی اور پھر مَیں نے اُس کی دلدوز چیخ سُنی۔ اتنی طویل اور لرزہ خیز چیخ کہ خود میرا دل شدت سے کانپ گیا... لیکن مَیں خود ایک نئی مصیبت میں مبتلا ہو رہا تھا۔ میرے ذہن میں جھماکے سے ہو رہے تھے۔ یُوں لگ رہا تھا جیسے دماغ میں ان گنت قمقمے جل بجھ رہے ہوں۔ مَیں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تاشیہ کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ اب میرے سامنے دُھندلا رہا تھا۔ وہ محض ایک ہیولہ ہی دکھائی دے رہی تھی... پھر ایسے لگا جیسے میرے اعضا دھڑ سے الگ ہو رہے ہوں۔

مَیں ٹوٹ رہا تھا۔

مَیں بکھرتا جا رہا تھا۔

میری ہستی تحلیل ہوتی جا رہی تھی۔

تاشیہ کی جو حالت مَیں نے آخری بار دیکھی تھی، وہ غالباً میرے تحلیل ہوتے وجود کو دیکھ کر ہوئی تھی۔ مَیں اس دَور کے ہنگاموں میں اتنا محو ہو گیا تھا کہ خود کو اسی دَور کا ایک انسان سمجھنے لگا تھا۔ یہ بھی بھول گیا کہ مَیں کہیں اور سے آیا ہوں اور جس نے مجھے یہاں بھیجا ہے، وہ میری واپسی کے لیے کوشش کر رہا ہو گا۔ ڈاکٹر فریدوں کی کوششیں رنگ لائیں اور میرا منتشر وجود گہری تاریکیوں کی سمت سفر کرتا رہا... تاریکی... گہری تاریکی...

...اور پھر مجھے کچھ بھی یاد نہ رہا جیسے میری سوچیں، میرے خیالات اور میرا دماغ تک منتشر ہو گیا ہو۔

●

مَیں جس زیرِ زمین کمرے میں دراز تھا، وہاں گہری خاموشی تھی۔ مَیں آنکھیں بند کیے پڑا رہا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے مَیں قدیم فراعنہ کے دَور کی ایک حنوط شدہ لاش ہوں اور کسی خاموش مقبرے میں لیٹا ہوا ہوں۔

میرا ذہن ابھی تک کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں ہوا تھا۔

مَیں آنکھیں کھولنے سے نہ جانے کیوں ڈر رہا تھا۔ —

ابھی مَیں کسی فیصلہ کُن مرحلے پر نہیں پہنچا تھا کہ اچانک مجھے اپنے قریب کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ لمحے بھر کے لیے یہی لگا جیسے مَیں شہزادی تاشیہ کے محل میں ہوں اور وہ میرے قریب بے چینی سے ٹہل رہی ہے... پھر میرے ذہن پر غبار سا چھاتا چلا گیا۔ جو کچھ بیت گیا تھا، وہ لمحے بھر کے لیے روشن ہوتا اور پھر دماغ میں تاریک بگولے چکرانے لگتے تھے۔

کافی دیر بعد ذہن پُرسکون ہو گیا۔

مجھے اپنے بازو میں ڈنک جیسی کسی چیز کی چبھن محسوس ہوئی تھی اور مَیں نیند کی گہرائی میں یوں ڈوبتا چلا گیا تھا جیسے کوئی بھاری بھرکم جسم پانی میں تہ نشین ہوتا جا رہا ہو۔ اس بار غفلت بے حد طویل ثابت ہوئی... اور جب مَیں ہوش میں آیا تو ماضی کی بیشتر باتیں چپکے سے میرے لاشعور میں جا کر گُم ہو گئی تھیں۔ مَیں ہوش میں آیا تو مجھے اپنے پپوٹے بے حد بھاری لگ رہے تھے اس لیے اُنھیں کھولنا یا حرکت دینا طاقت سے باہر محسوس ہونے لگا۔

"مَیں نے اسے ایک ایسا انجکشن دیا تھا جس سے یہ بارہ گھنٹے سکون کی نیند سوتا رہا ہے۔ اس کے اعصاب اور دل و دماغ بُری طرح متاثر ہوئے ہیں... لیکن جب یہ بیدار ہو گا تو بالکل تر و تازہ ہو گا۔"

یہ ڈاکٹر فریدوں کی آواز تھی۔

میرا دل خوشی سے جھوم اُٹھا۔ گویا مَیں نے کمپیوٹر کے ذریعے ماضی کا ایک یادگار سفر کامیابی سے سرانجام دیا ہے اور اب مَیں صحیح و سالم اپنے دَور میں واپس آ گیا ہوں۔ بے اختیار جی چاہا کہ مَیں خوشی کا ایک نعرہ بلند کرتا ہوا اُٹھوں اور ڈاکٹر فریدوں سے لپٹ جاؤں... لیکن اُسی لمحے ایک اور آواز سُن کر مَیں نے خود پر فوری قابو پا لیا۔

"وہ تو ٹھیک ہے، ڈاکٹر۔" بولنے والے کی آواز سے احساس ہوتا تھا کہ وہ ڈاکٹر فریدوں کی طرح عمر رسیدہ نہیں ہے: "لیکن آپ کے کمپیوٹر کا ایک معمولی سا نقص کتنے بڑے خطرے کا باعث بن گیا تھا۔ اگر اس شخص کی واپسی عمل میں نہ آتی تو شاید ہمیں اس سلسلے میں مزید تحقیقات ہی سے روک دیا جاتا۔"

"میرا حساب بالکل ٹھیک تھا، ڈاکٹر نوشیرواں۔" ڈاکٹر فریدوں کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ "بس کمپیوٹر میں کوئی معمولی سا نقص رہ گیا تھا۔ نہ جانے کمپیوٹر نے اسے کس زمان و مکاں میں لے جا پھینکا تھا۔ مَیں پچاسویں کوشش میں اسے واپس لا سکا ہوں۔ یہ میری آخری کوشش تھی، اس کے بعد کمپیوٹر ناکارہ ہو جاتا اور پھر سرفروش کی واپسی کبھی ممکن نہ ہوتی۔ یہ نہ جانے کہاں کہاں بکھر جاتا۔ بہرحال، یہ جہاں کہیں بھی رہا ہے، اس نے بڑا ہی مصروف اور جدوجہد سے بھرپور وقت گزارا ہے۔ اس کی رنگت ہی بدل گئی ہے۔ تیز دھوپ اور محنت و مشقت سے اس کا رنگ سنولا گیا ہے۔ اس کے جسم پر جا بجا زخموں کے نشان اور خراشیں ہیں۔ خُدا جانے یہ کس عہد میں چلا گیا تھا، کس سرزمین پر رہا اور کیا کچھ کرتا رہا ہے۔"

"ہاں... جب یہ ہوش میں آئے گا تو بڑی ہی دلچسپ کہانی سُنائے گا۔" ڈاکٹر نوشیرواں کی جوان آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

"اس طرح سائنس کی دُنیا میں ہماری دھاک بیٹھ جائے گی اور دُنیا میں تہلکہ مچ جائے گا۔"

"میں اپنے کمپیوٹروں کو ازسرِنو دیکھوں گا تاکہ وہ ہر قسم کی خامی سے پاک ہو جائیں۔" ڈاکٹر فریدوں نے فخریہ لہجے میں کہا۔ "میں سمجھتا ہوں کہ ہم بہت جلد اسے حسبِ منشا، جہاں چاہیں گے بھیج سکیں گے اور یہ نوجوان ہمارے لیے ایک بہترین جاسوس کا کام سرانجام دے گا۔ اسے ہوش میں آنے دو پھر تحقیق کی ایک نئی راہ کھل جائے گی۔"

"یہ آتے ہوئے کچھ مواد بھی ساتھ لایا ہے؟" ڈاکٹر نوشیرواں نے پوچھا۔

"ہاں... اس کے قبضے سے کچھ سیاہ موتی برآمد ہوئے ہیں۔ میں نے انھیں تجزیے کے لیے بھیج دیا ہے۔ رپورٹ کے مطابق یہ موتی کئی سو سال قبل مسیح کے کسی دَور میں پائے جاتے تھے کیا یہ بات حیرت انگیز نہیں؟"

اُسی لمحے میرے شعور میں کچھ ہیولے چکرانے لگے اور میں بے ساختہ اُن کا نام لے لے کر پکارنے لگا۔

"ناشیرہ... سِلاردو... جارل... کلانسی..."

مجھے اپنے ہونٹ کانپتے محسوس ہونے لگے اور میں نے بےخودی کے عالم میں کئی بار ان ناموں کو دُہرایا۔ اس وقت میں یہ بھی بھول گیا کہ کہاں لیٹا ہوا ہوں اور میرے قریب کون لوگ موجود ہیں۔

... اور جب میں ماحول سے آشنا ہوا تو ڈاکٹر فریدوں کی خوشی سے کانپتی ہوئی آواز سنائی دی۔ "بہت خوب! بہت خوب! سرفرش! کیا تم ہوش میں آ گئے ہو؟"

میں نے بمشکل اپنے وزنی پپوٹے اٹھائے اور اُس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر خوشیوں کے دھنک رنگ بکھرے ہوئے تھے۔

"کیا تم مجھے پہچان سکتے ہو، میں کون ہوں؟" ڈاکٹر فریدوں نے میری طرف یوں دیکھتے ہوئے محبت سے کہا جیسے کوئی خالق اپنی مخلوق کو فخریہ نگاہ سے دیکھتا ہے۔

"ہاں۔ ڈاکٹر فریدوں۔ میں آپ کو پہچان سکتا ہوں۔"

"آفرین... صد آفرین۔" ڈاکٹر نوشیرواں کی آواز سنائی دی۔

"ٹھیک ہے۔ اب تم آرام کرو۔" ڈاکٹر فریدوں نے کہا۔ "تمھارے جسم کو بھی امتحان سے گزرنا پڑا ہے۔ صرف کھانے پینے میں ذرا احتیاط برتنا۔ جلد ہی تم سے دوبارہ ملاقات ہو گی۔ تب میں تمھیں ایک زبردست خوش خبری بھی سناؤں گا۔"

"میرا خیال ہے، اسے کسی سرسبز علاقے میں منتقل کر دینا چاہیے۔" ڈاکٹر نوشیرواں نے کہا۔ "اس طرح اس کی ذہنی حالت جلد قابو میں آ جائے گی۔"

"ٹھیک ہے، میں اسے اس محل نما عمارت میں بھجوا دیتا ہوں جہاں میں تحقیقی کاموں کی منصوبہ بندی کرتا ہوں۔" ڈاکٹر فریدوں نے کہا اور دونوں کمرے سے نکل گئے۔

میں چھت کی طرف گھورتا رہا اور سوچتا رہا۔

تب مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ میرا ذہن سوچوں سے بالکل ہی خالی ہو گیا ہے۔ میں نے دماغ پر زور ڈالنے کی کوشش کی تو بھی یہ کیفیت برقرار رہی... کافی دیر بعد ایک ہیولا میرے ذہن کی سکرین پر نمودار ہوا اور رفتہ رفتہ واضح ہوتا چلا گیا۔

"لالہ رُخ... لالہ رُخ..." میں نے زیرِ لب کہا اور وہ حسین پیکر واضح تر ہوتا چلا گیا۔ تب میں اپنی محبوبہ لالہ رُخ کے نقش و نگار میں کھو گیا اور انوکھی لذتیں میرے احساسات میں گھلتی چلی گئیں۔

★★

شام کے سائے گہرے ہو گئے تھے۔

رات زینہ زینہ اُتر رہی تھی اور چاند دھیرے دھیرے بلند ہوتا جا رہا تھا۔

میں ایک آرام دہ کمرے میں لیٹا ہوا تھا جب سے اس محل نما قدیم عمارت میں مجھے منتقل کیا گیا تھا، میری حالت بڑی ہی عجیب سی ہو گئی تھی۔ میں سب کچھ سُن سکتا تھا، سب کچھ سمجھ سکتا تھا لیکن نہ جانے کیوں بیان کرنے کی صلاحیت کہاں کھو گئی تھی۔ دراصل میری قوتِ گویائی ہی نہیں ذہن بھی متاثر ہوا تھا۔ وجہ میرے لیے ناقابلِ فہم تھیں۔ صرف اتنا ہی دل کو سمجھا کر خوش ہو لیتا تھا کہ ڈاکٹر فریدوں جس انداز میں مجھ پر توجہ دے رہا ہے، اس سے میں جلد ہی نارمل ہو جاؤں گا۔

اس عمارت میں آئے ہوئے مجھے پورا ایک ہفتہ گزر گیا تھا۔ اس دوران میں مجھ پر اَن گنت تجربے کیے گئے۔ لاتعداد طبی معائنے ہوئے اور نہ جانے کتنی بار مجھے مختلف مشینوں کا امتحان دینا پڑا تھا۔ ایک ہفتے بعد میری حالت خاصی بہتر ہو گئی تھی لیکن ذہن پر کبھی کبھی زبردست غبار چھا جاتا اور پھر ہر چیز دُھندلا جاتی تھی۔

میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ تختۂ گلاب پر چہل قدمی کرتے ہوئے تین آدمی مجھے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ ڈاکٹر فریدوں اور اس کا نائب ڈاکٹر نوشیرواں آگے آگے تھے اور دُم چھلے کی طرح ڈاکٹر جمیز ان کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ وہ ان دونوں کی باتوں میں نہ تو حصّہ لے رہا تھا اور نہ ہی دلچسپی لیتا محسوس ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر فریدوں اور نوشیرواں، انسان کو سالموں میں تقسیم کرنے اور پھر ان سالموں کو یکجا کر کے دوبارہ انسانی شکل میں لانے کی تھیوری پر بحث کر رہے تھے

جو میری فہم و ادراک سے بالاتر تھی... لیکن ایک بات میں اچھی طرح محسوس کر چکا تھا کہ وہ لوگ مجھے کمپیوٹر میں ڈال کر ایک بار پھر کسی نامعلوم دور میں بھیجنا چاہتے تھے۔

میں نے ایک طویل سانس لی اور ان کی طرف سے توجہ ہٹا لی۔ یہ میری خوش قسمتی ہی تھی کہ کمپیوٹر میں خامی کے باوجود میرے سالمے یکجا ہو گئے تھے اور مجھے دوبارہ زندگی مل گئی تھی ورنہ میں ہمیشہ کے لیے ذروں کی شکل میں اس نامعلوم سرزمین پر بھٹکتا رہ جاتا جس کے تذکرے میں جدید دور کی تاریخی کتابیں بھی خاموش تھیں۔

چہل قدمی کرتے ہوئے وہ تینوں تختۂ گلاب کے آخری حصے میں پہنچ کر رک گئے۔ وہ تمباکو نوشی کرتے ہوئے چاندنی میں چمکتے دمکتے دریا کا نظارہ کر رہے تھے۔ ان کے قریب ہی ایک تالاب میں ایک بطخ اپنی چونچ پروں میں دبائے سو رہی تھی۔ اس بطخ کو دیکھ کر مجھے اپنی لالہ رخ یاد آ گئی۔ ایسی ہی کانچ کی بنی ہوئی ایک نازک سی بطخ اس نے مجھے تحفے میں دی تھی جو اب بھی شاید میرے کمرے میں گول آئینے پر رکھی ہو گی۔ لالہ رخ یاد آئی تو میری بے چینیاں بڑھنے لگیں۔ بے اختیار جی چاہا کہ اُڑ کر اس تک جا پہنچوں۔ اس کی شب رنگ زلفوں سے کھیلوں اور اس ——— کی مہک چراؤں... لیکن یہ ایک ایسی خواہش تھی جس پر سنگین حالات کے پہرے تھے۔ میں توقع کر سکتا تھا، خواہش کرنا میرے بس میں تھا لیکن اس کی تکمیل مقدر کے ہاتھ میں تھی جس کا رویہ میرے ساتھ بڑا ہی ستم ظریفانہ تھا... میں نے تختۂ گلاب کی طرف دیکھا۔

وہ تینوں آہستہ آہستہ میرے کمرے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور یوں بن گیا جیسے گہری نیند میں ڈوبا ہوا ہوں۔ آنکھیں بند کرتے ہی مجھے ڈاکٹر فریدوں کا وعدہ یاد آ گیا جس کے مطابق اُسے یہاں پہنچتے ہی مجھے کوئی خوش خبری سنانا تھی لیکن یا تو وہ بھول گیا تھا یا پھر ابھی وہ خوش خبری سنانے کا وقت ہی نہیں آیا تھا۔

ڈاکٹر فریدوں کا رویہ اب میرے ساتھ بے حد محبت آمیز تھا۔ شکائی عہد سے واپسی پر نہ جانے مجھ میں سرخاب کا کوئی پر لگ گیا تھا کہ اچانک ڈاکٹر فریدوں کا لہجہ ہی بدل گیا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ بھول گیا ہو کہ مجھ پر قتل کا الزام ہے اور میں ایک مفرور مجرم ہوں۔ میں نے فیصلہ کیا کہ موقع ملتے ہی اس سلسلے میں ڈاکٹر فریدوں سے ضرور بات کروں گا۔ فی الحال میرے لیے یہی کافی تھا کہ میں اس عمارت سے نکل کر قدیم طرز کے اس محل میں آ گیا تھا ورنہ اُس عمارت کا قانون تو یہ تھا کہ وہاں داخل ہونے والا کبھی واپس نہیں جا سکتا جب اتنی گنجائش نکل آئی ہے تو مزید گنجائشیں خود بخود نکل آئیں گی۔ اس اُمید پر میری دھڑکنیں خوش گوار ہو گئیں۔

معاً اُن کے قدموں کی چاپ سنائی دینے لگی۔

وہ کمرے میں آئے اور بیٹھ گئے۔

غالباً انھوں نے میری طرف دیکھا تھا لیکن مجھے گہری نیند میں ڈوبے پا کر آپس میں باتیں شروع کر دی تھیں۔ مجھے ان کی باتوں سے دلچسپی بھی تھی اور میں انھیں سننے کے لیے ہی دکھاوے کی نیند خود پر طاری کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

"ڈاکٹر فریدوں، آپ نے سرفروش کے حافظے کو وسعت دینا کیوں ضروری سمجھا؟" نوشیرواں نے سوال کیا۔

جواباً فریدوں ہنس پڑا۔ اس کی ہنسی میں خوشیاں ہی خوشیاں ہلکورے لے رہی تھیں۔ میری سماعت سے اس کی خوش گوار آواز ٹکرانے لگی۔

"جب ہم نے اسے کسی نامعلوم عہد میں منتقل کیا تو اس کی یادداشت بہت کمزور ہو گئی۔ اس کا حافظہ درحقیقت کمپیوٹر کے مرحلے سے گزرتے وقت ہی کمزور ہو گیا تھا یا کسی پُراسرار سرزمین پر پہنچنے کے بعد ایسا ہوا تھا، حد تو یہ ہے کہ اسے خود بھی یاد نہیں۔ بہرکیف اس کی یادداشت نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ واپسی میں اس نامعلوم سرزمین کی بہت تھوڑی اور وہ بھی بے حد دھندلی یادیں رہ گئی تھیں۔"

"پھر آپ نے کیا کیا، ڈاکٹر؟"

"میں وہی بتانے والا تھا۔" ڈاکٹر فریدوں نے کہا۔ "تم تو جانتے ہی ہو کہ ہماری اس جدوجہد کا مقصد علم اور خزانوں کا حصول ہے۔ وہ علم جو مرورِ زمانہ کے باعث ختم ہو گیا اور وہ بیش بہا خزانے جو ہماری زمین میں دفن ہیں لیکن ہمیں معلوم نہیں کہ وہ کہاں دفن ہیں۔ مجھے اعتراف ہے کہ سرفروش کے پہلے سفر میں ہمیں کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ یہ فائدہ اسی وقت ممکن ہے جب یہ وہاں جا کر جو کچھ دیکھے اُسے سیکھے اور پھر ذہن میں محفوظ بھی رکھے۔"

"آپ نے یادداشت بڑھانے کے لیے اسے کیا دیا ہے؟"

"جدید ترین دوا پیٹی لینی میٹرا زول۔ یہ دوا دماغی خلیوں کو اچھے معنوں میں متاثر کرتی ہے۔ تم یہ جان کر یقیناً خوش ہو گے کہ چند روز میں سرفروش نہ صرف ایک خود کار حافظے کا مالک ہو گا بلکہ اس کے حافظے کو یادیں محفوظ رکھنے کے لیے ایک فالتو ذخیرہ گاہ بھی فراہم کی جا رہی ہے۔ اب یہ جس بھی دور میں جائے گا، وہاں اسے کچھ یاد رکھنے کی زحمت نہیں اُٹھانا پڑے گی بلکہ سب کچھ خود بخود

ذہن نشین ہوتا جائے گا۔ اس کا کام صرف اتنا ہو گا کہ یہ اپنی بقا کے لیے حالات کا مقابلہ کرتا رہے۔ واپسی پر ہم اس کے ذہن سے وہ ساری معلومات یوں برآمد کر لیں گے جیسے بوتل سے گلاس میں کوئی مشروب اُنڈیل لیا جاتا ہے۔"

"بہت خوب! ڈاکٹر فریدوں۔ مرحبا مرحبا۔" دونوں معاون سائنس داں بیک وقت بولے اور ڈاکٹر فریدوں کا فاتحانہ قہقہہ پورے کمرے میں گونجنے لگا۔

"میں سرفروش کی کارکردگی سے بے حد مطمئن ہوں۔" کچھ دیر بعد ڈاکٹر فریدوں نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ "یہ ابھی تک سویا ہوا ہے۔ خیر، جب جاگے گا تو میں اسے ایک خوش خبری سناؤں گا۔"

"وہ کیا، ڈاکٹر؟" ڈاکٹر جمشید نے میرے دل کی بات پوچھی۔

"اس پر قتل کا جو الزام تھا، وہ ختم ہو چکا ہے۔ دراصل سرفروش ایک دیانت دار آدمی ہے۔ حریفوں نے اسے اپنی راہ پر لگانے کی کوشش میں ناکامی کے بعد اس خوف سے اسے ہلاک کر ڈالنا چاہا کہ کہیں یہ اُن کے مقابل نہ آ جائے۔ اس کے کلب میں جس شاگرد کی لاش پائی گئی تھی، اسے سیمرغ کلب کے ایک نوجوان نے قتل کیا تھا۔ بعض اختلافات کے باعث وہ نوجوان معتوب ہو گیا تو اس نے قانون کی پناہ حاصل کی اور پھر سب کچھ ظاہر کر دیا۔ سیمرغ اگرچہ مفرور ہے لیکن اس کے بعض ساتھی گرفتار ہو چکے ہیں۔ انھوں نے بھی اس بات کی تائید کی ہے کہ سرفروش قاتل نہیں ہے۔"

یہ سُن کر میرا دل خوشی سے دھڑک اُٹھا۔ مجھ پر شادیٔ مرگ جیسی کیفیت طاری ہو گئی اور میں اُچھل کر بیٹھ گیا۔ "کیا یہ سب کچھ سچ ہے، ڈاکٹر... یا میں کوئی سہانا خواب دیکھ رہا تھا؟" میں نے چیخ کر پوچھا۔

ایک لمحے کے لیے تو میری اس مداخلت پر وہ تینوں ہکا بکا رہ گئے... پھر ڈاکٹر فریدوں نے مسکرا کر تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "یہ سب کچھ سچ ہے، جانِ فریدوں۔" اس کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔ "اور اصل خوش خبری یہ ہے کہ میں نے تمھارے بارے میں شہنشاہ سے خصوصی اجازت نامہ بھی حاصل کر لیا ہے۔"

"وہ کس سلسلے میں؟" میں نے حیرانی ظاہر کی۔

"لالہ رخ..." اس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ "کیا تم اس سے ملنا نہیں چاہتے۔ وہ بے چاری تمھاری تلاش میں نہ جانے کہاں کہاں ماری ماری پھر رہی ہے۔ بہرحال، آج رات تمھارا ایک خصوصی آپریشن ہو گا۔ اس کے تین روز بعد تم کہیں بھی جانے کے لیے آزاد ہو گے... لیکن اس آزادی کا مطلب کہیں یہ نہ لے لینا کہ تم ہمیں دھوکا دے کر کہیں فرار ہو جانے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔ ہمیں جب بھی تمھاری ضرورت پڑے گی، صرف ایک لمحے میں تم خود بخود ہمارے پاس پہنچ جاؤ گے۔"

"لیکن جب قانون نے مجھے بے گناہ قرار دے دیا ہے تو مجھ پر آپ کی پابندیاں بھی ختم ہو جانا چاہئیں۔ اب یہ میری مرضی پر منحصر ہونا چاہیے کہ میں آپ کے لیے کام کروں گا یا نہیں۔"

"ایسا نہیں ہے، سرفروش۔" ڈاکٹر فریدوں یکایک بے حد سنجیدہ ہو گیا۔ "باہر کے قانون اور میری تجربہ گاہ کے قوانین میں فرق ہے۔ کیا تم بھول گئے کہ اس تجربہ گاہ میں داخل ہونے والے کے لیے باہر کیا تحریر کیا گیا ہے؟"

میں ایک طویل سانس لے کر مسکرانے لگا۔

"ڈاکٹر..." میں نے قدرے جذباتی لہجے میں کہا۔ "یہ زندگی تمھاری ہی مرہونِ منت ہے۔ اسے جس طرح چاہے استعمال کرو۔ میں کبھی اُف بھی نہیں کروں گا۔ اگر اُس روز میری زندگی کا آخری باب بند ہو جاتا تو آج یہ سب کچھ سوچنے اور کہنے کی نوبت ہی نہ آتی۔"

"میں تمھارا خوب جائزہ لے چکا ہوں، سرفروش!" ڈاکٹر فریدوں کا لہجہ فخریہ ہو گیا۔ "تم ایک بے مثال نوجوان ہو۔ یہ میری ہی نہیں ماسٹر کمپیوٹر کی بھی رائے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر بار اَن گنت پرسنل فائلز میں سے صرف تمھارا ہی کارڈ منتخب کرتا ہے۔"

"گویا میری خوبیاں اور صلاحیتیں ہی میری دشمن بن گئی ہیں۔" میں نے مسکرا کر کہا اور ان تینوں کی مسکراہٹیں بھی گہری ہوتی چلی گئیں۔

"بس اب تم آرام کرو۔ جھوٹ موٹ آنکھیں بند کر کے نہیں، حقیقی آرام۔ تمھیں آج ایک نازک آپریشن سے گزرنا ہے۔" ڈاکٹر فریدوں نے اُٹھتے ہوئے کہا اور پھر وہ اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

مارے خوشی کے میرا رُواں رُواں کانپ رہا تھا۔ میں اپنے دل کی بے چین دھڑکنیں سُنتا رہا، جو لالہ رخ کے قدموں کی دبی دبی آہٹیں معلوم ہو رہی تھیں۔

●

رات پر روپ کی رُت اُتر آئی تھی۔

آسمان لالہ رخ کی خوبصورت نیلی آنکھوں کی طرح صاف تھا۔ چار سو چاندنی پھیلی ہوئی تھی اور ہوائیں نہ جانے کہاں جا کے سو گئی تھیں لیکن خوشبو جاگ رہی تھی... اور خوشبو اس لیے جاگ رہی تھی کہ میں اور لالہ رخ معطّر کے خوشبو دار پودوں کے درمیان

پاس پاس لیٹے ہوئے تھے۔ میں بڑی آسودگی محسوس کر رہا تھا۔ میں نے کروٹ لے کر لالہ کی طرف دیکھا۔ وہ باہوں کا تکیہ بنائے یوں چُپ چاپ اور ساکت لیٹی ہوئی تھی جیسے کسی طلسم نے اسے مرمریں مجسمے میں تبدیل کر دیا ہو۔

ہر مرد کو اپنی محبوبہ دُنیا کی سب سے زیادہ حسین لڑکی نظر آتی ہے لیکن لالہ کا حُسن تو ویسے ہی بے پناہ تھا۔ یہ اچھا ہی تھا کہ اس نے اپنی آنکھیں موند رکھی تھیں ورنہ جب وہ مجھے متوجہ پاتی تو مسکراتے ہوئے اپنے نچلے ہونٹ کا بایاں کونا دانتوں تلے دبا لیتی۔ تب اس کی یہ ادا میرے لیے بڑا ہی پُر لطف لیکن دُشوار امتحان بن جاتی میرا خون مجھے آنچ دینے لگتا اور وہ میری اس کیفیت کا لطف لینے کے لیے کہتی۔

"آؤ جان! وہ باتیں کریں جو شاعر ہمارے لیے کر چکے ہیں۔"

وہ کسی خوبصورت شعر کا ایک مصرعہ سُناتی اور اس کے جواب میں مجھے بھی کسی شعر کا مصرعہ سُنانا پڑتا۔ "مصرعے بازی" کا یہ شغل اسے بے حد پسند تھا اور قربت کے خوشگوار لمحوں میں ہم اکثر یہ کھیل بھی کھیلا کرتے تھے۔

ان لمحوں میں ڈاکٹر فریدوں اور اس کی مہم کا خیال میرے لیے بڑا ہی سوہانِ رُوح ثابت ہونے لگا تھا۔ مجھے لالہ رُخ کے پاس آئے آج چوتھی شب تھی لیکن یوں لگتا تھا جیسے ہم ابھی ایک لمحے قبل ہی ایک دُوسرے سے ملے ہوں۔ ڈاکٹر فریدوں نے وعدے کے مُطابق میرا آپریشن کر دیا تھا۔ یہ آپریشن درحقیقت مجھے ماسٹر کمپیوٹر سے مستقل طور پر وابستہ کرنے کے لیے کیا گیا تھا۔ اب کمپیوٹر کو جب بھی میری ضرورت پڑتی، وہ مجھے فی الفور تحلیل کر کے اپنے ریسیونگ سیٹ میں بُلا سکتا تھا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ ڈاکٹر نے مجھے اتنی فراخ دلی سے لالہ رُخ کے ہاں آنے کی اجازت بھی دے دی تھی۔ گویا میں اب ایک آزاد قیدی تھا۔ میں نے ان خیالوں کو ذہن سے دھکیل دیا اور لالہ کی طرف متوجہ ہو گیا جو کچھ خاموش اور رُوٹھی رُوٹھی سی لگ رہی تھی۔

"آؤ لالہ... وہ باتیں کریں جو شاعر ہمارے لیے کر چکے ہیں۔" میں نے کہا اور پھر یہ مصرعہ سُنایا۔ "میرے دل کی آگ، تیرا رنگ رُوپ!"

اس نے نہ آنکھیں کھولیں اور نہ ہی میری طرف کروٹ لی بلکہ اس نے تو اپنا نرم و نازک ہاتھ بھی میری طرف نہیں بڑھایا اور رُکے رُکے لہجے میں یہ مصرعہ سُنا دیا۔ "محبتوں کے مہکتے گلاب راکھ ہوئے۔"

مجھے اس سے اس جواب کی توقع نہیں تھی کیونکہ وہ ہمیشہ ایسے مصرعے سُنایا کرتی تھی جن میں اُس کا پیار جھلکتا اور دل دھڑکتا تھا۔ مجھے اُس کے رَدِّعمل اور اس جواب نے چونکا دیا۔ میں نے اس کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔ "کیا بات ہے لالہ جان۔ تم نے ایسا جواب کیوں دیا؟"

اُس نے ایک جھرجھری سی لے کر آنکھیں کھول دیں اور میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ "تاشیہ کون ہے؟"

"تاشیہ؟" میں ذہن پر زور دے کر سوچنے لگا لیکن مجھے ایسا کوئی نام یاد نہ آ سکا۔ آشکانی دَور سے واپسی کے بعد میرے حافظے پر جو گہری دُھند سی چھا گئی تھی، کبھی کبھی کوئی یاد اس دُھند میں جگنو کی طرح چمکتی اور پھر اُسی اندھیرے میں گُم ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر فریدوں نے بتایا تھا کہ گزرے دِنوں کی یادیں میرے حافظے کی تحویل سے نکل گئی ہیں اور میرا ذہن اُنھیں دوبارہ نہیں سمیٹ سکے گا۔ میں اپنے ذہن پر بہت زیادہ زور ڈال کر حافظے کی راکھ کریدنے میں کامیاب ہو جاؤں، تب بھی یاد کی کوئی ایک آدھ چنگاری ہی نکلے گی اور چشمِ زدن میں بجھ جائے گی۔

میں نے تاشیہ کے لیے حافظے کی راکھ کریدی تو میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہُوا۔ شعُور اور لاشعُور کی درمیانی منزلوں میں ایک لڑکی کا ہیولا اُبھرا، جس کا حُسن وحشی تھا اور رنگت سونے جیسی تھی۔ اس دہکتی ہُوئی لڑکی کی باہیں میرے گلے کی زنجیر بنی ہُوئی تھیں... پھر وہ چہرہ، وہ آنکھیں، وہ باہیں اور وہ لڑکی دُھند میں غائب ہو گئی میرے ذہن کی تختی پر کوئی نقش اور کوئی تصویر باقی نہ رہی۔

"تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا، سرفروش!" لالہ رُخ نے مجھے خیالوں میں غرق دیکھ کر بے چینی سے پوچھا تو میں چونک پڑا۔

"سرفروش..." وہ تو ہمیشہ مجھے پیار سے سرفی کہا کرتی تھی مگر آج وہ دن بھر مجھے سرفروش کہہ کر مخاطب کرتی رہی تھی۔ اُس نے ایک بار بھی مجھے سرفی کہہ کر نہیں پُکارا تھا۔ کیوں؟... مگر میں نے اس سے یہ پوچھنے کی بجائے کہا۔ "میں کسی ایسی ہستی کو نہیں جانتا جس کا نام تاشیہ ہو... تم نے یہ سوال کیوں کیا؟"

لالہ اسی طرح میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتی رہی... پھر اس نے مجھے ہٹا کر مُنہ پھیر لیا۔ اُس نے ایسا کیوں کیا؟... وہ تو مجھ پر ہمیشہ مہربان رہتی تھی... پھر اچانک یہ بے رُخی کیوں؟ میں سوچتا اور اُلجھتا رہا۔

"ایسا مت کرو، لالہ! مجھے پاگل مت بناؤ۔" میں نے پریشان ہو کر کہا۔

"پاگل تو تم نے مجھے بنایا ہے، سرفروش۔" وہ پلٹتے ہُوئے بولی۔ "تم نے مجھے دھوکے میں رکھا ہے۔ میں تم سے اس سلوک کی توقع نہیں رکھتی تھی۔ ہم نادان بچے نہیں ہیں جو ایک دُوسرے کو جھُوٹی باتوں سے بہلاتے رہیں۔ اگر تم نے کسی دُوسری عورت کو

اپنے دل میں سجا لیا ہے تو صاف صاف بتا دو۔ میں تمھارے پاؤں کی زنجیر نہیں بنوں گی۔ تمھارے راستے میں کبھی نہیں آؤں گی۔" وہ جذبات کی رَو میں نہ جانے کیا کیا بولتی چلی گئی۔

"بس، چپ ہو جاؤ لالہ۔ میں نے تمھیں دھوکا نہیں دیا اور میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔ اگر تاشیہ کسی عورت کا نام ہے تو میں اُسے نہیں جانتا۔" میں نے زِچ ہو کر کہا۔ لیکن یہ نام آتے ہی میرے ذہن میں پھر ایک جھماکا سا ہُوا اور چشمِ زدن میں ایک کُندنی سراپا لہرا گیا۔

لالہ کچھ نہ بولی۔ بس میری آنکھوں میں دیکھتی رہی۔ وہ کہا کرتی تھی کہ میری زبان تو جھُوٹ بول سکتی ہے لیکن میری آنکھیں جھُوٹ نہیں بول سکتیں۔ آنکھیں ہمیشہ سچ کہتی ہیں۔ میں نے اُسے بازوؤں کی دیوار میں چُن دیا تو وہ چیخ اُٹھی۔ "اُف... ایسا نہ کرو سرفی! میرا دم گھُٹ جائے گا۔" اُس نے آج پہلی بار مجھے سرفی کہا تھا۔

"مجھے افسوس ہے، جان!" میں نے بازوؤں کی دیواروں کو وسعت دیتے ہُوئے کہا۔ "لیکن تمھیں بتانا پڑے گا کہ یہ سب کیا چکر ہے؟"

"اچھی بات ہے۔" لالہ نے کہا۔ "ہو سکتا ہے، یہ ایک خواب پریشان ہو اور جذبۂ رقابت نے مجھے ایسا سمجھنے پر مجبور کر دیا ہو... مگر لگتا ہے کہ تمھارے پیار نے مجھے پاگل بنا دیا ہے۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تم نے مجھ سے کبھی جھُوٹ نہیں بولا... لیکن پھر بھی دل اس خیال سے لرز اُٹھتا ہے کہ تم کسی دُوسری عورت کو چاہ سکتے ہو۔ کل رات میری آنکھ کھُل گئی۔ اس کا باعث تمھاری وہ باتیں تھیں جو تم خواب میں کر رہے تھے۔ تم نے مجھ سے کہا کہ میں اپنی جگہ تاشیہ کے لیے خالی کر دوں اور یہ کہتے ہُوئے تم نے مجھے پرے دھکیل دیا۔ پھر تم نے تاشیہ کو آواز دی اور اسے اپنے قریب بٹھا لیا... پھر... پھر..."

وہ اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکی اور رونے لگی۔

میں نے لالہ کی طرف دیکھا۔ میرا دل جو طوفانوں سے ٹکرانے کی ہمت رکھتا ہے، لالہ کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر کانپ اُٹھا۔ میں نے جلدی سے اُس کے آنسو پونچھے اور بولا۔ "تم نے مجھے جگا کیوں نہ دیا، پگلی؟"

"میں نے کوشش کی تھی مگر ایسا نہ کر سکی۔ میں تم سے خوفزدہ ہو گئی تھی۔ میں جانتی ہوں کہ تم بے حد طاقت ور ہونے کے باوجود میرے لیے اپنے دل میں نرمی ہی نرمی رکھتے ہو لیکن کل رات تم آدمی نہیں، وحشی بن گئے تھے۔ تمھیں اس عالم میں دیکھ کر مجھے تم سے نفرت ہو گئی تھی۔ میں تم سے اتنی خوفزدہ ہُوئی کہ تمھیں چھوڑ کر دُور کھڑی ہو گئی اور وہ باتیں سُنتی رہی جو تم تاشیہ سے کر رہے تھے۔ میں خاموشی سے تماشا دیکھتی اور سسکتی سُلگتی رہ گئی۔"

جب لالہ یہ بتا رہی تھی تو میں سوچ رہا تھا کہ کہیں یہ اُسی سائنسی عمل کے نتیجے میں تو نہیں ہُوا جو ڈاکٹر فریدوں کچھ عرصے سے مجھ پر کرتا رہا ہے۔ میرا ذہن تو ایک بند مقبرہ بن گیا تھا۔ اگر کل رات اُس میں ایک دراڑ پڑی ہے یا کوئی روزن کھُلا ہے تو پھر اس میں مزید دراڑیں بھی پڑ سکتی ہیں اور بہت سے روزن بھی کھُل سکتے ہیں۔ تب میں لالہ کو کیا جواب دُوں گا جو میرے لیے دُنیا کی سب سے زیادہ عزیز ہستی ہے۔ تاہم میں نے لالہ سے کہا۔ "مجھے صرف ایک بات کا جواب دے دو لالہ۔ کیا میں ایسا گھٹیا ہو سکتا ہُوں؟ کیا تم مجھے اتنا پَست سمجھتی ہو؟ یہ صرف ایک خواب تھا، جاناں... اور خواب بھی میرا نہیں ہو سکتا۔ یہ کسی اور کا خواب تھا جو میں نے دیکھ لیا ہے۔"

"ہاں، یہ خواب ہی ہو گا لیکن اس نے میرے ذہن میں اپنے پنجے گاڑ دیے ہیں۔" لالہ بولی اور کچھ سوچنے لگی۔

میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اس وقت نہ مجھے چاند اچھا لگ رہا تھا اور نہ ہی جھلملاتے ہُوئے ستارے... میں نے دل ہی دل میں ڈاکٹر فریدوں کو اور اپنے آپ کو کوسنا شروع کر دیا۔ اس معاہدے پر لعنت بھیجی جس کے تحت میں زندگی کے آخری لمحے تک کمپیوٹر کا پابند تھا۔ آفیشل سیکرٹ ایکٹ نے مجھے ہمہ تن چشم تو بنا دیا تھا مگر میرے ہونٹوں پر مہر لگا دی تھی۔ اگر میں اس تجربے اور اپنے کام کے بارے میں ذرا سی بات بھی ظاہر کرتا تو فوری موت میرا مقدر بن سکتی تھی۔ میں انھی سوچوں میں غلطاں تھا کہ لالہ کی آواز سُن کر چونک پڑا۔

"چند ماہ پہلے تک تم مجھے شادی کی زنجیروں میں جکڑنے پر بضد تھے اور میں اس لیے رضامند نہیں ہو رہی تھی کہ میں تمھیں اچھی طرح نہیں جان پائی تھی۔ خُود اپنے بارے میں بھی مجھے یہ یقین نہیں تھا کہ واقعی میں تم سے شدید محبت کرتی ہُوں اور جب مجھے محسُوس ہُوا کہ میں تمھارے بغیر ادھوری ہُوں تو تم نے مجھ سے شادی کے لیے کہنا ہی چھوڑ دیا... پھر تم طویل وقفے کے لیے غائب ہو گئے اور جب واپس آئے تو تمھارے چہرے پر خراشوں اور جسم پر زخموں کے نشان تھے۔ تمھاری نگاہوں سے اجنبیت جھلکتی تھی۔ ان ساری باتوں کے باوجُود تم مجھ سے وہی پہلی سی محبت چاہتے

ہو اور میں تمھیں تمھاری طلب سے کہیں زیادہ محبت دے چکی ہوں۔ میں شعوری طور پر ایسا نہیں کرتی۔ میرا دل اپنے آپ ہی تم پر دیوانہ وار نچھاور ہونے لگتا ہے... لیکن میں جانتی ہوں کہ ہمیشہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں عورت ہوں۔ میں شادی کرنا چاہتی ہوں۔ بچوں کی ماں بننا چاہتی ہوں اور ایسے شوہر کی آرزومند ہوں جسے میں روز دیکھ سکوں جس کی ہر شب میری ہو لیکن تم نے مجھے اتنا بھی نہیں بتایا کہ کلب بند کرنے کے بعد اب تمھارا وسیلۂ رزق کیا ہے؟"

میں جو اتنی دیر سے چپ چاپ اس کی باتیں سُن رہا تھا، بول پڑا: "تم جانتی ہو لالہ کہ میں بعض ایسی خوبیوں کا مالک ہوں جو عام مردوں میں نہیں پائی جاتیں۔ بس یہی سب کچھ میرا دشمن ہو گیا ہے۔"

لالہ نے اپنا ہاتھ میرے ہونٹوں پر رکھ دیا اور بولی: "مجھے بہلاوے مت دو، سرفروش! میں اس کام کے بارے میں جاننا چاہتی ہوں جو تم حقیقت میں کرتے ہو۔ دکھاوے کا نہیں، اصلی کام... تم نے اپنے آپ کو جس ادارے سے وابستہ ظاہر کیا ہے۔ وہ ایک پردہ اور ایک آڑ ہے۔ میں نے اس سلسلے میں کافی چھان بین کی ہے لیکن کچھ معلوم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی... آخر کیوں؟"

میں نے لالہ کی کسی بات کا جواب نہیں دیا۔ اس لیے کہ کوئی جواب دے ہی نہیں سکتا تھا۔ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر پھر آنکھیں موند لیں اور کروٹ بدل لی۔ دوسرے لمحے مجھے ایک گداز بوجھ محسوس ہوا اور لالہ کی میٹھی سرگوشی سنائی دی: "سُرنی... اگر تم کوئی سیکرٹ ایجنٹ ہو، انتہائی خفیہ اور خطرناک کام سرانجام دیتے ہو تو مجھ سے کیوں چھپاتے ہو؟ میں تم سے جُدا تو نہیں، تمھارا ہی حصہ ہوں اور تمھارے بچوں کی ماں بننا چاہتی ہوں۔ مجھے اشاروں ہی میں بتا دو۔"

"میں نہیں بتا سکتا لالہ! کچھ بھی نہیں بتا سکتا۔"

"اچھا میرے سوالوں کا ہاں یا نہیں میں جواب دیتے جاؤ۔"

"میرے لیے یہ بھی ممکن نہیں، جاناں!"

وہ خاموش ہو گئی تو میں نے بھی خاموشی ہی میں عافیت سمجھی۔ میں ابھی تک نرم نرم بوجھ تلے دبا ہوا تھا اور دبا ہی رہنا چاہتا تھا کہ دُور کہیں پپیہا بول اُٹھا۔ خاموشی ٹوٹی تو لالہ بولی: "اچھا سرنی! میں تمھیں مجبور نہیں کرتی۔ مجھ سے شادی کر لو۔ آج، ابھی اسی وقت اور میں وعدہ کرتی ہوں کہ تمھارے لیے کبھی سدِ راہ نہیں بنوں گی۔ بولو منظور؟"

لالہ سے شادی میری آرزو تھی۔ میں نے اس کے ساتھ ایک گھر کے اور ننھے منّے کلکاریاں مارتے ہوئے بچوں کے خواب دیکھے تھے لیکن اب یہ سب کچھ ممکن نہیں رہ گیا تھا۔ میری زندگی جس راہ پر چل رہی تھی، وہ موت کا راستہ تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ آنسو بھری آنکھوں سے میرا انتظار کرے اور یہ آنسو اس کا مقدر ہی بن جائیں۔ میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور جواب دیا: "میں شادی نہیں کر سکتا۔"

"تم شادی کر نہیں سکتے یا کرنا نہیں چاہتے؟" وہ چیخ پڑی۔

اس سے پہلے کہ میں لالہ کو کوئی جواب دیتا، فون کی گھنٹی چیخنے لگی۔ لالہ نے اُٹھتے ہوئے کہا: "میں کسی فون کال کی متوقع نہیں۔ یہ کال میری نہیں ہو سکتی۔"

"مجھے اس کی توقع تھی۔" میں نے جواب دیا اور اس کا ہاتھ تھام کر ہٹ کی طرف دوڑنے لگا۔ جہاں فون کی گھنٹی مسلسل چیخے جا رہی تھی۔ میں نے لپک کر ریسیور اٹھایا اور ماؤتھ پیس پر بولا: "ہیلو..."

"ہیلو برخوردار!" ڈاکٹر فریدوں کی آواز سنائی دی۔ "معاف... ٹھیک ٹھاک ہیں نا؟"

"شاید اب سُدھر جائیں!" میں نے لالہ کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا جو پلنگ پر بیٹھی، ٹھوڑی کو ہتھیلیوں کے پیالے رکھے مونالیزا کی طرح مسکراتے ہوئے میری جانب دیکھ رہی تھی۔

"میرا خیال ہے، میں نے دخل در معقولات نہیں کی ہو..." ڈاکٹر کے لہجے میں شرارت تھی۔

"اگر باہمی جھگڑے کو آپ معقولات کہتے ہیں تو آپ یقیناً دخل دیا ہے۔" میں نے جواب دیا۔ اب بھی میری آنکھیں لالہ کو اور اس کی آنکھیں مجھے دیکھے جا رہی تھیں۔

"تیاریاں مکمل ہو گئی ہیں۔ تمھیں علی الصباح واپس آنا ہے۔"

"بہتر جناب! پہنچ جاؤں گا۔" میں نے جواب دیا اور ریسیور رکھتے ہوئے لالہ سے نگاہیں چرا لیں۔ میں اس کے چہرے پر اُداسی اُترتے نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ اب اس کی آنکھیں مجھ سے نہیں ہٹیں گی۔

"کہیں جا رہے ہو، جاناں؟"

میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر اثبات میں سر ہلا دیا۔

"مجھے کب تک انتظار میں سلگنا ہوگا؟" اس نے پھر سوال کیا۔

"میں نہیں جانتا لالہ... میرے پاس یہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ بھی نہیں ہے۔" میں نے الماری سے کپڑے نکال کر چھوٹے سوٹ کیس میں رکھنے شروع کر دیے۔

میں اُسے کیسے بتا سکتا تھا، وہ آگے بڑھ کر اُنھیں للکارتے ... سکوں۔ اگر میں اُسے بتا دیتا کہ تم... میں نے سوچا کہ فریقِ مخالف جیسا جا رہا ہے اور میری واپسی کے لمحے پر اپنے حصار سے نکل آئے ہو جاتی یا پھر مجھے دیوانہ سمجھتی۔ تاہم انتہا نہ رہی کہ فصیل کا بڑا پھاٹک کہا۔ "کچھ کام ایسے بھی ہوتے ہیں لالہ... زیادہ جنگجو نکلے اور حملہ آوروں کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔" ... شن نعرے لگائے اور اُن

"سرنی! میری طرف دیکھو۔" اس نے ... کشتوں کے پشتے ... میں نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے بازو دلیے آگے ... میں آنسو لیے کھڑی تھی اور اس کے لب کپکپا رہے تھے۔ میں دیوانہ وار اس کی طرف لپکا۔ اگر اس وقت وہاں کوئی دیکھنے والا ہوتا تو وہ اس ملاپ کو غیر متکلم فلموں کا کوئی ایسا منظر سمجھتا جس میں کچھ کہے بغیر ہی سب کچھ کہہ دیا جاتا تھا۔

● پو پھٹے میری کار اُسی قلعہ نما عمارت کے دروازے پر پہنچی تو باہر ہی میں نے ڈاکٹر فریدوں کو اپنا منتظر پایا۔ اس نے یخ بستہ ہوا سے بچاؤ کے لیے چمڑے کا اوور کوٹ پہن رکھا تھا اور سگار کی بجائے پائپ پی رہا تھا۔ آج وہ عمر سے کہیں زیادہ بوڑھا دکھائی دیتا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا: "اس کام سے نجات کا بھی کوئی طریقہ ہے، جناب؟"

"ہاں... ایک ہی طریقہ ہے... اور وہ ہے، موت!" اس نے تھکے تھکے لہجے میں جواب دیا۔

میں خاموش ہو گیا۔ وہ غالباً رات بھر کام کرتا رہا تھا اس لیے بے حد تھکا تھکا سا لگ رہا تھا۔ تھکن تو مجھے بھی ہو رہی تھی لیکن میرے کام کی نوعیت ڈاکٹر سے مختلف تھی۔ تجربہ گاہ پہنچ کر میں اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ بوڑھا، کبڑا اور لنگڑا سائنسداں آج ایک مخصوص سفید لباس پہنے ہوئے تھا۔ وہ مختلف کمروں سے گزرتے ہوئے ان چھوٹے چھوٹے کمپیوٹرز کی کارکردگی کا جائزہ بھی لیتا جا رہا تھا جن سے مختلف اقسام کی آوازیں آ رہی تھیں جیسی کمپیوٹر کے اسپیکر سے وِن، ہو... وِن، ہو... وِن ہو اور کسی سے پی، ہاپ، پی، ہاپ کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔

بالآخر ہم ایک چھوٹے سے کمرے میں داخل ہوئے جہاں کمپیوٹر ... میرا منتظر تھا۔ میں پہلے سفر کے بعد آج دوسری بار اس کمرے میں آیا تھا۔ مجھے اس کمرے میں کوئی تبدیلی دکھائی نہیں دی۔ وہی مشین تھی اور مختلف رنگوں کی وہی اَن گنت تاریں تھیں جو کسی سوراخ سے مشین کے اندر جا رہی تھیں اور کسی سوراخ سے باہر آ رہی تھیں۔ بیسیوں چھوٹے چھوٹے بلب جل بجھ رہے تھے اور اس گورکھ دھندے کے بیچوں بیچ فرش کے ایک مربع نما ٹکڑے پر ربر کی

دیکھا جن میں سے کچھ کرچیاں میری کمین گاہ کے قریب آگری تھیں۔ میں نے ایک بار پھر فصیل اور میدانِ جنگ پر نظر ڈالی۔ فصیل پر دھوئیں کے بادل چھائے ہوئے تھے اور حملہ آوروں میں بھگدڑ مچ گئی تھی۔ وہ چیختے چلاتے پیچھے بھاگ رہے تھے۔

گولے کی وہ کرچیاں جو میری کمین گاہ سے کچھ فاصلے پر گری تھیں، اب تک چمک رہی تھیں اور اُن کی یہ چمک بڑی دل آویز تھی۔ میں جذبۂ تجسس کے تحت اپنی پناہ گاہ چھوڑنے اور اُن کی طرف بڑھنے پر مجبور ہو گیا اور جب میں نے ایک کرچی اُٹھا کر دیکھی تو حیرت سے میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ یہ نہایت عمدہ قسم کے ملتے اُس ٹکڑا تھا۔ مجھے اس کی پہچان اس لیے تھی کہ میرے والد میں کئی بنیادی تبدیلی کا جنون تھا مگر میں نے اُن کے ذخیرے میں پُشت تھا جبکہ یہ کم از کم نہیں دیکھا تھا۔ وہ اتنا شفاف تھا کہ اس میں جواباً خاموش ... صاف دکھائی دے رہی تھی۔ میرے لیے کرنا میرے لیے ممکن بھی نہیں تھا۔ ... اُن لوگوں نے اتنا قیمتی پتھر گولے

تھوڑی دیر بعد مجھے شیشے کے ٹوٹے ٹکڑے دیکھ ہی رہا تھا کہ اچانک اور بوڑھا سائنسداں میرے جسم پر ٹیپ کی مدد سے، کا وہ ٹکڑا وہیں پھینک کرنے لگا۔ یہ الیکٹروڈ سیاہ سانپ کے پھن سے مشابہ دکھائی دیتے تھے۔ اس نے یہ کام مکمل کرنے کے بعد اپنی زردی مائل بھوری سے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا: "آج تم پچھلی مرتبہ سے کہیں زیادہ گھبرائے ہوئے دکھائی دے رہے ہو، سرفروش۔ کیا تمھیں ڈر لگ رہا ہے؟"

مجھے جھوٹ بولنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی اس لیے میں نے کہا: "آپ کا خیال ٹھیک ہے، جناب۔ پہلے سفر میں کمپیوٹر نے کچھ گڑبڑ کر دی تھی اور سب کچھ اتنی تیزی سے عمل میں آ گیا تھا کہ مجھے گھبرانے کا وقت ہی نہیں ملا تھا اور یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ مجھے کہاں منتقل کیا جا رہا ہے۔"

اس نے میرے شانے تھپ تھپاتے ہوئے جواب دیا: "اب بھی تم نہیں جانتے کہ اس بار تمھیں کہاں بھیجا جا رہا ہے لیکن تمھیں گھبرانے یا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس مرتبہ ہر چیز اور ہر عمل کی پہلے سے آزمائش کر لی گئی ہے اور کسی غلطی یا حادثے کا امکان باقی نہیں رہا۔ وقت آنے پر میں تمھیں خود ہی واپس بلاؤں گا۔"

"میں تیار ہوں، جناب!" میں نے کہا: "آپ اپنا کام کیجیے۔"

ڈاکٹر فریدوں نے کمرے سے نکل کر دروازہ بند کیا اور ایک سوئچ پر انگلی رکھ دی۔ پچھلی مرتبہ مجھے اس مرحلے سے گزرتے ہوئے شدید تکلیف ہوئی تھی اور میں درد کی شدت سے بلبلا اُٹھا تھا۔ یوں

ہو اور میں تمھیں تمھاری طلب سے کہیں زیادہ محبت دے چکی ہوں۔ میں شعوری طور پر ایسا نہیں کرتی۔ میرا دل اپنے آپ ہی تم پر دیوانہ وار نچھاور ہونے لگتا ہے . . . لیکن میں جانتی ہوں کہ ہمیشہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں عورت ہوں۔ میں شادی کرنا چاہتی ہوں۔ بچوں کی ماں بننا چاہتی ہوں اور ایسے شوہر کی آرزو مند ہوں جسے میں روز دیکھ سکوں جس کی ہر شب میری ہو لیکن تم نے مجھے اتنا بھی نہیں بتایا کہ کلب بند کرنے کے بعد اب تمھارا وسیلۂ رزق کیا ہے ؟"

میں جو اتنی دیر سے چپ چاپ اس کی باتیں سُنتا رہا تھا، بول پڑا "تم جانتی ہو لالہ کہ میں بعض ایسی خوبیوں کا مالک ہوں جو عام مردوں میں نہیں پائی جاتیں۔ بس یہی سب کچھ میرا ذریعۂ معاش ہے . . .
سے الگ ہو گیا ہے اور گیا ہے !"

لالہ نے اپنا ہاتھ میرے ہونٹوں پر رکھ دیا۔ پھر مجھے اپنے سینے سے بہلاوے مت دو، سرفروش ! میں اُس رنگ، میری انتڑیاں نیلے اور گلابی ہوں۔ جو تم حقیقت میں کہتے ہو ہی ہو گئیں۔ مجھے خود اپنا ہی ایک تم نے اپنے آپ کو جس انداز میں دکھائی دیا جس نے برق رفتاری سے میرے اور ایک آرٹ ہے۔ میں درد کی شدت سے بلبلا اُٹھا۔ شاید میری لیکن کچھ معلوم ... پاش ہو گئی تھی۔

★★

جواب میں نے اپنے آپ کو اوندھے منہ ایک چٹان پر لیٹے ہوئے پھر اس میں دھوپ کی تمازت باقی تھی حالانکہ اردگرد پڑے پتھروں کے سائے بہت طویل ہو گئے تھے جن سے پتہ چلتا تھا کہ سورج غروب ہونے والا ہے۔ میں کسی نونائیدہ بچے کی حالت میں ساکت پڑا تھا اور مارے خوف کے سانس بھی آہستہ آہستہ لے رہا تھا۔ کمپیوٹر نے دوبارہ مجھے جہانِ قدیم میں بھیج دیا تھا اور یہ سرزمین پُرخطر بھی ثابت ہو سکتی تھی۔ مجھے بے حد احتیاط سے کام لینا تھا اور میرے لیے کسی غلطی کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

میں نے سر اُٹھائے یا اِدھر اُدھر گھمائے بغیر ہی ماحول کا جائزہ لینا شروع کیا اور دیکھا کہ یہ ایک پیالہ نما سطحِ مرتفع ہے۔ میرے گرد و پیش بڑے بڑے پتھر اور چھوٹی چھوٹی چٹانیں سر اُٹھائے کھڑی ہیں۔ میں جس چٹان پر لیٹا ہوا تھا، وہ خاک آلود تھی۔ میں نے تھوڑی سی خاک سمیٹی اور اُسے آنکھوں کے قریب لا کر دیکھا۔ یہ بہت باریک اور قدرے سیاہی مائل تھی۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ہوا اس پیالہ نما سطحِ مرتفع پر بگولے کی طرح گھوم رہی ہو۔ ایسا لگتا تھا کہ ہوا کسی درّے سے داخل ہوتی ہے اور اردگرد کی چٹانوں سے ٹکرا کر گھومتی ہوئی اوپر چلی جاتی ہے۔ ہوا

گھر کے اور ننھے منّے کلکاریاں ... میری آنکھوں میں پڑ رہی تھی۔ اُس دیکھے تھے لیکن اب یہ سب کچھ ... گیا۔ پہلے چند لمحوں تک مجھے کچھ سُنائی جس راہ پر چل رہی تھی، وہ موت ... پر آنے والی آوازیں بھی میری ... کہ وہ آنسو بھری آنکھوں سے ... ہی عجیب آوازیں تھیں۔ ان میں ... کا مقدر ہی بن جائیں۔ ... بھی شامل تھے۔ میں نے ایک کان چٹان جواب دیا "میں شادی ... گھوڑوں کے ٹاپوں کی آوازیں بھی سُنا "تم شادی کی ... مجھے یہ اندازہ ہو گیا کہ ان آوازوں کا باعث ... میدانِ کارزار ہے جہاں آدمی، آدمی کا خون بہا رہے ہیں، ... تے ہیں اور طبلِ جنگ اُنھیں ایسا کرنے پر اُکسا رہا ہے . . . پھر ایک زبردست دھماکا سُنائی دیا۔ ایسی آواز میں نے زندگی میں پہلی بار سُنی تھی۔ اب میرے لیے یہ معلوم کرنا ناگزیر ہو گیا تھا کہ یہ آوازیں کہاں سے آ رہی ہیں، متحارب کون ہیں، میدانِ کارزار کہاں اور مجھ سے کتنی دور ہے۔ چنانچہ میں نے ہوا کی مخالف سمت میں رینگنا شروع کر دیا تاکہ آوازوں سے فاصلے اور سمت کا تعین کر سکوں۔

رینگتے رینگتے میں ایک بہت بڑے، چٹان نما پتھر پر چڑھ گیا اور جس سمت سے آوازیں آ رہی تھیں، اُدھر دیکھنے لگا۔

میرے سامنے ایک بہت بڑا میدان تھا جہاں جنگ لڑی جا رہی تھی۔ وہ مقام جہاں میں یہ نظارا کر رہا تھا، میدانِ جنگ سے تقریباً ایک کوس عقب میں واقع تھا اور یہ سطحِ مرتفع تقریباً دو سو ہاتھ بلند تھی۔ فاصلے اور بلندی کا تعین کرنے کے بعد میں نے ایک بار پھر میدانِ کارزار کی طرف دیکھا تو حیرت سے دیکھتا ہی رہ گیا۔ میری حیرت کا باعث متحارب فریق نہیں بلکہ وہ بلند و بالا فصیل تھی جس کے سائے میں یہ جنگ لڑی جا رہی تھی۔ زرد سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی یہ فصیل اُفق کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلی نظر آتی تھی۔ اس کی بلندی تقریباً پچاس فٹ اور چوڑائی اتنی تھی کہ بیک وقت چار گھڑ سوار اس پر اپنے گھوڑے سرپٹ دوڑا سکتے تھے۔

فصیل کا وہ حصہ جو مجھ سے قریب تر تھا، حملہ آوروں کی خصوصی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ گھڑ سواروں کے دستے نعرے لگاتے اور چلّاتے ہوئے آگے بڑھتے تھے اور پیچھے ہٹ جاتے تھے۔ یہ لوگ عجیب قسم کی چھوٹی چھوٹی کمانوں سے آتش گیر تیر برسا رہے تھے۔ میری سمجھ میں نہ آ سکا کہ یہ تیر اس کوہ پیکر سنگی دیوار کا کیا بگاڑ سکتے ہیں۔ یہ تو ایسا ہی تھا جیسے میرے دور کی ائرگن سے ہاتھی شکار کرنے کی کوشش کی جائے۔

چند لمحوں کے بعد میں نے محسوس کیا کہ حملہ آور اپنے حریفوں کو

تاؤ دلانے کے لیے یہ حرکت کر رہے ہیں، وہ آگے بڑھ کر اُنھیں للکارتے، آوازے کستے اور پیچھے ہٹ جاتے۔ میں نے سوچا کہ فریقِ مخالف اتنا احمق نہیں ہے کہ اُن کے تاؤ دلانے پر اپنے حصار سے نکل آئے گا لیکن یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ فصیل کا بڑا پھاٹک کھلا، اس میں سے بے شمار گھڑ سوار اور پیادہ جنگجو نکلے اور حملہ آوروں پر ٹوٹ پڑے۔ اِدھر حملہ آوروں نے بھی پُرجوش نعرے لگائے اور اُن سے ٹکرا گئے۔ گھمسان کا رن پڑا اور دیکھتے ہی دیکھتے کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ حملہ آوروں کا ایک دستہ لمبی لمبی سیڑھیاں لے کر آگے بڑھا۔ اس کے ساتھ ساتھ تیر انداز بھی تھے جو دیوار کے اُوپر سے دفاع کرنے والے عسکریوں پر آتش گیر تیر پھینک رہے تھے لیکن انھوں نے بھی تیروں اور برچھوں سے اُن کا استقبال کیا۔ جہاں جہاں . . . سیڑھیاں لگائی گئی تھیں، وہاں وہاں، اُوپر سے گرم تیل کے کڑھاؤ انڈیلے اور پتھر برسائے جانے لگے۔ ہر طرف سے آہ و بکا کی صدائیں آنے لگیں۔ حملہ آور دفاعی کارروائی سے گھبرا اُٹھے اور پسپا ہونے لگے۔ فصیل سے باہر آنے والے بھی پیچھے ہٹے۔ دروازہ ایک بار پھر کھلا اور وہ لڑتے ہوئے اندر چلے گئے۔

دروازہ دوبارہ بند ہو گیا۔

میری نگاہ ایک عجیب و غریب توپ پر جا پڑی جسے فصیل کی اُس جانب ان گنت آدمی کھینچ کر آگے بڑھا رہے تھے۔ اس توپ کی نال بے حد لمبی اور نال کا گھیر کافی کشادہ تھا مگر یہ دیکھ کر مجھے بے حد تعجب ہوا کہ انھوں نے توپ کو بڑے غلط زاویے پر رکھا ہے۔ اس کی نال کا رُخ نہ تو حملہ آوروں کے خیموں کی جانب تھا اور نہ ہی وہ فصیل کے باہر اُن کو نشانہ بنا سکتی تھی۔ میں حملہ آوروں کے خیمے دیکھ چکا تھا۔ وہ سطحِ مرتفع کے دائیں جانب لگے ہوئے تھے جبکہ نال کا رُخ اُن سے ہٹ کر دوسری طرف واقع پہاڑیوں کی جانب تھا۔ پہلے تو میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ توپ سے کیا کام لینا چاہتے ہیں مگر جب وہ اُسے داغنے کی تیاری کرنے لگے تو میں اُن کا مطلب سمجھ گیا . . . وہ اس کے دھماکے اور دھوئیں سے غنیم کو خوفزدہ کرنا چاہتے تھے۔

چند لمحے بعد توپ نے شعلہ اُگلا۔ اس کے ساتھ ہی بڑے زور کا دھماکا ہوا اور ایک چمک دار گولہ اُڑتا ہوا اُن چٹانوں سے جا ٹکرایا جو حملہ آوروں کے خیموں کے دوسری جانب واقع تھیں۔ میری چھٹی حس نے مجھے پہلے ہی خبردار کر دیا تھا۔ اس لیے میں دھماکے کے ساتھ ہی دُبک گیا تھا۔ تاہم میری رفتار توپ کے گولے سے زیادہ تیز نہیں تھی اس لیے میں نے گولے کو ٹکراتے اور کرچیوں میں تبدیل ہوتے

دیکھا جن میں سے کچھ کرچیاں میری کمین گاہ کے قریب آ گری تھیں۔ میں نے ایک بار پھر فصیل اور میدانِ جنگ پر نظر ڈالی۔ فصیل پر دھوئیں کے بادل چھائے ہوئے تھے اور حملہ آوروں میں بھگدڑ مچ گئی تھی۔ وہ چیختے چلّاتے پیچھے بھاگ رہے تھے۔

گولے کی وہ کرچیاں جو میری کمین گاہ سے کچھ فاصلے پر گری تھیں، اب تک چمک رہی تھیں اور اُن کی یہ چمک بڑی دل آویز تھی۔ میں جذبۂ تجسس کے تحت اپنی پناہ گاہ چھوڑنے اور اُن کی طرف بڑھنے پر مجبور ہو گیا اور جب میں نے ایک کرچی اُٹھا کر دیکھی تو حیرت سے میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ یہ نہایت عمدہ قسم کے نیلم کا ٹکڑا تھا۔ مجھے اس کی پہچان اس لیے تھی کہ میرے والد کو قیمتی پتھر جمع کرنے کا جنون تھا مگر میں نے اُن کے ذخیرے میں بھی اتنا اعلا قسم کا نیلم نہیں دیکھا تھا۔ وہ اتنا شفاف تھا کہ اُس کے نیچے سے مجھے اپنی ہتھیلی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ میرے لیے یہ بات بھی بڑی حیرت انگیز تھی کہ اُن لوگوں نے اتنا قیمتی پتھر گولے کے طور پر استعمال کیا تھا۔ ابھی میں وہ ٹکڑا دیکھ ہی رہا تھا کہ اچانک اندھیرا چھانے کا احساس ہونے لگا۔ میں نے نیلم کا وہ ٹکڑا وہیں پھینک دیا۔ جب یہ لوگ اُسے توپ کے گولے کے طور پر استعمال کرتے ہیں تو یہاں اس پتھر کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہو سکتی تھی۔

شام گہری ہو گئی تو جنگ بند ہو گئی۔ میں تذبذب میں تھا کہ اب کیا کروں، رات یہیں بسر کروں یا کہیں جاؤں ؟ جب چاندنی پھیل گئی تو میں نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ سامنے حملہ آوروں کی خیمہ گاہ کے پس منظر میں چاند طلوع ہو رہا تھا۔ اس دوران خیمہ گاہ میں سینکڑوں مشعلیں جل اُٹھی تھیں۔ کہیں کہیں الاؤ بھی روشن تھے اور چند خیموں سے گانے کی ہلکی ہلکی آواز بھی اُبھر رہی تھی۔

میں نے ایک نظر فصیل کی طرف ڈالی۔ وہاں بھی لوگ مشعلیں اُٹھائے اِدھر اُدھر آ جا رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ اب تک جو کچھ بھی دیکھا ہے، اُسے یاد رکھنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ڈاکٹر فریدل جب چاہے گا، اُنھیں میرے ذہن کے نہاں خانوں سے برآمد کر لے گا بشرطیکہ اس نے چاہا . . . اور مجھے واپس بُلا لیا تو . . . ورنہ مجھے اب اسی سرزمین پر اپنی بقا کی جدوجہد جاری رکھنا تھی جہاں پہلے سے دو لشکر برسرِ پیکار تھے اور کسی وقت میں کسی بھی فریق کے ہاتھوں مارا جا سکتا تھا۔

میں آہستہ آہستہ اور بڑی احتیاط کے ساتھ اس کٹورا نما سطحِ مرتفع سے نیچے آیا اور غیر ارادی طور پر میرے قدم فصیل کی جانب اُٹھنے لگے۔ میری چھٹی حس مجھے بتا رہی تھی کہ اگر میں شہر پناہ کی اس

جانب پہنچ گیا تو بچ جاؤں گا ورنہ موت مجھے دبوچ لے گی اور ڈاکٹر فریڈوں کے سارے ہی خواب ادھورے رہ جائیں گے۔

جب میں اس کوہ پیکر فصیل کے قریب پہنچا تو دیکھا کہ میدان لاشوں سے اٹا ہوا ہے۔ کہیں مرنے والوں کے انبار سے لگے ہیں اور کہیں لاشیں ادھر اُدھر بکھری پڑی ہیں۔ اُن کے درمیان بہت سے گھوڑے بھی لقمۂ اجل بن چکے تھے۔ میرے لیے سب سے زیادہ تعجب خیز بات یہ تھی کہ وہاں میں نے کسی زخمی کو کراہتے یا دم توڑتے نہیں پایا۔ جنگ میں بہت سے سپاہی زخمی تو ہو جاتے ہیں لیکن مرتے نہیں۔ زخمیوں کی عدم موجودگی کی وجہ غالباً یہ تھی کہ دونوں فریقوں نے ایک دُوسرے کے زخمیوں کو تہ تیغ کر دیا تھا . . . یا پھر ممکن ہے وہ اپنے اپنے زخمی اُٹھا کر لے گئے ہوں۔

میں کسی ایسی لاش کی تلاش میں تھا جس کے لباس سے اپنی ستر پوشی کر سکوں۔ اس لیے میں چوپایوں کی طرح اُن کے درمیان گھومنے لگا۔ مشکل یہ تھی کہ آسمان ابر آلود تھا اور چھوٹی چھوٹی بدلیاں چاند کو اوجھل کر دیتی تھیں۔ میں اندھیرے میں کئی ایسی لاشوں سے بھی ٹکرایا جن سے بدبو اٹھنا شروع ہو گئی تھی۔ اچانک مجھے کھڑ بڑ اور چپڑ چپڑ کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ میں اپنی جگہ ساکت اور ہمہ تن گوش ہو گیا۔ دُوسرے ہی لمحے غرانے اور خوخیانے کی آوازوں نے مجھے بتا دیا کہ گیدڑ اور بگڑ بھگے لاشوں پر ضیافت اڑانے پہنچ گئے ہیں۔ جب چاند بدلی سے باہر آیا تو میں نے دیکھا کہ لاشیں نوچنے والے گیدڑوں اور بگڑ بھگوں نے میری آمد کو دخل در معقولات سمجھا تھا اس لیے دیکھتے انگاروں کی طرح سُرخ آنکھوں سے دیکھ کر غرا اور خوخیا رہے تھے مگر انھوں نے مجھ پر حملہ کرنے کی بجائے مُردوں کی بوٹیاں نوچنا زیادہ بہتر سمجھا اور لاشیں اُدھیڑنے میں لگے رہے۔ تاہم میں اپنی جگہ بُری طرح خوف زدہ ہو گیا تھا اس لیے جلدی جلدی اپنے قد و قامت کی لاشیں تلاش کرنے لگا۔ لاشوں کا جائزہ لیتے ہوئے مجھے پتہ چلا کہ حملہ آور اور شہر پناہ کے اندر رہنے والے دو مختلف نسلوں کے افراد ہیں۔ اُن کے خد و خال، رنگ، قد و قامت اور لباس ایک دُوسرے سے یکسر مختلف تھے۔ شہر پناہ کے اندر رہنے والے اپنے غنیم سے زیادہ قد آور تھے اور اُن کی رنگت زردی مائل تھی۔ یہ لوگ کانسی کے ہتھیار استعمال کرتے تھے لیکن جب میں نے ایک تلوار اٹھائی تو وہ بہت ہلکی پھلکی نکلی۔ میں نے غور سے دیکھا تو پتہ چلا کہ وہ لکڑی کی بنی ہوئی ہے اور اس پر کانسی جیسا روغن کر دیا گیا ہے۔ تاہم وہ بہت مضبوط اور تلوار کی طرح دھار دار تھی۔

حملہ آوروں کے بال سیاہ اور قد نسبتاً چھوٹے تھے۔ اُن کے لباس چرمی تھے۔ وہ چمڑے کی مخروطی ٹوپی اور گھٹنوں تک لمبے بوٹ پہنتے تھے۔ اُن کی خمیدہ ٹانگوں سے پتہ چلتا تھا کہ وہ شہسوار ہیں اور اُن کا زیادہ تر وقت گھوڑوں کی پیٹھ پر گزرتا ہے۔ میں لاشوں کا جائزہ لینے میں مصروف تھا کہ اتنے میں ایک بگڑ بھگا، جو اپنے ساتھیوں کے مقابلے میں کہیں بڑا اور خونخوار تھا، مجھ پر غرانے لگا۔ میں نے اُسے ڈرانے کے لیے وہی چوبی تلوار لہرائی تو وہ ہچکچا کر پیچھے ہٹنے لگا لیکن اس خیال سے کہ کہیں وہ اچھل کر مجھ پر حملہ نہ کر دے، میں اس کی طرف دیکھتا اور ہوا میں تلوار چلاتا رہا۔ اچانک مجھے اُس کے پیچھے کوئی سُنہری سی چیز چمکتی نظر آئی۔ میں اُسے ڈراتا اور دھمکاتا ہوا آگے بڑھا تو وہ بھاگ گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اُس چمک دار چیز کو دیکھا تو پتہ چلا کہ وہ ایک لاش کی زرہ بکتر پر بنا ہوا ہلال نما طلائی نشان ہے۔ یہ لاش شہر پناہ کے اندر سے آنے والے کسی عہدے دار کی تھی کیونکہ اُس کے کاندھوں پر سُنہری جھالر لگی ہوئی تھی اور گلے میں سونے کی ایک ایسی زنجیر پڑی تھی جسے تاروں سے گوندھ کر بنایا گیا تھا۔ یہ خوبصورت صناعی کا شاہکار تھی۔ اس لشکری کی خود پر بھی سُنہری کلغی لگی ہوئی تھی اور یہ ساری چیزیں اس بات کی مظہر تھیں کہ وہ کوئی بہت بڑا عہدے دار تھا۔ اتفاق سے یہ لاش قد و قامت میں میرے برابر ہی نکلی۔ میں نے بلا تاخیر اُس کی زرہ بکتر، خود، گلے کی طلائی زنجیر اور خون آلود لباس اُتار لیا کہ اب اُس سے زیادہ ان کی مجھے ضرورت تھی۔ میں نے جلدی جلدی وہ لباس پہنا مگر مرنے والے کا سینہ میرے سینے جتنا چوڑا نہیں تھا۔ اس لیے میرا سینہ کچھ ننگا رہ گیا تاہم سینہ بند اور زرہ بکتر نے یہ برہنگی بھی ڈھانپ لی۔ خدا کا شکر ہے کہ اُس کی خود مجھے ٹھیک آ گئی جس کے ساتھ کانوں، آنکھوں اور ناک کو چوٹوں سے محفوظ رکھنے کے لیے پٹیاں لگی ہوئی تھیں۔ ان کا ایک بڑا فائدہ اُس وقت مجھے یوں ہوا کہ میرا چہرہ کافی حد تک ڈھک گیا۔ چہرے کی باقی ماندہ شناخت کو مبہم بنانے کے لیے میں نے اُسی لاش کا تھوڑا سا خون اپنی ٹھوڑی پر مل لیا ہر چند کہ یہ ایک کراہت آمیز عمل تھا لیکن میں ایسا کرنے پر مجبور تھا۔

اس کام سے بعجلت فارغ ہونے کے بعد میں نے مرنے والے کی تلوار ڈھونڈنے کے لیے ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی تو یہ دیکھ کر دم بخود رہ گیا کہ فصیل کی طرف سے کچھ لوگ مشعلیں اُٹھائے اس طرف آ رہے ہیں۔ میں نے اپنے آپ پر لعنت بھیجی کہ لباس اور زرہ بکتر پہنتے وقت احتیاط کیوں نہ برتی۔ شاید اسی بے پروائی کے باعث میں اُن لوگوں کی نگاہوں میں آ گیا تھا۔ مجھے اس وقت یہی ایک ترکیب سُوجھی کہ لاشوں کے درمیان لیٹ کر خود کو ایک لاش

ظاہر کروں تو شاید وہ مجھے نظر انداز کرتے ہُوئے لوٹ جائیں۔ چنانچہ مَیں نے اس ترکیب پر عمل کیا اور لاشوں کے درمیان لیٹ گیا۔

چند لمحے بعد وہ لوگ اتنے قریب آ گئے کہ مجھے اُن کی باتوں کی آوازیں سُنائی دینے لگیں۔ اس سرزمین پر آنے کے بعد یہ پہلی واضح آوازیں تھیں جو میری سماعت سے ٹکرائی تھیں ورنہ ان سے پہلے تو صرف چیخ و پکار، دھماکوں اور جانوروں کے غرّانے کی آوازیں ہی سُنائی دی تھیں۔ مَیں نے آنے والوں کی آواز پر کان لگا دیے۔ ان میں سے کسی نے تحکم آمیز لہجے میں کہا۔

"اِدھر تلاش کرو جہاں آسوریوں کی لاشوں کا ڈھیر لگا ہُوا ہے اور سُنو احمقو۔ اُسے چہرے سے پہچاننے کی کوشش میں وقت ضائع نہ کرنا۔ خود اور زرہ بکتر سے پہچاننے کی کوشش کرنا۔ تمھیں تو معلوم ہے کہ بادشاہ کی زرہ بکتر پر سنہرا نشان اور خود پر سُنہری کلغی ہے۔"

یہ سُن کر مجھے جُھرجُھری سی آ گئی کیونکہ یہ زرہ بکتر اور خود تو مَیں پہنے ہُوئے تھا۔ مَیں نے ایک بار پھر اپنے آپ کو کوسا کہ یہ لباس اور زرہ بکتر کیوں پہنی تھی۔ اگر کسی عام سپاہی کا لباس اور زرہ بکتر پہنتا تو وہ میری طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھتے... مگر اُس وقت مَیں بھی مجبُور تھا کہ مجھے اپنے قد و قامت کی کوئی لاش نہیں مِل سکی تھی... پھر اچانک مجھے خیال آیا کہ یہ تو بہت اچھا ہُوا... اس طرح وہ خود ہی مجھے شہر پناہ کے اندر لے جائیں گے۔ اس کے بعد جو ہونا ہے، ہوتا رہے۔ مَیں دُعا مانگنے لگا کہ وہ جلدی سے میری یعنی بادشاہ کی لاش تلاش کر لیں تو اس خاک و خون اور تعفن سے نجات مِلے جس سے مجھے متلی ہونے لگی تھی۔ اتنے میں ایک آدمی کی آواز آئی۔ "میرا خیال ہے، اس وقت ہم بادشاہ سلامت کی لاش نہیں ڈھونڈ سکیں گے۔"

"کیوں؟" کسی نے سوال کیا۔

"ہمیں یہ معلوم ہی نہیں کہ بادشاہ سلامت کہاں ڈھیر ہوئے تھے۔ دُوسرے اگر آسوریوں نے ہماری مشعلیں دیکھ لیں تو وہ ہمیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

"یہ بکواس رہنے دو اور وہی کرو جو تم سے کہا گیا ہے۔" یہ اُن کے سردار کی آواز تھی۔ "اگر تم لوگوں نے حکم عدُولی کی تو کل صبح گرفتار شدہ آسوریوں کے ساتھ تمھاری بھی گردن ماری جائے گی۔"

اب تیسرے آدمی کی آواز آئی۔ "آخر ملکہ ہوشی اپنے شوہر کی لاش کے لیے اتنی مُصر اور مضطرب کیوں ہے؟"

"شاید وہ پُوری تعظیم و تکریم کے ساتھ اس کی تدفین کرنا چاہتی ہے۔ چلو آگے بڑھو، بُزدلو۔"

"ہم بُزدل نہیں ہیں۔" چوتھے آدمی نے کہا۔ "اور آسوریوں سے ڈرنے کی بھی کوئی وجہ نہیں کیونکہ وہ خود بھی رات کو لاشوں کے قریب نہیں آتے، اُن کی رُوحوں سے ڈرتے ہیں۔ گڑبڑ یہ ہے کہ ان بے شمار لاشوں میں بادشاہ سلامت کی لاش تلاش کرنا بہت مشکل بلکہ ناممکن کام ہے۔"

ایک لمحے کے لیے خاموشی چھا گئی اور مجھے اپنی یہ اُمید خاک میں مِلتی نظر آنے لگی کہ مَیں بغیر کسی جِدّ و جُہد کے شہر پناہ کے اندر پہنچ جاؤں گا مگر پھر وہی گرج دار آواز آئی۔ "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم لوگوں کو اپنی جان پیاری نہیں۔ اگر مَیں ملکہ ہوشی کو تمھاری یہ باتیں بتا دُوں تو وہ کھڑے کھڑے تمھاری گردنیں کٹوا کر تمھارے ہاتھوں پر رکھوا دے گی۔"

اس دھمکی یا انتباہ پر وہ لوگ بڑبڑاتے ہُوئے آگے بڑھے اور مشعلوں کی روشنی میں میرے اردگرد لاشوں کے انبار اُلٹ پلٹ کر بادشاہ کی لاش تلاش کرنے لگے۔ وہ ایسا کرتے ہُوئے بادشاہ کو بھی کوستے جا رہے تھے۔ اچانک مجھے اپنے سینے پر کسی کی ٹھوکر محسوس ہوئی۔ شاید نیم تاریکی میں کسی کا پاؤں میری لاش یعنی مجھ

سے ٹکرا گیا تھا۔ دُوسرے ہی لمحے مشعل کی روشنی مجھ پر ڈالی گئی اور پھر کوئی مسرّت آمیز لہجے میں بولا۔ "بادشاہ سلامت کی لاش مِل گئی۔ یہ رہی۔ مَیں نے تلاش کیا ہے اسے۔"

مَیں نے سوچا کہ اگر اُنھوں نے خود اُتار کر میرا معائنہ کیا تو میری خیر نہیں کیونکہ مَیں تنہا اور نہتا ہُوں جبکہ وہ کم از کم چھے تھے اور تلواروں سے مسلح بھی تھے۔ اتنے میں اُن کے سربراہ کی آواز آئی۔ "ہاں۔ یہ شاہ افشار کی لاش ہے۔ وہ دیکھو۔ شاہی زنجیر اور کلغی۔ اب اسے جلدی سے ڈولے میں ڈالو اور لے چلو۔ یہ مت سمجھنا کہ مَیں آسوریوں کے ڈر سے جلدی کر رہا ہُوں۔ نہیں، مجھے ان مکروہ لگڑ بھگوں سے گھن آتی ہے۔ جو لاشیں بھنبھوڑنے کے لیے میدانِ جنگ میں پھیلے ہوئے ہیں۔"

مَیں حیران تھا کہ اس وقت میرا ردِ عمل کیا ہونا چاہیے۔ پہلے کبھی لاش بننے کا تجربہ نہیں ہُوا تھا... اور وہ بھی ایک ایسے بادشاہ کی لاش جسے اس کی بیوہ تکریم کے ساتھ کفنانے دفنانے کی منتظر ہو۔

اُنھوں نے مجھے اُٹھا کر ڈولے میں پٹخ دیا اور ڈولا اُٹھا کر چل پڑے۔ کافی دیر چلنے کے بعد اُن میں سے ایک ہانپتا ہُوا بولا۔ "مَیں شروع ہی سے بادشاہ کا پالکی بردار رہا ہُوں مگر مَیں نے کبھی اسے اتنا بھاری محسوس نہیں کیا جتنا اس وقت کر رہا ہُوں۔ کیا مرنے کے بعد آدمی بھاری ہو جاتا ہے؟"

"یہ فضول باتیں رہنے دو اور تیز تیز چلو۔" ان کا سرغنہ بولا۔ "جتنی جلدی یہ کام نمٹے گا، اتنی جلدی ہم گھر جا کر آرام سے سو سکیں گے۔"

"بشرطیکہ سونے دیا گیا تو..." ایک پالکی بردار نے بے ساختہ کہا جس پر سب ہنس پڑے۔

کچھ دُور جا کر وہ رُک گئے۔ مَیں نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ وہ فصیل کے بڑے پھاٹک میں بنے ہُوئے چھوٹے دروازے کے پاس کھڑے تھے۔ جُونہی دروازہ کُھلا، وہ اندر داخل ہو گئے۔ یہ ایک سُرنگ نُما راستہ تھا جس میں جگہ جگہ مشعلیں جل رہی تھیں اور ایک عجیب سی خوشبُو پھیلی ہُوئی تھی۔

پالکی برداروں کا سفر جاری رہا۔

کچھ دیر بعد وہ ایک ایسے باغ سے گزرے جس میں پھُول دار جھاڑیوں اور گھنے پتّوں والے چھوٹے چھوٹے درختوں کو اس انداز سے تراشا اور کاٹا چھانٹا گیا تھا کہ اُن سے انسانوں اور جانوروں کی شکلیں بن گئی تھیں... پھر وہ ایک طویل تالاب کے پاس سے گزرے جس میں مشعلوں کے عکس لہرا رہے تھے۔ یہ مشعلیں بڑے بڑے ستونوں کے شمع دانوں میں لگی ہُوئی تھیں۔ مَیں ڈولے میں اپنی گردن ایک طرف ڈھلکائے یہ سب کچھ دیکھتا جا رہا تھا۔ اچانک میری نظر اس رہگزر پر جا پڑی جس پر وہ میری پالکی لیے جا رہے تھے... یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ اس راستے کا فرش نیلم کی اینٹوں سے بنا ہُوا تھا۔ یہ فرش پِھسلواں ہو گا۔ اس لیے پالکی برداروں کی رفتار کچھ سُست پڑ گئی تھی۔

"رفتار بڑھاؤ احمقو۔ ملکہ ہوشی، بادشاہ کی منتظر ہو گی۔" عہدے دار چیخ پڑا۔

"اب انتظار کا کیا فائدہ، جناب؟" وہی مسخرہ پالکی بردار بولا۔ "جسے خدشہ تھا کہ بیواں شاید انھیں ساری رات جگائے رکھنا چاہیں گی۔"

"مَیں آج تک ملکہ ہوشی کی ایک جھلک بھی نہیں دیکھ سکا۔" دُوسرا بولا۔ "کیا آپ نے اُسے دیکھا ہے، جناب؟"

"نہیں۔" عہدے دار نے جواب دیا۔ "ہم جیسے لوگوں کی آنکھیں اُس کا دیدار نہیں کر سکتیں۔"

"وہ کیسی ہو گی؟" تیسرے نے سوال کیا۔

"ظاہر ہے سلطنت میں اُس سے زیادہ حسین عورت کوئی نہیں ہو سکتی۔" عہدے دار بولا اور اُس کی اس بات نے میرے دل میں شوقِ دید کو بھڑکا دیا۔

"ہو سکتا ہے، آج ہم اُس کی جھلک دیکھ ہی لیں۔" چوتھے نے قیاس آرائی کی۔

"ناممکن۔" عہدے دار بولا۔ "وہ مُردوں کے معبد میں اُس وقت داخل ہو گی جب ہم بادشاہ کی لاش رکھ کر وہاں سے نکل جائیں گے۔ اب باتیں بند کرو اور رفتار بڑھاؤ۔"

پالکی برداروں کی رفتار تیز ہو گئی۔

مَیں نے اپنا سر ذرا سا اُوپر اُٹھایا، سامنے ایک گنبد والی عمارت دکھائی دے رہی تھی۔ یہ گنبد بھی نیلم ہی کا بنا ہُوا تھا اور چاندنی میں اُس کی چمک قابلِ دید تھی۔

پالکی بردار چند سیڑھیاں چڑھ کر ایک طویل راہ داری میں داخل ہُوئے۔ اس میں بھی مشعلیں روشن تھیں جو روشنی کے ساتھ ساتھ عجیب سی خوشبُو بھی بکھیر رہی تھیں جو نہ تو عُود و عنبر کی تھی اور نہ ہی اگر کی خوشبُو جیسی تھی۔ مَیں نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنی حسین بیوہ یعنی ملکہ ہوشی کے خوش آیند تصوّر میں ڈُوب گیا۔ عین ممکن تھا کہ آنے والے چند لمحات میں مجھے واقعی لاش ہی میں تبدیل کر دیا جاتا لیکن اب مَیں مرنے سے پہلے ملکہ ہوشی کو ضرور دیکھ لینا چاہتا تھا جسے پالکی

برداروں کے سردار نے اس سلطنت کی سب سے حسین عورت بتایا تھا۔

معاً پالکی بردار رُک گئے۔ اُن کے سرغنہ نے ایک دروازہ کھولا۔ وہ لوگ ڈولا اُٹھائے ایک بڑے کمرے میں داخل ہُوئے جس کی دیواریں بھی نیلم کی تھیں۔ اُنھوں نے آگے بڑھ کر ڈولا فرش پر رکھ دیا، مجھے اُٹھا کر نیلم ہی کے بنے ہُوئے ایک چبوترے پر لٹایا۔ میرے ہاتھ پاؤں سیدھے کیے، ڈولا اٹھایا اور چپ چاپ وہاں سے نکل گئے۔

مَیں نے آنکھیں کھولیں تو پتہ چلا کہ یہ وہی کمرہ ہے جس پر بنا ہُوا گنبد میں دیکھ چُکا تھا۔ یہ گنبد اتنا شفاف تھا کہ چاندنی اس سے جھلک رہی تھی۔ مَیں نے سر اُٹھا کر کمرے کا جائزہ لیا۔ یہ ایک طویل عریض کمرہ تھا جس میں صرف وہی ایک دروازہ تھا اور دروازے کے اُوپر شمع دان میں صرف ایک مشعل روشن تھی۔ کسی دیوار میں کوئی دریچہ یا کوئی روزن نہیں تھا جس کا مطلب تھا کہ اُس دروازے کے علاوہ یہاں سے فرار کا اور کوئی راستہ نہیں... اور مَیں جانتا تھا کہ آنے والا وقت میرے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔ بہر صُورت جو ہونا ہے، وہ تو ہو کر رہے گا اس لیے مَیں نے اپنے خیالوں کا رُخ ایک بدسیر ملکہ ہوشی کی طرف موڑ دیا۔

کمرے میں مکمل سکوت تھا اور وہاں مسحور کن خوشبو رچی ہُوئی تھی۔ مَیں دھڑکتے دل کے ساتھ ملکہ ہوشی کا انتظار کرنے لگا۔ جو ایک وفا شعار ملکہ کی حیثیت سے اپنے شوہر کی آخری رُسوم پُورے اعزاز کے ساتھ ادا کرنا چاہتی تھی۔ اپنے محبوب کی لاش دیکھ کر اُس کے دل پر کیا بیتے گی، گزرتے وقت کی یادیں اسے خون رُلائیں گی اور آنے والے وقت کے دامن میں اُس کے لیے محرومیوں کے سوا کچھ بھی نہ ہوگا۔ پھر میری چشمِ تصوّر نے دیکھا کہ ملکہ ہوشی سیاہ ماتمی لباس پہنے اور بال کھولے میرے سرہانے کھڑی بین کر رہی ہے اور اس کی دیوانہ بنا دینے والی آنکھوں میں خوابوں کی راکھ ہے یا آنسو ہی آنسو مچل رہے ہیں۔

مَیں یہ سوچ رہا تھا اور میری نیم وا آنکھیں مشعل کے شعلے پر جمی ہُوئی تھیں کہ صرف وہی شعلہ مجھے ملکہ ہوشی کی آمد سے مطلع کر سکتا تھا۔ بالآخر وہ لمحہ آ گیا جب مشعل کا شعلہ تھرتھرایا اور اس نے مجھے بتا دیا کہ کمرے کی ساکت ہُوا میں یہ ارتعاش دروازہ کھلنے سے پیدا ہُوا ہے۔ دروازہ کھلا ہے تو کوئی آیا ہوگا اور یہاں ملکہ ہوشی ہی کو آنا تھا۔

مَیں نے اپنی آنکھیں نیم وا ہی رکھیں اور ہمہ تن گوش ہو گیا۔

دم سادھنے سے میری چھاتی پھٹنے لگی تھی اور دل تھا کہ بے تحاشا دھڑکے جا رہا تھا... پھر ایک سایہ مجھ پر محیط ہو گیا اور مشعل اوجھل ہو گئی۔ وہ آگے بڑھ رہی تھی۔ جُوں جُوں دبے آواز قدموں سے آگے آ رہی تھی، میرے دلِ وحشی کا اضطراب بڑھتا جا رہا تھا۔ مجھ پر ایسی کیفیت ہمیشہ اُن لمحات میں طاری ہُوا کرتی تھی جب کسی سے جان جوکھوں میں ڈالنے والا مقابلہ ہُوا کرتا تھا مگر اس وقت تو یہاں ایک ایسی عورت تھی جس کا دل غموں سے چُور چُور تھا اور جو محبوب کی دائمی جُدائی کے دُکھ سے نڈھال تھی... پھر نہ جانے مجھ پر یہ اضطرابی کیفیت کیوں طاری تھی۔

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہُوئی چبوترے کے قریب آئی اور مجھ سے چھ قدم کے فاصلے پر رُک گئی۔ چست ریشمی لباس نے اس کی نسوانیت کو کچھ اور بھی نمایاں کر دیا تھا۔ پالکی برداروں کے سردار نے سچ ہی کہا تھا۔ وہ بلاشبہ بےحد حسین تھی... لیکن وہ رونے اور بین کرنے کی بجائے اپنے ہاتھ پُشت کے پیچھے کیے ایک ٹک مجھے دیکھتی رہی۔ شاید اُس پر وہی سکتے کی سی کیفیت طاری تھی جو شدید صدمے سے جنم لیتی ہے اور غم زدہ انسان سے آنسوؤں کے ساتھ قوتِ گویائی بھی چھین لیا کرتی ہے۔ اگر ایسی حالت میں اُسے رُلایا نہ جائے تو اس کا کلیجہ پھٹ جاتا ہے مگر مَیں اُسے کیسے رُلا سکتا تھا؟

اچانک اُس نے اپنی گردن کو ہلکا سا جھٹکا دیا اور پُشت کی طرف کیے ہُوئے ہاتھ چھوڑ دیے۔ تب میری نگاہ اُس کے دائیں ہاتھ میں چمکتے ہُوئے خنجر پر جا پڑی... اوہ... تو وہ خودکشی کرنا چاہتی تھی۔ اسی لیے نہ تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور نہ ہی ہونٹوں پر بین... اس کی گردن کا جھٹکا خودکشی کے عزم کا اعادہ تھا۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ مَیں کیا کروں؟ قدرت کی اس حسین ترین مخلوق کو مرنے سے کیسے باز رکھوں؟... ابھی مَیں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ وہ بول اُٹھی۔

"وہ گھڑی آ گئی ہے، شاہ افشار جس کا مجھے انتظار تھا...

وہ تمھاری لاش یہاں مُردوں کے اس معبد میں لے آئے ہیں تاکہ تمھیں وہی عزت و توقیر دی جائے جو قوم و وطن کے لیے جاں نثار کرنے والے بہادر بادشاہوں کو دی جاتی ہے... اور مجھے بھی ظاہر کرنا ہے کہ تم اس اعزاز کے مستحق ہو لیکن یہ کتنا بڑا جھوٹ ہے، شاہ افشار! تم نے بھی اپنی قوم کو دھوکا دیا اور مَیں بھی اپنی قوم کو دھوکا دے رہی ہُوں... لیکن اس دھوکے میں بڑا فرق ہے۔"

وہ بول رہی تھی اور مَیں مُردوں کی طرح آدھی آنکھیں کھولے اُس کا حُسن بے محابا دیکھ رہا تھا۔ اُس کے ہونٹ گلابی تھے۔ آنکھیں بے خانے اور سراپا قیامت تھا۔ کس غضب کی عورت تھی وہ اور کتنا بے بس تھا مَیں... سچ مچ کی لاش کی مانند... اگر اس وقت مَیں لاش نہ ہوتا تو وحشت میرے وجود پر طاری ہو گئی ہوتی۔

وہ ایک قدم آگے بڑھی اور اپنے ابرو کی طرح خم دار خنجر کو ایک نظر دیکھتے ہُوئے پھر بولنے لگی۔

"تم مر چکے ہو، شاہ افشار لیکن مَیں تمھیں ایک بار پھر مارنے آئی ہُوں۔ سیانے کہتے ہیں کہ آدمی کو ایک ہی بار موت آتی ہے لیکن مَیں اپنی عزتِ نفس کی تسکین کے لیے تمھیں دوبارہ قتل کرنا چاہتی ہُوں۔ تمھیں میرے ہاتھوں بھی مرنا چاہیے تاکہ مجھے سکون مل سکے۔ جب مَیں تم سے اپنا انتقام لے لوں گی تو اپنے نئے محبوب کی رفاقت میں مجھے تم یاد نہیں آؤ گے۔ مَیں بھول جاؤں گی کہ کبھی تم میرے محبوب اور میرے شوہر تھے۔"

اتنا کہہ کر وہ ایک قدم آگے بڑھی۔

اُس کی سانسیں اُلجھنے لگی تھیں... اور ان اُلجھی سانسوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والا زیروبم دیدنی تھا۔

"تمھاری رُوح جن تاریکیوں میں بھٹک رہی ہوگی، میری باتیں سُن رہی ہوگی اور یہ بات تو مَیں اُسے بطورِ خاص سُنانا چاہتی ہُوں کہ تم جنگ میں آسوریوں کے ہاتھوں نہیں مارے گئے بلکہ مَیں نے تمھیں قتل کروایا ہے... اور اسی لیے قتل کروایا کہ تم اپنی سرزمینِ وطن سے تاغان سے غداری کرنا چاہتے تھے۔ تم نے تاغان کی غلامی کی سازش کی تھی۔ مَیں نے تمھارے پیچھے آدمی لگا دیا تھا جس نے تمھاری پیٹھ میں خنجر گھونپ کر تمھیں موت کے گھاٹ اُتار دیا... اور پھر مَیں نے اُس آدمی کو خود ہی موت کی میٹھی نیند سُلا دیا تھا تاکہ وہ مجھ سے غداری نہ کر سکے۔ یہاں آنے سے پہلے مَیں نے اُس آدمی کی لاش ٹھکانے لگا دی ہے، شاہ افشار... اب یہ راز صرف مَیں جانتی ہُوں یا پھر تمھاری اندھیروں میں بھٹکنے والی رُوح کو معلوم ہے۔"

وہ رُک گئی اور اس کے خنجر والا ہاتھ بلند ہونے لگا۔ اب وہ کسی بھی لمحے وہ تیز دھار خنجر میرے دل میں اُتار سکتی تھی۔

ملکہ ہوشی نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ اگرچہ میری نگاہ اُس کے ہاتھ میں چمکتے ہُوئے خنجر پر تھی لیکن مَیں اُس کی ساحر آنکھوں کو دیکھے بغیر نہ رہ سکے۔ اُس کی سمندروں جیسی سبز آنکھوں میں مجھے جنّت اور جہنّم کی جھلک نظر آئی۔ وہ آنکھیں اگر پیار سے کسی کی طرف اُٹھیں تو اُسے اپنا گرویدہ بنائے بغیر نہ چھوڑیں اور نفرت سے دیکھیں تو آدمی اپنے مرنے کی دُعائیں مانگنے پر مجبور ہو جائے۔ ایسی تھیں وہ فسوں کار آنکھیں جن پر لمبی پلکوں کی جھالریں آویزاں تھیں۔ میرا جی چاہا کہ مَیں ان پلکوں کی چھاؤں میں پہنچ جاؤں۔ مگر مَیں ایک لاش تھا اور اگر میری نظر خنجر سے چوکتی تو میرا سچ مچ کی لاش بن جانا بھی یقینی تھا۔

ملکہ ہوشی کے ہونٹوں پر نفرت آمیز تبسّم کی لکیر گہری ہو گئی۔

" تم ایک بار تاغان کی آزادی اور تحفّظ کی خاطر قتل کیے گئے تھے اور اب ملکہ ہوشی تمھیں اپنے انتقام کی آگ بجھانے کے لیے دوبارہ قتل کر رہی ہے۔"

اُس کا خنجر والا ہاتھ بجلی کی سی سُرعت سے میرے سینے کی طرف گرتا چلا گیا۔

اُس نے بجلی کی سی سُرعت سے خنجر میرے دل میں اُتار دینا چاہا تھا مگر جب خنجر میرے دل سے چند انچ کے فاصلے پر آیا تو میرے ہاتھ نے بڑھ کر اُس کی کلائی پکڑ لی۔ اگر اس عمل میں مجھ سے ذرا سی بھی چُوک ہو جاتی تو اُس کا خنجر میرے دل میں اُتر گیا ہوتا۔ میں نے نہ صرف اُس کی کلائی مضبوطی سے اپنی گرفت میں لی تھی بلکہ اُسے اپنی طرف کھینچ بھی لیا تھا۔ اب اس کا چہرہ میرے چہرے سے صرف بالشت بھر دُور تھا۔

"چیخنے کی کوشش نہ کرنا۔" میں نے کہا: "اگر تم خاموش رہیں تو میں تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔"

ملکہ ہوشی کی آنکھوں میں خوف اور حیرت کے سائے لہرانے لگے مگر وہ خاموش رہی اور نڈھال سی ہو کر میرے اُوپر آ رہی۔ اُس کے لب کچھ کہنے کو ذرا سے وا ہوئے لیکن آواز نہ نکل سکی۔

"اُونھوں... کچھ مت بولو۔ پہلے میری بات سُن لو!" میں نے جلدی سے کہا۔

اُس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور بے ہوش ہو گئی۔ اُس کا خوبصورت سراپا جو چند لمحے پہلے آگ تھا، اب برف کی مانند ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ میں نے آہستہ سے اُسے اُٹھایا اور وہاں لٹا دیا جہاں پہلے میں دراز تھا... پھر میں نے اُس کے خم دار خنجر کا جائزہ لیا۔ میرا خیال تھا کہ اس تلوار کی طرح وہ بھی لکڑی کا بنا ہُوا ہو گا جو میں نے میدانِ جنگ میں دیکھی تھی... لیکن یہ خنجر فولاد کا بنا ہُوا ثابت ہُوا! اگر وہ اسے گھونپنے میں کامیاب ہو گئی ہوتی تو...؟ یہ سوچ کر ہی مجھے جُھرجُھری آ گئی۔ میں نے ایک نظر ملکہ ہوشی کی طرف دیکھا۔ وہ اسی طرح بے حس و حرکت پڑی تھی۔

میں دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

دروازہ ذرا سا کھولا اور جھانک کر باہر دیکھا۔ باہر کوئی پہرے دار نہیں تھا۔ مُردوں کے معبد کو پہرے داروں کی ضرورت ویسے بھی نہیں ہوتی۔ باہر باغ میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کہیں کہیں مشعلیں جل رہی تھیں... مگر اُن کی روشنی اندھیروں کو دُور کرنے میں ناکام ثابت ہو رہی تھی۔ فضا میں وہی عجیب سی خوشبو رچی ہُوئی تھی جسے میں پہلے بھی محسوس کر چکا تھا۔ مجھے قدرت نے ایک خصوصی صلاحیت سے نوازا تھا کہ میں جانوروں کی طرح خطرے کی بُو محسوس کر لیتا ہُوں۔ اسی صلاحیت کی بنا پر میں کئی بار موت کے مُنہ سے بچا ہُوں۔ یہ صلاحیت مارشل آرٹس کی تربیت کے دوران میں پیدا ہُوئی تھی اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا۔ اس وقت بھی جب میں ماحول کا جائزہ لے رہا تھا، میری چھٹی حِس نے مجھے کسی خطرے کا احساس نہ دلایا تو میں ملکہ ہوشی کے پاس واپس آ گیا۔

وہ ابھی تک ساکت لیٹی ہُوئی تھی۔

اُس کی باتوں سے مجھے بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ بڑی باکردار عورت ہے۔ میں نے سوچا کہ اگر کسی طرح یہ میرے قابو میں آ جائے تو پھر میرے لیے کوئی خطرہ باقی نہیں رہے گا لیکن سوال یہ تھا کہ یہ قابو میں کیوں اور کیسے آئے؟... نہ جانے ہوش میں آنے پر اُس کا ردِ عمل کیا ہو۔ بہر صورت مجھے ہر قدم پھونک پھونک کر رکھنا تھا... میں نے خود اُتار دیا اور بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا جب میں نے چہرے پر ہاتھ پھیرا تو پتہ چلا کہ بالوں کی نئی فصل رُخساروں کے کھیتوں پر سر اُٹھا رہی ہے لیکن یہاں اِن حالات میں داڑھی کیسے بنائی جا سکتی تھی اور اس کے لیے سامان کہاں سے آتا؟ میں نے ایک بار پھر ملکہ ہوشی کی طرف دیکھا تو اُس کے حُسن و شباب نے مجھے اُس کے قریب بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے اُس کے شفاف لباس کو چھُو کر دیکھا، وہ ریشم کا لگتا تھا مگر ریشم کا نہیں تھا اور ہوشی کی جلد نہ سفید تھی اور نہ ہی زرد تھی بلکہ کچھ ایسی تھی جیسے پُرانا ہاتھی دانت کچھ زردی مائل ہو جاتا ہے۔ میرا جی چاہا کہ میں اُس کی بند آنکھوں کو چھُو کر دیکھوں جنھوں نے مجھے مسحور کر دیا تھا.. مگر میں نے اپنی اس خواہش کو خود ہی رَد کر دیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ خوبصورت چہرے اور شاداب سراپا مجھے بُری طرح لُبھاتے اور اُکساتے ہیں... مگر میں یہاں کسی ایسی آسُودگی کے لیے نہیں آیا تھا بلکہ مجھے معلوم کرنا تھا کہ یہ کون سی سرزمین ہے اور یہاں کی تہذیب نے کس حد تک ترقی کی ہے۔ ملکہ ہوشی نے اپنی خود کلامی میں تاغان کا ذکر کیا تھا لیکن تاغان شہر کا نام ہے یا ملک کا؟ مجھے یہ ساری باتیں معلوم کرنا تھیں۔ اس لیے میں نے اپنی خواہشوں کی سرگوشیاں سُننی بند کر دیں اور ملکہ ہوشی کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنے لگا۔

کچھ دیر بعد جب اس کے جسم میں ذرا سی جُنبش پیدا ہُوئی تو میں نے جلدی سے اپنا ہاتھ چہرے پر رگڑا تاکہ وہ خون اُتر جائے جسے میں نے اپنی شناخت کو مُبہم بنانے کے لیے لگایا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ مجھے دیکھ کر ڈر جائے۔ میرے مستقبل کا دار و مدار اُسی پر تھا۔ اتنے میں ہوشی نے آنکھیں کھول دیں اور تعجب سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے نرمی سے ایک ہاتھ اُس کے ہونٹوں پر رکھ دیا "... وہ چیخنے نہ پائے۔

"میں نہ تو تمھارا دشمن ہُوں اور نہ ہی تمھیں کوئی نقصان پہنچانا چاہتا ہُوں، ملکہ! مجھے اپنا دوست سمجھو اور میری مدد کرو۔ مجھے تمھاری مدد کی ضرورت ہے۔ کوئی آواز نکالنے کی بجائے پہلے میری بات توجہ سے سُن لو۔"

اس پر ہوشی جو پہلے اُٹھنے اور میرا ہاتھ ہٹانے کی کوشش کر رہی تھی نرم پڑ گئی۔ اُس نے اُٹھنے کی کوشش ترک کر دی اور سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

"میرا نام سرفروش ہے اور میں یہاں تاغان میں اجنبی ہوں یہاں میرا کوئی دوست یا کوئی شناسا نہیں۔ میرے پاس ان کپڑوں اور اس ہتھیار کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔" یہ کہتے ہُوئے میں نے اُسے اُسی کا خنجر دکھایا: "میں تمھارا دوست رہُوں گا اور تمھارے کام آؤں گا بشرطیکہ تم بھی میرے ساتھ دوستانہ سلوک کرو۔ بولو منظور ہے؟"

مگر اُس نے اثبات میں سر نہ ہلایا۔ بول اس لیے نہیں سکتی تھی کہ میں نے اُس کے مُنہ پر ہاتھ رکھا ہُوا تھا۔ وہ خوفزدہ نگاہوں سے اُس خنجر کو دیکھتی رہ گئی جو میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے جلدی سے خنجر اپنے کمربند میں اُڑس لیا اور کہا: "اگر تم وعدہ کرو کہ شور نہیں مچاؤ گی تو میں تمھارے مُنہ سے ہاتھ ہٹا لوں گا۔ منظور ہو تو سر ہلا کر اشارہ کر دو۔"

ملکہ ہوشی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

میں نے اپنا ہاتھ اُس کے ہونٹوں سے ہٹا کر اُس کے جسم سے دُوسری جانب چبوترے پر ٹیک لیا۔ اُس نے اپنی نرم و نازک مخروطی انگلیوں سے اپنے یاقوتی لب صاف کیے اور میری طرف دیکھتی رہی۔

"تم آہستہ سے بات کر سکتی ہو۔ جیسے میں کر رہا ہُوں!" میں نے کہا: "میری زبان سمجھ رہی ہو، نا؟"

وہ آہستہ سے مسکرائی پھر مدھم اور میٹھے لہجے میں بولی: "اس میں کوئی شک نہیں کہ تم تاغان میں اجنبی ہو۔ جب تک میں خود کسی کو نہ بُلاؤں، یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ میں یہاں کی ملکہ ہُوں۔"

اب اُس کی آواز میں نفرت نہیں تھی بلکہ اُس کے لہجے میں رَس گھُل گیا تھا۔ ذرا سے وقفے کے بعد وہ پھر کہنے لگی۔

"تم نے مجھے چھُو کر اپنے ساتھ بڑا ظلم کیا ہے۔ تمھاری زندگی اب میرے اختیار میں ہے کیونکہ کوئی ملکہ کو چھُونے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ بہر حال، میں نے اب تک تم جیسا کوئی آدمی نہیں دیکھا۔ میں تمھاری بات ضرور سُنوں گی، اجنبی! بولو کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"اب تمھیں مجھ سے ڈر تو نہیں لگ رہا؟" میں نے پوچھا کیونکہ ایک خوفزدہ عورت پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔"

اُس نے ناک سکوڑتے اور کندھے اُچکاتے ہُوئے کہا: "میں تم سے خوف زدہ نہیں، اجنبی بلکہ میں تو یہ سوچ کر بے ہوش ہو گئی تھی کہ غالباً شاہ افشار کو میدانِ جنگ میں قتل نہیں کیا گیا اور وہ مرنے کا ڈھونگ رچا کر مُردوں کے اس معبد میں مجھے قتل کرنے آ گیا ہے۔ میں تمھاری حرکت سے اس غلط فہمی میں مُبتلا ہو گئی تھی۔"

"تمھارا شوہر مر چُکا ہے، ملکہ۔ اگر میں نے اُس کی زرہ بکتر نہ پہنی ہوتی تو وہ مجھے اُس کے دھوکے میں نہ اُٹھا لاتے۔ میں اور کہیں جا بھی نہیں سکتا تھا۔ یہی میرے لیے محفوظ ترین جگہ تھی۔ فی الحال اس سے زیادہ میں تمھیں نہیں بتا سکتا مگر بعد میں سب کچھ بتاؤں گا۔ مجھے خوراک، لباس اور پناہ کی ضرورت ہے اور میں کوئی ایسا طریقہ بھی جاننا چاہتا ہوں جس کی بدولت کوئی مجھ پر شک و شبہ نہ کر سکے۔"

"زرہ بکتر تم پر سجتی ہے، اجنبی! یہ افشار پر بالکل نہیں سجتی تھی۔"

"شکریہ ملکہ۔ اب یہ بتاؤ کہ تم میری مدد کرو گی یا نہیں؟ کیا تمھیں میری اس بات پر اعتماد ہے کہ میں تمھیں یا تاغان کو کبھی نقصان نہیں پہنچاؤں گا؟"

"مجھے تم پر اعتماد ہے اور میں تمھاری مدد ضرور کروں گی، اجنبی۔ اب اپنا بازو ہٹاؤ اور مجھے اُٹھنے دو... اور ہاں، آئندہ مجھے چھُونے کی جسارت نہ کرنا۔" اس کا لہجہ تحکمانہ ہو گیا۔

میں نے اپنا بازو ہٹا لیا۔

وہ اُٹھ بیٹھی۔ اگرچہ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی مگر اُس کے چہرے پر تناؤ تھا جس نے مجھے ہوشیار کر دیا۔ اچانک وہ تیزی سے اُٹھی اور بھاگنا ہی چاہتی تھی کہ میں نے لپک کر اس کا راستہ روک لیا۔ غالباً اُس نے باہر گشت کے پہرے داروں کی آواز سُن لی تھی جو میں نہیں سُن پایا تھا۔ اُس نے چیخنا چاہا مگر میں نے اُس کے مُنہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

اُس نے مدافعت کرتے ہُوئے مجھے دھکیلا۔

اُس وقت اُس میں بلا کی طاقت آ گئی تھی۔ وہ دوبارہ چیخنا چاہتی تھی۔ میں نے ایک بار پھر اُس کا مُنہ بند کر دیا... اور اس کے ساتھ ہی میں نے اسے دوبارہ چبوترے پر لٹا دیا۔ وہ چند لمحے کسمساتی رہی... پھر پُرسکون ہو گئی۔

اگر اس وقت پہرے دار بھی وہاں آ جاتے اور مجھے برچھیوں سے چھلنی کر ڈالتے تب بھی میں اپنے آپ کو نہیں روک سکتا تھا۔ میں یہ سمجھے بغیر نہ رہا کہ میری اس دیوانگی کا ردِ عمل میرے لیے بے حد خطرناک بھی ہو سکتا ہے... مگر لمحے ایک بار بیت جائیں تو کبھی واپس نہیں آیا کرتے۔ اس لیے پچھتاوا فضول تھا۔

میں آنکھیں موند کر لیٹ گیا کہ جو ہونا ہے، وہ ہو جائے... اور جو کچھ بھی ہوا اس کی مجھے ہرگز توقع نہیں تھی۔ مجھے اپنے سینے پر روئی کے گالے جیسا بوجھ محسوس ہوا تو میری آنکھیں خود بخود کھل گئیں۔ ملکہ کا چہرہ میرے چہرے سے زیادہ دور نہیں تھا اور وہ مسکرا رہی تھی۔

"مجھ سے ناراض تو نہیں ہو، ملکہ؟"

اس نے سر کو منفی جنبش دی۔ وہ مسکراتی رہی۔

"کیا تم میری مدد کرو گی؟" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں اجنبی! میں تمہاری مدد ضرور کروں گی اور میں حلفیہ کہہ سکتی ہوں کہ تم تاغان کے ہر مرد سے مختلف ہو۔ اُن میں سے ایک بھی تم جیسا نہیں ہے۔" اور پھر جس طرح کچھ دیر پہلے میں نے اس کا منہ بند کیا تھا، اسی طرح اس نے بھی مجھ سے گویائی چھین لی۔

وہ اٹھ کھڑی ہوئی تو میں بھی جلدی سے اٹھ گیا۔

"گھبراؤ نہیں اجنبی!... اب میں نہ کسی کو آواز دوں گی اور نہ ہی یہاں سے بھاگوں گی۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"...لیکن یہ جگہ... میرے لیے محفوظ نہیں ہے، ملکہ! ہمیں کہیں اور جانا چاہیے۔"

اس نے میرا ایک ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور کہنے لگی: "ہاں، ہاں۔ ابھی چلتے ہیں۔ تم گھبراتے کیوں ہو۔ میں یہاں کی حکمران ہوں۔ میرا ہر لفظ یہاں کے قانون کی حیثیت رکھتا ہے اور اب تمہاری بھی ہر بات یہاں کے قانون کا درجہ حاصل کر لے گی۔"

میں حیرت سے اس کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا... پھر بولا۔

"مگر ملکہ...!"

اس نے میری بات کاٹ دی: "تم آئندہ مجھے ملکہ نہیں کہو گے۔ کبھی ملکہ مت کہنا۔ سمجھ گئے؟"

"تو پھر کیا کہوں؟" میں نے پوچھا۔

"تم مجھے لالی کہہ کر مخاطب کیا کرو۔ جب میں چھوٹی سی تھی تو میرا باپ مجھے لالی کے نام سے پکارا کرتا تھا۔ میرے بچپن میں وہ آسوریوں سے لڑتے ہوئے مارا گیا۔ تب سے کسی نے بھی مجھے اس نام سے نہیں پکارا۔ کسی نے بھی مجھے لالی کہہ کر مخاطب نہیں کیا۔"

"لالی!" میں نے دہرایا: "لیکن مجھ میں اور تمہارے باپ میں تو بڑا فرق ہے۔"

"بے شک... اس کے باوجود تم مجھے لالی کہو گے۔"

"اچھی بات ہے۔ تم جس نام سے چاہو گی، میں اسی نام سے تمہیں مخاطب کروں گا مگر اب یہاں سے نکل چلو لالی۔ دیکھو نا، اگر پہرے دار یہاں آ گئے تو تم اُنھیں میرے بارے میں کیا بتاؤ گی؟ اُنھیں کیسے مطمئن کرو گی؟"

"بات صرف پہرے داروں تک ہی محدود نہیں، سرفروش! مجھے اپنے عوام اور عمائدین سلطنت کو بھی تو تمہارے متعلق کچھ نہ کچھ بتا کر مطمئن کرنا ہے۔ کیا اور کیسے؟ یہ سوچنے کے لیے وقت درکار ہے۔ مجھے کچھ جھوٹ گھڑنے پڑیں گے لیکن گھبراؤ نہیں۔ مجھے جھوٹ بولنے میں کافی مہارت حاصل ہے۔"

"جھوٹا تو میں بھی ہوں اور اس کام میں تمہارا اچھا مددگار ثابت ہو سکتا ہوں۔" میں نے کہا: "لیکن اچھا جھوٹ اسی وقت میرے ذہن سے جنم لے سکتا ہے جب میں نہا دھو کر پیٹ بھر لوں اور کچھ دیر سو کر تازہ دم ہو جاؤں۔"

وہ میری طرف دیکھ کر اک ادائے دل نشین سے مسکرائی اور پھر میری طرف انگلی نچاتے ہوئے بولی: "ہاں۔ اس وقت تمہیں بہت بھوک لگ رہی ہو گی۔ آؤ چلیں۔"

وہ مجھے لیے ہوئے ایک دیوار کے پاس آئی اور قریبی ستون میں بنے سوراخ میں انگلی سے کوئی کھٹکا دبا دیا تو دیوار کی ایک بڑی سِل کسی آواز کے بغیر ہٹ گئی۔ اب ہمارے سامنے ایک سرنگ نما ڈھلوان راستہ تھا جس میں مشعلیں جل رہی تھیں۔

"یہ راستہ میری نجی رہائش گاہ تک جاتا ہے۔ وہاں پہلے ہم غسل کریں گے... پھر کھانا کھائیں گے اور اس کے بعد میں چاہوں گی کہ تم ویسے ہی بن جاؤ جیسے کہ پہلے بن چکے ہو۔"

مجھے اس کے ارادوں سے کوئی قباحت محسوس نہ ہوئی، اس لیے میں نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔ چلتے چلتے اچانک ہی اس نے پوچھا: "کیا تمہیں یقین ہے کہ شاہ افشار مر چکا ہے؟ اگر وہ نہیں مرا تو سب کچھ الٹ پلٹ ہو جائے گا۔ میں تم سے کسی صورت دستبردار نہیں ہوں گی۔ جس پر جھگڑا ہو گا اور میں نہیں چاہتی کہ تاغان میں ایسے وقت کوئی ہنگامہ برپا ہو جب ہم بیرونی دشمنوں سے نبرد آزما ہیں۔"

"دیکھو لالی!" میں نے کہا: "میں ایک اجنبی ہوں اور تمہارے شوہر کو نہیں پہچانتا لیکن زرہ بکتر، خود اور یہ طلائی زنجیر میں نے جس شخص کے گلے سے اتاری تھی، وہ یقیناً مر چکا تھا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ میں نے جس آدمی کو شاہ افشار کے قتل پر مامور کیا تھا، اُس نے اپنا کام بخوبی انجام دیا تھا۔"

وہ مطمئن ہو گئی... مگر مجھے ایک نئے خیال سے جھرجھری سی آ گئی۔

"فرض کرو کہ کل دن کی روشنی میں کوئی تمہارے شوہر کی لاش پہچان لے تو کیا ہو گا؟" میں نے تشویش ظاہر کی۔

اس نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بولی: "تم اس کی فکر نہ کرو۔ مُردار خور گوریلے اور ریگز بھیڑیے راتوں رات ساری لاشیں چٹ کر جائیں گے۔ شاید تمہیں معلوم نہیں کہ گوریلے سب سے پہلے لاشوں کے چہرے ہی نوچتے ہیں۔ مُردوں کے معبد سے لاش غائب ہو جانے کے لیے بھی میں کوئی کہانی گھڑ لوں گی لیکن تمہاری موجودگی کی وضاحت قدرے مشکل ہے... اور اس لیے مشکل ہے کہ تمہاری شکل و صورت تاغان کے لوگوں سے نہیں ملتی۔ ویسے گھبراؤ نہیں۔ میں ضرور کوئی ایسا جھوٹ تراش لوں گی جس پر سب کو یقین آ جائے گا۔"

کچھ دیر بعد ہم دونوں ایک نیم گرم پانی والے تالاب میں اُتر گئے جس کے کنارے نوخیز لڑکیاں دست بستہ کھڑی تھیں۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے وہ تالاب میں کوئی خوشبودار عرق چھڑک دیتی تھیں۔ تپائی کی بجائے ایک طلائی طشتری میں خوشبودار سفوف رکھا ہوا تھا۔

میں یہ پوچھے بغیر نہ رہ سکا کہ اگر ان باندیوں میں سے کسی نے میرے متعلق کسی کو بتا دیا تو کیا ہو گا؟

"ان میں سے کوئی بھی اپنی زبان نہیں کھول سکتی۔ یہ سب جانتی ہیں کہ میری انگلی کا ہلکا سا اشارہ اُن کی گردنیں اڑا سکتا ہے۔"

کوئی وجہ نہیں تھی کہ میں ملکہ لالی کی بات کا اعتبار نہ کرتا۔

کھانے کے بعد وہ مجھے اپنی خواب گاہ دکھانے لے گئی جہاں پلنگ کی بجائے فرش پر ایک گول اور بے حد نرم گدا پڑا تھا۔ اس نے بتایا کہ تاغان میں سب فرش پر سوتے ہیں۔ تھوڑی ہی دیر بعد کنیزوں نے ہمارے اردگرد پردے آویزاں کر دیے۔

ملکہ لالی جھوٹ بولنے میں اپنی مثال آپ تھی۔ اس نے میرے بارے میں اپنی قوم اور عمائدین سلطنت کو یہ کہہ کر مطمئن بلکہ زیر بارِ احسان کر دیا تھا کہ میں جنوبی حصے میں واقع فارس سے تاغان آیا ہوں تاکہ آسوریوں کے خلاف جنگ میں اہلِ تاغان کے عسکری مشیر کے فرائض انجام دے سکوں اور یہ کہ میں فارس کا سورینا یعنی سپہ سالار ہوں۔ اس جواز نے جہاں سب کو مطمئن کر دیا تھا وہاں میرے لیے لالی کے محل میں رہنے کی بھی گنجائش پیدا کر دی تھی۔ چنانچہ گزشتہ تین ہفتوں سے میرے دن جنگ کا نظارا کرتے گزر رہے تھے اور راتیں وقت ملکہ کی خدمت میں بسر ہو رہا تھا۔ لالی مجھ پر اس قدر مہربان بلکہ والہ و شیدا تھی کہ اُسے ایک پل کی جدائی بھی گراں گزرتی تھی۔

میں شب و روز کی یکسانیت سے اکتاہٹ اور بے چینی سی محسوس کرنے لگا اور مجھے یہ احساس بھی کچوکے دینے لگا کہ میں یہاں کشت و خون کا نظارا کرنے اور لالی کی زلفوں کا اسیر بننے نہیں آیا بلکہ میرا مقصد کچھ اور ہی ہے... مگر میں یہ بات نہ تو لالی کو بتا سکتا تھا اور نہ ہی اپنے کسی عمل سے اُسے برہم کرنا چاہتا تھا کہ وہ عورت بیک وقت شبنم بھی تھی اور شعلہ بھی... مہربان ہو کر اُس نے مجھے اپنا دیوتا بنا لیا تھا تو نامہربان ہو کر وہ میرے لیے فرشتۂ اجل بھی بن سکتی تھی۔

ایک صبح میں فصیل کے ایک برج سے جنگ میں گرفتار ہونے والے آسوریوں کی گردن زنی کا نظارا کر رہا تھا۔ وہ ایک قطار میں کھڑے تھے اور اُن کے ہاتھ پشت پر باندھ دیے گئے تھے مگر اُن کے چہروں پر خوف و دہشت کے آثار نہیں تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے ہر قیدی جلد از جلد اپنے سر کا نذرانہ دینے کا متمنی ہو۔

وہ باری باری آگے بڑھتے، اپنا سر مقتل کے چبوترے پر رکھتے، جلاد کا تیشہ بلند ہوتا، "ٹھک" کی آواز آتی اور آسوری کا سر تن سے جدا ہو کر ایک گڑھے میں جا پڑتا۔ اس کے ساتھ ہی دوسرا آسوری آگے بڑھتا اور اپنا سر چبوترے پر رکھ دیتا۔

میرے ساتھ اُس وقت تاغان کا سورینا آذر بھی کھڑا تھا۔ اُس کا قد تو میرے برابر تھا لیکن جسامت اور طاقت میں آذر ہی نہیں بلکہ تاغان کا کوئی بھی مرد میرے ہم پلہ نہیں تھا۔ جب میں نے آسوریوں کو یوں مردانہ وار اپنی گردنیں کٹواتے دیکھا تو بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا...

"انھیں بہادروں کی طرح مرنا آتا ہے۔"

یہ سن کر آذر بولا: "یہ بہت بے حس اور عقل سے عاری لوگ ہیں سردار سرفروش! اسی لیے یہ کسی بات سے خوفزدہ نہیں ہوتے... پھر انھیں یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ مرنے کے بعد حیاتِ جاوداں اُن کی منتظر ہو گی۔ ممکن ہے، اُن کا یہ عقیدہ درست ہو۔ بہرکیف ہم انھیں تہ تیغ کرتے ہوئے تھک گئے ہیں مگر بدبخت وحشی اپنی گردنیں کٹوانے سے نہیں تھکتے۔ ان کی تعداد کم ہونے میں ہی نہیں آتی۔"

میں نے ایک نظر آذر پر ڈالی۔ تاغانی مردوں کی طرح اس کی داڑھی مونچھوں کے بال بھی برائے نام ہی تھے مگر میرے چہرے پر گھنی داڑھی اُگ آئی تھی جسے اب تک تراشنے کا موقع نہیں ملا تھا۔

وہ مجھے اپنی طرف دیکھتے پا کر نہ جانے کیا سمجھا اور بولا: "میرا

خیال ہے کہ تم نے ہمیں ان بدبخت وحشیوں سے نجات دلانے کا کوئی طریقہ سوچ لیا ہوگا۔ یہ تو ہمیں جونکوں کی طرح چمٹ گئے ہیں، سردار سرفردش؟"

"سردار" کا خطاب بھی مجھے لالی کے حضور نے عطا کیا تھا۔ میں نے اسے صرف اتنا کہہ کر ٹال دیا کہ ابھی مجھے ایسا کوئی طریقہ نہیں سوجھا۔

سپہ سالار آزدر یہ سن کر وہاں سے چلا گیا اور میں دوبارہ اُن قیدی آسوریوں کی طرف دیکھنے لگا جو مردانہ وار خوشی خوشی جامِ مرگ پی رہے تھے۔ پھر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں خود بھی یہاں ایک اسیر کی حیثیت رکھتا ہوں۔

دفعتہً مجھے گھوڑے کی ٹاپیں سنائی دیں۔

میں نے پلٹ کر دیکھا تو مجھے اسیر بنانے والی لالی لالی گھوڑے پر چلی آ رہی تھی۔ میں برج سے نکل کر فصیل پر آ گیا۔ لالی جنگی لباس اور سینہ بند پہنے بے حد خوبصورت لگ رہی تھی۔ خود کے نیچے لہراتی زلفیں اُس کے گالوں سے کھیل رہی تھیں اور سبز گہری آنکھیں چناروں سے گھری جھیلوں کی مانند نظر آ رہی تھیں۔

اُس نے چابک والے ہاتھ سے مجھے سلام کرتے ہوئے کہا۔

"صبح بخیر سردار سرفردش!"

"صبح بخیر لالی!" میں نے جواب دیا اور ہم دونوں کے ہونٹوں پر ایک خاص مسکراہٹ اُتر آئی۔

میں اپنے گھوڑے پر سوار ہو گیا اور بولا۔ "آؤ ذرا توپ کا معائنہ کریں۔"

ہمارے گھوڑے فصیل پر دلکی چال چلنے لگے۔ فوجیوں اور افسروں نے لالی کو اور مجھے دیکھ کر سلام کیا اور دوبارہ جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ لالی نے مجھے تیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"آج صبح جب میں بیدار ہوئی تو میں نے اپنے آپ کو تنہا پایا تھا۔ مجھے یہ پسند نہیں سردار سرفردش... میری آنکھیں سب سے پہلے تمہیں ہی دیکھنا چاہتی ہیں۔"

"میں معائنے کے لیے جلدی اُٹھ گیا تھا۔" میں نے جواب دیا۔ "اور ان بدبخت آسوریوں سے نجات حاصل کرنے کا کوئی طریقہ سوچنا چاہتا تھا۔ یہ کام خوابگاہ میں نہیں ہو سکتا تھا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔" لالی بولی۔ "لیکن تم نہیں جانتے کہ میں تمہارے آنے سے پہلے کس قدر محرومیوں کا شکار تھی۔"

میں یہ سن کر مسکرا دیا۔

"آج تو میں تمہیں معاف کرتی ہوں لیکن آئندہ نہیں کروں گی۔ یہ مت بھولو کہ رات کو آنکھیں بند کرتے وقت اور صبح آنکھیں کھولتے ہی میں تمہارے علاوہ کسی کو نہیں دیکھنا چاہتی۔"

اتنے میں ہم وہاں پہنچ گئے جہاں وہ عجیب و غریب توپ رکھی ہوئی تھی۔ اُسے تقریباً درجن بھر آدمی کھینچتے تھے۔ توپ میرے اس اندازے سے قدرے مختلف نکلی تھی جو میں نے پہلے دن سطحِ مرتفع سے لگایا تھا۔ اُس کے آٹھ پہیے تھے۔ جو بارہ فٹ اونچے تھے اور اُسے داغنے کے لیے دس پیپے بارود درکار ہوتا تھا مگر میرے لیے اُس کی سب سے حیران کن بات یہ تھی کہ اُس کی نال فولاد کی نہیں بلکہ لکڑی کی بنی ہوئی تھی جس پر فولادی پٹیاں منڈھی ہوئی تھیں۔ تعجب خیز امر یہ تھا کہ بار بار داغنے کے باوجود اس کی نال نہیں پھٹی تھی۔

اُس رات لالی نے بتایا۔

"آسوریوں کا بادشاہ تمبور اسی توپ کے لیے برسوں سے جنگ کر رہا ہے۔ اگر ہم یہ توپ اُسے دے دیں تو وہ جنگ بند کر کے واپس چلا جائے گا۔"

"تو پھر تم لوگ یہ توپ اُس کے حوالے کیوں نہیں کر دیتے؟" میں نے کہا۔ "اس کا فائدہ بھی کیا ہے؟ تم اُس سے آسوریوں کو ہلاک نہیں کرتے بلکہ صرف دھماکے سے ڈراتے ہو۔ وہ خوفزدہ ہو کر تتر بتر ہو جاتے ہیں... مگر پلٹ کر پھر لڑنے لگتے ہیں۔"

میری بات سن کر لالی بپھر گئی۔ اُس کی سبز آنکھوں میں غیظ و غضب کے ساتھ ساتھ خوف کے سائے بھی لہرانے لگے۔

"ہم یہ توپ تمبور کے حوالے کر دیں؟... تم پاگل تو نہیں ہو گئے سرفردش؟... مگر نہیں... تم اجنبی ہو اس لیے نہیں جانتے کہ یہ توپ ہماری عظمت کی علامت ہے۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ اگر یہ توپ ہم سے چھن گئی تو تاغان تباہ و برباد ہو جائے گا۔ روایت یہ بھی ہے کہ توپ جس قوم کی تحویل میں ہوگی وہی دنیا پر حکمرانی کرے گی۔ اس لیے شاہ تمبور سالہا سال سے اسے حاصل کرنے کے لیے لڑ رہا ہے۔ وہ اپنے لاتعداد سپاہیوں کو جنگ کی بھینٹ چڑھا چکا ہے۔ نہیں سرفردش، آئندہ ایسا کبھی نہ کہنا۔ اگر میری قوم کو یہ معلوم ہو جائے کہ تم نے ایسا کہا ہے تو وہ تمہارا پرخچے اُڑا دے گی۔ میں بھی تمہیں اُن کے قہر سے نہیں بچا سکوں گی۔"

میں نہیں جانتا تھا کہ میری اس بات کا اتنا شدید ردِعمل ہوگا اور وہ یوں غم و غصے میں بپھر جائے گی۔ اُسے معمول پر لانے کے لیے مجھے نہ جانے کیا کیا جتن کرنے پڑے۔

دوسری صبح وہ حسبِ معمول آسودگی اور فرحت محسوس کر رہی تھی لیکن میں کچھ تھکا تھکا سا تھا۔ جب ہم حسبِ معمول فصیل پر آئے تو مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ آج میدانِ جنگ میں وہ ہلچل اور لہا گہمی نہیں ہے جو روز ہوا کرتی تھی۔ آسوریوں کی خیمہ گاہ سے کھانا پکانے کے لیے دھواں ضرور اُٹھ رہا تھا مگر آج اُن کے گھڑسوار صف بستہ نہیں تھے اور نہ ہی مجھے وہ پیادہ دستے دکھائی دیے جو تیراندازوں کے ساتھ لمبی لمبی سیڑھیاں لے کر آگے بڑھا کرتے تھے۔

"مجھے کوئی گڑبڑ معلوم ہوتی ہے، سردار سرفردش! آج آسوری لڑ کیوں نہیں کر رہے ہیں؟"

"شاید تمبور کو عقل آ گئی ہے اور اسے یہ اندازہ ہو گیا ہے کہ وہ اس طرح جنگ نہیں جیت سکتا۔ اگر اُس کی جگہ میں ہوتا تو کب کا خیمے سمیٹ کر جا چکا ہوتا۔"

"اگر ایسا ہوا تو اچھا نہیں ہوگا۔" وہ اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دباتے ہوئے بولی۔ "یہ لوگ بھاگ نکلے تو ہم ان کی گردنیں کیسے کاٹ سکیں گے۔ اب تو یہ ہمارا معمول بن چکا ہے۔"

"شاید وہ سوار تمہارے سوال کا جواب دے سکے۔" میں نے گھڑسوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جو آسوریوں کی خیمہ گاہ سے فصیل کی طرف گھوڑا دوڑاتا ہوا آ رہا تھا... مگر جب وہ قریب آیا تو پتہ چلا کہ وہ ایک بونا ہے اور خچر پر سوار ہے۔ اس نے ایک لمبا سا نیزہ بلند کر رکھا تھا جس کے ساتھ گھوڑے کی دُم بندھی ہوئی تھی۔

"یہ تو ایلچی ہے... لیکن اگر تمبور صلح کرنا چاہتا ہے تو اس نے اس بونے مسخرے کو کیوں بھیجا ہے؟" یہ کہتے کہتے لالی کا چہرہ غصے سے تمتما اُٹھا۔ "اس نے بھونڈا اور توہین آمیز مذاق کیا ہے۔ مگر نہیں، ایسا گھٹیا خیال تمبور کی بہن سادیہ کو ہی سوجھ سکتا ہے۔"

اتنے میں بونا گھوڑے کی دُم والا نیزہ لہراتا ہوا فصیل کے پاس پہنچ کر رُک گیا۔ میں نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور وہاں پہنچا جہاں نیچے بونا ایلچی رکا تھا۔ آزدر اور دوسرے عہدے دار بھی وہاں موجود تھے۔

بونا رکابوں پر کھڑا ہو گیا۔

میرا خیال ہے، وہ بمشکل تین فٹ قد کا مالک تھا... مگر اعضا متناسب اور ٹانگیں مضبوط تھیں ورنہ وہ رکابوں پر کھڑا ہو کر توازن قائم نہ رکھ پاتا۔

اُس نے اپنے دونوں ہاتھ بھونپو کے انداز میں منہ پر رکھے اور زور سے بولا۔ "اہلِ تاغان اور تاغانی سپاہیو، ملکہ ہوشی اور ارکانِ سلطنت! میں شاہ تمبور کی طرف سے پیغام لایا ہوں، اسے غور سے سنو۔ شاہ تمبور جو حاکمِ دوراں ہے جس سے دھرتی لرزتی ہے، جو دشمنوں کے لیے بلائے بے درماں اور دوستوں کے لیے مہربان ہے، وہ تمہاری اس کوہ پیکر فصیل کے اندر رونما ہونے والے واقعات سے بھی بے خبر نہیں ہے۔"

وہ سانس لینے کے لیے رُکا تو لالی میری طرف جھک کر بولی۔ "یہ ٹھیک کہتا ہے۔ ہمارے ہاں اس کے بہت سے جاسوس ہیں۔"

بونا پھر بولنے لگا۔ "خادِ اعظم تمبور کو معلوم ہے کہ تمہارے ہاں فارس سے سردار سرفردش نامی ایک شخص آیا ہوا ہے۔ اُسے فارس سے اس لیے بھیجا گیا ہے کہ وہ اُن اسباب کا کھوج لگائے جن کی وجہ سے تم ہم آسوریوں کو شکست نہیں دے سکتے۔ وہ سردار تین ہفتے پہلے رات کے اندھیرے میں چھپتا چھپاتا تمہارے ہاں پہنچا تھا۔ کیا یہ ٹھیک ہے؟"

بونے ایلچی کے اس سوال پر میں نے اور لالی نے ایک دوسرے کی طرف ذومعانی نگاہوں سے دیکھا... پھر میں نے فصیل سے جھانکتے ہوئے بآوازِ بلند کہا۔

"ہاں... یہ درست ہے۔ میں سردار سرفردش ہوں۔ بولو... تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

بونا ایلچی میری طرف دیکھ کر دوستانہ انداز میں مسکرانے لگا۔ وہ صورت سے ہی مسخرہ لگتا تھا۔

اُس نے گھوڑے کی دُم والا نیزہ لہراتے ہوئے کہا۔ "میں خادِ اعظم تمبور کی طرف سے تمہیں سلام کہتا ہوں، سردار۔ تم ویسے ہی نظر آتے ہو، جیسے ہمارے جاسوسوں نے ہمیں بتایا ہے۔ تم واقعی قوی الجثہ، طاقتور اور بہادر ہو اس لیے میں اُمید کرتا ہوں کہ تم خادِ اعظم تمبور کی پیشکش قبول کر لو گے۔"

"وہ پیشکش کیا ہے مختصراً؟" میں نے پوچھا۔

لالی اور اُس کے ارکانِ سلطنت سرگوشیاں کر رہے تھے۔ شاید اُنھیں میرا یہ عمل ناگوار گزرا تھا۔

"خادِ اعظم تمبور چاہتا ہے کہ تم تنِ تنہا اُس کے ایک سورما سے مقابلہ کرو۔ یہ مقابلہ اسی فصیل کے سامنے کسی منتخب مقام پر ہوگا۔ اگر تم نے خادِ اعظم کے سورما کو شکست دے دی تو خادِ اعظم کا وعدہ ہے کہ وہ محاصرہ اُٹھا کر یہاں سے چلا جائے گا اور پھر کبھی تاغان کا رُخ نہیں کرے گا... لیکن اگر ہمارے سورما نے تمہیں شکست دے دی تو پھر اہلِ تاغان کو اپنی توپ خادِ اعظم تمبور کے

حوالے کرنا پڑے گی"۔

"ٹھہرو . . . میں ابھی تمھیں جواب دیتا ہوں"۔ یہ کہہ کر میں لالی کی طرف پلٹا جو عمائدینِ سلطنت اور لشکری عہدے داروں کے حلقے میں کھڑی تھی۔ وہ لوگ آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔

میں قریب آیا تو آزور نے جرأت سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "یہ پیش کش کیوں نہ قبول کر لی جائے، ملکہ عالیہ؟ سردار سرفروش کسی بھی آسوری کے مقابلے میں ایک دیو کی سی حیثیت کا مالک ہے۔ وہ فنِ حرب کا بھی ماہر ہے اور بڑی آسانی سے اپنے مقابلے پر آنے والے سُورما کو موت کے گھاٹ اُتار سکتا ہے"۔

لالی یہ بات سُن کر برافروختہ ہو گئی اور جھڑکنے کے سے انداز میں اسے ٹھوکا دیتے ہوئے بولی۔ "نہیں۔ میں اس احمقانہ پیش کش کے لیے سردار سرفروش کی جان کا خطرہ مول نہیں لے سکتی۔ اسے فارس سے ایک مشیر کی حیثیت سے بھیجا گیا ہے۔ میں ہمیشہ اسے اپنے ساتھ رکھنا اور اس کے مشوروں سے مستفید ہونا چاہتی ہوں"۔

میرے لیے لوگوں کے دلوں میں پیدا ہونے والے شکوک و شبہات دُور کرنے کا یہ بہترین موقع تھا۔ میں اپنے آپ کو تاغان اور تاغانیوں کا پُرخلوص دوست ثابت کر سکتا تھا لیکن لالی اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایسا نہیں چاہتی تھی۔

"نہیں ملکہ! آسوریوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے یہ ایک بہترین موقع ہے۔ میں شاہ تمبور کے بڑے سے بڑے سُورما کو بڑی آسانی سے خاک چاٹنے پر مجبور کر دوں گا"۔

یہ کہنے کو تو میں نے کہہ دیا . . . مگر میں جانتا تھا کہ میں دیانتداری سے یہ مقابلہ نہیں جیت سکوں گا بلکہ مجھے ایسے داؤ پیچ آزمانے پڑیں گے جو آسوری سُورما نہیں جانتے۔

لالی میری طرف مڑتے ہوئے بولی۔ "تم نہیں جانتے سردار سرفروش کہ تمبور کتنا جھوٹا اور عیار بادشاہ ہے۔ اگر تم نے اُس کے سُورما کو شکست دے دی تو وہ اپنے وعدے پر قائم نہیں رہے گا"۔

یہ سُن کر ایک لشکری عہدے دار جو دُوسروں کی نسبت زیادہ دلیر تھا، ہنس پڑا۔

"اگر سردار سرفروش ہار گیا تو ہم بھی اپنے وعدوں پر قائم رہنے کے لیے مجبور نہیں ہوں گے۔ ہم اُسے توپ نہیں دیں گے"۔ اسی عہدے دار نے کہا۔

تقریباً سارے عہدے داروں نے سر ہلا کر اس بات کی تائید کر دی۔

"لیکن اس کا فائدہ کیا ہو گا؟ سردار سرفروش کی جان مُفت میں چلی جائے گی۔ نہیں میں کسی قیمت پر ایسا نہیں ہونے دُوں گی"۔ لالی نے گرج کر کہا۔

میں سمجھ گیا کہ وہ مجھے اپنی ذات تک محدُود رکھنے کے لیے اس مقابلے کی منظوری نہیں دینا چاہتی۔ اتنے میں فصیل کے نیچے سے گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز آئی . . . اور پھر گھوڑے کی ہنہناہٹ جیسی آواز میں کسی کا جملہ سُنائی دیا۔

"تاغان کے لوگ احمق یا بُزدل ہیں ورنہ میرا بھائی گدھا بھی اتنی دیر سے آدھے وقت میں کسی فیصلے پر پہنچ چکا ہوتا"۔

یہ بات کہنے والا وہی مسخرہ ایلچی تھا جو گھوڑوں کے ہنہنانے جیسی آواز میں بول رہا تھا۔ اس کی اس حرکت پر سب ہنس پڑے اور ماحول کی کشیدگی قدرے کم ہو گئی۔

"میں جانتا ہوں کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ مجھ پر اعتماد کرو، ملکہ اور وہ شرط بھی سُن لو جو میں شاہ تمبور کو پیش کرنے والا ہوں"۔ میں نے کہا۔

میں دوبارہ فصیل کے کنارے پہنچا اور جھانک کر نیچے دیکھا۔ بونے کا خچر اپنی پچھلی ٹانگوں پر کھڑا تھا اور بونا ہنہناہٹ میں رہا تھا . . .

"جلدی کرو سردار سرفروش! میں بھوکا ہوں۔ خادِ اعظم کے اس کام کی وجہ سے مجھے آج گھاس اور دانہ بھی نہیں ملا۔ اور یہ دیو قامت شہسوار میری پیٹھ توڑے دے رہا ہے۔ جلدی کرو"۔

مجھے بونے کی اس حرکت پر ہنسی آ گئی۔

"اپنے خچر کا مُنہ بند کرو تو میں تمھیں کوئی جواب بھی دُوں مختصر خاں"۔

بونے نے خچر کی لگام ڈھیلی کی تو اس نے اگلی ٹانگیں زمین پر رکھ دیں پھر اس نے اپنی ٹوپی چھُو کر مجھے سلام کرتے ہوئے کہا۔ "میں ہمہ تن گوش ہوں، سردار سرفروش"۔

"اپنے بادشاہ کو میرا یہ پیغام پہنچا دو کہ میں اُس کے سُورما سے مقابلہ کروں گا مگر میری بھی ایک شرط ہے۔ اگر میں جیت گیا تو شاہ تمبور اپنی بہن سادیہ کو میرے حوالے کر دے گا۔ جاؤ اور اُس کا جواب لے آؤ کہ اُسے میری شرط منظور ہے"۔

بونے کے چہرے پر حیرت کے تاثرات نمُودار ہوئے۔ اُس کی آنکھوں میں ایک انوکھی چمک اُبھری اور وہ مسکرا کر بولا۔ "اچھی بات ہے سردار سرفروش! میں ابھی جواب لاتا ہوں"۔ اُس نے خچر کو ایڑ لگائی اور اُسے آسوریوں کی خیمہ گاہ کی طرف

اُڑاتا چلا گیا۔

میں نے مقابلے کی یہ شرط جان بُوجھ کر رکھی تھی۔

گزشتہ تین ہفتوں کے دوران میں مجھے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ ملکہ لالی، خادِ اعظم کی بہن سادیہ سے شدید نفرت کرتی ہے۔ اُس کے شوہر شاہ افشار نے محض سادیہ کی وجہ سے غداری کی تھی اور آسوریوں پر شہر پناہ کے دروازے کھول دینا چاہتا تھا۔ ملکہ ہوشی کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ سادیہ کی بوٹیاں نوچ کر چیل کوؤں کو کھلا دیتی۔ میں نے یہ افواہ بھی سُنی تھی کہ خادِ اعظم اور اس کی خوبصورت مگر بے آبرو ہمشیرہ سادیہ کی آپس میں نہیں بنتی۔ گویا میں اگر اُس کے سُورما کو شکست دیتا ہوں تو وہ اپنی بہن سے نجات حاصل کرنے کے لیے بخوشی اسے میرے حوالے کر دے گا اور اپنے آپ کو قول کا دھنی ثابت کرتے ہوئے محاصرہ چھوڑ کر چلا جائے گا۔ دُوسرے ملکہ ہوشی بھی اپنی رقابت کی آگ بجھانے کے لیے مجھے مقابلے سے نہیں روکے گی۔ بصورتِ دیگر وہ مجھے گرفتار بلکہ قتل بھی کروا سکتی تھی۔

میری یہ ترکیب کارگر ثابت ہُوئی اور ملکہ لالی خاموش ہو گئی۔ خادِ اعظم تمبور نے بھی میری شرط منظور کر لی۔

یہ طے پا گیا کہ دُوسرے روز مقابلہ ہو گا۔

یُوں تو ہر شام ملکہ اور میں ایک ہی تالاب میں غُسل کیا کرتے تھے مگر آج وہ تنہا چلی گئی تھی۔ اس لیے مجھے سوچ و بچار کا وقت مل گیا تھا۔ میں دریچے میں کھڑا حالات پر غور کر رہا تھا۔ فضا میں وہی جانی پہچانی خوشبو رچی ہُوئی تھی جس کا منبع ہانیوس کے پھُول تھے۔ یہ پھُول دن رات کھلتے اور خوشبو بکھیرتے رہتے تھے۔

دُور جنوب میں نیلم کے پہاڑوں پر بجلی چمک رہی تھی۔ نیلم کے یہ پہاڑ ان خزانوں میں سے تھے جو ڈاکٹر فریدوں حاصل کرنا چاہتا تھا۔ مگر میں ابھی تک یہ پہاڑ نہیں دیکھ پایا تھا۔ آسوریوں اور تاغانیوں کی یہ جنگ ختم ہوتی تو میں کہیں آ جا بھی سکتا تھا . . . پھر مجھے خیال آیا کہ سُورج غرُوب ہوئے کافی دیر ہو چکی ہے لیکن ملکہ ہوشی ابھی تک واپس نہیں آئی۔

کہیں وہ میرے خلاف کوئی سازش تو نہیں کر رہی؟

میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر بستر کا گدا اُٹھایا، وہ خنجر موجُود تھا جو پہلے روز مجھے ملکہ ہوشی سے حاصل ہُوا تھا اور میں نے اسے بستر کے نیچے چھپا دیا تھا۔ بس یہی واحد ہتھیار میری ملکیت تھا۔ اگر لالی کے سپاہیوں کا دستہ مجھے گھیر لیتا تو میں اس خنجر کی مدد سے دو چار سپاہیوں کو تو ڈھیر کر ہی سکتا تھا لیکن خود موت سے نہیں بچ سکتا تھا . . . پھر بھی میں نے احتیاطاً اسے چھپا لیا تھا کہ کچھ نہ ہونے سے تھوڑا ہونا بھی بہتر ہی ہوتا ہے۔

میں اب ملکہ ہوشی سے خوف زدہ تو نہیں تھا لیکن اُس کے ایک اقدام نے مجھے چوکنا ضرور کر دیا تھا۔ دو ہفتے پہلے مجھ سے وہی غلطی ہو گئی تھی جو مَردوں کی فطرت کا خاصہ ہوتی ہے۔ ملکہ کی ایک نوشباب کنیز میری طرف دیکھ کر مسکرائی تو جواباً میں بھی مسکرا دیا تھا۔ اگرچہ ملکہ اس وقت وہاں موجُود نہیں تھی۔ پھر بھی دُوسرے روز میں نے اُس کنیز کا بُریدہ سر اپنی خواب گاہ کے ایک کونے میں رکھا ہُوا دیکھا تھا۔ تبھی سے میں کچھ محتاط ہو گیا تھا۔

ملکہ نے مجھ سے اس سلسلے میں ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا لیکن میں اُس کے جذبۂ رقابت کو ایک پل کے لیے بھی فراموش نہیں کر سکتا تھا۔ اسی لیے مجھے یہ خیال آیا تھا کہ کہیں وہ اس غلط فہمی میں تو مُبتلا نہیں ہو گئی کہ میں سادیہ کو اپنے لیے حاصل کرنا چاہتا ہوں؟

یہ غلط فہمی اُسے میرے قتل پر بھی اُکسا سکتی تھی۔

میں انھی سوچوں میں ڈُوبا ہُوا تھا کہ وہ آ گئی۔

آج اُس نے سولہ سنگار کیے ہُوئے تھے۔ وہ آتے ہی میرے گلے کا ہار بن گئی۔ کچھ دیر میری دھڑکنیں سُنتی رہی پھر میرا چہرہ دونوں ہاتھوں کے کشکول میں تھام کر غم ناک نگاہوں سے دیکھتے ہُوئے بولی۔ "میرا جی تو نہیں چاہتا تھا مگر میں تمھیں مقابلے کی منظوری دینے پر مجبور ہو گئی تھی۔ جانتے ہو، مجھے یہاں آنے میں دیر کیوں ہُوئی ہے؟"

"نہیں لالی"۔ میں نے لہجے میں بے پناہ پیار سمو لیا۔

"میں اپنے جاسُوسوں سے معلومات حاصل کر رہی تھی۔ جس طرح شاہ تمبور نے ہمارے ہاں اپنے جاسُوس چھوڑ رکھے ہیں، اُسی طرح شاہ تمبور کی صفوں میں میرے بھی بہت سے جاسوس کام کر رہے ہیں۔ اُنھوں نے مجھے بتایا ہے کہ شاہ تمبور نے اپنی بہن سادیہ کو ایک خیمے میں محبوس کر رکھا ہے اور اس پر کڑا پہرہ لگا دیا ہے۔ پہرے داروں کو بتا دیا گیا ہے کہ اگر سادیہ فرار ہو گئی تو ان سب کی گردنیں اُڑا دی جائیں گی۔ اس لیے سادیہ کو اپنے بھائی پر بے انتہا غصہ ہے۔ یاد رکھو! سرفروش! تمھیں ہر حال میں کل کا مقابلہ جیتنا ہے اور اگر تم اپنے مدِمقابل کو شکست نہ دے سکو تو اپنی جان دے دینا مگر آسوریوں کے قیدی نہ بننا۔ میں نے تمھیں دل کی گہرائیوں سے چاہا ہے اس لیے فصیل کے سامنے تمھارے جسم کے ٹکڑے ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔ وہ وحشی تمھارے ساتھ ایسا ہی سلوک کریں گے"۔

میں نے اُسے دلاسا دیتے ہُوئے کہا۔ "گھبراؤ نہیں لالی۔ میں اپنے مدِمقابل کو شکست دے کر سادیہ کو تمھارے قدموں میں ڈال دُوں گا تاکہ تم اپنے دل کی بھڑاس نکال سکو اور آسوری بھی یہاں

سے دفعان ہو جائیں۔"

"میں جانتی ہوں کہ تم بہت مضبوط اور طاقت ور ہو لیکن آسوری بڑے وحشی اور عیار ہیں اگر تم ان کے قیدی بن گئے تو سادیہ اپنی توہین کا انتقام لینے کے لیے تمھیں بطور غلام مانگ لے گی اور تمھارے ساتھ وہی سلوک کرے گی جو میں اُس کے ساتھ کرنا چاہتی ہوں۔"

"تم اُس کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہتی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے دو پنجرے بنوائے ہیں۔" لالی نے مسکرا کر کہا۔۔۔ "ایک سادیہ کے لیے ہے اور دُوسرے میں وہ گوریلے بند ہیں جنھیں ہم پکڑ لائے ہیں۔ میں سادیہ کو پنجرے میں بند کر دُوں گی تاکہ وہ گوریلوں کو اور بھُو کے گوریلے سادیہ کو دیکھتے رہیں۔۔۔ پھر جب میں سادیہ کو جی بھر کے ایذا پہنچاؤں گی تو اُسے بھُوکے گوریلوں کے حوالے کر دُوں گی۔"

میں نے لالی کی اس بات پر آنکھیں بھینچ لیں اور سوچا کہ یہ نرم و نازک سی عورت اندر سے کتنی بے رحم اور سفاک ہے۔

لالی نے مجھے خاموش اور آنکھیں موندے دیکھا تو بولی۔ "کیا سوچ رہے ہو، سرفروش؟"

"بس یہ سوچ رہا ہوں کہ تمھاری ایذا رسانی کے بعد بھُوکے گوریلوں کے لیے کیا بچے گا؟"

ملکہ لالی نے قہقہہ لگایا اور بولی: "تم اس کی فکر نہ کرو۔ بھُوکے گوریلے ہڈیاں تک چبا جاتے ہیں۔"

تھوڑی ہی دیر بعد اس نے ثابت کرنا شروع کر دیا کہ وہ خود بھی کسی گوریلے سے کم نہیں ہے۔

اگلی صبح جب میں گھوڑے پر سوار شہر پناہ کے پھاٹک سے باہر آیا تو میدان میں دھول اُڑ رہی تھی۔ فصیل پر تاغان کے ہزاروں سپاہی میرا اور شاہ تمبور کے سُورما کا مقابلہ دیکھنے کے لیے بے تاب کھڑے تھے۔

ملکہ لالی شہر پناہ کے سب سے بڑے بُرج میں شاہی تخت پر بیٹھی تھی اور اُس کے ارکانِ سلطنت دست بستہ اس کے گرد کھڑے تھے۔ اس وقت میں سب کی نگاہوں کا مرکز بنا ہُوا تھا۔

میں نے آسوریوں کی خیمہ گاہ کی طرف دیکھا۔

خیموں کے آگے ہزاروں آسوری قطاروں میں کھڑے تھے قطاروں کے آگے ایک بڑا سیاہ خیمہ نصب تھا جس کے باہر ایک چوبی چبوترے پر شاہ تمبور بڑی تمکنت سے براجمان تھا۔ اس کے گرد لشکری عہدے دار باادب کھڑے تھے۔

میں نے اپنا گھوڑا اس نیزے کے قریب روک دیا جو حدِ فاصل کے طور پر زمین میں گاڑ دیا گیا تھا اور جس کے بالائی حصّے پر گھوڑے کی دُم لہرا رہی تھی۔ آج صبح بونے ایلچی کے ساتھ جو تفصیل طے پائی تھی اس کے مطابق مجھے وہیں رُکنا تھا۔

معاً مجھے بونے ایلچی کی ایک بات یاد آگئی۔

اُس نے جاتے جاتے کہا تھا: "میدان پر نگاہ رکھنا سردار سرفروش! زمین سے خبردار رہنا۔"

اُس کی یہ بات نہ اُس وقت میری سمجھ میں آئی تھی اور نہ ہی اب واضح ہو رہی تھی۔ اگر یہ انتباہ تھا تو اس کا مطلب میری سمجھ سے بالاتر تھا۔ تاہم میں نے ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی اور میدان کو غور سے دیکھا مگر مجھے سپاٹ ہموار زمین اور اس پر بھُوری ریت اور چھوٹے چھوٹے کنکروں کے علاوہ کوئی بھی چیز دکھائی نہیں دی۔

اتنے میں مجھے آسوریوں کی خیمہ گاہ سے ایک شہسوار آتا دکھائی دیا۔ میں نے اپنا زنجیر دار گرز گھما کر اپنے اعضا گرم کیے۔ یہ زنجیر دار گرز میں نے کل ہی تاغان کے آہن گروں سے تیار کروایا تھا۔ چھوٹے سے چوبی دستے کے بعد ایک مضبوط آہنی زنجیر منسلک کر دی گئی تھی جس کے دُوسرے سِرے پر آہنی گولہ تھا اور اس گولے میں نیلم کی اَنی جیسی تیز دھار کرچیاں جڑ دی گئی تھیں۔ اس کے علاوہ میرے پاس ایک تلوار، ایک چوکور ڈھال اور وہی لالی والا خنجر تھا جسے میں نے اپنی پیٹی میں اُڑس رکھا تھا۔

اسی دوران آسوری سُورما قریب آکر میرے اردگرد چکر کاٹنے لگا۔ میں نے اپنے گھوڑے کو کھڑے کھڑے گھمانا شروع کیا تاکہ اپنے مدِّمقابل پر نظر رکھ سکوں۔ میں چاہتا تھا کہ حملے میں پہل وہی کرے اور میں اُس کے وار خالی دے کر اسے تھکا دُوں لیکن آسوری سُورما بھی عجلت میں اوچھا وار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ مجھ سے بیس گز کے فاصلے پر دائرے میں گھُومتا اور اپنے مُنہ سے عجیب عجیب آوازیں نکالتا رہا پھر اُس نے اچانک اپنے پستہ قد گھوڑے کی لگام کھینچی تو وہ [illegible] ہو گیا۔

"میرا نام پارس ہے۔ میں آسوری سُورماؤں کا سرخیل ہوں اور [illegible] خادمِ اعظم کے لیے تمھیں قتل کرنے آیا ہوں۔" اتنا کہہ کر وہ نگاہوں [illegible] مجھے تولنے لگا۔

وہ قد و قامت میں مجھ سے بہت چھوٹا تھا مگر اُس کے [illegible] بے حد مضبوط تھے۔ اُس نے مرزِطی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ چھاتی پر چرمی سینہ بند تھا۔ اُس کا نچلا لبادہ بھی چرمی تھا اور اُس نے گھٹنوں [illegible] موٹی کھال چڑھا رکھی تھی۔ چند لمحوں تک ہم ایک دُوسرے کو نگاہوں ہی نگاہوں میں تولتے رہے۔۔۔ پھر میں نے کہا۔۔۔

"اگر تم مجھے قتل کرنے آئے ہو تو آگے بڑھو اور حملہ کرو۔ تمھا[illegible] بادشاہ بے چین ہو گا۔"

یہ سُن کر آسوری سُورما نے اپنے سُدھائے ہُوئے گھوڑے کی لگام کھینچی تو وہ اُچھلنے کُودنے اور کلیلیں کرنے لگا جب کہ پارس نے کندھے سے کمان اُتاری اور چلّے پر تیر چڑھانے لگا۔

میں نے اپنی ڈھال مضبوطی سے تھام لی۔

میں چاہتا تھا کہ جب وہ تیر چلا چُکے تو اُس پر چڑھ دوڑوں۔ میرا گھوڑا اُس کے پستہ قامت گھوڑے سے بھاری بھر کم اور نسبتاً طاقتور تھا۔ اس کے تصادم سے پارس اور اُس کا گھوڑا دونوں زمین بوس ہو جاتے اور جب پارس گھوڑے کی پیٹھ سے محروم ہو جاتا تو میرا گرز اُس کا کام تمام کرنے کے لیے کافی تھا۔

پارس نے نعرہ لگایا اور ایک ادائے بے نیازی سے چلّا کھینچا۔ میں نے ڈھال کی آڑ لے رکھی تھی مگر اُس نے مجھے نشانہ بناتے وقت پلٹ کر تیر میرے گھوڑے پر چلا دیا جو اُس کے جھول میں اٹک گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ جو کچھ میں اُس کے لیے سوچ رہا تھا، وہی وہ میرے لیے بھی سوچ چکا تھا اور پہلے ہی وار میں مجھے پیادہ دیکھنا چاہتا تھا۔

نشانہ خطا ہو جانے کے بعد اُس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور تیزی سے میرے گِرد گھوڑا دوڑانے لگا۔

وہ بلا کا شہسوار تھا۔

کبھی گھوڑے کے ایک جانب جھک کر غائب ہو جاتا اور کبھی ایک رکاب پر کھڑے ہو کر تیر چلا دیتا تھا۔

میں نے بھی اپنے گھوڑے کو مسلسل ایک ہی مقام پر گردش میں رکھا۔ ایک بار اُس نے رکاب سے لٹک کر اپنے گھوڑے کے پیٹ کے نیچے سے تیر چلایا جو میرے گھوڑے کے ٹخنے کو چھُوتا ہُوا زمین میں گڑ گیا۔

میرا گھوڑا بدکا اور الف ہو گیا مگر میں نے اسے سنبھال لیا۔ تھپکی دی تو وہ پُرسکون ہو گیا۔

میرا مدِّمقابل اپنا ہر وار خالی جاتے دیکھ کر کچھ پریشان ہو گیا۔ اُس نے تیر چلانے بند کر دیے اور خالی چکر کاٹنے لگا۔

میں نے اپنا گرز گھماتے ہُوئے اسے للکارا۔

"تم نے اپنا نام پارس بتایا تھا۔ کیا تمھاری زبان میں پارس بُزدل کو کہتے ہیں؟"

یہ سُن کر اُس نے ایک نعرہ لگایا اور گھوڑا دوڑاتا ہُوا خیمہ گاہ کی طرف چلا گیا۔ میں وہیں رُکا اُسے دیکھتا رہا۔ وہ ایک نیزہ اور ڈھال لے کر پلٹا اور دور ہی سے نیزہ تول کر برق رفتاری سے میری طرف بڑھا۔ وہ جیسے ہی میرے قریب آیا، میں نے اپنا گھوڑا ذرا سا موڑ کر اُس کا نیزہ اپنی ڈھال پر روک لیا اور اس کے ساتھ ہی گرز اُس کے سر پر مارا۔۔۔ لیکن اُس نے چشم زدن میں سر جھُکا کر میرا وار خالی کر دیا اور آگے بڑھ گیا۔

کچھ دُور جا کر وہ پلٹا اور نیزہ تول کر پھر برق رفتاری سے میری طرف بڑھنے لگا۔

اس بار میں نے گرز استعمال کرنے کی بجائے دُوسری چال چلی۔ جُونہی وہ میرے قریب آیا، میں نے گھوڑے کو ایڑ لگا کر اچانک اُس پر یلغار کر دی۔ وہ اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ نتیجتاً وہ نہ تو اپنے گھوڑے کو روک سکا اور نہ ہی اُسے روکنے میں کامیاب ہُوا۔ یُوں ہمارے گھوڑے ایک دُوسرے سے ٹکرا گئے۔

اس تصادم سے اُس کا گھوڑا لڑکھڑایا۔۔۔ مگر اُس کے گرنے سے پہلے ہی پارس نے اسے سنبھال لیا۔ اب اُس نے بھی غیر متوقع چال چلی۔ گھوڑے کو آگے لے جانے کی بجائے اس نے اُسے وہیں سے موڑا اور نیزے کی اَنی میرے جسم میں اُتار دینا چاہی لیکن میں نے اُسے ڈھال پر روک لیا۔

پیشتر اس کے کہ میں اُس پر گرز سے وار کرتا، اُس نے دُوسرے ہاتھ سے مجھ پر تلوار کی ضرب لگائی۔ میں بھی غافل نہیں تھا۔ اُس کی تلوار میری ڈھال سے ٹکرا کر رہ گئی۔ اسی دوران میں نے اپنا خالی ہاتھ بڑھا کر اُسے اپنی طرف گھسیٹنا چاہا مگر اس سے پہلے کہ میرا ہاتھ اُس کی گردن تک پہنچتا، وہ غوطہ کھا کر گھوڑے کی دُوسری جانب غائب ہو چکا تھا۔ پھر وہ گھوڑا دوڑاتا اپنی صفوں کی طرف نکل گیا۔

پارس اور اُس کا گھوڑا دونوں سیماب صفت تھے۔ انھوں نے میری ساری ترکیبیں ناکام بنا دی تھیں۔

اب تک میں نے آسوری سُورما کو حملے میں پہل کرنے دی تھی۔ میرا خیال تھا کہ میں اُسے تھکا کر اور اُس کے حملے کی نوعیت کا اندازہ کر کے اُس پر غالب آ جاؤں گا مگر یہ خیال دُرست ثابت نہ ہُوا۔ میں اُس کے تابڑ توڑ حملوں سے پسینے میں شرابور ہو چکا تھا۔

میں نے اس کی تلاش میں نگاہ دوڑائی تو دیکھا کہ وہ زمین میں گڑے ہُوئے بھالوں میں سے ایک بھالا منتخب کر رہا ہے۔

میں سمجھ گیا کہ اس طرح وہ دم لینا چاہتا ہے۔ میں نے اپنے گھوڑے کو تھپکی دی اور پارس کے پلٹنے کا انتظار کرنے لگا۔ جب وہ بھالا لہراتا اور گھوڑا دوڑاتا ہُوا میری طرف آنے لگا تو میں نے بھی اپنا گھوڑا اُس کی جانب دوڑا دیا۔

اب میں پہل کرنا چاہتا تھا اور ایک بار پھر اپنا گھوڑا اُس کے گھوڑے پر چڑھانے والی ترکیب آزمانا چاہتا تھا۔ میں نے پارس کو

چوٹ دینے کے لیے گرز گھمانا شروع کیا تو اس نے ڈھال سنبھال لی اور بھالا بھی تان لیا۔ مگر میں نے ڈھال کی آڑ لیتے ہوئے پوری رفتار سے اپنا گھوڑا اُس کے گھوڑے سے ٹکرا دیا۔

میری توقع کے عین مطابق پارس کا گھوڑا اس ٹکر کی تاب نہ لا کر گرا تو فصیل سے نعرہ ہائے تحسین بلند ہوئے اور آسوریوں کی صفوں میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی لیکن یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ پارس گھوڑوں کی ٹکر سے قبل ہی کود گیا تھا۔ اس نے پہلے سے اندازہ کر لیا تھا کہ میں کیا کرنے والا ہوں، اس لیے اُس نے مجھ پر بھالے سے حملہ کرنے کی بجائے گھوڑوں کے تصادم سے قبل ہی چھلانگ لگا دی تھی اور اب اپنی صفوں کی طرف دوڑ رہا تھا۔

میں نے اُسے گھیرنے کے لیے گھوڑا دوڑایا اور آسوریوں کے قریب پہنچ گیا لیکن نہ تو اُنھوں نے مجھ پر تیر برسائے اور نہ ہی نیزے یا بھالے پھینکے... بلکہ خاموشی سے تماشا دیکھتے رہے۔

مجھ پر خون سوار ہو گیا۔

میں اپنے مدِمقابل کو جلد از جلد موت کے گھاٹ اتار دینا چاہتا تھا جو غچے دیتا ہوا میرے آگے، دائیں بائیں بھاگ رہا تھا۔ وہ کبھی پیچھے پلٹتا اور کبھی آگے بڑھتا.. مگر ہر بار میرے گرز کی زد سے نکل جاتا تھا۔

میں جھنجلا گیا۔

میں نے اپنا خود سر سے اُتار کر پھینک دیا تاکہ اُسے آسانی سے نگاہ میں رکھ سکوں۔ اتنے میں پارس جو مجھ سے تقریباً پچاس قدم آگے نکل گیا تھا، ایک جگہ رُک گیا۔

اس نے اپنا بھالا زمین میں گاڑا، ایک گھٹنا زمین پر ٹیکا اور چلّے پر تیر چڑھانے لگا۔

میں نے گھوڑا روک لیا۔

اگر میں آگے بڑھتا تو تیر کھا کر میرے گھوڑے کا بھی وہی حشر ہوتا جو پارس کے گھوڑے کا ہوا تھا۔ مجھے گھوڑے کی اتنی فکر نہیں تھی جتنا کہ خود اپنا خیال تھا اگر میں گھوڑے سے گرتا تو مجھے سر میں چوٹ آنا یقینی تھا کیونکہ وہاں زمین بھی پتھریلی تھی اور ارد گرد بھی پتھر پھیلے ہوئے تھے۔

پارس نے مجھے گھوڑے کی باگیں کھینچتے دیکھ کر نفرت سے میری طرف تھوکا اور بولا "تف ہے تجھ پر۔ تمھارے پاس گھوڑا ہے اور میں پیدل ہوں۔ پھر بھی تم ڈر رہے ہو۔ آگے بڑھ کر مجھے ختم کیوں نہیں کرتے بزدل؟"

میں سمجھ گیا کہ وہ مجھے اشتعال دلا کر اپنے نشانے کی زد میں لانا چاہتا ہے۔

"گھبراؤ نہیں پارس! میں تمھیں ضرور ختم کروں گا۔ دراصل میں سوچ رہا تھا کہ تمھیں کس طرح موت کے گھاٹ اُتاروں کہ دیکھنے والوں کو بھی مزا آ جائے!"

وہ ہنس پڑا "تو پھر ٹھیک ہے جب تک چاہو سوچو۔ مجھے بھی مرنے کی جلدی نہیں ہے۔"

میں نے گھوڑا کچھ آگے بڑھایا تاکہ یہ دیکھ سکوں کہ اُس کے ترکش میں کتنے تیر باقی رہ گئے ہیں اور پھر میں نے اس کے باقی تیر گن لیے۔ وہ صرف تین تھے۔ میں نے سوچا کہ خطرہ مول لینے میں کوئی حرج نہیں۔ اگر میں گھوڑے سے اُتر کر اُسے موت کے گھاٹ اُتاروں گا تو سب کے دلوں پر میری دھاک بیٹھ جائے گی.. پھر شہنشاہ مرزوانگی بھی یہی ہے کہ مقابلہ برابر کا ہو۔ ممکن ہے، میرا یہ بہادرانہ اقدام آگے چل کر شاہ بمتور سے معاملات طے کرنے میں کوئی اہم کردار ادا کرے۔

یہ سوچ کر میں گھوڑے سے اُتر گیا۔

میں نے گھوڑے کو تھپکی دے کر ایک طرف ہانک دیا اور آہستہ آہستہ پارس کی طرف بڑھنے لگا جو تیر کمان میں ڈالے، چلّا کھینچے بیٹھا تھا کہ جونہی میں اس کی زد میں آؤں تو وہ تیر چلا دے۔

میں گرز گھماتا ہوا قدم قدم آگے بڑھتا رہا۔

جب میرے اور اُس کے درمیان صرف بیس قدم کا فاصلہ رہ گیا تو اُس نے تیر چلا دیا۔

"ٹھک" کی آواز کے ساتھ میری سپر نے سنسناتا ہوا تیر روک لیا جو بصورتِ دیگر میری گردن میں پیوست ہو جاتا۔ میں نے تیر ڈھال سے نکال کر ایک طرف پھینکتے ہوئے کہا "اب تمھارے پاس صرف دو تیر باقی رہ گئے ہیں، پارس!"

"تمھاری موت کے لیے صرف ایک ہی کافی ہو گا سردار سرفرش!" اُس نے جواب دیا اور دوسرا تیر چلّے پر چڑھانے لگا۔

میں ڈھال تولے اور گرز گھماتے ہوئے بڑی احتیاط سے قدم قدم آگے بڑھنے لگا۔

"مجھے خوشی ہے کہ میرا مقابلہ ایک مرد سے ہوا ہے۔ تم نے گھوڑے سے اُتر کر ثابت کر دیا ہے کہ بہادروں کی طرح مقابلہ کرنا جانتے ہو۔ نسخے تاغانی ایسا ہرگز نہیں کر سکتے۔"

میں نے اُسے کوئی جواب نہ دیا۔

میں قدم قدم آگے بڑھتا رہا۔

"تم شکل و صورت سے تاغانی نہیں لگتے.. پھر ان مہذب

بے وقوفوں کے ساتھ کیوں مِل گئے ہو۔ تمھیں تو ہم آسوریوں کے ساتھ ہونا چاہیے، اجنبی۔ تم اپنی داڑھی کی وجہ سے بھی آسوری لگتے ہو حالانکہ آسوریوں میں تم جیسے لمبے چوڑے آدمی نہیں ہوتے۔"

... اور اچانک ہی اُس نے تیر چھوڑ دیا جس کی مجھے توقع نہیں تھی کیونکہ اُس نے نشانہ نہیں لیا تھا۔ وہ تیر چھیلتا ہوا میری ران زخمی کر گیا۔ درد کی تیز لہر نے مجھے تڑپا دیا... مگر میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا "اب صرف ایک تیر رہ گیا ہے، پارس!"

اُس نے وحشیانہ قہقہہ لگاتے اور نفرت سے تھوکتے ہوئے جواب دیا: "وہی ایک تیر تمھاری موت کا پیغام بھی بن سکتا ہے سردار سرفرش! یا ہو سکتا ہے کہ بھوری مٹی میرے ہی خون سے اپنی پیاس بجھانا چاہتی ہو۔"

اب ہمارے درمیان صرف دس قدم کا فاصلہ رہ گیا تھا۔

پارس نے تیسرا تیر بھی چلّے پر چڑھایا اور بغیر کچھ کہے یا بغیر انتظار کیے اُسے بھی چھوڑ دیا۔ اس بار اُس نے میرے اُس حصّۂ جسم کا نشانہ لیا تھا جہاں زرہ بکتر کے تسموں کے درمیان ذرا سی جگہ خالی رہ گئی تھی.. مگر میری سپر نے بروقت اسے ڈھانپ لیا۔ اس کے ساتھ ہی پارس نے دھاڑتے ہوئے مجھ پر یلغار کر دی۔

میں نے ڈھال پھینک دی اور پھرتی سے ایک جانب ہٹ کر تلوار نکال لی۔ اب میرے دائیں ہاتھ میں زنجیر والا گرز اور بائیں میں تلوار تھی۔

اُس نے پلٹ کر مجھ پر تلوار سے وار کیا۔ میں نے اُسے تلوار سے روکتے ہوئے گرز چلایا لیکن وہ پینترا بدل کر اُس کی زد سے بچ گیا۔

میں نے آسوریوں کو اپنی گردنیں کٹواتے دیکھا تھا اور جانتا تھا کہ وہ کس طرح مردانہ وار اپنے سر مقتل کے چبوترے پر رکھتے تھے۔ اس لیے مجھے پارس کے بھاگنے کا کوئی خدشہ نہیں تھا۔ اُسے یا تو مجھے مارنا تھا یا پھر میرے ہاتھوں مر جانا تھا۔

اُس نے ایک بار پھر مجھ پر اندھا دھند حملہ کر دیا۔ ہماری تلواریں آپس میں ٹکرائیں اور ایک دوسرے کی روک بن گئیں۔ پارس نے اپنی تلوار پر اتنا دباؤ ڈالا کہ مجھے گرز چلانے کی مہلت ہی نہ مل سکی۔ اس کا دباؤ لحظہ لحظہ بڑھتا جا رہا تھا۔

میں نے اچانک اُس کے سینے پر لات ماری تو وہ لڑکھڑاتا ہوا دُور جا گرا۔

میں نے گرز گھما کر اسے نشانہ بنانا چاہا مگر وہ میرے پہنچنے سے پہلے ہی اُٹھ کھڑا ہوا اور پینترا بدل کر مجھ پر حملہ آور ہو گیا۔

اب وہ بھی ہانپ رہا تھا اور مجھے بھی تھکن محسوس ہونے لگی تھی۔ گرز اپنے وزن سے دُگنا بھاری لگ رہا تھا مگر ہم دونوں میں کسی کی ڈھیل اُس کی موت بن سکتی تھی۔ ہم سر دھڑ کی بازی لگائے ایک دوسرے سے شمشیر زنی میں مصروف تھے۔

"تم دلیر ہو، سردار سرفرش... مگر میں برفانی علاقوں میں تم سے کہیں زیادہ جسامت رکھنے والوں کو تہِ تیغ کر چکا ہوں!" یہ کہتے ہوئے اُس نے بائیں ہاتھ سے کمر کی پیٹی سے خنجر بھی نکال لیا۔

میں سمجھ گیا کہ وہ تلوار سے لڑتے ہوئے قریب ہونا اور مجھے خنجر گھونپنا چاہتا ہے۔ اس کی یہ چال بے حد خطرناک تھی کیونکہ میرے دائیں ہاتھ میں گرز تھا اور بائیں ہاتھ میں تلوار تھی۔ وہ گرز کی زد میں آ ہی نہیں رہا تھا اور کسی بھی وقت مجھے کائی دے کر خنجر گھونپ سکتا تھا۔ میں نے اپنی پوری قوت مجتمع کر کے گرز گھمانا شروع کر دیا اور پھر ایک دم پیچھے ہٹا تو وہ گرز کی زد میں آ ہی گیا۔

گرز نے اُس کے گھٹنوں کی ہڈیاں توڑ دیں۔

وہ درد کے مارے چیختا ہوا پیٹھ کے بل گرا۔ میں اس کی طرف لپکا تو پارس نے اس حال میں بھی تلوار سے اپنا دفاع کرنا چاہا مگر میری تلوار اُس کے نرخرے میں اُتر گئی اور بھوری ریت اُس کے گلے سے اُبلنے والے خون سے اپنی پیاس بجھانے لگی۔

میں نے اپنے مدِمقابل کو خاک و خون میں ڈوبے دیکھ کر جوشِ مسرت سے فتح کا نعرہ لگایا جو فصیل پر بلند ہونے والے نعرہ ہائے تحسین میں مدغم ہو گیا۔ شہر پناہ پر تاغانی مارے خوشی کے تالیاں بجا رہے تھے، نعرے لگا رہے تھے اور ادھر آسوریوں پر مُردنی اور خاموشی چھا گئی تھی۔

میں نے سیٹی بجا کر اپنے گھوڑے کو بلایا جو قریب ہی بھوری مٹی میں اُگنے والی زرد زرد گھاس پر منہ مار رہا تھا۔ شاید اُسے بھی میری فتح یابی کا احساس ہو گیا تھا اس لیے وہ بھی ہنہناتا اور کلیلیں کرتا میرے پاس آ گیا۔ جب میں اُس پر سوار ہونے لگا تو مجھے بوڑھے ایلچی کی ایک اور بات یاد آ گئی۔ آج صبح مقابلے کی تفصیل طے کرتے ہوئے اُس نے کہا تھا کہ اگر میری قسمت یاوری کرے اور میں آسوری سُورما پر غالب آ جاؤں تو اپنی جیت کا بھرپور فائدہ اُٹھاؤں کہ آسوری بہادروں کی قدر کرتے ہیں۔ یہی بات مجھے آزر نے بھی بتائی تھی... مگر یہ بھی کہا تھا کہ وحشی آسوری صرف طاقت کی زبان سمجھتے ہیں۔

جب میں گھوڑے پر سوار ہو کر آسوریوں کی طرف جانے لگا تو مجھے احساس ہوا کہ مقابلہ آسوریوں اور فصیل کے درمیانی حصّے میں شروع ہوا

لیکن اس کا اختتام آسوریوں کی صف سے تقریباً سو قدم دُور ہُوا تھا۔

مَیں نے ایک نظر شاہ تمبور کی طرف دیکھا جو چوبی تخت پر بیٹھا اپنے سُورما کی لاش تک رہا تھا۔ مَیں نے سوچا کہ مجھے اُس سے کن الفاظ اور کس پیرائے میں بات کرنا چاہیے کہ وہ جرأت و بہادری کے ساتھ ساتھ میری خود اعتمادی کا بھی قائل ہو جائے۔ ادھر جاتے ہوئے مَیں نے اپنے ذہن میں ایک مختصر سی تقریر تیار کی...

"اے دھرتی ہلا دینے والے خادِ اعظم تمبور، تم نے بچشمِ خود دیکھ لیا کہ مَیں نے تمھارے سورماؤں کے سرخیل کو شکست دی ہے۔ اب معاہدے کے مطابق سادیہ میرے حوالے کر دو اور کل کا سُورج طلوع ہونے سے پہلے پہلے اپنا لاؤ لشکر اُٹھا کر..."

ابھی مَیں اپنے ذہن میں تقریر کے اتنے ہی الفاظ دُہرا پایا تھا کہ اچانک میرے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور مَیں سر کے بل پتھریلی زمین پر گر گیا۔ ہُوا یہ کہ مَیں فتح کے زعم میں گردن اکڑائے اور گھوڑے کی لگام کھینچے آگے بڑھتے ہوئے شاہ تمبور کو دیکھ رہا تھا اور اس جال پر میری نظر نہیں پڑ سکی تھی جسے آسوریوں نے راستے میں بچھا رکھا تھا۔ اُنھوں نے گڑھا کھود کر اسے کھالوں اور مٹی سے ڈھک دیا تھا۔ تب مجھے بونے ایلچی کا انتباہ یاد آیا کہ زمین کا خیال رکھنا... مگر اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ میرا سر ایک پتھر سے ٹکرایا اور ہر شے دُھند میں گم ہوتی چلی گئی۔

جب مجھے ہوش آیا اور مَیں نے آنکھیں کھولیں تو ہر طرف اندھیرا تھا۔ میرے ہاتھ پاؤں میں مضبوط زنجیریں ڈال دی گئی تھیں۔ دائیں اَبرو کے اوپر ایک سخت اُبھار پیدا ہو گیا تھا اور بائیں ٹانگ میں درد کی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔

میری آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کی عادی ہُوئیں تو پتہ چلا کہ مَیں ایک سیاہ خیمے میں، گھوڑے کے بالوں سے بنے ہُوئے نمدے پر لیٹا ہُوا ہُوں۔

حواس پُوری طرح بحال ہُوئے تو مجھے ساری باتیں یاد آگئیں اور پھر باہر سے لوگوں کی آوازیں بھی سُنائی دینے لگیں۔ کہیں دُور سے موسیقی اور گانے کی صدا بھی آ رہی تھی جس میں لوگوں کا شور بھی شامل تھا۔ ہَوا کی سائیں سائیں بتا رہی تھی کہ وہ تیزی سے چل رہی ہے۔ مَیں سمجھ گیا کہ جس خیمے میں مجھے قید کیا گیا ہے، وہ آسوریوں کی خیمہ گاہ کے درمیان واقع ہے۔

یکایک خیمے کے دروازے کا پردہ ہٹا تو چاندنی کی ہلکی سی جھلک دکھائی دی مگر دُوسرے ہی لمحے خیمہ پھر تاریکی میں ڈوب گیا۔ پردہ ہٹا کر کوئی خیمے میں داخل ہُوا تھا۔

مَیں جلدی سے اُٹھ بیٹھا۔

اُٹھنے سے زنجیریں جھنجھنا اُٹھیں۔

"کون ہے؟" مَیں نے پوچھا۔

کوئی جواب نہ ملا تو مَیں نے پھر اپنا سوال دُہرایا۔

اندھیرے میں کسی کی چاپ سُنائی دے رہی تھی مگر آنے والا خاموش تھا۔ میرے دل میں اُمید کی ایک کرن چمکی کہ آنے والا میرا دوست ہی ہو سکتا ہے، دُشمن نہیں کیونکہ دُشمن کو خاموشی اختیار کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اتنے میں چقماق رگڑنے کی آواز آئی اور ایک دیا روشن ہو گیا۔

دیا جلانے والا وہی بونا ایلچی تھا۔

"اوہ... تو تم ہو خادِ اعظم۔ مَیں تمھارے انتباہ کا مطلب نہیں سمجھ سکا تھا ورنہ یُوں زنجیروں میں نہ جکڑا ہوتا۔ براہِ کرم آیندہ مجھ سے پہیلیوں میں باتیں نہ کرنا۔"

بونا یہ سُن کر جلدی سے میرے قریب آیا اور اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ دیے کی مدھم روشنی میں مجھے اس کی آنکھوں میں خوف و دہشت کے سائے لرزتے نظر آگئے... مگر یہ عجیب بات تھی کہ وہ اس عالم میں بھی مسکرائے جا رہا تھا۔ پھر وہ فوراً ہی خیمے سے نکل گیا۔

میری سمجھ میں نہ آسکا کہ یہ کیا چکر ہے؟

چند لمحوں کے بعد بونا واپس آیا اور میری دسترس سے باہر بیٹھ کر سرگوشی میں بولا: "شکر ہے کہ تمھاری بات کسی نے نہیں سُنی اور مَیں بچ گیا۔ آیندہ اپنی زبان قابو میں رکھنا اور اُس بات کا ذکر کبھی نہ کرنا!"

"اچھا!" مَیں نے کہا: "کیا تم میری مدد کے لیے آئے ہو؟"

"اُونہوں!" وہ بولا: "اگر مَیں تمھاری مدد کے قابل ہوتا تو بھی کچھ نہ کر سکتا مگر تم میری مدد ضرور کر سکتے ہو سردار سرفروش!... اور وہ یُوں کہ اُس تنبیہ کو بھول جاؤ ورنہ میرا حشر بھی تم سے مختلف نہیں ہوگا!"

یہ کہتے ہُوئے بھی وہ خوف زدہ نظر آ رہا تھا مگر مسکراہٹ اب بھی اُس کے ہونٹوں پر رقصاں تھی۔

"اچھی بات ہے دوست! مَیں وہ بات ہمیشہ کے لیے بھول گیا۔" مَیں نے کہا۔

اب بونا خاموشی سے میرا اور مَیں اُس کا جائزہ لینے لگا۔ ہم نے ایک دُوسرے کا سر سے پاؤں تک جائزہ لیا۔

بونا مجھے ایلچی کم اور مسخرہ زیادہ نظر آیا۔ اُس کی مخروطی ٹوپی کے پُھندنے میں گھنگھرو بندھے ہُوئے تھے اور گلے میں لوہے کا طوق پڑا ہُوا تھا۔ اُس نے چمڑے کا تنگ لباس پہن رکھا تھا اور اُس کے جوتوں

کی نوکیں بہت لمبی اور اُوپر کو اُٹھی ہُوئی تھیں۔ یہ ساری چیزیں اُسے درباری مسخرہ ثابت کرنے کے لیے کافی تھیں۔ چونکہ مجھے موجودہ صورتِ حال میں کسی ہمدرد اور دوست کی ضرورت تھی اس لیے مَیں نے ٹوہ لگانے کی خاطر پوچھا۔

"کیا خادِ اعظم یا سادیہ جانتی ہے کہ تم اس وقت یہاں آئے ہو؟"

بونے نے اچانک اُلٹی قلابازی لگائی اور تن کر بولا: "خادِ اعظم نہیں جانتا البتہ سادیہ جانتی ہے مگر تم مجھ سے سوال کرنے والے کون ہوتے ہو۔ پُوچھ گچھ کرنے کے لیے تو مجھے بھیجا گیا ہے۔"

"تمھیں کس نے بھیجا ہے اور تمھارا نام کیا ہے، خادِ اعظم؟"

"مجھے مارنو کہتے ہیں اور مَیں سادیہ کا معتمدِ خاص ہُوں۔ اُس نے مجھ سے تمھارے متعلق رائے مانگی ہے۔"

"تو پھر اُسے ایسی رائے دینا جو میری زندگی کی ضمانت بن سکے۔ مَیں کبھی نہ کبھی تمھارے اس احسان کا بدلہ ضرور چُکا دُوں گا۔"

بونا کوئی جواب دینے کی بجائے سر کے بل ہاتھوں پر کھڑا ہو گیا اور پھر ہتھیلیوں پر چلتا ہُوا خیمے کے اندر چکر لگا کر میرے سامنے آ رُکا۔ اب بھی اس کے ہونٹوں پر وہی مسکراہٹ کھیل رہی تھی جس سے اُس کی بتیسی جھانکنے لگتی تھی۔ مجھے اُس کی یہ حرکت ناگوار محسوس ہُوئی۔

"کیا یہ ضروری ہے کہ تم ہر وقت مُسکرا کر اپنی بتیسی دکھاتے رہو؟ یہ مذاق کا موقع نہیں ہے مختر خاں!"

یہ سُن کر بونے نے قلابازی کھائی اور آلتی پالتی مار کر بیٹھتے ہوئے بولا: "مَیں ہر وقت مسکراتے رہنے پر مجبور ہُوں سردار سرفروش! مَیں خاندانی احمق ہُوں۔ جب مَیں ننھا سا بچہ تھا تو جراحوں نے باچھیں چیر دی تھیں۔ غور سے دیکھو تو تمھیں ان چیروں کے نشان نظر آ جائیں گے۔ یہ اُنھوں نے اس لیے کیا تھا کہ میری باچھیں ہمیشہ کھلی رہیں اور مَیں مرنے کے بعد بھی اسی طرح مسکراتا نظر آؤں۔"

مَیں نے غور سے اُس کی طرف دیکھا۔ اُس کی باچھوں کے پاس واقعی چیرے کے نشان موجود تھے۔ وہ خاموش بیٹھا رہا۔ مَیں نے بھی اُسے نہ کُریدا اور انتظار کرنے لگا کہ وہ خود ہی کچھ بولے... پھر اُس نے نتھنے میں اُنگلی ڈال کر کچھ سوچا اور سرگوشی میں بولنے لگا۔

"مجھے تم سے ہمدردی ہے، سردار سرفروش! ایک ایسے آدمی کے ساتھ جو اذیت ناک موت مرنے والا ہو، ہمدردی کے سوا کیا بھی کیا جا سکتا ہے؟... مگر تم نہ تاغانی ہو اور نہ ہی آسوری... پھر تم کیا ہو؟ ہمارے جاسوس تمھارے متعلق صرف اتنا ہی جان سکے ہیں کہ ملکہ ہوشی تم سے بے حد خوش تھی۔ اُنھیں یہ بھی معلوم ہُوا تھا کہ تم فارس سے خصوصی اختیارات کے ساتھ یہاں آئے ہو... مگر یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آتی کہ ملکہ ہوشی نے اپنے شوہر شاہ افشار کے اچانک غائب ہو جانے پر سوگ منانے کے لیے مخصوص لباس پہننے کی بجائے ہار سنگار کیوں شروع کر دیا ہے۔ وہ غم زدہ دکھائی دینے کی بجائے تمھارے ساتھ چہکتی بہکتی رہتی ہے۔ آخر یہ کیا چکر ہے سردار سرفروش؟"

میرے لیے یہ بہت اچھا موقع تھا کہ مَیں جو چاہوں اُسے بتا دُوں اور وہ اُسے بڑھا چڑھا کر آگے بتا دے۔ گزشتہ تین ہفتوں کے دوران مجھے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ شاہ تمبور بے حد لالچی اور عیار آدمی ہے اور اس کی بہن بدنامیوں میں کوئی ثانی نہیں رکھتی۔

"شاہ افشار مر چکا ہے اور گوریلے اُس کی ہڈیاں تک چٹ کر گئے ہیں۔ یہ بھی سچ ہے کہ مَیں فارس سے آیا ہُوں۔ مجھے شہنشاہِ معظم نے شاہ افشار کی جگہ بھیجا ہے اور وہ یہ بھی جاننا چاہتا ہے کہ تم آسوریوں کو اب تک مغلُوب کیوں نہیں کیا جا سکا۔ فارس میں سبھی یہ جاننے کے لیے بے تاب ہیں کہ آخر سالہا سال سے جنگ کیوں لڑی جا رہی ہے؟"

مارنو اپنی سیاہ چمکتی آنکھوں سے مجھے دیکھتا رہا جن میں مجھے یقین کی کوئی جھلک دکھائی نہیں دی۔

"اچھا مَیں یہ باتیں سادیہ کو بتا دُوں گا۔" پھر وہ مجھے اُوپر سے نیچے تک دیکھتے ہُوئے بولا: "اور اسے وہ بات بھی بتا دُوں گا جس میں وہ سب سے زیادہ دلچسپی رکھتی ہے... یعنی تم اُس کے بہترین غلام بن سکتے ہو۔ تم سے وہ ایسا کام لے سکتی ہے جو دُوسرے غلاموں سے نہیں لیا جا سکتا۔ ممکن ہے، اِسی بنا پر وہ خادِ اعظم سے تمھاری جاں بخشی کرا دے۔"

میرے دل میں ایک بار پھر اُمید کی کرن چمکی۔ مَیں نے کہا۔

"مگر سادیہ مجھے خادِ اعظم سے کیسے بچا سکتی ہے مختر خاں؟ ہمارے جاسوسوں نے بتایا تھا کہ وہ خود شاہ تمبور کی قیدی ہے اور اگر مَیں مقابلہ جیت جاتا تو وہ میرے حوالے کر دی جاتی۔ ان باتوں سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں بہن بھائی ایک دُوسرے سے شدید نفرت کرتے ہیں... پھر شاہ تمبور، سادیہ کا کہنا کیسے مان لے گا؟"

"ہاں!"... مارنو بولا: "وہ ایک دُوسرے سے نفرت کرتے ہیں، کرتے تھے اور ہمیشہ کرتے رہیں گے... مگر اس کے باوجود وہ بہن بھائی ہیں... اور جب تک زندہ ہیں، دونوں مِل کر ہم آسوریوں پر حکومت کریں گے۔ اقتدار میں دونوں کا حصّہ ہے اور زندگی بھر رہے گا۔ وہ آپس میں مستقل جھگڑتے اور صُلح کرتے آئے ہیں

اور آیندہ بھی ایسا ہی کرتے رہیں گے۔ آج جب تم نے مقابلہ جیت کر ہار دیا ہے تو اس خوشی میں شاہ تمبو نے سادیہ کو اپنے خیمے سے باہر آنے کی اجازت دے دی ہے۔ آج رات اس خوشی میں ایک تقریب بھی منعقد کی جا رہی ہے جس میں تمھاری قسمت کا فیصلہ کیا جائے گا۔ میں اسی لیے یہاں آیا ہوں کہ تقریب سے پہلے سادیہ کو رائے دے سکوں۔ اگر تم اُس کے لیے کام کے آدمی ہُوئے تو وہ تمھاری جاں بخشی کی کوئی صُورت نکال ہی لے گی۔"

"مگر کیسے؟" میں اطمینان چاہتا تھا۔ "خادِ اعظم اس کی بات رد بھی تو کر سکتا ہے۔"

"نہیں... آج سادیہ کا پلّہ بھاری ہے۔ وہ اس لیے کہ اگر تم اپنی حماقت سے جیتی ہُوئی بازی نہ ہار جاتے تو خادِ اعظم، سادیہ کو تمھارے حوالے کرنے پر مجبور ہو جاتا اور اس طرح اُسے اپنی بہن سے نجات بھی مل جاتی... مگر چونکہ پانسہ پلٹ گیا ہے اس لیے وہ سادیہ کی بات نہیں ٹال سکے گا۔"

"اور سادیہ اُس سے مجھے بطور غلام مانگ لے گی؟" میں نے پوچھا۔

"اگر تمھاری قسمت یاور ہُوئی اور تم سادیہ کو پسند آ گئے تو یقیناً ایسا ہو گا، ورنہ کل صبح تمھیں اذیتیں پہنچا کر ہلاک کر دیا جائے گا... اور جانتے ہو تمھیں کس طرح ہلاک کیا جائے گا... نہیں، تم نہیں جانتے۔ مجھ سے سُنو۔ تمھیں فصیل کے سامنے میدان میں پابہ زنجیر لے جایا جائے گا۔ سارے تاغانی فصیل سے یہ منظر دیکھ رہے ہوں گے۔ اُن سے کہا جائے گا کہ وہ توپ خادِ اعظم کے حوالے کر دیں... مگر وہ توپ نہیں دیں گے... پھر اُن کے سامنے تمھیں قسم قسم کی اذیتیں دی جائیں گی۔ تمھیں تیروں کی نوک سے کچوکے اور برچھیوں سے چرکے لگائے جائیں گے۔ تم چیخو گے، چلّاؤ گے مگر تمھاری فریاد کوئی نہیں سُنے گا... اور جب تم دم توڑ دو گے تو ہمارے گھوڑے تمھاری لاش روند ڈالیں گے۔"

یہ خوفناک باتیں کرتے ہُوئے بھی بونے کے ہونٹوں پر وہی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ مجھے اپنے حشر سے خوف کے ساتھ ساتھ بونے کی مسکراہٹ سے گھِن بھی آئی اور رحم بھی آیا۔ یہ غریب اپنی شدید ترین تکلیف پر بھی مسکراتا دکھائی دینے پر مجبور تھا۔

اچانک ایک سیاہ فام خیمے میں داخل ہُوا۔

اُس نے ایک خاص ادا سے بونے کے سامنے تلوار لہرائی۔ بونا تن کر کھڑا ہو گیا اور پھر اچانک اس نے اُلٹی زقند بھری تو سیاہ فام جلدی سے واپس چلا گیا۔

میری سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیا چکر ہے۔

اگر وہ سیاہ فام پہرے دار تھا تو یُوں کیوں بھاگ نکلا؟

"یہ خواجہ سرا، سادیہ کا غلام ہے۔ خادِ اعظم نے اپنے پہرے داروں کی بجائے تمھاری نگرانی سادیہ کے خواجہ سرا غلاموں کو سونپ دی ہے۔ اس سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ شاید تمھاری جاں بخشی ہو جائے۔ تاہم یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ہوتا وہی ہے جو خاکِ سیاہ پر پہلے سے تحریر کیا جا چکا ہے۔ اچھا اب میں چلتا ہُوں۔"

اُس نے دو قلابازیاں کھائیں اور خیمے کے دروازے پر پہنچ گیا مگر باہر نکلنے سے پہلے رُک گیا۔

"میں اپنی طرف سے پُوری پُوری کوشش کروں گا کہ سادیہ تمھیں اپنا غلام بنا لے۔ میرا مطلب سمجھ گئے یا نہیں؟" اُس نے پلٹ کر پوچھا۔

"اگر وہ ساری باتیں سچ ہیں جو میں سادیہ کے بارے میں سُنتا رہا ہُوں تو تمھارا مطلب اُس کی ذات کے لیے مخصوص غلامی سے ہو سکتا ہے۔"

"بالکل ٹھیک!" مارلو بولا۔ "اور تمھارے لیے یہ کوئی مشکل یا نیا کام نہیں۔ ملکہ ہوشی تمھاری انھی خدمات کی وجہ سے خوش تھی... اور ہاں جانے سے پہلے تمھیں اتنا اور بتا دُوں کہ خوف کا اظہار بالکل نہ کرنا اور بہادر بننا۔ مگر بہت زیادہ بہادر بننے کی بھی ضرورت نہیں۔ میں تمھیں زندہ و سلامت دیکھنا چاہتا ہُوں، سردار سرفروش!" یہ کہہ کر وہ خیمے سے نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد ہی سیاہ فام تین پہرے داروں کے ساتھ خیمے میں داخل ہُوا۔ انھوں نے تلواروں کے علاوہ مشعلیں بھی اُٹھا رکھی تھیں۔ وہ گونگوں کی طرح غوں غاں کرتے ہُوئے تلواروں کے اشارے سے مجھے اُٹھنے اور جسم کے گرد ایک چادر لپیٹنے کی ہدایات دینے لگے جو وہ اپنے ساتھ لائے تھے۔ میرا خیال ہے، اُن کی زبانیں کاٹنے کے ساتھ ساتھ اُنھیں کسی عمل کے ذریعے بہرا بھی بنا دیا گیا تھا۔

میں نے وہ چادر اپنے جسم پر لپیٹ لی۔

خیمے کا دروازہ کھُلا اور ایک عہدے دار داخل ہُوا۔ اُس نے کینہ توز نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

"میں آسُوری لشکر کا سُورما اور حاکمِ دوراں، خادِ اعظم کا معتمدِ خاص رُستم ہُوں۔ تمھیں خادِ اعظم اور اس کی ہمشیر سادیہ کے حضور پیش ہونا ہے۔ کیا تم چلنے کے لیے تیار ہو، اجنبی؟"

آنے والے کا تکبر آمیز اندازِ تخاطب، لباس اور چال ڈھال اس اَمر کی تصدیق کرتی تھی کہ وہ واقعی لشکر کا اعلا عہدے دار ہے۔ میں نے آسوریوں میں اتنا قد آور اور جسیم آدمی نہیں دیکھا تھا۔ اس کی

آنکھیں آسوریوں کی طرح سیاہ نہیں بلکہ گہری بھُوری تھیں۔

وہ میری طرف نفرت و نخوت سے گھُور رہا تھا۔

میں نے سوچا کہ آغاز ہی سے خود اعتمادی اور حوصلے کا مظاہرہ کیا جائے تو بہتر ہو گا۔

"مجھے لفظ اجنبی سے خطاب نہ کرو کمان دار۔ میں سردار سرفروش ہوں۔ فارس سے آیا ہُوں۔ میری رہائی کے لیے تم لوگوں کو کافی بڑا تاوان ادا کیا جائے گا اس لیے مجھ سے آبرو مندانہ سلوک کرو۔ وہ سلوک جس کا میں مستحق ہُوں ورنہ بعد میں تمھیں پچھتانا پڑے گا۔"

اُس کی بھُوری آنکھیں اس طرح سکڑ گئیں جیسے اُسے میری کسی بات پر یقین نہ آیا ہو۔ پھر وہ مسکرایا تو اُس کی گھنی داڑھی مونچھ سے اس کے دانت چمکتے نظر آنے لگے۔ اُس نے سر کو ذرا سا خم دیا اور طنزیہ انداز میں بولا۔

"مجھے اپنے رویّے پر ندامت ہے، سردار سرفروش! میں نے بڑی دنیا دیکھی ہے لیکن میں نے کہیں ایسا خطاب نہیں سُنا جو تمھارے نام کے ساتھ ہے۔ کیا تم اس پر کچھ روشنی ڈالنا پسند کرو گے؟"

اُس کے لب و لہجے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کوئی تعلیم یافتہ آدمی ہے اور آسُوری نہیں ہو سکتا۔ میں نے اُسے مرعوب کرنے کے لیے کہا...

"تاغان کے جنوب میں بہت دُور ایک ایسا عظیم معاشرہ قائم ہے جسے بہت کم لوگ جانتے ہیں کیونکہ وہاں کسی غیر قوم کے آدمی کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ سردار کا خطاب وہاں کی عظیم اور اہم ترین شخصیتوں کو دیا جاتا ہے۔ وہاں کے شہنشاہ کے بعد میری شخصیت سب سے زیادہ اہم ہے۔ میرے قد و قامت اور خد و خال سے تم خود بھی اندازہ لگا سکتے ہو کہ میں تاغانی نہیں ہُوں۔ اپنے پُراسرار معاشرے کی طرف سے عائد کردہ پابندیوں کے باعث میں کسی پر یہ انکشاف نہیں کر سکتا کہ میں کون ہُوں۔ تمھارے لیے صرف اتنا جان لینا ہی کافی ہے کہ میں دُنیا کی ایک ایسی سرزمین سے آیا ہُوں جہاں آبِ حیات تیز ندی کی صُورت بہتا ہُوا موت کے اندھے ریگ زاروں میں گم ہو جاتا ہے۔ جس طرح تقدیر کی تختی پر جسے تم خاکِ سیاہ کہتے ہو، میری آمد کا وقت لکھا ہُوا تھا، اُسی طرح واپسی کا لمحہ بھی تحریر کر دیا گیا ہے اور وہ لمحہ آتے ہی میں اُس پُراسرار سرزمین کی طرف واپس چلا جاؤں گا۔ جسے تم میں سے کوئی بھی نہیں جانتا، جسے کسی کی آنکھ نے نہیں دیکھا اور نہ ہی تم میں سے کسی کی آنکھ دیکھ سکے گی۔"

میرا خیال تھا کہ وہ میری ان گول مول باتوں سے مرعوب ہو جائے گا لیکن اس نے اُن کا کوئی اثر قبول نہ کیا، البتہ اس کے پیچھے کھڑے سپاہی کچھ بے چین سے ہو گئے۔

کمان دار رستم نے ایک زبردست قہقہہ لگایا اور بولا۔ "یہ باتیں خادِ اعظم کو بتانا سردار سرفروش! ممکن ہے اُسے اِن پر یقین آ جائے۔" وہ اپنے سپاہیوں سے مخاطب ہُوا۔ "کھڑے مُنہ کیا دیکھ رہے ہو، اسے لے چلو مگر نہ اس سے کوئی بات کرنا اور نہ ہی اس کی بات سُننا ورنہ مسحُور ہو جاؤ گے۔" یہ کہہ کر وہ اپنی ایڑی پر گھُوما اور خیمے سے نکل گیا۔

آسوریوں کی خیمہ گاہ سے گزرتے ہُوئے میں نے صُورتِ حال کا جائزہ لیا۔ میرے ہاتھوں میں زنجیریں اور پاؤں میں بیڑیاں تھیں۔ ہر قدم پر زنجیریں اور بیڑیاں نہ صرف جھنجھنا اُٹھتی تھیں بلکہ چلنے میں بھی رکاوٹ پیدا کر رہی تھیں۔ میرے ارد گرد سپاہی بے نیام تلواریں لیے چل رہے تھے اور تاغان کی فصیل ایک میل دُور دُھندلی دُھندلی سی نظر آ رہی تھی۔

میرے لیے فرار کا ہر راستہ مسدُود تھا اور جائے پناہ کوئی نہیں تھی۔ اس لیے میں کسی جیالے سرفروش ہی کی طرح تن کر آگے چلتا رہا۔ اب بھی میری کوشش یہی تھی کہ کمان دار رستم مجھ سے مرعُوب ہو جائے۔ وہ ہمارے آگے آگے چل رہا تھا۔

خیموں کے درمیان ایک جگہ چھوٹے سے میدان میں مجھے دس بارہ آدمی دار پر لٹکے دکھائی دیے۔ یہ سب آسُوری تھے۔ ان میں سے کچھ کو پھانسی دی گئی تھی اور کچھ اُلٹے لٹکے ہُوئے تھے مگر سب مر چکے تھے۔ اُن کی بے لباس لاشیں صرف عبرت دلانے کے لیے لٹکتی چھوڑ دی گئی تھیں۔

بڑا ہی دل دوز منظر تھا۔

معاً رستم پلٹا اور سفاک مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "تم نے خادِ اعظم کے انصاف کا نمونہ دیکھا، سردار سرفروش؟ ان میں سے کوئی چور تھا، کوئی بھگوڑا، کوئی قاتل اور کسی کی زبان نے خادِ اعظم کے خلاف الفاظ اُگلے تھے۔ ویسے تمھارے تاوان میں کیا کچھ مل سکتا ہے؟" یہ کہہ کر اُس نے خوفناک قہقہہ لگایا۔

مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد سی لہر سرسراتی محسوس ہُوئی لیکن دُوسرے ہی لمحے میں نے ہر خوف اپنے قلب و ذہن سے جھٹک دیا اور اپنی بقا کے بارے میں سوچنے لگا کیونکہ اس سرزمین پر درحقیقت یہی میرا فرض بھی تھا۔

میدان کے بعد پھر خیموں کی قطاریں شروع ہو گئیں جہاں سے کھانا پکانے کی خوشبو اور بچّوں کا شور میری توجہ بٹانے لگا۔ کچھ دیر چلنے کے بعد ہم خیمہ گاہ کے کنارے پہنچ گئے۔ یہاں مجھے

ہزاروں گھوڑے اور خچر لیٹے، بیٹھے اور چرتے دکھائی دیے۔ چاروں طرف اُن کے رکھوالے موجود تھے ... پھر ہم چھکڑوں کی ایک لمبی قطار کے پاس سے گزرے۔ یہ چھکڑے چاروں طرف سے بند تھے اور باہر مسلح سپاہی پہرہ دے رہے تھے۔ چھکڑوں کے اندر سے رونے، گالیاں بکنے اور گانے کی ملی جلی آوازیں آ رہی تھیں۔ رستم نے اپنی تلوار سے اشارہ کرتے ہوئے کہا: "یہ غلاموں کے چھکڑے ہیں، سردار سرفروش! اگر تقدیر تم پر مہربان ہوئی تو ان میں سے کسی ایک پر تمھیں بھی جگہ مل جائے گی۔"

کچھ اور آگے بڑھے تو سب سے الگ تھلگ ایک بہت بڑا خیمہ دکھائی دیا، جس کے چاروں طرف مشعلیں روشن تھیں اور پہرے دار متعین تھے۔ یہ خادِ اعظم تمبور کا خیمہ تھا۔ خیمے کے اندر سے طنبورے، دَف اور قرنا پر مشتمل موسیقی کی صدا آ رہی تھی۔

ہم دروازے پر رُک گئے۔ جہاں دو نیزے گڑے ہوئے تھے اور اُن پر گھوڑوں کی دُمیں لہرا رہی تھیں، ان کے درمیان ایک اور لمبے نیزے پر انسانی کھوپڑی ٹنگی ہوئی تھی۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے یہ کھوپڑی مجھ پر ہنس رہی ہو۔

کمان دار رستم نے ایک چوبدار کے ذریعے ہماری آمد کی اطلاع بھجوائی۔ جب چوبدار نے خیمے کے دروازے کا پردہ ہٹایا تو مجھے ایک نوشباب رقاصہ کی جھلک دکھائی دی جو ایک تخت کے سامنے محوِ رقص تھی۔ اس کا سراپا مشعلوں کی روشنی میں دہکتا نظر آتا تھا۔ وحشت آمیز موسیقی کی لے تال پر اس کا انگ انگ متحرک رہا تھا۔ مجھے لانے والے سپاہیوں میں سے ایک نے کہا: "آج تو صنوبری کا رقصِ شباب پیش ہے۔"

دوسرا ہنستے ہوئے بولا: "یہ رقاصہ عمدگی کا نایاب نمونہ ہے۔"

"ہاں ہاں میں جانتا ہوں۔ میں نے اپنی تنخواہ پس انداز کرنا شروع کر دی ہے تاکہ ایک شب اسے اپنے خیمے میں مہمان بنا سکوں۔" تیسرے نے کہا۔

اس بات پر تمام پہرے دار ہنس پڑے۔ رستم نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا: "احمق ... تمھیں اس کی ایک شب کی میزبانی کے لیے اپنی زندگی بھر کی تنخواہ خرچ کرنا پڑے گی۔"

اتنے میں خیمے کا دروازہ پھر کھلا اور چوبدار نے اُلٹے پاؤں نکل کر کمان دار کو اندر جانے کا اشارہ کیا۔ رستم نے بازو سے پکڑ کر مجھے گھسیٹا اور خیمے میں داخل ہو گیا۔ میری زنجیریں اور بیڑیاں جھن جھنا اٹھیں۔

چند قدم آگے بڑھ کر رستم نے میرا بازو چھوڑ دیا اور اُلٹے قدموں پیچھے ہٹ گیا۔

میں نے قہر آلود نظروں سے اُسے دیکھا اور پھر تن کر کھڑا ہو گیا۔ اب سب کی نگاہیں مجھ پر جم گئی تھیں۔ موسیقی بند ہو گئی۔ رقص تھم گیا اور ایک عجیب سی خاموشی چھا گئی۔ میرے لیے ہر آنکھ میں نفرت تھی، ہر جبیں پر شکنیں تھیں اور میں شاہ تمبور کے بھرے پُرے دربار میں اپنے آپ کو یکسر تنہا محسوس کر رہا تھا۔

"اسے آگے لاؤ۔" خادِ اعظم نے جو اپنے تخت پر نیم دراز تھا، حکم دیا: "تاکہ میں دیکھ سکوں کہ میرے سورما کو شکست دینے والا کیسا آدمی ہے؟"

یہ سُن کر رستم نے مجھے آگے دھکیلا اور دھیمی آواز میں کہا: "تخت کے پاس جا کر گھٹنے ٹیک دو اور سر خم، زبان بند رکھو۔"

میں اس طرح آگے بڑھا جیسے میرے ہاتھ پاؤں میں زنجیریں نہیں بلکہ پھولوں کے ہار پڑے ہوئے ہوں، میرے جسم پر محض ایک چادر نہیں بلکہ زربفت کا لباس ہو ... اور سر پر تاجِ شاہی جگمگا رہا ہو۔ میں نے نہ گھٹنے ٹیکے اور نہ ہی اپنا سر خم کیا۔ بس ایک باوقار فاتح کی طرح تن کر کھڑا ہو گیا۔

میں نے دیکھا کہ بونا مارنو بھی ایک جانب بیٹھا میری طرف دیکھ رہا ہے مگر اس کی آنکھوں میں آشنائی کا کوئی رنگ نہیں تھا۔ خادِ اعظم مجھے غور سے دیکھنے کے لیے اُٹھ بیٹھا۔

وہ دُبلا پتلا آدمی تھا۔ اس کے شانے چوڑے نہیں تھے اور اس کی بائیں آنکھ پر پڑا ہوا کپڑے کا چھوٹا سا ٹکڑا کسی ایسے بحری قزاق کی یاد دلا رہا تھا جس کی آنکھ جاتی رہی ہو۔ وہ مجھے ایک کی اپنی دائیں آنکھ سے مجھے دیکھتا رہا۔

میں نے بھی اپنی نگاہیں اس پر مرکوز کر دیں تو وہ تخت پر پہلو بدلتے ہوئے غصے اور تعجب سے بولا: "تمھاری یہ جرأت کہ میرے سامنے یوں تن کے کھڑے ہو!"

"ہاں ... سردار سرفروش نہ تو کسی آدمی کے سامنے جھکا ہے اور نہ ہی کبھی جھکے گا۔" میں نے اطمینان سے جواب دیا۔

میری اس بات پر کسی نے سسکاری سی لی اور کوئی پھیکے سے انداز میں ہنس دیا پھر فوراً ہی خاموشی چھا گئی۔

شاہ تمبور نے گردن موڑ کر ایک عورت کی طرف دیکھا جو اس کے پہلو میں تخت سے قدرے چھوٹی شاہی نشست پر بیٹھی تھی۔ "تم اسے اپنا غلام بنانا چاہتی تھیں سادیہ ... لیکن تم نے دیکھا یہ کیسا آدمی ہے؟ غلام ایسے تو نہیں ہوتے۔"

سادیہ نے آنکھوں سے نیچے باریک نقاب ڈال رکھا تھا۔ اس کی بلوری آنکھیں مجھ پر جم گئیں۔ میں نے بھی اس سے نگاہیں ملائے رکھیں۔ اُن آنکھوں میں بلا کی کشش تھی اور ملکہ لالی اگر اس سے رقابت محسوس کرتی تھی تو اس کی رقابت بے جا نہیں تھی۔ سادیہ حُسنِ وحشی کا نمونہ تھی اور اُس کی آنکھیں جسے بھی دیکھتیں اُسے اپنا بنا لیتی تھیں۔

وہ خاموشی سے مجھے دیکھتی رہی۔

"ٹھیک ہے، سادیہ۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں سردار سرفروش کو کچھ آداب سکھا دینے چاہئیں۔" شاہ تمبور نے کہا اور سپاہیوں کو حکم دیا: "اسے گھٹنے ٹیکنا سکھاؤ۔"

یہ سنتے ہی سپاہیوں نے نیزوں کے پچھلے سرے میرے گھٹنوں پر مارنے شروع کر دیے مگر میں نے گھٹنے اکڑا لیے اور اس تکلیف کی پروا نہ کی جو ہر ضرب کے ساتھ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ اچانک سادیہ نے اپنا ہاتھ بلند کر کے اُنھیں رُکنے کا اشارہ کیا۔ اس کا ہاتھ نرم و نازک تھا اور انگلیاں مخروطی تھیں۔ پھر وہ بولی: "بیلوں اور غلاموں کو پیٹا جاتا ہے لیکن یہ شخص نہ بیل ہے اور نہ ہی ابھی غلام بنایا گیا ہے۔" یہ کہہ کر وہ اپنے بھائی کی طرف پلٹی اور سرگوشیوں میں اس سے بات کرنے لگی۔

میں نے اپنے ہاتھ سینے پر باندھے تو زنجیروں کی جھنکار خیمے کی خاموشی میں گونج گئی۔

میں نے سادیہ کے سراپا کا جائزہ لیا۔ اُس نے اپنے شب رنگ بال ایک مخروطی جوڑے کی شکل میں باندھ رکھے تھے اور ایک چھوٹی سی تنگ واسکٹ پہن رکھی تھی جس نے اُس کا حُسن نمایاں تر کر دیا تھا۔ اُس کے پاؤں چھوٹے چھوٹے اور خوبصورت تھے۔ اس نے ہاتھوں کی طرح پاؤں کے ناخنوں پر بھی کوئی خوش رنگ روغن لگا رکھا تھا اور اس کے ٹخنوں میں طلائی کڑے سجے ہوئے تھے ... لیکن آنکھوں کے نیچے سے گردن تک اُس کا چہرہ نقاب میں چھپا ہوا تھا۔ اس لیے میں یہ نہ جان سکا کہ اُس کے رخساروں اور ہونٹوں کو کن پھولوں سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔

وہ سرگوشیوں میں مصروف تھی جن کے جواب میں شاہ تمبور سر کی جنبش سے انکار کیے جا رہا تھا۔

یہ خاموشی میرے لیے جان لیوا ہوتی جا رہی تھی۔

میں نے ایک بار پھر بونے مارنو کی طرف دیکھا مگر اُس نے مجھ سے نگاہ ملانے کی بجائے چار گیندیں اچھالنا شروع کر دیں اور اپنی نگاہوں کو اُن پر مرتکز کر دیا۔

"ٹھیک ہے۔" شاہ تمبور نے کہا: "یہ اس وقت تک تمھاری تحویل میں رہے گا جب تک کہ اس کی رہائی کے لیے تاوان وصول نہیں ہو جاتا۔" ... پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا: "تم نے سُن لیا۔ تم جو اپنے آپ کو سردار سرفروش کہتے ہو۔ کیا تمھارے تاغان اور فارس والے دوست تاوان ادا کر دیں گے؟"

میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا: "وہ تاوان ضرور ادا کریں گے۔ شاہ تمبور مگر اس کے لیے تمھیں اپنا پیامبر فارس بھیجنا پڑے گا کیونکہ شہرِ پناہ کے پیچھے تاغانیوں کے پاس اتنا خزانہ نہیں ہے۔" میں نے یہ بات اس لیے کی تھی کہ ہو سکتا ہے، ملکہ ہوشی زرِ تاوان دینے پر آمادہ نہ ہو۔ میری اس بات کے جواب میں شاہ تمبور نے کہا۔

"میں جانتا ہوں کہ اس مقصد کے لیے مجھے اپنا آدمی فارس بھیجنا پڑے گا۔ تمھاری گرفتاری کے بعد میں نے ملکہ ہوشی کو پیغام بھیجا تھا مگر وہ توپ دینے کے لیے رضامند نہیں ہوئی۔ اگر مجھے توپ نہ ملی تو پھر مجھے تاغان کا آدھا خزانہ ملنا چاہیے۔"

خیمے میں کچھ سرگوشیاں ہونے لگیں تو شاہ تمبور نے ہاتھ اُٹھا کر حاضرین کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور بولا: "سنو ... میں اس آدمی کو غلام کے طور پر اپنی بہن سادیہ کی تحویل میں دے رہا ہوں۔ وہ جو سلوک چاہے، اس کے ساتھ کرے مگر اسے تاوان وصول کرنے کے لیے زندہ رکھے۔" پھر وہ سادیہ کی طرف پلٹا: "میں، تمھیں اس پر تشدد کرنے سے نہیں روکتا ... مگر یہ خیال رکھنا کہ تاوان کی وصولی تک اس کا دم نہیں نکلنا چاہیے اور میں یہ پسند نہیں کروں گا کہ مجھے دھوکا دیا جائے۔"

یہ کہہ کر اُس نے یُوں ہاتھ اُٹھائے جیسے معاملہ ختم ہو گیا ہو ... پھر اُس نے بونے مارنو کی طرف دیکھا۔ بونے نے پھرتی سے ایک بڑے برتن میں ہاتھ ڈال کر برف میں لگا ہوا تربوز نکالا، اس کے دو ٹکڑے کیے اور شاہ تمبور کی خدمت میں پیش کر دیے۔ شاہ تمبور تربوز بڑے شوق سے کھاتا تھا اور اُنھیں ٹھنڈا رکھنے کے لیے دُور دراز سے پہاڑی برف منگواتا تھا۔ اُس نے تربوز پر مُنہ مارتے ہوئے میری طرف دیکھا ... پھر اس کا گُودا چباتے ہوئے سادیہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"ہاں تو میری ہمشیر! یہ اب تمھاری تحویل میں ہے مگر یہ دیکھ لو کہ تم اسے غلام بنا سکتی ہو یا نہیں۔ غلام بنانے کے لیے اس پر اتنا تشدد نہ کرنا کہ یہ مر جائے اور میں تاوان سے محروم ہو جاؤں۔"

شاہ تمبور کی باتوں سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ مجھے جان سے نہیں

۔ راجائے گا اور سادیہ میرے لیے دُوسری ملکہ لالی ثابت ہو گی جس کی آنکھیں ایک بار پھر مجھ پر مرکوز ہو گئی تھیں۔ وہ میرے قد و قامت، خدوخال اور مضبوط اعضا کا جائزہ لے رہی تھی۔ مجھے یُوں محسوس ہُوا جیسے اس جائزے سے اُس کی آنکھوں میں چمک آ گئی ہو۔۔۔ پھر اُس نے ہاتھ اُٹھا کر ایک اُنگلی سے مجھے اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا :

"تم اب سردار سرفروش نہیں بلکہ میرے غلام ہو۔ میرے قریب آؤ غلام۔ بعد میں اگر تم نے میری خوشنودی حاصل کر لی تو میں تمھیں دُوسرا نام دے دُوں گی۔"

میں پُروقار انداز سے اُس کے سامنے جا کھڑا ہُوا۔

ہم دونوں کی نگاہیں چار ہُوئیں تو سادیہ نے اپنی نشست والے قالین پر اُنگلی مارتے ہُوئے کہا۔ "تم نے خادِ اعظم کے سامنے گھٹنے نہیں ٹیکے تھے لیکن میرے سامنے ضرور جُھکو گے کیونکہ اب تم میرے غلام ہو۔"

مجھے میری چھٹی حس نے خبردار کیا کہ اگر میں اپنی بات پر نہ اڑا رہا اور سادیہ کے سامنے جُھک گیا تو میری خیر نہیں۔ آسوری بہادری کی قدر کرتے اور طاقت کی زبان سمجھتے ہیں۔ اگر میں نے گھٹنے ٹیک دیے تو میری بہادری کا بھرم جاتا رہے گا اور یہ لوگ تاوان کی پروا کیے بغیر میرے پرخچے اُڑا دیں گے۔

"میں نے ایک مرد کے سامنے گھٹنے نہیں ٹیکے تو کسی عورت کے سامنے کیسے جُھک سکتا ہُوں؟" میں نے کہا۔

سادیہ کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔

شاہ تمبور کا قہقہہ گُونج اٹھا۔

"تم نے اپنی کارروائی کا آغاز اچھا نہیں کیا میری ہمشیر۔ لاتوں کے بُھوت باتوں سے نہیں مانتے۔"

سادیہ نے مجھے جُھکنے کا اشارہ کرتے ہُوئے غصّے سے کہا "میں تمھیں آخری موقع دے رہی ہُوں، غلام۔ جُھک جاؤ۔"

"یہ ناممکن ہے۔" میں نے مسکراتے ہُوئے جواب دیا۔ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ میں نے جو فیصلہ کیا تھا اب مجھے اُس پر کاربند رہنا تھا۔

سادیہ نے خیمے کی ایک جانب دیکھتے ہُوئے اشارہ کیا۔ دُوسرے ہی لمحے دو سیاہ فام غلام بغلی دروازے سے خیمے میں داخل ہُوئے۔ ایک غلام نے لکڑی کا ایک بڑا کُندہ اور دُوسرے نے چمکدار تیز دھار والی چھُری اُٹھا رکھی تھی۔ سادیہ نے سیاہ فام غلاموں سے کہا۔ "تیاری کر دو۔"

ایک سیاہ فام نے لکڑی کا وہ کُندا میرے سامنے رکھ دیا اور چھُری بدست غلام میرے پہلو میں کھڑا ہو کر چھُری کی دھار دیکھنے لگا۔

"گھٹنے ٹیکتے ہو یا نہیں؟" سادیہ نے پُوچھا۔

"نہیں۔" میں نے دو ٹوک جواب دیا۔

سادیہ نے اشارے سے اُسی غلام کو بُلایا جس کے بارے میں ابھی مارنو نے بتایا تھا کہ وہ سادیہ کا خواجہ سرا ہے۔ سادیہ نے اسے حکم دیا۔ "اسے دکھاؤ کہ تمھارے ساتھ کیا کچھ کیا گیا تھا۔"

وہ غلام میرے سامنے آیا اور اُس نے اپنا مُنہ کھول دیا۔ اُس کی زبان آدھی کٹی ہُوئی تھی۔۔۔ پھر اُس نے واسکٹ اُتاری۔ اُس کے سینے اور پیٹھ کو گرم لوہے سے داغا گیا تھا۔۔۔ اور جب اُس نے باری باری باقی کپڑے ہٹائے تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

"میں تمھیں ایک بار پھر تنبیہہ کرتا ہُوں میری ہمشیر! اس کا اتنا خون نہ بہنے پائے کہ یہ مر جائے۔" شاہ تمبور نے کہا۔

"میں یقین دلاتی ہُوں کہ اسے مرنے نہیں دیا جائے گا۔" سادیہ نے کہا اور مجھ سے مخاطب ہُوئی۔ "تم نے اس غلام کا حشر دیکھ لیا؟ تمھارے ساتھ بھی یہی سب کچھ کیا جائے گا۔"

میں نے ایک نظر اس مخنث غلام پر ڈالی تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میرے لیے اس حال میں زندہ رہنے کی نسبت موت زیادہ بہتر تھی لیکن اب میں اپنی ضد اور آن کے لیے اتنا آگے جا چکا تھا کہ پیچھے ہٹنے کی گنجائش ہی باقی نہیں رہی تھی۔ اگرچہ میں اپنی مہماتی زندگی میں کبھی اتنا خوف زدہ نہیں ہُوا تھا۔ اس کے باوجود میں نے جُوا کھیلنے کا فیصلہ کر لیا۔

"بہادر جان تو دے سکتے ہیں مگر اپنی بات سے نہیں پھرتے۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔

سادیہ نے غلاموں کو اشارہ کیا۔

اُن سب نے مجھے پکڑ لیا اور میرے جسم سے چادر اُتار پھینکی۔ سادیہ نے تالی بجائی تو ایک غلام دہکتی ہُوئی انگیٹھی لے آیا جس میں لوہے کی سلاخ تپ کر سُرخ انگارہ بن چکی تھی۔ لکڑی کا کُندا میری ٹانگوں سے قریب تر رکھ دیا گیا۔ چھُری والے غلام نے چھُری کے دستے پر اپنی گرفت مضبوط کی اور سادیہ کو دیکھا جیسے وہ حکم کا منتظر ہو۔

"آخری بار پُوچھ رہی ہُوں، غلام۔ میرے سامنے جُھکتے ہو یا نہیں؟" سادیہ نے مجھ سے کہا۔

"نہیں۔۔۔" میرے مُنہ سے بے ساختہ نکل گیا اور میں نے اپنی آنکھیں سامنے خیمے کے سیاہ پردے پر جما دیں۔ ہر شخص خاموش تھا۔ غلام تیار اور اشارے کے منتظر تھے۔ سادیہ میری طرف دیکھتی رہی اور میں پسینے میں شرابور ہوتا چلا گیا۔

پھر سادیہ نے غلاموں کی طرف دیکھا اور اُس کا ہاتھ اشارے کے لیے بلند ہوتا چلا گیا۔

☆

سادیہ کے اشارے پر میری گردن بھی اُڑائی جا سکتی تھی۔ میرا جسم دہکتی سلاخوں سے بھی داغا جا سکتا تھا، میری صُورت بھی بگاڑی جا سکتی تھی اور میں مخنث غلاموں کی صف میں شامل کیا جا سکتا تھا۔۔۔ مگر میں اس آخری لمحے میں اپنے چہرے پر خوف و دہشت کا کوئی تاثر نہیں لانا چاہتا تھا۔ اس لیے میں نے اپنی نگاہیں بلند رکھیں اور خیمے کی سیاہ چادر پر گاڑ دیں۔

سادیہ کا ہاتھ اُٹھنے اور اشارہ کرنے میں اگرچہ صرف ایک لمحے کا وقفہ آیا تھا لیکن میرے لیے یہ ایک لمحہ صدیوں کا کرب لیے ہُوئے تھا۔ یہ میری زندگی کا طویل ترین لمحہ تھا اور جب دُوسرے لمحے اُس نے اشارہ کیا تو عقوبتوں کے اس طوفان کا دھارا ایک دم مُڑ گیا جو مجھے اپنی لپیٹ میں لینے والا تھا۔

سادیہ نے چھُری اور سلاخ بردار غلاموں کو پیچھے ہٹ جانے کا حکم دے دیا۔

میں نے زندگی کا سب سے بڑا جُوا جیت لیا اور سادیہ ہار گئی۔

اس نے غصّے کے عالم میں کانپتے ہُوئے حکم دیا کہ مجھے قیدیوں والے ایک چھکڑے میں محبوس کر دیا جائے۔ یہ چھکڑا دُوسروں سے الگ تھلگ اُسی سطحِ مرتفع کے قریب کھڑا کیا گیا تھا۔ جہاں مجھے کمپیوٹر نے اس سرزمین پر منتقل کیا تھا اور جہاں سے مجھے پہلی بار آسوریوں کی خیمہ گاہ، میدانِ کارزار اور شہر پناہ دکھائی دی تھی۔

دن بھر بگولوں کی طرح گردش کرتی ہُوا دُھول اُڑاتی اور آسوری گروہ در گروہ آ کر مجھ سے مشغول کرتے، میرا مذاق اُڑاتے اور فقرے کستے۔ میں اپنے قفس کی مضبوط چوبی سلاخوں کے پیچھے لیٹا یا سر نیہوڑائے بیٹھا، اپنی بے بسی پر کُڑھتا یا پھر ڈاکٹر فریدوں کو کوستا رہتا جو مجھے یہاں بھیجنے کے بعد بالکل ہی بُھول گیا تھا۔

میرے لیے چھکڑے کے اس پنجرے سے فرار ناممکن تھا۔

اوّل تو اس کی چوبی سلاخیں بے حد مضبوط تھیں، دُوسرے اگر میں انھیں توڑنے میں کامیاب ہو جاتا، تب بھی ان چھ آسوری پہرے داروں سے بچ کر نہیں جا سکتا تھا جو شب و روز میری نگرانی پر مامور تھے۔

میری بے بسی کا تماشا دیکھنے والوں میں سادیہ بھی شامل تھی۔

وہ ہر صبح گھوڑے پر سوار آتی اور میرے پنجرے سے کچھ دُور گھوڑا روک کر، دیر تک میری طرف دیکھتی رہتی۔ اُس کے چہرے پر پڑی نقاب کے باعث میں یہ اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ مجھے دیکھ کر اُس کے ہونٹ نفرت سے بھنچ جاتے ہیں یا اُن پر فتح مندی کی مسکراہٹ اُبھر آتی ہے۔

میں اُس سے نگاہیں چُرا کر بے نیاز سا بن جاتا۔

وہ کچھ دیر بعد گھوڑے کو ایڑ لگاتی اور آسوری شہسواروں کی طرح اسے سرپٹ دوڑاتی چلی جاتی۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے اپنا ذاتی غلام بنائے گی۔ بونے مارنو نے بھی یہی کہا تھا مگر سادیہ نے مجھے تماشائے عبرت بنا دیا تھا۔ آسوریوں کے گروہ مجھ پر نہ صرف آوازے کستے بلکہ نوک دار چھُریاں بھی چبھو کر قہقہے لگاتے تھے۔

ایک روز جب ایک آسوری نے بار بار یہ حرکت کی تو میں نے چھُری چھین کر دو ٹکڑے کرنے کے بعد اسے حملہ آور کے سینے پر چبھو دیا۔ وہ چیختا چلاتا بھاگا تو دُوسرے اُس پر قہقہے لگانے لگے لیکن اُس کے بعد کسی کو یہ حرکت دُہرانے کی جرأت نہیں ہُوئی۔

اب وہ میرے پنجرے سے کچھ دُور کھڑے ہو کر پھبتیاں کستے اور اپنا دل خوش کر کے چلے جاتے تھے۔

اس دوران میں بونا مارنو ایک بار بھی میرے پاس نہیں آیا اور نہ ہی کہیں ادھر آتا جاتا دکھائی دیا۔

مجھے اس پنجرے میں قید ہُوئے کئی روز گزر گئے۔

خدا کا شکر ہے کہ سادیہ نے مجھے بھُوکا رکھنے کی سزا نہیں دی تھی جو دُنیا کی بدترین سزا ہے اور انسان کو ذلیل ترین افعال کے لیے مجبُور بنا دیتی ہے۔ مجھے دو وقت سیاہ آٹے کی روٹی، تھوڑا سا گھوڑے کا گوشت اور ایک بڑا گلاس بروس کا دیا جاتا تھا۔ بروس آسوریوں کا خاص مشروب تھا جو گھوڑی کے دُودھ کے علاوہ کسی اناج یا جڑی بوٹی کا آمیزہ ہوتا ہے۔

شروع شروع میں تو مجھے اس مشروب سے بہت گھن آتی رہی۔۔۔ مگر بعد میں اس سے شراب جیسا لُطف آنے لگا۔ یہ مشروب خاصا مقوی بھی تھا۔

ہر صبح آسوری فصیل پر حملہ آور ہوتے اور ہر شام شکست خوردہ لوٹ آتے۔

دن میں متعدد بار توپ کے زبردست دھماکے بھی سُنائی دیتے اور میں جاگتی آنکھوں اپنی رہائی کے خوش آئند خواب دیکھنے لگتا۔ میں سوچتا کہ لالی کسی رات اپنے لشکر کے ساتھ شہر پناہ سے نکلے گی، آسوریوں پر شب خُوں مارے گی اور مجھے چھُڑا لے جائے گی

مگر دن گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ سپنے ٹوٹتے بکھرتے چلے گئے اور اس سوچ کی سیاہ چادر خوبصورت خوابوں کا کفن بنتی گئی کہ لالی میرے نیلے اپنے سپاہیوں کو موت کے منہ میں کیوں دھکیلنے لگی ؟ وہ آخر کوئی خطرہ مول کیوں لے ؟ وہ مجھ سے آسودگی ہی تو حاصل کرتی تھی' یہ کام وہ کسی سے بھی لے سکتی ہے۔

خادِ اعظم کا کمان دار رستم بھی روزانہ گشت پر آیا کرتا تھا۔ وہ میری طرف عجیب سی نظروں سے دیکھتا رہتا مگر اُس نے کبھی مجھ سے بات نہیں کی بلکہ اپنے پہرے داروں کو ہدایات دیتا اور چلا جاتا تھا۔

مجھے اس پنجرے میں محبوس ہوئے ایک ہفتہ گزر گیا۔

میری داڑھی بڑھ گئی اور جسم میں کھجلی اُٹھنے لگی۔ میرے تن پر صرف ایک پھٹا پرانا میلا کچیلا لبادہ تھا اور پنجرے میں بچھی ہوئی گھاس گندگی کا ڈھیر بن گئی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ فرار کی کوئی راہ نہیں تھی اور اس حال میں جینا بھی عذاب تھا۔ اُوپر سے آسوریوں کی پھبتیاں' دن میں گرمی اور رات بھر سردی مجھے چین نہ لینے دیتی۔

میں ہر وقت جلتا بھنتا، کڑھتا اور ڈاکٹر فریدوں کو کوستا رہتا تھا۔ مجھ پر دیوانگی سی طاری ہونے لگی تھی۔

نویں روز اچانک رستم دو آسوری سپاہیوں کے ساتھ وہاں آیا۔ جنھوں نے ایک بڑا چوبی طوق اور چمڑے کی لگامیں اُٹھا رکھی تھیں۔ رستم پہلے تو اپنے مخصوص انداز سے میری طرف دیکھتا رہا پھر مسکرانے لگا۔

"تم نہ صرف اس رات موت کو چکمہ دینے میں کامیاب ہو گئے بلکہ اس بدبودار پنجرے میں سزا بھگتنے کے باوجود تمھاری صحت ٹھیک ٹھاک ہے۔ شاید اس لیے کہ تمھیں بھوکا نہیں رکھا گیا اور پیٹ بھر کھانا دیا جا رہا ہے۔"

"ہاں" میں نے جواب دیا۔ "اب یہ اور بات ہے کہ ہم ایسی غذا جانوروں کو نہیں دیتے۔ خادِ اعظم سے کہنا کہ مجھے میرے مرتبے کے اعتبار سے اچھی غذا بھیجے اور تم یہ گھاس بھی بدلوا دو۔"

یہ سُن کر رستم نے بڑے زور کا قہقہہ لگایا۔

"اب مجھے یقین ہو چلا ہے کہ تم واقعی سردار ہو ورنہ اس حال میں تمھیں ایسی باتیں ہرگز نہ سوجھتیں۔ بہرصورت اب نہ خادِ اعظم کو پیغام دینے کی ضرورت ہے اور نہ گھاس بدلنے کی۔" پھر اُس نے مزید آدمیوں کو بلایا اور اُنھیں حکم دیا۔ "اسے باہر نکالو اور یہ طوق اس کے گلے میں ڈال دو۔"

میں پنجرے سے نکلا تو آٹھ شمشیر و نیزہ بردار آسوری سپاہیوں نے مجھے اپنے حلقے میں لے لیا۔ اُن کا مقابلہ اور بچ نکلنا ممکن نہیں تھا۔

"آج سے تمھاری غلامی کا دُوسرا دَور شروع ہو رہا ہے' سردار سرفروش! یہ طوق پہننے کے بعد تم سادیہ کے نجی غلاموں میں شامل ہو جاؤ گے۔ اگر سادیہ تمھیں زندہ نہ رکھنا چاہتی تو دُنیا کی کوئی طاقت تمھیں بچا نہیں سکتی تھی۔ تم بہادر ضرور ہو لیکن بہادری کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ حماقت سے اپنی زندگی ہی گنوا دو۔ میری نصیحت ہے کہ بے جا اکڑفوں چھوڑ دو ورنہ یہ تمھاری موت کا پیغام بن جائے گی۔ تمھیں بہتر خوراک اور بہتر رہائش ملے گی۔ ہو سکتا ہے کہ جلد ہی تمھارے گلے میں اس بڑے چوبی طوق کی بجائے چھوٹا طلائی طوق ڈال دیا جائے۔"

رستم کی اس بات پر پہرے دار بے ساختہ کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ رستم نے انھیں ڈانٹ دیا اور حکم دیتے وقت گرج پڑا۔ "پہنا دو اسے۔"

میں نے چُپ چاپ وہ طوق اپنے گلے میں ڈلوا لیا۔

یہ بھدا سا طوق میری گردن کے لیے ذرا تنگ تھا مگر اتنا بھی نہیں کہ میری سانس ہی رُک جاتی۔ اس کی رگڑ سے البتہ گردن پر خراش آنے کا خطرہ ضرور تھا۔ تاہم میں نے یہ سوچ کر صبر کر لیا کہیں میرا احتجاج مجھے پھر اُسی قفس میں واپس نہ بھجوا دے۔

طوق پہنانے کے بعد اُنھوں نے اُس میں چمڑے کی ایک لمبی پٹی باندھی اور مجھے اپنے ساتھ چلنے کا حکم دیا۔ وہ گھوڑوں پر سوار تھے اور میں پیدل تھا۔۔ میری ران کا زخم ابھی پوری طرح مندمل نہیں ہوا تھا اس لیے میں لنگڑاتے ہوئے اُن کے ساتھ دوڑنے لگا۔۔ مگر ایک مقام پر پتھر سے ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔

سپاہی اور تماشا دیکھنے والے آسوری قہقہے لگانے لگے۔

وہ سپاہی جس نے میرے طوق والی لگام اپنے گھوڑے کی زین سے باندھی تھی، گھوڑے کو آگے بڑھا کر مجھے گھسیٹنے لگا۔ اس پر رستم نے اُسے ڈانٹ دیا۔

"رُک جاؤ۔ یہ سادیہ کا غلام ہے۔ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔"

وہ رُک گیا۔

میں زمین سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

میرا دل اپنی توہین و تکلیف پر بُری طرح کڑھ رہا تھا۔

وہ مجھے خیمہ گاہ سے ایک ایسے مقام پر لے آئے جہاں ایک چوبی چہار دیواری بنی ہوئی تھی جس کی نگرانی پر گھڑ سوار مامور تھے۔ اُن گھڑ سواروں کا لباس اور ہتھیار عام سپاہیوں سے مختلف تھے جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ شاہ تمبور کے نہیں بلکہ سادیہ کے سپاہی ہیں۔

رستم نے آگے بڑھ کر دروازے پر متعین پہرے دار سے کچھ باتیں کیں۔۔۔ پھر پلٹ کر میرے پاس آیا اور مخصوص انداز میں آنکھیں سکیڑتے ہوئے مسکرا کر بولا۔

"خدا حافظ سردار سرفروش! مجھے اُمید ہے کہ تم اچھے غلام بن کر جلد از جلد سنہری طوق حاصل کر لو گے۔"

اس کی اس بات پر سپاہی پھر ہنس پڑے۔ میری سمجھ میں اب بھی نہ آ سکا کہ آخر وہ طلائی طوق کے ذکر پر کیوں ہنس پڑتے ہیں۔ جب رستم اور اس کے سپاہی چلے گئے تو مجھے نیزے کی زد پر چہار دیواری کے اندر لے جایا گیا۔

چار دیواری میں چھوٹے چھوٹے سیاہ خیموں کے درمیان ایک بہت بڑا خیمہ نصب تھا جس کے سامنے سُرخ گھوڑوں کی دُمیں لہرا رہی تھیں۔

جب ہم اس بڑے خیمے کے قریب سے گزرے تو مجھے اس کے اندر سے نسوانی قہقہوں کی آوازیں سنائی دیں اور خوشبو بھی آئی۔ اس خیمے میں جگہ جگہ گول سوراخ سے بنے ہوئے تھے جن پر پردے پڑے ہوئے تھے۔ ایک سوراخ کے سرکے ہوئے پردے سے مجھے ایک ایسا چہرہ جھانکتا دکھائی دیا جس کی سجوری آنکھوں کے نیچے نقاب پڑا ہوا تھا۔ یہ چہرہ اور یہ آنکھیں سادیہ کے سوا کسی اور کی نہیں ہو سکتی تھیں۔

چھوٹے خیموں کے آخر میں ایک اور چوبی چار دیواری بنی ہوئی تھی۔ اس چار دیواری کے چوبی ستون زمین میں گڑے ہوئے تھے اور اُن کے اُوپری نوک دار سروں پر چمڑے کی پٹیوں سے چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں بندھی ہوئی تھیں تاکہ اگر کوئی اُنھیں اکھیڑنے یا ان پر چڑھنے کی کوشش کرے تو ان کے ہلنے سے گھنٹیاں بج اُٹھیں اور نگہبانوں کو خطرے سے آگاہ کر دیں۔

یہ چار دیواری' انسانوں کا باڑہ تھی اور اس باڑے کے نگراں شاہ تمبور کے وہ سپاہی تھے جو جنگ میں حصہ نہیں لے سکتے تھے۔ اُن میں سے کچھ بوڑھے ہو گئے تھے اور کچھ معذور تھے۔ تقریباً ہر نگراں کے چہرے پر زخموں کے نشان نمایاں نظر آتے تھے۔ بعض کے ناک اور کان بھی کٹے ہوئے تھے۔ ان کے برعکس سادیہ کے سارے سپاہی جوان اور ہنسوڑ تھے۔ جیسے بات بات پر قہقہے لگانا بھی اُن کے فرائض میں شامل ہو۔

مجھے اس انسانی باڑے میں دھکیل کر دروازہ بند کر دیا گیا۔

گلے میں پڑے ہوئے طوق سے مجھے اُلجھن اور تکلیف محسوس ہو رہی تھی مگر یہ ہتھکڑیوں اور بیڑیوں سے بہرحال بہتر تھا۔ میں نے باڑے کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ اس کی دائیں اور بائیں جانب والی چوبی دیواروں کے ساتھ چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں سی بنی ہوئی تھیں جنھیں ڈربے کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ اُن کی چھتیں بہت نیچی تھیں اور ان میں داخل ہونے کے لیے آدمی کا کمر تک جھکنا لازمی تھا۔

ابھی میں ان ڈربوں کا جائزہ ہی لے رہا تھا کہ کہیں سے آواز آئی۔

"مجھ سے بات کرو، سردار سرفروش! میرے پاس آؤ کہ میں تمھارے پاس نہیں آ سکتا۔"

یہ آواز بائیں جانب کی کونے والی کوٹھری سے آئی تھی۔

میں نے آگے بڑھ کر اندر جھانکا۔

سامنے ایک ایسا آدمی لیٹا نظر آیا جس کی دونوں ٹانگیں گھٹنوں کے اُوپر سے کٹی ہوئی تھیں۔ وہ اپنے مضبوط ہاتھوں کے سہارے اُٹھتے ہوئے بولا۔ "خوش آمدید سردار سرفروش! میں اپنے اس محل سرا میں تشریف لانے پر آپ کا شکر گزار ہوں۔"

مجھے اُس کی خوش دلی پر بے حد تعجب ہوا۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ بولتا، وہ پھر کہنے لگا۔ "میرے خدّام بھاگ گئے ہیں اور میرے پاس آپ کی خاطر مدارات کے لیے کھانے پینے کی کوئی بھی چیز نہیں ہے۔ دُوسرے میں صاحبِ فراش ہوں۔ اُمید ہے کہ آپ میری مجبوری و معذوری کے تحت مجھے معاف کر دیں گے۔"

"آپ میرا نام کیسے جانتے ہیں؟" میں نے بھی لہجہ تعظیمی رکھا۔

وہ ہنس پڑا۔

"میں جادوگر نہیں ہوں سردار سرفروش! سارے تاتاری اور آسوری آپ کا نام جانتے ہیں۔ آپ کی شہرت آپ کے یہاں آنے اور قیدی بننے سے پہلے ہی پہنچ چکی تھی۔۔ اور پھر جب آپ نے سادیہ کے حکم کی تعمیل نہ کی تو آپ کی عظمت کچھ اور بڑھ گئی۔۔۔ لیکن یہی عظمت آپ کی دُشمن بھی بن گئی ہے۔ آخر میں آپ کو اس کا گراں قدر معاوضہ ادا کرنا پڑے گا۔"

میری چھٹی حس نے مجھے بتایا کہ یہ معذور ایک اچھا آدمی ہے اور اس پر کسی حد تک اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ میں مسکرانے میں کوئی عار نہ سمجھتے ہوئے گھاس پر بیٹھ گیا جو گندگی کا ڈھیر بن چکی تھی۔

"اس شہرت و عظمت کے باوجود مجھے ایسا کھانا نہیں دیا گیا جیسا کہ دیا جانا چاہیے تھا۔" میں نے کہا۔

"آپ کھانے کی بات کرتے ہیں۔۔۔ شکر کیجیے کہ آپ زندہ ہیں اور یہ بھی ایک معجزہ ہی ہے۔ میں نے سُنا ہے کہ سادیہ آپ کو دیکھتے ہی اپنا دل ہار بیٹھی تھی۔ اب اگر آپ اُس کے معیار پر پورے اُترے تو یہ آپ کی خوش بختی ہوگی چاہے مختصر وقت کے لیے ہی سہی۔"

اس کا مطلب تھا کہ سادیہ اور ملکہ ہوشی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ دونوں ایک ہی کشتی کی سوار ہیں۔ مَیں نے مسکراتے ہُوئے اُس معذور لیکن شائستہ و شگفتہ مزاج شخص کی طرف دیکھا تو میری نگاہ اس کے چہرے پر جم کر رہ گئی۔

مجھے اس کے خدوخال کچھ جانے پہچانے سے لگے... پھر مجھے یاد آ گیا کہ اُس کے نقش و نگار اور آنکھیں رُستم سے ملتی جُلتی ہیں۔ اُس نے مجھے اپنی طرف دیکھتے پاکر ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔

"مجھے بابر کہتے ہیں۔ جیسا کہ آپ نے میرے چہرے مہرے سے اندازہ لگایا ہوگا، مَیں آسوری نہیں ہُوں۔ میرا تعلق کاؤسا قبیلے سے ہے۔ آپ شاید یہ سوچ رہے ہوں کہ میری شکل شاہ تمبُور کے کمان دار رستم سے مشابہت رکھتی ہے۔"

"بلاشبہ وہ ایک ذہین آدمی ہے۔" مَیں نے اثبات میں سر ہلا کر تائید کر دی۔

"اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بھی کاؤسا قبیلے ہی کا ایک فرد ہے۔ آپ یقین کریں یا نہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم نے طویل عرصہ ایک ساتھ گزارا ہے، ایک ساتھ جنگیں لڑی ہیں... مگر اب مجھے اس حال میں دیکھ کر کون یقین کر سکتا ہے کہ کبھی وہ میرا ماتحت تھا اور مَیں اُس کا کمان دار ہُوا کرتا تھا۔"

"کوئی مانے یا نہ مانے مگر مجھے آپ کی بات کا یقین ہے۔" مَیں نے کہا۔

"شکریہ سردار سرفروش!" وہ بولا۔ "میرا خیال ہے کہ اب یہ آپ جناب والا تکلّف ختم کر دینا چاہیے۔ جب تک تکلّف کے پردے حائل رہیں، آدمی ایک دُوسرے کے قریب نہیں آ سکتے اور نہ ہی ایک دُوسرے کے دوست بن سکتے ہیں۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔" مَیں نے جواب دیا۔

"آپ نہیں، تم کہو۔ خیر اب پہلے کام کی ایک بات سُن لو۔ اب تم بے جا اکڑ نہ دکھاؤ، کوئی بڑی غلطی نہ کرو اور سادیہ کو فرماں برداری کا ثبوت بہم پہنچاؤ تاکہ تمھارا یہ چوبی طوق بہت جلد طلائی طوق میں بدل جائے۔"

"یہ طلائی طوق ہے کیا بلا؟ جب بھی اس کا ذکر آتا ہے، سپاہی ہنس پڑتے ہیں۔" مَیں نے پوچھا۔

"طلائی طوق اُس غلام کے گلے میں ڈالا جاتا ہے، جو سادیہ کے دل پر حکمرانی کرتا ہے۔ جسے وہ اپنا محبوب بنا لیتی ہے لیکن محبوب بنانے سے پہلے وہ اُس مَرد کی اَنا کچل دینا چاہتی ہے۔ مَیں مدّتوں سے یہاں اسیری کے دن کاٹتا آ رہا ہُوں اور میری آنکھوں نے بارہا یہ تماشا دیکھا ہے۔ سادیہ کو اپنے محبوب بدلتے رہنے کی عادت ہے۔ تم اُس کے نئے محبوب بنو گے مگر جیسا کہ مَیں بتا چکا ہُوں، وہ تمھارے قریب آنے سے پہلے جی بھر کے تمھاری توہین کرے گی۔ تمھاری خود اعتمادی اور اَنا کو ٹھوکریں لگائے گی اور پھر تمھارے قریب آ جائے گی۔ تم جتنی جلدی اپنے آپ کو فرماں بردار غلام ثابت کرو گے، اتنی ہی جلدی تمھارے مصائب ختم ہو جائیں گے۔"

"مگر عورتوں کی فرماں برداری میرے بس سے باہر ہے، بابر! دُرست میں خوفزدہ ہونے کے باوجود خوف کا اظہار کرنا اچھا نہیں سمجھتا۔ جس شب خاورِ اعظم کے دربار میں میری قسمت کا فیصلہ ہونے والا تھا، مَیں بُری طرح خوفزدہ ہو گیا تھا لیکن تب بھی مَیں نے گھٹنے ٹیکنے کی بجائے زندگی کا جُوا کھیلنا بہتر سمجھا اور آج اُسی کے نتیجے میں زندہ ہُوں۔ اب خود ہی بتاؤ کیا میرے لیے اُس کا تابع فرمان ہونا ضروری ہے؟"

"اُس رات جو کچھ ہُوا مجھے سب معلوم ہے۔" بابر نے کہا۔ "اسیروں میں خبریں اور ایسی باتوں کے چرچے بڑی تیزی سے پھیلتے ہیں۔ اسی لیے مجھے اُس رات کی ہر بات معلوم ہو چکی ہے... مگر تم اُس وقت غلام نہیں تھے دوست!... پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ ایک بار کارآمد ہونے والی ترکیب ہر بار اور ہر موقعے پر کارگر ثابت ہو۔ ہر فرد کی قوتِ برداشت کی ایک حد ہوتی ہے۔ نہ جانے سادیہ کی قوتِ برداشت کب جواب دے جائے۔ مَیں تو اتنا جانتا ہُوں کہ آدمی جب تک موت اور مصائب سے محفوظ رہ سکے، اُس کے لیے بہتر ہے۔ ہمارے کاؤسا قبیلے میں ایک کہانی زبانِ زدِ عام ہے۔ کہو تو سُنا دُوں؟"

"ہاں ہاں ضرور سُناؤ۔" مَیں نے کہا۔

"ایک بادشاہ اپنے درباری ساحر پر بہت بھروسا کرتا تھا۔ ہر کام اور ہر مہم پر روانہ ہونے سے پہلے ساحر سے مشورہ کرتا اور پیش گوئی کا طالب ہوتا۔ ساحر کی پیش گوئیاں ہمیشہ دُرست ثابت ہوئیں... مگر ایک ایسا وقت بھی آیا کہ ساحر کی ساری پیش گوئیاں جھُوٹی نکلیں اور بادشاہ نے اُس کا سر قلم کرنے کے احکامات جاری کر دیے۔ تب ساحر نے بادشاہ سے التجا کی کہ اُس کی یہ سزا ایک سال کے لیے ملتوی کر دی جائے تاکہ وہ اس عرصے میں بادشاہ کے کتّے کو اپنے جادو کے علم سے انسانی زبان میں بات کرنا سکھا دے جو ساحر کی موت کے بعد اُس کی یاد دلاتا اور بادشاہ کو محظوظ کرتا رہے گا۔ بادشاہ نے اس شرط پر اُس کی بات مان لی کہ اگر کتّے نے ایک سال بعد انسانی زبان میں کلام نہ کیا تو ساحر کو تیل کے کڑھاؤ میں بٹھا کر تیل آہستہ آہستہ گرم کیا جائے گا تاکہ ساحر انتہائی تکلیف کی موت سے ہمکنار ہو۔ جب ساحر کو ایک سال کی مہلت مل گئی تو اُس کے ایک دوست نے پوچھا کہ تم نے ایسا کیوں

ساحر بولا: "زندگی کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہوتا ہے مہدوشت! ایک سال تو بہت لمبا عرصہ ہے۔ اس دوران مَیں بغیر کسی تکلیف کے طبعی موت مر سکتا ہوں، بادشاہ کو موت آسکتی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ مَیں سال بھر میں کُتّے کو بولنا ہی سکھا دوں'... تو میرے عزیز سردار! سب سے اہم بات یہ ہے کہ زندہ رہو اور صرف فرماں برداری ہی تمھاری زندگی کی ضمانت بن سکتی ہے۔ ممکن ہے کہ آنے والا وقت اپنے دامن میں تمھارے لیے ایسی خوشیاں لائے جو ان سارے دُکھوں کی تلافی کر دیں۔"

مجھے بابر کی بات میں وزن محسوس ہُوا۔ کوئی نہیں جانتا کہ آنے والا کل اس کے لیے کیا لاتا ہے۔ حالات اچانک ہی اور غیر متوقع طور پر بھی بدل جایا کرتے ہیں اور انہونی بھی ہو جاتی ہے۔ مجھے ملکہ ہوشی سے بڑی توقعات تھیں لیکن اُس نے میرے لیے صرف اتنا کیا تھا کہ خادِ اعظم نے میرے تاوان کی وصُولی کے لیے اپنا جو پیغام فارس بھیجا تھا، اُس کی حفاظت اور رہنمائی کے لیے اپنا ایک آدمی اُس کے ساتھ بھیج دیا...

مَیں نے سوچا کہ دو تین ماہ بعد جب شاہ تمبور کے پیغام پر فارس سے جواب آئے گا کہ وہاں مجھے کوئی بھی نہیں جانتا تو خادِ اعظم میری تکابوٹی کیے بغیر نہیں رہے گا۔ اس لیے اس دوران جتنا وقت آرام سے گزر جائے بہتر ہی ہوگا، ہو سکتا ہے، ڈاکٹر فریدوں مجھے شاہ تمبور کے غیظ و غضب سے پہلے ہی واپس بُلالے۔ لہٰذا مجھے بابر کے مشورے پر ضرور عمل کرنا چاہیے۔

بابر جو میری طرف غور سے دیکھ رہا تھا، بولا: "مَیں نے تمھارا چہرہ پڑھ لیا ہے، سرفروش! میری بات تمھاری سمجھ میں آگئی ہے۔ میرا قیاس ہے کہ شاید تم اُن تبدیلیوں میں اہم کردار ادا کرو گے جن کے رُونما ہونے کی عرصہ دراز سے توقع کی جا رہی ہے۔"

"کیسی تبدیلیاں؟" مَیں نے تعجب سے پوچھا۔

"مَیں اُن کی وضاحت کرنے سے قاصر ہوں لیکن کچھ نہ کچھ ہوگا ضرور... خادِ اعظم اور ساویہ جو کبھی ایک دُوسرے سے شدید محبت کرتے تھے، اب ایک دُوسرے سے شدید نفرت کرتے ہیں لیکن وہ اقتدار میں برابر کے شریک ہیں اور ان میں سے کوئی ایک تنہا اپنی قوم پر حکمرانی نہیں کر سکتا۔ وہ ایک دُوسرے سے خائف ہیں جس کا احساس اُن کی پُوری قوم کو ہو چکا ہے۔ جوہڑ میں پھینکا جانے والا پتّھر جس طرح سطحِ آب پر لہروں کو جنم دے کر دائرے بناتا ہے بالکل اُسی طرح جوہڑ کی تہ میں بھی ہلچل کا باعث بنتا ہے۔ باہمی نفرت نے جہاں شاہ تمبور اور ساویہ کو بے سکون و مضطرب کر رکھا ہے، وہاں اُن کی قوم میں بھی بے چینی اور بے اطمینانی کا باعث بن گئی ہے لیکن چونکہ تمبور خاندان صدیوں سے اُن پر حکومت کرتا آرہا ہے۔ اس لیے کسی کو اُن سے بغاوت کی جرأت نہیں ہُوئی... مگر سال ہا سال سے لڑی جانے والی یہ جنگ جس پر ہر ماہ ہزار ہا آسوری نوجوان اپنی جانوں کی بھینٹ چڑھاتے آرہے ہیں، رنگ لا کر رہے گی۔ خادِ اعظم کی دیوانگی اُنھیں بغاوت پر اُکسا دے گی اور...!"

وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ کسی کو آتے دیکھ کر خاموش ہوگیا... پھر سہمتے ہوئے سرگوشی میں بولا: "خلیدی آرہا ہے۔ طلائی طوق آج اُسی کے گلے کی زینت ہے اور وہ ہمارا نگران اعلیٰ ہے۔ اُس کی حرکتوں پر ہرگز غصّے میں نہ آنا اور صبر سے کام لینا۔"

مَیں خاموشی سے خلیدی کا انتظار کرنے لگا۔

مجھے خوب احساس ہو چکا تھا کہ وہ طلائی طوق سے محروم ہونے والا ہے۔ اس لیے مجھے اپنا رقیب سمجھ کر مجھ پر بھرپُور تشدّد کرے گا۔ مَیں ذہنی طور پر تشدّد برداشت کرنے کے لیے تیار ہوگیا اور اُسے آتا دیکھنے لگا۔

وہ اگرچہ آسوری نسل سے تعلق رکھتا تھا لیکن عام آسوریوں کے برعکس خاصا کشیدہ قامت تھا۔ اُس کے خدوخال بھی تیکھے تھے اور اُس کے گلے میں ایک خوبصورت طلائی طوق چمک رہا تھا۔ اُس نے بڑے قرینے سے بال بنا رکھے تھے اور بے حد خوبصورت رنگین لباس پہنے ہوئے تھا۔

وہ ہاتھ میں چمڑے کا ایک چابک لیے کوٹھری میں داخل ہُوا اور میری طرف نفرت سے دیکھنے لگا۔

"تو تم وہ سردار سرفروش ہو جسے خاتون ساویہ کے ذاتی غلام کے فرائض انجام دینے ہیں؟" اُس نے بڑی نخوت سے کہا۔

مَیں نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا: "جی ہاں! مَیں ہی وہ سردار سرفروش...!"

مَیں اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ تڑاخ سے چابک میرے چہرے پر پڑا۔ ساتھ ہی خلیدی کی دھاڑ سُنائی دی۔

"کھڑے ہو کر ادب سے بات کرو۔"

وہ مجھ پر تابڑ توڑ چابک برسانے لگا۔ مَیں ضبط کرتا رہا حتیٰ کہ اُس کی سانس پھُولنے لگی اور میرا خون کھول اُٹھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میری رگ رگ میں چنگاریاں سی بھر گئی ہوں۔ بے اختیار میرا جی چاہا کہ مَیں اُس کی ٹانگیں چیر کر رکھ دوں۔ میرے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا البتہ مشکل یہ تھی کہ مَیں اپنے غصّے پر کس طرح قابو پاؤں؟

مَیں بُری طرح ہونٹ کاٹنے لگا۔

مجھ پر چابک برس رہے تھے اور مَیں اپنے آپ سے جنگ میں مصروف تھا۔ بالآخر مَیں اپنے اندر کے وحشی پر قابو پانے میں کامیاب ہوگیا اور لڑکھڑاتے ہوئے اُٹھنے لگا تو خلیدی نے غراتے ہوئے کہا۔

"تمھیں میرے سامنے جھکنا پڑے گا۔ جھکو... جتنا جھک سکتے ہو، اُس سے بھی زیادہ جھکو۔"

مَیں اُس کے سامنے جھک گیا اور میری ہونٹ کاٹنے کی رفتار تیز ہوگئی۔

جھکتے وقت مَیں نے دیکھا تھا کہ وہ مارے خوف کے دو قدم پیچھے ہٹ گیا ہے... لیکن مَیں نے اپنے تاثرات چھپانے کے لیے جونہی سر جھکایا، اُس خبیث نے میرے سر اور شانوں پر تابڑ توڑ مُکّے مارنے شروع کر دیے۔

مجھے بابر کی بات یاد آگئی کہ زندہ رہو... اور مَیں نے یہ سوچ کر اپنے شانوں پر پڑنے والے مُکّوں کی گنتی شروع کر دی کہ وقت آنے پر خلیدی کا یہ قرض ضرور چُکاؤں گا۔

وہ مارتے مارتے تھک گیا تو چابک سے دُوسرے ڈبّے کی طرف اشارہ کرنے لگا۔

"وہ ہے، تمھارا ڈربہ... جب تک مَیں تمھیں باہر آنے کے لیے نہ کہوں، تم اُسی میں بند رہو گے اور اس بڈھے احمق سے بات نہیں کرو گے۔"

یکایک اُس نے چابک سے بابر کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے اُسے مخاطب کیا: "اور تم بھی سمجھ گئے، او بڈھے گیدڑ! مَیں تمھاری نگرانی کراؤں گا۔ اگر مجھے یہ پتہ چلا کہ تم نے اس اڑیل ٹٹو سے بات کی ہے تو تم اپنی موت کی دُعائیں مانگنے پر مجبور ہو جاؤ گے۔ مَیں تو کب کا تمھیں کُتّے کی موت مار چکا ہوتا مگر خاتون ساویہ ایسا نہیں چاہتی... پھر بھی مَیں اس طرح تمھاری چمڑی اُدھیڑ دوں گا کہ تم مرنا زیادہ پسند کرو گے۔"

وہ ایک بار پھر میری طرف پلٹا اور چابک برساتے ہُوئے دھاڑنے لگا۔

"غلاموں کا کوئی خطاب نہیں ہوتا، غلیظ خچر!... اب تم سردار نہیں ہو۔ اگر خاتون ساویہ کو لفظ خنزیر سے کراہت محسوس نہ ہوتی تو مَیں تمھیں یہی نام دیتا۔ جب تک وہ تمھارے لیے کوئی نام تجویز نہیں کرتی، تم صرف سرفروش کہلاؤ گے۔ کل سے تمھیں کام کرنا ہے۔ تم غلاموں کی طرح سر جھکا کر چلو گے اور جب تک مَیں حکم نہ دُوں، تم اپنی نظریں نیچی ہی رکھو گے۔ سمجھ گئے، آقائے خنزیر؟"

"جی ہاں، سمجھ گیا۔" مَیں نے نگاہیں اُٹھائے بغیر جواب دیا۔

وہ پاگلوں کی طرح قہقہے لگانے لگا لیکن اُس کے قہقہوں سے احساسِ شکست جھلک رہا تھا۔ اس کے قہقہے کھوکھلے تھے۔

معاً وہ ہنسنا چھوڑ کر ایک بار پھر بابر کی طرف متوجہ ہوگیا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ساویہ تمھیں موت کے گھاٹ اُتارنے کی اجازت کیوں نہیں دیتی۔" اس کے لہجے میں حیرت اور تجسّس کے تاثرات تھے... پھر وہ میری طرف متوجہ ہو گیا۔

"مَیں کل پھر تم سے نمٹوں گا۔" اس تنبیہہ کے ساتھ ہی وہ دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ دروازے پر متعین پہرے دار اُس کے سامنے سرنگوں ہو گئے۔ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر جانے لگا تو پہرے داروں کے تاثرات بدل گئے۔ اُن کی خوشامدانہ مسکراہٹ نفرت میں بدل گئی۔

مَیں یہ دیکھ کر ہنسے بغیر نہ رہ سکا۔

اتنے میں مجھے بابر کی سسکاری سُنائی دی۔ ساتھ ہی اُس کی مدھم آواز آئی۔

"دیوار سے پیٹھ لگا لو اور ہونٹ ہلائے بغیر بات کرو۔ پہرے دار جانتے ہیں کہ ہم قیدی باتیں کیا کرتے ہیں لیکن جب تک ہمارے ہونٹ نہ کھلیں، اُنھیں کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ وہ بھی ہماری طرح خلیدی سے نفرت کرتے ہیں۔"

"ہاں! مجھے بھی اس کا اندازہ ہو چکا ہے۔" مَیں نے بند ہونٹوں کے ساتھ جواب دیا۔

"دُنیا میں ہر جگہ نفرت کا دَور دَورہ ہے سرفروش! مَیں نے اپنے ملک میں بھی، جو یہاں سے دو ماہ کی مسافت پر ایک فلک بوس پہاڑ کے دامن میں واقع ہے، نفرت ہی کو پھُولتے پھلتے دیکھا۔ انسان تعداد میں تو بڑھ رہے ہیں مگر انسانیت گھٹتی جا رہی ہے۔ خیر... مَیں تو ڈر گیا تھا کہ کہیں تم غصّے میں آکر خلیدی کو مار ہی نہ ڈالو۔"

"میرا جی تو یہی چاہتا تھا مگر مَیں نے زہر کا گھونٹ پی لیا۔" مَیں نے لب بستہ جواب دیا۔

"اگر تم صرف احتجاج بھی کرتے تو سارا کھیل بگڑ جاتا۔ ساویہ کا دل اُس سے بھر چکا ہے اور وہ جانتا ہے کہ اب کسی بھی لمحے، تم ز ابل بننے والا ہے۔ اس لیے وہ تمھیں قتل کر ڈالتا۔ بعد میں چاہے اُسے خود بھی ہلاک ہونا پڑتا لیکن تمھاری جان تو ضائع ہو جاتی۔ بہر حال لعنت بھیجو اس پر... کوئی اور بات کرو۔"

"تم کچھ تبدیلیوں کا ذکر کر رہے تھے جو یہاں رُونما ہونے والی ہیں۔" مَیں نے یاد دہانی کرائی۔

"ہاں... لیکن وہ کب رُونما ہوں گی مَیں یقین سے نہیں کہہ سکتا تاہم مجھ سے وعدہ کرو، سردار سرفروش کہ تم یہ تبدیلیاں لانے یا انقلاب برپا کرنے میں نہ تو تنہا آگے بڑھو گے اور نہ ہی جلد بازی سے کام لو گے۔ یہ سارا عمل خود بخود اور اپنے آپ ہی ہوگا۔"

"مَیں وعدہ کرتا ہُوں کیونکہ مجھے تم پر اعتماد ہے۔" مَیں نے جواب دیا

"شکریہ سرفروش! میں بھی اسی وقت کا منتظر ہوں کیونکہ میں یہاں مرنا نہیں چاہتا... اور یہ بات بھی اچھی طرح ذہن نشین کر لو کہ یہ صرف میری قیاس آرائی ہے۔ جیسا کہ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ رستم میرا اہم وطن اور ایک عظیم جنگجو ہے۔ ہم لوگ کرائے کے سپاہی ہیں جو دُوسرے قبیلوں کے لیے لڑتے ہیں۔ اس بار میں آسُوریوں کے خلاف اور رستم آسُوریوں کے لیے برسرِ پیکار ہوئے تو وہ قبیلہ جنگ ہار گیا جس کی طرف سے میں لڑ رہا تھا۔ مجھے قیدی بنا لیا گیا تو خادِ اعظم نے میری گردن اُڑانے کا حکم دے دیا مگر رستم نے میرا سر قلم کرنے کی بجائے میری ٹانگیں کٹوا دیں اور مجھے مرنے سے بچا لیا۔ اُس نے ایسا کیوں کیا، میں نہیں جانتا۔ اب جبکہ ساویہ اور خادِ اعظم کے درمیان نفرت کی سرد جنگ جاری ہے، وہ تنے ہُوئے رسّے پر چلنے والے بازی گر کی طرح محتاط انداز اختیار کیے ہوئے ہے کیونکہ ایک طرف تو شاہ تمبُور اُس پر اعتماد کرتا ہے اور دُوسری جانب ساویہ بھی اُس کی مدد کے بغیر کچھ نہیں کر سکتی۔ رُستم کسی ایک کو بھی اپنے خلاف شک و شبہے میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا۔ وہ صرف اسی فریق کا ساتھ دینا پسند کرتا ہے جو فاتح ہو لیکن تمھارے قیدی بن کر یہاں آ جانے سے صُورتِ حال پیچیدہ ہو گئی ہے۔"

"وہ کیسے؟" میں نے تجسس سے پُوچھا۔

"تم نے آسُوری سورماؤں کے سرخیل کو موت کے گھاٹ اُتار دیا جو رستم کے لیے ناممکن تھا۔ تمھیں دیکھنے کے بعد میں بھی یہ سوچنے پر مجبُور ہو گیا ہوں کہ ساویہ تم سے اپنی ذاتی خدمت ہی نہیں بلکہ کوئی اور کام بھی لینا چاہے گی۔" بابر نے وضاحت کرتے ہوئے کہا "اگر میرا یہ خیال درست ثابت ہُوا تو وہ پہلے تمھیں اچھی طرح آزمائے گی، پھر دل کی بات زبان پر لائے گی لیکن ساویہ بھی اپنے بھائی کی طرح خونخوار، وحشی اور پاگل ہے۔ اُس کے برسرِ اقتدار آنے پر بھی جنگ یُونہی جاری رہے گی۔ امن صرف اُسی وقت ہو سکتا ہے جب دونوں بہن بھائی ختم ہو جائیں۔ رُستم بھی یہ بات اچھی طرح جانتا ہے۔ اس لیے وقت آنے پر وہ تمھیں اپنا ساتھی دیکھنا چاہے گا۔"

میں نے بابر کی باتوں پر غور کیا تو یہ باتیں میرے دل کو لگیں۔ اس کا تجزیہ حالات بڑی حد تک درست تھا۔

"تم کہتے ہو کہ شاہ تمبور پاگل ہے مگر اُس رات تو وہ مجھے اچھا بھلا دکھائی دیا تھا۔" میں نے کہا۔

"اس پر پاگل پن کے دورے پڑتے ہیں، سرفروش۔ تب کوئی مرد یا عورت اور خصوصاً کم عمر لڑکیاں اُس کی دیوانگی سے محفوظ نہیں رہتیں۔ وہ اُن کے لیے درندہ بن جاتا ہے۔"

مجھے یہ سُن کر جھرجھری سی آ گئی۔

"بچیوں کے والدین کچھ بھی نہیں کرتے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتے ہیں کہ اپنی بچیوں کو چھپا لیں یا محتاط انداز میں اُس کی درندگی پر ماتم اور شکوہ کر لیں... لیکن اگر شاہ تمبور کو ان باتوں کی بھنک بھی پڑ جائے تو وہ انھیں سُولی پر لٹکا دیتا ہے۔ جب دیوانگی کا یہ دورہ ختم ہو جاتا ہے تو وہ اپنے دیوتا اُدبل کے بُت کے سامنے گڑگڑاتا ہے، فریادیں کرتا ہے اور اپنی درندگی کا شکار ہونے والی بچیوں کے والدین کو انعام و اکرام سے نوازتا ہے مگر اس بار ایک بچی کے باپ نے خادِ اعظم پر قاتلانہ حملہ کر دیا تھا۔ شاہ تمبور تو بچ گیا لیکن اس بچی کے باپ کی لاش ابھی تک سُولی پر جھُول رہی ہے۔"

"ہاں، میں نے کچھ لوگوں کو سُولی پر لٹکے دیکھا تھا۔ کیا خادِ اعظم آتش پرست نہیں ہے؟"

"نہیں... اس نے ایک خود ساختہ دیوتا سے ساری اُمیدیں وابستہ کر رکھی ہیں۔" بابر نے جواب دیا۔ "بہرحال اس بچی کے باپ نے جلد بازی سے کام لیا تھا۔ ہم لوگوں میں ایک کہاوت مشہور ہے کہ اس انتقام کا پھل زیادہ میٹھا ہوتا ہے جو طویل عرصے بعد لیا جائے۔ تم بھی ہماری یہ کہاوت ذہن نشین کر لو۔" بابر نے مجھے نصیحت کی۔

"تم اس بونے ایلچی کے متعلق بھی کچھ جانتے ہو؟" میں نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔ میں بڑی دیر سے یہ سوال کرنے کے لیے بے چین تھا۔

بابر کچھ دیر تک سوچتا رہا... پھر بولا: "میں نے اُسے دیکھا ہے لیکن مجھے نہ تو اس کی کسی اچھائی کا علم ہے اور نہ ہی کوئی بُرائی میرے علم میں ہے۔ میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ شاہ تمبور کا حامی ہے یا ساویہ کا طرف دار ہے، بہرکیف! وہ اپنی نوعیت کا واحد آدمی ہے اور میں اس کے علاوہ مارلو کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔"

اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے کرتے شام ہو گئی۔

پہرے داروں نے چار بڑی بڑی مشعلیں روشن کر کے اس انسانی باڑے کے چاروں کونوں میں گاڑ دیں اور کچھ غلام ہمارے لیے کھانا لے آئے۔ آج بھی کھانے میں گھوڑے کا گوشت تھا مگر روٹی کچھ بہتر اور بروس کا گلاس قدرے بڑا اور عمدہ تھا۔

میں نے کھانا کھایا، بروس پی اور لیٹ گیا۔

بابر کو شاید مسلسل بولنے کی عادت تھی یا وہ باتیں کرنے کو ترسا ہُوا تھا، اس لیے وہ ہونٹ بند کیے بغیر بولتا رہا اور میں سُنتا رہا۔ آج بروس پینے کے بعد مجھے نشہ نہیں ہُوا تھا اور نہ ہی غنودگی تھی بلکہ مجھ پر ایک قسم کی غنودگی سی طاری ہو گئی تھی۔ اس غنودگی کے عالم

میں میں بابر کی شاعری سُنتا رہا کہ وہ اپنے قبیلے کا ایک مقبُول شاعر بھی تھا لیکن اُس کے اشعار نے میرے لیے لوری کا کام کیا اور مجھے نیند آنے لگی۔

سونے سے پہلے آخری بات میں نے یہی سوچی کہ اگر اس وقت ڈاکٹر فریدوں مجھے واپس بُلا لے تو کیسا رہے؟... میں جو اتنے مصائب کا شکار ہُوا تھا، جس نے خلیدی کا تشدد برداشت کیا تھا، جس نے اپنی اَنا کچل کر اُس کے سامنے سر جُھکایا تھا، ساویہ کو دیکھے، اُس کے قُرب و لذّت سے آشنا ہُوئے بغیر اپنی دُنیا میں واپس چلا جاؤں تو کیسا محسوس ہو گا؟

میرا ذہن اس سوچ کا جواب نہیں دے پایا تھا کہ میں نیند کی وادی میں اُتر گیا اور نہ جانے کتنی دیر کے لیے اس سہانی اور سکون بخش وادی میں گُم ہو گیا۔

●

مجھے ساویہ کے نجی غلام کی حیثیت سے کام کرتے ایک ہفتہ ہونے کو آیا تھا۔ مجھے ہر صبح ان خیموں میں پہنچا دیا جاتا جو قبیلے کی خواتین کے لیے مخصُوص تھے۔ وہاں میں پہلے جھاڑو لگاتا اور پھر برتن مانجھتا۔ اس دوران میں آسوری لڑکیوں کی نقاب سے اُوپر جھانکتی ہُوئی سیاہ آنکھیں مجھے اشتیاق سے دیکھتیں مگر زیرِ نقاب ہونٹ مجھ پر پھبتیاں کستے رہتے۔ ہرچند کہ میرا سر جُھکا رہتا تھا لیکن میری آنکھیں ساویہ کی متلاشی رہتی تھیں جو اُن دنوں کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی اور نہ ہی اُس کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی تھی۔ البتہ ایک روز اُس کے خیمے سے بونے مارلو کی آواز ضرور سُنائی دی تھی۔

اس آواز سے مجھے یہ پتہ چل گیا کہ شاہ تمبور پر دیوانگی کا دَورہ پڑنے کی علامات پھر ظاہر ہونے لگی ہیں۔

خواتین کے خیموں میں جب کوئی کام نہ ہوتا تو مجھے باہر کام پر لگا دیا جاتا۔ کبھی مجھے بیت الخلا کے لیے گڑھے کھودنے پڑتے اور کبھی چھکڑوں کی مرمت کرنا پڑتی۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہُوئی کہ آسوری چھکڑوں کے پہیوں اور دھُروں کو تیل دینے سے آشنا نہیں تھے۔ کبھی کبھی مجھے اُن چرواہوں کی بھی مدد کرنا پڑتی جو گھوڑوں کے ریوڑوں کی نگہبانی کیا کرتے تھے۔

اس دوران میں میری اس طرح نگرانی کی جاتی رہی جیسے شاہ تمبور کے ذاتی دیوتا اُدبل کے مجسمے کی ہوتی تھی۔ ادبل کا مجسمہ ایک بڑے سیاہ چھکڑے میں رکھا ہُوا تھا اور اس چھکڑے میں خادِ اعظم کے علاوہ کوئی داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ ساویہ کو بھی اُس چھکڑے میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔

میں عورتوں کے خیموں میں کام کرنے کی بجائے باہر کام کرنا زیادہ پسند کرتا تھا کیونکہ یہاں مجھے خلیدی کو جان سے مارنے کی خواہش دبانے کے لیے اپنے آپ سے لڑنا نہیں پڑتا تھا۔ وہ خبیث نسوانی حصّے میں، مجھے عورتوں کے سامنے کوڑے مارا کرتا تھا جو میرے لیے ناقابلِ برداشت سزا ہوتی تھی اور ضبط کا دامن میرے قابُو میں رہنا دُشوار ہو جاتا تھا۔

رات کو جب مجھے دوبارہ انسانی باڑے میں بند کیا جاتا تو میں اور بابر باتیں کیا کرتے بلکہ بابر ہی باتیں کرتا اور میں سُنتا رہتا تھا۔

دُوسرے ہفتے کے پہلے روز میں خاک میں لتھڑا ہُوا کھانا کھا رہا تھا کیونکہ خلیدی نے اُسے زمین پر اُلٹ دیا تھا کہ اتنے میں ساویہ اپنے خیمے سے برآمد ہُوئی۔ اُس نے حسبِ معمُول آنکھوں کے نیچے نقاب ڈالا ہُوا تھا لیکن اُس کے بالائی لباس کے بند کھُلے ہُوئے تھے اور اُس کی سرکشی عیاں تھی۔

وہ ہماری طرف بڑھنے لگی۔

میری نگاہیں اُس کے لچکتے ہُوئے سراپا پر جم گئیں۔

اچانک خلیدی نے میرے چہرے پر چابک مارتے ہُوئے کہا۔ "نگاہ نیچی رکھو سردار خنزیر!"

میں نے نگاہ جُھکالی لیکن دل تھا کہ بُری طرح مچلا جا رہا تھا۔ ساویہ قریب آئی تو میرے اندر کا وحشی جاگ اٹھا لیکن میں مجبُور تھا۔

خلیدی نے اُس کے سامنے سرنگوں ہوتے ہوئے کہا: "صبح بخیر خاتون ساویہ! اُدبل کی قسم آپ کے حُسن نے صبح کا حُسن دوبالا اور آپ کی خوشبُو نے ہواؤں کو معطّر کر دیا ہے۔ آپ کی نوازشوں کے بوجھ تلے دبا ہُوا یہ طلائی طوق بردار غلام اپنی مالکہ و محسنہ کی کیا خدمت کر سکتا ہے؟"

"اس بدبُو کے مارے غلام کو غسل کرواؤ، خلیدی! اس سے تو اُس لاش جیسی بدبو آ رہی ہے، جو کئی روز سے سڑ رہی ہو اور جسے گِدھ بھی کھانا پسند نہ کریں۔ اسے اچھی طرح رگڑ کر غسل کروانا۔ میری کنیزیں اس کے لیے لباس بھیج دیں گی۔"

یہ کہہ کر وہ پلٹی اور وہاں سے چلی گئی۔

خلیدی اور میں اُسے جاتے ہُوئے دیکھتے رہے... پھر جب خلیدی میری طرف گھُوما تو اُس کی آنکھوں میں خوف و دہشت کے سائے تیر رہے تھے اور وہ پسینے میں شرابُور تھا۔

"تمھارا وقت ختم ہو گیا ہے، خلیدی! اب میرا دَور شروع ہونے

والا ہے" میں نے کہا۔

اتنا سنتے ہی وہ آپے سے باہر ہوگیا اور مجھ پر چابک برسانے لگا لیکن آج چابک کی ہر ضرب کے ساتھ میرے ہونٹوں کی مسکراہٹ بڑھتی جارہی تھی۔ یہاں تک کہ وہ نڈھال ہوگیا اور اس میں چابک مارنے کی بھی سکت نہیں رہی... مگر میرے ہونٹوں پر اب بھی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

اُس کا قرض ادا کرنے کا وقت آگیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد مجھے گرم پانی کے ایک بڑے چوبی ٹب میں بٹھا دیا گیا اور وہی لڑکیاں جو مجھ پر پھبتیاں کستی تھیں' میرا جسم رگڑ رگڑ کر دھونے لگیں۔ اب اُن کا رویّہ یکسر بدل گیا تھا اب وہ مجھ سے ہنس ہنس کر باتیں کررہی تھیں۔

میری داڑھی اور سر کے بال تراشے گئے' مجھ پر عطر چھڑکا گیا اور مجھے خوبصورت لباس پہنایا گیا۔

میں دل ہی دل میں خوش ہورہا تھا کہ اب مجھے ساویہ کے خیمے میں لے جایا جائے گا لیکن اُنھوں نے دوبارہ میرے گلے میں وہی چوبی طوق ڈال دیا اور مجھے اُسی چار دیواری کے پہرے داروں کی تحویل میں دے کر چلے گئے۔

مجھے بڑی مایوسی اور کوفت ہوئی۔

اس کا مطلب تھا کہ ساویہ مجھ سے چوہے بلّی کا کھیل کھیل رہی تھی۔ مگر دُوسرے ہی لمحے جب ایک پہرے دار نے مجھے آنکھ مارتے ہوئے بتایا کہ ساویہ کے حکم پر میرا چوبی طوق اتارا جارہا ہے تو مجھے یقین نہ آیا۔ اُس نے میرے گلے سے طوق نکال دیا۔

"مجھے خوشی ہے کہ غلیدی کا خاتمہ ہوگیا!" پہرے دار بولا۔

"یہ چوبی طوق مجھے دے دو" میں نے کہا۔

"کیوں؟" اس کے لہجے میں حیرت تھی "کیا اس کے اتنے ہی عادی ہوگئے ہو کہ اس کے بغیر سو بھی نہیں سکو گے؟"

اب میں اُسے کیا بتاتا کہ یہ طوق مجھے کیوں چاہیے۔ دراصل میں نے اس انسانی باڑے میں آنے اور بابر سے ملنے کے بعد ایک ترکیب سوچ لی تھی اور اُسی ترکیب کے تحت اُس وقت ایک چاقو بھی اُڑا لیا تھا' جب میری داڑھی اور بال تراشے جارہے تھے۔

پہرے دار نے مجھے خاموش دیکھ کر کہا "اگر تمھیں یہ طوق اچھا لگتا ہے تو لے جاؤ اور اپنے دوست کے ساتھ جی بھر کے باتیں بھی کرلو کیونکہ اب تم پر کوئی روک ٹوک نہیں ہے!"

میں طوق اُٹھا کر سیدھا بابر کے ڈربے میں آگیا۔

بابر نے مجھے بنا سنورا دیکھا تو بہت خوش ہوا۔

"دیکھا۔ میں نہ کہتا تھا کہ اچھا وقت جلد آجائے گا مگر اب یہ طوق کیوں اُٹھائے پھرتے ہو؟" اس نے حیرت سے کہا۔

میں نے وہ طوق اور چاقو اُسے دیتے ہوئے کہا "یہ دونوں چیزیں اپنے پاس رکھو!"

چاقو دیکھ کر وہ سٹپٹا گیا "تم نے یہ چاقو چُرا کر اپنی جان داؤ پر لگادی ہے' میرے دوست۔ اگر تم پکڑے جاتے تو وہ اُسی وقت تمھاری بوٹیاں کردیتے اور اگر یہ میرے لیے لائے ہو تو یہ میرے کس کام کا؟ میں تو ویسے بھی ٹانگوں سے محروم اور معذور ہوں"

"تم اس طوق سے چار چھوٹے چھوٹے پہیے بنالینا... پھر میں کہیں سے تمھیں ایک تختہ لادوں گا۔ اس طرح تمھارے لیے ایک چھوٹی سی گاڑی بن جائے گی" میں نے اُسے وہ ترکیب بتادی جسے میں نے خاص طور سے سوچا تھا۔

"لیکن اس سے کیا فائدہ ہوگا' سرفروش؟"

"ہوسکتا ہے کہ وہ انقلاب جلد ہی آجائے گا جس کی تمھیں توقع ہے۔ تمھیں اُس وقت کے لیے تیار رہنا چاہیے!"

"کیا تمھیں کوئی نئی بات معلوم ہوئی ہے؟" اُس نے پوچھا۔

"نہیں... لیکن اب مجھے تھوڑی بہت آزادی نصیب ہوگی تو کچھ معلومات بھی حاصل ہوہی جائیں گی!"

"میں نے تمھیں کہا تھا کہ جلدی مت کرنا۔ طلائی طوق کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تمھیں آزادی مِل گئی ہے۔ اب تم پر غلامی کا بوجھ اور بھی بڑھ جائے گا۔ تم ساویہ کو نہیں جانتے۔ وہ بے حد متلون مزاج کی عورت ہے۔ اس سے یہ بعید نہیں کہ تمھارے ساتھ چند لمحے گزارنے کے بعد دُوسری صبح تمھیں سُولی پر چڑھوادے!"

"ایسا نہیں ہوگا بابر... ابھی تک اُس کا مجھ جیسے آدمی سے پالا ہی نہیں پڑا۔ یقین رکھو' مجھے آزمانے کے بعد اس کے ذہن میں کوئی نیا تجربہ جنم ہی نہیں لے سکتا... مگر مجھے ایک بات بتادو۔ میں نے تم سے بونے مارلو کے بارے میں پوچھا تھا تو تم نے مجھے ٹال دیا تھا۔ دیکھو بابر! میرا خیال ہے کہ میں' تم' رستم اور وہ پُراسرار بونا ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ مجھے صرف اتنا بتادو کہ مارلو دشمن ہے یا دوست؟"

بابر نے اپنا گنجا سر کھجاتے ہوئے کچھ سوچا پھر بولا "میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بس اتنا ہی جانتا ہوں کہ وہ رستم کی طرح شاہ تیمور کا آدمی ہے لیکن اگر کبھی وہ تمھارے پاس کوئی پیغام لے کر آئے تو اُس پر اعتماد کرلینا حالانکہ یہ بھی خطرناک سی بات ہے۔ تاہم کبھی کبھی خطروں سے بھی کھیلنا ہی پڑتا ہے البتہ یہ احتیاط ضرور برتنا کہ خود نہ اُس سے ملنا اور نہ ہی اُسے اعتماد میں لینے کی کوشش کرنا!"

تقریباً ایک گھنٹے بعد کچھ پہرے دار آتے دکھائی دیے۔

"یہ تمھیں ساویہ کے پاس لے جانے کے لیے آئے ہیں۔ احتیاط برتنا تاکہ ہم تم زیادہ عرصے تک زندہ رہ سکیں" بابر نے زیر لب کہا۔

"فکر نہ کرو بابر... اور اپنے لیے پہیے ضرور تیار کرلینا۔ میں تمھیں اور تمھاری ہدایات نہیں بھولوں گا" میں نے جواب دیا۔

میں پہرے داروں کے ساتھ چل پڑا۔

وہ مجھے ایک چھوٹے سے خیمے میں لے آئے جو خواتین کے خیموں کے باہر لگایا گیا تھا۔ اس خیمے میں ایک پہرے دار طلائی طوق کپڑے سے صاف کررہا تھا۔ یہ کپڑا خون آلود تھا۔ مجھے یہ سوچ کر بے حد دُکھ ہوا کہ اب میں غلیدی کا قرض نہیں چُکا سکوں گا کیونکہ کپڑے پر لگے دھبّے اُسی کے خون کے تھے۔

پہرے دار نے طلائی طوق ایک آدمی کو دیتے ہوئے کہا "یہ طوق اسے پہنادو۔ آج سے یہ خاتون ساویہ کی خواب گاہ میں کام کرے گا"

اس تبصرے پر سارے پہرے دار ہنس پڑے۔

اُن میں سے ایک بولا "غلیدی میرے اندازے سے کہیں زیادہ عرصے چل گیا اور میں شرط میں دو گھوڑے ہار گیا"

"ہاں..." دُوسرا بولا "وہ کمبخت دُوسروں کی بہ نسبت زیادہ دنوں تک ساویہ کا رفیق رہا..." پھر اُس نے... میری طرف دیکھا اور اُنگلیوں پر گنتے ہوئے کہنے لگا "دو سال کے دوران تم خاتون ساویہ کے گیارھویں غلام ہو۔ اگر تم دیوتا اُدبی کے معتقد ہو تو اپنی بخشش کے لیے ابھی سے دُعائیں مانگنا شروع کردو"

میں خاموش کھڑا رہا۔

وہ پہرے دار جو مجھے طوق پہنا رہا تھا' بولا "یہ طوق اس کے لیے چھوٹا ہے کیونکہ اس کی گردن کسی بھینسے کی طرح موٹی ہے۔ ساویہ کو اس کے لیے نیا طوق بنوانا پڑے گا"

"یا پھر اسے غلام تبدیل کرنا پڑے گا" خیمے والا پہرے دار بولا۔

"چلو جلدی کرو' وہ بے تابی سے اس کی منتظر ہوگی"

وہ مجھے ساویہ کے بڑے خیمے کے دروازے پر متعین ایک پہرے دار کے حوالے کرگئے۔ وہ مجھے لے کر اندر داخل ہوا تو پتہ چلا کہ اس خیمے کو مختلف حصّوں میں تقسیم کردیا گیا ہے۔ ہم جس راہ داری سے گزر رہے تھے' اُس میں دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔

"میں بزدل ہوں ورنہ اب تک وہاں پہنچ چکا ہوتا' جہاں تم جارہے ہو" پہرے دار نے بڑی حسرت سے کہا۔

راہ داری کے اختتام پر ایک سنہری پردہ آویزاں تھا۔ پہرے دار مجھے اندر جانے کا اشارہ کرکے پلٹ گیا۔ میں نے پردہ ہٹایا اور اندر داخل ہوگیا۔ خیمے کا یہ حصّہ ایک کمرے کی مانند تھا جس کے بیچوں بیچ میز جتنے اُونچے شمع دان پر ایک موم بتی جل رہی تھی۔ فرش پر قالین اور ایک جانب ایک بستر بچھا ہوا تھا لیکن یہ بستر ملکہ ہوشی کے بستر کی طرح گول نہیں بلکہ چوکور تھا۔ کمرے میں مُشک کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی اور موم بتی کی مدّھم روشنی میں ہر شے دُھندلی دُھندلی سی دکھائی دے رہی تھی۔

... میری آنکھیں اس مدّھم روشنی میں مرمریں انسانی مجسّمے پر جم گئیں۔ مگر آج بھی اُس نے نقاب ڈالا ہوا تھا۔ اُس کے شب رنگ بال شانوں پر لہرا رہے تھے اور اُس نے پاؤں میں سونے کے کڑے پہن رکھے تھے۔

میں بُت بنا اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔

"کیا تم اب بھی میرے سامنے نہیں جُھکو گے؟" اس نے مترنم آواز میں کہا۔

میں اس سوال کا جواب دینے کے لیے تیار تھا ہر چند کہ پچھلے چند روز سے میں جُھکتا اور سرنگوں ہوتا آیا تھا لیکن اب ایک بد مزاج خطرے سے کھیلنا چاہتا تھا۔ میں نے اپنے ہاتھ سینے پر باندھ لیے اور کہا۔

"خاتونِ محترم! میں سمجھتا ہوں کہ آپ کا مقصد مجھے گھٹنوں کے بل جُھکانا نہیں بلکہ ایک بہادر مرد کا حصول ہے۔ اگر میرا یہ خیال غلط ہے تو آپ جو چاہیں مجھے سزا دے سکتی ہیں۔ میں محبت کے ایک بول پر سر جُھکانے کی بجائے سر کٹوانے میں بھی دریغ نہیں کروں گا"

میری اس بات پر اُس کی آنکھوں میں چمک آگئی۔

باریک نقاب کے پیچھے سے ہونٹوں کی کلیاں نیم وا ہوتی دکھائی دیں جو مسکراہٹ کی غمّاز تھیں۔

میں دل ہی دل میں خوش ہوگیا۔

میرا تیر نشانے پر بیٹھا تھا۔

"اچھا تو تم ایسا سمجھتے ہو' سرفروش! مجھے تمھاری جرأت پر حیرت ہے لیکن اس وقت تم ٹھیک سمجھے ہو۔ میں نے تمھیں بہت قریب سے دیکھا ہے اور اس طرح تمھاری نگرانی کرتی رہی ہوں کہ تمھارے فرشتوں کو بھی علم نہ ہوسکے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تم ایک تابلِ مرد ہو... لیکن ایک بات یاد رکھنا۔ میں ایک بار تنبیہہ کے بعد دُوسرے انتباہ کا موقع نہیں دیا کرتی!"

یہ کہہ کر اُس نے تالی بجائی تو ایک جانب کا پردہ ہٹا اور اس کے دو نوجوان اور خوش شکل محافظ اندر آگئے۔

میں اُنھیں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ یہ بڑے ہنس مکھ جوان تھے

لیکن اس وقت وہ بے حد سنجیدہ اور مؤدب نظر آ رہے تھے۔ انھوں نے آگے بڑھ کر سادیہ کے سامنے سر خم کیا اور حکم کا انتظار کرنے لگے۔ انھوں نے میری طرف نظر اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔

سادیہ میری طرف دیکھ رہی تھی۔

"میرے محافظ ہر وقت چوکنا اور گوش بر آواز رہتے ہیں، سرفروش۔ اگر میرا لہجہ یا آواز ذرا سی بھی بدل جائے تو یہ بلا تامل اندر آ جائیں گے۔"

اُس نے پہرے داروں کو جانے کا اشارہ کیا تو وہ سر جھکائے باہر چلے گئے۔

سادیہ کے اس عمل سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ مجھ سے کچھ خائف بھی ہے۔

جب وہاں ہم دونوں ہی رہ گئے تو سادیہ بولی: "میں تمھارے لیے کوئی نام تجویز نہیں کر سکی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تم بہت عجیب آدمی ہو۔ دُوسروں سے بے حد مختلف ہو۔ اس لیے میں تمھیں سرفروش ہی کہا کروں گی، سردار سرفروش نہیں کیونکہ میرے خیال میں غلاموں کا کوئی خطاب نہیں ہوتا۔"

"میں آپ سے متفق ہُوں خاتون! جب تک میں آپ کا قیدی ہُوں، سردار کے خطاب سے دست بردار رہوں گا۔"

میری اس بات پر پہلی بار سادیہ نے قہقہہ لگایا۔

یہ دلآویز قہقہہ اُس کی مسرت کا عکاس تھا۔ نقاب کے پیچھے اُس کے خوبصورت دانتوں کی قطار، آب دار موتیوں کی طرح چمک اُٹھی تھی۔

میں نے اپنا سر ذرا سا خم کیا اور کہا: "مجھے خوشی ہُوئی کہ آپ کو میری بات دلچسپ محسوس ہُوئی۔"

اُس نے پھر قہقہہ لگایا: "تمھارا کام مجھے خوش رکھنا ہے مگر جس انداز سے میں چاہُوں گی، تمھیں اس کا پابند رہنا ہو گا... اور جب تم مجھے خوش نہیں رکھ سکو گے تو سمجھ لو کہ تمھارا آخری وقت آ پہنچا۔"

یہ کہتے ہُوئے وہ پھر سنجیدہ ہو گئی۔

اُس نے اپنی ٹھوڑی ایک ہتھیلی کے پیالے میں رکھ لی۔

"تم نے ہمارے شہ زور سے مقابلے کی جو شرط رکھی تھی، اس نے میرے دل میں چنگاریاں بھر دی تھیں۔ میں تمھیں دیکھنا چاہتی تھی مگر میرے بھائی نے مجھے اس خیمے میں نظر بند کر رکھا تھا۔ میں نے ملازمہ کا بھیس بدلا اور لوگوں میں گھُس گئی۔ تمھیں پکڑنے کے لیے وہ جال بھی میری ہدایت ہی پر بچھایا گیا تھا۔ میں نے تمھارا مقابلہ نہایت غور سے دیکھا۔ اُس وقت تمھاری آنکھوں میں خون اُترا ہُوا تھا اور اُن میں رحم یا نرمی کی ہلکی سی پرچھائیں بھی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ مگر اب اُن میں نرمی ہی نرمی نظر آ رہی ہے۔ ایسا کیوں ہے سرفروش؟"

"آپ اس کی وجہ بھی جانتی ہیں، خاتون۔" میں نے جواب دیا۔ "آپ نے مجھے یہاں بُلوایا ہے۔ آپ کا غلام حاضر ہے پھر ان باتوں میں وقت ضائع کرنے کا کیا فائدہ؟"

اس نے پھر بے ساختہ قہقہہ لگایا۔

"... کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا، ان باتوں کا فیصلہ مجھے کرنا ہے۔ تم اس وقت تک کسی قسم کی بھی جرأت نہیں کرو گے جب تک میں تمھیں حکم نہیں دیتی۔"

"میں نے آپ کی ہدایت ذہن نشین کر لی ہے، خاتون۔" میں نے جواب دیا۔ میں جان چکا تھا کہ وہ جرأت مندی پسند کرتی ہے لیکن بہت زیادہ جرأت مندی کو گستاخی سمجھتی ہے۔ مجھے اس کہانی کے ساحر کی طرح وقت حاصل کرنا تھا جو مجھے بابر نے سُنائی تھی۔ سادیہ اُٹھ کر میری طرف بڑھنے لگی۔

"وہیں کھڑے رہو۔ اپنی جگہ سے حرکت نہ کرنا۔" اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"بجا ارشاد ہُوا۔" میں نے سینے پر ہاتھ باندھتے ہوئے جواب دیا۔

وہ میرے قریب تر آئی تو میری رگوں میں خون سنسنانے لگا۔

اس نے اپنے ہاتھ اُٹھائے تو مجھے یُوں محسوس ہوا جیسے میرے جسم میں شعلے لپک اُٹھے ہُوں۔ اُس نے اپنے ٹخنوں میں پڑا ہُوا کڑا دُوسرے کڑے سے بجایا اور بولی: "کیا تم مجھے پسند کرتے ہو؟ کیا میں تمھیں اچھی لگتی ہُوں؟"

میری سانسیں اُلجھنے لگیں اور میرے لیے جواب دینا مشکل ہو گیا۔ میں نے پہلے تو اثبات میں سر ہلایا... پھر بمشکل بولا: "آپ پسند کی بات کرتی ہیں! آپ تو میری سب سے بڑی خواہش بن گئی ہیں۔ آخر آپ مجھے اپنے حُسنِ جہاں سوز سے کب تک جلائیں گی؟"

اُس نے پھر قہقہہ لگایا اور بولی: "جب تک میرا جی چاہے گا۔"

میری سانسیں تیز تر ہوتی گئیں لیکن میں نے خود پر قابو رکھا حتیٰ کہ اس نے خُود ہی میرا ہاتھ تھام لیا۔

میں اُس سنہرے پردے کے سامنے قالین پر لیٹا ہُوا تھا جو سادیہ کی رہائش گاہ کے دروازے پر آویزاں تھا۔ پردے کی دُوسری جانب راہداری میں صرف ایک مشعل روشن تھی جہاں سادیہ کا ایک تیغ بردار محافظ پہرہ دے رہا تھا۔ جب وہ بے آواز قدموں سے چلتا ہُوا مشعل کے قریب پہنچتا تو اُس کا سایہ پُورے پردے پر محیط ہو جاتا اور جب وہ پردے کی طرف بڑھتا تو اُس کا سایہ سُکڑتا سمٹتا چلا جاتا۔

مجھے سادیہ کا طلائی طوق بردار غلام بنے آج چوتھی شب تھی۔

وہ چابک اور کُند چوبی خنجر بھی مجھے دے دیا گیا تھا جو کبھی غلیدی کی تحویل میں ہُوا کرتا تھا۔ آسوری سُورما یہ کھلونا نما خنجر دیکھ کر حقارت آمیز انداز میں مسکرایا کرتے تھے۔ اگر میں سادیہ کی تنہائیوں کا رفیق بننے کی بجائے اپنے مُوقف پر ڈٹا رہتا اور اپنی آن کے لیے جان دے دیتا تو وہ مجھے عظیم سمجھتے اور میری بہادری کے گُن گاتے۔ میں جانتا تھا کہ آسوری شہ زور کو موت کے گھاٹ اُتارنے کے بعد جب میں نے شاہ تمبور کے دربار میں سادیہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے سے انکار کر دیا تھا تو آسوری جنگ جُو مجھ سے بے حد مرعوب ہُوئے تھے لیکن اب وہ مجھے بُزدل سمجھنے لگے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں ذاتی طور پر ان کے اس رَدِّ عمل سے مُطمئن اور مسرُور تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ مجھے بُزدل سمجھ کر مجھ سے کوئی خوف یا خطرہ محسوس نہ کریں تاکہ وقت آنے پر میں اُن کے نرغے سے بہ آسانی فرار ہو سکوں۔

چوتھی شب میں سادیہ کی خدمت گزاری کے بعد تھکا ماندہ لیٹا ہُوا تھا۔ نیند آہستہ آہستہ میری پلکوں پر ڈیرے ڈال رہی تھی کہ اچانک مجھے ایک سرگوشی سُنائی دی۔

"سردار سرفروش... کیا تم سُن رہے ہو، سردار سرفروش!"

میں نے نیم غنودگی کے عالم میں سر اُٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھا مگر مجھے محافظ کے گھٹتے بڑھتے سائے کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیا۔ میں نے سوچا کہ شاید میں نے کچی نیند میں کوئی خواب دیکھا ہو گا ورنہ یہاں زنان خانے میں کون آواز دے سکتا ہے؟

اتنے میں کسی اندھیرے گوشے سے پھر سرگوشی اُبھری: "میں مارنو ہُوں، سردار سرفروش!... کیا تم میری آواز سُن رہے ہو؟"

میں نے جلدی سے اپنی آنکھیں رگڑیں، جماہی لی اور سرگوشی ہی میں پوچھا: "تم کہاں ہو مارنو؟"

"تمھاری بائیں جانب۔ ترینا کے خیمے میں۔ وہ گہری نیند سو رہی ہے۔"

سادیہ بھی گہری نیند سو چکی تھی اور صُبح تک اُس کے اُٹھنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ میں قالین پر لوٹتے ہُوئے ترینا کے خیمے کی طرف سرکنے لگا... اور دریافت کیا: "کیا بات ہے، مارنو؟" میں نے آواز بے حد دھیمی رکھی تھی۔

"میں تمھارے لیے ایک ضروری پیغام لایا ہُوں سردار سرفروش! یہ بھی ہو، کل بابر سے ضرور مل لینا۔"

"کیوں؟" میں نے اپنی حیرت پر بہ مشکل قابو رکھتے ہُوئے سوال کیا۔

"وہ تمھیں اس انقلاب کے متعلق مزید معلومات فراہم کرے گا جس کے بارے میں تم سے گفتگو کر چکا ہے۔"

میں کچھ دیر تو ورطۂ حیرت میں غوطہ زن رہا... پھر میں نے آواز کی سمت دیکھتے ہوئے کہا: "یہ پیغام کس نے دیا ہے؟"

جواباً خاموشی طاری رہی۔

میرا دل شدت سے دھڑک اُٹھا۔

"مارنو...!" میں نے اُسے اُوپر تلے کئی بار دھیمی آواز میں پکارا لیکن ہر بار سناٹا ہی میری پُکار کا جواب ثابت ہُوا۔

میں سمجھ گیا کہ مارنو جا چکا ہے۔

زنان خانے کے اس حصّے میں طلبی کے بغیر کسی مرد کو آنے کی اجازت نہیں تھی لیکن مارنو جان ہتھیلی پر رکھ کر یہاں بھی پہنچ گیا تھا۔ غالباً اپنے بونے قد کی وجہ سے وہ کسی محافظ کی نظروں میں نہیں آ سکا تھا ورنہ بے موت مارا جاتا۔

میں دیر تک سوچتا رہا کہ کیا واقعی خادِ اعظم کو اقتدار سے محروم کرنے کا وقت قریب آ چکا ہے۔

حُسنِ اتفاق سے اگلی صُبح شاہ تمبور نے سادیہ کو بُلوا لیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ بے حد خوف زدہ ہے۔ سُننے میں آیا تھا کہ خادِ اعظم پر پھر دیوانگی کے دورے پڑنے لگے ہیں۔ ان دَوروں کی وجہ سے پھیلنے والی تباہیوں اور بربادیوں کا احوال میں سُن چکا تھا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ شاہ تمبور پر ایسی وحشت طاری ہوتی ہے کہ دُوسرے تو دُوسرے خُود اس کی بہن سادیہ بھی اس دیوانگی کا شکار ہو جاتی تھی۔ یہی وہ ایام ہوتے تھے جب آسوری اپنی نوعمر کلیوں کو چھپا لیا کرتے تھے تاکہ معصُومیت درندگی کی بھینٹ نہ چڑھ سکے۔

جب سادیہ اپنے محافظوں کے ساتھ شاہ تمبور سے ملنے چلی گئی تو میں اپنا چابک لیے گھوڑے پر سوار ہُوا اور اُس انسانی باڑے کی طرف روانہ ہو گیا، جہاں میں نے بابر کے ساتھ کچھ دن گزارے تھے۔ مجھے آتے دیکھ کر آسوری محافظ ناگوار تاثرات کے ساتھ چوکنے ہو گئے۔ میں غلیدی کے سے خشمگیں انداز میں دروازے پر رُکا اور محافظوں کی طرف دیکھ کر دھاڑنے لگا۔

"میں اُس بڈھے پاگل کی خبر لینے آیا ہُوں جو دن بھر سو کر گھاس کو غلاظت کا ڈھیر بناتا اور مفت کی روٹیاں توڑتا رہتا ہے۔ خاتون سادیہ نے مجھے ایک ذاتی غلام رکھنے کی اجازت دے دی ہے۔ میں بابر کو اپنا غلام بنانا چاہتا ہُوں اس لیے اُسے اپنے کوڑے کا مزا چکھانا ضروری سمجھتا ہُوں تاکہ اُس کی یہ خوش فہمی دُور ہو جائے کہ میں اُس سے کوئی رعایت برتوں گا۔"

میری اس تاویل پر ایک آسوری محافظ نے مسکراتے ہُوئے

کہا۔ "آپ نے بجا ارشاد فرمایا عالی جاہ۔ بابر نے بہت دنوں سے کوڑے نہیں کھائے لیکن آپ ایک معذور کو غلام کیسے بنا سکتے ہیں؟"

میں نے اُسے غصّے سے گھورتے ہوئے جواب دیا۔ "تم احمق ہو اور نہیں جان سکتے کہ اس لنگڑے لُولے کو کیسے غلام بنایا جا سکتا ہے۔ جاؤ اور چھکڑوں کے پاس پڑے ہوئے لکڑی کے تختوں میں سے ہاتھ بھر لمبے اور دو بالشت چوڑے ٹکڑے لا دو۔"

"لکڑی جیسی قیمتی چیز غلاموں پر برباد نہیں کی جا سکتی حضورِ والا۔ اسے بہت دُور سے لایا جاتا ہے۔" محافظ نے جواب دیا۔

میں نے غضب ناک ہو کر اُسے ایک چابک جڑ دیا اور پاؤں پٹخ کر چنگھاڑنے لگا۔ "جاؤ اور وہی کرو جو میں نے تمھیں کہا ہے یا تم خاتون سادیہ کے محبوب کی حکم عدولی کر کے اپنی گردن کٹوانا... چاہتے ہو؟"

محافظ ایک قدم پیچھے ہٹ گیا اور طنز و نفرت سے میری طرف دیکھ کر سر خم کرتے ہوئے بولا۔ "خاتون سادیہ کے طوق بردار محبوب کے حکم کی تعمیل ضرور کی جائے گی۔"

میں اُسے گھورتا ہُوا باڑے میں داخل ہُوا اور اُس کوٹھری کی طرف بڑھنے لگا جس میں بابر کو رکھا گیا تھا۔ اب اُس کے سامنے والی کوٹھریوں میں تین مزید قیدی آ چکے تھے۔ اُنھوں نے مجھے دیکھ کر آپس میں کھسر پھسر شروع کر دی۔ وہ تینوں چور تھے اور عنقریب اُن کے دائیں ہاتھ قطع کیے جانے والے تھے۔ میں اُن کی طرف توجہ دیے بغیر آگے بڑھتا چلا گیا۔

بابر نے مجھے دیکھا تو بازوؤں کے بل رینگتا ہُوا دروازے میں آ گیا اور میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔ میں نے اُسے چابک مارتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ "سب ادھر دیکھ رہے ہیں اس لیے مجھے تم کو کوڑے مارنے پڑیں گے۔"

"ہاں۔ مگر زیادہ زور سے نہ مارنا۔ کیا مارتو تم سے ملا تھا؟"

میں نے چابک لہراتے ہوئے جواب دیا۔ "بات کہاں تک پہنچی ہے؟"

"جو کچھ جانتا ہوں، وہ بتا دیتا ہوں۔ ویسے اس لباس میں تم خوب جچتے ہو۔"

میں نے اُس پر جھوٹ موٹ کے تیر برسانے شروع کر دیے وہ با آوازِ بلند بولا۔ "بکواس بند کرو بڈھے گیدڑ! تجھے میرا غلام بننا ہی پڑے گا۔ میں تم جیسے لنگڑے لُولے سے کام لینا بھی جانتا ہوں۔"

"تم ایک اچھے اداکار بھی ہو سردار سرفروش۔" بابر نے سسکاری بھرتے ہوئے کہا۔

"جلدی جلدی بولتے جاؤ، ایسا نہ ہو گھونسے اور کوڑے کھا کھا کر تمھارا دم نکل جائے اور بات ادھوری ہی رہ جائے۔" میں نے دھیمے لیکن کرخت لہجے میں کہا۔ "میں سادیہ کی لاعلمی میں یہاں آیا ہوں اس لیے میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ صرف مقصد کی بات کرو۔"

"رات مارتو میرے پاس آیا تھا۔ اُس نے بتایا کہ رستم آمادہ ہو چکا ہے۔ آج سے تین روز بعد شاہ تیمور اپنی سالگرہ منائے گا۔ اس موقعے پر ایک شاندار تقریب منعقد کی جائے گی۔ رستم اس موقعے سے فائدہ اُٹھا کر اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانا چاہتا ہے۔ اگر تم اُس کا ساتھ دینے کو تیار ہو تو تمھیں ہتھیار فراہم کر دیے جائیں گے...

لیکن یہ تم نے ہاتھ کیوں روک لیا ہے؟"

"میں اُس کا ساتھ دینے کو تیار ہُوں۔" میں نے اُسے گھونسہ مارتے ہوئے کہا۔

"مگر رستم پہلے تم سے بات کر کے ہی کسی فیصلے پر پہنچے گا۔"

"میری اُس سے ملاقات کیسے ہوگی؟ وہ شاہ تیمور کا سپہ سالار ہے اور میں سادیہ کا غلام ہُوں۔"

"قدرت نے خود ہی اس کا انتظام کر دیا ہے۔ ایک تاغانی جاسوس پکڑا گیا ہے جس نے اعتراف کیا ہے کہ ملکہ ہوشی نے اُسے تمھیں تلاش کرنے اور فرار میں مدد دینے کے لیے بھیجا تھا۔ شاہ تیمور کافی برہم ہے اور رستم نے اُس کے غصّے کو مزید ہوا دی ہے۔ اُس نے خادِ اعظم سے کہا ہے کہ تم بھی اُس جاسوس کی طرح مجرم اور خطرناک ہو۔ لہٰذا تم سے پوچھ گچھ ضروری ہے تاکہ یہ پتہ چلایا جا سکے کہ اور کتنے جاسوس تمھاری مدد کو آئے ہیں۔ اس نے خادِ اعظم سے تمھاری گرفتاری کی سفارش بھی کی ہے۔"

"تو پھر اب تک میں آزاد کیسے گھوم رہا ہُوں؟" میں نے چابک لہراتے ہوئے دھیمی آواز میں پوچھا۔

"خادِ اعظم پر دیوانگی کے دورے کا آغاز ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ اسے معلوم ہے کہ سادیہ تمھیں بے حد چاہتی ہے اور تمھیں نقصان نہیں پہنچنے دے گی۔ یہی وجہ ہے کہ اُس نے پہلے سادیہ کو بلوایا ہے۔"

میں نے بابر کو دکھاوے کی دو تین لاتیں جڑتے ہوئے پوچھا۔ "کیا سادیہ بھی اس سازش میں شریک ہے؟"

"نہیں۔ رستم اُس پر اعتماد نہیں کرتا۔ کیا سادیہ نے یہ کہا ہے کہ رستم اُس کا آدمی ہے؟" اُس نے بلند آواز میں آہ و زاری کرتے ہوئے مدّھم آواز میں کہا۔

"نہیں... مگر مجھے یقین ہے کہ وہ بھی کوئی منصوبہ بنائے ہوئے ہے اور اس منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے مجھے

استعمال کرنا چاہتی ہے۔ چونکہ فی الحال وہ مجھ پر اعتماد نہیں کرتی اس لیے ابھی خاموش ہے۔"

"تو پھر اُسے اپنے منصوبے پر عمل کرنے کا وقت نہیں ملے گا اور رستم موقعے سے فائدہ اُٹھائے گا۔ میرا خیال ہے، رستم کی درخواست پر شاہ تیمور تمھاری گرفتاری کا حکم دے دے گا۔ اس طرح رستم کو تم سے بات کرنے اور تمھیں پرکھنے کا موقع مل جائے گا۔ تم تیار رہو۔" یہ کہہ کر وہ زور سے کراہا اور اس نے گھاس میں مُنہ چھپا لیا۔ میں سمجھ گیا کہ کوئی ادھر آ رہا ہے۔ میں نے گرج گرج کر اُسے گالیاں دیں اور چابک یُوں برسایا کہ آواز زیادہ پیدا ہو اور اسے کوئی چوٹ نہ آئے۔ اسی دوران میں نے پُوچھا۔ "تم نے پہیے تیار کر لیے؟"

"ہاں... اور میں نے اُنھیں گھاس میں چھپا رکھا ہے۔"

"محافظ کچھ تختے لا رہا ہے۔ اُن سے بیٹھنے کا تختہ اور دُھرا تیار کر لینا۔ دو نوک دار لکڑیاں بھی بنا لینا تاکہ اُنھیں کشتی کے چپوؤں کی طرح زمین پر چلا کر گاڑی کھینچ سکو اور اس مار پیٹ کے لیے مجھے معاف کر دینا۔" معذرت کرنے کے بعد میں پھر گرجنے برسنے لگا۔ "بدبخت بُڈھے۔ اگر تُو نے پھر کبھی میرے سامنے زبان چلانے کی جرأت کی تو میں تمھاری کھال ادھیڑ ڈالوں گا۔"

میں غصّے سے بل کھاتا کوٹھری سے باہر آ گیا۔ اتنے میں وہ محافظ بھی قریب آ چکا تھا جسے میں نے تختے لانے کے لیے بھیجا تھا۔ میں نے اسے مخاطب کر کے بڑی رعونت سے کہا۔ "یہ تختے اس گیدڑ کی کوٹھری میں پھینک دو اور اپنے ساتھیوں کو بتا دینا کہ وہ مجھے خاتون سادیہ سے شکایت کا موقع نہ دیں۔"

اُس نے اثبات میں سر ہلایا اور تختے کوٹھری میں پھینک دیے۔ میں پلٹ کر دروازے کی طرف چلنے لگا۔۔ لیکن ابھی میں نے دو تین ہی قدم اُٹھائے ہوں گے کہ مجھے ٹھٹک جانا پڑا۔

دروازے اور میرے درمیان ایک جسیم آدمی حائل تھا۔ اُس کی آنکھوں میں درندگی اور ہونٹ سفاک مسکراہٹ سے پھیلے ہوئے تھے۔ عقب سے مجھے محافظ کی کراہ سُنائی دی۔ یُوں لگتا تھا جیسے وہ بے حد خوف زدہ ہو لیکن اس کی آواز میں حیرت بھی تھی جیسے اس غیر معمولی ہستی کو یہاں دیکھ کر اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آ رہا ہو۔

"آقائے جلالی..." وہ بڑبڑایا۔

میں نے ادھر اُدھر دیکھا۔ انسانی باڑے کا ہر قیدی سہم کر اپنی کوٹھری میں دُبک گیا تھا اور محافظوں کے چہروں پر سراسیمگی کے آثار نمایاں ہو گئے تھے۔ میں نے اس شخص کو نہ تو پہلے کبھی دیکھا تھا اور نہ ہی اس کے بارے میں کچھ جانتا تھا۔

اچانک وہ حرکت میں آ گیا۔

وہ آہستہ آہستہ میری طرف بڑھنے لگا۔

میں اپنی جگہ خاموش کھڑا اس دیو قامت شخص کو گھورتا رہا جس کا جسم کسی درخت کے تنے جیسا مضبوط اور بازو موٹے موٹے شہتیروں جیسے تھے۔ ہر بڑھتے ہوئے قدم کے ساتھ اُس کی آنکھوں میں خونخواری کی جھلک بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ یکایک اس نے دونوں ہاتھ اپنے سر سے بلند کر لیے۔ اُسی لمحے انسانی باڑہ محافظوں کی للکار سے گونج اُٹھا۔ "آقائے جلالی!" وہ بیک وقت چلائے اور میں نے متحیر نگاہوں سے دیکھا۔ وہ سب کے سب گھٹنوں کے بل جھکتے جا رہے ہیں۔ اس سے پہلے کہ مجھے صورتِ حال کا اندازہ ہوتا میں نے آقائے جلالی کا دایاں ہاتھ اپنی کھوپڑی کی طرف گرتے دیکھ لیا۔ ایک ساعت کے لیے مجھے یُوں لگا جیسے میرے سر پر کسی وزنی کلہاڑے کی چوٹ پڑی ہو اور میری کھوپڑی ان گنت ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئی ہو۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرے اُتر آئے اور میرا وجود انہی اندھیروں میں ڈُوبتا چلا گیا۔

میں نے زور سے اپنا سر جھٹکا لیکن تاریکیوں نے ذہن پر کچھ اس طرح پنجے گاڑ رکھے تھے کہ اُنھیں محض جھٹکنے سے دُور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کھوپڑی پر پڑنے والی اس ضرب نے مجھے ایک آدھ تارا نہیں بلکہ پُوری کہکشاں ہی دکھا دی تھی اور میں جو خود کو اندھیروں میں ڈُوبتا محسوس کر رہا تھا تو درحقیقت بات یہ تھی کہ میں اس غیر معمولی چوٹ کے زیرِ اثر زمین بوس ہو رہا تھا۔

زمین سے ٹکراتے وقت تھوڑی بہت جو شعوری کیفیت باقی رہ گئی تھی، اس کے تحت میں نے خود کو لڑھکنیاں کھانے کے انداز میں متحرک کر لیا۔ یہ حاضر دماغی میرے کام آ گئی ورنہ جلالی کی دُوسری ضرب مجھے تقسیم ہی کر ڈالتی۔ لڑھکنیاں کھانے کا یہ عمل میرے لیے یُوں بھی فائدہ مند ثابت ہُوا کہ میرے اور آقائے جلالی کے درمیان کچھ فاصلہ پیدا ہو گیا تب

تک اس نے یہ فاصلہ طے کیا، میں نہ صرف سنبھل کر اُٹھ گیا بلکہ اس کے اگلے حملے کے لیے تیار بھی ہو چکا تھا۔

میں مارشل آرٹس کا ماہر ہونے کے باوجود اب تک قدیم طرزِ حرب اپنانے پر مجبور تھا اگر ایسا نہ کرتا تو یقیناً میری شخصیت ان کے لیے ایسے تجسس کا باعث بن جاتی جو میرے لیے مہلک بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں اپنے تربیت یافتہ جسم کی پھرتی اور طاقت ہی استعمال میں لاتا اور داؤ پیچ انھی جیسے اختیار کرتا تھا۔

جلالی انسان نہیں درندہ تھا۔ اس کی دہکتی ہوئی آنکھیں حریف کو یقیناً احساسِ کمتری کی دلدل میں گرا کر بے بس کر دیتی ہوں گی۔ میں نے کن انکھیوں سے ادھر اُدھر دیکھا۔ سرنگوں محافظ اب سیدھے ہو کر حیرت سے منہ پھاڑے میری طرف دیکھنے میں مصروف تھے۔ گویا انھیں یقین نہ آ رہا ہو کہ کوئی شخص آقائے جلالی کے کلہاڑے جیسے ہاتھ کی ضرب کھا کر زندہ بھی رہ سکتا ہے... لیکن میں نہ صرف زندہ تھا بلکہ میرے انداز سے مقابلے کی دعوت بھی جھلک رہی تھی۔

میں اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔

"مجھے حیرت ہے کہ خادِ اعظم نے تم جیسے بزدل کو کہاں چھپا رکھا تھا۔" میں نے زہر خند سے کہا: "بہرحال سامنے آئے ہو تو تمھیں مایوس نہیں کروں گا۔"

وہ رُک گیا۔ انداز ٹھٹک جانے جیسا ہی تھا۔ میری بات نے غالباً اسے میری قوتِ ارادی اور خود اعتمادی کی انتہا سے آگاہ کر دیا تھا۔ شاید اسی لیے اب وہ اندھا دھند مجھ پر چڑھ دوڑنے سے باز رہا تھا۔

اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

بس کھڑا ایک ٹک مجھے دیکھتا رہا۔

"میں دشمنی کا تعین کیے بغیر لڑنا پسند نہیں کرتا۔" میں نے بھاری آواز میں کہا: "بتاؤ، تم کون ہو اور تمھیں مجھ پر ہاتھ اُٹھانے کی جرأت کیوں کر ہوئی؟"

وہ ہنس پڑا۔ اس کا قہقہہ سارے جہان کی سفاکیوں کا مظہر تھا۔

"اسے بتاؤ، میں کون ہوں؟" اس نے ایک محافظ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس نے شاید پہلے کبھی میرا نام بھی نہیں سنا۔"

میں نے اُسے نگاہ میں رکھتے ہوئے اس محافظ کی طرف دیکھا جسے جلالی نے تعارف کرانے کی ذمے داری سونپی تھی۔

"یہ... یہ آقائے جلالی... خادِ اعظم کے خاص شہ زور ہیں... اور انھیں آشوری قبیلے میں طاقت کے دیوتا کا درجہ حاصل ہے۔" محافظ نے ہکلا ہکلا کر بتانا شروع کیا: "آقائے جلالی، اسی شہ زور پارس کے بھائی ہیں جس سے تم نے پہلا مقابلہ کیا تھا۔"

"ہوں..." میں نے حقارت آمیز انداز میں سلیتے ہوئے کہا: "اس بات سے دشمنی کا تعین تو ہو گیا لیکن تم اب تک کہاں چھپے ہوئے تھے، بدبودار گوریلے؟" میں نے براہِ راست جلالی سے کہا۔

غالباً اس سے پہلے کسی نے اس سے اتنے حقارت آمیز انداز میں مخاطب ہونے کی جرأت بھی نہیں کی تھی، اس لیے میری بات سن کر لمحے بھر کو وہ سناٹے میں رہ گیا اور پھر اگلی ہی ساعت اس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔

غصے سے اندھے شیر کو پچھاڑنا اُسی وقت ممکن ہوتا ہے، جب مقابل اپنا ذہن بے حد ٹھنڈا رکھے۔ میں اس کے بدلتے ہوئے تیور دیکھ رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ سوچ رہا تھا کہ اب مجھے کنگ فو اور کراٹے کے دو ایک داؤ آزمانے چاہئیں۔ اس وقت تماشا دیکھنے والے چند محافظ ہی تھے اس لیے میرا یہ اندازِ حرب زیادہ نگاہوں میں نہیں آ سکتا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔

اس کے جبڑوں سے جھاگ گر رہے تھے۔

یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ مجھے دانتوں سے بھنبھوڑ کر رکھ دینا چاہتا ہو۔ لیکن میں یہاں زیادہ وقت ضائع نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے واپس سادیہ کے خیمے میں بھی پہنچنا تھا۔ جیسے ہی وہ میری زد میں آیا، میں نے ایک نعرہ لگا کر اپنا جسم فضا میں اچھال دیا۔

اس سے قبل کہ وہ میرے حربے سے آگاہ ہوتا، میری دونوں ٹانگیں اس کے پیٹ سے ٹکرائیں اور کھڑی ہتھیلی نے کسی وزنی کلہاڑے کی طرح اس کی کھوپڑی پر قیامت ڈھا دی۔

کھوپڑی ٹوٹنے اور پیٹ میں پیروں کے پنجے گھسنے سے بیک وقت موت تین جگہ سے اس کے جسم میں داخل ہوئی اور پل بھر میں اس کی روح نکال کر پرواز کر گئی۔

وہ گوشت اور ہڈیوں کے ڈھیر کی طرح زمین پر گرا۔

تازہ تازہ خون زخموں سے فواروں کی طرح بہہ نکلا لیکن اس کے جسم میں وہ تڑپ نہیں تھی جو ذبح ہونے والے بکرے میں ہوتی ہے بلکہ اس کے جسم کے ٹکڑوں سے بے نیاز حصوں کی بوٹیاں یوں پھڑک رہی تھیں جیسے کھال اُتر جانے کے بعد گوشت

ہی دکھائی دیتا ہے۔

میں نے اطراف میں دیکھا۔

تمام محافظ یوں جھکے ہوئے تھے، جیسے انھیں اسی حالت میں سکتہ ہو گیا ہو۔ میں نے ایک فاتحانہ نگاہ اپنے شکار پر ڈالی اور انسانی باڑے کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

اب مجھے خیمے میں جا کر سادیہ کا انتظار کرنا تھا... لیکن سارا دن گزر گیا۔ رات آ گئی مگر سادیہ اپنے خیمے میں واپس نہیں آئی۔ میں نے باہر جا کر حالات معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میرا دل خطروں اور خدشوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ کبھی وہ ان جانے خطروں سے لرز اُٹھتا اور کبھی ڈاکٹر فریدوں کے خلاف غصے سے لبریز ہو جاتا۔ جس نے ہر آنے والا لمحہ میرے لیے کچے دھاگے سے لٹکتی شمشیرِ برہنہ بنا دیا تھا جو کسی بھی وقت گر کر میری شہ رگ کاٹ سکتی تھی۔ یہاں مجھے قدیم ... کی جنگ لڑنے کے ساتھ ساتھ اب سازشوں کا بھی تجربہ ہو رہا تھا لیکن یہ تجربہ کس کام کا جب زندگی کا اعتبار ہی اُٹھ چکا ہو اور ہر پل آخری پل محسوس ہو رہا ہو۔

اسی ذہنی کشمکش کے دوران اچانک میرے خیالوں کی رَو لالی کی طرف بہہ گئی جو مجھ سے رابطہ قائم کرنے کے لیے اپنے جاسوس بھیج رہی تھی۔ اس کا صاف مطلب تھا کہ وہ مجھے بھولنے میں کامیاب نہیں ہو سکی لیکن اس کا یہ پیار بھی میری جان کا دشمن بن گیا تھا۔ کاش میں کسی طرح اسے یہ پیغام بھیج سکتا کہ وہ میرے لیے اپنے جاسوس بھیجنا بند کر دے ورنہ مجھے موت کے گھاٹ اُتار دیا جائے گا۔

اتنے میں توپ کا دھماکا سنائی دیا۔ توپ کا یہ گولہ قریب ہی خیمہ گاہ میں کسی جگہ گرا تھا۔ اس کے ساتھ ہی لوگوں کی چیخ و پکار اور بھاگ دوڑ کی آوازیں آنے لگیں۔ کبھی کبھی تاغائی رات کی خاموشی میں اچانک توپ چلا دیتے تھے تاکہ آشوری خوفزدہ ہو کر بھاگ نکلیں۔ مجھے لالی کا سپہ سالار یاد آ گیا جو اکثر ٹھنڈی سانس کے ساتھ کہا کرتا تھا کہ وہ وقت کتنا خوش گوار ہو گا جب وہ شہر پناہ کی بلندی سے میدان پر نظر ڈالے گا تو اُسے آشوریوں کے خیمے نظر نہیں آئیں گے۔ لیکن اس کی یہ خواہش حسرت بن کر رہ گئی تھی۔ آشوری ابھی تک میدان میں خیمہ زن تھے ان کے سینکڑوں شہسوار روزانہ اپنی جانوں کے نذرانے پیش کرتے تھے لیکن یہ جنگ ماؤں سے بیٹے، بہنوں سے بھائی، بچوں سے باپ اور سہاگنوں سے شوہر چھین رہی تھی اور ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔

مجھے خیال آیا کہ یہ دَور بھی ہماری سرزمین جیسا ہی ہے اور یہاں بھی اقتدار کے لیے وہی کچھ کیا جا رہا ہے، جو ہمارے دَور میں ایک قوم دوسری قوم پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے کرتی آئی ہے اور اب تک کر رہی ہے۔ وہاں بھی ماؤں کی گودیں اجاڑی جاتی ہیں اور بچے یتیم کیے جاتے ہیں اور یہاں بھی خونِ انسانی سے ہولی کھیلی جا رہی ہے۔

نہ جانے آج نیند مجھ سے کیوں رُوٹھ گئی تھی؟

اچانک مجھے خادِ اعظم تمبور کا خیال آ گیا جو دیوانگی کے دَورے میں نوعمر بچوں کی زندگی سے کھیلتا اور پھر اپنے دیوتا اودی کے سامنے گڑگڑا کر فریادیں کرتا تھا۔ میں نے سوچا، کیا رستم بھی کسی نوشباب بیٹی کا باپ ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو وہ شاہ تمبور کو کیوں ہلاک کرنا چاہتا ہے؟ میں رستم کے بارے میں صرف اتنا ہی جانتا تھا کہ وہ بابر کا ہم وطن اور کرائے کا جنگجو ہے۔ اگر وہ برسرِ اقتدار آ جائے تو کیا میں اور آشوری اس کے زیرِ سایہ بہتر زندگی گزار سکیں گے؟ اس سوال کا جواب آسان تھا۔ رستم خادِ اعظم سے یقیناً بہتر تھا۔ نہ اس پر شاہ تمبور کی طرح دیوانگی کے دورے پڑتے تھے اور نہ ہی وہ معصوم بچیوں کو اپنے جنون کا شکار بناتا تھا۔ وہ ذہین آدمی تھا اور اُسے ٹھوس دلائل سے قائل کیا جا سکتا تھا۔ مجھے یہ سوچ کر یک گونہ اطمینان محسوس ہوا کہ اگر رستم کا منصوبہ کامیاب ہو گیا تو میں اُس وقت تک ضرور زندہ رہ سکوں گا جب ڈاکٹر فریدوں مجھے واپس بُلا لے گا۔ اس لیے مجھے بہرطور رستم کا ساتھ دینا چاہیے۔

سوچوں کے جنگل میں بھٹکتے بھٹکتے نہ جانے کب مجھے نیند آ گئی۔

دوسری صبح سادیہ کی بجائے رستم کے چھ آدمی آئے اور اُنھوں نے مجھے اپنی حراست میں لے لیا۔ مجھے اپنا چابک اور چوبی خنجر تو اپنے پاس رکھنے کی اجازت دے دی لیکن وہ میرا تمسخر اُڑاتے اور نیزوں سے ٹہوکے دیتے ہوئے ایک چھوٹے سے خیمے میں لے آئے جو خادِ اعظم کے شاہی خیمے کے قریب گاڑا گیا تھا... پھر وہ مجھے خاموشی سے انتظار کرنے کا حکم دے کر باہر چلے گئے۔

چند لمحوں کے بعد رستم خیمے میں داخل ہوا اور حسبِ عادت کچھ بولے بغیر مجھے گھورتا رہا، پھر وہ میری طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

"کیا بونا تمھارے پاس آیا تھا اور تم بابر سے مل چکے ہو؟"

"ہاں کمان دار۔" میں نے ادب سے جواب دیا کہ میں اس

احترام کرتا تھا۔
وہ اپنی داڑھی میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولا۔ "میں زیادہ
لمبی چوڑی بات نہیں کروں گا اگر خادِ اعظم اس وقت دوسرے معاملات
میں مصروف نہ ہوتا تو شاید میں اس ملاقات کا خطرہ مول نہ لیتا۔ میں
نے اس دوران تم پر کڑی نظر رکھی اور اپنے آدمیوں سے تمہاری
نگرانی کروائی ہے۔ تم اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھنے والے آدمی ہو۔
ایک غلام کی بھی بہت اچھی اداکاری کر رہے ہو مگر تم مجھے بے وقوف
نہیں بنا سکتے۔ تم نے آقائے جلالی کو جس انداز میں خاک نشین کیا
وہ اس صدی کا سب سے عجیب واقعہ ہے۔ جن محافظوں نے
وہ منظر دیکھا ہے، وہ اب تک اپنے حواسوں میں نہیں آئے۔
فی الحال تم مجھے صاف صاف بتا دو کہ میرا ساتھ دو گے یا نہیں؟"
یہی وہ گھڑی تھی جب رستم سے سودے بازی کی جا سکتی
تھی اس لیے میں نے نرم لہجے میں کہا۔ "اگر معاملہ شاہ تیمور کو ہلاک
کرنے کا ہے تو میں تمہارے ساتھ ہوں لیکن میں یہ ضرور جاننا چاہتا
ہوں کہ اس کے بعد میرا مستقبل کیا ہوگا؟"
یہ سن کر رستم کی آنکھیں سکڑ گئیں: "تمہیں آزادی کے
ساتھ عہدہ بھی ملے گا سرفروش! تم میرے نائب بنو گے اور
تمہارا تاوان ادا کر دیا گیا تو تمہیں تاغان جانے کی اجازت بھی
دے دی جائے گی۔" اتنا کہہ کر وہ مسکرایا اور بات جاری رکھی۔
"حالانکہ یہ تاوان والی بات میرے پلے نہیں پڑتی۔ ویسے میں چاہتا
ہوں کہ تم میرے ساتھ رہو۔ میں نے تمہیں پہلے شہزادے سے مقابلہ
کرتے دیکھا ہے۔ مجھے تم جیسے بہادروں کی ضرورت ہے لیکن تمہاری
شخصیت میرے لیے پُراسرار بھی ہے۔ خیر اس سلسلے میں بعد میں بات
کریں گے۔ فی الحال صرف یہ بتا دو کہ تم میرا ساتھ دے رہے ہو یا نہیں؟"
"مجھے اپنا ساتھی سمجھو کمان دار!" میں نے جواب دیا۔
"تو پھر غور سے سنو۔ میں چند لمحوں کے بعد تمہیں شاہ تیمور کے
پاس لے جاؤں گا کہ اس بہانے میں نے تم سے ملاقات کا
موقع نکالا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں وہاں کوئی خطرہ پیش نہیں
آئے گا کیونکہ سادیہ تمہاری وکالت کے لیے وہاں موجود ہوگی۔
اسے طیش مت دلانا۔ اپنی دیوانگی کے دوروں میں اسے
کسی بات کا احساس نہیں ہو پاتا اور اگر ہم محتاط رہیں تو اسے کبھی
احساس نہیں ہوگا کہ وہ لقمۂ اجل بننے والا ہے۔ البتہ سادیہ
کا خیال ہے۔ اسے دو روز تک اندھیرے میں رکھنا بے حد
ضروری ہے۔ لہٰذا دو روز تک تمہیں اس طرح اس کے ساتھ
رہنا ہے کہ اسے اپنی خبر بھی نہ رہے۔ تم میرا مطلب سمجھتے ہو نا؟"

"میں تو سمجھتا ہوں لیکن اگر اس دوران وہ میری ضرورت
محسوس نہ کرے تو کیا ہوگا؟"
"تو تمہیں خود ہی اس کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا۔ کم از کم خادِ اعظم
کے جشن تک اسے گرد و پیش سے بے خبر رہنا چاہیے۔ اس کے
بعد اس کی کوئی اہمیت نہیں رہے گی۔ اب میرے منصوبے کی
تفصیل بھی سن لو۔"
وہ سرگوشی میں مجھے تفصیل بتلانے لگا۔ بات ختم کرتے
ہی اس نے بڑے زور سے میرے جبڑے پر مُکا رسید کیا اور بولا۔ "یہ
اس لیے ضروری تھا کہ تمہارے ہونٹوں سے رسنے والا خون تاخیر کا
جواز بن سکے۔ شاہ تیمور یہ سمجھے کہ تم سے حقیقت اگلوانے کے
لیے سختی کی گئی ہے۔ آؤ میرے ساتھ۔"
رستم اور اس کے چھ آدمی مجھے لے کر خادِ اعظم کے شاہی خیمے
کی طرف چل دیے۔ ان آدمیوں نے رستم کے ساتھ جینے مرنے کی
قسم کھا رکھی تھی اور میں نہیں جانتا تھا کہ اس کے ساتھ ایسے اور
کتنے آدمی ہیں۔
خادِ اعظم کے خیمے سے موسیقی کی آواز آ رہی تھی لیکن جب
ہم خیمے میں داخل ہوئے تو خیمہ تقریباً خالی تھا۔ ایک کونے میں
چند سازندے بیٹھے ساز بجا رہے تھے اور دوسرے کونے میں
شاہ تیمور کے آدمیوں کے درمیان ایک تاغانی قیدی زنجیروں
میں جکڑا کھڑا تھا۔ خادِ اعظم اور اس کی بہن سادیہ معمول کے مطابق
اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھے تھے مگر آج شاہ تیمور کے دائیں جانب
بھی ایک کرسی رکھی ہوئی تھی جس پر بارہ تیرہ سالہ ایک حسین لڑکی براجمان
تھی۔ اس کا اداس چہرہ اور بھاری پپوٹے بتا رہے تھے کہ وہ روتی رہی
ہے۔ جب میں خادِ اعظم کے تخت کی جانب بڑھا تو مجھے دیکھ کر سادیہ
کی آنکھوں میں جگنو سے چمک اٹھے... مگر وہ جلدی سے دوسری
جانب دیکھنے لگی۔
خادِ اعظم کے قدموں میں بونا مارتو سب سے بے نیاز حسبِ معمول
چار رنگین گولے اچھالنے میں مصروف تھا اور اس کے ہونٹوں پر وہی
حزنیہ مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی جو عملِ جراحی سے ہمیشہ کے لیے اس
کے چہرے پر چپکا دی گئی تھی۔
خادِ اعظم مجھے دیکھتے ہی آگے کو جھکا اور اپنی داہنی آنکھ مجھ
پر گاڑ دی جو انگارے کی طرح سرخ ہو رہی تھی اور جس کی پتلی مسلسل
گردش کر رہی تھی۔ اس نے وقت ضائع کیے بغیر مجھ سے کہا: "وہ ملعون
ملکہ ہوشی تمہیں بھول نہیں سکی سرفروش! اس نے تمہیں ہماری قید
سے نجات دلانے کے لیے اس جاسوس کو یہاں بھیجا ہے۔ تم اس

سلسلے میں کیا جانتے ہو؟"

"میں اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں جانتا، عالم پناہ۔" میں نے ادب سے جواب دیا۔

خادِ اعظم اپنے مکروہ دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے مسکرایا اور بولا۔ "یہ جاسوس بھی یہی کہتا ہے کہ تم اس معاملے میں ملوث نہیں ہو لیکن رستم کو تم پر اعتماد نہیں ہے اور اس نے مجھے مشورہ دیا ہے کہ میں تم سے براہِ راست استفسار کروں۔ اس جاسوس کو سامنے لاؤ۔"

خادِ اعظم کا حکم سنتے ہی اس کے سپاہی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تاغانی جاسوس کو دھکے دیتے اور کھینچتے ہوئے اس کے سامنے لے آئے۔ جب زنجیروں کی جھنکار موسیقی میں مدغم ہوگئی تو خادِ اعظم مجھ سے مخاطب ہوا۔ "کیا تم نے اس آدمی کو پہلے بھی کبھی دیکھا ہے، سرفروش؟ کیا تم اسے جانتے ہو؟"

"نہیں عالم پناہ۔" میں نے جواب دیا اور بے بس تاغانی کی طرف دیکھا جس نے جنگ میں کام آنے والے کسی آسوری کا لباس پہن رکھا تھا اور اس کا حلیہ بدلنے کے لیے بھی کسی آسوری کی داڑھی کے بال کاٹ کر اس کے رخساروں اور ٹھوڑی پر چپکا دیے گئے تھے... مگر اب وہ بال کہیں کہیں سے اکھڑ چکے تھے۔

"کیا تم نے اسے پہلے بھی کبھی دیکھا ہے تاغانی گیدڑ؟"

شاہ کمتور نے غرا کر پوچھا۔

تاغانی جاسوس نے ایک نظر مجھ پر ڈالی اور بولا۔ "ہاں میں نے عظیم سردار سرفروش کو دیکھا ہے۔ اسے ملک فارس سے بھیجا گیا تھا۔ اس نے تمہارے سورما کو شکست دی مگر گھوڑے سے گر کر گرفتار ہوگیا۔ مجھے اس سے ملنے اور فرار کا منصوبہ بنانے کی ہدایت کی گئی تھی لیکن میں اس سے ملنے اور بات کرنے سے پہلے ہی پکڑا گیا۔" جاسوس نے یہ بیان دے کر خود اپنی موت کو دعوت دی تھی۔ وہ دم لینے کو رکا اور پھر بولا۔ "مجھ سے وعدہ کیا گیا تھا کہ اگر میں سچ بتا دوں گا تو مجھے اذیت پہنچا کر نہیں مارا جائے گا۔ اس لیے اس وعدے پر عمل کیا جائے۔"

"میں نے تجھ سے ایسا کوئی وعدہ نہیں کیا، بدبخت۔" خادِ اعظم شیر کی طرح دھاڑنے لگا۔

"آپ کے آدمیوں نے تو وعدہ کیا تھا۔" جاسوس نے گھبرا کر یاد دہانی کرانے کی کوشش کی۔

اس سے پیشتر کہ خادِ اعظم اسے کوئی جواب دیتا، سادیہ میری طرف دیکھتے ہوئے اپنے بھائی کی طرف جھکی اور کہنے لگی۔ "اب تو یہ بات بالکل واضح ہوگئی ہے، برادرِ عزیز کہ سرفروش نے فرار کا منصوبہ نہیں بنایا۔ اس لیے اسے دوبارہ میرے حوالے کر دیا جائے۔ یہ میرا غلام ہے۔"

شاہ کمتور نے یہ سن کر دیوانوں کی طرح قہقہے لگانے شروع کر دیے اور اس وقت تک ہنستا اور اپنے سینے پر ہاتھ مارتا رہا جب تک کہ اس کی آنکھوں میں پانی نہیں آگیا۔ پھر وہ بولا۔ "اہورا کی قسم، میں جانتا ہوں کہ یہ تمہارا غلام ہے اور تم اس سے کیا چاہتی ہو۔ مگر اس کا فیصلہ میں نہیں، میرا گھوڑا برق کرے گا۔ برق کو یہاں لایا جائے۔" اس نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا۔

میں فوراً سمجھ گیا کہ لایا تو گھوڑا ہی جائے گا مگر گھوڑے کے بھیس میں لونا مارنو باتیں کرے گا۔ میں نے لونے کی طرف دیکھنے کی جرأت بھی نہیں کی۔ وہ اسی طرح بے نیازی سے زنگین گولے اچھالنے میں مصروف تھا۔ میں نے سوچا کہ لونے مارنو کی دوستی اور دشمنی کی گھڑی بھی آ ہی گئی۔ اگر یہ میرا دشمن ہوگا تو گھوڑے کی زبان سے میری موت کا فیصلہ سنا دے گا اور دوست ہوگا تو یقیناً...

اتنے میں خادِ اعظم کا ذاتی گھوڑا برق وہاں لایا گیا جو عام گھوڑوں سے قد میں بڑا تھا۔ گھوڑا سازندوں کی آواز سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوا۔ ایک سیاہ فام غلام نے برق کی باگ تھامی اور اسے تخت کے قریب لے گیا۔ خادِ اعظم نے جھک کر اس کی گردن پر ہاتھ پھیرا اور بولا۔ "اے میرے میدانِ کارزار کے ساتھی، پیارے برق، تمہیں ان آدمیوں کی تقدیر کا فیصلہ کرنا ہے۔ تاغانی گیدڑ کے متعلق بتاؤ کہ یہ مجرم اور سزاوار ہے یا نہیں؟"

سیاہ فام غلام نے ہلکے سے باگ کھینچی تو گھوڑے نے اثبات میں سر ہلایا اور اس کی باچھیں کھل گئیں۔ اگرچہ لونے کے ہونٹ بند تھے لیکن گھوڑے کی ہنہناہٹ جیسی آواز اس کے حلق سے نکلی۔ "یہ تاغانی مجرم ہے۔" خادِ اعظم کسی بچے کی طرح خوش ہو کر تالیاں بجاتے ہوئے بولا۔ "میں تم سے متفق ہوں، برق... اور کہ اس کی سزا موت ہے مگر اسے آسان موت ملنی چاہیے یا اذیت ناک؟"

میں یہ سوچ کر ہی لرز گیا کہ لونا مارنو اس سوال کا وہی جواب دے گا جو خادِ اعظم چاہتا تھا۔ وہ لب ہلائے بغیر گھوڑے کی آواز میں بولا۔ "اسے اذیت ناک موت ملنی چاہیے مالک! اس نے اپنے جرائم کا اعتراف کیا ہے تو اسے سزا بھی بھگتنا ہوگی۔"

میں نے بے اختیار مارنو کی طرف دیکھا مگر وہ گولے اچھالنے میں مصروف تھا۔ موت کی سزا سناتے وقت بھی

اس کے ہونٹوں پر وہی مستقل مسکراہٹ چپکی ہوئی تھی حالانکہ اس کے ہونٹ بند تھے۔

"اور اب سرفروش کے متعلق تمہارا کیا فیصلہ ہے، برق؟ کیا یہ اتنا ہی معصوم اور بے گناہ ہے جتنا میری بہن سمجھتی ہے اور یہ خود کو ظاہر کرتا ہے؟" شاہ کمتور نے پوچھا۔

گھوڑا یعنی مارنو خاموش رہا۔ اگرچہ اس کی خاموشی کا یہ وقفہ صرف چند لمحوں تک محدود تھا لیکن یہ چند لمحے مجھ پر موت سے بھی زیادہ بھاری گزرے... پھر مارنو کے غیر متحرک ہونٹوں کے باوجود گھوڑے جیسی ہنہناتی ہوئی آواز نکلی۔

"سرفروش احمق نہیں ہے، مالک کہ کوئی ایسا منصوبہ بنائے۔ یہ تو اپنے تاوان کا منتظر ہے جو اسے آزادی دلائے گا۔ آپ کی بہن نے اس معاملے میں سچ کہا ہے، عالم پناہ! سرفروش کو اس جرم کی سزا نہیں ملنی چاہیے جس کا وہ مرتکب نہیں ہوا۔"

یہ سن کر میری جان میں جان آئی۔

خادِ اعظم سادیہ کی طرف پلٹا اور بولا۔ "میرا برق تم سے متفق ہے میری ننھی بہن! کیا تم اس کے تھان پر جا کر اسے مٹھائی کھلاتی رہی ہو؟" یہ کہہ کر وہ بے ہودہ انداز میں ہنس پڑا۔

سادیہ نے بھی قہقہہ لگایا اور بولی۔ "آپ نے برق سے فیصلہ لے کر بڑی دانش مندی سے کام لیا ہے، برادرِ عزیز! ہو سکتا ہے آپ کا گھوڑا ہم دونوں سے زیادہ عقل مند ہو۔"

خادِ اعظم نے ہاتھ بلند کرتے ہوئے کہا۔ "سرفروش مجرم نہیں ہے۔ میں اسے دوبارہ سادیہ کی تحویل میں دیتا ہوں اور اس تاغانی کو اسی وقت قتل گاہ میں لے جاؤ... پھر وہاں ان سب لوگوں کو اس کی موت کا دلچسپ تماشا دکھانے کے لیے بلا لو جو کسی اہم کام میں مصروف نہ ہوں۔"

اب میں خادِ اعظم کا قیدی نہیں بلکہ دوبارہ سادیہ کا غلام بن گیا تھا۔

جب وہ اپنے محافظوں اور کنیزوں کے جلو میں اپنے خیمے کی طرف جا رہی تھی تو میں بھی چند قدم پیچھے چلتا رہا۔ خیمے کے قریب پہنچ کر اس نے محافظوں اور کنیزوں کو رخصت کر دیا اور میرے پاس آ کر کہنے لگی۔ "تم موت کی دہلیز تک پہنچ گئے تھے، سرفروش! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر میں تمہیں بچانے کی اتنی کوشش کیوں کرتی ہوں؟"

"کیوں کہ میں آپ کا غلام ہوں اور آپ کو ہمیشہ خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہوں، خاتونِ محترم۔"

"شاید یہی بات ہے... لیکن اگر تم زیادہ مصیبت میں پھنس جاتے تو مجھے خوش نہیں رکھ سکتے تھے۔"

"اس معاملے میں میرا کوئی قصور نہیں تھا، خاتون گرامی قدر۔"

"ہاں... مگر رستم کیوں مصر تھا کہ تم سے ضرور استفسار کیا جائے؟ یہ آدمی میری سمجھ سے بالا ہوتا جا رہا ہے۔" وہ پریشانی سے بولی۔ "میں تمہیں حکم دیتی ہوں کہ جب بھی موقع ملے، رستم پر نظر رکھو لیکن اسے یہ احساس نہ ہونے پائے کہ اس کی نگرانی کی جا رہی ہے۔ میں جاننا چاہتی ہوں کہ وہ کیا کرتا ہے، کہاں جاتا ہے، کس سے ملتا ہے اور کیا باتیں کرتا ہے۔"

میں نے اشتیاق ظاہر کرتے ہوئے مؤدبانہ انداز میں کہا۔ "لیکن اس پر نظر رکھنے کے لیے مجھے آنے جانے کی اجازت درکار ہو گی، خاتونِ گرامی قدر۔ میں زنان خانے میں رہ کر اس پر نظر نہیں رکھ سکوں گا۔"

"میں جانتی ہوں۔" وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "میں اس کا بندوبست کر دوں گی مگر یاد رکھو..." اس نے مقتل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بات جاری رکھی۔ "اگر تم نے میرے ساتھ کوئی چال چلی تو اس تاغانی کی اذیت ناک موت، اس موت کے مقابلے میں نہایت آسان ہوگی جو تمہارے حصے میں آئے گی۔"

اس رات میں نے اپنی خدمت گزاری کی انتہا کر دی۔

سادیہ اور ملکہ ہوشی میں یہ فرق تھا کہ لالی آتشِ وصال میں جل کر صبح تک راکھ ہو جاتی تھی، جب کہ سادیہ ایک ایسی راکھ کی مانند ہو جاتی جسے جب بھی کریدا جائے اس میں ایک آدھ چنگاری ضرور موجود ہوتی تھی۔

"تم نے مجھے انوکھے جذبوں سے روشناس کرایا ہے، سرفروش!" وہ سرگوشی میں بولی۔ "میں ان جذبوں سے آشنا نہیں تھی۔ میری رفاقت میں بہت سے لوگ آ چکے ہیں۔ تمہارا حریف خسرو زرپارس جو تمہارے ہاتھوں مارا گیا، وہ بھی میرا رفیق رہ چکا ہے۔ شاید یہ بات تمہارے لیے حیرت انگیز ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ شاہ افشار بھی میری محبت کا دم بھرتا رہا ہے۔ اگر وہ صرف ایک ہفتہ مزید زندہ رہ جاتا تو جیسا اس نے وعدہ کیا تھا، وہ ہم پر تاغان کی شہر پناہ کا دروازہ کھول دیتا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ میدانِ جنگ میں کیسے مارا گیا؟ ہم نے اپنے لشکریوں کو ہدایت کی تھی کہ کوئی اس پر حملہ نہ کرے اور کسی کو یہ جرأت نہیں ہو سکتی کہ وہ حکم عدولی کرتا مگر اس کے باوجود شاہ افشار مر گیا اور میرے سارے منصوبے خاک میں مل گئے۔ فصیل آج بھی سدِ راہ بنی ہوئی ہے اور میرا بھائی آج بھی اس توپ کے حصول کے لیے تڑپ رہا ہے۔ اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ شاہ افشار کو کس نے

مار بھا تو میں اُس کے ساتھ وہی سلوک کروں گی جو آج تا غانی جا موس کے ساتھ کیا گیا ہے۔"

میں خاموشی سے سادیہ کی باتیں سنتا رہا۔ صرف لال ہو یا میں ہی جانتا تھا کہ شاہ افشار کو کس نے ہلاک کیا تھا۔ مجھے اس بات پر بے حد تعجب تھا کہ شاہ افشار اور سادیہ ایک دوسرے کے قریب رہ چکے ہیں لیکن میں اس سلسلے میں سادیہ سے کچھ پوچھ کر اپنے لیے کوئی مصیبت کھڑی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

وہ رات تو میرے لیے بے پناہ حیرتیں لے کر آئی تھی۔ سادیہ ہر لمحے ایک نئے راز اور ایک نئے اسرار سے پردے اُٹھاتے جا رہی تھی۔ کچھ دیر بعد اس نے خود ہی پوچھا "یہ جانتے ہو، میں خاموش کیوں ہو گئی تھی؟"

"نہیں خاتونِ مکرم" میں نے جواب دیا۔

"میں نے سوچا تھا کہ تم میرے اور شاہ افشار کے بارے میں پوچھو گے۔"

"ایک غلام کو اس قسم کے استفسار کی جرأت کیسے ہو سکتی ہے، خاتونِ محترم؟"

سادیہ نے قہقہہ لگایا اور بولی "یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا، سرفروش! میں یہی پرکھنا چاہتی تھی کہ تم اس سلسلے میں متجسس ہوتے ہو یا نہیں۔ بہر حال، تم جیت گئے اس لیے میں خود ہی تمھیں بتائے دیتی ہوں۔ تاہم یہ خیال رکھنا کہ میں تمھیں اعتماد میں لے رہی ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم اپنا مقام بھول جاؤ۔"

"نہیں سرکارِ عالیہ... میں خوش فہم احمقوں میں سے نہیں ہوں۔"

اس یقین دہانی کے بعد سادیہ نے مجھے بتایا کہ میدانِ کارزار سے چند میل مغرب کی طرف فصیل میں ایک موری نما چھوٹا سا دروازہ ہے۔ کبھی کبھی سادیہ اپنے چند محافظوں اور کنیزوں کے ساتھ رات کے وقت وہاں جایا کرتی تھی۔ شاہ افشار اپنے عمائدینِ سلطنت اور ملکہ سے جان چھڑا کر اس دروازے سے باہر آتا اور سادیہ کے ساتھ چھوٹے خیمے میں کچھ وقت گزارا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ وہ سادیہ کی محبت میں اتنا ڈوب گیا کہ اس نے اپنی قوم سے غداری کرتے ہوئے شہر پناہ کا دروازہ کھولنے کا وعدہ کر لیا۔ اس نے سادیہ کو یہ قول بھی دیا کہ وہ ملکہ ہوشی کو اس کے حوالے کر دے گا تاکہ سادیہ اس سے انتقام لے سکے۔ ملکہ ہوشی کے تذکرے پر سادیہ بولی "اگر شاہ افشار نہ مرتا تو میں ملکہ ہوشی کو ایسی عبرت ناک سزا دیتی کہ دیکھنے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ میں نے تو اس کُتی کے لیے ایک پنجرہ بھی تیار کروا لیا تھا۔"

سادیہ کی یہ بات سُن کر میرے لیے ہنسی ضبط کرنا مشکل ہو گئی۔ لال نے سادیہ کے لیے اور سادیہ نے لال کے لیے پنجرے تیار کروا لیے تھے۔ انتقام کے سلسلے میں عورتوں کی سوچ بھی کتنی یکساں قسم کی ہوتی ہے۔

ان باتوں کے بعد سادیہ دیر تک خاموش رہی تو میں سمجھا کہ شاید وہ سو گئی ہے۔ میں اس کے بدلے ہوئے رویے پر غور کرنے لگا کہ اس اچانک تبدیلی اور میرے لیے پیار کے اظہار کا محرک کون سا جذبہ ہے؟

ابھی میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا تھا کہ وہ بول اٹھی "سرفروش!"

"جی خاتونِ محترم!"

"میں سمجھی تھی کہ تم سو گئے ہو، سنو... میں نے تم پر اعتبار کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

"یہ میرے لیے باعثِ عزت و افتخار ہے خاتونِ مکرم... آپ ہمیشہ مجھے اپنے اعتماد کا اہل پائیں گی۔"

اس کی آواز سرگوشی میں ڈھل گئی "میں نے خادِ اعظم کو ختم کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ پھر میں تنہا آسوریوں پر حکمرانی کروں گی۔ تمھیں اس سلسلے میں میری مدد کرنا ہو گی۔"

میں نے یہ سُن کر اس طرح کروٹ بدلی جیسے اس بات سے مجھے حیرت ہوئی ہو اور میں کچھ خوف زدہ بھی ہو گیا ہوں۔ مجھے پتا تھا کہ وہ مجھ سے اسی ردِ عمل کی متوقع ہو گی۔ چنانچہ میں نے اداکاری کرتے ہوئے کہا "میں آپ کی مدد کیسے کر سکتا ہوں، خاتونِ محترم... میں تو ایک بے بس غلام ہوں جس کے پاس نہ کوئی ہتھیار ہے اور نہ ہی کوئی اختیار ہے۔"

چونکہ وہ خواب گاہ میں مکمل تاریکی پسند نہیں کرتی تھی اس لیے خیمے کے ایک گوشے میں شمع جل رہی تھی۔ اس نے شمع کی مدھم روشنی میں اپنی نگاہیں میرے چہرے پر گاڑ دیں۔ میں اپنا عکس اس کی خوب صورت بادامی آنکھوں میں دیکھا تو مجھے خیال آیا کہ اُسے بھی اپنا عکس میری آنکھوں میں جھلکتا نظر آ رہا ہو گا۔ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی "تمھیں اختیار بھی اور ہتھیار مل جائیں گے۔ اگر تم نے میرا ساتھ دیا تو میرے ساتھ حکمرانی کرو گے... لیکن نہیں... میں جھوٹ نہیں بولنا چاہتی۔ حکمرانی میں کروں گی اور تم میرے دوش بدوش بیٹھو گے۔"

میں سادیہ کی اس پیشکش سے پریشان ہو گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ شاہ تیمور کو قتل کرنے کے لیے بیک وقت دو منصوبے بنا لیے گئے ہیں اور انھیں ایک ساتھ عملی جامہ پہنایا جائے گا مگر منصوبوں

پر عمل درآمد کرنے والے فریقین ایک دوسرے کے منصوبے سے لاعلم ہیں... اور یہ بات سب سے زیادہ خطرناک تھی کیونکہ کسی بھی لمحے اور کسی بھی مقام پر فریقین کا آپس میں ٹکراؤ ہو سکتا تھا.. پھر ان کا یہ تصادم ایک دوسرے کا بھانڈا پھوڑنے کے لیے کافی سے زیادہ ثابت ہو سکتا تھا۔

میں انھی سوچوں میں گم تھا کہ سادیہ بولی "تم خاموش کیوں ہو گئے، سرفروش؟"

"میں... میں غور کر رہا تھا خاتونِ محترم۔ دراصل مجھے اس کی توقع نہیں تھی بلکہ میں نے تو ایسا بھول کر بھی نہیں سوچا تھا۔ خادِ اعظم کو قتل کرنا بہت مشکل ہے کیونکہ محافظ ہر وقت اس کی حفاظت اور نگرانی پر مامور رہتے ہیں اور وہ اس کے وفادار ہیں۔"

"اگر اس کے پاس وفادار جنگ جو ہیں تو میرے پاس بھی ہیں جو میرے لیے اپنی جانوں پر کھیل سکتے ہیں۔"

میں نے سوچا کہ ایسے وفادار ساتھی رستم کے بھی ہیں اور جال ہر طرف پھیلتا ہی جا رہا ہے۔

سادیہ نے ایک نوک دار رنگین ناخن سے اپنی ناک کھجاتے ہوئے کہنے لگی "اگر میرا منصوبہ کامیاب ہو گیا تو اس میں کوئی معرکہ آرائی نہیں ہو گی۔ میں خون ریزی نہیں چاہتی اگر لڑائی ہوئی تو میں ماری جاؤں گی کیونکہ میرے پاس اتنی نفری نہیں جتنی کہ خادِ اعظم کے پاس ہے۔ اس لیے میں اُسے عیاری سے قتل کرنا چاہتی ہوں... مگر میں یا تم اُسے قتل نہیں کرو گے۔ میرے پاس ایک ایسا آدمی ہے جو اُسے قتل کرے گا اور سارا الزام بھی اپنے سر لے گا۔ اس جرم کے لیے اُسے اپنی جان دینا پڑے گی۔"

"یہ سب کچھ کیسے عمل میں آئے گا، خاتونِ محترم؟"

"تم بونے مارنو کو جانتے ہو، خادِ اعظم کا وہی مسخرہ جو ہر وقت گولے اُچھالتا رہتا ہے؟"

مارنو کا نام سُن کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اگر وہ سادیہ کا ساتھی ہے تو پھر میری اور رستم کی جانیں اس کی مُٹھی میں تھیں۔

"زیادہ مت سوچو، سرفروش! وہ بونا میرا ساتھی ہے وہ بظاہر اپنے آپ کو خادِ اعظم کا وفادار ظاہر کرتا ہے لیکن کسی بنا پر وہ میری وفاداری کے لیے مجبور ہے۔ میں نے اُسے کہہ رکھا ہے کہ وہ اپنے آپ کو شاہ تیمور کا وفادار ظاہر کرتا رہے لیکن جب میں اُسے حکم دوں گی تو وہ بلا چون و چرا اس کی تعمیل کرے گا۔"

میں یہ جان کر دنگ رہ گیا کہ بونا مسخرہ بیک وقت کس کس سے کھیل کھیل رہا ہے۔ خادِ اعظم اُسے اپنا ساتھی سمجھتا ہے، سادیہ اُسے اپنا وفادار کہتی ہے، رستم اور بابر کے نزدیک وہ معتبر ہے اور ان کی وجہ سے میں بھی اسے معتبر سمجھ رہا تھا۔

سادیہ کہہ رہی تھی "دو روز بعد میرے بھائی کی سالگرہ ہے جس کے لیے ایک شان دار تقریب منعقد کی جائے گی۔ اس تقریب میں بونا اُسے قتل کر دے گا۔ میں اُسے خادِ اعظم کے قتل پر مجبور کر دوں گی اور یہی وہ وقت ہو گا جب مجھے تمھاری مدد درکار ہو گی۔ میں تمھیں لکڑی کے کُند خنجر کی بجائے فولاد کا تیز دھار خنجر دوں گی۔ تم تقریب میں میرے ساتھ جاؤ گے جب بونا میرے بھائی کو قتل کرے تو تم اُسے کچھ بولنے کا موقع دیے بغیر اس خنجر سے بونے کا کام تمام کر دو گے۔ اگر اُسے بولنے کا موقع مل گیا تو سب کچھ غارت ہو جائے گا۔" اتنا کہہ کر وہ ہنس پڑی "میرا منصوبہ ناکام نہیں ہو سکتا سرفروش... اس عیارانہ منصوبے پر عمل کرنا بہت آسان ہے۔ بونا خادِ اعظم کو قتل کرتے ہی مجرم بن جائے گا اور تم مجرم کو قتل کر کے عہدے داروں اور آسوریوں کی نگاہوں میں اعلا مقام حاصل کر لو گے۔ میں روتے اور بین کرتے ہوئے خادِ اعظم کو سپردِ خاک کروں گی اور اس کے بعد جب میں اپنی قوم کی واحد حکمراں بن جاؤں گی تو تم تخت پر میرے دائیں ہاتھ بیٹھا کرو گے۔"

"مگر کتنے دن؟" میں نے یہ الفاظ کہے نہیں بلکہ صرف دل ہی دل میں سوچے تھے۔ "نہ جانے کب تمھارا جی مجھ سے بھر جائے اور تم میرے ساتھ بھی وہی سلوک کرو جو مجھ سے پہلے غلام کے ساتھ کیا گیا تھا۔" پھر میں نے سادیہ کی طرف دیکھا اور کہا "آپ کا منصوبہ بہت عمدہ اور مکمل ہے خاتونِ محترم لیکن آپ بونے مارنو کے متعلق اتنی پُر یقین کیسے ہیں؟"

"اس یقین کی وجہ میں تمھیں نہیں بتا سکتی۔ تمھارے لیے صرف اتنا جان لینا ہی کافی ہے کہ وہ میرے کہنے پر خادِ اعظم کو ضرور قتل کر دے گا۔ تم اس دوران رُستم پر نظر رکھو۔ میں نہیں جانتی کہ اس کی وفاداریاں کس کے ساتھ ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ میرے معاملے اور منصوبے میں دخل در معقولات نہ کرے۔"

میں خاموشی سے اُسے دیکھتا اور سوچتا رہا کہ اب کبھی

بونے پر اعتماد نہیں کروں گا۔

"آج میں نے بہت باتیں کی ہیں اور میں نے اپنا دِل تم پر کھول دیا ہے۔ کیا تم میرے لیے ایک بار پھر..."

میں ہادیہ کے حکم کی تعمیل میں مصروف ہو گیا۔

• ◘

آنے والی صبح صرف میرے لیے ہی حسرتیں اور اُداسیاں نہیں لائی بلکہ ہادیہ اور رستم کے لیے بھی اس کے دامن میں مایوسیاں ہی مایوسیاں تھیں۔ ان کے سارے منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے تھے کیونکہ رات کے کسی لمحے خادِ اعظم نے لشکر کو فوری کُوچ کا حکم دے دیا تھا۔ جس شدّت و سُرعت کے ساتھ اُس پر جنوں کا دَورہ پڑا تھا، اسی تیزی سے وہ ختم بھی ہو گیا تھا۔ دیوتا اُوبی نے اُسے خواب میں جلوہ دکھایا تھا اور بشارت دی تھی کہ وہ یہاں جنگ نہیں جیت سکتا۔ اس لیے وہ فوراً کُوچ کر کے مشرق کی طرف روانہ ہو جائے جہاں فتح و نصرت اس کی منتظر ہے۔ دیوتا نے اُسے خواب میں اور بھی بہت سی باتیں بتائی تھیں مگر سختی سے ہدایت کر دی تھی کہ وہ ان باتوں کا انکشاف کسی پر نہ کرے۔ اِس لیے اُس نے چُپ سادھ رکھی تھی۔

خادِ اعظم کے اس اچانک اقدام نے میری ساری اُمیدیں اور سارے خواب بکھیر دیے تھے۔ قافلے کے ساتھ چلتے چلتے ایک مقام پر میں نے اپنے گھوڑے کی باگ کھینچی اور پلٹ کر دیکھا تو مجھے تاحدِ نظر لشکر کے چھکڑے ہی چھکڑے دکھائی دیے۔ یہ چھکڑے یا گاڑیاں ایک طویل قطار میں آگے بڑھ رہی تھیں اور ان کے پیچھے گرد کا ایک بادل اُڑ رہا تھا۔

کُوچ کرتے وقت ہادیہ نے مجھ سے کہا تھا کہ اب ہمیں انتظار کرنا پڑے گا۔ سالگرہ کی تقریب ملتوی کر دی گئی ہے اور جب خادِ اعظم پر دیوانگی کا دورہ نہ ہو تو وہ محافظوں کے گھیرے میں رہتا ہے پھر اُوبی کی بشارت کے بعد شاید وہ بروں بھی بہت کم پیٹے گا اس لیے اب اُسے قتل کرنے کی کوشش بے حد خطرناک ہو گی... لیکن فکر نہ کرو۔ اس پر پھر جنوں کے دَورے پڑیں گے اور کوئی نہ کوئی تقریب بھی ضرور منائی جائے گی۔"

کُوچ کے بعد رستم سے بھی میری مڈبھیڑ ہوئی تھی اس نے سر کی منفی جنبش سے بتا دیا تھا کہ اب منصوبے پر عمل نہیں کیا جا سکتا... اور پھر میرے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے صرف یہ ایک لفظ کہا تھا: "صبر۔"

ہمیں سفر کرتے ہوئے کئی روز گزر چکے تھے مگر اِس دوران بونامار نے مجھے ایک بار بھی دکھائی نہیں دیا تھا۔ خدا جانے وہ کہاں غائب ہو گیا تھا۔ میں نے اُسے خادِ اعظم کے ذاتی عملے میں بھی نہیں دیکھا تھا اور یہ بات میرے لیے تعجب خیز تھی۔ شاید سفر کے دوران یا ہنگامی حالات میں شاہ تمبود اس مسخرے کو اپنے قریب نہیں آنے دیتا تھا۔

....

... دوسرے روز میں نے ہادیہ سے بابر کو مانگ لیا۔ میری درخواست پر اس نے مجھے تیز نگاہوں سے تو ضرور دیکھا لیکن میری درخواست قبول کر لی۔ میں نے بابر کو غسل کرایا اور اسے نیا لباس بھی فراہم کر دیا۔ اس نے اپنی چھوٹی سی گاڑی بھی مکمل کر لی تھی جسے وہ دو نوک دار چھڑیوں کی مدد سے چلایا کرتا تھا۔ آسوری اسے اپنی گاڑی چلاتا دیکھ کر محظوظ ہوتے تھے۔ میں نے اسے چھکڑے کے ساتھ ایک تختہ بھی لگوا دیا تھا تاکہ وہ اس پر سے اپنی گاڑی اُتار یا چڑھا سکے۔

ایک روز اس نے مجھ سے کہا: "ہادیہ آج کل تمھیں بڑی عجیب نظروں سے دیکھتی ہے، سرفروش! میرا خیال ہے، اب تم پہلے کی بہ نسبت زیادہ مشکل میں پھنس گئے ہو... لیکن یہ مشکل دوسری قسم کی ہے۔ میرے دوست۔ جب میں جوان تھا تو میری بیوی بھی مجھے ایسی ہی نگاہوں سے دیکھا کرتی تھی لیکن میں ناتجربہ کاری اور نادانی کے باعث ان نگاہوں کا مفہوم نہ سمجھ سکا اور جب اُسے محبت کا جواب محبت سے نہ ملا تو وہ بے وفائی پر مائل ہونے لگی۔ تب میں نے اُسے اپنے قبیلے کے دستور کے مطابق ہلاک کر دیا تھا... مگر اب بھی مجھے اس کی یاد دُکھوں اور پچھتاووں میں مبتلا کر دیتی ہے۔"

بابر کی اس بات سے مجھے احساس ہوا کہ ہادیہ سچ مچ مجھ سے محبت کرنے لگی ہے اور اس کا التفات محض ڈھونگ نہیں ہے۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہو سکتا تھا کہ مجھے زندہ رہنے کی زیادہ مُہلت مل سکتی تھی۔

سفر کا چوتھا یا پانچواں روز تھا کہ چلتے چلتے میں نے اپنا گھوڑا ایک ٹیلے پر چڑھا دیا اور مڑ کر لشکری کارواں دیکھنے لگا جو کسی سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کے پس منظر میں بہت دُور، اُفق کے پاس شہر پناہ دکھائی دے رہی تھی۔ سفر کے دوران جب تک ہم فصیل کے متوازی چلتے رہے تھے جگہ جگہ تاغانی سپاہی اور گھڑ سوار فصیل پر ہماری نگرانی کرتے دکھائی دیے تھے۔ جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ فصیل کے اس پار دوسرے شہر اور گاؤں آباد ہیں۔ جنھیں خبردار کر دیا گیا ہے کہ اگر

خادِ اعظم کا لشکر مشرق کی طرف بڑھتے ہوئے اچانک پلٹے اور ہیں پر حملہ کر دے تو وہ مقابلے کے لیے تیار رہیں لیکن خادِ اعظم چُپ سادھے اپنے لشکر کی رہنمائی کرتا رہا اور فصیل سے ہٹ کر آگے بڑھتا رہا۔

لشکر کے آگے آگے ہراول دستہ تھا جس کے گھڑ سوار تیزی سے سفر کرتے ہوئے راستے کا جائزہ لیتے اور واپس آ کر شاہ تمبود کو آگاہ کرتے رہتے تھے۔ خادِ اعظم اپنے گھوڑے برق پر سوار محافظوں کے دستے میں گھرا دُور اُفق پر نظریں جمائے رہتا۔ اُس کے محافظوں نے اپنے نیزوں کی نوک پر انسانی کھوپڑیاں اور گھوڑوں کی دُمیں لٹکا رکھی تھیں۔ اُن کے درمیان یک چشم خادِ اعظم اپنے مکروہ چہرے کی وجہ سے کوئی خبیث روح ہی دکھائی دیتا تھا اور اس کے محافظ غول بیابانی لگتے تھے۔ ان کے پیچھے ہادیہ اپنے چہرے پر مہین نقاب ڈالے کبھی گھوڑے پر سفر کیا کرتی اور کبھی اپنی گاڑی میں آرام کرنے چلی جاتی تھی۔ اس کی کنیزوں اور ذاتی محافظوں کے لیے بیس چھکڑے وقف تھے۔ ان کے بعد رستم کا چھکڑا تھا جس کے پیچھے اس کے خصوصی عملے کی گاڑیاں تھیں... پھر فوج کے عہدے داروں اور سپاہیوں کے بعد قیدیوں اور خدمت گاروں کے چھکڑے تھے میں ان چھکڑوں کو گزرتے ہوئے دیکھتا اور سوچتا رہا کہ شاید بونے مار نو کے لیے بھی کوئی چھکڑا مخصوص کیا گیا ہو گا ورنہ وہ ان پانچ دنوں میں کہیں نہ کہیں تو ضرور دکھائی دیتا۔

'اس کا چھکڑا کہاں ہے؟' یہ مجھے معلوم نہ ہو سکا۔

آخری چھکڑے کے تقریباً ایک میل پیچھے گھوڑوں اور بچھڑوں کے گلّے لائے جا رہے تھے۔ محتاط اندازے کے مطابق ان کی تعداد پانچ ہزار سے کم نہیں تھی۔ ان گھوڑوں اور بچھڑوں کو چھوٹے چھوٹے گلّوں میں اِس لیے بانٹ دیا گیا تھا کہ ان کی رکھوالی آسانی سے کی جا سکے۔ ان کے رکھوالوں میں چرواہوں اور سلوتریوں کے ساتھ ساتھ قصاب بھی شامل تھے جو وقتِ ضرورت گھوڑے ذبح کرتے تھے۔ رکھوالوں کے پاس کافی تعداد میں ایسے تربیت یافتہ کتّے بھی تھے جو گلّے سے بھاگنے والے گھوڑوں کو گھیر کر واپس لاتے اور انھیں گلّے کے ساتھ چلنے پر مجبور کر دیتے تھے۔

میں نے ایک بار پھر پلٹ کر فصیل کی جانب دیکھا تو میری نگاہ ان دو آسوری شہسواروں پر جا پڑی جو میرے عقب میں تھوڑے فاصلے پر کھڑے میری ہی جانب دیکھ رہے تھے۔ یہ دراصل میرے نگراں تھے اور چوبیس گھنٹے مجھ پر نظر رکھتے تھے۔ میں نے مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ، انگلی سے طلائی طوق کی طرف اشارہ کیا۔ جیسے انھیں بتانا چاہتا تھا کہ میں اس حسین حصار سے باہر کہیں نہیں جاؤں گا۔ اگرچہ ہادیہ نے یہ طوق ڈھیلا کروا دیا تھا اور اب اس سے میری گردن نہیں چھلتی تھی مگر جب تک یہ میرے گلے کی زینت تھا، میں ایک غلام تھا اور مجھے تلوار رکھنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی تھی۔

سفر مسلسل جاری رہا اور ہر صبح و شام مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی رہی کہ آسوری لمحوں میں اپنے خیمے اُکھاڑتے اور لمحوں میں نصب کر دیتے ہیں۔ قیام کے دوران وہ کچھ اور ہوتے ہیں اور سفر کے دوران کچھ اور... جب کوچ کا وقت آتا تو ہر فرد حتیٰ کہ چھوٹے چھوٹے بچے بھی کام میں جُت جاتے۔ ایسا لگتا تھا کہ انھوں نے قیام و سفر کے لیے جو اصول و قواعد بنائے ہیں، ان سے کوئی بھی روگردانی نہیں کر سکتا۔

چھٹے روز مجھے ہادیہ کا پیغام ملا کہ آج رات مجھے اس کے حضور پیش ہونا ہے چنانچہ جب پڑاؤ ہُوا تو میں اپنے چھکڑے میں گیا اور تیار ہو کر ہادیہ کے چھکڑے کی طرف چل دیا۔ آسمان پر تارے جگ مگ کر رہے تھے اور رات کچھ خنک ہو گئی تھی اس لیے متعدد جگہوں پر الاؤ روشن تھے۔ جس میدان میں پڑاؤ ڈالا گیا تھا، اس کی زمین کچھ ریتلی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے آگے ریگستان آنے والا ہے۔

ہادیہ کا چھکڑا بڑا اور خوب آراستہ پیراستہ تھا۔ اس کی سیڑھیوں کے قریب کھڑے محافظ نے مُسکرا کر مجھے سلام کیا لیکن اب محافظوں کے تبسّم میں میرے لیے توہین گُھلی ہُوئی نہیں ہوتی تھی۔ ان کے روّیے میں یہ تبدیلی میرے ساتھ ہادیہ کے مہربان روّیے کا نتیجہ تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ اب بھی مجھے ہادیہ کا کھلونا اور غلام سمجھتے ہیں مگر انھیں طنزیہ تبسّم یا ذومعانی بات کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔

میں سیڑھیاں چڑھ کر چھکڑے میں داخل ہو گیا...

اور جب عقبی حصّے کا پردہ ہٹا کر آگے بڑھا تو سامنے ہی ہادیہ بستر پر دراز نظر آ گئی۔ وہ میرا ہی انتظار کر رہی تھی۔ جوں ہی میں اُس کے قریب پہنچا اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

"میں نہیں جانتی کہ تم نے مجھے اپنا گرویدہ بنا لیا ہے یا میں خود ہی اپنا آپ ہار بیٹھی ہوں۔ لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے تم میری کمزوری بن گئے ہو، جیسے تمھارے بغیر میری

تکمیل ہی نہیں ہو سکتی۔"

میں نے جواب میں بولنا چاہا تو اس نے میرے ہونٹوں پر اپنی دو انگلیاں رکھ دیں۔

"نہیں، تم مت بولو۔ مجھے بولنے دو۔ میں چھ روز سے تم سے بات کرنے کو ترس گئی ہوں۔"

میں خاموش رہا اور وہ بولتی رہی۔ حتیٰ کہ اس نے سرگوشی میں کہا۔ "جب ہم شاہ تمبور کو ختم کر دیں گے تو میں تم سے شادی کر لوں گی... پھر تم بھی میرے ساتھ میری قوم پر حکمرانی کرو گے۔ کرو گے نا؟"

"آپ نے میری اتنی عزت بڑھائی ہے خاتونِ محترم کہ مجھے شکریہ ادا کرنے کے لیے الفاظ ہی نہیں ملتے۔"

"یہ میری بات کا جواب نہیں ہے، سرفردش! جو میں نے پوچھا ہے، اس کا جواب دو۔"

"میں نہیں جانتا کہ آسوری قوم پر حکومت کیسے کی جاتی ہے، خاتونِ محترم۔" میں نے جواب دیا۔

وہ ایک دم میرے پہلو سے اُٹھ بیٹھی اور قدرے غصّے سے بولی۔ "میں نے محسوس کیا ہے کہ تم مجھے ٹالتے ہو اور بنانے کی کوشش کرتے ہو۔ مجھے تمھارا یہ بزدلانہ اور محتاط رویّہ قطعاً پسند نہیں اور ہاں تنہائی میں مجھے خاتونِ محترم نہیں بلکہ صرف سادیہ کہا کرو۔ سمجھ گئے؟"

"جی ہاں خاتون... سادیہ۔" میں نے جواب دیا۔

"خاتون نہیں... صرف سادیہ... یہ آپ جناب والا تکلّف بھی ختم ہونا چاہیے۔ اب بتاؤ کہ میں تمھیں کیسی لگ رہی ہوں؟"

"بے حد غصّے میں۔" میں نے جواب دیا۔

"تو ایسے میں کیا تمھارا فرض یہ نہیں کہ میرا غصّہ ٹھنڈا کرو؟" اس نے غصّے سے پوچھا۔

میں نے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ وہ کچھ دیر آنکھیں بند کیے لیٹی رہی پھر آہستہ آہستہ کہنے لگی۔ "سُنو سرفروش! جب سے اُوبی نے شاہ تمبور کو بشارت دی ہے، اس نے آج پہلی بار مجھے بلوایا اور اپنے اعتماد میں لے کر بہت سی باتیں کیں۔"

"اچھا! کیا میں وہ باتیں پوچھ سکتا ہوں؟"

"وہ تو میں خود ہی تمھیں بتانے والی تھی۔" اس نے کروٹ لے کر بات جاری رکھی۔ "وہ ہر صبح کوچ سے پہلے اس چھکڑے میں جاتا ہے جس میں دیوتا اُوبی کا مجسمہ رکھا ہُوا ہے۔ آج کل وہ بہت نیک ہو گیا ہے۔ لڑکیوں کی طرف تو آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ وہ کہتا ہے کہ دیوتا اُوبی نے اُسے ہدایت کی ہے کہ اس وقت تک مشرق کی طرف بڑھتا رہے جب تک کہ وہ دیوار ختم نہ ہو جائے جس کے دوسری جانب تاغانی رہتے ہیں پھر وہ دیوار کی دوسری جانب سے مغرب کی طرف چلتا رہے اور ملکہ ہوشی کی فوج پر پیچھے سے حملہ کرے تو نہ صرف اُسے فتح نصیب ہو گی بلکہ توپ بھی مل جائے گی۔"

"یہ تو اُسے بہت پہلے کرنا چاہیے تھا، سادیہ۔ اُس نے پہلے ایسا کیوں نہیں کیا؟"

اس پر سادیہ نے بے ساختہ قہقہہ لگایا اور بولی۔ "تم بھی پاگل ہو، سرفروش! پہلے اُسے اُوبی نے یہ بشارت ہی نہیں دی تھی۔ دوسرے میں نے سُنا ہے کہ اس دیوار کے اختتام تک راستہ بے حد خطرناک ہے۔ وہاں تک پہنچنا کوئی آسان کام نہیں۔ وہاں تک پہنچتے پہنچتے سینکڑوں سپاہی مر جائیں گے بہر حال یہ باتیں۔ تم صرف رستم پر نظر رکھو اور وقت کا انتظار کرو۔ خادِ اعظم پر دیوانگی کا دورہ ضرور پڑے گا... پھر وہ بروس پی کر اپنی حفاظت سے بے پرواہ ہو جائے گا اور اس کی غیر فطری طلب جاگ اُٹھے گی تب میں خود ہی کوئی تقریب منعقد کر ڈالوں گی اور ہم اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنا دیں گے۔"

۱۶

گردشِ لیل و نہار کے ساتھ لشکر کا سفر جاری رہا۔ آہستہ آہستہ دن خنک اور راتیں خنک تر ہوتی گئیں۔ مجھے گھوڑوں کی ایال سے بنا ہُوا ایک جُبّہ، کمبل اور کتّے کی کھال سے بنی ہُوئی ٹوپی دی گئی تاکہ سردی سے اپنا تحفظ کر سکوں۔ سردیوں میں آسوری یہی چیزیں استعمال کیا کرتے تھے۔

اب تاغانی فصیل نگاہوں سے اوجھل ہو چکی تھی اور ہم جس صحرائی علاقے سے گزر رہے تھے، وہ بتدریج چڑھائی میں تبدیل ہوتا جا رہا تھا۔ اس بے آب و گیاہ میدان میں صرف دو ہی چیزیں مسلسل متحرک تھیں۔ ایک لشکر اور دوسری ریت.. دن رات چلنے والی تیز ہوائیں بگولوں کو جنم دیتیں اور ایسی باریک دُھول اُڑانے لگتیں جو چہروں پر لپٹے ہُوئے کپڑوں کے بھی پار ہو جاتی۔

میں بار بار سانس کے ساتھ مُنہ میں جانے والی دُھول تھوکتا اور ڈاکٹر فریدوں کو کوستا رہتا جس نے مجھے اپنے تجربے کی بھینٹ چڑھا کر اس عجیب دور کے وحشی قبیلوں میں پھینک دیا تھا۔ سفر کی صعوبتوں کی تاب نہ لا کر بچّے اور بوڑھے مرنے لگے

آسوری انھیں دفنانے کی بجائے لاشیں رہگزر کے کنارے پھینک دیتے اور لشکر کے پیچھے پیچھے آنے والے گوریلے انھیں چٹ کر جاتے۔ یہ گوریلے، جنھیں میدانِ جنگ میں کام آنے والوں کی لاشیں کھانے کی چاٹ لگ چکی تھی، آغازِ سفر سے ہی لشکر کے پیچھے پیچھے چلے آ رہے تھے لیکن جب انھیں اپنی مرغوب غذا کافی مقدار میں نہ ملی تو انھوں نے گھوڑوں کے ریوڑوں پر حملے شروع کر دیئے تھے۔

کئی روز بعد جب ریت کا طوفان تھم گیا تو لشکر ایک ایسے درّے میں داخل ہُوا جو اچانک دراز میں بدل گیا تھا اور دُور دکھائی دینے والے ان پہاڑوں کی طرف راہ نمائی کر رہا تھا جن کی چوٹیوں پر برف چمک رہی تھی۔ اب خادِ اعظم نے اپنے گھوڑے برق پر سواری ترک کر دی تھی اور چھکڑے میں سفر کر رہا تھا۔ سادیہ تقریباً روزانہ مجھے اپنے چھکڑے میں بلا لیا کرتی تھی اور اس کی مہربانیاں مجھ پر بڑھتی جا رہی تھیں۔ پہلے مجھے اس کی دُشمنی سے خوف آتا تھا تو اب دوستی سے ڈر لگنے لگا... مگر میں کر بھی کیا سکتا تھا۔

چند روز بعد لشکر برفانی پہاڑوں کے دامن میں پہنچ گیا جہاں درختوں اور ہریالی کی بہتات تھی۔ آسوریوں نے یہاں تقریباً ایک ہفتہ پڑاؤ ڈالے رکھا۔ وہ درخت کاٹتے اور لکڑی جمع کرتے رہے جو اُن کے لیے بے حد قیمتی تھی اور دُور دراز سے لائی جاتی تھی۔ اس لیے وہ لکڑی بطورِ ایندھن کبھی استعمال نہیں کرتے تھے۔ ایندھن کے لیے گھوڑوں کی لید استعمال کی جاتی تھی اور آسوری قوم کا سب سے نچلا طبقہ لید جمع کیا کرتا تھا۔

جوں جوں ہم آگے بڑھے، درّے کا راستہ تنگ تر ہونے لگا۔ جس میں سے بہ مشکل تمام ایک چھکڑا گزر سکتا تھا۔ اب برفانی علاقہ شروع ہو چکا تھا۔ ہمارے سروں پر برفانی چوٹیاں تنائے کھڑی تھیں اور نیچے وادیوں میں بادل گھوم رہے تھے۔ سرد ہوائیں جسم کے آر پار ہونے لگی تھیں۔ وہ مُردار خور گوریلے جو تاغان کے میدانِ کارزار سے ہمارا پیچھا کرتے آ رہے تھے، برفانی علاقہ شروع ہوتے ہی پلٹ گئے تھے اس لیے اب مرنے والوں کو گہری کھائیوں میں پھینک دیا جاتا تھا۔ اموات کی تعداد میں بھی کافی اضافہ ہو گیا تھا۔ کچھ لوگ تو بیماری سے مر رہے تھے اور کچھ تنگ راستے پر سے پھسل کر جان دے رہے تھے۔ کبھی کبھی تو چھکڑے بھی کھڈوں اور کھائیوں میں جا گرتے تھے لیکن ان تمام مشکلات و مصائب کے باوجود خادِ اعظم اپنے دیوتا اُوبی کی ہدایت پر سفر جاری رکھے ہُوئے تھا۔ شام کا اندھیرا اُترنے سے پہلے ہر فرد اور ہر چھکڑا جہاں ہوتا تھا، وہیں رُک جاتا تھا اور الاؤ روشن کر دیئے جاتے تھے۔ میں آسوریوں کی بہ نسبت اچھی صحت اور تن و توش کے باوجود زکام اور نزلے کا شکار ہو گیا تھا۔ جس کا علاج وہ گرم گرم بروس سے کیا کرتے تھے چنانچہ گرم گرم بروس کے ساتھ مجھے برف کی طرح یخ گوشت کھانا پڑتا تھا مگر اب مجھے گھوڑے کا گوشت کھانے کی عادت سی پڑ گئی تھی۔

میرا چھکڑا سادیہ کے چھکڑے سے کافی پیچھے تھا اور میں خوش تھا کہ اُس نے کئی دنوں سے مجھے نہیں بلوایا تھا۔ دو روز سے مجھے وہ دو آسوری شہسوار بھی دکھائی نہیں دیئے تھے جو سائے کی طرح میری نگرانی کیا کرتے تھے۔ شاید وہ یہ سوچ کر مطمئن ہو گئے تھے کہ میں اس برف زار سے فرار ہو کر کہاں جاؤں گا۔ اُن کی یہ سوچ بجا تھی۔ اس لیے وہ بھی اپنے چھکڑے میں جا دُبکے تھے۔ چنانچہ رات کو میں بلا خوف بابر کے چھکڑے میں چلا جایا کرتا تھا جہاں ہم اپنے کمبلوں اور گھاس کے ڈھیروں میں چھُپے جی بھر کے گپیں مارا کرتے تھے۔

ایسی ہی ایک شام اچانک چھکڑے کے عقبی دروازے پر بڑے زور کی دستک ہُوئی تو ہم دونوں چونک گئے ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ بابر نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور سرگوشی میں بولا۔ "ایسی ہڈیوں میں گوُدا جما دینے والی سرد اور اندھیری رات میں سادیہ بھی تمھیں نہیں بُلوا سکتی، پھر کون آیا ہو گا؟"

"میں دیکھتا ہوں۔" میں نے جواب دیا اور وہ چاقو جو کبھی میں نے بابر کو اپنی گاڑی بنانے کے لیے دیا تھا، ایک ہاتھ میں چھپا کر اُٹھا، عقبی حصّے میں گیا اور دروازے کا ایک پٹ کھول دیا۔ یخ بستہ طوفانی ہَوا بھیڑیوں کی طرح غرّاتی ہُوئی چھکڑے میں دَر آئی۔

میں نے سر باہر نکال کر دیکھا تو حیران رہ گیا۔ آنے والا بونا مارنو تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اُسے اُٹھا لیا اور دروازہ بند کر دیا۔

"تم نے ملاقات کے لیے بڑا اچھا وقت منتخب کیا ہے۔" بابر اُسے دیکھتے ہی بولا۔ "آج تو گھوڑوں نے بھی اپنے سر ایک دوسرے کی ٹانگوں میں چھُپا رکھے ہوں گے۔ بتاؤ کیا خبر لائے ہو۔ کیا خادِ اعظم نے اپنی دیوانگی کے دَورے میں کسی کھڈ میں چھلانگ لگا دی ہے؟"

بونا اسے جواب دینے کے بجائے اپنے جُتے، کمبل اور ٹوپی سے برف جھاڑتا رہا۔ وہ اپنے لبوں پر اپنی مخصوص مُسکراہٹ کے باوجود بے حد پریشان دکھائی دیتا تھا۔ اس نے میری کلائی تھامی اور کہنے لگا۔۔۔

"میں تمھارے چھکڑے پر گیا تھا مگر جب جواب نہ ملا تو میں نے سوچا کہ شاید تم یہاں ہو۔ مجھے تمھاری مدد کی ضرورت ہے، سردار سرفروش! میں ہر طرف سے مایوس ہو کر تمھارے پاس آیا ہوں۔ دیوتا اُوبی کے نام پر میری مدد کرو۔"

میں نے اب تک بابر کو یہ نہیں بتایا تھا کہ بونا مارنو بقول سادیہ اُسی کا آدمی ہے۔ وہ اصل میں کس کا وفادار تھا، مجھے اب تک معلوم نہیں ہو سکا تھا، اس لیے میں نے بابر سے یہ بات چھپائی تھی اور اب و[illegible] سے مدد مانگ رہا تھا۔ وہ کیسی مدد چاہتا تھا اور مجھ ہی سے [illegible]ں چاہتا تھا جب کہ خادِ اعظم، رستم اور سادیہ اس کی مدد کے لیے موجود تھے؟ تاہم میں نے اس کا شانہ تھپتھپاتے ہُوئے کہا۔ "میں تمھاری مدد ضرور کروں گا مارنو۔۔۔ کیا تم خطرے میں ہو؟"

"مَیں خطرے میں نہیں ہُوں بلکہ وہ کوئی اور ہے جو مجھے بے حد عزیز ہے۔ میرے ساتھ آؤ سردار سرفروش اور دیکھو کہ تم اس کے لیے کیا کر سکتے ہو۔"

میں نے نگاہوں ہی نگاہوں میں بابر سے مشورہ طلب کیا مگر اس نے کندھے اُچکا دیئے جیسے وہ کہنا چاہتا ہو کہ میں خود ہی فیصلہ کروں کہ مجھے جانا چاہیے یا نہیں۔ میں سوچنے لگا کہ کہیں وہ پُراسرار بونا مجھے دھوکے سے تو کسی جگہ نہیں لے جانا چاہتا؟ اتنے میں اس نے پھر کہا: "دیر مت کرو سردار سرفروش! وقت بہت کم ہے اور ہمیں کافی دُور جانا ہے۔" اس کے لہجے میں التجا تھی۔

"میں تمھاری مدد کرنے کے لیے تیار ہُوں، مارنو۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہُوئے کہا۔ "مگر پہلے یہ تو بتاؤ کہ مدد کی ضرورت کیسے ہے اور تم مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہو؟"

بونا مارنو یہ سُن کر دروازے کی طرف بڑھا۔ اس کے چہرے پر دحشت اور مایوسیوں کے سائے پھیل گئے تھے۔ وہ بولا: "میں نہیں بتا سکتا۔ یہاں نہیں بتا سکتا۔ میں نہیں چاہتا کہ بابر کو اس بات کا علم ہو، ورنہ اس کی جان بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔"

"اگر ایسا ہے تو میں بھی نہیں جاننا چاہتا۔" بابر بولا۔ "تم اس کے ساتھ جاؤ۔ سرفروش۔"

"چلو مارنو۔" میں نے اُسے کہا، ہم چھکڑے سے نکل آئے اور دروازہ بند کر دیا۔

باہر تُند اور یخ بستہ طوفانی ہوائیں چل رہی تھیں اور اُن کی سائیں سائیں کے علاوہ کچھ سُنائی نہیں دیتا تھا۔ میں نے چلا کر مارنو سے پوچھا۔ "ہمیں کہاں چلنا ہے، مارنو۔ جلدی بتاؤ ورنہ یہ ہوا تو ہمارا خون جما دے گی۔"

مارنو نے اسی طرح چلاتے ہُوئے جواب دیا: "ہمیں بہت پیچھے جانا ہے جہاں لید جمع کرنے والوں کے چھکڑے ہیں۔ میں وہیں سے آیا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ چھکڑوں کی آڑ لیتا ہُوا اُس خطرناک برفانی راستے پر چل پڑا۔ لید جمع کرنے والوں کے چھکڑے یہاں سے کم از کم پانچ میل دور تھے۔ راستہ بے حد خراب اور خطرناک تھا۔ ہوا تیز تھی اور اندھیرا بہت گہرا تھا۔ اگر میرا یا بونے مارنو کا پاؤں پھسل جاتا تو پاتال جتنی گہری کھائیوں میں گر کر ہماری ہڈیاں چُور ہو جاتیں۔

میرے ہاتھ پاؤں سُن ہو رہے تھے۔ میرا خیال تھا کہ اس وقت سردی نقطہ انجماد سے بیس درجے کم ہوگی۔ ایسے عالم میں کوئی بھی چوکیداری اور گلہ بانی نہیں کر رہا تھا۔ گھوڑوں کے چھکڑوں کی قطار سے بہت پہلے ایک کُھلے مقام پر روک لیے گئے تھے تاکہ انھیں اس وقت آگے بڑھایا جائے جب سارے چھکڑے اس تنگ اور دُشوار گزار راستے سے نکل جائیں۔

اگرچہ اس وقت برف باری نہیں ہو رہی تھی مگر تیز ہوا سے برف کے ذرّات اُڑ کر چھروں کی طرح جسم سے لگ رہے تھے۔ اچانک ایک مقام پر بونا مارنو گر پڑا۔ میں نے اُسے سہارا دے کر اُٹھایا۔

"اگر تمھارے لیے چلنا مشکل ہو تو میں تمھیں اُٹھا کر لے چلوں؟" میں نے کہا۔

بونے نے نفی میں سر ہلا دیا مگر چند قدم چلنے کے بعد وہ پھر لڑکھڑایا اور گر پڑا۔ اب کے میں نے اس سے پوچھنے کی بجائے اُسے اپنے کندھوں پر بٹھا لیا اور تیز تیز مگر بڑی احتیاط سے آگے بڑھنے لگا۔ جب بونا مارنو بولنے کے قابل ہُوا تو اس نے کہا: "تقریباً ایک میل کا فاصلہ باقی ہے۔"

اس نے یہ اندازہ یوں لگایا تھا کہ چھکڑوں کی قطار ختم ہو گئی تھی مگر کچھ فاصلہ خالی چھوڑنے کے بعد یہ قطار دوبارہ شروع ہو گئی تھی۔ یہ فاصلہ جان بُوجھ کر چھوڑا گیا تھا [illegible] سے

لانے والے چھکڑے باقی چھکڑوں سے اتنی دُور رہیں کہ اُن کی بدبُو اور غلاظت اگلے چھکڑوں کو متاثر نہ کر سکے بالآخر میں اُپلوں والے چھکڑوں تک پہنچ گیا۔ چھ سات چھکڑوں کے بعد ایک چھکڑے میں سے ہلکی سی روشنی باہر آ رہی تھی۔

"بس اسی چھکڑے کے پاس رُک جانا۔" بونے نے کہا۔

میں نے چھکڑے کے قریب پہنچ کر اسے کندھوں سے اُتارا تو وہ کہنے لگا: "چھکڑے میں داخل ہونے سے پہلے تمھیں ایک حلف اُٹھانا پڑے گا، سردار سرفروش!"

"کیسا حلف مارنو؟ یہ بکواس رہنے دو اور اندر چلو ورنہ اس سردی میں ٹھٹھر کر رہ جائیں گے۔"

"تمھیں صرف اتنی قسم کھانی ہے کہ جو کچھ چھکڑے میں دیکھو گے، اس کا کسی سے ذکر نہیں کرو گے۔"

"اچھی بات ہے، مارنو۔ میں قول دیتا ہُوں کہ جو کچھ۔۔۔ دیکھوں گا، اس کا ذکر کسی سے نہیں کروں گا۔ اب اندر چلو ورنہ سردی ہڈیوں میں اُتر جائے گی۔"

مارنو مطمئن ہو گیا۔ اس نے سیڑھیاں چڑھ کر اپنے چھکڑے کا دروازہ کھولا جو نسبتاً چھوٹا تھا چنانچہ مجھے جُھک کر اندر جانا پڑا۔ بونے نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔ اگرچہ چھکڑے میں روشنی تھی مگر وہ اتنی مدھم تھی کہ واضح طور پر کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ وہاں ایک ناگوار سی بُو بھی پھیلی ہُوئی تھی۔ جب میری آنکھیں اس نیم تاریکی میں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو سب سے پہلے میری نگاہ ایک بڑھیا پر پڑی جس کے سامنے گدّے پر ایک لڑکی لیٹی ہُوئی تھی۔ بڑھیا نے ہماری طرف دیکھنے کی بجائے لڑکی پر ہی اپنی نگاہیں مرکوز رکھیں۔ مارنو لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا: "یہ میری بیٹی تانتی ہے اور یہ مر رہی ہے، سرفروش! نہ میں اس کی مدد کر سکتا ہوں اور نہ ہی یہ بڑھیا کچھ کر سکتی ہے۔ اگر تم نے بھی اس کی مدد نہ کی تو یہ مر جائے گی۔۔۔ اور میری مشکل یہ ہے کہ میں تمھارے سوا کسی سے بھی مدد کی التجا نہیں کر سکتا۔" یہ کہتے کہتے بونے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

مجھے اس پر رحم کے ساتھ ساتھ غصہ بھی آیا کہ اس نے آج ایک بار پھر مجھے نئے اسرار سے دوچار کر دیا تھا۔ اس کی ہر بات اور ہر ادا اسرار کے پردے میں لپٹی ہُوئی تھی۔ وہ جب بھی مجھے ملتا ایک نئے معمے، نئے راز اور نئے اسرار سے دوچار کر جاتا تھا۔ اس وقت میں نے غصے پر قابو پا لیا اور کہا: "میں تمھاری بیٹی کو بچانے کے لئے جو کچھ بھی کر سکتا ہُوں، ضرور کروں گا مارنو مگر مجھ سے کسی معجزے کی توقع مت رکھنا۔ یہ کب سے بیمار ہے؟" میں نے اس کی بیمار اور بے ہوش بیٹی کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے پوچھا۔

"پانچ روز سے بخار میں بھن رہی ہے۔ دیکھو اس کا پنڈا کیسا تپ رہا ہے۔"

میں گھٹنوں کے بل لڑکی کے قریب بیٹھا تو وہ بڑھیا پرے ہٹ گئی جو اس کے چہرے سے پسینہ پونچھ رہی تھی۔ میں نے لڑکی کی پیشانی پر ہاتھ رکھ دیا، سوچ رہا تھا کہ کیا کروں۔ اس کی سانس بہت آہستہ چل رہی تھی مگر اس کا سینہ جکڑا ہُوا نہیں تھا جیسا کہ نمونیے میں ہوتا ہے۔

"پہلے میرا خیال تھا کہ اسے کھانسی والا بخار ہے جس سے سانس لینی مشکل ہو جاتی ہے مگر اسے وہ نہیں بلکہ کوئی دوسرا بخار ہے۔ میں نے آج تک کسی کو ایسے بخار میں مبتلا نہیں دیکھا کیا تم کوئی مدد کر سکتے ہو؟"

میں نے چراغ اُٹھا کر اس کی روشنی لڑکی کے چہرے پر ڈالی تو یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ لڑکی کے خدوخال آسوریوں جیسے نہیں بلکہ تاغانیوں جیسے ہیں۔ تاہم اُسے اپنے باپ سے ورثے میں آسوریوں کی ایک ہلکی سی جھلک بھی ملی تھی۔ اس کی آنکھیں پوری طرح نہ تاغانی قوم جیسی تھیں اور نہ ہی آسوریوں جیسی۔۔۔ اس کے ہونٹ گلاب کی طرح سُرخ تھے جن پر بخار کی وجہ سے پپڑیاں جم گئی تھیں۔ ابھی میں اس کے خدوخال ہی دیکھ رہا تھا کہ لڑکی کی آنکھیں جھپکنے لگیں۔

وہ ہوش میں آ گئی تھی لیکن اسے یوں آنکھیں جھپکتے دیکھ کر مجھے جھرجھری سی آ گئی۔ یوں محسوس ہُوا جیسے ایک سرد سی لہر میری ریڑھ کی ہڈی میں سرایت کر گئی ہو۔ اس کی آنکھیں اگرچہ ملکہ ہوشی کی آنکھوں کی طرح گہری سبز تھیں مگر وہ بینائی سے محروم تھیں۔ اتنی حسین آنکھوں میں اندھیروں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ پھول، چاند، ستارے اور نیلا آسمان کچھ بھی تو نہیں دیکھ سکتی تھی۔

اس نے میری موجودگی محسوس کرتے ہُوئے اپنا نرم و نازک ہاتھ اُٹھایا جو میرے چہرے سے ٹکرا گیا۔ وہ میری داڑھی کو محسوس کرتے ہُوئے بولی۔

"تم کہاں ہو بابا۔ یہ کون ہے جس سے میرا ہاتھ ٹکرایا ہے؟"

یہ سُن کر بونا اس کے قریب بیٹھ گیا اور جُھک کر اس کا رخسار چومتے ہُوئے بولا: "یہ میرا دوست ہے تانتی۔ یہ تمھارا علاج کرنے

آیا ہے، میری بچی۔ تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی۔"
لڑکی کا ڈال جیسا ہاتھ پھر اُٹھا اور اس کا ہاتھ میرا چہرہ ٹٹولنے لگا۔ اس نے میری داڑھی، ہونٹ، آنکھیں اور پیشانی چھوتے ہوئے کہا: "تمہارا دوست اچھا ہے بابا۔" پھر وہ ہاتھ سے اپنے باپ کو ٹٹولنے لگی۔
لڑکی کی اس بات سے میرا دل بھر آیا۔
"ہاں میری لختِ جگر۔ یہ بہت اچھا ہے اور تمہیں جلد ہی اچھا کر دے گا۔" مارنو کہہ رہا تھا کہ اتنے میں لڑکی پھر بے ہوش ہو گئی۔
"میں کوشش کروں گا مارنو... اس کی عمر کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔
"بارہ سال۔ اتنی کہ..." بوڑھے نے فقرہ اُدھورا چھوڑ دیا مگر میں اس کا مطلب سمجھ گیا۔ خاوا اعظم اپنی دیوانگی کے دوروں میں اتنی ہی عمر کی لڑکیوں پر ستم ڈھاتا تھا۔
"جتنی جلدی ہو سکے، ہمیں اس کا بخار ختم کر دینا چاہیے مارنو، کیا تمہارے پاس کوئی ایسا برتن ہے جس میں برف لائی جا سکے؟"
"برتن تو چھوٹے ہیں لیکن چھکڑے کے نیچے وہ ٹوکریاں لٹک رہی ہیں جن میں لید جمع کی جاتی ہے۔ کیا وہ کام آ سکتی ہیں؟" اس نے پوچھا۔
"ہاں۔ وہ بھی کام دے جائیں گی۔" میں نے کہا۔ "دو پیالے بھی لے لو۔"
ہم چھکڑے سے باہر آ گئے اور طوفانی ہوائیں پیالوں سے برف سمیٹ کر ٹوکریاں بھرنے لگے۔ جب ٹوکریاں بھر گئیں تو ہم انھیں چھکڑے میں لے آئے۔ میں نے مارنو کو مزید برف لانے کے لیے بھیج دیا اور خود تانتی پر پڑا کمبل ہٹا کر بڑھیا کو سمجھانے لگا کہ وہ مریضہ کا لباس بھی اُتار دے۔
بڑھیا نے مریضہ کا ملبوس اُتار دیا تو میں نے اسے کندھوں کی طرف سے برف میں دبانا شروع کر دیا اور بڑھیا نے پاؤں کی جانب سے۔ بوڑھا برف لاتا رہا اور ہم تانتی کے جلتے بھنتے جسم کو برف سے ڈھانپتے رہے یہاں تک کہ وہ پوری طرح برف سے ڈھک گئی۔
مارنو نے بڑھیا کو ایک کونے میں چلے جانے کا اشارہ کیا اور خود میرے قریب بیٹھ گیا۔
میں نے تانتی کی طرف دیکھا۔ وہ شفاف برف میں دبا ہوا ایک خوبصورت مرمریں مجسمہ لگ رہی تھی۔ کچھ دیر وہ بے حس و حرکت پڑی رہی تو میں ڈر گیا کہ کہیں وہ مر نہ گئی ہو... مگر جلد ہی اس نے سانس لینی شروع کی تو سینے کے زیر و بم سے برف ہٹنے لگی۔
"کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ سردی سے ٹھٹھر جائے۔" مارنو نے خدشہ ظاہر کیا۔
"اگر ہم نے زیادہ دیر برف میں دبائے رکھا تو یقیناً ٹھٹھر جائے گی۔ کیا تم انگیٹھی کا بندوبست کر سکتے ہو؟"
مارنو نے بڑھیا کو انگیٹھی لانے کا حکم دیا۔ وہ لکڑی کا ایک چھوٹا سا کھوکھا لے آئی جسے اندر سے، چاروں طرف مٹی سے لیپ دیا گیا تھا۔
"جب تم کہو گے اس میں اُپلے جلا دیں گے۔" مارنو نے دُکھی لہجے میں کہا۔
"کچھ کمبل ہوں تو وہ بھی تیار رکھو۔ برف ہٹانے کے بعد اسے ہوا نہیں لگنی چاہیے۔"
"میرے پاس کافی کمبل ہیں۔" وہ بولا۔ "تانتی ہی میرا سب کچھ ہے، سرفروش! میں صرف اسی کی خاطر زندہ ہوں۔"
"تم نے اسے بڑی خوبی سے چھپا رکھا ہے۔ مارنو۔ ان غلیظ چھکڑوں کی طرف کوئی بھی نہیں آتا ہو گا۔" میں نے بوڑھے کی ذہانت کو سراہتے ہوئے کہا۔
"ہاں۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں شاہ تیمور کی نظر اس پر نہ پڑ جائے۔ کوئی اسے بتا نہ دے۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ وہ کج روی کا شکار ہے۔ اُسے میری تانتی کا حُسنِ معصوم دیوانہ بنا دیتا اور میں اس کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکتا۔"
"میں وعدہ کرتا ہوں مارنو کہ تانتی کا ذکر کبھی کسی سے نہیں کروں گا۔" میں نے اُسے یقین دلایا۔
"مجھے تم پر اعتماد ہے، سرفروش!" میں نے زندگی میں سوائے تمہارے کبھی کسی پر اعتماد نہیں کیا اور میں اسی لیے تمہارے پاس آیا بھی تھا۔ پہلے یہ بڑھیا اور صرف میں ہی جانتا تھا کہ تانتی میری بیٹی ہے۔ اب تمہیں بھی معلوم ہو گیا۔ لید جمع کرنے والوں کو میں نے یہ بتا رکھا ہے کہ تانتی میری بھتیجی ہے۔ میں اسے چیتھڑوں میں اور میلا کچیلا رکھتا ہوں۔ یہ ان لوگوں کے ساتھ اُپلے تھاپتی ہے۔ اپنی شہزادیوں جیسی خوبصورت بیٹی کو شاہ تیمور کی نظرِ بد سے بچائے رکھنے کا صرف یہی ایک طریقہ میری سمجھ میں آ سکا تھا۔"

اتنے میں تانتی کراہنے لگی۔ میں اور مارنو اُس کے قریب آ گئے۔
"مجھے سردی لگ رہی ہے بابا۔" تانتی کراہ کر بولی۔
مارنو نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "گھبراؤ نہیں میری بچی۔ تم بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گی۔" یہ کہہ کر وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔
تانتی پھر غش کھا گئی۔
میں نے بھی اُس کا ماتھا چھو کر دیکھا جو ابھی خاصا گرم تھا۔ میں نے سوچا کہ مزید کچھ دیر اُسے برف میں دبا رہنے دیا جائے تو اس کی حرارت دم توڑ دے گی۔ مارنو تانتی کی حالت دیکھ کر پریشان ہو رہا تھا۔
"اسے آرام کرنے دو مارنو۔ اور یہ بتاؤ کہ تمہاری تانتی کیا اپنی ماں پر گئی ہے؟"
"ہاں۔" وہ بڑبڑایا۔ "میں جانتا تھا کہ تم کسی وقت یہ سوال ضرور کرو گے یا یہ ضرور پوچھو گے کہ میری بیٹی اتنی خوبصورت کیوں ہے؟ بات دراصل یہ ہے سرفروش کہ تیرہ چودہ سال پہلے ہم نے اپنے علاقے میں تاتانیوں کا ایک گروہ پکڑا تھا جس میں کچھ عورتیں بھی شامل تھیں۔ ہم نے مردوں کو تو قتل کر دیا مگر ان کی عورتیں قیدی بنا کر اپنے ساتھ لے آئے۔ خاوا اعظم اس وقت بروس کے نشے میں مدہوش تھا۔ اس نے مذاق ہی مذاق میں ایک عورت مجھے دے دی۔ میں جانتا تھا کہ عورتیں کسی مسخرے بونے کو پسند نہیں کرتیں مگر میں نے دکھاوے کے لیے شاہ تیمور کا بے حد شکریہ ادا کیا اور اس عورت کو اپنے چھکڑے میں لے آیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے پسند نہیں کرے گی۔ مگر وہ مجھے چاہنے لگی۔ اور پھر مجھے بھی اس سے محبت ہو گئی۔ ایک سال بعد تانتی پیدا ہوئی اور میری بیوی کھانسی والے بخار سے مر گئی۔ تانتی اتنی خوبصورت تھی کہ میں نے اسی وقت اُسے چھپا کر رکھنے کا فیصلہ کر لیا اور اسے ان گھٹیا لوگوں میں لے آیا۔"
"کیا یہ پیدائشی نابینا ہے؟" میں نے پوچھا۔
"ہاں مگر یہ بچپن ہی سے اپنی انگلیوں کے ذریعے ہر شے دیکھتی آئی ہے۔ اس نے تمہارا چہرہ ٹٹول کر بتا دیا کہ تم اچھے آدمی ہو اور اس کی پہچان کبھی غلط ثابت نہیں ہوئی۔"
"اگر تم مجھے اچھا آدمی سمجھتے ہو تو پھر مجھے کچھ سوالات کے سچ سچ جواب دو، مارنو۔" میں نے موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا تو مارنو نے میری طرف جھکتے اور ہونٹوں پر اُنگلی رکھتے ہوئے سرگوشی کی۔ "اس وقت کوئی سوال نہ کرو سرفروش۔ اگرچہ بڑھیا قابلِ اعتماد ہے لیکن اگر اس پر تشدد کیا گیا تو یہ ہر وہ بات اُگل دے گی جو اس نے سُنی ہو گی۔ وقت آنے پر میں ہر بات تم پر خود ہی واضح کر دوں گا۔"
"بابا۔ مجھے بہت سردی لگ رہی ہے، بابا۔" تانتی چیخنے لگی۔
میں نے جلدی سے اس کا ماتھا چھوا جو اب ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ "جلدی سے انگیٹھی جلواؤ مارنو۔" یہ کہہ کر میں تانتی کے جسم سے برف ہٹانے لگا۔
مارنو نے بڑھیا کو انگیٹھی جلانے کا حکم دیا اور خود میرا ہاتھ بٹانے لگا۔ برف ہٹاتے ہی ہم نے تانتی پر کئی کمبل ڈال دیئے۔ اتنے میں انگیٹھی بھی جل گئی۔ میں اپلوں کے دُھوئیں سے کھانسنے لگا مگر مارنو، تانتی اور بڑھیا اس کے عادی تھے۔
چند ہی منٹوں میں بند چھکڑا گرم ہونے لگا۔
تانتی ایک بار پھر بے سُدھ ہو گئی۔
وقت آہستہ آہستہ گزر رہا تھا۔ میری تشویش بڑھتی جا رہی تھی اور مارنو بڑی خاموشی سے اپنی بیٹی کا چہرہ تکے جا رہا تھا جس پر سے میں نے کمبل ہٹا دیا تھا۔ مجھے اُپلوں کی اس بھدی سی انگیٹھی کی کارکردگی پر تعجب ہونے لگا جس نے ذرا سی دیر میں چھکڑے کو بہت گرم کر دیا تھا۔
چند لمحوں کے لیے میرا دھیان انگیٹھی کی طرف بٹ گیا۔ مگر جلد ہی وہ خدشہ پھر جاگ اُٹھا کہ کہیں تانتی مر نہ گئی ہو کیونکہ وہ ابھی تک بے حس و بے حرکت پڑی تھی۔ مارنو بُت بنا اُسے گھورے جا رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔
اچانک میں یہ دیکھ کر چونک اُٹھا کہ تانتی کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے ہیں۔ میں نے جلدی سے اُس کا پسینہ پونچھ دیا۔ چند لمحوں بعد قطرے دوبارہ اُبھر آئے۔ میں نے کمبل کے نیچے ہاتھ ڈال کر تانتی کے شانے چھوئے تو پتہ چلا کہ وہ پسینے میں شرابور ہے اور اس کا بخار ٹوٹ گیا ہے۔
میں اُٹھ کھڑا ہوا اور مارنو سے بولا: "تمہاری بیٹی کا بخار ٹوٹ گیا ہے مارنو۔ اسے ہوا نہ لگنے دینا۔ چھکڑا گرم رکھنا اور اسے کچھ گرم بروس بھی پلا دینا۔ مگر زیادہ نہیں۔ اب میں جا رہا ہوں۔" یہ کہہ کر میں دروازے کی طرف بڑھ گیا۔
مارنو میرے پیچھے آتے ہوئے بولا: "میں تمہارا بے حد شکر گزار ہوں سرفروش۔ تم نے مجھ پر زندگی کا سب سے بڑا احسان کیا ہے اور آج سے میں تمہارا غلام بن گیا ہوں۔ تم مجھے جو کہو گے، میں وہی

کروں گا لیکن تم سے صرف ایک استدعا ہے کہ اپنے وعدے پر قائم رہنا اور تانتی کے بارے میں بابر کو بھی نہ بتانا۔ وہ اچھا آدمی ہے مگر تشدد اسے بھی زبان کھولنے پر مجبور کر سکتا ہے۔"

"تم فکر نہ کرو مارنو! میں اپنے وعدے پر قائم رہوں گا۔ مجھے تانتی کی حالت سے آگاہ کرتے رہنا لیکن مجھ سے کھلے عام مت ملنا کیونکہ ہم کبھی لوگوں کے سامنے ایک دوسرے سے نہیں ملے اور نہ ہی پہلے کبھی دوست رہے ہیں۔ اب اگر تم نے مجھ سے برسرِ عام بات کی تو لوگ شک و شبے میں مبتلا ہو جائیں گے۔"

ایک لمحے کے لیے بونے کی آنکھوں میں وہی عیارانہ چمک اُبھری اور وہ بولا: "میں جانتا ہوں، سرفروش! اور محتاط رہوں گا۔ دوسری باتوں کے متعلق اپنے ذہن پر کوئی دباؤ نہ ڈالو اور وقت کا انتظار کرتے رہو۔"

میں باہر آ گیا اور بونے نے جلدی سے چھکڑے کا دروازہ بند کر دیا۔ چھکڑا اندر سے جتنا گرم تھا، باہر اتنی ہی شدید سردی تھی یخ بستہ ہواؤں کے جھکڑ چل رہے تھے اور مجھے پانچ میل ایک ایسے راستے پر سفر کرنا تھا جو برف سے ڈھکا ہوا تھا اور جس کے ایک جانب ہزاروں فٹ گہری کھائی اپنا خوفناک جبڑا کھولے ہوئے تھے۔

میں قدم قدم ڈاکٹر فریدوں کو کوستا رہا اور آگے بڑھتا رہا میرا جی چاہا کہ وہ مجھے اسی وقت واپس بلا لے مگر یہ سب کچھ میری خواہشات کے مطابق تو ہو نہیں رہا تھا۔ اس لیے مجھے صبر کے گھونٹ پینا پڑ رہے تھے۔

☐

اگلے چند روز مجھے تانتی کے بارے میں سوچنے کی مہلت بھی نہ مل سکی۔ ہمیں نئے طوفان نے گھیر لیا تھا اور سردی بہت بڑھ گئی تھی... مگر سفر پھر بھی جاری تھا کچھ لوگ شدید سردی اور کچھ نمونیے کے باعث مر رہے تھے جسے آسوری کھانسی کا بخار کہتے تھے۔ اس پورے ہفتے کے دوران سادیہ نے صرف ایک بار مجھے اپنے چھکڑے میں طلب کیا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ سوچوں، خوابوں اور خیالوں کی گھمر گھیریوں میں پھنسی ہوئی ہو لیکن اس نے خادِ اعظم کے خلاف اپنے منصوبے کے متعلق ایک لفظ بھی ظاہر نہیں کیا۔

جوں جوں ہم آگے بڑھ رہے تھے، خوراک اور ایندھن کے ذخیرے ختم ہوتے جا رہے تھے۔ بالآخر ہم برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گئے... میں نے ایسا عجیب منظر اپنی زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ چہار جانب اور اوپر نیچے برف کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ دھند اور بادلوں سے جھانکنے والا آسمان بھی برف ہی کی چادر جیسا نظر آتا تھا۔ پھر راستہ ڈھلان کی طرف مڑ گیا اور چھکڑے تیز رفتاری سے آگے بڑھنے لگے۔

اب سفر پہلے کی نسبت آسان ہو گیا تھا۔

مارنو مجھے عام طور پر خادِ اعظم کے ذاتی عملے میں دکھائی دیتا تھا۔ اس نے صرف ایک بار میرے قریب سے گزرتے ہوئے غیر محسوس انداز سے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔ اس کا یہ ہلکا سا اشارہ مجھے یہ بتانے کے لیے کافی تھا کہ تانتی بچ گئی ہے۔

تین روز بعد ہم تنگ درے سے نکل کر ایک کھلے مگر ریتلے میدان میں آ گئے اور شاہ تمبور نے پڑاؤ ڈالنے کا حکم دے دیا۔ وہ یہاں رُک کر لشکر کو پھر سے ترتیب دینا اور گھوڑوں کے گلوں کا انتظار کرنا چاہتا تھا چنانچہ چھوٹے چھوٹے سیاہ خیمے چھکڑوں سے اُتار کر میدان میں نصب کر دیے گئے اور زندگی کی وہی گہما گہمی پھر لوٹ آئی جسے اس مسلسل اور پُرخطر سفر نے وقتی طور پر معطل کر دیا تھا۔

سادیہ کئی بار مجھ سے کہہ چکی تھی کہ وہ بہت جلد مجھ پر ایک راز منکشف کرنے والی ہے لیکن ہر بار وہ صرف راز ظاہر کرنے کی خواہش کا اظہار کر کے ہی خاموشی اختیار کر لیتی تھی اس لیے میرا تجسس بڑھتا جا رہا تھا لیکن میں سادیہ کو مجبور نہیں کر سکتا تھا۔ میں ایک عجیب سے تذبذب کی کیفیت میں مبتلا تھا۔ ایک طرف سادیہ تھی اور دوسری جانب رستم اور بونا مارنو... مگر سب کے سب میرے لیے پُراسرار بن گئے تھے۔ کوئی بھی تو مجھ پر نہیں کھل رہا تھا اور مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میں کسی بازی گر کی طرح تنے ہوئے رسّے پر چل رہا ہوں اگر میرا توازن ذرا سا بھی بگڑا تو میں سر کے بل نیچے آ رہوں گا۔

... اور وہ لمحہ میری زندگی کا آخری لمحہ ہو گا۔

تقریباً ایک ہفتے تک لشکر وہاں پڑاؤ ڈالے رہا۔ اس اثنا میں لشکر کے اعداد و شمار جمع کیے گئے تو پتہ چلا کہ سفر کے دوران ایک ہزار سے زائد بچّے، بوڑھے، عورتیں اور چار سو گھوڑے لقمۂ اجل بن چکے ہیں۔

اسی رات جب سادیہ نے پھر وہی الفاظ دُہرائے کہ وہ مجھ پر ایک راز کا انکشاف کرنا چاہتی ہے تو میں نے کسی ردِّعمل کا اظہار نہیں کیا۔ اس پر وہ مسکرا کر بولی "چلو آج بتا ہی دیتی

ں۔ بات یہ ہے کہ میں تمھارے بچّے کی ماں بننے والی ہوں، ں، مگر تم یہ بات اس وقت تک کسی کو نہیں بتاؤ گے جب ہمارا منصوبہ پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ جاتا... اور ہاں یہ ف نصف خوشخبری کے برابر ہے۔ دوسری نصف خوشخبری ناؤں گی۔"

میں نے سادیہ کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے بابر تک کو نہیں بتائی لیکن میرا جی چاہتا تھا کہ کاش سادیہ نے جھوٹ ہیں نیم آسوری بچّے کا باپ بننا پسند نہیں کرتا تھا اور پھر ریدوں نے مجھے کسی بھی وقت بلا لینا تھا۔ تب اس بچّے کا کیا؟ کیا اُسے بھی بے ضابطہ اولاد کی چھاپ لگا کر آسوریوں ب سے نچلے طبقے میں شامل کر دیا جائے گا؟

میں اپنے بچّے کو لید جمع کرنے والوں میں چھوڑ کر جانے بھی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ باتیں میرے لیے ذہنی کشمکش نہیں بلکہ دلی کوفت کا باعث بھی بن گئی تھیں۔

جس روز ہم نے اس میدان میں پڑاؤ ڈالا تھا، اُسی اہ تمبور نے اپنے کچھ سوار شمال، جنوب اور مشرق کی سمت ردیے تھے تاکہ وہ ان کی فراہم کردہ معلومات کے تحت اپنی ن کر سکے۔ شمال اور جنوب کی طرف جانے والے سوار تو ز بعد لوٹ آئے تھے اور انھوں نے خادِ اعظم کو صورتِ ادی تھی مگر مشرق کی طرف جانے والے سوار ابھی تک نہیں آئے تھے۔ چھ روز بعد جب وہ آئے تو خادِ اعظم نے ہ اجلاس منعقد کیا اور دوسری صبح لشکر کو کُوچ کا حکم دیا۔

کئی روز بعد ہم ایک ایسے وسیع و عریض میدان میں جو بڑی بڑی چراگاہوں پر مشتمل تھا۔ یہ چراگاہیں گھوڑوں ے جنت ثابت ہوئیں اور انھیں جی بھر کر چرنے کے لیے دیا گیا۔ جب کہ آسوریوں کی اکثریت سوکھی گھاس کاٹنے مروف ہو گئی۔

روانگی سے پہلے بے انتہا گھاس چھکڑوں پر لادی تھی۔

سفر پھر شروع ہو گیا۔

کئی روز بعد مجھے ہوا میں نمی محسوس ہوئی اور پھر یہ لرنے میں دیر نہ لگی کہ یہ سمندری ہوا ہے۔ ایک روز شاہ کے وہ سوار جو لشکر سے آگے آگے جا کر خبریں لایا کرتے اپنے ساتھ ایک قیدی بھی لے آئے۔ یہ قیدی اگرچہ خدوخال سے تاغانی ہی لگتا تھا مگر اب تک جو تاغانی میں نے دیکھے تھے وہ اُن سے قد و قامت میں بڑا بلکہ میرے ہی برابر تھا۔ وہ گھوڑے پر سوار تھا مگر اس کے ہاتھ پشت پر اور پاؤں رکابوں میں باندھ دیے گئے تھے اور یہ رکابیں گھوڑے کے پیٹ کے نیچے سے ایک دوسرے کے ساتھ جکڑ دی گئی تھیں تاکہ وہ گھوڑے کو ایڑ لگا کر فرار نہ ہو سکے۔

وہ اپنے لباس سے لشکری عہدے دار معلوم ہوتا تھا اور اُس نے قید کے عالم میں بھی کسی فاتح کی طرح اپنا سر بلند کر رکھا تھا۔

اس رات سادیہ نے مجھے بتایا کہ وہ اپنے آپ کو بحری تاغانی بتاتا ہے۔ آسوری سپاہی اُسے ایک سرحدی چوکی سے پکڑ لائے ہیں۔ انھوں نے اس کے ساتھیوں کو قتل کر دیا اور اسے پوچھ گچھ کے لیے خادِ اعظم کے پاس لے آئے مگر وہ بدبخت اتنا ضدی ہے کہ کچھ اُگل کر ہی نہیں دے رہا۔

میں نے جماہی لیتے ہوئے پوچھا "اس کا انجام کیا ہو گا سادیہ؟"

"کیا معلوم؟... اور پھر کسی کو اس کے انجام کی پروا بھی کیا ہے؟" سادیہ نے بے نیازی سے کندھے اچکاتے ہوئے جواب دیا اور پھر ایک دم بپھرتے ہوئے بولی "آئندہ کبھی میرے سامنے جماہی مت لینا سرفروش! اس سے اُکتاہٹ کا اظہار ہوتا ہوتا ہے... اور اگر تمھیں اُکتاہٹ محسوس ہونے لگی ہے تو میں یہ اُکتاہٹ دور کرنے کا کوئی اور طریقہ ڈھونڈ لوں گی۔" یہ کہتے ہوئے وہ مجھے پہلے والی خونخوار سادیہ محسوس ہوئی اور ایسا لگا جیسے اس نے میرے بچّے کی ماں بننے کی خبر سنا کر اور میرے ساتھ نرمی سے پیش آ کر اپنے اس روپ پر فریب کی چادر ڈال لی تھی۔

میں نے دل میں اپنے آپ کو کوستے ہوئے کہا "جاناں میں کبھی تم سے نہیں اُکتا سکتا۔ میرا رُواں رُواں تم سے محبت کرتا ہے۔"

اُس نے بھویں سکوڑ کر یوں میری طرف دیکھا جیسے یہ الفاظ اس کے لیے بے معنی ہوں، جیسے وہ میرے دل کا حال بخوبی جانتی ہو۔ میں نے اُسے غصے سے اُکھڑتے دیکھ کر لجاجت سے تاویل پیش کی "مجھ سے جماہی لینے کی گستاخی لاشعوری طور پر سرزد ہوئی ہے، سادیہ۔ دراصل دن بھر بھاگ دوڑ کے باعث میں بُری طرح تھکا ہوا ہوں اور مجھے نیند آ رہی ہے... لیکن

سچ تو یہ ہے کہ آج کل میں سو بھی نہیں سکتا۔ جب میں سونے کے لیے لیٹتا ہوں تو مجھے اپنے تصور میں اُس بچّے کی معصوم کلکاریاں سُنائی دینے لگتی ہیں جو ابھی تمھارے بطن میں ہے۔ تم نے یہ خوشخبری سُنا کر مجھے پاگل کر دیا ہے، سادیہ کہ میں باپ بننے والا ہوں۔"

... مگر جب میری اس بات پر بھی اس کے چہرے کے تاثرات نہ بدلے تو میں خوفزدہ ہو گیا کہ شاید اس پر میری ناکام اداکاری کا پول کھل گیا ہے ... مگر دوسرے ہی لمحے وہ مُسکرانے لگی۔ وہ خونخوار سہی مگر ایک عورت بھی تھی اور میں نے وہی کچھ کہا تھا جو اس کی ماممتا سننا چاہتی تھی۔ اس نے ایک لفظ بھی نہیں کہا بلکہ شرما کر میرے قریب آ گئی۔ اس وقت تک میری پیشانی عرق آلود ہو گئی تھی۔

دوسری صبح اس بحری تاغانی نے تشدّد سے مجبور ہو کر سب کچھ بتا دیا۔ آسوریوں کا دستور تھا کہ جب وہ دُشمن سے راز اُگلوا لیتے تو اُسے قتل کر دیتے تھے۔ انھوں نے اس بحری تاغانی کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا اور لشکر آگے چل پڑا۔

جلد ہی ہم اس سرحدی چوکی تک پہنچ گئے جہاں سے کل اس بحری تاغانی کو گرفتار کیا گیا تھا۔ اب اس چوکی پر آسوری دستے کا قبضہ تھا۔ انھوں نے بتایا کہ کل کی جھڑپ کے بعد بحری تاغانیوں کی طرف سے کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ اس لیے لشکر نے اپنا سفر جاری رکھا۔ جُوں جُوں ہم آگے بڑھے، ہَوا میں نمی بڑھتی گئی جس سے میں نے اندازہ لگایا کہ سمندر قریب تر آتا جا رہا ہے۔

جس علاقے سے لشکر گزر رہا تھا، وہ کافی سرسبز اور شاداب تھا لیکن صحرا کے یہ جفاکش بیٹے، آسوری ایسے علاقوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔ پرندوں کی چہچہاہٹ ان کی سماعت پر گراں گزرتی تھی اور کسی مقام پر مستقل قیام کا ان کے ہاں کوئی تصور ہی نہیں تھا۔ انھوں نے صحراؤں کے درمیان خیموں میں آنکھیں کھولی تھیں اور خانہ بدوشی ہی کو اصلِ حیات سمجھتے تھے البتہ میں اس علاقے کے چھتنار درختوں اور خودرو پھولوں کو حسرت سے تکتا رہ گیا تھا۔

راہگزر کا چڑھائی والا موڑ مڑتے ہی آسوریوں کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ سامنے سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا اور اس کی لہریں جھاگ اُڑاتی ساحل سے ٹکرا رہی تھیں۔ شاہ تمبور نے جو اس وقت لشکر کی راہ نمائی کر رہا تھا، ٹھاٹھیں مارتے سمندر کو دیکھ کر گھوڑے کی باگیں کھینچ لیں اور ایک ہاتھ بلند کر کے لشکر کو رُکنے کا حکم دے دیا۔

میلوں لمبی چھکڑوں اور گھڑسواروں کی قطار جلد ... چل گئی۔ میں اور سادیہ جو شاہ تمبور کے محافظ دستے کے تھے، اپنے گھوڑے بڑھا کر آگے لے گئے۔ خادِ اعظم گھو... کی پیٹھ پر بیٹھا اپنی واحد اچھی آنکھ سے سمندر اور کھاڑی ... دوسری جانب واقع شہر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جس کے گرد مضبوط شہر پناہ موجود تھی چونکہ ہم لوگ فراز پر تھے اور شہر ... میں تھا، اس لیے اس کی عمارتیں، گلیاں، بازار اور بندرگا... واضح دکھائی دے رہے تھے۔ بندرگاہ میں چھوٹی ... کشتیاں موجود تھیں اور لوگ بڑے اطمینان سے اپنے ... میں مصروف تھے۔ ان کا یہ اطمینان بجا تھا کیونکہ سمندر کی ... سے انھیں حملے کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔

شہر پر حملہ صرف سامنے والے میدان سے کیا جا سک... لیکن ادھر سے بھی ان لوگوں نے زبردست دفاعی انتظا... کر رکھے تھے۔ شہر پناہ کے سامنے ایک چوڑی کھائی ... کے مہدانی کنارے پر نیزوں کی مانند نوکدار چھڑیاں گاڑ... تھیں جن کا رُخ میدان ہی کی طرف تھا۔ آدمی تو ان نوک... سے بچ کر آگے بڑھ سکتے تھے لیکن گھوڑے ان کے در... نقل و حرکت نہیں کر سکتے تھے۔ اس کھائی کے دوسرے ... نوّے درجے کے زاویے پر مضبوط فصیل کھڑی تھی جس ... سے تیر برسائے جا سکتے تھے اور سیڑھی لگانے کی کوشش ... والوں پر کھولتا پانی یا تیل انڈیلا جا سکتا تھا لیکن یہ دفاعی ... تو ہر فصیل سے کی جاتی ہے۔ اس کے باوجود فصیلیں اور شہ... ہوتے رہے ہیں۔

خادِ اعظم کی طرح میں بھی بحری تاغانیوں کے دفاع... کا گہری نگاہوں سے جائزہ لے رہا تھا۔ یہ انتظامات آسو... یلغار نہیں روک سکتے تھے لیکن تاغانیوں کا سب سے مف... وہ خندق تھی جو شہر پناہ کے ساتھ ساتھ بندرگاہ تک چلی گ... اس وقت وہ خشک تھی لیکن میں بندرگاہ میں وہ دروازے ... چکا تھا جن کے کھلتے ہی سمندر کا پانی ایک بلاخیز لہر بن کر ... اور خندق میں موجود ہر شے کو تنکے کی طرح بہا لے جاتا۔ ... دانش مندانہ دفاعی انتظام پر تاغانیوں کو دل ہی دل میں ... ہُوا سادیہ کے ساتھ وہاں سے ہٹ گیا کیونکہ اب شاہ تمبو... حملے کے متعلق ایک دوسرے سے تبادلۂ خیالات میں مصر... گئے تھے۔

کچھ فاصلے پر پہنچ کر سادیہ نے اپنا گھوڑا روک لیا اور ادھر ... دیکھ کر یہ اطمینان کر لیا کر کوئی ہماری گفتگو نہیں سُن سکے گا ... "اب ہمیں اپنے منصوبے پر عمل کرنے کے لیے تیار رہنا ... سرفروش۔ اگرچہ خادِ اعظم پر دیوانگی کے دورے کی علامات ... نہیں ہوئی ہیں لیکن میں جانتی ہوں کہ وہ بہت جلد جنون ... ... میں آ جائے گا۔ دوسرے اس شہر کی تسخیر کے بعد اس ... الکروسے بھی بڑی تقریب منعقد کی جائے گی۔ وہ بھی ہمارے ... شاندار موقع ہوگا۔ بس تم تیار رہو۔"

"مجھے تمھاری ہر ہدایت یاد ہے، جاناں۔ میں جانتا ہوں ... اس موقعے پر کیا کرنا ہے۔" میں نے اُسے اطمینان دلایا۔ ... بات اب تک میری سمجھ میں نہیں آ سکی تھی کہ سادیہ نے خادِ ... اعظم کے قتل جیسے جُرم پر کیسے اُکسایا مجبور کر سکتی ہے۔

سادیہ نے اپنا گھوڑا میرے گھوڑے کے قریب تر لا کر ... میرے ہاتھ پر رکھتے ہوئے سرگوشی کی: "اب وقت آ گیا ... ہیں تمھیں اس خوشخبری کا دوسرا حصّہ بھی سُنا دوں۔ اس ... کے بعد تم قائل ہو جاؤ گے کہ میں کتنی چالاک اور زیرک ... وہ کسی بچّے کی طرح خوش ہوتے ہُوئے بولی: "یہ جنگ ... ہونے سے پہلے میں خادِ اعظم سے کہوں گی کہ وہ تمھیں ... دے۔ اس آزادی کا یہ مطلب ہوگا کہ طلائی طوق تمھارے ... سے اتار دیا جائے۔ وہ مجھ سے اس فرمائش کی وجہ پوچھے ... اُسے کسی حد تک سچّی بات بتا دوں گی۔ میں اُسے کہوں ... مجھے تم سے محبّت ہو گئی ہے اور یہ ایک حقیقت بھی ... یہاں تک تو وہ خاموشی سے سنتا رہے گا لیکن جونہی ... سے یہ بتاؤں گی کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں تو ... کے مارے آپے سے باہر ہو جائے گا مگر بالآخر وہ ... کی اجازت دے ہی دے گا کیونکہ اس سے پہلے ... کی شہزادیاں اپنے غلاموں سے شادیاں کرتی آئی ہیں ... اُسے قائل کرنے کے لیے کافی ہوں گی۔"

اس دوران میں اس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا تھا ... سے زیادہ زیرِ نقاب تھا لیکن اب میں اس کی آنکھوں ... کے تاثرات کا اندازہ لگا لیا کرتا تھا۔

... لمحے کو رُک کر وہ پھر بولی: "لیکن فی الوقت کسی کو ... معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ میں ماں بننے والی ہُوں۔ یہ اس ... ضروری ہے سرفروش کہ جب خادِ اعظم ہمیں شادی کی اجازت ... دے گا اور ہم آسوری رسم و رواج کے مطابق میاں بیوی بن جائیں گے تو ہمارا ہونے والا بیٹا یا بیٹی ہماری جائز اولاد کہلائے گی اور وارثِ تخت و تاج ہو گی۔ پھر جب خادِ اعظم راستے سے ہٹ جائے گا تو تم میرے شوہر کی حیثیت سے میرے ساتھ تخت پر بیٹھا کرو گے اور ہم دونوں مل کر آسوری قوم پر حکمرانی کریں گے۔"

اب تک میں نے سادیہ کو صرف اپنی ذات تک خوشیاں سمیٹنے والی لالچی عورت سمجھا تھا مگر آج اس کی شخصیت کا دوسرا پہلو میرے سامنے آیا تھا۔ یا شاید یہ اس محبت کا کرشمہ تھا جو اس کے پتھر دل سے ایک چشمے کی طرح پھوٹ نکلی تھی۔

خادِ اعظم نے وقت ضائع کیے بغیر بحری تاغانیوں کی طرف اپنا ایلچی روانہ کر دیا اور کہلوا بھیجا کہ اگر وہ غیر مشروط ہتھیار ڈال دیں گے تو انھیں جان کی امان مل جائے گی ورنہ ان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے گی۔

اس دوران رُکا ہُوا قافلہ درّے سے میدان کی طرف چل پڑا تھا۔ جو لوگ میدان میں پہنچ گئے تھے، وہ اپنے خیمے نصب کر چکے تھے اور جو پہنچ رہے تھے خیمے نصب کرتے جا رہے تھے۔ کئی مقامات پر آگ جلا کر دیگیں چڑھا دی گئی تھیں اور کھانے کی تیاریاں کی جا رہی تھیں۔

خیمہ گاہ میں ایک بار پھر قہقہے اور نغمے سُنائی دینے لگے تھے۔ ہر آسوری خوش تھا کہ اُسے بڑے عرصے کے بعد خوں ریزی اور لُوٹ مار کا موقع ملنے والا ہے۔ انھیں اپنی فتح کا پورا پورا یقین تھا کیونکہ دیوتا اُوبی نے خادِ اعظم کو اس کی بشارت دے دی تھی۔ صرف میں اور شاید رستم ہی دو ایسے افراد تھے جنھیں یہ خدشہ تھا کہ کہیں آسوریوں کو لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔

ایلچی ابھی واپس نہیں آیا تھا۔ اور اس کی واپسی کا انتظار کرتے ہُوئے شاہ تمبور نے اپنے شاہی خیمے میں ایک محفل منعقد کر ڈالی تھی جس میں مجھے بھی مدعو کیا گیا تھا لیکن میں سب سے پیچھے بیٹھا ہُوا یہ ہنگامہ بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ خادِ اعظم بہت خوش تھا اور بار بار بروس پی رہا تھا۔ بظاہر مجھے اس میں دیوانگی کے دورے کی علامات دکھائی نہ دیں۔ لیکن میرا خیال تھا کہ سادیہ کا اندازہ ٹھیک ہی ہوگا۔ وہ ایک بار پھر چیخنے چلّانے اور معصوم نوشباب بچّوں پر ستم ڈھانے لگے گا۔ اس وقت وہ بھرپور تفریح کا خواہش مند تھا۔ چنانچہ ناچنے گانے والی لڑکیوں کے علاوہ شعبدے باز بھی بلائے گئے تھے اور رمارنو بھی مختلف

کرتب دکھا رہا تھا۔ خادِ اعظم کے مرغوب تربوز جنھیں دور دراز علاقے سے لایا اور برف میں دبا کر رکھا جاتا تھا، کافی تعداد میں اس کے قریب رکھے ہوئے تھے۔ آج مارنو گھوڑوں کی بجائے تربوز کی زبان میں تمبور سے استدعا کر رہا تھا کہ حضور اپنے دانت میرے نرم نرم گودے میں گاڑ دیجیے۔

اس دوران مارنو نے ایک بار بھی میری طرف نہیں دیکھا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ جب شاہ تمبور کے لیے نوخیز لڑکیاں تلاش کی جائیں گی تو اس کی تانتی الیدجمع کرنے والوں کے درمیان ہمیشہ کی طرح اس بار بھی محفوظ رہے گی۔

خادِ اعظم کو قہقہے لگاتے دیکھ کر سادیہ جو حسبِ معمول اس کے قریب بیٹھی تھی، اپنے بھائی کی طرف جھکی اور اس کے کان میں کچھ کہنے لگی۔ شاہ تمبور نے نگاہ اٹھا کر میری طرف دیکھا اور سادیہ کی بات سننے لگا۔ میں سمجھ گیا کہ سادیہ اسے کیا کہہ رہی ہے۔ اتنے میں خادِ اعظم نے انگلی کے اشارے سے مجھے بلایا تو میرے اعصاب کھنچے سے گئے مگر میں اپنے حواس پر قابو رکھتے ہوئے آگے بڑھا اور اس کے سامنے سرخم کرتے ہوئے بولا: "خادم حاضر ہے عالی جاہ۔"

خادِ اعظم نے اپنی واحد آنکھ سکیڑ کر میری طرف غور سے دیکھا۔ پھر گھٹنے پر ہاتھ مار کر قہقہہ لگاتے ہوئے بولا: "تم اور ہمارے خادم! ہمارا خیال تھا کہ تم ہماری ہم شیر کے خادمِ خاص ہو۔ یہ بتاؤ کہ تم نے اس خدمت کے دوران میں کیا محسوس کیا؟"

آخری فقرے پر اس کی آنکھ سے نفرت جھلکنے لگی اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں کانچ کے کچے فرش پر چل رہا ہوں جو ذرا سے دباؤ سے کرچی کرچی ہو جائے گا۔ میں دوبارہ سرخم کرتے ہوئے بولا: "خادم کا کام صرف خدمت بجالانا ہوتا ہے۔ عالی جاہ۔ اپنے احساسات کا خیال رکھنا نہیں۔"

خادِ اعظم نے ایک بار پھر قہقہہ لگایا تو اس کے خوشامدی بھی قہقہے لگانے لگے... مگر جونہی خادِ اعظم نے اپنا ہاتھ بلند کیا، قہقہے تھم گئے اور سکوت چھا گیا۔

"سنو لوگو۔ ہماری بہن نے ہم سے کیا درخواست کی ہے اور ہم اس کا کیا جواب دینا چاہتے ہیں۔ غور سے سنو۔ ہماری بہن کی خواہش ہے کہ ہم سرفروش کو آزاد کر دیں اور اس کے گلے سے طوق نکلوا دیں۔ تم لوگوں کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟"

اس پر لوگ ایک دوسرے سے کانا پھوسی کرنے لگے مگر کھل کر کسی نے بھی اظہارِ خیال نہ کیا تو خادِ اعظم نے اپنا ہاتھ بلند کیا اور بولا: "ابھی ابھی ہماری ہم شیر نے ایک اور درخواست بھی کی ہے۔ کیا تم وہ بھی جاننا چا..."

"ارشاد۔ ارشاد۔" اس کے درباری چلائے۔

"سادیہ چاہتی ہے کہ جب سرفروش آزاد ہو... تو وہ اسے اپنا شوہر بنا لے لیکن کوئی آسوسی شہزادی غلام سے شادی نہیں کر سکتی۔ کیا خیال ہے، تم لوگ..."

میں نے رستم اور سارنو کا ردِعمل دیکھنے کے لیے... پر نگاہ ڈالی۔ انھوں نے پہلے تو ایک نظر ایک دوسر... طرف اور پھر مجھے دیکھا لیکن میں ان کے چہروں سے ک... سکا۔ خیمے میں موجود افراد کی سرگوشیاں بھنبھناہٹ کی... محسوس ہو رہی تھیں اور ہر آدمی میری یا سادیہ کی... رہا تھا۔ میں نے شاہ تمبور کی جانب دیکھا تو مجھے اس... آنکھ میں دیوانگی کی شیطانی چمک ابھرتی نظر آئی۔ وہ کسی... کی طرح اپنے بھدے دانت نکوستے ہوئے غرایا۔

"ہم تمھارے گلے سے یہ طوق غلامی اتروا دیں... اور اس شادی کی اجازت بھی دے دیں گے... مگر اس... ہم بحری تاغانیوں کا یہ شہر فتح کر لیں گے اور اسے فتح ک... تم ایک اہم کردار ادا کرو گے۔ ہم تمھیں اس جنگ میں حصّ... لیے اپنی فوج کا ایک بڑا عہدہ دینے کو تیار ہیں۔"

میں نے سرخم کرتے ہوئے جواب دیا: "میں آپ... بے پایاں عنایت کا شکر گزار ہوں، جہاں پناہ اور آپ... پر پورا اترنے کے لیے جان کی بازی لگانے سے بھی... کروں گا۔"

خادِ اعظم سادیہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا: "ہماری ہی نہیں، ہماری ہم شیر کی توقعات پر بھی پورا اتر... جانتے ہیں بلکہ ہمیں مسلسل بتایا جاتا رہا ہے کہ تم ایک... ہو۔ ہم نے تمھیں اپنے سُورما پارس کو مغلوب کرتے... ہے اور خاص طور سے آقائے جلالی کی ہلاکت آج... لیے ناقابلِ یقین ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تم واقعی بہادر... اس کا صحیح اندازہ کل میدانِ جنگ میں ہی ہو سکے گا۔"

"آپ نے بڑا دانشمندانہ فیصلہ کیا ہے شہنشا..." خادِ اعظم کی بات پر رستم نے میری طرف دیکھے بغیر کہا: "آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ اسے میرے اور میر... کے دوش بدوش لڑنے کی اجازت دی جائے۔ میں...

کے ارشاد کے مطابق اہم عہدہ دینے کے ساتھ ساتھ ایک ایسا اہم فریضہ بھی سونپوں گا جو اس سے پہلے سرفردش نے کبھی انجام نہیں دیا ہوگا۔"

"ہم تمھاری درخواست قبول کرتے ہیں۔" خادِ اعظم نے رستم کو جواب دیا۔ "ہمارا خیال ہے کہ یہ بدبخت بحری تاغانی جنگ کیے بغیر ہتھیار نہیں ڈالیں گے۔ لیکن اگر انھوں نے ہتھیار ڈال دیے تو ہم سرفردش کو آزمانے کا کوئی اور موقع ڈھونڈ نکالیں گے۔ ہمارا بہنوئی بننے کے لیے اسے ثابت کرنا پڑے گا کہ یہ کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔"

میں سمجھ گیا کہ خادِ اعظم مجھے میدانِ کارزار میں لڑتے ہوئے یا کسی بھی دوسرے طریقے سے موت کے منہ میں دھکیلنا چاہتا ہے۔ سادیہ بھی اس کی چال سمجھ گئی تھی۔ وہ اب تک تعجب اور غصّے پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ پھر وہ شاہ تمبور کی طرف جھکی اور شیریں لہجے میں بولی۔ "آپ ایک بات بھول گئے ہیں، برادرِ عزیز۔"

شاہ تمبور نے بھویں اُچکاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا جو اس کی دیوانگی کے آغاز کی علامت تھی، پھر بولا۔ "ہم کیا بھول گئے ہیں، جلدی بتاؤ؟"

"سرفردش کے بدلے میں ملنے والا تاوان۔ تاغانی اتنے عظیم آدمی سمجھتے ہیں اگر یہ جنگ میں مارا گیا تو آپ تاوان سے محروم رہ جائیں گے۔"

خادِ اعظم نے بھویں اُچکاتے اور گھٹنے پر ہاتھ مارتے ہوئے سادیہ سے کہا۔ "اس کے تاوان والی بات تو سرے سے ہمارے پلے ہی نہیں پڑتی عزیزہ۔ پھر جب ہم یہ شہر فتح کرلیں گے تو فصیل کی دوسری طرف سفر کرتے ہوئے بآسانی توپ والے تاغانیوں تک پہنچ جائیں گے۔ تب ان کی ہر چیز ہماری ہوگی۔ اس لیے ہمیں تاوان کی ضرورت ہی نہیں۔۔۔ اور تیسری بات جو تم ناقص العقل عورت ہونے کی وجہ سے نہیں سمجھ سکیں، یہ ہے کہ تاوان تو غلام کے عوض وصول کیا جاتا ہے، جنگجو اور بہادر بہنوئی کے بدلے نہیں۔"۔۔۔ پھر وہ دربار میں موجود اپنے حواریوں سے مخاطب ہُوا۔ "کیا آسوری رسم و رواج اپنے بہنوئی کو بیچنے کی اجازت دیتے ہیں؟ زور سے جواب دو۔"

"نہیں، عالم پناہ — بالکل نہیں۔" اس کے حواریوں نے بیک زبان نعرہ لگایا۔

اتنے میں خادِ اعظم کا ایک عہدے دار خیمے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پوٹلی تھی جس سے خون رس رہا تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ وہ پوٹلی کسی رومال یا کپڑے کی نہیں تھی بلکہ شاہی خریطہ تھا۔

"بکتے کیوں نہیں کہ ایلچی کیا خبر لایا ہے؟" خادِ اعظم گرج اُٹھا۔

عہدے دار نے سرخم کیا اور وہ پوٹلی خادِ اعظم کے سامنے رکھ کر کھول دی۔ اس پوٹلی میں ایلچی کا بُریدہ سر تھا۔ خادِ اعظم اسے گھورتا رہ گیا۔ اس کی اکلوتی آنکھ کی پتلی تیزی سے گردش کرنے لگی۔ چہرے پر تشنج چھا گیا اور اس کے منہ سے غرّانے کی آوازیں نکلنے لگیں۔ اس نے دونوں ہاتھوں کے پنجے اپنے سینے میں گاڑ لیے اور قالین پر گر کر لوٹنے لگا۔ اس کی باچھیں کف آلود ہوگئیں، پھر وہ قالین کے سرے کی طرف کھسکا اور اُسے اُٹھا کر چبانے لگا۔

خادِ اعظم شاہ تمبور پر دیوانگی کا شدید دورہ پڑ چکا تھا۔ سب خاموش کھڑے دیکھ رہے تھے۔

وہ قالین کا کونا چبانے کے ساتھ ساتھ چیخ بھی رہا تھا۔ مارنو نے جلدی سے آگے بڑھ کر لکڑی کا ایک گول ٹکڑا خادِ اعظم کے منہ میں دے دیا اور وہ قالین کی بجائے اُسے چبانے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ لکڑی کے اس ٹکڑے پر پہلے سے دانتوں کے نشان موجود تھے۔ اتنے میں چار سیاہ فام غلام آئے اور شاہ تمبور کو اُٹھا کر چلے گئے۔

◘

رستم نے اسی وقت سپاہ کو میدان میں صف آرا ہونے کا حکم دے دیا تھا اور وہ رات بھر فصیلِ شہر کے سامنے والے میدان میں جمع ہوتے رہے تھے تاکہ طلوعِ آفتاب کے ساتھ ہی حملے کا آغاز کردیں۔ رستم نے قلب کے دستوں کی کمان سنبھالی تھی اور مجھے اپنے دائیں ہاتھ رکھا تھا۔ رات بھر وہ مصروف رہا تھا اور اس سے بات کرنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ پو پھٹے جب آسوری سپاہ صف آرا ہوگئی تو وہ میرے پاس آیا اور مجھے ہدایات دینے کے بہانے سپاہیوں سے کچھ فاصلے پر لے گیا۔

"یہ شادی کا کیا چکر ہے سرفردش؟ کیا تم نے اور سادیہ نے میرے خلاف کوئی سازش کی ہے؟"

اس وقت ہم اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار کھائی کے قریب سے گزر رہے تھے۔ اگرچہ یہ چاندنی رات نہیں تھی لیکن ستاروں کی روشنی میں بھی میں نے اس کی آنکھوں کی چمک دیکھ لی جو مجھ پر مرتکز تھیں۔ وہ میرے جواب کا منتظر تھا اور میرے تاثرات سے اندازہ لگانا چاہتا تھا کہ میں اسے سچ بتاتا ہوں یا جھوٹ بولتا ہوں۔

میں نے اسے سادیہ کا منصوبہ بتادیا۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ بہت چالاک عورت ہے اور اس نے اچھا منصوبہ بنایا ہے لیکن وہ مارنو کو خادِ اعظم پر قاتلانہ حملے کے لیے کیونکر مجبور کرسکتی ہے۔ مارنو کی کون سی رگ دبتی ہے اس سے؟" وہ اپنی ڈاڑھی کھجاتے ہوئے بڑبڑایا۔

اگرچہ میں مارنو کی ایک کمزوری سے آگاہ ہوچکا تھا مگر میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ سادیہ اس کمزوری سے کیسے فائدہ اُٹھا سکتی ہے۔

"یہ تو میں نہیں جانتا لیکن وہ بڑے یقین کے ساتھ کہتی ہے کہ مارنو اس کے حکم کی تعمیل ضرور کرے گا۔" میں نے کچھ دیر بعد جواب دیا۔

"تم ان باتوں پر دماغ سوزی نہ کرو۔" رستم بولا۔ "میں پہل کردوں گا۔ میرے آدمی اشارے کے منتظر ہیں۔ اب اس کام میں تاخیر بے حد خطرناک ہوگی۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تمھارا منصوبہ وہی ہے جو تم نے مجھے بتایا تھا۔" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ اب اس پر عمل کرنا زیادہ آسان ہوگیا ہے۔ خادِ اعظم پر دورہ پڑ چکا ہے۔ جب تک ہم اس شہر پر قبضہ کریں گے تب تک اس کی حالت اور بھی غیر ہوجائے گی۔ فتح کا جشن مناتے ہوئے وہ اپنے حواسوں میں نہیں ہوگا۔ تم تیار رہنا۔"

"میں تیار ہُوں مگر سادیہ کا کیا ہوگا؟" میں نے دریافت کیا۔

"سادیہ کا کیا ہوگا؟" رستم کسی بھیڑیے کی طرح غرّایا۔ "اُسے بھی موت کا جام پینا پڑے گا، سرفردش! سانپ کو مار کر سپنولیے چھوڑ دینا عقلمندی نہیں ہوتی۔ جب تک وہ زندہ رہے گی، میں حکمران نہیں بن سکتا۔ اس لیے اس کی موت لازمی ہے۔"

"ٹھیک ہے رستم، لیکن اسے قتل کرنے کے لیے مجھے مت کہنا۔ میں اسے قتل نہیں کرسکوں گا۔"

رستم نے قہقہہ لگایا اور بولا۔ "تم بھی عجیب آدمی ہو، سرفردش! خیر چھوڑو اس قصّے کو، یہ بتاؤ کہ تاغانیوں نے سمندر کا پانی روکنے کے لیے جو دروازے بنا رکھے ہیں، کیا لڑائی کے دوران وہ انھیں کھول دیں گے؟"

میں رستم کے مشاہدے اور عسکری قیادت و صلاحیت پر حیران رہ گیا اور بولا۔ "اگر وہ جنگ ہارنے لگیں گے تو یقیناً یہ سمندری روک ہٹا دیں گے۔ میرا خیال ہے کہ شہر فتح کرنا آسان نہیں ہوگا۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں چاہتا ہُوں کہ جب سمندری ریلا آئے تو خادِ اعظم کے زیادہ سے زیادہ آدمی خندق میں موجود ہوں تاکہ ان کی اکثریت غرق ہوجائے۔ تب تک میں اپنے آدمیوں کو آگے بڑھنے سے روکے رکھوں گا۔"

"میں نے خندق کی گہرائی کا اندازہ کرلیا ہے۔ جب وہ روک ہٹائیں گے تو پانی کی کم از کم گہرائی دس ہاتھ ہوگی۔" میں نے رستم کو بتایا۔

"تم خندق کے قریب نہیں گئے پھر تم نے پانی کی گہرائی کا اندازہ کیسے کرلیا ہے؟" رستم نے پوچھا۔

"ایک ایسے علم کے ذریعے جو ہماری سرزمین پر ہمیں سکھایا جاتا ہے۔" میں نے اُسے بتایا۔ "مگر ہم خندق میں پانی بھر جانے کے باوجود فصیل تک پہنچ سکتے ہیں بشرطیکہ پُل بنانے والوں کو تاغانیوں سے محفوظ رکھا جاسکے۔"

"میں جانتا ہُوں کہ پُل کیا ہوتے ہیں۔" رستم بولا۔ "ہم بھی پُل بنایا کرتے تھے مگر وہاں درختوں اور لکڑی کی کمی نہیں ہوتی تھی۔ یہاں ہمارے پاس لکڑی نہیں ہے۔"

میں نے اسے وہ ترکیب بتادی جس کے ذریعے ہم پُل بنا سکتے تھے۔ رستم یہ جان کر خوش ہوگیا اور بولا۔ "میں نے تمھیں اپنا ساتھی منتخب کرنے میں کوئی غلطی نہیں کی۔"

اتنے میں سورج نکل آیا اور قرنا پھونکے جانے لگے۔ وہ آسوری جو رات کو زمین پر ہی لیٹ گئے تھے، آنکھیں ملتے ہُوئے اُٹھ بیٹھے۔ آسوری افسران سپاہ کی صف آرائی میں لگ گئے۔ سپاہیوں نے جلدی جلدی گھوڑے کے ٹھنڈے گوشت سے ناشتہ کیا اور معرکہ آرائی کے لیے تیار ہوگئے۔

ان تاغانیوں کے پاس کوئی توپ نہیں تھی ورنہ داغ چکے ہوتے۔ اب تک وہ بھی شہر پناہ پر صف بستہ ہوچکے تھے۔ ان کے پاس بڑی بڑی کمانیں تھیں جن سے بیک وقت بارہ تیر چلائے جاسکتے تھے اور ان کا چلّہ کئی آدمی کھینچتے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کمانوں سے نیزے نما تیر برسنے لگے اور انھوں نے آسوریوں کی اگلی صف میں تباہی مچادی۔

میں نے ایک تیر دو آسوریوں کے جسموں میں اُترتے دیکھا۔ وہ دونوں ماہیِ بے آب کی طرح تڑپنے لگے۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ان کا اچھا ہتھیار ہے

مگر اس میں ایک خرابی ہے۔ اسے چھوٹی کمانوں کی طرح اوپر نیچے نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ہم تیزی سے آگے بڑھیں تو تیروں کی زد سے محفوظ رہ جائیں گے کیونکہ یہ تیر ہمارے سروں پر سے گزر جائیں گے اور جب خادِ اعظم کے سپاہی آگے بڑھ کر ہماری جگہ لیں گے تو ان کا نشانہ بن جائیں گے۔ اب ذرا غور سے سنو سرفروش، ہم تیزی سے آگے بڑھ کر کھائی کے کنارے گڑی ہوئی نوکدار چھڑیاں اکھیڑیں گے اور ہمارے آدمی آگے بڑھ کر دیوار کے ساتھ سیڑھی لگانے کی کوشش کریں گے۔ اس میں ہمارا جانی نقصان تو ہو گا مگر زیادہ نہیں۔ شاہ تمبور جو پیچھے بیٹھا یہ منظر دیکھ رہا ہے، سمجھے گا کہ ہم بڑی بے جگری سے آگے بڑھ کر فصیل سر کرنا چاہتے ہیں۔"

میں نے پلٹ کر پیچھے دیکھا تو خادِ اعظم واقعی ایک اونچے تخت پر بیٹھا تھا۔ اس نے اپنی اکلوتی آنکھ پر ہاتھ سے چھجا بنا رکھا تھا۔ سادیہ اس کے پہلو میں کھڑی تھی۔ تخت کے اردگرد شاہ تمبور کے محافظ کھڑے تھے اور گھوڑوں کی دُموں والے پھریرے لہرا رہے تھے۔ اتنے میں تمبور نے ہاتھ اُٹھا کر حملے کا اشارہ کیا تو رستم بولا۔ "یہ بہادر جنگجو ہے مگر اُسے میدانِ کارزار میں بہادروں کی سی موت نہیں ملے گی۔"

اتنے میں تیروں کی ایک اور بوچھاڑ آئی لیکن اب رستم کے سپاہی پیچھے ہٹ کر ان کی زد سے محفوظ ہو گئے تھے۔ رستم بولا۔ "جب ہم خندق میں پہنچ کر سیڑھیوں کے لیے چبوترہ یا بنیاد بنا لیں گے تو آرام کرنے کے لیے پیچھے آ جائیں گے۔ تب میں خادِ اعظم کے بہترین دستے وہاں بھیج دوں گا تاکہ وہ کام جاری رکھ سکیں۔ خادِ اعظم کو ذرا سا بھی شک نہیں ہو گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہی وہ وقت ہو گا کہ تاغانی سمندری روک ہٹا لیں گے۔ ورنہ ہمارے آدمی فصیل پر چڑھ جائیں گے۔۔۔ اور اب آخری بات۔ آج عقب سے ہوشیار رہنا۔ ہو سکتا ہے کہ تم پر پیچھے سے کوئی وار کر دے۔" یہ کہہ کر وہ پلٹا اور فوجیوں سے مخاطب ہوتے ہوئے دہاڑا۔ "آگے بڑھو آسوری بہادرو!" اس کے ساتھ ہی اس نے اپنا گھوڑا تیزی سے آگے بڑھا دیا۔ میں بھی اس کے ساتھ تھا۔

ہمارے پیچھے آسوری شہ سوار بھی برق رفتاری سے آگے بڑھے۔ اُن میں سے کچھ تو سنسناتے ہوئے تیروں کا نشانہ بن گئے اور کچھ ان کی زد سے نکل آئے۔ ایسا لگتا تھا کہ آسوری میدانِ جنگ میں مرنے کے لیے پیدا ہوئے ہوں۔ ایک مرتا یا زخمی ہو کر گرتا تو دوسرا فوراً اس کی جگہ لے لیتا تھا۔

رستم نے کھائی کے کنارے پہنچ کر سواروں کو گھوڑوں سے اُترنے اور تیر چلانے کا حکم دیا تو وہ اپنے گھوڑوں کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھ کر جوابی تیر چلانے لگے مگر اُن کے بیشتر تیر خالی جا رہے تھے کیونکہ دیوار دور تھی۔۔۔ پھر رستم نے کچھ دستوں کو نوکدار چھڑیاں اکھیڑنے کا حکم دیا تو وہ چھڑیاں اکھیڑتے ہوئے کھائی پار کر کے خندق تک پہنچ گئے۔ تاغانیوں نے اپنی کمانوں کو کسی حد تک نیچا کر لیا تھا اور مسلسل تیر برسا رہے تھے۔ مگر اب ان کی کمانوں کی کارکردگی زیادہ مؤثر نہیں رہی تھی۔ اتنے میں کچھ آسوری دستے سیڑھیاں، لکڑیوں کے ٹکڑے، تختے اور اوزاروں سے بھری ٹوکریاں اُٹھائے وہاں پہنچ گئے اور خندق میں اُتر کر فصیل کے ساتھ ساتھ سیڑھیاں لگانے اور چبوترے بنانے لگے۔

یہ دیکھ کر تاغانی گھبرا گئے اور ان کی مدافعت میں شدت آ گئی۔ رستم نے دائیں جانب والے دستوں کو آگے بڑھنے کا حکم دیا جو سادیہ کے سپاہیوں پر مشتمل تھا۔ وہ اندھا دھند آگے بڑھے تو بیک وقت بارہ تیر چلانے والی کمانوں نے ان میں سے بیشتر کو خاک و خون میں نہلا کر رکھ دیا۔

تیر میرے اور رستم کے گرد و پیش بھی گر رہے تھے اور ہم کسی وقت بھی ان کا نشانہ بن سکتے تھے۔ ایک تیر نے تو رستم کے گھوڑے کو زخمی بھی کر دیا تھا۔ ہم اِدھر اُدھر گھوڑے دوڑا کر ہدایات دے رہے تھے کہ اتنے میں اچانک میری نگاہ ایک آسوری پر پڑی جو میرے بائیں جانب گھٹنے کے بل بیٹھا چلّے میں تیر چڑھا رہا تھا مگر اس کی نگاہ مجھ پر جمی ہوئی تھی۔ مجھے رستم کی تنبیہ یاد آ گئی۔ میں نے ڈھال پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ اگرچہ اس آسوری نے کمان فصیل کی طرف اُٹھا رکھی تھی مگر چلّہ کھینچنے کے بعد اس نے اچانک رُخ موڑ کر تیر میری طرف چھوڑ دیا۔ جسے میں نے عین وقت پر ڈھال پر روک لیا تو وہ اُٹھ کر بھاگا۔ میں نے اپنا گھوڑا اس کے پیچھے ڈال دیا۔ رستم معاملے کی نوعیت بھانپ گیا تھا۔ جونہی وہ اس کے قریب سے گزرا رستم اس پر تلوار سے وار کرتے ہوئے چلّایا۔ "بزدل بھگوڑے پیچھے کو کہاں بھاگ رہے ہو۔ آگے۔۔۔" تلوار کا ایک ہی وار اس کے لیے کاری ثابت ہوا۔ اور وہ ڈھیر ہو گیا۔ رستم نے مجھ سے کہا۔ "ہوشیار رہنا۔ وہ پھر کوشش کریں گے۔"

میں نے اس آسوری پر نگاہ ڈالی۔ اس کے لباس پر خادِ اعظم کا نشان تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ شاہ تمبور نے مجھے موت کے گھاٹ اُتارنے کے لیے اپنے آدمی لگا دیے تھے۔ میرے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ میں نے خندق کی طرف دیکھا۔ آدمی مر رہے تھے مگر متعدد مقامات پر سیڑھیاں بلند ہوتی جا رہی تھیں اور شاہ تمبور کے تازہ دم دستے کھائی میں اُتر رہے تھے۔ رستم نے اپنے آدمیوں کو پیچھے ہٹنے کا حکم دے دیا۔

"لوستا! اپنے آدمیوں کو پھر سے ترتیب دو۔ تھوڑی دیر بعد انھیں پھر حملہ کرنا ہے۔" رستم چیخ کر بولا۔

مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ اتنی دیر میں آسوری کچھ ایسی سیڑھیاں بھی بنا چکے تھے، جن میں مٹی بھری جا رہی تھی تاکہ ان کے ذریعے گھوڑے اُوپر جا سکیں۔ کچھ آسوری سپاہ تیر اندازی میں مصروف تھی اور کچھ سیڑھیاں بنانے، مٹی کھودنے اور بھرنے میں لگی ہوئی تھی۔ اب کھائی میں ہزاروں آسوری سما چکے تھے۔ اتنے میں رستم نے سمندر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "یہ کیا ہیں؟"

میں نے سمندر کی جانب نگاہ ڈالی تو مجھے بڑے بڑے مینار سے حرکت کرتے دکھائی دیے۔ اور پھر مجھے اس نتیجے پر پہنچنے میں دیر نہ لگی کہ وہ پتھر پھینکنے والی سادہ مشینیں ہیں۔ چند لمحے بعد وہ منجنیقیں پتھر کے گولے برسانے لگیں جو بیک وقت پندرہ بیس آدمیوں کو گوشت کے لوتھڑوں میں بدل دیتے تھے۔

"شکر ہے کہ میں نے اپنے دستے پہلے ہی سے باہر نکال لیے تھے۔ یہ خادِ اعظم کے آدمی مر رہے ہیں۔"

اتنے میں مٹی والی کچھ سیڑھیاں مکمل ہو گئیں اور گھوڑے پہاڑی بکروں کی طرح ان پر چڑھنے لگے۔ میں نے رستم کو بتایا۔ "یہی وہ وقت ہے جب تاغانیوں کو سمندری روک ہٹا دینی چاہیے۔"

اُدھر آسوریوں میں جوش و خروش بڑھ گیا۔ بہت سی جگہوں پر پیادہ سپاہیوں کے چڑھنے کے لیے فصیل کے ساتھ ساتھ سیڑھیاں لگا دی گئی تھیں اور آسوری اپنی تلواریں لہراتے ہوئے اوپر چڑھنے لگے تھے۔ میں نے پلٹ کر شاہ تمبور کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے تخت سے اُتر کر کچھ آگے آ چکا تھا اور کھڑے کھڑے یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ شاید اُسے یقین ہو گیا تھا کہ فتح اس کے قدم چومنے والی ہے۔

تاغانی اُوپر سے سیڑھیاں گرا رہے تھے، کھولتا ہوا پانی اور تیل انڈیل رہے تھے مگر آسوری جان کی پروا کیے بغیر تلواریں لہراتے اور دانتوں میں خنجر دبائے اوپر پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ خندق میں کھڑے ہوئے آسوری اُوپر دفاعی۔۔۔ کارروائی کرنے والے تاغانیوں پر تیر برسا رہے تھے۔ جس کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہو رہا تھا۔ کئی مقامات پر آسوری سپاہی اوپر پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تھے اور دست بدست لڑائی شروع ہو گئی تھی۔

عین اسی وقت ایک گرج دار آواز سنائی دی اور سپاہیوں کا حوصلہ بڑھانے والے رستم نے مجھے بتایا کہ تاغانیوں نے سمندری روک ہٹا دی ہے۔ ہم تیزی سے کھائی کے کنارے سے پیچھے ہٹنے لگے۔ اتنے میں ایک طوفانِ بلاخیز کی طرح سمندری پانی کا زبردست ریلا آیا اور خندق میں موجود ہر ذی نفس اور ہر چیز کو خس و خاشاک کی طرح اپنی لپیٹ میں لے کر آگے بڑھ گیا۔

میں نے پلٹ کر شاہ تمبور کی طرف دیکھا۔ وہ بے بسی سے اپنے سینے پر دوہتڑ مار رہا تھا۔

اُدھر فصیل پر تاغانی خوشی کے مارے ناچ رہے تھے اور نعرہ ہائے مسرت بلند کر رہے تھے۔

"اب تمھاری ترکیب آزمانے کا وقت آ گیا ہے، سرفروش دیکھیں۔ وہ کس حد تک کامیاب رہتی ہے۔" رستم نے میری طرف جھکتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔

میں نے رستم کو جو ترکیب بتائی تھی اُس کا لب لباب یہ تھا کہ جب تاغانی سمندری روک ہٹا کر خندق میں پانی چھوڑیں گے تو خندق اور کھائی کی گہرائی میں برسرِ پیکار آسوری پانی کے زبردست ریلے میں ڈوب جائیں گے اور تاغانی اپنی جگہ مطمئن ہو جائیں گے کہ انھوں نے جنگ جیت لی ہے۔ عین اُسی وقت ہم اپنے چھکڑے کھائی اور خندق میں لے آئیں گے اور یہ تیرتے ہوئے چھکڑے جب ایک دوسرے سے باندھ دیے جائیں گے تو کھائی سے دیوار تک پُل سا بن جائے گا۔ چونکہ خندق اور کھائی میں دس ہاتھ سے زیادہ پانی ہو گا اس لیے فصیل کی اونچائی بھی بہت کم رہ جائے گی اور یوں تاغانی آسوریوں کی یلغار نہیں روک سکیں گے۔

رستم نے میری ترکیب سے اتفاق کرتے ہوئے پچاس خالی چھکڑے منگوا لیے تھے اور ایک ہزار سپاہی بہتا ہوا پُل تعمیر کرنے کے لیے لگا دیے تھے جو اشارے کے منتظر تھے۔ جونہی رستم نے مجھے اپنی ترکیب آزمانے کے لیے کہا، میں نے کماندار کی حیثیت سے چھکڑے کھائی کے پاس لانے کا حکم دے دیا۔

رستم کے لشکری درمیان سے ہٹے تو میری کمان کے تحت کام کرنے والے سپاہی بڑی تیزی سے چھکڑے دھکیلتے ہوئے آگے آ گئے۔ میں نے انھیں دس دس چھکڑوں کی دو قطاریں بنا کر کھائی میں اُتارنے کی ہدایت کی۔ ان چھکڑوں کے پہلوؤں میں لگے ہوئے تختے اُتار کر سامنے لگا دیے گئے تھے تاکہ وہ تیروں کے خلاف ڈھال کا کام دے سکیں۔

کھائی، ڈوبنے والے سپاہیوں اور اُن کے گھوڑوں ہی کی لاشوں سے پٹ گئی تھی جنھیں جلدی جلدی ہٹا کر چھکڑے پانی میں اُتارے جانے لگے تھے۔

بحری تاغانی، جو اَب تک فصیل پر ناچ کود اور نعرے لگا کر فتح کی خوشیاں منا رہے تھے، یہ صورتِ حال دیکھ کر پہلے تو چونکے پھر گھبرا گئے۔ انھوں نے جلدی سے بارہ تیر چھوڑنے والی کمانوں کا رُخ چھکڑوں کی طرف موڑا اور تیر برسانے لگے لیکن چھکڑوں کے سامنے لگے ہوئے تختے اب سپر کا کام دے رہے تھے۔ یہ دیکھ کر تاغانیوں نے منجنیقوں والے دستے کو اشارہ کیا تو بھاری بھاری سنگی گولے ایک بار پھر برسنے لگے اور ان گولوں نے تباہی مچا دی۔

گولے گرنے سے پچاس ہاتھ کی بلندی تک پانی اُچھلتا تھا اور جو چھکڑا ابھی گولے کی زد میں آتا تھا، چکنا چور ہو جاتا تھا۔ اس وقت تک ہم نے جو چند چھکڑے آگے بڑھائے تھے، وہ تنکوں کی طرح ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گئے اور جو لوگ اُن پر سوار تھے، ان میں سے ایک بھی زندہ نہ بچ سکا۔

میری ترکیب ناکام ہونے لگی تو میں غم و غصّے کے مارے پاگل سا ہو گیا۔

اَب مجھ پر جنوں سوار ہو چکا تھا اور میں ہر قیمت پر آسوریوں کو فصیل تک پہنچا دینا چاہتا تھا۔ میں نے اپنا گھوڑا کھائی میں ڈال دیا۔ میں نے دیکھا کہ کھائی کا گدلا پانی رُکا ہوا نہیں بلکہ بہہ رہا ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ تاغانیوں نے خندق اور کھائی میں بھر جانے والے پانی کی نکاسی کا انتظام کیا ہوا تھا اور بہتے پانی میں پیراکی سے ناآشنا سپاہیوں کے لیے پُل بنانا ناممکن تھا۔ اس صورتِ حال سے رستم بھی کافی پریشان دکھائی دینے لگا۔ میں نے دھاڑ کر اپنے نائب کو حکم دیا، جو کھائی کے کنارے کھڑا تھا۔

"جلدی سے ڈنڈے منگواؤ۔"

"کون سے ڈنڈے؟" اس نے پوچھا۔ لہجے میں حیرت تھی۔

"وہی، جو گھوڑے جوتنے کے لیے چھکڑوں کے آگے لگے ہوئے تھے۔" میں نے جواب دیا اور تیزی سے پلٹ گیا۔

میں نے یہ ڈنڈے فالتو سمجھ کر اُتروا دیے تھے۔ اب سولہ ہاتھ لمبے اور تین اُنگل چوڑے ان ڈنڈوں کو استعمال کرنے کی ترکیب مجھے سُوجھ گئی تھی۔ اتنے میں رستم بھی میرے قریب آ گیا۔

"تمھاری ترکیب تو ناکام ہو گئی، سرفروش۔" اس نے پریشانی سے کہا۔

"میری پہلی ترکیب ناکام ہو گئی ہے مگر دوسری ترکیب ضرور کامیاب ہو گی۔"

"وہ کیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"میں چھکڑوں کو کشتیوں کی طرح استعمال کروں گا۔" میں نے اُسے بتایا۔

"ہاں... بکھری ہوئی کشتیوں پر تاغانیوں کے تیر برسانا بھی مشکل ہو گا اور وہ گولوں کی زد سے بھی بچ سکتی ہیں۔" رستم نے میری نئی ترکیب کو سراہتے ہوئے کہا۔

"سارے چھکڑے اِدھر لے آؤ۔" میں نے اپنے دوسرے نائب کو حکم دیا اور وہ اُس کی تعمیل کے لیے پلٹ گیا۔

اس وقت تک خاوِ اعظم کے بیشتر سپاہی مر چکے تھے جب کہ رستم کے دستے ابھی تازہ دم تھے۔

"شاہ تمبور کے آدمیوں کو خاصی سزا مل چکی ہے۔ وہ آدھے سے زیادہ غرق ہو گئے ہیں۔ جو بچ گئے ہیں، وہ دل شکستہ ہیں اور یہ بات ہمارے حق میں بہتر ہے۔ جب تمھیں میرے آدمیوں کی ضرورت

ہو تو مجھے اشارہ کر دینا۔ دیوار میرے دستوں کو سر کرنی چاہیے اور تمھاری کشتیوں پر بھی میرے ہی آدمی جائیں گے۔" یہ کہہ کر وہ کھائی کے کنارے کی طرف پلٹ گیا۔

اگرچہ تاغانیوں کی طرف سے گولہ باری اور تیر اندازی جاری تھی مگر مجھے یُوں محسوس ہُوا جیسے اُن کے پاس تیر ختم ہو گئے ہیں یا وہ اُن کی قلت کا شکار ہو گئے ہیں کیوں کہ اب اُن کی تیر اندازی کی رفتار سست پڑ گئی تھی۔ دوسرے میں نے یہ بھی پرکھ لیا تھا کہ منجنیقوں کے گولے ہمیشہ اُن کے نیچے تُلے نشانے پر ہی گرتے ہیں۔ اس لیے مَیں نے اُن مقامات کا انتخاب کر لیا تھا جہاں جہاں سے مجھے چھکڑوں کی کشتیاں فصیل کی طرف بڑھانا تھیں۔

چھکڑوں کو کھائی کے کنارے سے دھکیل کر لانے والے آسوری سپاہی نہیں تھے بلکہ نہتّے لید جمع کرنے والوں کو قربانی کے بکرے بنا کر آگے بھیج دیا گیا تھا۔ مجھے ایک لمحے کے لیے مارتو کی بیٹی تاتی کا خیال آیا مگر یہ وقت ان باتوں کا نہیں تھا۔ میں نے لید جمع کرنے والوں کو حکم دیا کہ وہ ان چھکڑوں کے پہیے اُتار دیں اور انھیں اُٹھا کر کھائی میں اُتر جائیں۔

اتنے میں رستم بھی اپنے دستے کھائی کے کنارے لے آیا۔

"میرے آدمی ملّاح یا کشتی بان نہیں ہیں تمھیں ان کی رہبری کرتے ہُوئے بتانا پڑے گا کہ کشتی کیسے چلائی جاتی ہے۔" اس نے کہا۔

مَیں نے ہر چھکڑے کے لیے دس آدمیوں کو مقرر کر دیا اور سب سے پہلے چھکڑے کے قریب آ کر سپاہیوں کو مخاطب کرتے ہُوئے کہا۔ . .

"بہادر آسوریو! جیسا میں کروں تمھیں بھی ویسا ہی کرنا ہو گا۔ یا تو ہم فصیل سر کر لیں گے یا مر جائیں گے۔ ہمیں واپسی کی مہلت نہیں ملے گی۔"

مَیں نے چھکڑوں کی چھتیں اُتروا کر سامنے لگوا دیں تاکہ کچھ آڑ میسر آ جائے۔ ہر چھکڑے پر چار چار آدمیوں کو وہ سولہ ہاتھ لمبے ڈنڈے تھما دیے اور انھیں بتایا کہ ڈنڈوں سے چپو کا کام کیسے لیا جا سکتا ہے۔

یہ سب کچھ ہو گیا تو مَیں نے ایک ڈنڈے کے ساتھ گھوڑے کی دُم باندھی۔ اُسے لہرا کر رستم کو اشارہ کیا اور اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ وہ ڈنڈوں سے کشتی کو پانی میں دھکیل کر آگے بڑھنا شروع کر دیں۔

بحری تاغانی، جو فصیل پر کھڑے اب تک یہ تماشا دیکھ رہے تھے، میری چھکڑا کشتی کو فصیل کی طرف بڑھتے دیکھ کر میرا منصوبہ سمجھ گئے اور تیزی سے اس طرف بڑھے جہاں میری چھکڑا کشتی فصیل سے لگنے والی تھی۔ میرے پیچھے دوسری چھکڑا کشتیاں بھی چل پڑی تھیں۔ اس وقت تاغانیوں سے بہت بڑی حماقت یا غلطی یہ ہُوئی کہ وہ فصیل کے کنارے جمع ہو گئے تاکہ ہمیں مار بھگائیں مگر اس طرح جمگھٹوں کی شکل میں اُن کے لیے ہتھیار استعمال کرنا مشکل ہی نہیں، ناممکن بھی ہو گیا دوسرے ان کے پاس چھوٹی کمانیں اور نیزے بھی نہیں تھے۔ چنانچہ فصیل کے قریب پہنچتے ہی مَیں نے اپنے آدمیوں کو تیر چلانے کا حُکم دیا۔

پہلے ہی ہلّے میں بیسیوں بحری تاغانی ہلاک ہو گئے۔

یہ دیکھ کر ان کے ساتھیوں میں افرا تفری مچ گئی۔ وہ تیروں کی باڑھ سے بچنے کے لیے فصیل کے کنارے سے پیچھے ہٹے تو چھکڑا کشتیوں پر سوار رستم کے بہادروں نے پہلے ایک دوسرے کے کندھوں پر اور پھر فصیل پر چڑھنا شروع کر دیا۔

سب سے پہلے مَیں سات جوانوں کے ساتھ فصیل پر چڑھا تو پیچھے ہٹ جانے والے بحری تاغانی پلٹ کر ہم پر ٹوٹ پڑے لیکن میرے آدمیوں نے نیم دائرے کی صورت میں گھٹنوں کے بل بیٹھ کر ان پر تیر برسانے شروع کر دیے۔

تاغانی جانتے تھے کہ اگر وہ یلغار نہ روک پائے تو ان کا بچہ بچہ تہِ تیغ کر دیا جائے گا۔ انھوں نے بھی سر دھڑ کی بازی لگا دی۔ . . اور نوبت دست بدست لڑائی تک آ پہنچی۔ انھوں نے میرے گروہ کو گھیر لیا۔

میرے ساتھی ایک ایک کر کے کٹنے لگے یا بُری طرح زخمی ہو گئے۔ تین تاغانیوں نے بیک وقت مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں نے ایک کو تلوار کی ضرب لگائی، دوسرے کو خنجر گھونپا مگر تیسرے نے میرے سر پر کلہاڑا دے مارا۔

ہر چند کہ میرے سر پر خود تھی لیکن اس ضرب سے مَیں چکرا کر رہ گیا۔ لڑکھڑا کر گرتے ہُوئے، مَیں نے خنجر اس کے پہلو میں اُتار دیا۔ اتنے میں کچھ اور تاغانی سپاہی میری طرف لپکے۔ اب مجھ میں اُن کا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں رہی تھی۔

اچانک مجھے رستم کی دھاڑ سُنائی دی۔ میں نے بند ہوتی آنکھوں سے دیکھا کہ وہ حملہ آوروں پر ٹوٹ پڑا ہے۔ مَیں نے اپنا سر جھٹک کر حواس قائم رکھنے کی کوشش کی اور جب چند لمحوں بعد مَیں دوبارہ آنکھیں کھولنے پر قادر ہُوا تو رستم اُن کا صفایا کر چکا تھا لیکن اس کی پیشانی پر لگے زخم سے بھی خون رِس رہا تھا۔

"تمھاری یہ ترکیب کامیاب رہی ہے، سرفروش! اُدھر دیکھو۔" اس نے ہنس کر کہا۔

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ . .

فصیل پر جگہ جگہ آسوری سپاہی چڑھ رہے تھے اور نعرے لگاتے ہُوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ رستم نے مجھے بتایا کہ وہ مزید دو سو چھکڑوں کو کشتیوں میں بدلنے کا حُکم دے آیا تھا۔ میں نے فصیل کے کنارے سے میدان کی جانب دیکھا۔

بیسیوں چھکڑے کھائی میں اُتر رہے تھے اور بیسیوں میدان سے کھائی کی طرف لائے جا رہے تھے۔

تیروں پر گھوڑوں کی لہراتی دُمیں اور انسانی کھوپڑیاں بتا رہی تھیں کہ ہم نے جنگ جیت لی ہے۔ اچانک میری نگاہ شاہ تمبور کے خیمے کی طرف اُٹھ گئی۔ وہ تخت پر کھڑا اپنی اکلوتی آنکھ پر ہاتھ کا چھجا بنائے فصیل کی طرف دیکھ رہا تھا اور سادیہ اس کے قریب کھڑی ہاتھ ہلا رہی تھی۔ شاید اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔ مَیں نے رستم کی طرف پلٹتے ہُوئے کہا۔

"کچھ لوگ اُن بحری دروازوں کی طرف بھیجو تاکہ وہ انھیں بند کر کے پانی کا بہاؤ روک دیں۔ تھوڑی دیر میں خندق اور کھائی کا پانی نکل جائے گا کیوں کہ ان لوگوں نے نکاسیِ آب کا بھی انتظام کیا ہوا ہے۔ مَیں نہیں چاہتا کہ یہاں تشریف لاتے ہُوئے خادِ اعظم کے پاؤں گیلے ہو جائیں۔"

رستم مُسکرایا اور بولا۔ "بہت اچھی بات کی ہے تم نے شہنشاہِ اعظم کے پاؤں گیلے نہیں ہوں گے۔" پھر اس نے اپنے کچھ سپاہی پانی روکنے کے لیے بھیج دیے۔

اس وقت تک فصیل بحری تاغانیوں سے خالی ہو چکی تھی اور آسوری جوق در جوق شہر میں داخل ہو رہے تھے۔ مَیں اور رستم فاتح سالاروں کی طرح ایک جگہ فصیل کی سیڑھیوں سے اُتر کر شہر کے چوک میں پہنچے۔ یہاں کچھ دیر تاغانیوں اور آسوریوں کے درمیان شدید جھڑپ ہُوئی تھی۔ اس لیے وہاں بہت سی لاشیں پڑی تھیں۔ دس بارہ مکانوں سے دُھواں اُٹھ رہا تھا اور جگہ جگہ سے عورتوں اور بچوں کی آہ و بکا سُنائی دے رہی تھی۔

مَیں اور رستم ایک چبوترے پر بیٹھ گئے۔

میرے سر سے جنگ کا جنوں اُتر چکا تھا۔

عورتوں اور بچّوں کی چیخ و پکار نے میرا دل گداز کر دیا۔ نہ جانے کتنی ماؤں سے ان کے بیٹے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئے تھے اور کتنے بچّوں کے سروں سے سایۂ پدری اُٹھ گیا تھا۔ کتنی بہنیں اپنے بھائیوں کا ماتم کر رہی تھیں اور کتنی سہاگنوں کی مانگ اُجڑ گئی تھی۔

اس خیال نے اچانک مجھے سادیہ کی یاد دِلا دی۔

سادیہ جو میرے بچّے کی ماں بننے والی تھی اور جسے رستم موت کی میٹھی نیند سُلا دینا چاہتا تھا۔ مَیں نے سوچا کہ رستم سے کہہ دوں کہ وہ سادیہ کے بارے میں اپنا فیصلہ بدل دے۔ وہ جیسی بھی ہے، میرے بچّے کی ماں بننے والی ہے۔ اگر اُسے موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا تو وہ معصوم رُوح جو اس کے بطن میں پرورش پا رہی ہے، ناکردہ گناہوں کی سزا میں، عالمِ وجود میں آنے سے پہلے ہی موت کے اندھے کنویں میں دھکیل دی جائے گی۔

ابھی میں بات چھیڑنے کے لیے دل ہی دل میں تمہید ہی باندھ رہا تھا کہ رستم نے اپنے سر سے خود اُتارتے ہُوئے کہا۔ "یہ تاغانی تو بڑے زبردست جنگجو نکلے۔ میں نہیں سمجھتا تھا کہ یہ اتنے دلیر بھی ہو سکتے ہیں۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی 'زن' سے ایک تیر ہمارے درمیان سے گزر گیا۔ ہم نے جلدی سے پلٹ کر دیکھا۔ خادِ اعظم کا ایک سپاہی ایک ستون کی آڑ لے رہا تھا۔ ہم جلدی سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اتنے میں سپاہی نے پھر چلّہ کھینچا مگر اس کے تیر چلانے سے پہلے ہی ہم ایک طرف ہٹ گئے۔

"اس بن مانس کی اولاد کو جانے نہ دینا۔" رستم چیخ پڑا اور تیزی سے اس کی طرف دوڑا۔

مَیں نے بھی رستم کی تقلید کی۔

شاہ تمبور نے مجھے موت کے گھاٹ اُتارنے کے لیے یقیناً کوئی بڑا انعام رکھا ہو گا جبھی تو وہ آسوری سپاہی شہر میں لُوٹ مار کرنے کی بجائے مجھے اپنا نشانہ بنانے پر تُلا ہُوا تھا۔ رستم گالیاں بکتا ہُوا اس کا تعاقب کر رہا تھا اور میں رستم کے پیچھے تھا۔

سپاہی ایک تنگ سی گلی میں گُھس گیا۔

رستم نے تعاقب جاری رکھا مگر چند ہی لمحے بعد رستم پلٹا اور بولا۔ "دیوار سے لگ جاؤ سرفروش! تاغانی گھڑ سوار آ رہے ہیں۔"

وہ دس سواروں کی ایک ٹولی تھی۔ اُن میں سے کچھ زخمی بھی تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ آسوریوں سے جان بچانے کے لیے بھاگتے پھر رہے ہیں مگر انھیں کہیں بھی جائے امان دِکھائی نہیں دیتی۔ اس لیے وہ مرنے سے پہلے دوسروں کو مارنے کے درپے ہیں۔

وہ مغلظات بکتے ہوئے میری اور رستم کی طرف بڑھے۔

ہم نے اپنی اپنی پیٹھ دیواروں سے لگا رکھی تھی۔ جیسے ہی وہ ہم پر حملہ آور ہُوئے، ہم نے جُھکائی دے کر ان کے گھوڑوں کو زخمی کر دیا۔ گھوڑے بدکے اور ہم موقع ملتے ہی ایک دروازے میں گُھس گئے۔ گھڑ سواروں نے پلٹ کر پھر حملہ کیا لیکن اب ہم اپنی ڈھالیں استعمال

کر سکتے تھے۔ ہم نے ان کے وار روک کر دو سپاہیوں کو تہ تیغ کر دیا۔۔ مگر تیسرے سوار کے نیزے کی اَنی مجھے زخمی کر گئی۔

مجھ پر ایک بار پھر جنوں طاری ہو گیا۔

میں دروازے سے نکل آیا اور اندھا دھند لڑنے لگا۔ اتنے میں کچھ آسوری سوار بھی وہاں پہنچ گئے اور تاغانی سواروں پر ٹوٹ پڑے۔

چند لمحوں بعد ان میں سے ایک بھی زندہ نہ رہا۔

میں لپک کر اس دروازے میں آیا جہاں رستم کھڑا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ اپنا دایاں بازو تھامے زمین کی طرف دیکھ رہا ہے۔ میں نے اس کی نگاہوں کا تعاقب کیا تو یہ دیکھ کر میرا دل دھک سے رہ گیا کہ اس کے ہاتھ سے خون کی موٹی دھار بہہ رہی ہے اور اس کا رنگ زرد پڑ گیا ہے۔

"کیا ہوا رستم؟" میں چیخ پڑا۔

وہ مجروح تبسم کے ساتھ بولا "میری قسمت خراب ہے۔۔۔ سرفروش! اس منحوس کی طرح۔" یہ کہتے ہوئے اس نے قریب پڑے ایک تاغانی کی طرف اشارہ کیا جو دم توڑ چکا تھا "اس بدبخت نے میرا ابھی کام تمام کر دیا۔"

میں نے جلدی سے اس کے بازو کا جائزہ لیا اور فوراً اپنی پیٹی اُتار کر اس کے بازو پر آنے والے زخم سے کچھ اوپر کس کر باندھ دی، جس سے اس کے خون کا بہاؤ رُک گیا۔

"اس وقت میری حالت کسی زچہ جیسی ہے سرفروش! مجھے سہارا دے کر یہیں بٹھا دو۔"

میں نے اُسے سہارا دے کر بٹھا دیا اور آسوری گھڑ سواروں کے سرخیل سے کہا "جلدی سے ایک انگیٹھی اور لوہے کا ٹکڑا لے آؤ۔ اگر زخم فوراً نہ داغا گیا تو خون بند نہیں ہوگا اور اس کا زہر پورے جسم میں پھیل جائے گا۔"

وہ فوراً وہاں سے چل دیا۔

رُستم کی پیشانی عرق آلود ہو گئی تھی۔ اس نے عجیب نگاہ سے میری طرف دیکھا اور نقاہت سے بولا "میں نے آج تک کسی کو یہ نہیں بتایا کہ مجھے آگ سے ڈر لگتا ہے۔ میں کسی انسان یا شیطان سے نہیں ڈرتا مگر داغے جانے سے میری روح کانپتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں یہ تکلیف برداشت نہیں کر سکوں گا۔"

میں نے نرمی سے اُس کا شانہ تھپکتے ہوئے کہا "نہیں رستم تم اس سے کئی گنا تکلیف برداشت کر سکتے ہو۔ میں نے تمھارے جیسے جگرے والا آدمی نہیں دیکھا۔ اگرچہ تم ایک ہاتھ سے محروم ہو گئے ہو لیکن اس کے باوجود تمھیں بہت کچھ کرنا ہے۔۔۔ یا تکلیف کی وجہ سے تم سب کچھ بھول گئے ہو؟"

"نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ "میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ وہ کام آج رات ہوگا لیکن اب میری بجائے اُسے تم انجام دو گے۔ جب بونا شاہ تیمور کو زہر دے دے تو تمھیں فوری طور پر سادیہ کو قتل کرنا ہوگا۔ میں بھی وہاں موجود رہوں گا لیکن اس حالت میں تو میں ایک عورت کو بھی تہ تیغ نہیں کر سکتا۔ یہ کام تمھیں ہی کرنا ہوگا۔"

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے میرے دل پر گہرا گھاؤ ڈال دیا ہو۔ مجھے اپنے ہاتھوں سے سادیہ کو قتل کرنا ہوگا۔۔۔ اسی سادیہ کو جو میرے بچے کی ماں بننے والی تھی۔

★★

بحری تاغانیوں کا یہ شہر صرف چار گھنٹے کے اندر اندر تباہ و برباد کر دیا گیا۔ ہر گھر سے دُھواں اور شعلے اُٹھ رہے تھے یوں لگتا تھا جیسے ہر گلی اور ہر کوچے سے موت اپنے بال کھولے بین کرتے گزر گئی ہو۔ تاغانی بچوں، بوڑھوں، جوانوں اور عورتوں کی لاشیں ڈھو کر اس سبزہ زار میں پہنچا دی گئی تھیں جس کے ایک کنارے آسوریوں کی خیمہ گاہ تھی۔ زندہ بچنے والوں کو بھی اسی جگہ لا کر قتل کیا گیا تھا تاکہ اُن کے بریدہ سروں سے مینار بنایا جا سکے جو وہاں سے گزرنے والوں کو فاتح اعظم شاہ تیمور کی یاد دلاتا رہے۔

اس شہر کی صرف ایک ہستی کو اُس وقت قتل نہیں کیا گیا تھا۔۔۔ اور یہ شخص تھا، شہر کا ناظم اوسندی۔۔۔ اُسے مین اُس وقت گرفتار کیا گیا تھا جب وہ خودکشی کرنے والا تھا۔ اُسے پابہ زنجیر خاد اعظم کے سامنے لایا گیا اور اس وقت تک اُس پر تشدد کیا جاتا رہا جب تک کہ اس نے شاہ تیمور کو مطلوبہ معلومات فراہم نہ کر دیں۔ اُس کی پُرکرب ناک چیخ پر شاہ تیمور قہقہہ لگاتا تھا بالآخر اُسے بھی قتل کر دیا گیا۔

یہ ساری باتیں مجھے سہ پہر کو بابر کی زبانی معلوم ہوئیں وہ میرے اُس زخم کا معائنہ کر رہا تھا جو مجھے تاغانی گھڑ سوار کے نیزے سے آیا تھا۔ اُس وقت میں رُستم کی تکلیف دیکھ کر اپنا یہ زخم بھول گیا تھا۔ نیزے کی اَنی مجھے ایک پسلی میں چبھی تھی۔ بابر نے زخم صاف کیا اور بتایا کہ اُس کے خیال میں زخم داغنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

میں نے یہ سُن کر دل میں خدا کا شکر ادا کیا کیونکہ میں رُستم کی حالت دیکھ چکا تھا لیکن میں اُس کے ضبط اور حوصلے کی

داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جب اُس کا بازو کاٹ کر اُسے سُرخ لوہے سے داغا گیا تو اس کے ہونٹوں سے ایک سسکاری تک نہیں نکلی تھی۔

میں وہاں سے اپنے چھکڑے میں چلا آیا تھا تاکہ آرام کر سکوں۔ یہیں بابر نے میری مرہم پٹی کرتے ہوئے یہ ساری باتیں بتائی تھیں۔

"خادِ اعظم تیمور سروں کا مینار تعمیر کروا رہا ہے اُس کے لیے زمرد کی ایک لوح کندہ کروائی جا رہی ہے۔ جس پر یہ تحریر ہوگی۔

"اے پڑھنے والو! یہ لوح اس امر کی گواہ ہے کہ حاکمِ دوراں، خادِ اعظم تیمور جس کے نام سے دُنیا لرزاُٹھتی ہے۔ اس راہ سے گزرا تھا اور یہ کاسۂ ہائے سر اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ اُنھوں نے حاکمِ دوران خادِ اعظم تیمور کے حکم سے رُوگردانی کی تھی۔"

بابر نے یہ بھی بتایا کہ شاہ تیمور آج بہت زیادہ بردس پی رہا ہے اور دیوانگی کے بھرپور دَورے میں مبتلا ہے۔ اتنے میں چھکڑے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے خود ہی اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ آنے والا سادیہ کا گونگا بہرہ سیاہ فام غلام تھا۔ وہ میرے لیے اس کا بے حد اہم پیغام لایا تھا۔ یہ پیغام لکڑی کی ایک چھوٹی سی تختی پر لکھا گیا تھا۔

"آج رات تک میرے پاس مت آنا۔ وہ انتہائی غصّے میں ہے کیونکہ تم ابھی تک زندہ و سلامت ہو۔ آج رات تمھیں وہی کرنا ہے جو کہا گیا ہے۔ پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

میں نے بابر کو اس کے چھکڑے میں بھیج دیا اور خود سوچ کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے لگا۔ میں ایک عجیب ذہنی کشمکش میں مبتلا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ مجھے کس پر اعتماد کرنا چاہیے اور کس پر نہیں؟

سادیہ چاہتی تھی کہ جونہی مارنو خادِ اعظم کا کام تمام کرے میں اُسے ہلاک کر دوں اور رُستم کی خواہش تھی بلکہ یہ حکم تھا کہ میں سادیہ کو قتل کر دوں لیکن میں اپنے ہونیوالے بچے کی ماں کا قاتل نہیں بن سکتا تھا۔ مجھ میں یہ سوچنے کا بھی حوصلہ نہیں تھا۔

میں پاگل سوچوں اور وسوسوں میں گھرا ہوا تھا کہ اتنے میں مجھے رُستم کا پیغام ملا کہ جب اندھیرا ہو جائے تو میں اُس کے پاس پہنچ جاؤں۔

میں نے ہر سوچ کو وقتی طور پر ذہن سے جھٹک دیا اور غروبِ آفتاب کا انتظار کرنے لگا۔

شام ہوتے ہوتے خیمہ گاہ میں ہر طرف ہنگامۂ طرب کی گونج سُنائی دینے لگی۔ آج بردس پانی کی طرح بہائی جا رہی تھی فاتح آسوری قہقہے لگا رہے تھے۔ آپس میں لڑ جھگڑ رہے تھے، شور مچا رہے تھے اور گا بجا رہے تھے۔ آج بچوں اور عورتوں کو اُن سے دُور رکھا گیا تھا کیونکہ نشے میں ڈوبے شہسوار اندھا دُھند گھوڑے دوڑا رہے تھے۔ ان علامات سے پتہ چلتا ہے کہ آج رات اپنے دامن میں جشنِ طرب کے بہت سے ہنگامے لانے والی ہے۔

غروبِ آفتاب کے بعد میں چھپتا چھپاتا اور الاؤ کی روشنیوں سے بچتا بچاتا رُستم کے خیمے تک پہنچ گیا۔ اگرچہ میرے گلے میں اب بھی طلائی طوق جگمگا رہا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ آج کے معرکے کے بعد آسوریوں کے دلوں میں میرے لیے احترام بڑھ گیا ہوگا اور وہ ایک بار پھر میری بہادری اور بے جگری کے معترف ہو چکے ہوں گے لیکن ان ساری باتوں کے باوجود خادِ اعظم میری جان کے درپے تھا۔

جونہی میں رُستم کے خیمے کے دروازے پر پہنچا محافظوں کے سرخیل نے آگے بڑھ کر مجھے سلام کیا اور بولا "کمان دار آپ کے منتظر ہیں سردار سرفروش۔"

میں نے محسوس کیا کہ یہ سب لوگ پوری طرح مسلح ہیں اور انھوں نے بردس بھی نہیں پی رکھی ہے۔ مجھے "سردار سرفروش" کے الفاظ سُن کر تسکین اور خوشی محسوس ہوئی کہ اب آسوری پھر مجھے محترم سمجھنے لگے ہیں۔

میں خیمے میں داخل ہوا تو دیکھا کہ مارنو بھی رُستم کے پاس بیٹھا ہے۔ رُستم ایک تخت پر نیم دراز تھا۔ اُس نے مسکراتے ہوئے میری طرف نگاہ دوڑائی لیکن مُنہ سے کچھ نہ بولا۔ البتہ اپنا بایاں ہاتھ اُٹھا کر میرا استقبال کرنا نہ بھولا۔ اس کے دائیں بازو پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں اور اُس نے بازو کو چمڑے کی ایک پٹی میں ڈالا ہوا تھا جو اُس کے گلے میں لٹک رہی تھی۔ اس نے خادِ اعظم کے جراحوں کے مشورے کے باوجود بردس نہیں پی تھی وہ چمڑے کا ہلکا لباس پہنے ہوئے تھا اُس کی خود اور تلوار اُس کے قریب ہی رکھی ہوئی تھی۔

"انتظار کی گھڑیاں ختم ہونے والی ہیں سردار سرفروش! آج ہم ضرب لگائیں گے اسی لیے ہم نے بردس کو مُنہ نہیں لگایا۔"

"ساویہ کے آدمیوں نے بھی آج نہیں پی ہوگی۔" مارنو بول اُٹھا۔ "وہ بے وقوف عورت بھی غالباً آج ہی رات ضرب لگانا چاہتی ہوگی۔"

میں نے اُس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "ہاں کمان دار یہ ٹھیک کہتا ہے۔"

یہ سُن کر رستم نے آنکھیں بند کرلیں جیسے وہ بازو میں اُٹھنے والی درد کی ٹیس روکنے کی کوشش کررہا ہو۔ پھر لمبی سانس لیتے ہوئے بولا۔ "اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا کیونکہ پہل ہم کریں گے۔ میرے آدمی اُس کے آدمیوں سے بہتر طریقے پر مسلح ہوں گے اور وہ اُس کے آدمیوں پر نگاہ رکھیں گے۔ اب تم سردار سرفروش کو بتاؤ مارنو کہ ہمارا طریق کار کیا ہوگا؟"

مارنو نے اپنی ٹھوڑی کھجائی اور کہنے لگا۔ "میں اُسے ایسا زہر دوں گا جس کا کوئی تریاق نہیں ... لیکن یہ زہر چند لمحے بعد اپنا اثر دکھائے گا اور اُسے ڈھیر کردے گا۔ اُسی وقت تمھیں ساویہ کو تہ تیغ کردینا ہوگا سردار سرفروش۔"

"پھر تمھیں حتی الوسع اپنا دفاع بھی کرنا ہوگا۔" رستم بولا۔

"اس کی ضرورت زیادہ دیر تک پیش نہیں آئے گی۔ میں بھی وہاں موجود ہوں گا... مگر یہ ظاہر کروں گا کہ میں شدید درد میں مبتلا ہوں جوں ہی ساویہ مرے گی، میں بول اُٹھوں گا اور اقتدار اپنی کمان میں لے لوں گا باقی سب کچھ میرے آدمی سنبھال لیں گے اس میں خطرہ تو ہے لیکن اگر ہم نے کوئی غلطی نہ کی تو سب کچھ حسبِ منشا ہوجائے گا۔"

یہی وہ وقت تھا جب مجھے اُن پر حقیقتِ حال منکشف کرنا تھی۔ چنانچہ میں نے کہا۔ "میں ساویہ کو قتل نہیں کرسکتا کیونکہ وہ میرے بچے کی ماں بننے والی ہے۔"

رستم اور مارنو کو اس بات سے دھچکا سا پہنچا اور وہ خاموشی سے میری طرف دیکھتے رہ گئے۔ مجھے بوڑھے مارنو سے مخالفت کا کوئی خطرہ نہیں تھا کیونکہ وہ خود صاحبِ اولاد تھا۔ وہ خاموش بیٹھا رہا۔

"تم یہ بات جانتے تھے پھر تم نے اب تک مجھے کیوں نہ بتائی؟" رستم نے کہا۔

"میں تمھیں بتانا چاہتا تھا، کمان دار لیکن ہر بار بات بیچ میں ادھوری رہ جاتی تھی۔ آخر اُسے قتل کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ تم اُسے قیدی بنا سکتے ہو اور میں اس کے لیے تیار ہوں مجھے ساویہ سے کوئی دلچسپی نہیں لیکن اپنے بچے سے ضرور ہے۔ زچگی کے بعد تمھیں اختیار ہوگا کہ اس کے ساتھ جو چاہو سلوک کرو۔"

"تم پاگل ہوگئے ہو، سرفروش!" رستم غرّایا۔ "تم مردوں کے مرد ہو۔ میں نے آج تمھیں میدانِ جنگ میں لڑتے دیکھا ہے۔ مجھے تم جیسے ساتھی کی ضرورت ہے مگر جب تک وہ عورت زندہ ہے ہمارے سر محفوظ نہیں رہیں گے۔ آسوریوں میں خانہ جنگی شروع ہوجائے گی اور ہم کسی بھی لمحے قتل کردیے جائیں گے۔"

رستم نے تائید طلب نگاہوں سے مارنو کی طرف دیکھتے ہوئے بات جاری رکھی۔ "میں ٹھیک کہتا ہوں مارنو یا غلط؟"

اُسی لمحے میرے ذہن میں ایک سوال نے کسی ناگ کی طرح اپنا پھن اُٹھالیا ساویہ کہتی تھی کہ مارنو اس کا آدمی ہے۔ اس وقت وہ رستم کا مشیرِ خاص نظر آرہا تھا۔ آخر ساویہ سو فی صد یقین سے کیوں کہتی تھی کہ مارنو اس کی خاطر خادِ اعظم کو قتل کردے گا؟ میں یہ سوال پوچھنے ہی والا تھا مگر یہ سوچ کر رُک گیا کہ یہ اُس مسئلے کا حل نہیں جو مجھے درپیش ہے۔

مارنو اُٹھ کر ٹہلنے لگا پھر اپنے ہاتھ سینے پر باندھتے ہوئے رستم سے بولا۔ "میرا خیال ہے کہ اس معاملے میں ہمیں سردار سرفروش کو مجبور نہیں کرنا چاہیے۔ میں اُس کے احساسات سمجھتا ہوں مجھے یہ بھی اعتراف ہے کہ ساویہ کا وجود ہمارے لیے موت کی پرچھائیں بنا رہے گا۔ لیکن آسوریوں کے سربراہ بن کر کیا تم ایک عورت پر قابو نہیں پاسکو گے؟ بہرصورت منصوبہ طے پاچکا ہے اور اب اس میں تبدیلی نہیں کی جاسکتی۔" مارنو نے اپنی رائے کے ساتھ فیصلہ بھی دے دیا۔

رستم نے درد کے مارے ایک بار پھر آنکھیں موند لیں اور چند لمحے سوچنے کے بعد بولا۔ "اچھی بات ہے مارنو لیکن ساویہ کی ذمے داری تم پر ہوگی، سردار سرفروش! اگر آج رات ہم کامیاب ہوگئے تو تم میرے نائب بنو گے۔ ساویہ نے کوئی گڑبڑ، سازش، دھوکے کی کوشش یا بغاوت کی تو مجھے تمھارا سر قلم کرنے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوگی۔"

"مجھے منظور ہے، کمان دار۔" میں نے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے کہا۔ "جب ساویہ بچے کو جنم دے گی تو میں اُسے تمھارے حوالے کردوں گا۔"

اس کے بعد ہم تقریباً نصف گھنٹے تک باتیں کرتے رہے۔

آج مارنو اپنے بہترین لباس میں تھا اور جب وہ لہک لہک کر باتیں کرتا تھا تو اس کی مخروطی ٹوپی کی نوک پر بندھا ہوا

لٹو بجنے لگتا تھا۔

"جب شاہ تبور کچھ کھاتا یا پیتا ہے تو پہلے تم اُسے چکھتے ہو مارنو۔ پھر تم اُسے زہر کیسے کھلاؤ یا پلاؤ گے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ بات نہ میں نے کمانڈر کو بتائی ہے اور نہ ہی تمھیں بتاؤں گا۔" مارنو بولا۔ "اگر ہمارا منصوبہ ناکام ہوجائے تو تشدد سے مجبور ہوکر تم یہ راز اُگل سکتے ہو۔ اس لیے میں نے اُسے اپنے سینے میں دفن کیا ہے تاکہ وقت آنے پر اُسے دوبارہ استعمال کرسکوں۔"

آخری منصوبہ بندی کے بعد میں اپنے جھگڑے میں لوٹ آیا۔ لباس تبدیل کیا اور خادِ اعظم کے خیمے کی طرف چل دیا۔

آج شاہی خیمے کے محافظوں کی تعداد بڑھا دی گئی تھی جن میں سے آدھے شاہ تبور کے آدمی تھے اور آدھے رستم کے۔ مگر خادِ اعظم کے محافظ بروس کے نشے میں تھے جبکہ رستم کے سپاہیوں کو ہدایت کردی گئی تھی کہ وہ بروس نہ پئیں اور اشارہ ملتے ہی شاہ تبور کے محافظوں کو تلوار کی نوک پر ہتھیار ڈالنے پر مجبور کردیں۔

خادِ اعظم کے خیمے میں جشنِ طرب جاری تھا۔

وحشی موسیقی کی لَے تال پر شاداب سراپا والی لڑکیاں نوجوان گھوڑیوں کی طرح رقص کررہی تھیں۔ سیاہ فام غلام بروس کے پیالے اور تاغانیوں کے شہر سے لُوٹے ہوئے پھلوں کے تشت اُٹھائے سب کو پیش کرتے پھر رہے تھے۔

خیمہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔

مشعلوں کے دھوئیں اور بروس کی بُو سے سانس لینی مشکل ہو رہی تھی۔

خادِ اعظم قہقہے لگا رہا تھا اور ساویہ حسبِ معمول اس کے قریب خاموش بیٹھی تھی۔ میں خیمے میں داخل ہونے کے بعد دروازے کے پاس ہی رُک گیا تاکہ اپنے آپ کو بروس کی بُو سے محفوظ رکھ سکوں جو اپنے اندر نشے کی تاثیر رکھتی تھی۔

ساویہ بار بار خیمے کے دروازے کی طرف دیکھتی تھی شاید اسے میرا ہی انتظار تھا۔ میں نے اپنے گھٹنے موڑ کر خود کو قدرے چھپالیا اور شاہ تبور کے عہدے داروں کی ایک ٹولی کے پیچھے کھڑا ہوگیا۔ اتنے میں بابر بھی اپنی گاڑی دھکیلتا ہوا اندر آیا اور میرے پاس پہنچ گیا۔ آج اُسے میرے غلام کی حیثیت سے جشن میں شریک ہونے کی اجازت دے دی گئی تھی۔

موسیقی کی لَے بدلی اور رقاصائیں دو، دو کی ٹولی میں بٹ کر رقص کرنے لگیں، جو بروس سے بدمست سپاہیوں کے لیے خاصا اشتعال انگیز تھا۔ اتنے میں مارنو بہرف میں لگے ہوئے زرنوزدل کا چھوٹا سا ٹوکرا اٹھائے اندر آیا اور حسبِ معمول شاہ تبور کے دائیں جانب بیٹھ گیا۔ اُس نے جیب سے رنگین گولے نکالے اور انھیں اچھالنے لگا۔ اُس نے نہ تو میری طرف دیکھا اور نہ ہی ان رقاصاؤں پر نگاہ ڈالی جو رقص کے آخری مرحلے میں ایک دوسری سے جکڑی وحشیانہ انداز میں چیخ اور کراہ رہی تھیں۔ پھر موسیقی کے ایک جھٹکے کے ساتھ رقص ختم ہوا اور رقص کرنے والی ایک بغلی دروازے سے ملحقہ خیمے میں چلی گئیں۔

بدمست سپاہی دیر تک تالیاں پیٹتے رہے۔

میں اُسی طرح جھکا کھڑا رہا تاکہ ساویہ مجھے بلند قامتی کی وجہ سے پہچان نہ لے۔ مجھے اُس وقت تک شاہ تبور کی نگاہوں سے اوجھل رہنا تھا جب تک کہ رستم کو چوکی پر بٹھا کر وہاں نہ لایا جاتا۔ میں نے دیکھا کہ اب ساویہ اپنے غصّے کو چھپانے کی کوشش کیے بغیر بار بار خیمے کے دروازے کی جانب دیکھتی ہے۔ وہ بڑی مضطرب نظر آتی تھی اور ہونٹ چبا رہی تھی۔

بالآخر رستم کے چار آدمی اُسے چوکی پر خیمے کے اندر لے گئے اور چوکی شاہ تبور کے تخت کے پاس ایک نمایاں جگہ رکھ دی گئی۔ خادِ اعظم اپنی نشست سے اُٹھا اور اُس نے اپنا ہاتھ بلند کیا تو خیمے میں خاموشی چھا گئی۔ وہ اس وقت بروس کے نشے میں دُھت تھا۔ اس لیے کچھ ہکلاتے ہوئے بولا۔

"میں تمھیں مبارکباد کہتا ہوں رستم ... اور تمھارا شکریہ ادا کرتا ہوں کیونکہ آج تم نے تاغانیوں کو ناقابلِ فراموش سبق دیا ہے اور مجھے تمھارے زخمی ہونے پر بہت افسوس ہے۔ میرے جرّاح کیا کہتے ہیں اس سلسلے میں؟"

رستم نے اپنا کٹا ہوا بازو دکھاتے ہوئے جواب دیا۔ "وہ آپ کو مبارکباد دیتے ہیں اور اس تاغانی پر انھیں شدید غصّہ ہے جس نے میرا بازو کاٹ کر انھیں ان کے حق سے محروم کردیا۔"

رستم کی اس بات پر حاضرین نے زوردار قہقہہ لگایا۔

خود خادِ اعظم بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

اُس کی پتلیاں تیزی سے گردش کرنے لگی تھیں۔

"یہ تو صرف ایک ہاتھ تھا جو میرے لیے بہت قیمتی تھا۔ لیکن اگر میرے سو ہاتھ ہوتے تو میں انھیں بھی اپنے خادِ اعظم پر قربان کردیتا۔" رستم نے کہا۔

رستم کے یہ الفاظ میرے لیے اشارے کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس نے کہا تھا کہ جب یہ الفاظ ادا کرے تو میں تخت کے

سامنے آ جاؤں۔ چنانچہ میں آگے بڑھا تو لوگ مجھے راستہ دینے کے لیے ہٹ گئے۔ میں خادِ اعظم اور سادیہ کی نشستوں کے سامنے آیا تو سادیہ کا ہاتھ بے ساختہ اظہارِ تحسین میں اُٹھ گیا۔

میں نے پہلے خادِ اعظم اور پھر سادیہ کے سامنے سر خم کرتے ہوئے کہا: "میں خادِ اعظم کا شکر گزار ہوں جنھوں نے مجھے اپنے حضور حاضری کا اعزاز بخشا۔ پہلے میں تاغانیوں کو بہادر سمجھتا تھا اور اُن کی عزت کرتا تھا لیکن اب میرے دل میں اُن کا کوئی احترام نہیں رہا۔ آج مجھے معلوم ہوگیا ہے کہ حاکمِ دوراں آپ ہی ہیں، شہنشاہِ معظم!"

خادِ اعظم میری طرف جھکا۔ اُس کے چہرے پر تشنج کے سے آثار تھے اور اس کی اکلوتی آنکھ کی پتلی گردش کرتے ہوئے چمک رہی تھی۔ ایسا محسوس ہوا جیسے اس نے میرے خوشامدانہ فقرے سُنے ہی نہ ہوں کیونکہ وہ اپنے آپ کو سنبھالنے کی جدوجہد کر رہا تھا... پھر اُس نے خود پر قابو پاتے ہوئے سرگوشی کی۔

"تم بہت خوش قسمت ہو سردار سرفروش! آج تمھاری تقدیر یاور تھی۔ تم دو بار موت کے مُنہ سے بچے ہو یا تین بار؟"

"دو بار عالی جاہ۔ صرف دو بار۔" میں نے اُس سے نگاہ ملاتے ہوئے کہا۔

وہ اپنے بھدّے دانتوں سے ہونٹ چباتے ہوئے سیدھا کھڑا ہوگیا: "میں تمھارا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں، سردار سرفروش! جس طرح میں نے دوسروں کا شکریہ ادا کیا ہے۔ مگر نہیں۔" اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوگیا۔ مجھے یکلخت کانا پھوسیاں ہونے لگیں۔

میں بھی قدرے خوفزدہ ہوگیا۔

خادِ اعظم پھر بولنے لگا: "میں صرف لفظی طور پر تمھارا شکریہ ادا نہیں کرنا چاہتا۔ تم ایک بار پھر سردار سرفروش بن گئے ہو اس لیے یہ طلائی طوق اپنے گلے سے اُتار دو۔"

میں نے اس کے سامنے سر خم کیا اور طوق گلے سے اُتار کر اُچھال دیا جسے ایک سیاہ فام خواجہ سرا نے جھپٹ لیا۔ لوگ تالیاں بجانے لگے۔

خادِ اعظم نے ہاتھ بلند کیا تو خاموشی چھا گئی۔

"جس بے جگری سے آج سردار سرفروش نے جنگ لڑی ہے ہم اُسے بچشمِ خود ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ سردار سرفروش نے یہ جنگ ہمارے لیے لڑی ہے اور ہم اس کی خوش بختی کے بھی قائل ہو گئے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے اُس نے مجھے دیکھا اور مسکرانے لگا: "ہم آسوری خوش بختی کی قدر و قیمت جانتے ہیں۔ اس لیے ہم اُسے سادیہ کے ساتھ شادی کی اجازت دیتے ہیں جو تاریخ مقرر ہونے کے بعد بڑی دھوم دھام اور شاہانہ تزک و احتشام سے منائی جائے گی۔ اس کے علاوہ ہم اسے ایک اہم عہدہ بھی دے رہے ہیں۔ اس حیثیت میں سردار سرفروش صرف ہمیں جوابدہ ہوگا۔ ہمارے علاوہ اس سے کوئی دوسرا باز پرس نہیں کر سکے گا۔ اسے ہمارے خزانے اور ہماری ہر چیز پر مکمل اختیارات حاصل ہوں گے۔ یہ ہماری بہن کے ساتھ تخت پر بیٹھا کرے گا اور تم سب اس کی اطاعت کرو گے۔ یہ ہمارا فرمان ہے۔"

یہ الفاظ سنتے ہی دو سیاہ فام غلام جلدی سے تیسری مسند لے آئے جو سادیہ کے برابر رکھ دی گئی۔

"تم نے دیکھا سردار سرفروش کہ ہم اپنا قول کس طرح پورا کرتے ہیں۔" شاہ تیمور نے کہا۔

میں نے شکریہ ادا کرنے کے لیے سر خم کر دیا۔

حاضرین نے بے تحاشا تالیاں بجائیں اور نعرہ ہائے تحسین بلند کیے۔ شاہ نے مجھے مسند پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پہلی بار مجھے اندازہ ہوا کہ وہ اپنی قوم میں کتنا مقبول ہے۔ آج مجھے یہ اندازہ بھی ہوگیا تھا کہ آسوری بہادروں کی کتنی قدر اور عزت کرتے ہیں۔

جب نعرہ ہائے تحسین اور تالیوں کا شور ختم ہوا تو سادیہ نے خادِ اعظم کا شکریہ ادا کیا... پھر اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اُس کی آنکھیں جوشِ مسرت سے چمک رہی تھیں۔ وہ میری طرف جھکی اور میرے کان میں بولی: "وقت آ گیا ہے، مارنو کو قتل کرنے کے لیے تیار رہو۔"

اُدھر شاہ تیمور، مارنو سے کہہ رہا تھا: "بول بول کر میرا حلق خشک ہوگیا ہے اور بھوک لگنے لگی ہے احمق۔ جلدی سے تربوز دو۔" پھر اس نے پہلو میں رکھے پیالے سے بروس کے چند گھونٹ غٹاغٹ پیے اور تربوزوں کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا جن میں سے مارنو اچھا دانہ چھانٹ رہا تھا۔ دریں اثنا ایک سیاہ فام غلام شاہ تیمور کے پاس آیا اور اس نے سرگوشی میں کچھ کہا۔

خادِ اعظم نے اثبات میں سر ہلایا اور اُسے جانے کا اشارہ کرتے ہوئے پھر تربوزوں کی طرف دیکھنے لگا۔

میری نگاہیں بھی مارنو پر مرکوز تھیں۔

مارنو نے ٹوکرے میں سے ایک اچھا اور بڑا سا تربوز اُٹھایا، اپنی پیٹی سے چاقو نکالا، بڑی احتیاط سے تربوز دو حصوں میں کاٹنے کے بعد اُٹھا اور ادب سے جھکتے ہوئے آدھا تربوز شاہ تیمور کو پیش کر دیا۔

خادِ اعظم تربوز پر مُنہ مارنے سے پہلے مارنو کو غصّے سے دیکھتے ہوئے بولا: "پہلے اسے چکھو بدبخت۔ کیا میں تمھیں اس کام کا الگ سے معاوضہ نہیں دیتا؟"

مارنو نے تربوز کا دوسرا حصّہ اُٹھا لیا۔ سب کی نگاہیں اب مارنو پر تھیں کیونکہ جب کبھی خادِ اعظم اُسے کوئی چیز چکھنے کے لیے کہتا تھا تو مارنو اُسی چیز کی زبان بن جاتا تھا۔ مارنو نے تربوز کی ترجمانی [illegible]یب مزاحیہ لہجے میں شروع کر دی۔

"مجھے کھاؤ احمق بونے! مجھے کھاؤ تاکہ خادِ اعظم میرا دوسرا حصّہ کھا سکیں۔" پھر تربوز کی ہنسی سُنائی دی: "کٹ کٹ کٹ کٹ۔ جب میں یہاں آیا تو ثابت و سالم تھا۔ میرا چھلکا بھی ثابت سالم تھا۔ جب تم کاٹ رہے تھے تو سب دیکھ رہے تھے۔ کیا [illegible]ادِ اعظم مجھے جادوگر سمجھتے ہیں؟ ورنہ تربوز کو کاٹے بغیر کون اُسے زہر آلود کر سکتا ہے۔ کھاؤ مجھے جلدی کھاؤ احمق!"

یہ کہہ کر مارنو جلدی جلدی تربوز کھانے لگا۔ سارے حاضرین [illegible]س کی باتوں اور کھانے کے انداز پر بے تحاشا ہنسنے لگے۔ خادِ اعظم [illegible]ی قہقہے لگا رہا تھا... پھر وہ بھی تربوز کھانے لگا۔ میری پیشانی عرق [illegible]ود ہوگئی۔

مارنو نے کہا تھا کہ شاہ تربوز کھانے کے چند لمحوں بعد [illegible]یر ہو جائے گا۔ سادیہ میری طرف جھکی اور میرے گھٹنے پر ہاتھ [illegible]تے ہوئے بولی: "کیا بات ہے سرفروش! تم اس طرح گھبرائے [illegible]ئے کیوں لگ رہے ہو؟ تمھیں تو ابھی ایک اہم کام کرنا ہے۔"

میں نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

خادِ اعظم نے جلدی جلدی کچھ اور تربوز کھایا... پھر کھڑے [illegible]ر ہاتھ بلند کیا اور جب خاموشی چھا گئی تو بولا: "میں تمھیں [illegible]ک اور خوشخبری بھی سُنانا چاہتا ہوں۔ میں تمھارا حکمران یعنی تیمور بھی شادی کرنے والا ہے۔ مجھے میرے خوابوں کی شہزادی [illegible]ئی ہے۔" یہ کہہ کر اُس نے تالی بجائی اور غلاموں کو حکم دیا کہ [illegible]اعظم تیمور کی دُلہن سامنے لائی جائے۔ "آسوری قوم کے سرداروں [illegible]ن ہستی کا دیدار کروایا جائے جو حاکمِ دوراں کے ساتھ اس کے [illegible]ت پر جلوہ افروز ہوا کرے گی۔"

حاضرین خوشی سے تالیاں بجانے لگے۔ خادِ اعظم نے مسکراتے [illegible]ئے بروس کا پیالہ اُٹھا لیا اور دو گھونٹ پینے کے بعد رکھ دیا۔ [illegible]رین میں سے کسی کو بھی اس خوشخبری کی توقع نہیں تھی وہ [illegible]ت زدہ تھے صرف سادیہ ہی بھرے دربار میں وہ واحد ہستی [illegible]س کی آنکھوں میں خوشی اور حیرت کی بجائے نفرت کی لہریں ہلکورے لے رہی تھیں۔ اس نے مجھ سے سرگوشی میں کہا...

"تیار ہو جاؤ سرفروش۔ وہ لمحہ آ گیا ہے۔" پھر اُس نے ان سیاہ فام غلاموں کی طرف دیکھا جن کے درمیان خادِ اعظم کی ہونے والی نازک اندام دُلہن آ رہی تھی۔ اُس کے سر پر جوڑا بندھا ہوا تھا اور سادیہ کی طرح اُس کا آدھا چہرہ بھی زیرِ نقاب تھا۔ صرف آنکھیں نقاب سے باہر تھیں جنھیں وہ جلدی جلدی جھپک رہی تھی۔ چلتے چلتے وہ لڑکھڑائی تو ایک غلام نے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ ایکدم بولی...

"بابا۔ کیا تم بھی یہاں موجود ہو، بابا۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے بابا... تم کہاں ہو، بابا!"

یہ آواز سُن کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی تیز دھار خنجر سیدھا میرے دل میں اُتر گیا ہو۔ میرا رُواں رُواں کانپ اُٹھا... اور پھر بونے مارنو کے حلق سے ایک دلدوز چیخ نکلی جس سے ماحول کا ذرّہ ذرّہ کانپ گیا۔ اچانک اُس کے ہاتھ میں ایک تیز دھار خنجر چمک اُٹھا اور پھر یوں لگا جیسے خیمے میں آسمانی بجلی گر گئی ہو۔

میں نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں۔ میرا دل یوں کانپ رہا تھا جیسے میں کوئی غیر معمولی جوان نہیں بلکہ بھیڑ کا ایک کمزور و ناتواں سا بچہ ہوں اور میری گردن پر خنجر کی دھار رکھ دی گئی ہو۔

حالات نے کس قدر اچانک اور کتنی بھیانک کروٹ لی تھی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ خادِ اعظم تمبور نے مارنو کی معصوم بیٹی تانتی کو نہ صرف تلاش کر لیا ہے بلکہ اسے اپنی ملکہ بنانے کا بھی فیصلہ کر لیا ہے... مارنو کے ہاتھ میں لمحے بھر کو اس کا تیز دھار خنجر چمکا اور پھر وہ تڑپ کر لپکا۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو میرے سامنے ایک اور ناقابلِ یقین منظر تھا۔

مارنو کا خنجر سادیہ کے دل میں اُتر گیا تھا۔

سادیہ کے حلق سے بڑی ہی دل دوز چیخ نکلی تھی اور ماحول پر لرزہ ساطاری ہو گیا تھا۔ وہ مُنہ کے بل مسند سے قالین پر گری اور اس کی رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

ابھی حاضرین اس صورتِ حال کو سمجھ بھی نہیں پائے تھے کہ خادِ اعظم بھی اپنی ہم قیر سادیہ کے پہلو میں گر گیا۔ اس نے دونوں... ہاتھوں سے اپنا حلق تھام لیا۔ وہ چند لمحے تڑپا اور ہمیشہ کے لیے ٹھنڈا ہو گیا۔

سب کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں اور وہ بے یقینی سے مُنہ پھاڑے دیکھتے رہ گئے کہ یہ کیا ہو گیا ہے۔

میں خود بھی حیرتوں میں ڈوب گیا تھا... پھر فوراً ہی مجھے ہوش آگیا۔ اس سے پہلے کہ سیاہ فام غلام مارنو پر جھپٹتے، میں نے اپنی مسند ہی اُٹھا کر اُن پر دے ماری اور تلوار سونت کر لوٹنے مارنو کے آگے آگیا۔ اتنے میں رُستم نے بھی چوکی کے گدّے کے نیچے چھپی ہوئی تلوار نکالی اور اسے لہراتے ہوئے گرجا...

"سُنو اے آشوری لوگو سُنو... اب میں تمھارا حکمراں ہوں!"

رُستم کا یہ اعلان سُنتے ہی خادِ اعظم کے وفاداروں میں ایک بڑبونگ سی مچ گئی۔ اُنھوں نے چیختے چنگھاڑتے ہوئے اپنی نیاموں سے تلواریں نکال لیں لیکن رُستم کے آدمی پہلے سے چوکس تھے انھوں نے خادِ اعظم کے آدمیوں کو کاٹ کر رکھ دیا۔ ان میں سے دو رُستم کے آدمیوں کو غچّہ دے کر بونے مارنو کی جانب لپکے تو میں نے آگے بڑھ کر ایک کو تہِ تیغ اور دُوسرے کو بُری طرح زخمی کر دیا۔

خادِ اعظم کے کچھ وفاداروں نے خیمے سے نکل کر ہنگامہ کرنا چاہا مگر رُستم کے وفاداروں نے اُن کا راستہ روک لیا۔ اتنے میں بار اپنی گاڑی دھکیلتا ہوا اُن کے قریب پہنچا اور گاڑی کے تختے کے نیچے چھپائی ہوئی تلوار نکال کر اُن کی ٹانگوں پر وار کرنے لگا۔

دیکھتے ہی دیکھتے یہ بغاوت کچل دی گئی۔

رُستم نے اپنے آدمی اُن چند آشوریوں کو بھی ختم کرنے کے لیے بھیج دیے جو خیمے سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

ہنگامہ فرو ہوتے ہی رُستم کے وفاداروں نے اسے خادِ اعظم کے تخت پر بٹھا دیا۔ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولا "ابھی میں اتنا کمزور ہوں کہ چل نہیں سکتا۔"

"اب میں تمھیں کمان دار کہہ کر مخاطب کروں یا خادِ اعظم کہا کروں؟" میں نے پوچھا۔

"تنہائی میں تم مجھے کمان دار کہہ سکتے ہو۔" وہ مسکراتے ہوئے آہستہ سے بولا۔ "لیکن یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے۔ تم اور مارنو یہیں میرے پاس رہو گے تاوقتیکہ میرے آدمی اپنا کام مکمل نہ کر لیں۔"

رُستم نے اپنے منصوبے کو کامیابی سے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے سارے انتظامات کر رکھے تھے۔ اُس کے وفاداروں نے خادِ اعظم کے ان افسروں کو فوراً گرفتار کر لیا جو جشنِ طرب میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ عام سپاہیوں کو اس بات سے کوئی سروکار نہیں تھا کہ اُن کا حکمراں شاہ تمبور ہے یا رُستم... وہ تو صرف معاوضے سے دلچسپی رکھتے تھے اور وہ اپنے آجر کے وفادار تھے۔

رُستم کے آدمی خادِ اعظم کے وفادار افسروں کو گرفتار کر کے [illegible] میں لاتے رہے۔ انھیں صرف ایک لمحے کی مہلت دی جاتی جو اس ایک لمحے میں حلفِ وفاداری نہیں اُٹھاتے تھے، اُن کا سر قلم کر دیا جاتا تھا۔ صبح تک یہ سلسلہ جاری رہا اور شاہ تمبور کے افسروں میں سے تین چوتھائی نے رُستم کے ساتھ وفادار رہنے کا حلف اُٹھا لیا۔

رات بھر جاگنے سے رُستم کی تکلیف بڑھ گئی تھی اور وہ کمزوری کے مارے بے حال ہو رہا تھا۔ صبح طلوعِ آفتاب کے بعد وہیں اپنی چوکی پر سو گیا اور اُس پر کمبل ڈال دیے گئے۔

شاہ تمبور اور سادیہ کی لاشیں رات ہی کو وہاں سے ہٹا دی گئی تھیں مگر میں نے رُستم سے وعدہ لے لیا تھا کہ سادیہ کی لاش کی بے حرمتی نہیں کی جائے گی بلکہ اُسے پورے احترام سے دفنایا جائے گا۔ البتہ شاہ تمبور کا سر کاٹ کر نیزے پر بلند کر دیا گیا تھا تاکہ دیکھنے والے عبرت حاصل کر سکیں۔

مارنو اور تانتی نے بھی رات شاہی خیمے ہی میں گزاری۔ مارنو اپنی بیٹی کو تھپکتا اور تسلیاں دیتا رہا تھا اور اب وہ سو رہی تھی۔ خود مارنو بھی اپنی بیٹی سے گلے مل کر بہت رویا تھا۔ میں نے اُسے تسلی دی کہ وہ اپنا دل چھوٹا نہ کرے۔ اُسے تو خوش ہونا چاہیے کہ اس کی معصوم بچی شاہ تمبور کے ستم کا نشانہ بننے سے بچ گئی ہے۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ وہ اب تک اس المیے سے بے خبر ہے

جو اُس کے ساتھ پیش آنے والا تھا۔

"میں زندگی بھر تمھارا احسان نہیں اُتار سکوں گا، سردار سرفروش! تم نے پہلے میری بیٹی کی جان بچائی تھی اور اب میری زندگی بچائی ہے۔" مارنو نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"ایسی باتیں نہ کرو مارنو۔" میں نے جواب دیا۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ سادیہ کو تمھاری بیٹی کا علم کیسے ہو گیا تھا؟"

"وہ شیطان کی خالہ تھی سردار سرفروش۔ وہ کئی سال پہلے یہ جان چکی تھی کہ میری ایک بیٹی ہے جو بے حد خوبصورت ہے۔ شاید اس کے جاسوسوں نے اُسے یہ راز بتایا ہو گا۔"

اب اس راز سے پردہ اُٹھ گیا تھا کہ سادیہ اتنے یقین سے کیوں کہتی تھی کہ مارنو اُس کا وفادار ہے اور وہ اُس کے لیے شاہ تمبور کو قتل کر سکتا ہے۔

"تم نے مجھ سے یہ جھوٹ کیوں بولا تھا کہ دُنیا میں صرف تین آدمی یعنی تم، میں اور وہ بڑھیا ہی جانتے ہیں کہ تانتی تمھاری بیٹی ہے جبکہ سادیہ بھی اس حقیقت سے آگاہ تھی؟" میں نے سوال کیا۔

"میں نے یہ جھوٹ بھی سادیہ کی وجہ سے بولا تھا، سردار سرفروش! اُس نے مجھے تاکید کر دی تھی کہ کسی کو یہ معلوم نہ ہونے پائے کہ وہ تانتی کے بارے میں کچھ جانتی ہے۔ اُس نے مجھے یہ دھمکی بھی دی تھی کہ اگر میں نے اُس کے حکم کی تعمیل نہ کی تو تانتی کو ہلاک کر دیا جائے گا۔"

اس کا یہ مطلب تھا کہ سادیہ اُس وقت کا انتظار کر رہی تھی جب تانتی کچھ بڑی ہو جائے اور وہ اُسے اپنی مقصد براری کے لیے استعمال کر سکے۔ بہرکیف اب سادیہ مر چکی تھی اور اُس کے ساتھ ہی اُس کے سارے شیطانی منصوبے بھی ختم ہو گئے تھے... لیکن اُس کی ہلاکت میں میرے لیے ایک دُکھ کا پہلو بھی تھا۔ میں نے جس ننھے مُنّے بچے کے خواب دیکھے تھے، سادیہ اس کی تعبیر بھی اپنے ساتھ قبر ہی میں لے گئی تھی۔

سہ پہر کو جب رُستم جاگا تو وہ تازہ دم تھا۔ اُس کی قوت بھی کسی حد تک بحال ہو چکی تھی۔ اُس نے ناشتے کے ساتھ ساتھ احکام بھی جاری کرنے شروع کر دیے۔ جب تانتی کو ایک معتبر عورت کی نگہداشت میں دے دیا گیا تو مارنو آرام کے لیے اپنے خیمے میں چلا گیا۔ رُستم نے معذور بار کو شاہ تمبور کے آدمیوں کے ساتھ نبرد آزما دیکھا تھا اس لیے اُس نے بار کو سپاہ میں افسرِ عملہ کے نائب کا منصب سونپ دیا تھا اور چار آدمی اُس کی پالکی اُٹھانے کے لیے مقرر کر دیے تھے... پھر رُستم اور میں شاہ تمبور کا حشر دیکھنے کے لیے چل پڑے۔

خادِ اعظم کا سر ایک نیزے پر بلند کیا گیا تھا... مگر وہ نیزہ غلاظت کے ڈھیر میں گڑا ہُوا تھا اور سر بریدہ جسم نیزے کے ساتھ غلاظت میں لتھڑا ہُوا تھا۔ آشوری عورتیں اور مرد گزرتے ہوئے اُس پر تھوک رہے تھے۔ اب اُن کی معصوم بچیاں شاہ تمبور کی بھینٹ چڑھنے سے محفوظ ہو گئی تھیں۔ وہ سب رُستم کو اپنا نجات دہندہ تصور کر رہے تھے۔

"مارنو نے شاہ تمبور کو زہر کب اور کیسے دیا تھا؟" میں نے رُستم سے پُوچھا۔

"میں نے اُس سے پوچھا تھا مگر اُس نے مجھے بھی نہیں بتایا تھا۔ وہ اپنی بات پر اڑا رہا مگر جب میں نے اُسے کہا کہ جس طرح شاہ تمبور کو ہلاک کیا ہے اُسی طرح مجھے بھی کر سکتا ہے تو وہ اس راز سے پردہ ہٹانے پر مجبور ہو گیا۔ تم نے دیکھا ہو گا کہ اُس نے صندوق سے ثابت و سالم تربوز نکالا تھا؟"

"ہاں..." میں نے کہا۔ "اور اُس نے سب کے سامنے ہی اُسے کاٹا تھا اور اُسے تربوز کو زہر آلود کرنے کا موقع نہیں ملا تھا... مگر اس کے باوجود خادِ اعظم تربوز کھانے کے چند لمحوں بعد مر گیا۔"

"اُس نے سب کے سامنے تربوز کو زہر آلود کیا تھا، سردار سرفروش! اُس نے چاقو کے پھل پر ایک طرف وہ زہرِ قاتل لگا دیا تھا۔" رُستم نے وضاحت کی۔

"اوہ... اس کا مطلب ہے کہ جب اس نے تربوز کاٹا تو تربوز کے جس حصّے پر زہر لگا ہُوا تھا، وہی اُس نے خادِ اعظم کو پیش کر دیا... اور دُوسرا حصّہ جو زہر آلود نہیں تھا، شاہ تمبور کے کہنے پر مزے سے کھاتا رہا۔ بونا بڑا ہی کائیاں ہے، کمان دار لیکن اگر اُس کی یہ ترکیب ناکام ہو جاتی تو پھر کیا ہوتا؟" میں نے پوچھا۔

"میں اپنے بائیں ہاتھ سے خود ہی شاہ تمبور کو قتل کر دیتا۔" رُستم نے جواب دیا۔

خیمے میں واپسی پر میں نے رُستم سے بہت سی باتیں کیں۔ ہمارے درمیان بحث بھی ہُوئی مگر رُستم خادِ اعظم اور آشوری نہیں تھا۔ اُس کا تعلق کاوسا قبیلے سے تھا، اس لیے وہ دلیلوں سے قائل ہو گیا اور جو کچھ میں اُس سے منوانا چاہتا تھا، وہ منوانے میں کامیاب ہو گیا۔

تقریباً ایک ہفتے تک ہمارا پڑاؤ اسی جگہ رہا۔ اس دوران رُستم نے آشوری سپاہ اور قبیلوں کی تنظیمِ نو کی اور اصلاحات نافذ کرتا رہا۔ آشوری اُس کے اقدامات سے مطمئن تھے۔

رستم نے مجھے، بونے مارنو اور بابر کو اپنے اعتماد میں لے کر ایک مجلسِ مشاورت قائم کر لی تھی اور مارنو نے خفیہ طور پر لشکر میں اپنے جاسوس پھیلا دیے تھے جو ہمیں آسوری سپاہیوں کے درمیان ہونے والی بات چیت اور ان کے خیالات سے باخبر رکھتے تھے۔

ایک ہفتے بعد لشکر کو کُوچ کا حکم دے دیا گیا۔ اب رستم کے بازو کا زخم بھر چلا تھا اور وہ بآسانی سفر کر سکتا تھا۔ دو روز تک ہم سمندر کے ساتھ ساتھ جنوب مغرب کی جانب سفر کرتے رہے۔ تیسرے دن ہمیں دُور اُفق پر وہ دیوار نظر آ گئی۔ اب ہم اس فصیل کی دُوسری طرف سفر کر رہے تھے جیسا کہ خادِ اعظم کا منصوبہ تھا۔

"تمھیں اپنا قول یاد ہے نا؟" میں نے رستم سے پُوچھا۔

"ہاں" رستم بولا: "ہم پُرامن رہیں گے اور تاتغانیوں سے جنگ نہیں کریں گے۔ میں نے اپنے سارے افسروں کو سمجھا دیا ہے کہ جس نے بھی حکم عدولی کی اُس کا سر قلم کر دیا جائے گا۔"

ہمارا سفر جاری رہا۔

ہم سانپ کی طرح بل کھاتی فصیل کے ساتھ ساتھ مغرب کی طرف بڑھتے رہے۔

ایک شام جب سُورج دُور پہاڑیوں کی اوٹ میں غروب ہُوا تو مجھے اُن پہاڑیوں کے عقب میں سے سبز روشنی پُھوٹتی نظر آئی۔ میں سمجھ گیا کہ اس روشنی کا مخرج اس سلسلۂ کوہ کے پیچھے زمرد کی پہاڑیاں ہیں۔ ایسی پہاڑیاں میں سراندیپ میں دیکھ چکا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی مجھے لالی یاد آ گئی۔ لالی کے ساتھ گزارے ہُوئے لمحے یاد آ گئے۔

میں ساعتوں کے پل پار کرتا ہُوا ماضی کے اُن لمحوں میں جا پہنچا جب میں نے پہلی بار لالی کو دیکھا تھا اور جانے اب وہ کیسی ہو گی۔ جانے اب اس کا ساتھی کون ہو گا۔ وہ کس کی محبت کا دم بھرتی ہو گی؛ ان سوچوں کو اسی وقت جواب مل سکتا تھا جب ہم منزلیں طے کرتے ہُوئے لالی کے شہر پہنچ جائیں گے۔

لشکر کی پیش قدمی جاری رہی۔

ایک روز مغرب سے آنے والی ہوائیں اپنے ساتھ پھولوں کی بھینی بھینی مہک بھی لے آئیں۔ یہ خوشبو اس بات کی غماز تھی کہ ہم تاتغانی سرزمین کے قلب تک پہنچ گئے ہیں لیکن اب تک نہ تاتغانی فوجیوں سے ہماری مڈبھیڑ ہوئی تھی اور نہ ہی نگہبانی کے کوئی بُرج اور گاؤں دکھائی دیتے تھے۔

پچھلے چند روز سے میں محسوس کر رہا تھا کہ لونا مارنو مجھ سے پہلوتہی کر رہا ہے اور کترانے لگا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اُس کے رویّے میں یہ تبدیلی کیوں آ گئی ہے؟ آخر ایک روز میں نے اُس سے پُوچھ ہی لیا: "کیا بات ہے، مارنو۔ تم مجھ سے کچھ دُور دُور رہنے لگے ہو؟"

"تم سچ کہتے ہو سردار سرفروش! دراصل میرا ضمیر مجھے کاٹنے لگا ہے۔ تم نے میری بیٹی کی جان بچائی لیکن میں نے تمھارے ہونے والے بچّے کو قتل کر دیا۔ ضمیر کی یہی ملامت مجھے تمھارا سامنا کرنے سے روکتی ہے۔"

"ہونی کو کوئی نہیں روک سکتا، مارنو! مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ میرے ساتھ وہی دوستانہ رویّہ روا رکھو گے تو مجھ پر احسان ہو گا۔" میں نے اُسے سمجھایا۔

گزشتہ دو روز سے میرا دل کچھ گداز ہو رہا تھا۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ میرے سر میں مسلسل ہلکا ہلکا درد رہنے لگا تھا جو کبھی کبھی شدت بھی اختیار کر لیتا تھا... اور یہ اس بات کی علامت تھی کہ ڈاکٹر فریدوں اپنے کمپیوٹر کے توسط سے میری کھوج میں ہے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اپنے پیچھے تلخ یادیں چھوڑ جاؤں۔ اسی لیے میں نے مارنو سے یہ بات چھیڑی تھی تاکہ اگر اُسے مجھ سے کوئی شکایت ہو تو دُور کرتا جاؤں۔

مارنو کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا: "کیا تم مجھے اس زیادتی پر تہِ دل سے معاف کر سکتے ہو سردار سرفروش؟ دراصل سادینے چال ہی ایسی چلی تھی۔ اُس کا خیال تھا کہ میں اپنی بچّی کو دیکھ کر طیش میں آ جاؤں گا اور خادِ اعظم کو قتل کر دُوں گا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ میں اُسے زہر دے چکا ہُوں۔ اس کی شیطانی حرکت سے میں ایک دم اشتعال میں آ گیا اس لیے..."

"سب بھول جاؤ مارنو" میں نے اُس کی قطع کلامی کرتے ہُوئے کہا: "میں نے اُس سے متعلق ہر بات اُس کے ساتھ دفن کر دی ہے۔" میں سمجھ گیا تھا کہ سادینے اس سلسلے میں اتنی پُریقین کیوں تھی کہ مارنو، خادِ اعظم کو ضرور قتل کر دے گا۔

"اچھی بات ہے سردار سرفروش" وہ بولا اور پھر ایک دم چونکتے ہُوئے کہنے لگا: "وہ دُھول کیسی ہے؟ ہمارے جاسوس واپس آ رہے ہیں یا تاتغانی ہیں؟"

میں نے بھی پلٹ کر دیکھا تو دُور مجھے دُھول اُڑتی دکھائی دی۔ کچھ گھڑ سوار تیزی سے ہماری طرف آ رہے تھے۔ جب وہ قریب آئے تو پتہ چلا کہ وہ ہمارے ہی آدمی ہیں جنھیں خبریں لانے کے لیے لشکر کی روانگی سے پہلے آگے بھیج دیا گیا تھا۔

میں نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور رستم کی طرف بڑھا جو اس وقت لشکر کی رہنمائی کر رہا تھا۔ میرے اس تک پہنچنے سے پہلے جاسوس وہاں پہنچ چکے تھے اور اپنی رُوداد سُنا رہے تھے۔ رستم میری طرف دیکھ کر مسکرایا اور بولا: "تم تو تاتغانیوں کے دیوتا بن چکے ہو، سردار سرفروش! وہ تمھاری پُوجا کرتے ہیں۔ لو... اسے دیکھو!" یہ کہتے ہُوئے اُس نے ایک چھوٹا سا پُتلا میری طرف بڑھا دیا۔

میں یہ پُتلا دیکھ کر دم بخود رہ گیا۔

زمرد سے تراشا ہُوا یہ ایک ہاتھ لمبا مجسمہ میرا ہم شکل تھا۔ میں نے تعجب سے پوچھا: "یہ تمھیں کہاں سے ملا۔ کیا یہ لوگ لائے ہیں؟"

"ہاں!" رستم نے کہا اور جاسوسوں کے سرخیل کی طرف متوجہ ہو گیا: "اسے تفصیل سے بتاؤ کہ یہ تمھیں کہاں سے ملا؟"

"اس سفر کے دوران پہلی بار ہمیں ایک گاؤں نظر آیا تو ہم وہاں پہنچے اور جیسا کہ ہمیں حکم دیا تھا، میں نے ایک آدمی گاؤں بھیج کر تاتغانیوں کو پیغام بھجوایا کہ ہم جنگجو بن کر نہیں بلکہ امن کے پیامبر بن کے آئے ہیں اس لیے ہمیں دشمن نہیں مہمان سمجھا جائے۔ ان لوگوں نے ہمیں اپنے گاؤں میں آنے کی اجازت دے دی۔ جب ہم گاؤں پہنچے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اس کے مرکزی چوراہے میں تمھارا قدِ آدم مجسمہ نصب تھا۔" جاسوس نے وضاحت کی۔

"اس گاؤں کے ہر گھر میں اسی قسم کے چھوٹے چھوٹے مجسمے تھے سردار سرفروش۔" دُوسرے نے تائید کی۔

"ہم جانتے ہیں کہ تاتغانی بہت سے دیوتاؤں کی پُوجا کرتے ہیں۔ اب اُن میں تم بھی شامل ہو گئے ہو۔ جب ہم وہاں سے آنے لگے تو میں نے یہ سوچ کر ایک لڑکی سے یہ مجسمہ مانگ لیا کہ تم اسے دیکھ کر خوش ہو گے۔" سرخیل نے مسکرا کر کہا۔

میں نے تعجب سے اپنے مجسمے کی طرف دیکھا۔ وہ سبز زمرد سے تراشا گیا تھا اور اس میں سے شعاعیں منعکس ہو رہی تھیں۔

"کیا تم نے اُن سے پُوچھا تھا کہ یہ مجسمے کیوں بنائے گئے ہیں؟" میں نے سوال کیا۔

"ہاں" جاسوسوں کا سردار بولا: "یہ تمھاری یاد میں بنائے گئے ہیں۔ ملکہ ہوشی نے اپنی سلطنت کے ہر شہر اور ہر گاؤں کے مرکزی مقامات پر تمھارا قدِ آدم مجسمہ نصب کرنے اور ہر گھر میں ایک چھوٹا مجسمہ رکھنے کا حکم دیا ہے۔"

میں نے سوچا کہ لالی شاید مجھے آنجہانی سمجھتی ہے۔

ہمارا سفر جاری رہا۔

جب ہم پہلے گاؤں کے قریب پہنچے تو میں خود گاؤں کے چوراہے پر گیا۔ دیہاتی مجھے دیکھ کر سر جھکانے لگے اور بچے چیختے چلّاتے بھاگ اُٹھے۔ مجھے خیال آیا کہ اُن کی مائیں اُنھیں یہ کہہ کر تو نہیں ڈراتی ہوں گی کہ خبردار رونے یا شرارت کی تو سردار سرفروش کے حوالے کر دُوں گی۔

میں نے گاؤں کے مرکزی چوراہے میں اپنے مجسمے کے سامنے گھوڑا روک لیا اور اُسے غور سے دیکھنے لگا۔ یہ مجسمہ قدِ آدم نہیں بلکہ دس ہاتھ بلند تھا اور زمرد کی چٹان سے تراشا گیا تھا۔ مجھے یہ مجسمہ بڑا باوقار نظر آیا اور میں اسے دیکھ کر خوش ہُوئے بغیر نہ رہ سکا۔ میں نے تو کبھی بھول کر بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ لالی مجھے اتنی شدتوں سے بھی چاہ سکتی ہے۔ اُس کی محبت نے تو مجھے دیوتاؤں کا درجہ عطا کر دیا تھا۔ مجھے اُس پر ٹوٹ کر پیار آ گیا۔ اور میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ اگر اس وقت وہ میرے ساتھ ہوتی تو مارے خوشی کے ہم دونوں ہی نہال ہو گئے ہوتے۔

جب میں دوبارہ اپنے لشکر پہنچا تو ایک بار پھر میرے سر درد میں شدت آ گئی۔ میں نے آگے کو جُھک کر اپنے آپ کو گرنے سے بچایا اور ڈاکٹر فریدوں کو کوسنے لگا جو شاید مجھے سالموں میں تقسیم کرنے کی غرض سے کمپیوٹر کے ذریعے تلاش کر رہا تھا۔

لشکر حسبِ معمول آگے بڑھتا رہا لیکن ہمیں فصیل پر کوئی نقل و حرکت دکھائی نہ دی۔ تاہم ہر منزل پر ہم نے اپنے آگے آگے دُھوئیں کے بادل ضرور اُٹھتے دیکھے تھے، جو ہماری آمد کی نشان دہی کرتے تھے۔ پھر ایک روز ہمیں نگہبانی کے سلسلۂ بُرج کا پہلا بُرج بھی دکھائی دے گیا۔ اس سلسلے کے ہر بُرج پر مختلف رنگوں والے تین اشارہ نما لگے ہوئے تھے جنھیں رسّوں کی مدد سے اُٹھایا یا گرایا جا سکتا تھا۔ ہر بُرج اُونچے مقام پر تعمیر کیا گیا تھا اور اُسے دُوسرے بُرج سے دیکھا جا سکتا تھا لیکن کسی بُرج پر ہم نے کسی فرد کو مامور نہیں پایا۔ بُرج کے محافظ ہمارے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی جا چکے ہوتے تھے۔

رستم کو اُن کی اس حرکت پر بڑا غصہ آیا۔

"ہم اُن لوگوں سے مفاہمت کی بات چیت کیسے کر سکتے تھے جو ہمیں دیکھ کر ہماری آمد سے پہلے ہی بھوتوں کی طرح غائب ہو جاتے ہیں!" وہ بھڑک کر بول اُٹھا۔

میں اُسے سمجھاتے ہُوئے جواب دیتا: "صبر سے کام لو کمان دار۔ اپنے نمائندے اُن کی طرف بھیجتے رہو... مگر زیادہ تعداد میں نہیں۔ ایک نہ ایک روز وہ مفاہمت کی بات چیت پر ضرور آمادہ ہو جائیں گے۔"

رستم دس دس آدمیوں کے گروہ بھیجتا جو اپنے نیزوں کے ساتھ سفید بالوں والے گھوڑوں کی دُمیں آویزاں رکھتے تھے۔ یہ سفید

وہیں امن و آشتی اور صلح کی علامت تھیں لیکن رستم کے یہ ایلچی جس بھی گاؤں میں داخل ہوتے تھے، اُسے خالی پاتے تھے اور ناکام ہو کر لوٹ آتے تھے۔ رستم جھنجلا اُٹھتا تھا اور اس خدشے کا اظہار کرتا تھا کہ کہیں ہم اُن کے جال میں نہ پھنس جائیں۔ کہیں وہ اس لیے گاؤں خالی نہ کر جاتے ہوں کہ ہم اُن کے گھیرے میں آئیں اور وہ ہم پر یلغار کر دیں۔

اس دوران بابر نے ایک بار پھر گھڑ سواری سیکھ لی تھی اور وہ ٹانگوں کے بغیر آسانی سے گھوڑے پر سفر کر سکتا تھا۔ ایک روز وہ میرے پاس آیا اور بولا: "سردار سرفروش! میں تمھارا آدمی بھی ہوں اور رستم کا بھی... ہم تاغانی سرزمین پر بہت آگے نکل آئے ہیں اور رستم کا خدشہ بجا ہے۔ اگر تاغانیوں نے ہمیں گھیر لیا تو کیا تم اُن لوگوں کے خلاف لڑو گے جن سے تم ملنا اور مفاہمت کروانا چاہتے ہو؟"

مجھے بابر کی یہ بات بُری لگی۔ میں نے کہا: "کیا میں بحری تاغانیوں سے نہیں لڑا تھا؟ کیا میں نے اُنھیں تہِ تیغ نہیں کیا تھا؟ کیا میں نے اپنی عسکری چال سے فصیل سر نہیں کی تھی؟ اگر ان باتوں کا جواب اثبات میں ہے تو تمھیں اپنے سوال کا جواب مل گیا ہو گا۔"

بابر نے اپنی خود اُتارتے اور گہری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے جواب دیا: "تب تم غلام تھے سردار سرفروش! تمھیں لڑنا ہی تھا... مگر اب تم آزاد اور بہت بڑے عہدے دار ہو۔ تاغانیوں کے دیوتا ہو اور یہی بات مجھے کھٹکتی ہے۔"

"ایسا مت سوچو بابر!" میں نے کہا: "اگر تاغانیوں نے ہم پر حملے میں پہل کی تو میں آسوریوں کی طرف سے لڑوں گا۔ میں نے یہی وعدہ رستم سے کیا تھا اور یہی تم سے بھی کرتا ہوں لیکن جنگ نہیں ہونی چاہیے بابر! اگر مجھے تاغانیوں سے بات کرنے کا موقع مل گیا تو جنگ نہیں ہو گی۔ تم خود ہی بتاؤ۔ کیا تمھیں جنگ سے نفرت نہیں؟... یا تم جنگ کے حامی ہو؟"

"مجھے جنگ سے نفرت ہے سردار سرفروش! میں اپنی باقی زندگی امن و سکون سے گزارنا چاہتا ہوں لیکن اگر تم سمجھتے ہو کہ جنگ کبھی نہیں ہو گی تو تمھارا خیال غلط ہے۔ جنگیں ہوتی رہتی ہیں اور آیندہ بھی ہوتی رہیں گی۔ ورنہ نوجوانوں کا وسیلۂ رزق کیا ہو گا۔ کاش! ہمیں روزی کا کوئی اور وسیلہ میسر آ سکے۔"

اس سے پہلے کہ میں بابر کو کوئی جواب دیتا، میرے سر میں درد کی ایک اور شدید لہر اُٹھی اور میں پسینے سے شرابور ہو گیا۔

جب یہ لہر گزر گئی تو میں نے رومال سے اپنی پیشانی صاف کی۔ ڈاکٹر فریدوں کے کمپیوٹر نے مجھے کھوج لیا تھا لیکن اب میں تاغانیوں اور آسوریوں کے درمیان معاہدۂ امن کروائے بغیر واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔

بابر نے میری یہ حالت دیکھی تو بولا: "تمھاری طبیعت کچھ خراب معلوم ہوتی ہے سردار سرفروش!"

"نہیں بابر! میں کچھ تھک گیا ہوں اور سب کی طرح پریشان بھی ہوں۔ میری خواہش ہے کہ تاغانی سامنے آئیں اور صلح و امن کی بات چیت کریں۔ اُن کا یوں فرار ہونا اور سامنے نہ آنا میرے لیے سخت کوفت کا باعث بن گیا ہے۔"

دوسری صبح لشکر کی روانگی کے دو گھنٹے بعد ہم ایک پہاڑی پر چڑھے تو ہمیں نیچے ایک پیالہ نما وادی نظر آئی۔ اس وادی کے وسط میں ایک تاغانی شہر آباد تھا۔ شہر کے مرکزی چوراہے میں اُن کا پرچم لہرا رہا تھا اور اس پرچم کے قریب ہی میرا مجسمہ نصب تھا۔ شہر کے لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے اور مصروف ہی رہے۔ انھوں نے ہمیں اپنے دروازوں پر دیکھنے کے باوجود ہماری طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ رستم نے ہاتھ اُٹھا کر لشکر کو رُکنے کا اشارہ کیا، میرے قریب آیا اور ایک درّے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"یہ درّہ دیکھ رہے ہو سردار سرفروش؟ اس کے چاروں طرف چھوٹے چھوٹے پہاڑ ہیں جنھوں نے وادی کو گھیر رکھا ہے۔ ان پہاڑوں کے پیچھے لاکھوں تاغانی چھپ سکتے ہیں اور تم سے بہتر کوئی نہیں جان سکتا کہ اب ہم پہلے جیسے طاقت ور نہیں رہے۔ پہاڑوں کے طویل سفر، بحری تاغانیوں سے جنگ اور اُس کے بعد پھر طویل سفر نے ہماری طاقت بہت گھٹا دی ہے۔ تم نے روانگی سے پہلے خود ہی مردم شماری کی تھی۔ ہمارے پاس کتنے جنگجو جوان ہیں؟"

"صرف چالیس ہزار جوان ایسے ہیں جو جنگ لڑ سکتے ہیں۔" میں نے جواب دیا: "لیکن مجھے کہیں تاغانی لشکر دکھائی نہیں دے رہا۔"

رستم نے ایک بار پھر چاروں طرف پھیلے ہوئے پہاڑوں کا جائزہ لیا اور فیصلہ کن انداز میں بولا: "نہیں سردار سرفروش! ہم آگے نہیں بڑھیں گے۔ ہمارا لشکر یہیں پڑاؤ ڈالے گا۔ اگر تمھارے تاغانیوں کو مفاہمت مقصود ہے تو اُنھیں ہمارے پاس آنا چاہیے۔ میں اپنے آدمیوں کو وادی میں نہیں لے جاؤں گا حالانکہ یہ ہمارے

لیے اپنے اندر بڑی دلکشی رکھتی ہے۔ اگر یہ ہمارے قبضے میں ہو تو آسوری یہاں بس سکتے ہیں، جنگ کے علاوہ وسیلۂ رزق تلاش کر سکتے ہیں اور ایک بار پھر طاقت ور بن سکتے ہیں۔" میں اس دوران اُس کے چہرے کے تاثرات پڑھتا رہا تھا۔ میں نے کہا: "اگرچہ تم آسوری نہیں ہو کمان دار لیکن تمھاری سوچ آسوریوں جیسی ہی ہے۔"

"تم جانتے ہو کہ میں آسوری نہیں بلکہ کاوسا ہوں اور مجھے اپنے کاوسا ہونے پر فخر ہے لیکن اب آسوری میری قوم ہے۔ میں نے اُن کے سربراہ کو قتل کیا ہے اور اُن کی ذمے داریاں مجھ پر عائد ہوتی ہیں جن سے عہدہ برآ ہونے کی میں ہر ممکن کوشش کروں گا۔"

"تو پھر ذرا اپنے غصّے پر قابو رکھو۔" میں نے اُس کا شانہ تھپکتے ہوئے کہا: "تمھارا خیال ٹھیک تھا۔ یہ پہاڑ اپنے پیچھے بہت کچھ چھپائے ہوئے ہیں مگر تم جلد بازی میں کوئی اقدام نہیں کرو گے۔ تم صرف اُن سے مفاہمت کی بات چیت کرنے کے لیے مجھے تنہا وادی میں جانے کی اجازت دے دو۔"

دراصل میں نے دُور سے آنے والی قرنا کی آواز سُن لی تھی جو پہاڑیوں کے پیچھے پھونکی جا رہی تھی۔ اس لیے مجھے خطرہ تھا کہ کہیں واقعی بات بگڑ نہ جائے۔

رستم کچھ سوچنے لگا... پھر اُس نے بھی میری نگاہوں کا تعاقب کرتے ہوئے پہاڑوں کی طرف دیکھا جہاں تین اطراف سے تاغانی لشکری نمودار ہو رہے تھے۔

"میں نے تمھیں پہلے ہی بتا دیا تھا سردار سرفروش! دیکھو! وہ کتنی بڑی تعداد میں ہیں۔ اگر جنگ ہوئی تو وہ ہمیں تہس نہس کر دیں گے۔" تاغانی لشکریوں کی ان گنت نفری دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ اُنھوں نے جنگ لڑنے کے لیے جان بوجھ کر اس مقام کا انتخاب کیا ہے اور وہ یہی چاہتے تھے کہ آسوری ایک بار یہاں تک آ جائیں تو پھر اُنھیں بچ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں مل سکے گا۔

ہم اَن گنت تاغانیوں کے نرغے میں آ چکے تھے اور ہمارے لیے فرار کا کوئی راستہ باقی نہیں رہا تھا۔ اتنے میں ہمیں شہر کی طرف سے ایک گھڑ سوار اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔

سب کی نگاہیں اُس پر مرتکز ہو گئیں۔

"ابھی کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے کمان دار! سب کو بتا دو کہ وہ سکون اور خاموشی سے اپنی اپنی جگہ کھڑے رہیں۔ میرا خیال ہے کہ میں آنے والے کو جانتا ہوں۔ میں تنہا اُس سے بات کروں گا۔ ممکن ہے کہ اس کے بعد جنگ کی نوبت ہی نہ آئے۔" میں نے کہا۔

رستم نے میری بات پر عمل کرتے ہوئے اپنے افسروں کو ضروری ہدایات دے دیں۔

گھڑ سوار نے قریب آ کر سفید جھنڈا لہرایا اور اپنے سر سے خود اُتار دی۔ میں اُسے پہچان گیا۔ وہ لالی کا سپہ سالار آزدر تھا۔

"میں اس شخص کو جانتا ہوں۔ یہ ملکہ ہوشی کا سورما ہے۔" میں نے رستم سے کہا۔

"جاؤ۔ اُس سے بات کرو... مگر بات کر کے فوراً واپس آ جانا اور تم نے مجھے جو قول دیا ہے، اُسے پورا کرنا۔"

"قولِ مرداں جان دارد کمان دار۔ میں ضرور آؤں گا۔" میں نے جواب دیا اور اپنا گھوڑا درّے کی طرف دوڑا دیا، جہاں آزدر کھڑا تھا۔

اُس نے مجھے اپنی طرف آتے دیکھ کر مسرت سے ہاتھ ہلایا اور جب میں قریب پہنچا تو وہ بولا۔

"خوش آمدید سردار سرفروش! ہم تو سمجھے تھے کہ تم مر چکے ہو لیکن کچھ عرصہ پہلے ہمارے ایک جاسوس نے تمھیں دیکھا اور آ کر بتایا کہ جس آدمی کے مجسمے ہر شہر اور ہر گاؤں میں ایستادہ ہیں، وہ تو آسوری لشکر کے ساتھ آ رہا ہے۔"

"میں نے اپنے مجسمے دیکھے ہیں آزدر!" میں نے مسکراتے ہوئے کہا: "کیا یہ واقعی ملکہ ہوشی کے حکم پر نصب کیے گئے ہیں؟"

"ہاں... تم آسوریوں کے ہاتھوں گرفتار ہوئے تو دُنیا کی ساری خوشیاں اُس سے رُوٹھ گئیں۔ حد تو یہ ہے کہ میں نے آسوریوں کو ہمیشہ کے لیے صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کا جو یہ شاندار منصوبہ بنایا ہے اُس سے بھی ملکہ کو کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ میرا خیال ہے اگر ہمارے جاسوس تمھیں ہمارا پیغام نہ پہنچاتے تو تم اُنھیں یہاں نہ لاتے اور آسوری لشکر اتنی آسانی سے ہمارے جال میں ہرگز نہ پھنستا۔"

"مجھے تمھارا کوئی پیغام نہیں ملا آزدر! میں ہی اُنھیں یہاں لایا ہوں... مگر جنگ کے لیے نہیں بلکہ معاہدۂ امن کرنے کے لیے۔"

...اور پھر میں نے مختصراً ساری باتیں اُسے بتا دیں۔

"کیا تمھیں یقین ہے کہ اگر معاہدۂ امن ہو گیا تو رستم اس پر عمل کرے گا؟" آزدر نے پوچھا۔

"ہاں!" میں نے کہا: "جس طرح مجھے اس بات کا یقین ہے، اُسی طرح تمھیں اور ملکہ کو بھی کرنا چاہیے اور کرنا ہی پڑے گا۔"

"تم تو اُس منصوبے کو ہی گڑبڑ کر دینا چاہتے ہو سردار سرفروش جو میں نے اور ملکہ ہوشی نے بنایا ہے۔ ہم نے ایک آسوری قیدی کو جان بوجھ کر یہ موقع دیا تھا کہ وہ ہمارے خفیہ اجلاس کی باتیں سُنے۔

اس جلسے میں ہم نے جھوٹ موٹ رو نا رویا تھا کہ ہمارے پاس اتنا لشکر نہیں ہے جو مشرق میں فصیل کی حفاظت کر سکے۔ ہم نے دیوار کے انتظام پر رہنے والے تاغانیوں کو کمزور اور بزدل کہا تھا اور پھر اس آسوری کو فرار ہو جانے کا موقع دیا تاکہ وہ خادِ اعظم تیتور کو یہ باتیں بتا کر اسے یہاں آنے پر اکسائے۔ ہماری اس چال کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا۔ آج جب آسوری وہاں آ چکے ہیں جہاں سے کوئی زندہ بچ کر نہیں جا سکتا تو تم کہتے ہو کہ ہم صلح اور امن کا معاہدہ کر لیں۔"

آزدر کے اس انکشاف پر مجھے ہنسی آ گئی۔ اس کا تو یہی مطلب تھا کہ خادِ اعظم نے دیوتا اوبلی کی بشارت کا محض ڈھونگ رچایا تھا ورنہ یہ باتیں اُسے معزور قیدی سے معلوم ہوئی تھیں اور وہ ملکہ ہوشی اور آزدر کی چال میں آ گیا تھا... مگر اب صورتِ حال بدل چکی تھی۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ تم لوگوں نے بڑا اچھا منصوبہ بنایا اور خادِ اعظم تمہاری چال میں بھی آ گیا تھا لیکن اب اس پر عمل کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔ میں اپنی جان کی بازی لگا کر رستم کو یہاں لایا ہوں۔ اگر معاہدۂ امن نہ ہوا اور جنگ ناگزیر ہو گئی تو میں آسوریوں کی طرف سے لڑوں گا۔ اب تم خود ہی فیصلہ کر دو کہ جنگ لڑو گے یا معاہدۂ امن کو ترجیح دو گے؟"

"اس کا فیصلہ میں نہیں کر سکتا، سردار سرفروش!" وہ بولا: "یہ اختیار صرف ملکہ کو حاصل ہے۔"

"وہ کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اسی شہر میں ہے۔" آزدر نے وادی میں واقع شہر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا: "جونہی اُسے یہ معلوم ہوا کہ تم زندہ و سلامت ہو اور آسوریوں کے ساتھ ادھر آ رہے ہو، اُس کی بے تابی بے چینی مزید بڑھ گئی۔ آؤ، میں تمہیں اس کے پاس لے چلوں۔"

"ذرا رکو۔ میں ابھی آتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے اپنا گھوڑا موڑا اور رستم کی طرف چل پڑا۔

یہ سُن کر میرے دل کی حالت عجیب سی ہو گئی تھی کہ لالی یہیں موجود ہے۔ مجھے اس کی سبز آنکھیں یاد آ گئی تھیں جن میں ڈوبنے کے بعد نکلنا محال تھا۔ مجھے اس کا خوبصورت، ترشا ترشا یا سراپا یاد آ گیا جس کی رنگت پرانے ہاتھی دانت جیسی تھی۔ مجھے اس کے ہونٹ یاد آ گئے، جو گلاب تھے لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ مجھے معاہدۂ امن کروانا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ معاہدہ امن سے پہلے ڈاکٹر فریدوں کا کمپیوٹر مجھے سالموں میں اور ان سالموں کو غیر مرئی لہروں میں تبدیل کر کے اپنے دور میں منتقل کر لے۔

جب میں نے رستم کو حقیقت سے آگاہ کیا اور ملکہ ہوشی سے ملنے کا ارادہ ظاہر کیا تو وہ بولا۔

"اتنا خیال رکھنا سردار سرفروش کہ صلح کی شرائط ایسی نہ ہوں جن سے آسوری قوم کا وقار اور عزتِ نفس مجروح ہو۔ اگر ہمیں لڑنا پڑا تو ہم ہتھیار ڈالنے کی بجائے بہادروں کی موت مرنے کو زیادہ ترجیح دیں گے۔"

جب میں وہاں سے چلا تو بابر اور لونا مارنو میری کامیابی کی دعائیں مانگ رہے تھے۔

میں آزدر کے ساتھ گھوڑا دوڑاتا ہوا شہر میں داخل ہوا تو ایک بار پھر میرے سر میں درد کی شدید لہریں اُٹھنے لگیں۔

میں بے ساختہ کہہ اُٹھا: "نہیں، ڈاکٹر فریدوں... ابھی نہیں!"

میری اس خود کلامی پر آزدر نے تعجب سے میری طرف دیکھا... مگر میں نے اُسے کوئی جواب نہ دیا۔ چند لمحوں کے بعد اس نے شہر کے سب سے اچھے مکان کے سامنے اپنے گھوڑے کی باگیں کھینچ لیں اور بولا۔

"ملکہ اسی مکان میں آپ کی منتظر ہے، سردار سرفروش!"

بہت سے تاغانی محافظ اس مکان کی حفاظت پر مامور تھے۔ میں گھوڑے سے اُتر کر مکان میں داخل ہوا تو محافظ میرے جسم پر آسوریوں کا لباس دیکھ کر متعجب ہوئے بغیر نہ رہ سکے لیکن وہ اپنے نیزوں کے اشارے سے میری رہنمائی کرتے رہے۔ میں دو راہ داریوں سے گزرنے کے بعد ایک کمرے کے دروازے پر پہنچا اور اُسے کھول کر اندر قدم رکھا تو ٹھٹک گیا۔

سامنے لالی گول بستر پر نیم دراز تھی۔ اگرچہ اسی کے چہرے پر حزن بکھرا ہوا تھا... مگر وہ مجھے پہلے سے کہیں زیادہ حسین نظر آئی۔ وہ مجھے دیکھتے ہی اُٹھ بیٹھی اور اپنی بانہیں وا کرتے ہوئے بولی۔

"اوہ سرفروش، تم آ گئے۔ اب مجھے کسی اور چیز کی تمنا نہیں رہی۔ اب مجھ سے دُور نہ جانا، سرفروش!"

میں نے اُسے کوئی جواب نہ دیا۔ بس چُپ چاپ دیکھتا رہا۔ اس کی سبز گہری آنکھوں میں میرے لیے پیار ہی پیار تھا۔

"تم مجھ سے بات کیوں نہیں کرتے، سرفروش؟"

میں نے اُس کے قریب رکھا ہوا اپنا چھوٹا سا مجسمہ اُٹھا لیا اور کہا: "تم نے تو جیتے جی مجھے دیوتا بنا دیا، لالی!"

"میں سمجھتی تھی کہ تم مر گئے ہو... مگر تم میرے دل میں زندہ تھے۔ میری آنکھیں بھی تمہیں زندہ دیکھنا چاہتی تھیں۔ اس لیے میں

نے تمہارے مجسمے بنوا لیے۔ اب اسے رکھ دو کہ یہ باعثِ تسکینِ قلب نہیں رہا۔ تم خود جو آ گئے ہو۔ میرے پاس بیٹھو نا۔"

"بیٹھنے سے پہلے مجھے تم سے بہت ضروری باتیں کرنا ہیں لالی۔"

"تو کرتے کیوں نہیں۔ وہ کون سی باتیں ہیں جو تمہیں وصال سے بھی زیادہ عزیز ہیں؟"

اس پر میں نے اسے جلدی جلدی ساری باتیں بتا دیں۔ اس نے فوراً آزدر کو بلوایا، چمڑا، قلم اور دوات منگوائی... پھر اس کی موجودگی میں معاہدۂ امن پر دستخط کرتے ہوئے بولی: "اسے رستم کے پاس لے جاؤ۔ اُسے کہو کہ وہ اپنے بارہ آدمی ساتھ لائے۔ جو معاہدۂ امن کی شرائط طے کریں گے۔ میری طرف سے تمہیں کُلی اختیار ہے۔ اگر آسوری اس وادی میں لینا چاہتے ہیں تو یہ شہر اور علاقہ انہیں دے دینا اور اب... جب تک میں خود نہ بلاؤں میرے پاس نہ تو تم آنا اور نہ ہی کوئی اور آئے... بس اب چلے جاؤ۔"

آزدر معاہدۂ امن لے کر وہاں سے چلا گیا۔ لالی نے ایک بار پھر اپنی بانہیں پھیلا دیں۔

"آؤ سرفروش! میں تمہارے لیے بہت تڑپی اور بہت ہی ترسی ہوں۔ یہ پتلا رکھ دو اور میرے قریب آ جاؤ۔"

میں اس کے قریب بیٹھ گیا۔ وہ مجسمہ ابھی میں رکھنے بھی نہیں پایا تھا کہ میرے سر میں درد کی انتہائی شدید لہر اُٹھی۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی آدم خور شیر نے میرے دماغ میں اپنا خونیں پنجہ گاڑ دیا ہو... اور پھر میں لالی کے قریب گر گیا۔

مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ اُس وقت لالی "کیا ہوا سرفروش! تمہیں کیا ہوا ہے؟" کہہ رہی تھی۔ وہ میرا سر اُٹھا کر میری آنکھوں میں دیکھ رہی تھی اور میں تڑپ رہا تھا۔

... پھر مجھے ایسے لگا جیسے میں سکڑ رہا ہوں، سمٹ کر چھوٹا ہوتا جا رہا ہوں۔ پہلے مارنو... پھر بالشتیا اور اس کے بعد انگوٹھے جتنا ہو گیا... تب ایک دھماکا سا ہوا اور میں لالی کی سبز آنکھوں میں ڈوب گیا۔

گہرائی بڑھتی چلی گئی، اتھاہ ہوتی گئی اور میں اس سبز رنگ گہرائی میں غرق ہوتا چلا گیا... پھر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں ایک اُبلتے ہوئے فوارے میں آ گرا ہوں، اُس کے پانی میں بہتا ہوا ایک نالی سے گزر رہا ہوں۔ نالی میں پانی کی رفتار تیز ہے اور ہر ساعت تیز تر ہوتی جا رہی ہے... اور ہر طرف سے ایک آواز گونج رہی ہے... "سرفروش... سرفروش... سرفروش... سر... فر... و... ش..."

آواز غائب ہوئی تو میں بھی غائب ہو گیا۔

میں کئی ہفتوں سے ساحلی ہٹ میں مسلسل آرام کر رہا تھا... مگر مسلسل بے آرام تھا۔

جب آدمی کا اپنا دل ہی دشمن ہو جائے تو پھولوں کی سیج بھی کانٹوں کا بستر بن جاتی ہے۔ میرا دل بھی میرا دشمن بن گیا تھا۔ یادوں کی یلغاروں نے میری پلکوں سے نیندیں نوچ لی تھیں اور دھڑکنیں تھیں کہ لالہ کو پکارے جاتی تھیں، جو مجھ سے رُوٹھ گئی تھی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس بے کراں اور بے نظیر دُنیا میں لاتعداد چاند چہرے اور ان گنت دہکتے مہکتے جسم ہیں جن میں سے بعض نے اپنی تمام تر شدتوں کے ساتھ مجھے چاہا تھا اور جو مجھے اب بھی مجھے محبتیں بخش سکتے تھے مگر اس کا کیا علاج کہ دل اُسی دشمنِ جاں لالہ کا طالب تھا جس نے درد کی سوغات دے کر مجھ سے مُنہ پھیر لیا تھا۔

وہ مجھ سے چھپی چھپی پھرتی تھی۔ میں اُس کے گھر جاتا تو کہلوا دیتی کہ وہ گھر پر نہیں ہے۔ میں اُسے فون کرتا تو جواب ملتا کہ وہ اپنی کسی سہیلی کے ہاں گئی ہوئی ہے۔ میں جانتا تھا کہ وہ مجھ سے ملنا نہیں چاہتی۔

اُس کی بے التفاتی ررد بن کر میرے دل میں اُتر گئی تھی۔

وہ مجھ سے شادی کرنا اور مجھے ایک ایسا شوہر دیکھنا چاہتی تھی جسے اپنی بیوی کے سوا دُنیا میں کسی بھی چیز سے دلچسپی نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ، یہ بھی جاننے کی آرزومند تھی کہ میں اچانک ہی کہاں غائب ہو جاتا ہوں اور جب مہینوں بعد لوٹتا ہوں تو میرے جسم پر زخموں کے نئے نشانات کیوں ہوتے ہیں اور میں عالمِ خواب میں کن عورتوں کو پکارتا ہوں؟

میں اُسے یہ ساری باتیں کیسے بتا سکتا تھا۔ اس پر یہ راز کیسے ظاہر کر سکتا تھا کہ میری غیر حاضری کا سبب ماضی کا سفر ہوتا ہے۔ اُن تاریک زمانوں کا سفر جن پر تاریخ بھی بھرپور روشنی نہیں ڈال سکتی۔

بالفرضِ محال میں لالہ کو بتا بھی دیتا کہ ڈاکٹر فریدوں کا کمپیوٹر مجھے ماضی کی اُن سرزمینوں پر منتقل کر دیتا ہے جن کی تہذیبیں مر چکی ہیں اور میرے جسم کے زخم اُنہی مُردہ تہذیبوں کے درمیان جہد تھا کی نشانیاں ہیں تو وہ کیسے یقین کر لیتی کہ بہتے ہوئے لمحوں پر کمند بھی ڈالی جا سکتی ہے اور وہ واقعات جنہیں تاریخ اپنے دامن میں نہیں سمیٹ سکی میری یادداشت میں اپنے آپ کیسے سمٹ جاتے ہیں؟

میں اُسے یہ سب کچھ نہیں بتا سکتا تھا، اس لیے وہ مجھ سے رُوٹھ گئی تھی اور آقا بیدار بخت سے شادی کرنے والی تھی جو قالینوں

کا بہت بڑا تاجر تھا جس کے یورپ اور امریکا میں کئی کئی شو رُوم اور ان گنت دفاتر تھے۔ آج ہی لالہ کی ایک سہیلی گوگوش فرخی نے مجھے یہ خبر سُنائی تھی کہ کل اُس کی منگنی ہونے والی ہے۔ وہ بڑی دیر تک مجھ سے اظہارِ ہمدردی کرتی رہی اور پھر یہ کہتی ہُوئی رخصت ہوگئی کہ میں خود کو تنہا نہ سمجھوں۔ میرے ایک اشارے پر وہ خود بھی لالہ بن سکتی ہے۔

گوگوش چلی گئی مگر لالہ کی یادوں کے بھنور سے نہ نکل سکا۔ میرا جی چاہا کہ جاؤں اور اُسے بتادوں کہ مجھے کن مجبوریوں نے چُپ کا زہر پلا دیا ہے۔ میں اپنی کتابِ زیست اُس کے سامنے کھول کر رکھ دُوں۔ وہ اُسے ورق ورق پڑھتی جائے اور اُسے پتہ چلتا جائے کہ دُنیا اپنی تمام تر خوبصورتی کے باوجود کتنی خود غرض اور کتنی گھٹیا ہے۔ لوگ دوستی کے رُوپ میں دشمنی کس طرح کرتے ہیں اور اُن کی خود غرضیوں کے دائرے کتنے وسیع ہوتے ہیں۔

میں نے کسی کا کچھ نہیں بگاڑا تھا مگر مجھے قتل کی ایک واردات میں ملوث کر دیا گیا... اور میں جو مارشل آرٹس کا انسٹرکٹر تھا، لوگوں اور قانون کی نگاہوں میں قاتل بن کر رہ گیا۔ ناکردہ گناہی کی سزا میں مجھے پھانسی پر چڑھایا جاتا تھا کہ گاڑیوں کے تصادم نے مجھے موت کے مُنہ سے بچالیا۔ میں وہاں سے بھاگ اٹھا لیکن تقدیر نے مجھے ڈاکٹر فریدوں کا "آزاد زندانی" بنا دیا۔ اب وہ جب چاہتا ہے مجھے مُردہ زمانوں کی اندھیری بھول بھلیّوں میں دھکیل دیتا ہے اور جب چاہتا مجھے اسی "جیٹ ایج" میں واپس بُلا لیتا ہے۔ اُس نے مجھے سکس ملین ڈالرز مین جیسی غیر معمولی اور غیر فطری طاقت اور صلاحیت تو نہیں بخشی لیکن میرے جسم میں اسپرین کی ٹکیہ جتنا ایک بم ضرور لگا دیا ہے جو ہلاکت خیزی میں ایٹم بم سے کم نہیں۔

اُس نے کسی آپریشن کے بغیر ہی میری ذہنی استعداد اتنی بڑھا دی ہے کہ اب مجھے کوئی بات یاد رکھنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ہر بات اپنے آپ ہی میری یادداشت کے نہاں خانوں میں جمع ہوتی چلی جاتی ہے اور وہ جب چاہتا ہے ان باتوں کو میری یادداشت سے برآمد کر لیتا ہے۔ اس صُورتِ حال میں جب میری حیثیت ایک کٹھ پتلی سے زیادہ نہیں رہی، میں ایک آئیڈیل شوہر کیسے بن سکتا ہوں؟

میں سوچ کی اِنھی گھمن گھیریوں میں گھرا ہُوا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی چیخنے لگی۔ میں نے ریسیور اٹھایا تو دُوسری طرف سے ڈاکٹر فریدوں بول رہا تھا۔

"ہیلو سرفروش! کیسے ہو؟" آواز میں تشویش شامل تھی۔

"بالکل ٹھیک ہُوں جناب!" میں نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے جواب دیا۔

"میرا مطلب ہے بالکل ٹھیک ہو نا؟" اُدھر سے پُوچھا گیا۔

مجھے ڈاکٹر فریدوں کا یہ اندازِ استفسار کچھ عجیب سا لگا تو پوچھے بغیر نہ رہ سکا: "بالکل ٹھیک سے کیا مُراد ہے آپ کی؟"

"بھئی وہ... تمھاری آواز کچھ بدلی بدلی سی لگ رہی ہے۔"

"نہیں جناب۔ میری آواز بھی بالکل ٹھیک ہے۔"

"شاید اسی لیے بدلی بدلی سی لگ رہی ہے کہ تم سے بات کیے بہت دن ہو گئے ہیں۔"

"بہت دن!" میں نے تعجب سے دُہرایا۔ "چار روز پہلے ہی تو بات ہُوئی تھی آپ سے۔"

"ہاں۔ اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تم بالکل ٹھیک ٹھاک ہو اور کوئی گڑبڑ بھی نہیں ہُوئی۔" اس بار ڈاکٹر کی آواز سے اطمینان جھلک رہا تھا۔

"کیسی گڑبڑ آقائے فریدوں؟" میں نے پوچھا۔

اِس سوال کے جواب میں خاموشی چھا گئی اور مجھے یُوں محسوس ہُوا جیسے ڈاکٹر ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر قریب کھڑے کسی شخص سے بات کر رہا ہے۔ پھر آواز آئی: "یہ مت پوچھو اور فوراً یہاں آجاؤ۔"

ڈاکٹر فریدوں نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔

میں اُلجھن میں پڑ گیا کہ ایسی کیا گڑبڑ ہو سکتی ہے جس نے ڈاکٹر کو تشویش میں مُبتلا کر دیا ہے۔

جب میں ڈاکٹر فریدوں کے کمرے میں داخل ہُوا تو سیکورٹی کا سربراہ رضا آفندی بھی وہاں موجود تھا۔ علیک سلیک کے بعد ڈاکٹر فریدوں نے مسکراتے ہُوئے میری طرف دیکھا اور رضا آفندی سے پُوچھا۔

"کیا وہ سرفروش کا ہم شکل ہوگا؟"

"صد فی صد۔" رضا آفندی نے جواب دیا۔ "وہ شکل و صورت، چال ڈھال اور عادات و اطوار میں بالکل سرفروش جیسا ہی ہوگا۔"

"مگر کون؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"تمھارا ڈپلی کیٹ۔" رضا آفندی بولا۔ "اگر اُسے تمھارے ساتھ کھڑا کر دیا جائے تو تم خود بھی شک میں پڑ جاؤ گے کہ اصلی سرفروش تم ہو یا وہ ہے۔"

"یہ کیا چکر ہے، کچھ مجھے بھی تو بتایئے۔" میں نے دونوں کی طرف تعجب سے دیکھتے ہُوئے پُوچھا۔

"ہماری سیکرٹ سروس نے اطلاع دی ہے کہ ہمارے ایک دشمن ملک نے تمھارا ڈپلی کیٹ یہاں بھیج دیا ہے اور اُسے وہاں سے چلے تقریباً دو ہفتے گزر چکے ہیں۔"

"مگر میرا ڈپلی کیٹ کیوں بھیجا گیا ہے؟"

"اس کی وضاحت تو آفندی ہی کر سکتا ہے۔" ڈاکٹر فریدوں نے کہا اور اپنا پائپ بھرنے لگا۔

سیکورٹی کے چیف نے چند لمحوں تک گہری نگاہ سے میری طرف دیکھا۔۔ پھر گہری متانت سے بولا: "یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ ہر ملک میں انٹیلی جینس اور سیکرٹ سروس ڈپارٹمنٹ ہوتے ہیں لیکن ایک خاص محکمہ ہر اس ملک کی اہم شخصیات کے ڈپلی کیٹ تیار رکھتا ہے، جہاں اُسے جاسُوسی کرنا مقصُود ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ رُوس میں یہ محکمہ ٹوئن کہلاتا ہے، جرمنی میں ڈوپلی گینگر اور برطانیہ میں جیمینی کوڈ۔" اتنا کہہ کر رضا آفندی دَم لینے کے لیے رُکا۔

میں نے فوراً یہ سوال داغ دیا: "جاسُوسی تو ویسے بھی کی جا سکتی ہے۔ سی۔آئی۔اے کے افراد دُنیا کے تقریباً ہر مُلک میں اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہُوئے ہیں۔ پھر ڈپلی کیٹ تیار کرنے کا خصوصی مقصد کیا ہے؟"

"جہاں جاسُوسی تنظیموں کے نمائندے کسی خاص منصُوبے کا کھوج لگانے میں ناکام ہو جاتے ہیں، وہاں ڈپلی کیٹ استعمال کیے جاتے ہیں۔" رضا آفندی نے وضاحت کی۔ "بعض اوقات ان ڈپلی کیٹس کو سالہا سال تربیت دی جاتی ہے مگر اُن سے کام لینے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ یہ ڈپلی کیٹ اصل شخصیتوں سے صد فی صد مشابہت رکھتے ہیں۔ انھیں اصل شخصیتوں کے حالاتِ زندگی اور ان کی تمام تر سرگرمیوں سے بھی پُوری طرح باخبر رکھا جاتا ہے اور جب اُنھیں کسی مشن پر بھیجا جاتا ہے تو وہ مشن اُنھیں ہر قیمت پر پُورا کرنا پڑتا ہے ورنہ ناکامی کی صُورت میں انھیں خود اپنے ہی آدمی موت کے گھاٹ اُتار دیتے ہیں اس لیے یہ ڈپلی کیٹ جب کسی خطرناک صُورتِ حال سے دوچار ہو جاتے ہیں تو اس ملک کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا کر ہنستے ہنستے موت کو گلے لگا لیتے ہیں، جہاں انھیں بھیجا جاتا ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے جناب!... لیکن میرا ڈپلی کیٹ کیوں بھیجا گیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تفصیل تو اُسی وقت معلوم ہو سکتی ہے جب نقلی سرفروش زندہ و سلامت گرفتار کر لیا جائے لیکن اس کی آمد سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ہمارے دشمنوں کو ڈاکٹر فریدوں کے منصُوبے اور اس میں تمھارے کردار کا کسی حد تک علم ہو چکا ہے۔ اُس کے نمایندے پُوری طرح اس منصُوبے اور اس میں تمھاری اہمیت کا کھوج نہیں لگا سکے۔ اس لیے اُنھوں نے تمھارا ڈپلی کیٹ یہاں بھیج دیا ہے تاکہ تمھیں راستے سے ہٹانے کے بعد وہ تمھاری جگہ لے کر حقیقتِ حال معلوم کر سکے۔"

رضا آفندی کی بات ختم ہوتے ہی ڈاکٹر فریدوں بول اُٹھا۔ "اسی لیے میں نے یہ پُوچھنے پر اصرار کیا تھا کہ تم بالکل ٹھیک ٹھاک ہو۔ میں خوف زدہ تھا کہ کہیں اُس ڈپلی کیٹ نے تمھاری جگہ نہ لے لی ہو۔"

اب ساری بات میری سمجھ میں آگئی تھی۔

"میرے لیے کیا ہدایات ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"تمھاری ہٹ کے اردگرد سیکورٹی کے جوان متعین کر دیے گئے ہیں۔" رضا آفندی بولا۔ "اوّل تو تم اگلی ہدایات تک کہیں آؤ جاؤ ہی نہیں اور اگر آنا جانا ناگزیر ہو تو پھر چار محافظ تمھارے ساتھ ساتھ رہیں گے۔"

"یہ پابندی کب تک رہے گی؟" میں نے پوچھا۔

"کل تک۔" رضا آفندی کی بجائے ڈاکٹر فریدوں بولا۔ "میں نے کمپیوٹر سیٹ کرنا شرُوع کر دیا ہے۔ میں چاہتا ہُوں کہ ایک بار پھر جلد از جلد تمھیں ماضی میں بھیج دُوں تاکہ تمھارا ڈپلی کیٹ تمھاری جگہ نہ لے سکے۔"

میں خاموش ہو گیا۔ اس نئی مصیبت کا سیدھا سا مطلب یہ تھا کہ اب یہ سرزمین بھی میرے لیے محفوظ نہیں رہی۔ گویا میں پُوری دُنیا میں واحد آدمی تھا جس کے لیے پُوری کائنات میں خطرے ہی خطرے بکھرے ہُوئے تھے۔

واپسی پر سیکورٹی گارڈ کے چار جوان میرے ساتھ تھے۔

مجھے اپنی ہٹ میں آئے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ ہُوا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی پھر چیخنے لگی۔

میں نے ریسیور اُٹھایا تو دُوسری طرف سے لالہ کی آواز سنائی دی۔ وہ سسکیاں لے رہی تھی۔

"سرفروش... یہ تم ہو نا؟" اس نے ہانپتی ہُوئی آواز میں کہا۔

"ہاں لالہ... مگر تم رو کیوں رہی ہو؟" اس کی سسکیوں نے میرے دل میں درد بھر دیا تھا۔ "خُدا کے لیے جلدی بتاؤ لالہ... کیا بات ہے؟"

"میں تم سے مِلنا چاہتی ہُوں سرفروش۔" اُس نے رندھی ہُوئی آواز میں کہا۔

"میں تو خود تمھاری تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہوں... مگر تم خود ہی مجھ سے اجتناب برتتی رہی ہو۔ گھر میں ہوتی تھیں

تو کہلوا دیتی تھیں کہ کہیں گئی ہو؟ اب جلدی سے آجاؤ۔ میں تمھارا منتظر ہوں۔" میرے لہجے میں خود بخود استدعا پیدا ہو گئی۔

"میں نہیں آسکتی، سرفروش!" وہ رو پڑی۔ "تمھیں آنا پڑے گا۔ ابھی اور اسی وقت میرے گھر آجاؤ۔"

"مگر میرا آنا مشکل ہے۔ میں مجبور ہوں۔"

"نہیں نہیں سرفروش! خدا کے لیے فوراً آجاؤ۔ یہ میری تم سے آخری التجا ہے۔ اگر تم نہ آئے تو تمھیں میری لاش پر آنسو بہانا پڑیں گے۔" اتنا کہہ کر وہ پھر رونے لگی۔

میں تڑپ اٹھا اور سوچنے لگا کہ نہ جانے اس نے اپنے دل میں کیا سوچ رکھا ہے۔ کہیں اس نے خودکشی کا ارادہ تو نہیں کر لیا؟ ہوسکتا ہے، اس نے مجھے اشتعال دلانے کے لیے بیدار بخت سے شادی کرنے کا ڈھونگ رچایا ہو اور اب پچھتا رہی ہو... اور اس تاجر سے پیچھا چھڑانے کے لیے خودکشی کرنا چاہتی ہو۔ پھر کل ہی مجھے کمپیوٹر ماضی کی کسی اجنبی سرزمین پر بھیجنے والا ہے۔ اگر میں وہاں سے واپس نہ آسکا، اور اگر مجھے مُردہ تہذیب کے نیم وحشی انسانوں نے موت سے ہمکنار کر دیا تو لالہ کو آخری بار دیکھنے اور اس سے آخری بار ملنے کی حسرت بھی دل ہی میں رہ جائے گی۔

"اچھی بات ہے لالہ۔ میں آرہا ہوں۔" میں نے بالآخر ہامی بھر لی۔

جواب میں مجھے لالہ کے زور سے رونے کی آواز سنائی دی اور سلسلہ منقطع ہو گیا۔

آدھی رات سے کچھ پہلے جب میں اپنے چار سیکیورٹی گارڈز کے ساتھ لالہ کے گھر پہنچا تو وہ ٹیرس پر میرا انتظار کر رہی تھی۔ میں اپنے محافظوں کو گاڑی میں انتظار کرنے کا کہہ کر اُوپر چلا گیا۔

لالہ کے کمرے سے اس کے رونے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ مجھے آتے دیکھ کر ٹیرس سے اپنے کمرے میں چلی آئی تھی اور اب بے تحاشا روئے جا رہی تھی۔ میں دیوانہ وار کمرے میں داخل ہوا اور اس کی طرف لپکا۔ عین اسی وقت مجھے اپنے پیچھے دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی۔

میں نے پلٹ کر دیکھا تو مجھ پر بجلی سی گر پڑی۔

پانچ آدمی، جنھوں نے اپنے چہرے نقابوں سے چھپا رکھے تھے، سائلینسر لگے ریوالور میری اور لالہ کی طرف تانے کھڑے تھے۔ ساتھ ہی میری نظر صوفے کے پیچھے لالہ کی ماں، اس کے باپ، دو چھوٹی بہنوں اور اکلوتے بھائی پر جا پڑی جنھیں باندھ کر فرش پر ڈال دیا گیا تھا اور ان کے منہ پر ٹیپ چسپاں کر دی گئی تھی۔

ان نقاب پوشوں میں سے ایک بولا۔ "ہاتھ اُٹھا لو آقائے سرفروش... اور یاد رکھو کہ تمھاری ذرا سی بھی جنبش نہ صرف تمھیں ختم کر دے گی بلکہ ان سب کی بھی موت بن جائے گی۔"

میرے لیے اس کے حکم کی تعمیل کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ چار نقاب پوش میرے قریب آ گئے اور انھوں نے مجھے زد میں لے لیا۔

وہی نقاب پوش پھر بولا۔ "دوسرے کمرے میں چلو۔"

میں ہاتھ اُٹھائے دوسرے کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔ اب ان میں سے ایک آدمی میرے آگے اُلٹے قدموں چل رہا تھا اور باقی تینوں نے مجھے اسی طرح زد میں لے رکھا تھا۔

مجھے دوسرے کمرے میں لے جا کر درمیانی دروازہ بند کر دیا گیا۔ اتنے میں باتھ روم کا دروازہ کھلا اور ایک آدمی باہر آیا جسے دیکھتے ہی میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ آنے والا میرا ڈپلی کیٹ تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے آئینے کے سامنے کھڑا ہوں۔ مجھ میں اور اس شخص میں بال برابر بھی فرق نہیں تھا۔ البتہ اس وقت ہمارے لباس ضرور مختلف تھے لیکن اس نے جو لباس اور کوٹ پہن رکھا تھا، بالکل ویسا ہی لباس اور کوٹ میری ہٹ کی الماری میں بھی لٹکا ہوا تھا۔

میرے ڈپلی کیٹ نے میرے ہی لب و لہجے میں کہا۔ "حیرت سے کیا دیکھ رہے ہو دوست! ہم ایک دوسرے کے ہمزاد ہیں۔"

"لگتا تو کچھ ایسا ہی ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "مگر میں نے تمھاری محبوبہ اور اس کے عزیزوں کے ساتھ وہ سلوک نہیں کیا جو تم نے کیا ہے۔"

"تم بھی اپنے مشن کی تکمیل کے لیے ایسا ہی کرتے ہو گے دوست... خیر، میرے پاس فضول باتوں کے لیے وقت نہیں ہے۔ اگر تم اپنی اور ان لوگوں کی سلامتی چاہتے ہو تو چپ چاپ وہی کیے جاؤ جو تمھیں کہا جاتا ہے۔"

"اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں عزیز ہمزاد۔" میں نے خوش دلی سے جواب دیا۔ "لیکن یہ یاد رکھنا کہ میرے ہاتھوں انجام کو پہنچ کر تمھاری روح تک کانپ جائے گی۔"

میرے ڈپلی کیٹ نے خاموشی سے آگے بڑھ کر میرے ہاتھ میری پشت پر باندھ دیے۔ میں نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ چار لوگ بدمست افراد میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتے تھے۔ اگرچہ میرا ہمزاد اپنا

ہم پلہ ہی نظر آرہا تھا۔ لیکن اس سے نمٹنا بھی مشکل نہیں تھا۔ مجبوری یہ تھی کہ لانزا اس کے والدین اور اس کے بھائی بہن ہلاک کر دیے جاتے اور ان کا خون میری گردن پر رہتا۔

میرے ہاتھ پاؤں باندھنے کے بعد میرے ڈپلی کیٹ نے اپنی جیب سے ایک چھوٹا سا ڈبہ نکالا جس میں ایک بڑی سرنج اور کسی محلول کا ایمپول رکھا تھا۔ ایمپول میں سیاہ رنگ کا محلول تھا۔ اس نے سرنج میں وہ محلول بھر لیا... پھر سرنج کی نوک مجھے اپنے بازو میں اُترتی محسوس ہوئی۔

"ڈرو نہیں سرفروش۔ یہ زہر کا انجکشن نہیں ہے۔ اگر تمھیں مارنا مقصود ہوتا تو یہ ریوالور ہی کافی تھے۔ یہ صرف بے ہوشی کا انجکشن ہے۔" میرا ہمزاد بولا۔

...اور پھر چند ہی لمحوں میں مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں تاریک خلا میں ڈوبتا جا رہا ہوں۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں نے اپنے آپ کو ایک میز پر دراز پایا۔ میرے ہاتھ پاؤں چمڑے کے تسموں سے میز کے ساتھ جکڑ دیے گئے تھے۔ میں نے سر اُٹھا کر ادھر اُدھر دیکھا۔

یہ ایک وسیع و عریض کمرہ تھا جس کے بیچوں بیچ یہ میز پڑی ہوئی تھی۔ میرے سامنے کی دیوار میں ایک چھوٹی سی بھنوی کھڑکی تھی جس سے بڑے بڑے پتوں والے کسی درخت کی ایک شاخ نظر آرہی تھی۔ کھڑکی سے کچھ پرے ایک بند دروازہ تھا جس کے ساتھ اسٹول پر بیٹھا ہوا ایک نقاب پوش محافظ اونگھ رہا تھا۔

میں نے کھڑکی سے جھانکنے والی درخت کی شاخ کے بڑے بڑے پتے گننے شروع کر دیے تاکہ یہ اندازہ کر سکوں کہ پوری طرح ہوش میں ہوں یا نہیں۔ ہر بار پتوں کی ایک ہی تعداد نے مجھے بتا دیا کہ میں پوری طرح ہوش میں آچکا ہوں۔

اگرچہ یہاں سے فرار ناممکن محسوس ہو رہا تھا لیکن ایسے حالات سے نمٹنے کے لیے ڈاکٹر فریدوں نے میرے جسم میں اسپرین کی ٹکیہ جتنا جوہم اسٹور کر دیا تھا، میں اُسے آسانی سے استعمال کر سکتا تھا مگر اس میں خرابی یہ تھی کہ میں دشمنوں کو ملیامیٹ کرنے کے ساتھ ساتھ خود بھی فنا ہو جاتا... پھر مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ دشمنوں کی تعداد کتنی ہے۔

یہ باتیں سوچتے سوچتے مجھ پر غنودگی سی طاری ہونے لگی اور میں ایک بار پھر بے سُدھ ہو گیا۔

جب میں دوبارہ جاگا تو میری آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ مجھ پر چار تیز روشنیاں ڈالی جا رہی تھیں۔ میں سمجھ گیا کہ مجھے نشہ آور دواؤں سے مسلسل نیم بے ہوش رکھا جا رہا ہے اور مجھ پر وہ دوا بھی آزمائی جا رہی ہے جس کے زیرِ اثر مجھ سے ہر وہ بات اگلوائی جا سکے جو میں جانتا ہوں لیکن انھیں یہ معلوم نہیں تھا کہ ڈاکٹر فریدوں نے میری مانعی استعداد بہت بڑھا دی ہے اور میں نشہ آور ادویات سے بہت کم متاثر ہوتا ہوں۔ تاہم میں نے اپنے آپ کو بے ہوش ظاہر کرنا ہی بہتر سمجھا کہ اس طرح میں اُن کے سوالات سے محفوظ رہ سکتا تھا۔

دفعتاً مجھے دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔

میں نے خیرہ کُن روشنی کی وجہ سے آنکھیں تو بند کر ہی رکھی تھیں۔ اب بالکل ہی بے ہوش بن گیا۔

چند لمحوں کے بعد کچھ لوگ میز کے قریب آئے اور اُن میں سے ایک نے میرے دل پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ غالباً ڈاکٹر تھا۔ میری دھڑکنوں کا جائزہ لینے کے بعد اس نے کہا...

"اس شخص کی صحت حیرت انگیز حد تک بہت اچھی ہے۔"

اس کے بعد اُنھوں نے میرے انگ انگ کی پیمائش لی۔ میرے جسم پر لگے ہوئے زخموں کے نشانات ناپے اور ان کی تفصیل لکھی جاتی رہی۔ میرا خیال تھا کہ اس کارروائی کے بعد وہ مجھے پھر نشے کا انجکشن دیں گے... مگر اُنھوں نے ایسا نہیں کیا اور چلے گئے۔ تب نہ جانے کب مجھے نیند آگئی۔

صبح کسی نے مجھے جھنجوڑ کر جگایا۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو وہاں دو آدمی موجود تھے۔ ایک آدمی نے ناشتے کی ٹرے اُٹھا رکھی تھی۔ اور دُوسرا ریوالور لیے ہوئے تھا۔ ناشتے کی ٹرے میرے پہلو میں رکھنے کے بعد اُس آدمی نے میرا دایاں ہاتھ آزاد کر دیا اور میں ناشتہ کرنے لگا۔

اس دوران میں، وہ دونوں خاموش رہے۔ جب میں ناشتہ ختم کر چکا تو میرا ہاتھ پھر جکڑ دیا گیا اور وہ دونوں کمرے سے چلے گئے۔

میں نے کھڑکی کی طرف دیکھا۔

باہر بارش ہو رہی تھی۔

کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور ایک دراز قد آدمی کمرے میں داخل ہوا۔ وہ بہترین سُوٹ میں ملبوس تھا لیکن چہرے پر اوڑھے ہوئے نقاب کی وجہ سے جدید جلاّد دکھائی دیتا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا میز کے قریب آیا، کچھ دیر میری طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔ "تو تم سرفروش ہو؟"

"یہ تو تم جانتے ہی ہو۔" میں نے جواب دیا۔

"بے شک میں جانتا ہوں مگر میں تمھاری زبان سے سُننا چاہتا ہوں"

میں سمجھ گیا کہ اُنھوں نے وہاں کہیں ٹیپ ریکارڈر لگا رکھا ہے جس پر ہماری گفتگو ریکارڈ کی جائے گی اس لیے وہ ہر بات کی وضاحت چاہتا ہے۔

"ہاں... مجھے اعتراف ہے کہ میں ہی سرفروش ہوں۔" میں نے کہا۔

"تم ڈاکٹر فریدوں کے آدمی ہو۔ اُس کے لیے کام کرتے ہو؟"

"ان بے تکے سوالوں سے تمھارا مقصد کیا ہے؟" میں جھلا گیا۔

"تم ہمارے بارے میں جانتے ہو اور ہم تمھارے متعلق معلومات رکھتے ہیں۔ یہ راؤنڈ تم لوگ جیت گئے ہو، لہٰذا سیدھی سیدھی بات کرو تم چاہتے کیا ہو... اور ہاں میں باتھ رُوم بھی جانا چاہتا ہوں۔"

"تمھیں باتھ رُوم جانے کی اجازت ضرور دی جائے گی... مگر ابھی نہیں۔ تھوڑی دیر میں ہم تمھیں پھر ایک انجکشن دیں گے اگر تمھارے ذہن پر کوئی بوجھ نہ ہے۔ یہ خیال بھی اپنے دماغ سے نکال دو کہ ہم تمھارے ساتھ کوئی تشدد کریں گے۔ یہ انجکشن تمھیں اس لیے دیا جائے گا تاکہ تم ہر سوال کا سچ سچ جواب دے دو۔ ورنہ ممکن ہے تم جھوٹ ہی بولتے رہو۔ اس طرح بہت وقت ضائع ہونے کا اندیشہ ہے۔"

"تمھارا خیال بالکل درست ہے۔" میں نے کہا۔ "ہوش کی حالت میں تم مجھ سے کچھ نہیں اُگلوا سکتے لیکن پہلے میرا باتھ رُوم جانا بہت ضروری ہے۔ میرے پیٹ میں زبردست مروڑ اُٹھ رہے ہیں۔" میں نے باتھ رُوم جانے پر اس لیے اصرار کیا تھا کہ اگر مجھے وہ ہلاکت خیز بم استعمال کرنا ہی پڑ جائے تو مجھے جائے وقوع کا اندازہ ہونا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ اس کی زد میں بے گناہ لوگ بھی آجائیں۔

وہ آدمی میری بات سُن کر دروازے پر گیا۔ وہاں اُس نے کسی سے سرگوشی کی، دروازہ کھلا اور تین آدمی اندر آگئے۔ اُن میں سے دو وہی تھے جو صبح ناشتہ لے کر آئے تھے لیکن تیسرا نیا تھا۔ دو کے ہاتھوں میں ریوالور تھے اور تیسرے نے اسٹین گن سنبھال رکھی تھی۔

میرے ہاتھ پاؤں کھول دیے گئے اور مجھے ایک کمبل اوڑھا دیا گیا۔ میں اُن مسلح نقاب پوشوں کی زد میں کمرے سے باہر آگیا۔ مجھے لے جانے میں اُنھوں نے سب سے بڑی غلطی یہ کی تھی کہ میری آنکھوں پر پٹی نہیں باندھی تھی اور میں بڑے آرام سے جائے وقوع کا جائزہ لے سکتا تھا۔

یہ ایک وسیع و عریض احاطہ تھا جس کے گرد تقریباً چھ فٹ اونچی اینٹوں کی دیوار تھی۔ ایک دیوار میں زنگ خوردہ آہنی پھاٹک تھا۔ دوسری دیوار کے ساتھ اصطبل بنا ہوا تھا جس سے گھوڑوں کی بدبو آرہی تھی۔ اصطبل کے قریب ہی بیت الخلا تھا۔

ماحول کا جائزہ لینے کے علاوہ میرے باتھ رُوم آنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ مجھے کچھ سوچنے کا موقع مل جائے۔

کمرے میں واپس آنے تک میں نے سوچ لیا کہ نشہ آور انجکشن لگنے کے بعد میں اُن کے سوالوں کے جواب میں کچھ سچ اور کچھ جھوٹ اس طرح گڈمڈ کر دوں گا کہ وہ اُلجھ کر رہ جائیں۔ وہ لوگ نہیں جانتے کہ میرے اندر نشے کے خلاف مزاحمت کی غیر معمولی قوت ہے۔ وہ مجھے بہت زیادہ مقدار میں بھی نشے کی دوا نہیں دے سکتے تھے۔ اس طرح میرا ذہن ناکارہ ہونے کا امکان تھا۔ وہ تو مجھے صرف غنودگی میں مبتلا کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ میں ذہنی طور پر تیار ہو کر آگیا کہ انھیں کس طرح غچہ دُوں گا۔

اب کمرے میں اس دراز قد آدمی کے ساتھ گٹھے ہوئے جسم کا ایک پستہ قد آدمی بھی موجود تھا۔ اس نے بھی چہرے پر نقاب چڑھا رکھا تھا اور اس کے ہاتھوں پر سفید دستانے تھے جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ڈاکٹر ہے۔ اس نے بلاتاخیر مجھے انجکشن لگایا اور مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے میں ہواؤں میں تیر رہا ہوں۔ اتنے میں آواز آئی جیسے کوئی بہت دُور سے بول رہا ہو۔

"کیا تم میری آواز سُن رہے ہو سرفروش؟"

"ہاں..." میں نے جواب دیا۔

"ہمیں معلوم ہوا ہے کہ ڈاکٹر فریدوں نے کوئی عجیب سی چیز ایجاد کی ہے اور تم اُس کے لیے آلۂ کار بنے ہوئے ہو۔"

"نہیں۔" میں نے خواب کے جزیروں میں اُڑتے ہوئے جواب دیا۔ "وہ سائنس داں ہے، میں سائنس داں نہیں ہوں۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو۔" آواز آئی۔

میں نے قہقہہ لگایا اور خلا میں ڈوبتے ہوئے جواب دیا۔ "کیا تم مجھے سائنس داں سمجھتے ہو؟"

"تمھارا انجکشن کام نہیں کر رہا ہے ڈاکٹر۔ کیا تم نے ٹھیک مقدار میں دوا استعمال کی ہے؟" مجھے اس دراز قد آدمی کی آواز بھی دُور سے آتی سنائی دی تھی۔

"ہاں... میں نے بالکل ٹھیک مقدار میں دوا استعمال کی ہے لیکن یہ ایک غیر معمولی نوجوان ہے۔ دوا اس پر ذرا دیر سے اثر انداز ہو گی۔" ڈاکٹر کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

اب مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں کسی گہری کھائی میں معلق ہوں۔

"ڈاکٹر فریدوں نے کیا ایجاد کیا ہے؟" کھائی کے اُوپر سے آواز آتی محسوس ہوئی۔

"ایک مشین" میں نے جواب دیا۔ یہ بتانا نقصان دہ ثابت نہیں ہو سکتا تھا۔

اُوپر سے قہقہے کی آواز آئی اور کوئی بولا "دیکھا۔ اب دوائی نے اثر دکھایا ہے"۔

یہ نمایاں ڈاکٹر کی آواز تھی۔ میں پھر اپنے آپ کو خلاؤں میں اُڑتا محسوس کرنے لگا۔

دُوسرے آدمی کی آواز آئی "وہ کس قسم کی مشین ہے؟"

میں نے اپنے اُڑتے اور ڈولتے ہُوئے ذہن کو قابو میں رکھنے کی کوشش کرتے ہُوئے سوچا کہ اب جھُوٹ اور سچ گڈمڈ کرنے کا وقت آگیا ہے۔

"کمپیوٹر۔" میں نے جواب دیا۔

"کیا...؟ ٹھیک ٹھیک بولنے کی کوشش کرو، سرفروش! کون سی مشین ہے، وہ؟"

"پیو ہر... پیو ہر" میں نے جان بُوجھ کر لکنت سے جواب دیا۔

"کمپیوٹر کہہ رہا ہے یہ۔" ڈاکٹر کی آواز آئی "تم سوال کیے جاؤ۔"

"میں سمجھ گیا سرفروش۔ وہ کس قسم کا کمپیوٹر ہے۔ کیا کرتا ہے؟ تمھارا اس سے کیا تعلق ہے؟" یہ دراز قد نقاب پوش کی آواز تھی۔

میں نے پھر جھُوٹ سچ کو گڈمڈ کرتے ہوئے بتایا "کمپیوٹر... دماغ کے... پر... ہر... پرچے اُڑاتا ہے... نئے مقام پر... بھیجتا ہے۔ ہزاروں سال پہلے... لڑائی ہوتی ہے... تاشیہ... لالی اور سادیہ تینوں غضب کی عورتیں تھیں اور کاؤسا... گھوڑے... گھوڑے... بہت سے گھوڑے..."

"یہ کیا بکواس کر رہا ہے ڈاکٹر؟" اندھیرے خلاؤں سے آواز آئی "کمپیوٹر کا عورتوں اور گھوڑوں سے کیا تعلق؟... یہ تو گھوڑوں اور عورتوں کی باتیں کر رہا ہے۔"

"یہ ابھی تک نشے کے خلاف مزاحمت کر رہا ہے۔ دوا سے معجزے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اسے بولنے دو۔ شاید بعد میں ان باتوں کا کوئی سلسلہ مل جائے۔" ڈاکٹر نے مشورہ دیا۔

"ہمیں کمپیوٹر کے متعلق کچھ اور بتاؤ، سرفروش۔ کیا تم اس کی کارکردگی سے خوش ہو؟ تمھیں کیا محسوس ہوتا ہے۔ بولتے جاؤ... اپنا ذہن خالی کر دو۔ جو کچھ تمھارے ذہن میں ہے اُگل دو... پھر تم ہلکے ہو جاؤ گے اور تمھیں بڑے مزے کی نیند آئے گی۔ بولو سرفروش بولو۔"

"پیوٹر... دماغ کے سائے... تار... بجلی کے جھٹکے... پھر پرواز... چٹانیں... ننگ دھڑنگ... تاشیہ... تلوار... کتے ریچھ... ملکہ رُدبا اور سُرخ شیطان... لمبی دیوار... جنگ... کھوپڑیوں کا مینار... تاشیہ... لالی..."

"یہ نری بکواس ہے جو ہمارے کسی کام نہیں آ سکتی۔" دراز قد نقاب پوش کی آواز آئی۔ "ہم خواہ مخواہ وقت برباد کر رہے ہیں۔"

"جب تم اس پر تشدد کرو گے تو یہ انھی باتوں کے حوالے سے ایک ایک راز اُگل دے گا۔"

"یہ میرا کام نہیں ہے۔ میں اُنھیں فون پر اطلاع دے دیتا ہوں۔ وہ جو چاہیں کرتے رہیں۔ آؤ، چلیں۔"

اُن کے جانے تک میں اسی طرح بے ربط باتیں کرتا رہا۔ مگر جب وہ کمرے سے نکل گئے تو میں نے سوچا کہ کہیں تشدد مجھے سچ بولنے پر واقعی مجبور نہ کر دے۔ لہٰذا اب مجھے ہلاکت خیز ٹکیہ کا بم استعمال کرنا ہی پڑے گا... اور یہ سوچتے سوچتے مجھے نیند آگئی۔

جب میری آنکھ کھُلی تو کھڑکی کے باہر کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کا یہ مطلب تھا کہ رات ہو چکی تھی۔ میں نقاہت محسوس کر رہا تھا اور مجھے متلی بھی محسوس ہو رہی تھی۔ میں اسی طرح میز سے جکڑا ہُوا تھا۔

میں نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ دروازے کے باہر ایک آدمی اسٹول پر بیٹھا اُونگھ رہا تھا۔

"سُنو... مجھے سخت متلی محسوس ہو رہی ہے۔ مجھے باتھ رُوم لے چلو یا میں یہیں قے بھی کر دُوں اور..." میں نے کہا۔

"نہیں۔" وہ کراہت سے بولا۔ "ایسی حرکت مت کرنا۔ بس ایک منٹ صبر سے کام لو۔" یہ کہہ کر اُس نے دروازے پر ٹھک ٹھک کی اور کچھ بولا۔

دروازہ کھُل گیا اور اُس کے دو ساتھی اندر آ گئے۔ ایک کے ہاتھ میں حسبِ معمول ریوالور اور دُوسرے کے ہاتھ میں اسٹین گن تھی۔ اُنھوں نے جلدی جلدی میرے ہاتھ پاؤں کھول دیے۔

میں نے کمبل اوڑھا اور اُن کے گھیرے میں باہر آ گیا۔

بارش کی وجہ سے احاطے کی زمین کیچڑ میں بدل گئی تھی۔ اندھیرے میں مجھے وہ اینٹوں والی دیوار نظر نہیں آ رہی تھی مگر مجھے اتنا پتہ تھا کہ واپسی پر وہ میرے دائیں ہاتھ ہو گی۔ اب وہ کا بم استعمال کرنے کا وقت آ گیا تھا۔

میں نے باتھ رُوم پہنچ کر قے کرنے کی کوشش کی۔ کوشش سے میری مُراد صرف آواز نکالنے سے ہے۔ میں اس طرح پہرے دار کو جُل دینا چاہتا تھا۔ دراصل میں واش بیسن پر جھُکا ہُوا اُس بلیڈ کا جائزہ لے رہا تھا جو صبح میں نے وہاں رکھا ہُوا دیکھا تھا۔ اسے یہاں رکھے رکھے شاید مدتیں گزر گئی تھیں۔ اس لیے وہ زنگ آلود تھا۔ میں نے اُسے اُٹھا کر دھویا... پھر ہاتھ صابن سے دھونے اور حلق میں اُنگلی ڈال دی۔

یہیں وہ ٹکیہ کا بم چھُپا ہُوا تھا۔ جس طرح پُرانے وقتوں میں کئی چور اپنے حلق میں گولیاں اور سکّے رکھ کر اُنھیں چھپانے کی جگہ بنایا کرتے تھے۔ بالکل اُسی تکنیک کے مطابق ڈاکٹر فریدوں کی ہدایت پر میں نے یہ مہلک ٹکیہ چھُپانے کی جگہ بنائی تھی۔

میں نے اُنگلی ڈال کر پہلے وہ ٹکیہ نکالی اور پھر سچ مچ قے کر دی۔ یہ ٹکیہ کا بم المونیم کے خول میں بند تھا اور اگر کبھی حلق سے معدے میں چلا جاتا تو بھی کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا۔ یہ صرف اس صورت میں ہلاکت خیز ثابت ہو سکتا تھا جب میں اُسے توڑ دیتا یا اس کا خول اُتار دیتا۔ خول اور ٹکیہ کے درمیان ایک ایسا سیّال بھرا ہُوا تھا جو ہَوا لگنے سے تیزابیت خارج کرتا تھا۔ میں نے بلیڈ سے اس کا خول کاٹ کر واش بیسن میں بہا دیا اور کمبل اوڑھنے لگا۔

خول اُترنے کے بعد بم کو پھٹنے کے لیے دو منٹ درکار تھے۔ بم کی یہ ٹکیہ جدید ترین ایجاد تھی اور ہلاکت آفرینی میں عام بموں سے کسی طرح کم نہیں تھی۔ مگر اس سے تابکاری اثرات نہیں پیدا ہوتے تھے۔ بس دھماکے کے بعد شعلے بڑھتے چلے جاتے تھے۔

جب میں باتھ رُوم سے باہر آیا تو اُس مخصوص بم کے پھٹنے میں ڈیڑھ منٹ باقی رہ گیا تھا۔

بوندا باندی شروع ہو گئی تھی۔

تینوں گارڈز نے مجھے اپنے گھیرے میں لے لیا۔

جب ہم احاطے کے درمیان پہنچے تو میں نے اچانک رُکتے ہُوئے کہا "وہ دیکھو... کتنا بڑا چُوہا ہے!"

اسٹین گن والے نے مجھے پیچھے سے ٹہوکا دیتے ہُوئے کہا۔ "یہاں اندھیرے میں تمھیں چُوہے کہاں سے دکھائی دے گئے۔ چلو آگے بڑھو۔" مگر میں نے آگے بڑھنے کی بجائے اپنا کمبل اس کے مُنہ پر دے مارا۔ اپنے دائیں بائیں والے محافظوں کو ایک دُوسرے سے ٹکرایا اور پھر اُنھیں اسٹین گن والے پر دھکیلتے ہُوئے بے تحاشا دائیں جانب کی دیوار کی طرف بھاگ اُٹھا۔ ٹکیہ کا بم میں کمبل پھینکنے سے پہلے ہی میں وہاں گرا چکا تھا اور اب کسی بھی لمحے وہ پھٹنے والا تھا۔

جونہی میں نے دیوار پر ایک ہاتھ رکھ کر چڑھنا چاہا۔ ایک گولی میرے بائیں جانب دیوار سے ٹکرائی اور اینٹ کا ایک ٹکڑا اُڑ کر دور جا گرا۔ مگر میں کسی بندر کی طرح دیوار پر چڑھا اور دُوسری جانب کُود گیا... پھر میں اندھا دھند اندھیرے میں دوڑتا چلا گیا۔

اچانک فضا میں دھماکے کے ساتھ روشنی پھیل گئی۔

میں نے پلٹ کر دیکھا۔

تقریباً ایک فرلانگ دُور اصطبل میں آگ کا ایک پھُول سا، رِم جھم برستی رات میں اُوپر کو اُٹھ رہا تھا۔ میں نے اپنی دوڑ جاری رکھی کہ اس روشنی میں مجھے دُور کچھ مکان دکھائی دے گئے تھے مکانوں تک پہنچنے سے پہلے ہی اُن کے مکین بھی جاگ چکے تھے اور تعجب سے اُسی طرف دیکھ رہے تھے جدھر سے میں آیا تھا۔ میں سب سے پہلے مکان میں گھُس گیا۔

مجھے لینے کے لیے آنے والی گاڑی جلد ہی اُس مکان تک پہنچ گئی اور اس نے مجھے فوراً ڈاکٹر فریدوں کے دفتر میں پہنچا دیا جہاں رضا آفندی بھی میرا منتظر تھا۔

مجھے دیکھتے ہی ڈاکٹر فریدوں کا چہرہ کھِل اُٹھا۔ وہ مسرت آمیز لہجے میں بولا "مبارک ہو سرفروش۔ تم زندہ سلامت لوٹ آئے ورنہ میں تو تمھارا ماتم کر چکا تھا۔"

"لیکن یہ تو اب بھی ماتم کناں ہی لگتے ہیں۔" میں نے رضا آفندی کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے کہا "کیا آپ کو میرے بچ جانے کی خوشی نہیں ہُوئی، جناب؟"

یہ سُن کر ڈاکٹر فریدوں نے قہقہہ لگایا اور بولا "ابھی انھیں مت چھیڑو۔ پہلے اپنی رُوداد سناؤ... پھر تمھیں ان کی خاموشی اور مُوڈ کی خرابی کا باعث بھی معلوم ہو جائے گا۔"

میں نے اُنھیں لالہ کے ٹیلی فون سے لے کر اپنی واپسی تک کی ساری داستان سُنا دی۔

ڈاکٹر فریدوں پائپ کا کش لیتے ہُوئے رضا آفندی سے بولا۔ "اب تم بھی اسے کچھ سُنا دو، رضا۔"

"برخوردار، تمھارے عشق نے تو ہم بُڈھوں کا خانہ خراب کر دیا ہے۔" رضا آفندی بولا۔ "جب تم لالہ سے ملاقات کے لیے چلے گئے تو سکیورٹی گارڈز مزے سے کار ہی میں بیٹھے رہے۔ بیس پچیس منٹ بعد تمھارا ڈپلی کیٹ اُسی لباس میں جو تم پہنے ہُوئے تھے نیچے آیا اور اسٹیئرنگ وھیل سنبھالنے کی بجائے ایک گارڈ سے بولا کہ وہ ڈرائیو کرے اور سیدھا ڈاکٹر فریدوں کے آفس چلے۔ سیکورٹی گارڈز کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ تم نہیں بلکہ تمھارا ڈپلی کیٹ ہے۔ چنانچہ وہ اُسے یہاں لے آئے۔"

"پھر کیا ہُوا؟" میری سانس حلق میں اٹک گئی۔

"پھر میں نے تمھاری بجائے اُسے کمپیوٹر کے ذریعے گزرے ہُوئے کسی زمانے میں بھیج دیا۔" ڈاکٹر فریدوں نے انکشاف کیا اور رضا آفندی کی طرف دیکھنے لگا۔

"میں کہتا ہوں کہ ایک منٹ بھی ضائع کیے بغیر سرفروش کو اس کے پیچھے بھیج دیجیے۔" رضا نے کہا اور پھر وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "اُسے زندہ مت چھوڑنا برخوردار پہلی کوشش میں ہی اُسے قتل کر ڈالنا۔"

"اس کی کیا ضرورت ہے آقائے رضا۔" میں نے کہا۔ "ڈاکٹر فریدوں اُسے واپس ہی نہ بلائیں تو وہ اپنے آپ ہی ٹھکانے لگ جائے گا۔"

"سرفروش ٹھیک کہتا ہے آفندی۔" ڈاکٹر فریدوں نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ "وہ اس وقت تک نہیں آسکتا جب تک میں اُسے واپس نہ بلاؤں۔"

"یہ تمھاری بھول ہے فریدوں۔" رضا آفندی بولا۔ "تم خود ہی کہتے ہو کہ کمپیوٹر آدمی کو کسی بھی زمانے میں بھیج سکتا ہے۔ آدمی کو کمپیوٹر میں ڈالنے اور اس کے واپس آنے سے پہلے تمھیں بھی معلوم نہیں ہوتا کہ اس کی منزل کون سا زمانہ ہے۔ اگر آدمی کئی ہزار یا کئی سو سال پہلے کے زمانے میں پہنچ سکتا ہے تو کمپیوٹر اُسے کئی سو یا کئی ہزار سال مستقبل میں بھی بھیج سکتا ہے... اور مستقبل سائنسی ارتقا میں ہم سے بہت آگے ہوگا۔ فرض کرو کہ نقلی سرفروش ماضی کی بجائے مستقبل میں پہنچ جائے تو اُسے صرف اتنا ہی کرنا پڑے گا کہ وہ وہاں کے سائنس دانوں کو حقیقتِ حال سے آگاہ کر دے۔ وہ لوگ نہ صرف اُسے تمھارے کمپیوٹر کی مدد کے بغیر واپس بھیج دیں گے بلکہ اُسے جدید ترین ٹیکنالوجی کی بھی تھوڑی بہت تربیت دینے سے گریز نہیں کریں گے۔ اس امکان کے تحت ہمارا دشمن ملک ہمارے لیے ہی نہیں، پوری دُنیا کے لیے کتنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے، تم خود اندازہ لگا لو۔ اس لیے نقلی سرفروش کا قتل لازمی معاملہ بن گیا ہے۔"

"تمھارا مفروضہ درست بھی ہو سکتا ہے، رضا...!" ڈاکٹر فریدوں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "اس قسم کے ناقابلِ یقین مفروضوں کو سائنس حقیقت کا رُوپ دیتی آئی ہے لیکن میرے لیے مشکل یہ ہے کہ ابھی میرے تجربات مکمل نہیں ہوئے۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ کمپیوٹر سرفروش کو بھی اُسی زمانے میں منتقل کرے گا جہاں اُس نے اُس کے ڈپلی کیٹ کو بھیجا ہے۔"

"تم نے کمپیوٹر کی سیٹنگ میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ اس لیے یہ اُمید کی جا سکتی ہے کہ وہ سرفروش کو اُسی زمانے میں منتقل کرے گا جس میں ڈپلی کیٹ کو بھیجا گیا ہے۔ لہٰذا ایک منٹ کی بھی تاخیر نہ کرو اور سرفروش کو کمپیوٹر میں ڈال دو۔"

"کیا تم اس کے لیے تیار ہو سرفروش؟" ڈاکٹر فریدوں نے مجھ سے پوچھا۔

"مجھے کیا انکار ہو سکتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "لیکن لارا اور اس کے گھر والوں کا کیا ہوگا؟"

"آؤ چلیں۔ تم ان لوگوں کی فکر نہ کرو۔"

ہم تینوں ڈاکٹر فریدوں کے دفتر سے ماسٹر کمپیوٹر کے تہ خانے کی طرف چل دیے۔ سیکورٹی کے آخری مرحلے پر رضا آفندی رُک گیا اور بولا۔ "اُسے تلاش کرنا اور موت کے گھاٹ اُتارنا اب تمھارا سب سے بڑا فریضہ بن گیا ہے، برخوردار۔"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

کمپیوٹر چیمبر میں داخل ہونے سے پہلے کی تیاریوں کے دوران میں نے ڈاکٹر فریدوں سے پوچھا۔ "آپ نے میرے ڈپلی کیٹ کو کمپیوٹر میں جانے کے لیے آمادہ کیسے کر لیا تھا؟"

"آمادہ؟" ڈاکٹر زہرخند کے ساتھ بولا۔ "آمادہ میں نے نہیں بلکہ اُس نے مجھے کیا تھا اور اتنی بڑی دھمکی سے کیا تھا کہ نہ تو میں انکار کر سکا اور نہ ہی رضا آفندی کے لیے اختلاف کی گنجائش تھی۔"

"وہ کیسے؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔

"جب وہ دفتر آیا تھا تو اس نے اپنے کوٹ کے نیچے انتہائی تباہ کن بم چھپا رکھے تھے۔ اس نے کہا کہ اُسے ساری معلومات فراہم کی جائیں ورنہ وہ اس سارے پروجیکٹ کو ان بموں سے اُڑا دے گا اور جب اُسے اس پروجیکٹ کی معلومات فراہم کی گئیں تو اُسے یقین نہ آیا۔ اُس نے کہا کہ وہ سچ جھوٹ کا پتہ چلانے کے لیے کمپیوٹر میں جانا چاہتا ہے۔ وہ اُن بموں سمیت کمپیوٹر چیمبر میں جا کر بیٹھ گیا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ کمپیوٹر ان بموں کے ساتھ کیا سلوک کرے گا... مگر میں نے اللہ کا نام لے کر اُسے بھیج ہی دیا اور وہ بموں سمیت نہ جانے ماضی کے کس دور میں پہنچ چکا ہے۔"

"شاید میں بھی ماضی کے اُسی دور میں پہنچ جاؤں۔" میں نے کمپیوٹر چیمبر کی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا جو ہمیشہ مجھے موت کی یاد دلایا کرتی تھی۔

ڈاکٹر فریدوں نے حسبِ معمول میرے اعضا کے ساتھ تار باندھے اور آخر میں سوئچ دبا دیا۔ میرے رگ و پے میں بجلی کی لہریں دوڑنے لگیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں راکٹ بن گیا ہوں۔ یہ راکٹ تیزی سے بلند ہونے لگا اور چشم زدن میں تاریک خلا کا سینہ چاک کرتا چلا گیا۔ میرا دل اور دماغ پھیل گئے پھر ایک دھماکا ہوا اور کچھ بھی باقی نہ رہا۔ کچھ بھی نہیں۔ میں ذرّوں میں تقسیم ہو گیا۔

◙

جہاں کمپیوٹر نے مجھے منتقل کیا تھا، وہ ماضی کے سفر کا پہلا پڑاؤ تھا۔ حسبِ معمول میری جلد ہی میرا لباس تھی اور میں ٹھنڈی ٹھنڈی ریت پر پڑا تھا۔ اگرچہ میرے سر میں ہلکا ہلکا درد تھا مگر اس کے باوجود میں خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔

میں سوچ رہا تھا کہ کمپیوٹر نے مجھے ماضی کے کس دور میں منتقل کیا ہے اور اس بار بھی میں اپنا وجود برقرار رکھ سکوں گا یا نہیں، لیکن ان باتوں کا جواب مجھے یہاں لیٹے لیٹے نہیں مل سکتا تھا۔ یہ باتیں تو آنے والا وقت اور حالات ہی بتا سکتے ہیں۔ اس سے پہلے میری ہی سرزمین کا کوئی دشمن اجنبی سرزمین پر نہیں آیا تھا اس لیے مجھے توقع تھی کہ اس بار معاملہ پہلے سے مختلف ہوگا۔

میں نے سر اُٹھا کر ایک لمبی سانس لی تو مجھے ہوا میں نمک اور نمی کا احساس ہوا۔ ریت، نمی اور نمک کے علاوہ دُور کہیں سے آنے والی لہروں کی مسلسل آواز نے بتا دیا کہ سمندر قریب ہی ہے۔ مگر جلد ہی مجھے ایک اور آواز نے چونکا دیا۔

یہ آواز لمحہ بہ لمحہ میرے قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے اس آواز کا سُراغ لگانے کے لیے ادھر اُدھر دیکھا تو مجھے اپنا خون رگوں میں منجمد ہوتا محسوس ہونے لگا اور دہشت کی ایک لہر میری ریڑھ کی ہڈی میں اُترتی چلی گئی۔

چاروں طرف سے قوی الجثہ مکروہ صورت کیکڑے میری طرف بڑھ رہے تھے۔ ان کی پشت سیاہ اور پیٹ زرد تھے۔ وہ مجھے اپنی شیطانی آنکھوں سے گھورتے ہوئے دم بہ دم اپنا حلقہ تنگ کیے جا رہے تھے۔

میں جلدی سے اُٹھ بیٹھا اور اپنے قریب ریت میں دھنسا ہوا پتھر نکالنے لگا... کہ بچاؤ کی کوئی صورت نکل سکتی تھی تو اُس کا ذریعہ یہی پتھر ہی ہو سکتا تھا۔

وہ عجیب الخلقت کیکڑے مجھے پتھر کے اردگرد سے ریت ہٹاتے دیکھ کر رُک گئے۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے یہ خونخوار جانور سوچنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ میں نے اپنا عمل جاری رکھتے ہوئے ایک نظر پھر ماحول کا جائزہ لیا کہ اگر ان خوفناک کیکڑوں کے حصار سے نکلنے کا موقع مل جائے تو کہاں پناہ مل سکے گی؟

میرے بائیں جانب کھاڑی اور دائیں طرف بہت دُور اُبھرے ہوئے پہاڑ تھے۔ کھاڑی کے کنارے کنارے دُور تک کھمبے گڑے ہوئے تھے جن کے ساتھ انسانی پنجر لٹکے ہوئے تھے۔ ان ڈھانچوں میں سے کچھ کی ہڈیاں چمک دار تھیں اور باقی کی موسمی اثرات کے باعث مٹیالی ہو گئی تھیں۔ یہ ڈھانچے کس کے تھے اور کیوں لٹکے ہوئے تھے، یہ سوچنے کا میرے پاس وقت نہیں تھا کیونکہ وہ کیکڑے ایک بار پھر میری طرف بڑھنے لگے تھے۔

میں نے پتھر اُٹھا لیا اور کھڑا ہو گیا۔

کیکڑے ایک بار پھر ٹھٹک گئے اور مجھے گھورنے لگے۔ چند لمحے بعد اُن کا سردار جو جسامت میں کسی شکاری کتے سے کم نہیں تھا، دوبارہ میری طرف بڑھنے لگا۔ باقی کیکڑوں نے بھی اس کی تقلید کی اور میرے گرد اُن کا حلقہ تنگ تر ہونے لگا۔ میں نے فاصلے کا اندازہ لگایا، پتھر سر سے بلند کیا اور آگے بڑھ کر سردار کیکڑے پر دے مارا۔ اُس نے پیچھے ہٹنے کی کوشش ضرور کی مگر اسے دیر ہو چکی تھی۔ پتھر اس کی پشت پر گرا۔ "کڑاچ" کی آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی اس کے جسم سے خارج ہونے والے بدبودار مادے کے چھینٹے ہر طرف پھیل گئے۔ اُس کے ساتھی بھوکے بھیڑیوں کی طرح اُسی پر ٹوٹ پڑے۔ اُن کا حصار ٹوٹتے ہی میں بھاگ اُٹھا اور آہنی کھمبوں کی قطار کے ساتھ ساتھ دوڑتا چلا گیا۔

جب میں کافی دُور نکل آیا تو ایک کھمبے کے پاس رُک کر اُس سے لٹکے ہوئے انسانی پنجر کا جائزہ لینے لگا۔ یہ پنجر کسی چھوٹے قد کے آدمی کا تھا۔ مجھے کھمبے کے آس پاس نہ کپڑے کی کوئی دھجی دکھائی دی اور نہ ہی چمڑے یا لوہے کی کوئی چیز نظر آئی۔ اس کا مطلب تھا کہ مرنے والوں کو بے کفن حالت میں کھمبوں کے ساتھ باندھ دیا گیا تھا اور یہ قوی الجثہ کیکڑے انھیں چٹ کر گئے تھے... مگر میری سمجھ میں یہ بات نہ آسکی کہ آخر ان لوگوں کو ایسی اذیت ناک موت کس جرم کی پاداش میں دی گئی تھی؟

میں نے دُوسرے کھمبے کی طرف دیکھا۔ اُس پر لٹکا ہوا پنجر بھی کسی چھوٹے قد والے آدمی کا تھا اور جب میں نے پلٹ کر تیسرے ڈھانچے کو دیکھنا چاہا تو دم بخود رہ گیا۔ وہ کیکڑے میری طرف ہی بھاگے آ رہے تھے۔

میں ایک بار پھر بھاگ اُٹھا۔

ابھی میں تھوڑی ہی دُور گیا تھا کہ مجھے کسی کے رونے کی آواز سُنائی دی۔ میں ٹھٹک کر رہ گیا۔ ادھر اُدھر دیکھا مگر مجھے اپنا تعاقب کرنے والے کیکڑوں کے سوا کوئی ذی رُوح دکھائی نہ دیا تو میں نے اس آواز کو اپنا وہم سمجھ کر ایک بار پھر دوڑ لگا دی۔

دوڑتے دوڑتے میں کھمبوں کے ساتھ لٹکے ہوئے ڈھانچوں پر بھی نگاہ ڈالتا جا رہا تھا۔ وہ سب پستہ قد افراد کے ڈھانچے تھے۔

اچانک ایک آواز نے میرے دوڑتے قدموں میں زنجیریں سی ڈال دیں۔ کوئی التجا کر رہا تھا۔ "تمھیں بردق کا واسطہ ہے، مالک! مجھے بچا لو۔ میری مدد کرو، مالک!"

میں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی تو سامنے کچھ فاصلے پر ایک چھوٹا سا گولا نظر آیا۔ میں نے غور سے دیکھا تو پتہ چلا کہ کوئی آدمی ریت میں گڑا ہوا ہے۔ صرف اس کا سر ریت سے باہر ہے۔ اس آدمی نے پھر وہی التجا دُہرائی "بروق کے لیے مجھے بچالو مالک !"

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ آدم خور کیکڑے قریب آتے جا رہے تھے اور میرے سامنے ایک بے بس انسان اپنی زندگی کے لیے التجائیں کر رہا تھا۔ میں اُسے کیکڑوں کی غذا بننے کے لیے چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا تو مجھے اپنی جان بچانے کی مہلت مِل سکتی تھی، مگر میرے ضمیر نے یہ گوارا نہ کیا۔ میں دوڑتا ہُوا اس کے قریب پہنچا اور اِدھر اُدھر سے ریت ہٹانے لگا۔

وہ مسلسل التجا دُہرائے جا رہا تھا۔

"تم بھی ذرا ہلو جلو اور پاؤں پر زور ڈال کر نکلنے کی کوشش کرو" میں نے ہانپ کر کہا۔

"میں ایسا نہیں کر سکتا۔ میرے ہاتھ پاؤں بندھے ہُوئے ہیں" وہ سِسک کر بولا۔

میں نے آدم خور کیکڑوں کی طرف دیکھا۔ سب سے آگے آنے والا کیکڑا ہم سے تقریباً پچاس ساٹھ قدم کے فاصلے پر رہ گیا تھا اور ابھی وہ "زندہ مدفون" آدھا ریت میں دھنسا ہُوا تھا۔ میں یہ صورتِ حال دیکھ کر فوراً ہی کھمبے کی طرف لپکا جو صرف دس قدم کے فاصلے پر تھا۔ میں نے اُسے اکھاڑنے کی کوشش کی مگر وہ مضبوطی سے گڑا ہُوا تھا اور اس آہنی کھمبے کے ساتھ نصب چوبی تختہ اُسے اکھیڑنے میں مزاحم تھا۔ میں نے چوبی تختے میں لگے ہُوئے کڑوں میں بازو ڈال دیے اور پُوری قوت سے جھٹکے دینے لگا۔ کھمبا پہلے ڈھیلا ہُوا اور پھر ریت سے نکل آیا۔ اس دوران وہ آدمی بُری طرح چیخنے چلانے لگا تھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو پتہ چلا کہ کیکڑا اُس کے سر پر پہنچ چکا ہے اور اپنے نوکیلے پنجے سے اس کا مُنہ نوچنے والا ہے۔

میں نے کھمبے کا نیزے کی اَنی نما نچلا حصّہ تولا اور ایک ہی جست میں کیکڑے کو چھید ڈالا۔ اتنے میں دُوسرے کیکڑے بھی قریب آ گئے تھے۔ میں نے تختے کی مدد سے زخمی کیکڑا اُن کی طرف اُچھال دیا۔ وہ پہلے کی طرح اس پر ٹوٹ پڑے۔

فضا میں ایک بار پھر بدبو پھیل گئی۔

میں جلدی جلدی ریت ہٹانے لگا۔

اتنے میں ایک سیپ میرے ہاتھ لگ گئی۔ میں نے اُس سے پہلے تو اُس شخص کے ہاتھوں کو جکڑنے والے چرمی تسمے کاٹ دیے... پھر سیپ اُس کے حوالے کرتے ہُوئے کہا: "تم بھی ریت ہٹاؤ۔ یہ کیکڑے اپنے ساتھی کو چٹ کرتے ہی ہم پر ٹوٹ پڑیں گے۔"

اب وہ بھی ریت ہٹانے لگا اور بولا "یہ کیکڑے بڑے ظالم ہیں مالک!... مگر اُن لوگوں جتنے نہیں جنھوں نے مجھے یہاں گاڑا ہے۔ ہمیں جلدی کرنی چاہیے کیونکہ وہ لوگ یہ دیکھنے کے لیے آتے ہی ہوں گے کہ میں کیکڑوں کی خوراک بن گیا ہُوں یا نہیں۔"

"وہ کون لوگ ہیں ؟" میں نے پُوچھا۔

"وہ مفرور غلاموں کو ڈھونڈنے اور اُنھیں سزا دینے والے گشتی دستے کے لوگ ہیں مالک! اُن کا سربراہ بردوش ہے۔ پُورے سرما میں اس سے زیادہ ظالم کوئی نہیں مالک۔ بروق اسے غارت کرے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تم غلام ہو" میں نے کیکڑوں پر نگاہ رکھتے ہُوئے کہا۔

"میں غلام تھا مالک... مگر بھاگ نکلا کیونکہ میں غلامی کی زندگی نہیں گزارنا چاہتا تھا... پھر میں پکڑا گیا۔ اسی لیے اُنھوں نے مجھے کھمبے کے ساتھ باندھنے کی بجائے ریت میں گاڑ دیا تاکہ کیکڑے مجھے آسانی سے تلاش نہ کر سکیں اور میں زیادہ سے زیادہ دیر تک خوفِ مرگ کی اذیت سے گزرتا رہُوں۔"

"تم ریت ہٹاتے رہو۔ باتیں بعد میں کر لیں گے۔" میں نے کیکڑوں کی طرف دیکھتے ہُوئے کہا جو اس وقت تک اپنے ساتھی کو چٹ کر چکے تھے اور پھر سے ہمیں گھورنے لگے تھے۔ یہ دیکھ کر میں نے کھمبا اُٹھایا اور دُوسرا کیکڑا ہلاک کر دیا تاکہ اس کے باقی ساتھی اس پر ضیافت اُڑانے میں مصروف ہو جائیں۔ ابھی کیکڑے اپنے ساتھی کو پُوری طرح چٹ نہیں کر پائے تھے کہ میں نے اس آدمی کی بغلوں میں ہاتھ دے کر اُسے گڑھے سے نکال لیا اور اُس کے پاؤں کھول دیے... مگر بہت دیر تک ریت میں دبے رہنے کے باعث اس کی ٹانگیں شل ہو گئی تھیں۔ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا نہ رہ سکا اور دھڑام سے گر پڑا۔ اس صُورتِ حال نے مجھے ایک اور کیکڑا مارنے پر مجبُور کر دیا۔

میں پھر اُس آدمی کی طرف متوجہ ہُوا۔ وہ بھی کھمبوں سے لٹکے ہُوئے ڈھانچوں کی طرح چھوٹے قد کا تھا۔ اُس نے مجھے اپنی طرف دیکھتے پایا تو ڈر گیا۔

"ڈرو نہیں۔ اگر میں تمھیں کوئی نقصان پہنچانا چاہتا تو تمھاری مدد کیوں کرتا۔ لاؤ دوستی کا ہاتھ ملاؤ۔" یہ کہتے ہُوئے میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا... مگر اُس نے مجھ سے ہاتھ نہیں ملایا بلکہ نگاہوں سے دیکھتا رہا۔

"ہمارے ہاں دستُور ہے کہ جب دو آدمی ایک دُوسرے پر

اعتماد کرتے اور ایک دُوسرے کی مدد کرنا چاہتے ہیں تو وہ آپس میں ہاتھ ملاتے ہیں۔ میں نے تمھاری مدد کی ہے اور اس اجنبی سرزمین پر تم سے مدد چاہتا ہُوں۔ اگر تم اس کے لیے تیار ہو تو مجھ سے ہاتھ ملاؤ۔"

وہ چند لمحوں تک مجھے دیکھتا رہا پھر اُس نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہُوئے کہا: "میں تمھارا قرض چُکانے کی پُوری پُوری کوشش کروں گا مگر شرط یہ ہے کہ تم مجھے غلام نہیں بناؤ گے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پہلے میں غلام تھا مگر اب کبھی نہیں بنُوں گا۔"

"میں کسی کو غلام نہیں بناتا" میں نے نرمی سے جواب دیا "لیکن ہم میں سے کسی ایک کو سربراہی کا فرض تو انجام دینا ہی ہے۔ وہ فرض میں ہی انجام دُوں گا۔ اگر تمھیں یہ بات منظور نہ ہو تو تم اپنی راہ لو، میں اپنا راستہ خود تلاش کر لُوں گا۔"

"مجھے منظور ہے" وہ بولا "میرا نام پیلو ہے۔ پیلو تمھارا ہر حکم مانے گا مگر غلام نہیں بنے گا۔"

"میں کہہ چکا ہُوں کہ تمھیں غلام نہیں بناؤں گا۔ یہ بتاؤ کہ گشتی دستہ یہاں کب تک پہنچے گا" [illegible] "ابھی [illegible] کافی باقی ہے۔"

میں نے ایک نہ دو پُورے چار کیکڑے چھید ڈالے۔ فضا میں ناقابلِ برداشت بدبُو پھیل گئی۔ میں نے پیلو سے کہا: "کیا اب تم چل سکتے ہو؟"

"ہاں..." وہ بولا "بلکہ دوڑ سکتا ہُوں۔"

ہم نے سچ مچ وہاں سے دوڑ لگا دی اور کافی دُور نکل آئے۔ اب ہمارے سامنے دلدلی علاقہ تھا جس میں نرکل، سرکنڈے اور بڑی بڑی جھاڑیاں اُگی ہُوئی تھیں۔ پیلو نے ایک سرکنڈا توڑ کر اُسے نرم زمین میں گاڑ دیا اور اس کا سایہ دیکھتے ہُوئے بولا۔

"تھوڑی ہی دیر میں گشتی دستہ قلعے سے روانہ ہو جائے گا۔ قلعہ ان پہاڑیوں کے پیچھے ہے۔ وہاں ایک چھوٹی سی بندرگاہ بھی ہے۔ گشتی دستہ ہمیشہ اسی طرف سے گزرتا ہے، رات دُوسرے قلعے میں بسر کرتا ہے اور دُوسرے روز اسی راستے سے لوٹ آتا ہے مگر آج ایسا نہیں ہو گا۔"

"کیوں ؟" میں نے پُوچھا "آج کیوں نہیں ؟"

"اس لیے کہ جب اُنھیں میری ہڈیاں نہیں ملیں گی اور وہ خالی گڑھا دیکھیں گے تو میری تلاش شروع ہو جائے گی اور اس وقت تک جاری رہے گی جب تک کہ وہ مجھے گرفتار نہیں کر لیں گے۔ اس مرتبہ وہ مجھے کیکڑوں کی خوراک نہیں بنائیں گے بلکہ میدان میں ایک کھونٹے سے باندھ کر میرے اردگرد آگ جلا دیں گے۔ میں دھیمی دھیمی آنچ سے بھُنتا اور چیختا چلاتا رہُوں گا اور لوگ میری چیخ و پکار پر تالیاں بجاتے رہیں گے۔ میری چیخیں اُن کے لیے تفریح اور تماشا ہوں گی۔"

"ایسا نہیں ہو گا پیلو..." میں نے اس کا شانہ تھپکتے ہُوئے دلاسا دیا "میں ایک ایسی سرزمین سے آیا ہُوں جہاں لوگ اس قسم کی صُورتِ حال سے نمٹنا خوب جانتے ہیں اور اگر میں نہ نمٹ سکا تو پھر خود بھی تمھارے ساتھ سزا بھگتوں گا۔"

پیلو نے اس طرح میری طرف دیکھا جیسے اُسے میری بات کا یقین نہ آیا ہو۔

"وقت تمھیں خود ہی بتا دے گا کہ میں غلط نہیں کہتا۔ اب یہ بتاؤ کہ کپڑے اور ہتھیار کیسے اور کہاں سے حاصل کیے جا سکتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"کپڑے اور ہتھیار !" وہ زہرخند سے بولا "غلاموں کو کپڑے اور ہتھیار نہیں ملتے۔ البتہ وہ غلام کپڑے پہنتے اور ہتھیار رکھ سکتے ہیں جو لڑتے بھڑتے اور خوں ریزی کرتے ہیں۔"

"غلام لڑتے بھڑتے ہیں ؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں۔ وہ لوگوں کا دل خوش کرنے کے لیے آپس میں لڑتے ہیں اور ایک دُوسرے کو مار ڈالتے ہیں مگر تم اجنبی ہو اس لیے یہ بات نہیں سمجھ سکو گے۔"

"میں سمجھتا اور جانتا ہُوں پیلو ایسے لوگوں کو جانباز کہا جاتا ہے۔"

"تم اُنھیں کچھ بھی کہہ لو مگر وہ غلام ہی ہوتے ہیں۔ میں کوئی نوک دار پتھر تلاش کر لوں" یہ کہہ کر وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

"کیوں ؟ نوک دار پتھر کا کیا کرو گے ؟"

"گشتی دستہ یہاں سے گزرتے ہُوئے اس علاقے کو چھان ڈالتا ہے۔ کیونکہ عام طور پر غلام بھاگ کر انہی جھاڑیوں میں چھپتے ہیں اور پکڑے جاتے ہیں۔ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہم بھی پکڑے جائیں گے مگر میں دوبارہ غلام نہیں بنُوں گا۔ نوک دار پتھر سے اپنی رگیں کاٹ لُوں گا۔" یہ کہہ کر وہ پتھر تلاش کرنے لگا۔

میں سوچ میں پڑ گیا کہ اس گشتی دستے سے بچنے کے لیے ہمیں کہاں پناہ مِل سکتی ہے۔ میں نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ ایک جانب سمندر تھا اور دُوسری طرف پہاڑیاں تھیں۔

اچانک میری نگاہ کچھ گھُڑ سواروں پر جم کر رہ گئیں جو پہاڑی سے اُتر رہے تھے۔ اُن کے پیچھے پیچھے کچھ اور لوگ بھی نمودار ہُوئے جو پیدل تھے۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ گشتی دستہ ہے اور اسے ہم تک پہنچنے میں زیادہ سے زیادہ نصف گھنٹہ لگے گا۔

میری چھٹی حس تیزی سے کام کرنے لگی۔

میں نے آگے بڑھ کر ایک نرکل توڑا اور اس کا جائزہ لیا۔ وہ کھوکھلا تھا۔ میں نے اطمینان کی سانس لی اور نرکل کے سرے پر لب رکھ کر سیٹی بجانے لگا۔

پیلو نے پہلے تو تعجب سے میری طرف دیکھا پھر گشتی دستے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"تم سیٹی بجا رہے ہو۔ اُدھر دیکھو۔ موت ہماری طرف بڑھ رہی ہے۔"

"ڈرو نہیں پیلو! وہ ہمیں تلاش نہیں کر سکیں گے۔ میں نے پناہ گاہ تلاش کر لی ہے۔" میں نے اُسے خوش خبری سنائی۔

وہ اور زیادہ پریشان ہو گیا۔

"اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ تم ان جھاڑیوں میں چھپ جاؤ گے اور اُنھیں دکھائی نہیں دو گے تو یہ تمھاری بھول ہے۔ وہ ایک ایک جھاڑی کو نیزوں کی نوک سے ٹٹولتے ہیں۔"

"ہم جھاڑیوں میں نہیں، سمندر کے پانی میں چھپیں گے اور نرکل کے ٹکروں سے سانس لیتے رہیں گے۔" میں نے اُسے نرکل کا ٹکڑا منہ سے لگا کر دکھایا۔ "تم بھی اپنے لیے نرکل توڑ لو۔"

"تم نے خوب ترکیب سوچی ہے۔" وہ بولا۔ "مگر اس طرح بھی ہمیں کوئی خاص فائدہ نہیں ہو گا۔ جب وہ میری ہڈیاں نہیں دیکھیں گے تو پورے سرا میں میرے فرار کا اعلان کر دیں گے اور لوگ ہمیں شکار کرنے کے لیے نکل پڑیں گے۔ غلاموں کا شکار یہاں کے لوگوں کی دلپسند تفریح ہے۔"

"پیش از مرگ واویلا کرنے کی ضرورت نہیں۔ آؤ چلیں۔"

میں سمندر کی طرف چلنے لگا۔

پیلو نے جلدی سے نرکل توڑا اور میرے پیچھے پیچھے آنے لگا۔ سمندر کا پانی پیلو کے لیے تکلیف دہ ثابت ہوا۔ وہ اپنے ہلکے وجود کی وجہ سے بھی اوپر آ جاتا تھا۔ اس لیے میں نے پاؤں سے ٹٹول کر ایک ایسی جگہ منتخب کی جہاں نیچے چٹانیں تھیں اور ہم اُن میں پاؤں اٹکا کر بیٹھ سکتے ہیں۔ میں نے پیلو کو بتا دیا تھا۔ کہ نرکل کی نلکی سطح آب پر ایک انگل سے زیادہ نہ نکلنے پائے۔

جب گشتی دستہ قریب آنے لگا تو پیلو نے ڈبکی لگا دی اور نرکل کے ذریعے سانس لینے لگا مگر میں نے اپنی ناک اور آنکھیں باہر رکھیں تاکہ دستے کا اچھی طرح جائزہ لے لوں اور پھر ڈبکی لگاؤں۔

وہ چھ گھڑ سوار اور تقریباً پچاس پیادے تھے۔ انھوں نے چرمی وردیاں پہن رکھی تھیں۔ کسی کے پاس لمبے نیزے اور کسی کے پاس تیر کمان تھے مگر ڈھالیں سب کے پاس تھیں۔

جب وہ اور قریب آئے تو پتہ چلا کہ اُن گھڑ سواروں میں... ایک نوشباب لڑکی بھی شامل ہے اس کی سنہری زلفیں ہوا سے لہرا رہی تھیں۔ اُس نے مختصر سا چرمی لباس پہن رکھا تھا اور دوسرے سواروں کے برعکس بغیر کاٹھی کے گھوڑے پر سوار تھی۔ اگرچہ اس نے چمک دار دھات کا سینہ بند پہن رکھا تھا مگر اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ اگر اس لڑکی میں بے پناہ کشش نہ ہوتی تو میں پہلے ہی ڈبکی لگا گیا ہوتا۔

اب دستہ دلدلی ٹکڑے کی جھاڑیوں میں نیزوں کی انیاں بھونک رہا تھا۔ پیادوں کا یہ عمل رقص کے انداز میں تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ لے تال کے ساتھ اپنے دائیں بائیں نیزے بھونکتے آگے بڑھ رہے ہیں لیکن میں اُن کی حرکات زیادہ دیر تک نہ دیکھ سکا۔ میری آنکھیں پھر اُسی نوعمر حسینہ کی طرف اٹھ گئیں۔

ایک دبلا پتلا اور طوطے کی چونچ جیسی خم دار ناک والا گھڑ سوار جو اس دستے کا سرخیل معلوم ہوتا تھا، اپنا گھوڑا بڑھا کر لڑکی کے گھوڑے کے پاس لایا اور اس کی ساق سیمیں پر ہاتھ رکھ کر کچھ کہنے لگا۔

لڑکی نے بڑے غصے سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور گھوڑے کو ایڑ لگا کر کھاڑی کی طرف چلی گئی۔

گھڑ سوار کا ہاتھ پیٹی میں اُڑسے ہوئے خنجر کی طرف بڑھا۔ دوسرے ہی لمحے خنجر اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے خنجر تولا مگر پھر کچھ سوچ کر اس نے خنجر پیٹی میں اُڑس لیا اور اپنے آدمیوں کو ہدایات دینے لگا۔

میں نے یہ سوچتے ہوئے ڈبکی لگا دی کہ وہ گھڑ سوار بدمعاش ہی ہو گا۔

کافی دیر بعد جب میں نے اپنا سر پانی سے نکالا تو گشتی دستہ جا چکا تھا۔ میں نے پاؤں سے پیلو کو ٹہوکا دیا۔ اس نے بھی پانی سے سر نکال لیا اور ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا۔

"اس وقت تو بروق نے ہمیں بچا لیا۔ آگے پتہ نہیں کیا ہو گا۔"

"آگے کی آگے دیکھی جائے گی۔" میں نے کہا۔ "فی الوقت ہم جھاڑیوں میں پناہ لیں گے۔ میرا خیال ہے کہ وہ دوبارہ اس علاقے کی تلاشی نہیں لیں گے۔"

جھاڑیوں کی طرف بڑھتے ہوئے میں نے پیلو کو گھڑ سوار اور لڑکی کے بارے میں بتایا تو وہ بولا۔

"ہاں، وہ بدبخت بدمعاش ہی تھا۔ تم کہتے ہو کہ لڑکی نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا تھا، کاش میں نے بھی یہ تماشا دیکھا ہوتا۔"

"ہم جھاڑیوں میں لیٹ گئے لیکن مچھروں نے ہم پر دھاوا بول دیا۔ اس پر مستزاد یہ کہ اب بھوک بھی ستانے لگی تھی مگر وہاں کیا ملتا۔ میں نے اپنا دھیان بٹانے کے لیے پوچھا۔

"وہ سنہرے بالوں والی لڑکی کون تھی؟ کیا تم اسے جانتے ہو؟"

اس سوال پر پیلو کی بھویں تن گئیں مگر وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "میرا خیال ہے کہ میں اسے جانتا ہوں۔ اس کا نام زینا ہے۔ وہ ملکہ فیرا کی بیٹی ہے جو یہاں دیوتا بروق کے نام پر حکمرانی کرتی ہے۔ اگر زینا، برداکش کے قابو میں آجائے تو اُسے مزید اقتدار حاصل ہو جائے گا لیکن اس عالم میں جبکہ ہم ننگے، بھوکے اور نہتے ہیں، تمھارا عورتوں کے بارے میں سوچنا بہت ہی گھٹیا بات ہے۔"

مجھے پیلو کی اس بات پر غصہ تو بہت آیا مگر میں نے خود کو سنبھال کر ہنستے ہوئے کہا۔ "پہلی بات تو یہ ہے کہ میں عورتوں کے بارے میں نہیں بلکہ کھانے، ہتھیاروں اور کپڑوں کے متعلق سوچ رہا ہوں۔ دوسرے اگر میں عورتوں کے بارے میں سوچوں بھی تو تمھارا اس میں کیا جاتا ہے؟ مجھے عورتیں پسند ہیں اور جب چاہوں گا، وہ مجھے مل جائیں گی۔ تیسری بات یہ کہ مجھے کسی استاد کی ضرورت نہیں جو مجھے پند و نصائح کرتا رہے جیسے کہ تم کر رہے ہو۔ تمھارا فلسفۂ اخلاق اور پند و نصائح نہ ہمارے پیٹ بھر سکتی ہیں اور نہ ہی ہمیں زندہ رکھ سکتی ہیں۔ اگر میری باتیں تمھاری سمجھ میں آگئی ہوں تو اب مجھے نصیحت نہ کرنا اور ہاں، تم کہتے ہو کہ زینا ملکہ فیرا کی بیٹی ہے۔ اس ناتے سے وہ شہزادی ہوئی اور شہزادیاں محلوں کی شہ نشینوں میں آرام کرتی ہیں، غلاموں کو تلاش کرنے والے دستے کے ساتھ بغیر زین کے گھوڑوں پر نہیں گھومتیں۔"

پیلو کچھ دیر مجھے دیکھتا رہا، پھر دھیمے دکھ بھرے لہجے میں بولا۔ "تمھارے طنز نے میرے دل کے زخموں کو کھرچ دیا ہے، اجنبی مہربان۔ حقیقت یہ ہے کہ میں استاد ہی تھا۔ سراماسیڈ کے محل میں اتالیق کے فرائض انجام دیتا تھا اور یقین کرو کہ پورے سراما میں، میں اپنی مثال آپ تھا لیکن ایک عورت نے مجھے اس حال کو پہنچا دیا اور وہ عورت میری اپنی بیوی تھی جسے میں نے تمام رشتوں کے ساتھ چاہا تھا اور جو مجھے اپنے چھ شوہروں میں سب سے زیادہ پسند کرتی تھی مگر یہ اس کا دکھاوا تھا، جھوٹ تھا، فریب تھا۔ اس نے کسی اور کو اپنا چھٹا شوہر بنانے کے لیے میرے گلے میں طوقِ غلامی ڈال دیا۔ اسی لیے مجھے عورتوں سے نفرت ہے وہ ظالم، دغاباز..."

"بس بس میں سمجھ گیا پیلو۔" میں نے اس کا دکھ محسوس کرتے ہوئے اس کی قطع کلامی کی اور موضوعِ گفتگو بدل کر اس کا دھیان بٹانا چاہا۔ "مجھے سراما کے بارے میں بتاؤ کہ یہ کیسا ملک ہے، یہاں کے لوگ کیسے ہیں؟ اس طرح کچھ وقت بھی کٹ جائے گا اور مجھے کچھ معلومات بھی حاصل ہو جائیں گی۔"

پیلو نے اس اجنبی سرزمین کے بارے میں بولنا شروع ہی کیا تھا کہ اس طرف سے ایک گھڑسوار آتا دکھائی دیا جدھر گشتی دستہ گیا تھا۔ وہ خوف زدہ انداز میں بولا۔

"یہ پیام بر ہے۔ گشتی دستے کو پتہ چل گیا ہے کہ میں کپاڈوا کا نوالہ بننے سے بچ نکلا ہوں۔ یہ پیام بر قلعے میں اطلاع دینے جا رہا ہے۔ جلد ہی یہ خبر سراماسیڈ پہنچ جائے گی اور پھر ملک کے طول و عرض سے لوگ میری اور تمھاری تلاش میں نکل پڑیں گے۔"

"وہ سراماسیڈ کو یہ اطلاع کیسے پہنچائیں گے؟" میں نے پوچھا تاکہ اس اجنبی سرزمین کے نظامِ مواصلات کے متعلق کچھ پتہ چل سکے۔

پیلو نے پہاڑوں کی طرف اشارہ کر دیا۔

"اُدھر اس بڑے پہاڑ کی طرف دیکھو۔ وہاں تمھیں ایک اونچا کھمبا نظر آئے گا۔ قلعے سے لے کر سراماسیڈ تک تھوڑے تھوڑے فاصلے سے اسی قسم کے کھمبے گڑے ہوئے ہیں۔ جب قلعے سے سراماسیڈ والوں کو کوئی خبر دینا مقصود ہوتی ہے تو پہلے کھمبے پر خاص اقسام کے جھنڈے لہرائے جاتے ہیں۔ انھیں دیکھ کر دوسرے، تیسرے، چوتھے اور باقی کھمبوں پر جھنڈے لہرائے جاتے ہیں۔ اس طرح غروبِ آفتاب تک یہ خبر سراماسیڈ پہنچ جائے گی اور لوگ ہمارے شکار کی دل پسند تفریح کے لیے تیار ہو جائیں گے۔"

یہ سن کر میں نے دوبارہ گھڑسوار کی طرف دیکھا اور چونکا۔ یہ گھڑسوار وہی لڑکی تھی جس کا نام پیلو نے زینا بتایا تھا۔ اس کا گھوڑا تھکا ہوا تھا اس لیے آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ ابھی وہ ہم سے کافی دور تھی۔ اچانک مجھے ایک ترکیب سوجھ گئی۔ جب میں نے وہ ترکیب پیلو کو بتائی تو وہ لرز گیا اور خوف کے مارے ہکلاتے ہوئے بولا۔

"نہیں نہیں... میں... میں ایسا نہیں کر سکتا۔ آپ... آپ جان چکے ہیں کہ میں بہادر نہیں... بہت... بہت بزدل ہوں۔"

"اس میں بہادری یا بزدلی کی کوئی بات نہیں پیلو۔" میں نے درشتی سے کہا۔ "تمھیں کھاڑی کے کنارے لیٹنا اور یوں ظاہر کرنا ہے کہ تم مر چکے ہو۔ جلدی سے اٹھو اور اس طرح لڑکھڑاتے ہوئے آگے بڑھو جیسے یہاں تک آتے آتے تمھارا حال بہت برا ہو گیا ہے۔ ہمت کر کے اٹھو، چند قدم جاؤ مگر پھر چکرا کے گر پڑو اور مر

اس دوران وہ تمھیں دیکھ لے گی اور سیدھی تمھارے پاس آئے گی مگر اتنی دور مت جانا کہ میں اس پر ہاتھ نہ ڈال سکوں اور وہ میرے پہنچنے سے پہلے ہی بھاگ نکلے۔"

"تم زینا پر ہاتھ ڈالنا چاہتے ہو؟" اس نے بے حد تعجب اور خوف سے پوچھا۔ "ملکہ فیرا کی بیٹی پر... شہزادی پر؟" اور یہ کہہ کر وہ سینے پر انگلی سے کوئی نشان بنانے لگا۔

"میں کسی بری نیت سے نہیں بلکہ اپنے تحفظ کی خاطر اسے یرغمال بنانے کے لیے ہاتھ ڈالوں گا۔" میں نے وضاحت کی۔

"کچھ بھی ہو، تم اسے نہیں چھو سکتے اجنبی مہربان۔ ورنہ بروق دیوتا ہمیں نہیں بخشے گا۔ ہم بری طرح مارے جائیں گے۔ میں تمھارا کہنا نہیں مان سکتا۔" اس نے فیصلہ سنا دیا۔

مجھے اس پر بری طرح غصہ آگیا۔ میرا جی چاہا کہ میں ایک مکے سے اس کی کھوپڑی پاش پاش کر دوں مگر ناچار اپنے غصے پر قابو پا لیا اور اسے اشتعال دلانے کے لیے بولا۔

"اب مجھے پتہ چل گیا ہے کہ تم غلام کیوں بنائے گئے تھے۔ تم غلام بننے کے لیے ہی پیدا ہوئے تھے اور غلام ہی کی حیثیت سے مرو گے۔ اس لیے کہ تم بزدل ہو اور اپنی آزادی کے لیے ذرا سا خطرہ بھی مول نہیں لے سکتے۔ اب میں اکیلا ہی اسے پکڑنے کی کوشش کروں گا لیکن اگر وہ میرے قابو میں نہ آسکی اور اس نے قلعے میں خبر پہنچا دی کہ ہم یہاں ہیں تو سپاہی فوراً یہاں پہنچ جائیں گے مگر وہ مجھے گرفتار نہیں کر سکیں گے کیونکہ میں لڑتے لڑتے جان دے دوں گا۔ البتہ تم ایک بار پھر غلام بن جاؤ گے اور اذیت ناک موت مرو گے۔"

"نہیں نہیں، میں غلام نہیں بنوں گا۔" وہ روہانسی آواز میں بولا اور اس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔ "میں تمھارے کہنے پر عمل کرنے کو تیار ہوں۔"

"تو پھر آگے بڑھو۔ مگر زیادہ دور مت جانا اور مرنے کی اداکاری سلیقے سے کرنا۔ باقی سب میں سنبھال لوں گا۔"

منحنی سا پیلو خوف اور ہمت کے ملے جلے جذبات کے تحت لڑکھڑاتا ہوا دلدل سے نکلا اور کھاڑی کے کنارے کنارے چلنے لگا۔ اس کی چال میں واقعی ایسی لڑکھڑاہٹ تھی جیسے وہ بری طرح نڈھال ہو اور دم توڑنے والا ہو۔

میں نے زینا کی طرف دیکھا۔

اس کا گھوڑا تھکا ہوا تھا اور آہستہ روی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کے سنہرے بال ہوا سے اڑ کر بار بار اس کی آنکھوں پر آجاتے تھے۔ انھیں ایک ہاتھ سے ہٹا کر ایک ادا سے گردن کو ہلکا سا جھٹکا دیتی اور آگے دیکھنے لگتی تھی۔ اچانک ایک بار یہ عمل دہراتے ہوئے اس کی نگاہ پیلو پر جا پڑی۔ وہ آنکھوں پر ہاتھ کا چھجا بنا کر اسے غور سے دیکھنے لگی۔

اتنے میں پیلو چکرا کر جھولتے ہوئے گر پڑا۔

زینا نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور تیزی سے اس کی طرف بڑھنے لگی۔

میں اپنی کمین گاہ میں چھپا اس پر جھپٹنے کے لیے تیار ہو گیا۔ زینا نے پیلو کے قریب گھوڑا روکا اور چند لمحے غور سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ وہ یوں بے حس و حرکت پڑا رہا جیسے سچ مچ اللہ کو پیارا ہو چکا ہو۔ ادھر میں دل ہی دل میں دعا مانگتا رہا کہ زینا گھوڑے سے اتر کر اس کا معائنہ کرنے لگے تو مجھے جھپٹنے کا موقع مل جائے مگر میری دعا کو شرفِ قبولیت حاصل نہ ہو سکا۔

زینا گھوڑے سے اترنے کی بجائے ایک طرف جھکی اور اپنی لمبی ٹانگ بڑھا کر پنجے سے پیلو کو ٹٹولنے لگی۔

یہ دیکھ کر میں بری طرح سٹپٹا گیا۔

اب میرے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں رہا تھا کہ اسے گھوڑے کو ایڑ لگانے کا موقع نہ دوں ورنہ اس کا میری دسترس سے نکل جانا یقینی تھا چنانچہ میں اپنی کمین گاہ سے اچھلا اور تیز رفتاری سے اس کی طرف دوڑتا چلا گیا۔

جب میں اس کے قریب پہنچا تو وہ مجھے دیکھ کر دہشت زدہ ہو گئی۔ اس کے منہ سے چیخ نکلی اور اس نے لاشعوری طور پر گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ میں نے جلدی سے لپک کر اس کی ٹانگ پکڑ لی مگر وہ بھی بلا کی شہسوار تھی۔ زین اور رکابیں نہ ہونے کے باوجود وہ گھوڑے سے نہ گری بلکہ الٹا مجھ پر چابک برسانے لگی۔ ادھر گھوڑے نے بھی رفتار پکڑ لی۔ اب میں نہ اسے چھوڑ سکتا تھا اور نہ گھوڑا روک سکتا تھا۔ اوپر سے زینا مسلسل چابک برسائے جا رہی تھی۔

اچانک مجھے اپنی دنیا کے وہ کاؤ بوائز یاد آگئے جو مست بچھڑوں کو گردن سے پکڑ کر گرا دیتے ہیں۔ میں نے بھی زینا کی ٹانگ چھوڑ کر جست لگائی اور اپنی باہیں گھوڑے کی گردن میں ڈال دیں۔ گھوڑا پوری رفتار سے دوڑ رہا تھا۔ میں نے بائیں کلائی دائیں ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑ لی اور ایڑی چوٹی کا زور لگا کر گھوڑے کی گردن مروڑنے لگا۔ میں اس ہیڈ لاک کے ذریعے اپنے کئی دشمنوں کو ٹھکانے لگا چکا تھا لیکن آج اسے ایک گھوڑے پر آزما رہا تھا۔ کچھ دیر تو گھوڑا مزاحمت کرتا رہا مگر پھر میرے ایک جھٹکے اور دار نے اس کی گردن توڑ دی تو وہ منہ کے بل گر پڑا۔

زینا اس کی پیٹھ سے پھسلتی ہوئی دُور جا گری اور بے ہوش ہوگئی۔
مَیں نے بے ہوش زینا کی دھڑکنیں سنیں اور نبض دیکھی۔ دونوں ٹھیک تھیں۔ وہ صرف خوف و دہشت سے بے ہوش ہوگئی تھی۔
اتنے میں پیلو بھی وہاں آگیا۔

"کیا یہ مر گئی ہے؟"

"نہیں" میں نے جواب دیا۔ "تم اس کی فکر نہ کرو اور گھوڑے کو اُٹھاؤ۔"

"وہ تو جانکنی کے عالم میں ہے۔ تم نے اس کی گردن توڑ دی ہے۔"

"اوہ... پھر تو یہ ہماری بدقسمتی ہے پیلو۔ اب ہمیں پیدل ہی چلنا پڑے گا۔ خیر، تم زینا کا خیال رکھو۔ میں گھوڑے کو جانکنی کے عذاب سے نجات دلانے کی کوئی تدبیر کرتا ہوں۔"

"نہیں نہیں!" وہ بولا۔ "یہ شہزادی زینا ہے۔ میں اسے پڑھایا کرتا تھا۔ میں اُسے نہ چھو سکتا ہوں اور نہ ہی اس کا کوئی حکم ٹال سکتا ہوں۔ اس لیے مجھے اس کی خبر گیری پر مامور نہ کرو۔"

"اس کا مطلب ہے کہ سارے کام مجھے ہی کرنا پڑیں گے۔ تم ہر معاملے کو اُلجھا دیتے ہو پیلو! خیر اس سلسلے میں پھر کبھی بات کریں گے۔"
یہ کہہ کر میں آگے بڑھ گیا۔

میں نے ایک بڑا پتھر تلاش کیا اور اُسے اُٹھا کر گھوڑے کے پاس لے آیا جو جانکنی کے عذاب میں مبتلا تھا۔ میں نے بڑے دُکھ کے ساتھ وہ پتھر گھوڑے کے سر پر دے مارا۔ گھوڑا ایک جھٹکا کھا کر ٹھنڈا ہو گیا۔

میں نے اس کی لگام نکالی اور زینا کے پاس آگیا۔ جو ابھی تک بے ہوش پڑی تھی اور پیلو کچھ دور گھٹنوں کے بل لیٹا اپنے کسی دیوتا سے دُعا مانگ رہا تھا۔

میں نے لگام کے ٹکڑوں سے زینا کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے اور اس کا سر سہلانے لگا۔ چند لمحوں کے بعد زینا نے آنکھیں کھول دیں اور مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے پہلی بار محسوس کیا کہ اس کی خوبصورت غلافی آنکھوں میں بے پناہ کشش ہے۔

زینا نے سر سے پیروں تک میرا جائزہ لیا تو مجھے ندامت سی محسوس ہونے لگی کیونکہ کمپیوٹر سے یہاں آنے کے بعد ابھی تک مجھے لباس میسر نہیں آیا تھا... لیکن یہ دیکھ کر مجھے بڑا تعجب ہوا کہ اس کی اپنا بنا لینے والی آنکھوں میں نفرت کا ہلکا سا عکس بھی نہیں تھا۔
جب وہ کچھ نہ بولی اور خاموشی سے میری طرف دیکھتی ہی رہی تو میں نے کہا۔

"شہزادی زینا! مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ میں تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ دراصل مجھے تمھارا گھوڑا درکار تھا جو مر چکا ہے لیکن اب گھوڑے سے زیادہ مجھے تمھاری ضرورت ہے۔"

"تم کون ہو اور تمھیں سراما کی شہزادی پہ ہاتھ ڈالنے کی جرأت کیسے ہوئی؟" اس کا لہجہ تیکھا تھا۔

"میرا نام سرفرڈش ہے شہزادی اور میں یہاں اپنی مرضی سے نہیں آیا۔ میں تمھیں یرغمال بنانے پر مجبور ہوں اور اس کی وضاحت بعد میں کروں گا۔ فی الوقت ہمیں یہاں سے چل دینا چاہیے۔"

"تمھیں میرا نام کیسے معلوم ہوا؟" اس نے نرمی سے پوچھا۔

"اس ٹھگنو میاں نے بتایا تھا۔ یہ کہتا ہے کہ اس نے تمھیں پڑھایا تھا۔ کیا یہ سچ ہے؟"

زینا نے ایک نظر پیلو کی طرف دیکھا اور ہنستے ہوئے بولی۔

"ہاں، یہ ٹھیک کہتا ہے۔ اب میں اسے پہچان گئی ہوں۔ میرے سارے اتالیقوں میں، یہ سب سے زیادہ بولتا تھا۔" پھر اس نے بھویں سکیڑتے ہوئے بات جاری رکھی۔ "مگر اب یہ بھی تمھارے ساتھ سزا بھگتے گا۔"

یہ سن کر پیلو کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

میں نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "جب وہ وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا۔ فی الحال تو کچھ عرصے تم ہماری مہمان رہو گی شہزادی۔" یہ کہتے ہوئے میری نگاہیں زینا کی آنکھوں سے ٹکرائیں۔ اس کی آنکھوں میں مجھے وہ تحریر دکھائی دی جو خواتین محبت سے قبل اپنی پتلیوں میں طغروں کی طرح سجا لیتی ہیں۔ میں نے کچھ کہے بغیر زینا کو کندھے پر اُٹھا لیا۔ وہ ایک لفظ بھی نہ بولی۔

"اب تم رہبری کا فرض ادا کرو گے چھوٹو میاں۔" میں نے پیلو سے کہا۔ "ہمیں جھاڑیوں کی اوٹ میں پہاڑ تک لے چلو، مگر راستے میں ایک اُستاد کے ذہن سے سوچتے جانا کہ ہمیں خوراک، کپڑوں اور ہتھیاروں کی اشد ضرورت ہے۔ یہ چیزیں کیسے اور کہاں سے حاصل ہوں گی، جب اس سوال کا جواب سوچ لو تو مجھے بتا دینا۔"

پیلو نے مُردہ گھوڑے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
"وہ اسے دیکھ کر ہمارے تعاقب میں ضرور آئیں گے۔"

"ہاں، مگر وہ دستہ یہاں سے کب گزرے گا؟" میں نے پوچھا۔

"کل... لیکن اس کی آمد سے پہلے شہزادی کی تلاش بھی انھیں ہمارے تعاقب میں بھیج سکتی ہے۔"

"دیکھا جائے گا۔ تم آگے بڑھو۔"

ہم کافی دیر تک دلدلی علاقے میں سفر کرتے رہے جہاں خود رو جھاڑیوں، سرکنڈوں اور کیڑے مکوڑوں کی بہتات تھی۔ کئی بار ہمیں سانپ بھی رینگتے نظر آئے مگر پہاڑ اب بھی کافی دُور تھے۔

دن ڈھلے ہم ایک جھیل پر پہنچے جس کے اردگرد خاردار جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ میں نے ایک ایسی جگہ رات گزارنے کے لیے منتخب کی جہاں دو چٹانیں کمان کی طرح اُوپر مل ہوئی تھیں اور نیچے غار سی بن گئی تھی۔ یہاں میں نے زینا کو کندھے سے اُتار دیا۔

"کیا تم میرے بندھن ڈھیلے کر سکتے ہو سرفرڈش؟ مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔" وہ کراہ کر بولی۔

"کیا میں یہ اعتماد کر سکتا ہوں شہزادی کہ تم فرار ہونے کی کوشش نہیں کرو گی؟" میں نے پوچھا۔

اُس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "میں تمھیں قول دیتی ہوں کہ بھاگوں گی نہیں... اور میں جا بھی کہاں سکتی ہوں؟"

میں بھی اُسے جکڑبندی سے آزاد کر کے دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کیا کرتی ہے اور اب اس کا ردِعمل کیسا رہتا ہے۔ کیا اُس کی آنکھوں کی وہ تحریر سچ تھی یا اُنھوں نے مجھے جھوٹا پیغام دیا تھا؟ جب میں اُس کے پاؤں کھولنے لگا تو وہ اس طرح آہستہ سے بولی کہ پیلو نہ سن سکے۔

"تم بہت عجیب ہو، سرفرڈش۔ مجھے تمھاری اس بات پر یقین آگیا ہے کہ مجھے نقصان نہیں پہنچاؤ گے۔ میں نے تم جیسا شخص پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ میں تم سے بہت سی باتیں پوچھنا چاہتی ہوں۔ اس لیے میں یہاں سے نہیں بھاگوں گی۔ ویسے بھی مجھے ڈر لگتا ہے کہ رات کو اس بیابان میں درندے نکل آتے ہوں گے۔"

میں نے کچھ سرکنڈے جمع کیے اور جھاڑو بنا کر وہ جگہ صاف کرنے لگا۔ جہاں ہمیں رات گزارنا تھی۔ پیلو کچھ کہے بغیر وہاں سے چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھوں میں چقماق کے دو چھوٹے بڑے ٹکڑے تھے۔ جنھیں وہ جھیل کنارے سے ڈھونڈ لایا تھا۔

بڑے ٹکڑے سے اُس نے چاقو کا کام لیتے ہوئے ایک سوکھے درخت کی چھال اُتاری اور اسے ایک جگہ جمع کر کے الاؤ جلا دیا۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ وہ چقماق کے دو ٹکڑے کیوں لایا تھا۔ اس دوران میں نے سوکھے درخت کی کچھ شاخیں توڑ لیں تاکہ الاؤ رات بھر روشن رکھا جا سکے۔ زینا چپ چاپ بیٹھی یہ تماشا دیکھتی رہی۔

لکڑیاں لانے کے بعد میں نے پیلو کا شانہ تھپکتے ہوئے کہا۔ "تم تو بڑے کام کے آدمی نکلے یار۔ اب پیٹ بھرنے کا کوئی سامان کر سکو تو مزا آجائے۔"

"میں کوشش کرتا ہوں کہ کوئی شکار ہاتھ لگ جائے۔ میں نے سنا ہے کہ اس جھیل میں ایسی مچھلیاں بھی ہیں جو رات کو پانی سے باہر آجاتی ہیں۔" یہ کہہ کر وہ وہاں سے چل دیا۔

میں نے ایک نظر زینا پر ڈالی جو میری طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں بالکل ویسی چمک دیکھی جو اکثر مجھے لالہ کی آنکھوں میں دکھائی دیتی تھی لیکن میں اس سلسلے میں پہل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں اپنا دھیان بٹانے کے لیے ڈاکٹر فریدون اور رضا آفندی کے بارے میں سوچنے لگا۔ پھر میرے خیالات کا دھارا اپنے ڈبل کیٹ کی طرف مُڑ گیا جسے مجھ سے پہلے کمپیوٹر نے منتقل کر دیا تھا... خدا جانے وہ بھی سراما ہی میں وارد ہوا تھا یا اس کے سالمے کسی اور سرزمین پر یکجا ہوئے تھے۔

میں انھی خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ مجھے اپنے شانوں پر نرم نرم اُنگلیوں کی حرارت محسوس ہوئی۔

پلٹ کر دیکھا تو زینا کے غلافی آنکھوں والے چہرے کو قریب پایا۔ وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔ "تم کون ہو سرفرڈش؟ مجھے تم پر غصہ آنا چاہیے تھا لیکن اب میرا دل تمھاری طرف داری کرنے لگا ہے؟"

"میرے مُلک میں جو یہاں سے بہت دُور ہے، جب کسی عورت کا دل کسی مرد کی یا کسی مرد کا دل کسی عورت کی طرف داری کرتا ہے تو وہ ایک دُوسرے کے دوست بن جاتے ہیں، ایک دُوسرے پر اعتماد کرتے ہیں اور اپنا سب کچھ ایک دُوسرے پر نچھاور کر دیتے ہیں۔" میں نے نرمی سے کہا۔

"سراما میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ جب دونوں ایک دُوسرے کی رضامندی سے ایک دُوسرے کو چھوتے ہیں تو وہ ایک دُوسرے کے ہو جاتے ہیں۔ پہلے تم نے میری رضامندی کے بغیر مجھے چھوا تھا اس لیے مجھے غصہ آگیا تھا لیکن اب مجھے غصہ نہیں آئے گا۔"

میرے لیے اتنا ہی اذن کافی تھا۔
اُسی لمحے پیلو کے گانے کی آواز نے ہمیں چونکا دیا۔

"پیلو سو جائے گا تو ہم باتیں کریں گے۔" اس نے سرگوشی کی۔
پیلو نے تین کچھوے الاؤ کے قریب پٹخ دیے۔

"میں زمین پر چلنے والی مچھلیاں تو پکڑ لایا ہوں مگر یہ اُوپر سے فولاد کی طرح سخت ہیں۔"

میں بھوک سے بے تاب ہو رہا تھا اس لیے میں نے کچھوؤں کو چیر پھاڑ کر نوکدار ٹہنیوں میں پرو دیا اور بھوننے کے لیے رکھ دیا۔ زینا اس دوران کراہت محسوس کرتے ہوئے دُوسری جانب دیکھتی رہی۔

مگر جب گوشت کے پارچے بھن گئے تو وہ بھی ہمارے ساتھ کھانے میں شریک ہوگئی۔ سچ ہے کہ بھوک جسم فروش کی بھی ہو بہت بری ہوتی ہے۔

پیٹ کی آگ بجھانے کے بعد زینا جھیل کی طرف چلی گئی۔

"شہزادی زینا ..." پیلو نے کچھ کہنا چاہا۔

"وہ کہیں نہیں جائے گی۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"میں کچھ اور کہنا چاہتا تھا۔" وہ بولا۔ "شہزادی زینا ملکہ فیرا کی بیٹی ہے۔ سراما میں شہزادیوں کو جنگ، عدلیہ اور انتظامیہ کے رموز سکھائے جاتے ہیں۔ آج کل وہ غلام تلاش کرنے والے دستے کے ساتھ زیر تربیت ہے۔ جب وہ چھوٹی تھی تو میں اُسے فن خطابت سکھایا کرتا تھا۔" اتنا کہہ کر وہ سانس لینے کے لیے رُکا۔

"اس کام کے لیے تم موزوں تر آدمی ہو پیلو مگر میں تم سے کوئی اخلاقی تقریر نہیں سُننا چاہتا۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"میں بھی آپ کو کوئی پند و نصائح نہیں کرنا چاہتا۔ صرف یہ تنبیہہ کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارے ہاں کوئی عام آدمی شہزادیوں کا شوہر نہیں بن سکتا۔ اگر کوئی عام آدمی کسی شہزادی سے شادی کرلے تو اس کے حصے میں انتہائی اذیت ناک موت آتی ہے۔"

"میں زینا سے شادی کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا، پیلو۔"

"لیکن میں نے اپنی آنکھوں سے آپ کو اور اُسے ایک دوسرے کو چھوتے دیکھا ہے... اور ہمارے ہاں اسی کو شادی کہتے ہیں۔"

میں اُٹھ کھڑا ہوا اور جمائی لیتے ہوئے کہا۔ "اگر ایسا ہے تب بھی تم فکر نہ کرو میرے ننھے دوست۔ صرف اتنا یاد رکھو کہ تم اس واقعے کے عینی گواہ نہیں بن سکتے جو تم نے دیکھا ہی نہ ہو۔ میرا مطلب سمجھ گئے تم؟"

"ہاں میں سمجھ گیا کہ میں نے نہ پہلے کچھ دیکھا ہے اور نہ ہی اب دیکھوں گا لیکن میری یہ بات نہ بھولیے گا کہ میں نے آپ کو وقت پر آگاہ کر دیا تھا۔"

یہ کہہ کر وہ الاؤ سے کچھ ہٹ کر لیٹ گیا اور اس نے کروٹ بدل لی۔

جب زینا واپس آئی تو وہ خراٹے لے رہا تھا۔

زینا جھیل سے نہا کر آئی تھی۔ اُس کے بال گیلے تھے اور رُوپ نکھر گیا تھا۔

"تم یہاں لیٹ جاؤ۔" اس نے سرگوشی کی۔

میں نے اُس کی ہدایت پر عمل کیا تو وہ میرے قدموں کی جانب کچھ فاصلے پر کھڑی ہو گئی۔ اُس نے پہلے سیاہ آسمان کی طرف دیکھا جس پر ستاروں کے جگنو چمک رہے تھے پھر اس نے زمین پر نظر ڈالی اور اُنگلی سے کوئی نشان بنایا۔ اس کے بعد وہ دھیمے لہجے میں دُعا مانگنے لگی۔

"اے بروق دیوتا۔ اے معبود اور دیوتا۔ اے دو چہروں والے دیوتا۔ میں تیری رضا سے سرفروش کو اپنا تسلیم کرتی ہوں۔ ہم شادی کے بندھن میں بندھ رہے ہیں جو اٹوٹ ہے۔"

اس دُعا کے خاتمے پر وہ مسکراتی ہوئی میری طرف متوجہ ہو گئی۔

◙

اگلی صبح سب سے پہلے مجھے جو خیال آیا وہ یہ تھا کہ ڈاکٹر فریدوں کے تجربے اس کے نکتۂ نظر سے بجا سہی لیکن گزرے زمانوں کی نادیدہ سرزمینوں پر مجھے اپنی بقا کے لیے جو کچھ بھی کرنا پڑتا ہے، اس کے نتیجے میں کچھ اخلاقی پابندیاں میری ذات پر بھی عائد ہوتی ہیں اگر میں ماضی کے اس سفر میں بچ گیا تو واپسی پر اس سلسلے میں ڈاکٹر فریدوں سے ضرور بات کروں گا کہ وہ خواتین جو اپنی تقدیر اور اپنا مستقبل مجھ سے وابستہ کر لیتی ہیں، اُن کے خوابوں اور خوشیوں کا قتل کس حساب میں ڈالا جاتا ہے؟ اگر وہ میرے بچوں کی مائیں بن گئیں تو انھیں باپ کے سائے سے محروم کرنے کا گناہ کس کے حساب میں لکھا جائے گا؟ ... مگر اس وقت میں نے ان سوچوں سے اپنا دامن چھڑا لیا کہ پہلا سوال وہاں خود اپنی ہی بقا کا تھا۔

ہم نے چوری چھپے اپنا سفر جاری رکھا۔

اس دوران میری کوشش رہی کہ زینا اور پیلو پر میری برتری برقرار رہے اور میں کم سے کم غلطیاں کروں۔ میں نے اپنے بارے میں زینا اور پیلو کو یہ بتایا کہ میں اپنے جڑواں بھائی کے ساتھ، جو ہوبہو میری ہی شکل کا ہے، ایک بادبانی کشتی میں سفر کر رہا تھا کہ کشتی طوفان میں پھنس کر تباہ ہو گئی۔ میں ایک تختے کے سہارے سراما کے ساحل سے آ لگا۔ ہو سکتا ہے کہ تقدیر نے میرے بھائی کو بھی اسی ملک کے ساحل پر کہیں لا پھینکا ہو۔ میں اُسے تلاش کرنا چاہتا ہوں جب وہ مل جائے گا تو ہم دونوں بھائی یہیں رُک جائیں گے یا پھر واپس چلے جائیں گے۔

زینا نے مجھے اس کی تلاش میں بھرپور مدد دینے کا وعدہ کیا تھا۔

اس من گھڑت کہانی سے میرا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اگر میرا ڈبلی کیٹ یہاں پہنچ چکا ہے تو اس سے بھی نمٹ لیا جائے۔

دورانِ سفر مجھے زینا اور پیلو سے بہت سی معلومات حاصل

ہوئی تھیں۔ انھوں نے بتایا تھا کہ سیاہ پانی والی جھیل کے قریب لڑاکا غلاموں کی تربیت گاہ ہے جہاں اُنھیں مختلف ہتھیاروں کا استعمال اور فنِ حرب سکھایا جاتا ہے تاکہ وہ راجدھانی کے اکھاڑے میں ایک دُوسرے سے برسرِ پیکار ہو کر لوگوں کے لیے تفریح فراہم کرسکیں۔

پیلو نے چُپکے سے مجھے یہ بتا دیا تھا کہ اگر میں لڑاکا غلام بن جاؤں تو وہ میرے نوکر کی حیثیت سے میرے ساتھ رہ سکے گا اور اُسے غلام نہیں سمجھا جائے گا۔

میں نے کافی سوچ وبچار کے بعد... دل میں فیصلہ کر لیا کہ میں لڑاکا غلام بن جاؤں گا۔ اس طرح مجھے شہرت کے ساتھ ساتھ مرتبہ بھی مل سکتا تھا۔ چنانچہ بظاہر تو ہم لوگ سراما سیڈ کی طرف سفر کر رہے تھے مگر جب سیاہ جھیل کے قریب پہنچے تو میں نے زینا سے کہا۔

"میرا خیال ہے ہمیں چھُپ چھُپ کر سفر کرنے اور پناہ گاہیں تلاش کرنے کی بجائے سیدھا تربیت گاہِ غلاماں چلنا چاہیے۔ وہاں سے حفاظتی دستہ مل جائے گا جو تمھیں سراما سیڈ پہنچا دے گا اور ہمیں غلاموں میں جگہ مل جائے گی اور جیسا کہ تم کہتی ہو کہ اجنبی ہونے کے ناتے مجھ پر سراما کا قانون لاگو نہیں ہوتا اس لیے وہ مجھے غلام بھی نہیں بنا سکیں گے۔"

"مگر مجھے تو وہ دوبارہ غلام بنا لیں گے۔" پیلو چیخ اُٹھا۔ "میں کسی قیمت پر بھی غلام بننے کے لیے تیار نہیں ہوں۔"

"یہ وقتی بات ہوگی پیلو... جب زینا سراما سیڈ پہنچ جائے گی اور ہمارے لیے راہ ہموار کرے گی تو ہم بھی یہاں سے چلے جائیں گے۔" میں نے اسے سمجھایا مگر وہ نہ مانا تو خود زینا اُسے سمجھانے لگی کہ میری محبت نے خود اُسے اسیر بنا دیا ہے۔

پیلو اپنی ضد پر اڑا رہا اور اپنی رگیں کاٹنے کے لیے تیار ہوگیا۔

"میرا خیال ہے کہ میں لڑاکا غلام بن جاؤں۔ اس طرح جہاں پیلو غلام بننے کی بجائے میرا نوکر بن جائے گا وہاں ہماری شادی پر کیے جانے والے اعتراض بھی ختم ہو جائیں گے کیونکہ پیلو نے بتایا ہے کہ شہزادیاں بہادر اور نامور لڑاکا غلاموں سے شادی کرسکتی ہیں۔" میں نے کہا۔

"یہ تو ٹھیک ہے سرفروش۔ مگر میں تمھیں لڑاکا غلام نہیں بننے دُوں گی۔ اس میں تمھاری جان کا خطرہ ہے۔ میں تمھیں اپنے لیے زندہ دیکھنا چاہتی ہوں۔"

میری بجائے پیلو بول اُٹھا۔ "شہزادی حضور! جیسا کہ سرفروش کہتا ہے اگر یہ فنِ حرب کا ماہر ہے تو پھر اس کا مقابلہ کوئی نہیں کرسکتا کہ پورے سراما میں سرفروش جیسا طاقتور کوئی آدمی نہیں ہے۔"

"میں نے سُنا ہے کہ لڑاکا غلاموں کا کپتان ماکونا بہت طاقتور اور قوی الجثہ ہے۔ میں اپنے شوہر کی زندگی خطرے میں نہیں ڈال سکتی۔" شہزادی یہ کہتے ہُوئے میرے قریب سرک آئی۔

"گھبراؤ نہیں زینا۔" میں نے اُسے تسلی دیتے ہُوئے کہا۔ "ماکونا میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ اور جیسا کہ پیلو نے بتایا ہے تم سراما کی شہزادی کی حیثیت سے ایک غلام کی سرپرست بن سکتی ہو۔ اس لیے میری کفیل بن کر مجھے تربیت گاہ میں خود ہی داخل کرا دو۔"

"یہ اتنا آسان نہیں ہے، سرفروش!" وہ بولی۔ "ایک تو میں تمھاری جُدائی گوارا نہیں کرسکتی۔ دوسرے پُوچھ گُچھ سے ڈرتی ہُوں۔"

"تم سے پوچھ گچھ کون کرسکتا ہے، زینا۔ تم تو شہزادی ہو۔"

"میری ماں مجھ سے پوچھ گچھ کرے گی، سرفروش۔ وہ ہر معاملے میں چھان بین کرنے کی عادی ہے اور اپنی بیٹیوں سے بھی بدگمان رہتی ہے۔" وہ متفکر انداز میں بولی۔ "میری سمجھ میں اب تک یہ نہیں آسکا کہ میں اُسے تمھارے متعلق کیا کہہ کر مطمئن کروں گی۔"

"اس سلسلے میں تمھیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ اسے کہنا کہ میں نے اور پیلو نے اپنے آپ کو تمھارے حوالے کر دیا تھا تمھیں ہم پر رحم آگیا۔ اس لیے تم نے ہمیں غلاموں کا کھوج لگانے والے دستے کے سپرد کرنے کی بجائے سراما سیڈ کی تربیت گاہ میں داخل کرا دیا اور لڑائیوں کے آیندہ مقابلے میں میں تمھاری زیرِ سرپرستی حصّہ لوں گا۔ تمھاری ماں کو ہی نہیں بلکہ سب کو اس بات پر یقین آجائے گا۔"

"لیکن میرا کیا ہوگا، سرفروش! میں تمھارے لیے تڑپتی اور ترستی رہوں گی۔"

"میں قانونی طور پر تمھارا شوہر بننے کے لیے ہی لڑاکا غلام بننا چاہ رہا ہُوں، زینا۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو ممکن ہے، وہ مجھے پیلو کی مدد کرنے کے جُرم میں موت کی سزا دے دیں۔ کیا تم یہی چاہتی ہو، زینا؟"

میرے دلائل نے زینا کو میری بات ماننے پر مجبور کر دیا۔

تربیت گاہ کے کپتان ماکونا نے زینا کی بے حد تکریم کی اس کے ہر حکم پر سرِ تسلیم خم کیا اور ایک دستے کی حفاظت میں اُسے سراما سیڈ بھیج دیا۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہُوئی کہ یہاں مرد، عورت کی حکمرانی کو تہِ دل سے تسلیم کرتے اور اُس کا حکم بجا لانے

میں فخر محسوس کرتے ہیں۔

ہمیں اس تربیت گاہ کی پتھروں سے بنی ہُوئی جھونپڑیوں میں ٹھہرایا گیا جو جھیل سے زیادہ دُور واقع نہیں تھیں۔ ان جھونپڑیوں کے سامنے ایک وسیع میدان تھا جس کے ایک کنارے بردق کا مجسمہ نصب تھا اور اس کے پاس ہی پھانسی کے چبوترے بنے ہُوئے تھے۔ یہاں زیرِ تربیت غلاموں کی کڑی نگرانی نہیں کی جاتی تھی۔ اگرچہ لڑاکا غلام قانونی طور پر غلام سمجھے جاتے تھے مگر اُن کے ساتھ غلاموں جیسا سلوک نہیں کیا جاتا تھا۔ ان کی اکثریت ایسے افراد پر مشتمل تھی جو غلامی سے نجات حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ قسمت آزمائی کی خواہش رکھتے تھے۔ ان کی کامیابی یا ناکامی کا دار و مدار منصفوں پر تھا اور یہ منصف خواتین ہوتی تھیں کہ ریاست پر عورتوں کی عمل داری تھی۔

ایک روز میں میدان میں دوڑ لگا رہا تھا اور پسینے سے تربتر ہو چکا تھا۔ جب میں مجسمے کے قریب سے گزرا تو اُسے غور سے دیکھنے کے لیے رُک گیا۔ بردق دیوتا کے مجسمے کا اوپری حصّہ اور چہرہ عورت کا تھا لیکن زیریں حصّہ مرد اور عورت، دونوں کی نمایندگی کرتا تھا۔ سراما کے لوگ عورت کو خیر اور مرد کو شر کی علامت سمجھتے تھے۔ مجھے اس زنانہ و مردانہ مجسمے پر کوئی تعجب نہ ہوا۔

میں جانتا تھا کہ ہر دَور کے لوگوں نے اپنی پسند اور ضرورت کے مطابق خود ہی دیوتا تخلیق کیے اور پھر اُن کے مجسمے بنا کر اُنھیں اپنا معبود بنا لیا۔ میں نے یہ بھی سُنا تھا کہ سراما کے لوگ اپنے دیوتا کو معصوم بچیوں کی قربانی دیتے ہیں۔ میں نے لاشعوری طور پر مجسمے کی طرف تھوک دیا اور جانے لگا کہ اتنے میں کسی نے مجھے آواز دی۔

میں نے پلٹ کر دیکھا۔

ماکونا مجسمے کی اوٹ سے نکل کر میرے سامنے آگیا۔ اس کے ہاتھ میں کوڑا اور کمر سے چھوٹی سی تلوار لٹک رہی تھی۔ وہ اپنے غلیظ دانتوں کی نمائش کرتے ہُوئے بولا۔

"تم نے ہمارے دیوتا کی توہین کی ہے، سرفروش! میں نے اپنی آنکھوں سے تمھاری گستاخی دیکھی ہے اور اس کی پاداش میں میں تمھیں کوڑے ہی نہیں لگا سکتا بلکہ چاہوں تو پھانسی کا پھندا بھی تمھارے گلے میں ڈال سکتا ہوں۔"

میں ایک غلام کو پھانسی کے پھندے پر لٹکتے دیکھ چُکا تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ بردق کی توہین، حکم عدولی یا تربیت حاصل کرنے میں کوتاہی وغیرہ پر پھانسی کی سزا دی جاسکتی ہے اور تربیت گاہ میں آنے کے پہلے ہی روز مجھے یہ بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ ماکونا سے کبھی نہ کبھی روز میری ٹکر ضرور ہوگی۔

آج وہ وقت آ ہی گیا تھا۔

اگر مجھے زینا کی سرپرستی حاصل نہ ہوتی تو میں اور پیلو نہ جانے کب کے دار پہ لٹکا دیے گئے ہوتے۔

"میں نے دیوتا کے ساتھ کوئی گستاخی نہیں کی۔ دوڑ لگانے سے میرا حلق خشک ہو گیا تھا، اس لیے میں نے تھوک دیا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں نے دیوتا پر تھوکا ہے۔" میں نے کہا۔

اگرچہ سراما کے باشندے ماکونا کو دیوہیکل آدمی سمجھتے تھے مگر وہ قد میں مجھ سے کم از کم ایک ہاتھ چھوٹا تھا لیکن اس کے شانے چوڑے اور کمان کی طرح خمیدہ ٹانگیں بے حد مضبوط تھیں۔

"میں تمھاری اس حرکت سے جو مطلب بھی نکالنا چاہوں تو نکال سکتا ہوں اور سزا دے سکتا ہوں۔ سچی بات یہ ہے، سرفروش کہ میں تمھیں پسند نہیں کرتا۔ تم ہماری مملکت میں اجنبی ہو۔ میں نے تم اجنبی پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ میں تم پر اعتماد نہیں کرتا۔ مختصر یہ کہ میں چاہتا ہُوں دیوتا تم پر اپنا عذاب نازل کرے اور تم فنا ہو جاؤ۔" وہ بولا۔

میری سمجھ میں نہ آیا کہ آخر وہ ایسی باتیں کیوں کر رہا ہے۔ میں نے اپنے ہاتھ سینے پر باندھ لیے اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

"تم اس بھری دوپہر میں اتنی دُور مجھے یہی بتانے آئے ہو، جو میں پہلے سے جانتا ہُوں؟ نہیں ماکونا! نہ تم بے وقوف ہو، نہ میں احمق ہُوں۔ جو کچھ تمھارے دل میں ہے، اُسے زبان پر لانے میں مت جھجکو۔"

ماکونا نے میری بات پر قہقہہ لگاتے ہُوئے جواب دیا۔

"تم ٹھیک سمجھے، سرفروش! میں تم پر دیوتا کی گستاخی کا الزام لگانے نہیں آیا۔ میری آمد کا مقصد کچھ اور ہے۔" اور یہ کہتے ہُوئے اس نے اپنا ہاتھ کمر سے لٹکی تلوار کے دستے پر رکھا تو میں نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر کراٹے کی دفاعی حالت اختیار کر لی۔ یہ دیکھ کر وہ ہنسا اور بولا۔ "میں تمھیں نقصان پہنچانے بھی نہیں آیا۔ مجھ پر اعتماد رکھو۔"

"میں کسی پر اعتماد نہیں کرتا، ماکونا۔ جو کچھ تمھیں کہنا ہے صاف صاف کہو اور مجھے تنہا چھوڑ دو۔"

"میں تم سے راز کی بات کرنے آیا ہوں سرفروش! کیا تم برداش کو جانتے ہو؟"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"رات وہ اس وقت میرے پاس آیا تھا جب تم سب سو چُکے تھے۔ وہ بھی تمھارا اتنا ہی دُشمن ہے، جتنا میں ہُوں۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے مجھ پر؟" مَیں نے کہا: "ہمارے مُلک میں بہادر اپنے دُشمنوں سے پہچانے جاتے ہیں"۔

"میں نہ تمھیں جانتا ہوں اور نہ تمھارے مُلک کو" ماکونا بولا۔ "مَیں تو سراما کو اور برداش کو جانتا ہوں ۔ وہ کنواری زینا کا پہلا شوہر بننا چاہتا ہے"۔

"تو پھر اُسے دیر ہوگئی ہے ماکونا" یہ الفاظ بے ساختہ میرے مُنہ سے نکل گئے۔

"اوہ... تمھارے ساتھ شہزادی کے محبت آمیز سلوک سے شک تو مجھے بھی ہُوا تھا لیکن مجھے اس قسم کے معاملات سے کوئی دِل چسپی نہیں، مگر جب برداش کو یہ معلوم ہوگا کہ تم شہزادی سے شادی کر چکے ہو تو اس کی رگوں میں چنگاریاں دوڑنے لگیں گی۔ وہ تو پہلے ہی تمھاری موت کا خواہاں ہے۔ کل رات اُس نے تمھیں ٹھکانے لگانے کے لیے بھاری معاوضے اور عہدے میں ترقی کی بھی پیش کش کی تھی"۔

"پھر تم نے کیا سوچا؟" مَیں نے پُوچھا۔

"اس کی پیش کش میرے لیے خاصی دل کش ہے" وہ بولا۔ "میرے دِل میں تمھاری کوئی وقعت نہیں سرفروش! لیکن اگر تم واقعی شہزادی سے شادی کر چُکے ہو تو پھر مجھے دوسرے نکتۂ نظر سے سوچنا پڑے گا"۔

"یہ تمھاری مرضی پر منحصر ہے ماکونا۔ ویسے میں سراما کے قانون کے مطابق اُس سے شادی کر چُکا ہوں"۔

اس پر ماکونا کچھ سوچتے ہُوئے بولا۔

"ہُوں... تو وہ تمھیں یہاں چھوڑ کر خود ملکہ کو ٹھنڈا کرنے گئی ہے۔ یہی بات ہے نا؟"

"کسی حد تک یہ دُرست ہے ماکونا مگر مَیں اپنی بہادری سے اُسے حاصل کرنے کا حق دار ثابت کرنا چاہتا ہوں۔ اس لیے یہاں تربیت لے رہا ہوں"۔

یہ سُن کر ماکونا کافی دیر تک سوچتا رہا... اس کی جبیں پر شکنیں اُبھر آئیں۔

"دانشمندی کا تقاضہ یہ ہے کہ آدمی فاتح فریق کا ساتھ دے"۔

"لیکن ابھی مجھے مکمل فتح حاصل نہیں ہُوئی ماکونا"۔

"پھر بھی تم برداش سے بہتر ہو کہ شہزادی کا دِل جیت چُکے ہو اور وہ سراما سیڈ میں تمھارے لیے سرگرمِ عمل ہے۔ اس لیے میں برداش کا نہیں، تمھارا ساتھ دوں گا"۔

"یہ میری عزت افزائی ہوگی، کپتان" مَیں نے قدرے طنزیہ انداز میں کہا۔

مگر وہ میرا یہ انداز نظر انداز کرتے ہُوئے بولا۔

"لیکن ایک ذراسی گڑبڑ ہوگئی ہے، سرفروش! مَیں نے برداش سے رقم لے کر تمھیں ٹھکانے لگانے کا وعدہ کر لیا ہے مگر کبھی مرے ہُوئے آدمی کو رقم واپس کرنا اور اُس کے ساتھ کیا ہُوا وعدہ نبھانا ضروری نہیں ہوتا۔ اس لیے تمھیں آج رات ہی اُسے قتل کرنا ہوگا، سرفروش! اور یہ تمھارے لیے بہت آسان ہوگا۔ سمجھ لو کہ اس سلسلے میں سارے انتظامات مکمل ہیں"۔

"انتظامات میرے قتل کے مکمل ہیں یا اُس کے قتل کے؟" مَیں نے زہرخند کے ساتھ پُوچھا۔

"تھے تو تمھارے قتل کے مگر ذراسی تبدیلی کے ساتھ اب اُس کے قتل کے لیے موزوں ہوجائیں گے... اُسے ٹھکانے لگانے کے بعد تم شہزادی سے کہو گے کہ مَیں تمھارا ایسا دوست ہُوں جس نے تمھاری جان بچائی ہے، اس طرح مجھے وہ عہدہ مِل جائے گا جو برداش کی موت سے خالی ہوگا"۔

"مَیں ابھی سے کوئی وعدہ نہیں کرتا ماکونا۔ پہلے مجھے اپنے منصوبے کی تفصیل بتاؤ"۔

ماکونا نے پلٹ کر تربیت گاہ کے رہائشی حصّے کی طرف دیکھا، جہاں غلام چوبی تلواروں سے لڑنے اور ایک دوسرے کو قتل کرنے کی مشق میں مصروف تھے اُن کی بھاگ دوڑ اور اُچھل کود سے گرد اُڑ رہی تھی۔

ماکونا بولا: "مجھے بھُوک لگ رہی ہے اور یہاں سے وہاں تک خاصا فاصلہ ہے۔ اس لیے یہ تفصیل راستے میں بتاؤں گا... آؤ، میرے ساتھ"۔

مَیں کچھ فاصلے پر اُس کے پیچھے چلنے لگا۔

"اس وقت تک مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں، سرفروش! جب تک میں اس نتیجے پر نہ پہنچ جاؤں کہ تمھیں فتح نہیں، شکست ہوگی" وہ بولا۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ تم سچ کہنے والے غلط آدمی ہو ماکونا! اگر کبھی تمھیں قتل کرنا پڑا تو مجھے افسوس ہوگا"۔

ماکونا نے میری بات پر کوئی توجہ نہ دی اور دُور ایک کھمبے سے لہرانے والے جھنڈوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"وہ دیکھو۔ برداش، سیاہ جھیل سے پوچھ رہا ہے کہ اس کے منصوبے کا کیا رہا؟"

میں نے ماکونا کی بات پر اعتبار کر لیا کہ وہی جھنڈوں کا پیغام سمجھ سکتا تھا۔

"... یہ منصوبہ یا سازش بہت آسان تھی۔ آج رات کچھ غلام مجھے قتل کر کے فرار حاصل کرنے کی کوشش کرتے اور تم ان باغی غلاموں کے سرغنہ ہوتے"۔

"میں اُن کا سرغنہ ہوتا؟" مَیں نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں۔ سازش کی ناکامی کے بعد وہ غلام یہی کہتے۔ منصوبے کے مطابق برداش اور اس کا دستہ تیار رہتا۔ جونہی سازشی غلام شور و غل مچاتے، وہ دستہ تمھیں گرفتار کر لیتا اور غلاموں کی گواہی پر تمھیں فوراً ہی تہ تیغ کر دیا جاتا۔ اب بولو کیسا تھا یہ منصوبہ؟"

"بہت عمدہ" مَیں نے جواب دیا: "اپنی جگہ مکمل اور آسان"۔

"اب یہ اور بھی عمدہ، آسان اور مکمل تر ہوگیا ہے" ماکونا بولا۔ "میں تمھیں پہلے سے وہ جگہ دِکھا دوں گا جہاں برداش انتظار کرے گا۔ تمھیں بہر طور اُسے ختم کر دینا ہے کیوں کہ میں اُسے اپنا دُشمن نہیں بنا سکتا"۔

مَیں نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر ماکونا سے پُوچھا۔

"ایک بات تو بتاؤ ماکونا۔ برداش کو میرے اور زینا کے بارے میں کیسے معلوم ہوا نیز اُسے یہ پتہ کیسے چلا کہ میں یہاں زیرِ تربیت ہوں؟"

ماکونا نے تعجب سے میری طرف دیکھا اور بولا: "جھنڈوں کے ذریعے، سرفروش!"

میں کچھ نہ سمجھنے کے انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"جب شہزادی غائب ہوئی تھی تو فوری طور پر سراما سیڈ کو اُس کی گم شدگی کا پیغام بھیجا گیا تھا۔ ملکہ فیرا نے اس کے جواب میں جو پیغام بھیجا تھا، برداش نے اس کے بارے میں مجھے آگاہ کر دیا اور جب شہزادی یہاں پہنچی تو مَیں نے ملکہ کو پیغام بھیج دیا کہ وہ فکر نہ کرں۔ شہزادی تمھارے ساتھ یہاں آگئی ہے۔ اس کے بعد برداش مجھ سے روزانہ جھنڈوں کے ذریعے تمھارے بارے میں پوچھتا رہا۔ مگر جھنڈوں کے ذریعے ہم سودے بازی نہیں کر سکتے تھے اس لیے برداش کو یہاں آنا پڑ گیا"۔

بات میری سمجھ میں آگئی۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ جب زینا سراما سیڈ پہنچی ہوگی تو اس کی ماں ملکہ فیرا کو سارے حقائق کا پتہ پہلے سے چل چُکا ہوگا۔ خدا جانے زینا پہ کیا بیتی ہوگی، وہ معاملات کو سُلجھا بھی سکی ہوگی یا نہیں؟ اِدھر بھی حالات کا رُخ یکسر بدل گیا تھا۔ مجھے ایسے کام کرنے پر مجبور کیا جا رہا تھا جو میں نہیں کرنا چاہتا تھا۔

مجھے سوچ میں ڈوبے دیکھ کر ماکونا نے کہا: "اگر تم برداش کو قتل نہ کر سکے اور اس نے تمھیں قتل کر دیا تو مجھے حلفیہ بیان دینا پڑے گا کہ تم نے غلاموں کو بغاوت پر بھڑکایا تھا اور تم ان کے سرغنہ تھے"۔

میرے لیے یہ صورتِ حال، سانپ کے مُنہ کا چھچھوندر بن گئی۔

مَیں اپنی جھونپڑی میں واپس آیا تو چیلو میری راہ دیکھ رہا تھا۔ وہ بے حد پریشان تھا۔

اُس نے مجھے اور ماکونا کو پھانسی کے چبوتروں کے پاس باتیں کرتے دیکھ لیا تھا اور جانتا تھا کہ ماکونا کسی بہانے، کسی بھی لڑاکا غلام کو پھانسی پر لٹکا سکتا ہے۔

میں نے اُسے ماکونا اور اپنے درمیان ہونے والی بات چیت سے آگاہ کیا تو وہ اور زیادہ متفکر ہوگیا۔

"یہ کہیں اس کی چال نہ ہو، سرفروش! میں سراما سیڈ کے محل میں شہزادیوں کو پڑھاتا رہا ہوں اور جانتا ہوں کہ سراما میں بڑی مکروہ سازشیں کی جاتی ہیں"۔

"اگر ماکونا نے میرے ساتھ کوئی گھٹیا چال چلی ہے تو بھی مجھے اس کے منصوبے میں حصّہ لینا ہی پڑے گا" مَیں نے اُسے سمجھایا۔ "اگر میں اس کی ہدایت پر عمل نہیں کروں گا تو مجھ پر بغاوت پھیلانے کا الزام لگا کر مجھے تہِ تیغ کر دیا جائے گا۔ اس صورتِ حال میں مجھے خطرہ مول لینے کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آتا"۔

شام کے وقت ماکونا خود ہماری کوٹھری میں آیا۔

اُس نے باقی سب کو باہر جانے کا حکم دے دیا۔

جب ہم دونوں ہی رہ گئے تو اس نے مجھ سے وہ چوبی تلوار اور خنجر لے لیا جو مجھے مشق کے لیے دیا گیا تھا اور ان کی بجائے مجھے اصلی تلوار اور خنجر دے دیا۔

اب میرے دل سے یہ شکوک و شبہات ختم ہوگئے کہ ماکونا میرے ساتھ کوئی گھٹیا چال چل رہا ہے۔

"برداش منصوبے کے مطابق طلوعِ ماہتاب کے بعد پہاڑی نالے کے کنارے میرے اشارے کا منتظر رہے گا۔ جب میرے سکھائے پڑھائے غلام جنھیں میں برداش کی دی ہوئی رقم سے حصّہ دے چُکا ہُوں، شور برپا کریں گے تو میں مشعل جلا کر اُسے اشارہ کر دوں گا تاکہ وہ اپنے دستے کو بُلا سکے لیکن اس کی نوبت نہیں آنی چاہیے، سرفروش، جوں ہی وہ پہاڑی نالے پر پہنچے، اُسے قتل کر دینا ورنہ منصوبے کے مطابق تم خود قتل کر دیے جاؤ گے"۔

میں تلوار اور خنجر سے مسلح ہو کر پہاڑی نالے کی طرف چل دیا۔

اَب مجھے طلوعِ ماہتاب کا انتظار تھا۔

نالے میں چھپنے سے پہلے میں نے اِدھر اُدھر گھوم پھر کر یہ اطمینان کر لیا تھا کہ وہاں کوئی چھپا ہُوا نہیں ہے۔ مَیں ایک محفوظ مقام پر چٹان سے پیٹھ لگا کر چاند کے طلوع ہونے اور برداش کے وہاں آنے کا انتظار کرنے لگا۔

ہر چند کہ میں اس منصوبے میں بادلِ نخواستہ شریک ہُوا تھا لیکن اب سوچ رہا تھا کہ برداش جیسے دُشمن کو، جو مجھے راستے سے ہٹانے کے لیے رقم اور اپنا وقت برباد کر رہا ہے، ختم کر دینا ہی بہتر ہے پھر جو ہوگا، دیکھا جائے گا۔

چاند طلوع ہو گیا مگر برداش نہ آیا۔

جُوں جُوں وقت گزر رہا تھا، میری بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔

میں سوچنے لگا کہ کہیں ماکونا نے میرے ساتھ کوئی چال تو نہیں چلی۔۔ لیکن اگر اسے دھوکا دینا مقصود ہوتا تو وہ مجھے اصلی تلوار اور خنجر کیوں فراہم کرتا؟

مَیں نے اپنی کمین گاہ سے نکل کر رہائشی کوٹھریوں کی طرف دیکھا۔

وہاں سوائے ایک کوٹھری کے باقی سب میں اندھیرا تھا اور جس کوٹھری کی کھڑکی سے روشنی جھانک رہی تھی، اُسی میں ماکونا کی رہائش تھی اور وہیں وہ اپنا دفتری کام بھی کیا کرتا تھا۔

کچھ وقت اور گزر گیا۔

برداش نہیں آیا اور نہ ہی نام نہاد بغاوت کرنے والے غلاموں کا شور سُنائی دیا۔

میرا اضطراب بڑھنے لگا۔۔۔

مجھے پیلو کی باتیں یاد آنے لگیں۔ اس نے کہا تھا۔۔۔

"برداش بے حد جاہ طلب اور ہوس مند آدمی ہے۔۔۔ وہ اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے سب کچھ کر سکتا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ اور ماکونا دَرپردہ ایک دوسرے کے دُشمن ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ان دونوں نے اپنی اپنی مقصد براری کے لیے یہ منصوبہ بنایا ہے اور تمھیں اپنے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں اس لیے تم آج رات وہاں مت جانا!"

میں نے سوچا، ہو سکتا ہے کہ پیلو کا خیال ٹھیک ہی ہو مگر میں یہاں آنے کے لیے مجبور تھا ورنہ خواہ مخواہ غلاموں کو بھڑکانے کے الزام میں دھر لیا جاتا۔۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اب تک شورش کیوں نہیں ہُوئی اور برداش کیوں نہیں آیا؟ مَیں نے یہ سوچتے ہُوئے دوبارہ ماکونا کی جھونپڑی کی طرف دیکھا۔

اب اس کی روشنی بھی گُل ہو چکی تھی۔

میری سمجھ میں نہ آیا کہ ہر کام منصوبے کے برعکس کیوں ہو رہا ہے؟

اچانک مجھے چاندنی میں ماکونا کی کوٹھڑی سے چند ہیولے باہر میدان کی طرف آتے دکھائی دیے۔ وہ فاصلے اور ہلکی ہلکی چاندنی کے باعث واضح نظر نہیں آتے تھے۔ مَیں اپنی آنکھیں ملنے لگا کہ کہیں یہ میرا وہم تو نہیں؟

جب مَیں نے دوبارہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُدھر دیکھا تو وہ ہیولے غائب ہو چکے تھے اور ماکونا کی جھونپڑی کی کھڑکی سے روشنی جھانک رہی تھی۔

مَیں چکرا کر رہ گیا کہ یہ سب کیا چکر ہے؟

نہ شورش برپا ہُوئی، نہ برداش آیا اور نہ ہی ماکونا نے روشنی جلا کر خطرے کا اشارہ دیا ہے۔ آخر ماجرا کیا ہے؟ پھر مجھے خیال آیا کہ شاید کسی بنا پر ماکونا کو منصوبہ ملتوی کرنا پڑ گیا ہوگا۔ اس لیے اس نے پہلے اپنی کوٹھڑی کی مشعل بُجھائی اور پھر جلا دی کہ میں وہاں جا کر اس سے مل لُوں۔

مَیں نے ماکونا سے ملنے کا فیصلہ کر لیا اور تلوار ہاتھ میں لے کر کمین گاہ سے رہائشی کوٹھڑیوں کی طرف چل دیا۔ نصف راستہ طے کرنے کے بعد مجھے خیال آیا کہ یہ بھی ماکونا اور برداش کی چال ہو سکتی ہے۔ رات کے وقت میرا اصلی تلوار اور خنجر لے کر اپنی کوٹھڑی سے باہر آنا یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ مَیں یہ ہتھیار چُرا کر تربیت گاہِ غلامان سے فرار ہو رہا تھا۔ میرا یہ اقدام مجھے زینا کی سرپرستی سے بھی محروم کر سکتا تھا۔ میرے اس جُرم کی سزا صرف مجھے ہی نہیں، پیلو کو بھی بھگتنا پڑ جاتی، جسے میری وجہ سے زینا کی سرپرستی حاصل ہو گئی تھی۔۔۔ لیکن اَب میں پیچھے بھی نہیں جا سکتا تھا۔ اگر ماکونا اور برداش مجھ پر بھگوڑے کا ہی الزام لگانا چاہتے تو مجھے کوٹھڑی سے غائب پا کر بھی لگا سکتے تھے، اس لیے میں آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا۔

رہائشی کوٹھڑیوں کی پہلی قطار میں کچھ لوگ زور زور سے خراٹے لے رہے تھے۔ کچھ اندھیرے میں سسکیاں لے رہے تھے اور کچھ سرگوشیاں بھی کر رہے تھے۔ شاید یہ وہ لوگ تھے جنھیں آج رات نام نہاد شورش برپا کرنا تھی۔

میں دبے قدموں ماکونا کی جھونپڑی کی طرف بڑھتا رہا اور بالآخر اس کے سامنے والی کوٹھڑی کی دیوار سے پیٹھ لگا کر کھڑا ہو گیا تاکہ کوئی پیچھے سے مجھ پر حملہ نہ کر سکے۔ سامنے آنے والوں کے لیے میرے ہاتھ میں تلوار موجود تھی۔

میں نے اس کھڑکی سے اندر دیکھنے کی کوشش کی جس سے روشنی باہر آ رہی تھی مگر مجھے ماکونا دکھائی نہیں دیا۔

میں آگے بڑھ کر اُسے آواز دینا چاہتا تھا کہ ناگاہ میری نظر اس

ی کوٹھری کے سامنے میدان میں جا پڑی جہاں ایک سربریدہ لاش پڑی تھی۔

مَیں نے جذبۂ تجسّس کے تحت چند قدم لاش کی طرف بڑھائے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ لاش کا سر اس کی ٹانگوں کے درمیان رکھا ہُوا ہے۔۔۔ اور یہ سر ماکونا کے سوا کسی اور کا نہیں تھا۔

مَیں ماکونا کا یہ حشر دیکھ کر دم بخود کھڑا رہ گیا۔

خوف کی ایک لہر میرے وجود میں سرایت کر گئی۔

ماکونا کے غلیظ دانت اور پھٹی پھٹی آنکھیں چاندنی میں یُوں چمک رہی تھیں جیسے وہ اَب بھی تمسخر آمیز انداز میں میری طرف دیکھ رہا ہو۔۔۔ اور مجھے پھانسی پر لٹکانے کی دھمکی دے رہا ہو۔

اچانک ماکونا کی کوٹھری سے کسی کی آواز آئی۔

"تم، جسے سرفروش کے نام سے پُکارا جاتا ہے، اندر آ جاؤ، تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔۔۔ مگر اپنی تلوار پھینک دو!"

مَیں نے تلوار پھینکنے کی بجائے پلٹ کر کھڑکی کی طرف دیکھا۔

وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔

آواز دوبارہ آئی۔

"حکم کی تعمیل کرو، سرفروش۔ مَیں برداش ہُوں اور ملکہ فیرا کے نام پر تمھیں حکم دیتا ہوں کہ تلوار پھینک دو۔ تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا، کیوں کہ اَب تم ملکہ فیرا کی امان میں ہو!"

اس کا یہ مطلب تھا کہ زینا نے اپنی ماں کو اعتماد میں لے کر حالات پر قابو پا لیا تھا اور پیلو کے خیال کے برعکس ملکہ فیرا بے رحم ثابت نہیں ہوئی تھی۔

"کیا تم اس بات کا قول دیتے ہو، برداش؟" مَیں نے بلند آواز میں اس سے کہا۔

"ہاں۔ میں ملکہ فیرا کے نام پر قول دیتا ہُوں کہ تم اس کی امان میں ہو!"

یہ سُن کر میں نے تلوار ماکونا کی سربریدہ لاش کے پاس پھینک دی اور کوٹھری کی طرف جاتے جاتے ایک بار ماکونا کی طرف دیکھا تو مجھے یوں محسوس ہُوا جیسے اس کے بریدہ سر کے چہرے والے حصّے میں چمکتی ہوئی آنکھیں میرا تعاقب کر رہی ہوں۔

میں نے پاؤں کی ٹھوکر سے کوٹھری کا دروازہ کھولا تاکہ برداش کو اپنی ہمت و شجاعت سے مرعوب کر سکوں لیکن جونہی مَیں نے کوٹھری میں قدم رکھا، درجن بھر آدمی مجھ پر ٹوٹ پڑے۔

اس اچانک حملے نے مجھ پر ایک جنون سا طاری کر دیا۔

مَیں کسی پر جوڈو، کسی پر کراٹے اور کسی پر کنگ فو کے داؤ آزمانے لگا۔ میں نے حملہ آوروں کو پکڑ پکڑ کر اُن کے سر ایک دوسرے سے ٹکرا دیے۔

میرے گھونسوں اور لاتوں نے کئی حملہ آوروں کو زمین چاٹنے پر مجبور کر دیا تھا مگر اُن کی جگہ دوسرے لیتے جا رہے تھے۔

اتنے میں برداش نے، جو کوٹھری کے ایک کونے میں تلوار لیے کھڑا تھا، اُنھیں غیرت دِلاتے ہُوئے کہا۔

"تم ایک آدمی پر قابو نہیں پا سکتے، بزدلو۔ اُسے نیزوں کے پچھلے حصّے سے مارو مگر یاد رکھو یہ مرنے نہ پائے۔ اگر کسی نے اسے ہلاک کر دیا تو اس وقت اُس کی تکا بوٹی کر دی جائے گی۔ اس کی ہڈیاں توڑ دو مگر اس کا دَم نہ نکلنے پائے!"

اپنے سرغنہ کے اس حکم پر وہ مجھے اُلٹے نیزوں کے ڈنڈوں سے پیٹنے لگے۔ اس طرح وہ میری دسترس سے دُور بھی ہو گئے۔

میں ایک کی طرف لپکتا تو دوسرے مجھ پر نیزوں کے ڈنڈے برسانے لگتے۔ سر پر پڑنے والے ڈنڈوں سے میں چکرا گیا۔ مجھے کوٹھری کی دیواریں اپنے گرد گردش کرتی محسوس ہونے لگیں اور پھر یُوں لگا جیسے اس کی چھت مجھ پر آن گری ہو اور میں اس کے ملبے میں دب گیا ہوں۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں مُنہ کے بل زمین پر پڑا ہُوا تھا۔ میری کلائیوں میں آہنی کڑیاں پڑی ہوئی تھیں اور میرے ٹخنوں میں زنجیریں ڈال کر انھیں کڑیوں سے جوڑ دیا گیا تھا۔ یہ زنجیریں بیڑی کا کام دے رہی تھیں اور کافی وزنی تھیں۔

انھیں توڑ کر آزادی حاصل کرنا میرے بس سے باہر تھا۔

کوٹھری میں خاموشی چھائی ہُوئی تھی۔ شاید وہ سب مجھے پابجولاں چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ میرے انگ انگ سے ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں اور کچھ زخموں سے ابھی تک خون بھی رِس رہا تھا۔

مَیں نے بہت ہمت سے کام لیا اور ہاتھوں کے سہارے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ اتنے میں کسی نے پیچھے سے میری گردن کے نیچے بڑے زور کی لات ماری۔

مَیں پھر مُنہ کے بل گر پڑا لیکن جلدی سے کروٹ بدل کر چت لیٹ گیا تاکہ اس بدبخت کو دیکھ سکوں جس نے مجھے ٹھوکر ماری تھی۔

میرے سامنے وہی خم دار ناک والا برداش کھڑا تھا جسے مَیں نے پہلی بار زینا کے ساتھ گھاٹی پر دیکھا تھا۔ وہ قد میں میرے برابر تھا اور اس کے چہرے سے سفاکی برس رہی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ پیٹی میں اُڑسی ہُوئی تلوار کے دستے پر تھا۔

مَیں نے غور سے اس کے خدوخال کا جائزہ لیا۔

اس کی داڑھی سیاہ تھی مگر اس میں اِکا دُکا سفید بال بھی

دکھائی دے رہے تھے۔ اس کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں اور سراما کے باشندوں کے برعکس سر گول تھا۔ اس کے یہ خدوخال اور قد غمازی کرتے تھے کہ وہ سراما کا باشندہ نہیں ہے۔

"مَیں برداش ہوں۔ ماکونا کے بعد یہ تربیت گاہ بھی میری کمان میں آگئی ہے۔ کیا تم مجھے جانتے ہو؟" اس نے سوال کیا۔

مَیں نے مٹی سے آلود ہونٹ ہاتھ کی پُشت سے صاف کرتے ہُوئے جواب دیا: "ہاں تم اس سرزمین کے سب سے زیادہ ظالم اور جھُوٹے آدمی ہو!"

اس نے یہ سُن کر مجھے ٹھوکر لگانے کے لیے اپنا پاؤں اُٹھایا تو مَیں نے اپنے ہتھکڑی والے ہاتھ دفاعی انداز میں سامنے لاتے ہُوئے کہا: "اگر تم نے مجھے ٹھوکر ماری تو میں تمھاری ٹانگ توڑ دوں گا۔ یقین نہ ہو تو آزما کر دیکھ لو۔"

وہ اپنا پاؤں پیچھے ہٹاتے ہُوئے مسکرا دیا۔

"میرا خیال ہے کہ تم ایسا کر سکتے ہو... لیکن میں اس لیے بھی اَب تمھیں ٹھوکر نہیں ماروں گا کہ اگر تم نے مجھے چھُو لیا تو تمھیں قتل کرنا میرے لیے لازم ہو جائے گا جب کہ یہ ملکہ کے حُکم کی خلاف ورزی ہوگی۔"

"مَیں پھر وہی الفاظ دُہراتا ہوں کہ تم جھُوٹے ہو۔ تم نے کہا تھا کہ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا!"

وہ پلکیں جھپکائے بغیر میری طرف دیکھتا رہا۔

"لیکن مجھے بُری طرح پیٹا گیا۔ اگر ملکہ کی امان کا یہی مطلب ہے تو خُدا حافظ ہی بھلا۔" میں ابھی شاید کچھ اور بھی بولتا لیکن مجھے کوٹھڑی کے ایک کونے سے زنجیروں کی جھنکار سُنائی دی تھی۔ یہ آواز سُن کر میں نے اُدھر دیکھا تو پیلو زنجیروں میں جکڑا نظر آیا۔

وہ خوف اور دہشت کی تصویر بنا ہوا تھا اور آنکھیں پھاڑے مجھے دیکھے جا رہا تھا۔

میں نے مُسکراتے ہوئے اُسے آنکھ ماری اور پھر برداش کی طرف متوجہ ہو گیا، جو اَب تین ٹانگوں والے ایک چوبی تخت پر بیٹھ رہا تھا۔ اُس نے اپنا چاندی کا خود اُتار کر گھٹنوں پر رکھ لیا اور میری طرف دیکھنے لگا۔

"میں اس وقت بہت غصّے میں تھا۔ میرے آدمی خاصے تندرست اور توانا ہیں مگر جس طرح تم نے اُن کی پٹائی کی، وہ میں نے زندگی میں پہلی بار دیکھی تھی۔ اُسے اپنی تعریف مت سمجھنا کیونکہ میں کسی کی تعریف نہیں کیا کرتا۔ مگر مجھے تمھارا اندازِ مدافعت اور مخالفوں کی ٹھکائی کرنے کا انداز پسند آیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سراما میں تم جیسا لڑاکا کوئی اور نہیں ہے۔ میں نے یہ بھی سُنا ہے کہ تم ہتھیاروں کا استعمال بھی خوب جانتے ہو۔"

"میں اُن کے استعمال کا مظاہرہ اس وقت بھی کر سکتا ہوں بشرطیکہ تم مجھے اِن زنجیروں سے آزاد کر دو۔"

"یہ ممکن نہیں ہے۔ سرفروش۔ مجھے ملکۂ عالیہ کے حکم پر تم کو سراما سیڈ لے جانا ہے کیونکہ وہ تمھیں دیکھنے کی بے حد مشتاق ہیں۔ کیوں؟ اس کی وجہ وہاں جا کر تمھیں بہت جلد معلوم ہو جائے گی۔ ہاں تمھیں اپنی طاقت اور فن کا مظاہرہ کرنے کا بھی موقع دیا جائے گا مگر یہ موقع تمھیں اُس وقت ملے گا جب کالا برق شہر میں آئے گا اور اس کے اعزاز میں موت کے کھیلوں کے مقابلے منعقد کیے جائیں گے۔ اگر ملکہ تمھیں دیکھنے کی مشتاق نہ ہوتی اور تمھیں موت کے مقابلوں کے لیے منتخب نہ کیا گیا ہوتا تو اب تک تمھاری لاش کیڑوں مکوڑوں کی خوراک بن چکی ہوتی۔"

"تم اتنے بڑے جھُوٹے ہو کہ مجھے تمھاری کسی بات پر یقین نہیں آ سکتا۔" میں نے کہا۔

اس نے فوراً اپنی جیب سے ایک خریطہ نکالا اور پڑھنے لگا جس کا لبِ لباب یہ تھا کہ سرفروش نامی ایک اجنبی کو جسے طوفان نے ساحلِ سراما پر لا پھینکا تھا اور جو اَب تربیت گاہِ غلاماں میں زیرِ تربیت ہے، ملکۂ عالیہ کی خوشنودی و مسرت کے لیے سراما سیڈ لایا جائے۔

"خوشنودی و مسرت" کے الفاظ ادا کرتے ہوئے برداش نے مُسکرا کر میری طرف دیکھا تھا... پھر وہ خریطہ پڑھتے ہوئے بولا: "ملکہ کی خوشنودی اور مسرت کا مطلب تمھیں وہیں جا کر معلوم ہوگا۔"

میں نے اس کی بات پر کوئی توجہ نہ دی اور سوچنے لگا کہ زینا نے اپنا کام بخوبی انجام دیا ہے۔ اس طرح میرے جڑواں بھائی والی بات بھی پھیل جائے گی۔ اب ہزارہا لوگ میرے ڈپلی کیٹ کو دیکھنا بلکہ تلاش کرنا چاہیں گے اور نادانستہ طور پر میرے مددگار و معاون ثابت ہوں گے۔

"ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی، برداش! ماکونا نے بتایا تھا کہ تربیت گاہ کے کچھ غلام نام نہاد بغاوت کریں گے اور مجھے ان کا سرغنہ قرار دے کر تہِ تیغ کر دیا جائے گا۔ اُس کا کہنا تھا کہ یہ منصوبہ تمھاری ایما پر بنایا گیا ہے۔ اُس منصوبے کا کیا ہوا؟"

"تم ٹھیک کہتے ہو، سرفروش! ہم نے یہی منصوبہ بنایا تھا مگر اس پر عمل کرنے سے پہلے ہی ملکہ کا پیغام بر یہ فرمان لے کر یہاں پہنچ گیا۔ اس سے پہلے مجھے جھنڈوں کے ذریعے صرف تمھاری تلاش کا حکم دیا گیا تھا اور میں نے تمھیں تلاش کر لیا تھا۔"

یہ کہہ کر وہ اُٹھا اور جس چھوٹے سے چوبی تخت پر بیٹھا تھا، اُسے ٹھوکر مار کر دُور پھینک دیا۔

"ماکونا ایک احمق آدمی تھا۔ ہم دونوں اکٹھے پڑھا کرتے تھے لیکن وہ ہمیشہ سے کم عقل تھا۔ مجھے اس کے دوسرے منصوبے کا علم نہیں تھا کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہے مگر مجھے اس پر کبھی اعتماد نہیں رہا۔ جس طرح اُس کے جاسوس میرے دستے میں کام کرتے ہیں، اُسی طرح میرے جاسوس بھی اس تربیت گاہ میں موجود ہیں اور وہ اس مرتبہ ماکونا کے جاسوسوں سے برتر ثابت ہوئے۔ نتیجے میں ماکونا کو اپنے سر کا نذرانہ دینا پڑا۔ تم بھی اس لیے زندہ ہو کہ ملکہ تمھیں دیکھنے کی... خواہشمند ہے ورنہ تمھارا حشر بھی وہی ہوتا جو ماکونا کا ہُوا ہے۔ میرا خیال ہے، آگے جا کر تم یہی خواہش کرو گے کہ کاش تم بھی ماکونا کے ساتھ ہی مر جاتے تو زیادہ اچھا ہوتا۔"

اتنے میں اُس کے دستے کے کچھ مسلح جوان کوٹھڑی میں داخل ہوئے۔

برداش نے اُنھیں حکم دیا: "ان دونوں کو لے چلو!"

پیلو کی زنجیریں ایک دم جھنجھنا اُٹھیں۔

میں نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے برداش سے کہا: "یہ میرا نوکر ہی نہیں، دوست بھی ہے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ اس کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے۔"

برداش نے کندھے اُچکاتے ہوئے جواب دیا: "میں نوکروں، غلاموں حتیٰ کہ اساتذہ کی بھی پروا نہیں کیا کرتا۔ اس کے ساتھ بھی ویسا ہی اچھا سلوک کیا جائے گا، جیسا کہ تمھارے ساتھ ہوگا۔"

مجھے برداش کے اس جواب میں طنز محسوس ہُوا مگر میں نے پیلو کو دلاسا دیتے ہوئے کہا: "گھبراؤ نہیں پیلو! ہم ملکہ کی امان میں ہیں اور ہمارا اچھا وقت ضرور آئے گا۔"

آخری جُملہ میں نے برداش کو سُنانے کے لیے کہا تھا مگر مجھے اُس کا ردِ عمل معلوم نہ ہو سکا کیونکہ اُس وقت وہ دروازے کی طرف مُڑ چکا تھا اور میں اس کے چہرے کے تاثرات نہیں دیکھ سکا تھا۔

لڑاکا غلاموں کی نصف میل لمبی قطار کسی اَدھ مُوئے سانپ کی طرح بھُوری مٹی والے میدان میں رینگ رہی تھی۔ ہر غلام کو ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنانے کے بعد ایک طویل زنجیر سے منسلک کر دیا گیا تھا۔ غلام دو دو کی قطار میں چل رہے تھے اور برداش کا دستہ اُن پر کڑی نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ خود برداش اپنے سفید گھوڑے پر سوار سب سے آگے آگے چل رہا تھا۔

میں اور پیلو اس قطار کے درمیانی حصّے میں تھے۔ تربیت گاہِ غلاماں سے چلے ہوئے آج ہمیں دوسرا دن تھا اور ابھی تین منزل سفر باقی تھا لیکن پیلو کی حالت ایک ہی روز کے سفر سے غیر ہو چکی تھی۔ وہ کل ایک بار گر پڑا تھا اور جو غلام تین بار گر پڑتا تھا، اُسے زنجیر سے علیٰحدہ کر کے برداش کے سامنے پیش کر دیا جاتا تھا جو بذاتِ خود اُس کا معائنہ کرتا اور اگر اُسے زندہ رکھنا مناسب سمجھتا تو اُس غلام کو گھوڑوں سے کھینچی جانے والی گاڑی میں ڈال دیا جاتا ورنہ وہ اپنے سپاہیوں کو اشارہ کرتا جو اُسی وقت اُس غلام کو برچھیاں مار مار کر ہلاک کر دیتے اور اُس کی لاش وہیں پھینک دی جاتی۔

پہلے دن کے سفر میں بارہ بدنصیب غلاموں کا یہی حشر ہو چکا تھا اس لیے میں پیلو کی وجہ سے خاصا فکرمند تھا۔ مجھے اُس سے بڑی اُنسیت ہو گئی تھی اور میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ برداش کے عتاب کا شکار ہو۔ چنانچہ میں نے اُس سے قریب تر ہو کر زنجیر کا بوجھ اپنے ہاتھ پر سہار لیا تھا اور اس کی ہمت بڑھاتا جا رہا تھا کیونکہ آج بھی وہ گر چکا تھا۔ اب اگر وہ تیسری بار گر پڑتا تو اُسے برداش کے سامنے پیش کر دیا جاتا۔ جو پہلے ہی سے اُس کی تاک میں تھا۔

کھانے پینے کے معاملے میں ہم سے بُخل نہیں برتا جا رہا تھا۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ غلاموں کو چاق و چوبند رکھنا ضروری تھا تاکہ وہ کالے بروق کی آمد پر اُس کے اعزاز میں منعقد ہونے والے موت کے مقابلوں میں حصہ لے سکیں۔ میں اپنے حصے کا کچھ کھانا اور پانی پیلو کو دے دیا کرتا تھا تاکہ اُس کی قوت برقرار رہے۔

کبھی کبھی برداش غلاموں اور اپنے آدمیوں کا جائزہ لینے کے لیے پیچھے آتا تھا۔ ایک بار وہ ہمارے قریب سے گزرا تو میں نے پُوچھا۔

"کیا میں پیلو کو اُٹھا لوں، یہ میرے لیے بہت ہلکا پُھلکا ہے۔"

"نہیں۔" برداش نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ایسا کرنا ممنوع ہے۔ اگر یہ تیسری بار گرا تو میں خود اس کا معائنہ کروں گا۔"

پھر اُس نے دو سپاہیوں کو بلا کر انھیں کچھ ہدایات دیں اور وہاں سے چلا گیا۔ اب وہ سپاہی ہمارے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ میں نے برداش سے اجازت لے کر خواہ مخواہ مصیبت مول لے لی تھی۔

میں نے پیلو کو ہدایت کی کہ اگر وہ گرنے لگے تو پہلے مجھے آواز دے دے۔ میں فوراً اُسے سنبھال لوں گا۔

"مجھے مر جانے دیجیے۔ مجھ سے یہ صعوبت برداشت نہیں ہو سکتی۔" اس نے سسک کر کہا۔

"نہیں پیلو، مجھے تمھاری ضرورت ہے۔ اس ملک میں صرف تم ہی تو میرے دوست ہو۔"

"اور شہزادی زینا؟" وہ چونک کر بولا۔ "حالانکہ مجھے تعجب۔۔۔"

"مجھے بھی تعجب ہے، پیلو۔ اگر زینا نے ہمارے لیے راہ ہموار کی ہوتی یا حالات اُس کے قابو میں ہوتے تو ملکہ کے داماد کی حیثیت میں مجھ سے یہ سلوک نہ کیا جاتا۔" میں نے پیلو سے پہلی بار اپنا خدشہ بیان کیا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے برداش کے وہ الفاظ بھی یاد آ گئے کہ ملکہ اپنی خوشنودی اور مسترت کے لیے مجھ سے ملنے کی مشتاق ہے۔

رات کو سوتے وقت بھی ہمیں زنجیروں سے آزاد نہیں کیا جاتا تھا۔ اس لیے غلام آرام کی نیند نہیں سو سکتے تھے۔ اور میں تو پیلو کو اور بھی دیر تک جگائے رکھتا تھا تاکہ سراما کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کر سکوں۔ میں نے اُس سے یہاں کے حروفِ تہجی بھی سیکھ لیے تھے اور جھنڈوں سے دیے جانے والے پیغامات کو بھی تھوڑا تھوڑا سمجھنے لگا تھا۔ پیلو نے مجھے مقامی مذہب اور دیوتا بروق ۔۔۔ کے بارے میں بھی کافی معلومات فراہم کی تھیں اور یہ ساری باتیں اپنے آپ ہی میری یادداشت میں محفوظ ہوتی جا رہی تھیں۔

اور پھر وہی ہُوا جس کا مجھے خطرہ تھا۔ میں نے پیلو کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہوتی جا رہی تھیں اور وہ لہرا رہا تھا۔۔۔ پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ گر گیا۔

اُس کے گرتے ہی شمشیر بردار آدمی تیزی سے آگے بڑھے۔ اُن کا انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ پیلو کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیں گے۔ اس سے قبل کہ ان کی تلواریں پیلو کے جسم تک پہنچتیں، میں ان کے سامنے جم گیا اور میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "تم میں سے کوئی بھی اس کے قریب نہ آئے۔"

وہ حقارت آمیز انداز میں ہنس پڑے۔ اتنے میں برداش بھی گھوڑا دوڑاتا ہُوا پہنچ گیا۔ اس نے پیلو کو زمین بوس دیکھا تو اس کی آنکھیں کسی شیطانی جذبے کے تحت چمک اُٹھیں۔۔۔ پھر جیسے ہی اس کی نگاہ مجھ پر پڑی تو اس نے گہری نگاہ سے میری طرف دیکھتے ہوئے اپنے شمشیر زنوں سے پُوچھا۔ "کیا بات ہے؟ تم لوگ یہاں کیوں کھڑے ہو۔ اس گرے ہوئے آدمی کو اُٹھاتے کیوں نہیں؟"

"اجنبی مزاحمت پر آمادہ ہے۔" ایک شمشیر زن بولا۔

"اوہ۔۔۔" برداش نے سفّاک انداز میں مُسکراتے ہوئے کہا۔ "شاید تم نہیں جانتے 'مزاحمت' بغاوت کے مترادف ہے۔ میں تمھیں صرف ایک موقع دے سکتا ہوں۔ اگر تم سامنے سے نہ ہٹے تو تمھارا انجام بھی اس حقیر آدمی سے مختلف نہیں ہوگا۔" یہ کہہ کر اُس نے تین انگلیاں اُٹھا دیں۔ "میں باری باری اپنی انگلیاں۔۔۔ جھکاؤں گا۔ تیسری انگلی جھکنے تک تمھارے پاس مہلت ہے۔"

میرا جسم ٹھنڈے پسینے میں بھیگنے لگا۔

اس کی ایک انگلی جُھک گئی۔ پیلو اب بھی بے حس و بے حرکت پڑا تھا۔ دوسری انگلی بھی جُھک گئی۔۔۔ اور پھر تیسری انگلی جُھکتے ہی تلواروں اور زنجیروں کی جھنکاروں سے ماحول کانپ اُٹھا۔ برداش کی للکار ہر آواز پر بھاری تھی۔ میری سانس حلق میں جس مقام پر تھی، وہیں اٹک گئی اور دل جیسے دھڑکنا ہی بھول گیا۔

میں چند ساعتوں کے لیے شل سا کھڑا رہ گیا۔

یُوں لگ رہا تھا جیسے میری سوچیں اور میرے خیالات تک انجماد کا شکار ہو گئے ہوں۔ میرا رُواں رُواں ٹھٹھر گیا ہو اور میری ہستی برف کی وزنی سلوں کے نیچے دب کر رہ گئی ہو۔ پیلو کا وجود اب بھی ساکت پڑا تھا۔ معلوم نہیں اس بے چارے کی رُوح، جسدِ خاکی سے رُوٹھ گئی تھی یا وہ وقتی طور پر بے ہوشی کی دُھند میں ڈُوب گیا تھا۔۔۔ برداش نے جیسے ہی تیسری اُنگلی اُٹھا کر مہلت کا وقت ختم ہونے کا اشارہ کیا تھا، اس کے فوراً ہی بعد گویا موت چاروں طرف سے اپنے بھیانک جبڑے کھولے ہمارے طرف لپک پڑی تھی۔

"رُک جاؤ۔" میں نے برداش کی للکار کے جواب میں دھاڑ کر کہا۔ "برداش! تم جانتے ہو کہ تمھارا یہ پُورا دستہ بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اگر تمھیں یقین نہ ہو تو تم میری بات عمل کی کسوٹی پر پرکھ سکتے ہو۔۔۔ اور اگر تم سمجھتے ہو کہ میں دروغ بیانی سے کام نہیں لے رہا تو اپنے شمشیر زنوں کو روک لو۔"

میری آواز میں بے پناہ سفّاکی تھی۔

غالباً اس سے پہلے سراما کے ان باشندوں نے کسی کی آواز میں ایسی گھن گرج نہیں سُنی تھی کہ شمشیر زن یکایک رُک گئے۔ تلواریں بے ہوش پیلو سے کچھ ہی فاصلے پر ساکت ہو گئیں ورنہ اُس کا مختصر سا وجود بوٹیوں میں بٹ چکا ہوتا۔

"میں پہلے بھی بتا چکا ہُوں کہ مجھے ملکہ کی امان حاصل ہے۔" میں نے مزید مؤثر لہجے میں کہا۔ "اور یہ شخص میرا نوکر ہے۔"

"لیکن اصُول یہ ہے کہ جو شخص تین بار گر جائے اُسے۔۔۔"

"ایسا صرف اُسی صُورت میں ہوتا ہے، جب گرنے والے کا بوجھ اُٹھانے والا کوئی نہ ہو۔" میں نے اُس کی بات قطع کرتے ہوئے کہا۔ "میں اسے اُٹھا سکتا ہُوں۔ ہاں۔۔۔ اگر میں تین بار تو درکنار، ایک بار بھی گر پڑوں تو تم مجھے بے شک ٹکڑے ٹکڑے کر دینا۔"

اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ انداز میں بے چینی تھی جیسے وہ کوئی فیصلہ کرنے میں دشواری محسوس کر رہا ہو۔ اس کے سپاہی مستعد کھڑے تھے۔ چند ساعتوں تک وہ میری طرف گھُورتا رہا پھر اُس کے شیطانی ذہن میں کوئی مافوق منصوبہ جنم لینے لگا اس کے ساتھ ہی اس کے ہونٹ سفّاک انداز میں مسکرانے لگے جبکہ چہرہ کسی دیوار کی طرح بے شکن رہا اور آنکھیں انگاروں کی طرح دہکتی رہیں۔

"ٹھیک ہے۔" وہ غرّایا۔ "اسے اُٹھا لو۔۔۔ لیکن خیال رہے۔ اگر تم ایک بار بھی گرے تو تمھیں اور اسے آخری ہچکی زمین کے سینے میں دفن ہو کر ہی لینی پڑے گی۔" یہ کہہ کر اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور قافلے کے آگے آگے گھوڑا دوڑانے لگا۔

میں نے پیلو کا جائزہ لیا۔

وہ زندہ تھا لیکن اُکھڑی اُکھڑی سانسیں لے رہا تھا۔

میں نے اُسے کندھے پر اُٹھا لیا اور قافلہ منزلِ مقصُود کی طرف بڑھتا رہا حتیٰ کہ چوتھے روز ہم پابہ زنجیر غلاموں کی قطار ایک تنگ درّے سے گزر کر پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گئی۔ دو روز میں پیلو کی حالت کافی سنبھل گئی تھی۔ اس کے بعد سے اب تک وہ اپنے پیروں سے چل رہا تھا۔

میں پلکیں جھپک جھپک کر وادی میں آباد سراما سیڈ کا نظارا کرنے لگا۔ برداش نے ہمیں تھوڑی دیر آرام کرنے کی اجازت دے دی تھی حالانکہ ہمیں اب آرام کی ضرورت نہیں تھی۔

میری نگاہیں چاروں طرف کا جائزہ لینے میں مصروف تھیں۔ شہر کے پس منظر میں سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا اور بندرگاہ بادبانی کشتیوں سے اٹی ہوئی تھی۔ پیلو مجھے بتا چکا تھا کہ سراما سیڈ اس ملک کی تجارتی بندرگاہ ہے۔ شہر، خاکنائے کی وجہ سے بڑی محفوظ جگہ آباد تھا۔ جس کے عین وسط میں ملکہ فیرا کا محل واقع تھا۔ اس محل میں ایک اُونچا مینار تھا جس پر ایک بڑے ڈنڈے کے ساتھ مختلف اقسام اور رنگوں کے پرچم لہرا رہے تھے میں نے پیلو کے بتائے ہوئے طریقے سے ان جھنڈوں کا پیغام پڑھنے کی کوشش کی۔۔۔ اور اس میں کامیاب بھی ہو گیا۔ پیغام یہ تھا۔

"خوش آمدید برداش! اجنبی کو فوراً لے آؤ۔ فیرا"

پیلو جو اب بے حد تازہ دم ہو چکا تھا، بولا۔ "اب میرے اور آپ کے بچھڑنے کا وقت آ گیا ہے۔"

"ہماری یہ علیحدگی بہت مختصر وقت کے لیے ہو گی پیلو۔ میں زینا سے ملتے ہی کہوں گا کہ وہ تمھیں بُلوا کر میرے ساتھ رکھے اور مجھے اُمید ہے کہ وہ میری بات نہیں ٹالے گی۔"

"اگر آپ اُس سے مل سکے تو۔۔۔" پیلو بولا۔ "آپ سراما کے متعلق بہت کم جانتے ہیں۔ ملکہ فیرا بڑی سخت مزاج اور ظالم ہے مگر برداشت جیتی نہیں۔ وہ اپنے حُسن اور تاج و تخت کے سلسلے میں بے حد محتاط ہے۔ کہتے ہیں کہ وہ خوبصورت بچیوں کو مروا دیتی ہے تاکہ کوئی عورت اُس سے زیادہ حسین نہ کہلا سکے۔ یہ بھی مشہور ہے کہ وہ ازل سے زندہ ہے اور ابد تک زندہ رہے گی۔ نہ کبھی بوڑھی نہیں ہو گی اور اس کا حُسن ہمیشہ اسی طرح قائم و دائم رہے گا۔"

"بس رہنے دو پیلو۔ یہ نری بکواس ہے۔ ایسی کہانیاں تو

بچوں کو ڈرانے کے لیے سُنائی جاتی ہیں۔" میں نے درشتی سے کہا۔

وہ بے چارہ خاموش ہو گیا۔

اتنے میں ایک گرج دار آواز سُنائی دی اور نشیب سے اُٹھنے والے زرد رنگ کے کثیف دُھویں کے ساتھ بدبُو بھی پھیل گئی۔ یہ بدبُو ایسی تھی جیسے چمڑا اور ہڈیاں جلائی جا رہی ہوں۔

"یہ دُھواں اور بدبُو کیسی ہے؟" میں نے پوچھا۔

اُس نے شہر کی فصیل سے پرے دیوتا بردق کے ایک بہت بڑے مجسمے کی طرف اشارہ کیا جو کم از کم سو ہاتھ اُونچا ہو گا۔ یہ زرد کثیف دُھواں اُسی کے مُنہ سے نِکل رہا تھا۔

"یہ سراماسیڈ کا آتشیں بردق ہے۔ یہ بدبُو ہڈیوں اور آگ میں جھونکے جانے والے غلاموں اور مُجرموں کے مُردہ اجسام کی ہے۔ جب کالا بردق یہاں آئے گا تو بردق کے لیے قربانیاں دی جائیں گی۔ غلاموں اور مُجرموں کو بردق کی بھینٹ چڑھایا جائے گا۔ اس لیے پُجاری اس کی صفائی کر رہے ہیں۔"

اتنے میں برداش چھ سپاہیوں کے ساتھ ہمارے پاس آیا اور بولا: "چلو سرفردش... شاید شہزادی تمھارے فراق میں ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپ رہی ہے۔ اس لیے تمھیں فوراً حاضری کا حکم دیا گیا ہے۔"

میں نے برداش کا طنز تو محسوس کر لیا مگر اس سلسلے میں کچھ بولا نہیں، صرف اتنی یاد دہانی کرائی: "پیلو کو بھی کھول دو۔ یہ میرا نوکر ہے اور مجھے اس کی ضرورت پڑے گی۔ دُوسرے ہم دونوں ملکہ کی امان میں ہیں۔"

برداش نے بڑے زور کا قہقہہ لگایا اور پیلو کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے بولا: "ملکہ اس بونے کی امین ہے؟ اس بُزدل بھگوڑے کی...؟ جسے اُس کی اپنی بیوی نے غلام بنوا دیا تاکہ وہ کسی اور کو اپنا شوہر بنا سکے۔"... پھر وہ پیلو سے مخاطب ہُوا: "ملکۂ عالیہ کو تمھارے اس حسین مردانہ پیکر سے محروم تو رہنا پڑے گا مگر وہ یہ دُکھ برداشت کر ہی لیں گی، بونے غلام۔"

پیلو نے ایک جھٹکے سے اپنی گردن اُٹھائی اور ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہُوئے بولا: "مجھے غلام مت کہو۔ میں غلام نہیں ہوں اور نہ کبھی بنوں گا۔"

میں پیلو کی اس جرأتِ مردانگی پر دنگ رہ گیا جبکہ برداش نے تلوار چپٹی کر کے اس کے سر پر دے ماری۔ میں برداش کی طرف لپکا... مگر اُس کے تین سپاہی میرے بازوؤں سے لپٹ گئے۔ تلوار چپٹی ہونے کے باعث پیلو کو زیادہ زور کی چوٹ نہیں آئی تھی۔ اس نے آہستہ سے اپنا سر اٹھایا اور بولا: "آپ کو بردق کی قسم۔ میری وجہ سے نہ لڑیں۔"

میں نے اپنے آپ پر قابو پا لیا اور سپاہیوں کے ساتھ جاتے ہوئے اسے تسلی دی: "میں تمھارے لیے جو کچھ بھی کر سکا ضرور کروں گا... مگر ڈرنا نہیں، پیلو۔ اب اسی طرح مرد بنے رہنا۔"

میں تقریباً دو گھنٹوں سے کسی مجسمے کی طرح اُس چوکی پر کھڑا تھا جو ملکہ فیرا کے تخت اور اس کے پانچ مشیروں کی کُرسیوں کے درمیان رکھی تھی۔

ملکہ فیرا کے دربار میں لانے سے پہلے مجھے نہلایا اور اس طرح سجایا سنوارا گیا تھا جیسے دُلہنوں کا سنگھار کیا جاتا ہے۔ میری داڑھی عمدگی سے تراشی گئی تھی۔ بالوں میں عِطر لگایا گیا تھا اور پہننے کو حریری لباس اور نفیس جُوتے دیے گئے تھے۔ میرے جسم کا اُوپری حصہ البتہ بے لباس رکھا گیا تھا۔

ملکہ فیرا کا یہ دربار ایک طویل و عریض کمرے پر مشتمل تھا جس کے کُھلے دریچوں سے بندرگاہ دکھائی دے رہی تھی۔ کمرے کی دیواریں، تخت کا چبوترہ، چوکی اور کُرسیاں سب کی سب سنگِ سفید کی بنی ہوئی تھیں جو سراماسیڈ میں عام تھا۔

ملکہ فیرا کی کُرسی چبوترے پر رکھی ہُوئی تھی۔ اس کے سامنے نیم دائرے کی شکل میں اس کے پانچ مشیروں کی کُرسیاں تھیں جو پُجاری تھے اور درمیان میں وہ چوکی تھی جس پر میں ایک مُجرم کی طرح کھڑا تھا۔ ملکہ فیرا کی رنگت دُودھ کی طرح سفید تھی مگر بال گہرے سیاہ تھے۔ وہ بلاشبہ بے حد حسین تھی۔ اس کے جسم اور چہرے سے اس کی عمر کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ جوان بیٹیوں کی ماں ہونے کے باوجود [illegible]وان نظر آتی تھی اور شاید اسی لیے اس کے متعلق یہ روایت مشہور تھی کہ وہ نہ تو کبھی بوڑھی ہو گی اور نہ ہی اس کے حُسن کو زوال آئے گا۔

ملکہ کے مشیروں کے سر مُنڈے ہُوئے تھے اور داڑھی مونچھیں صاف تھیں۔ وہ اپنے سیاہ لبادوں میں ایسے بوڑھے گِدھ نظر آتے تھے جن کی گردنوں کے بال و پر جھڑ گئے ہوں۔ انھوں نے میرے بارے میں صرف اتنا کہا تھا۔

"یہ اجنبی ہے اور اجنبی غلاموں کے ساتھ سراماسیڈ کی شہزادیاں شادی نہیں کر سکتیں۔ اس لیے زینا کے ساتھ اس کی شادی منسوخ کی جاتی ہے۔ شہزادی زینا اس کے ساتھ شادی کرنے کے جُرم میں جہاز پر سزا بھگتے گی۔"

میں نے اپنی وکالت کے لیے لب کشائی کرنا چاہی تو مجھے سختی سے روک دیا گیا۔ اب میں اپنے آپ کو بے یار و مددگار اور تنہا

محسوس کر رہا تھا کیونکہ زینا سے البتہ توقعات یکسر ختم ہو چکی تھیں... قبل ازیں اس قسم کے مواقع پر میرا توانا جسم اور جوانی ساتھ دیتی آئی تھی لیکن اب کے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میرا جسم اور جوانی بھی میرے کسی کام نہیں آ سکے گی کیونکہ ملکہ کے مشیروں کا رویّہ بے حد جارحانہ اور منتقمانہ تھا۔

یہ مجلسِ مشاورت دو گھنٹوں سے جاری تھی۔ بالآخر ملکہ کے مشیرِ اعلا کرنڈ نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ملکۂ عالیہ! دو روز میں کالا بردق اپنا سالانہ خراج وصول کرنے کے لیے یہاں پہنچ جائے گا۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی اُسے خراج ادا کر دینا چاہیے کہ ہم کمزور ہیں اور اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اُسے "میٹا" دینے کے علاوہ اس کے اعزاز میں موت کے مقابلے بھی منعقد کیے جائیں گے اور قربانیاں بھی دی جائیں گی۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ ہم ملزم سرفردش کو تحفے کے طور پر کالے بردق کی خدمت میں پیش کر دیں۔ اگر وہ اپنے ذوق و مقاصد کی تکمیل کے بعد اسے لوٹا دے تو ہم اسے دیوتا بردق کی بھینٹ چڑھا دیں گے۔ بردق اس کی قربانی سے بہت خوش ہو گا اور دیوی طوری سے ہماری سفارش کرے گا تو وہ ہم پر اپنی برکتیں نازل کرے گی اور ہمیں ایسی قوت بخشے گی جس کے بل بوتے پر ہم کالے بردق سے ہمیشہ کے لیے نجات حاصل کر لیں گے۔"

ملکہ کے چاروں مشیروں نے اس تجویز پر سر ہلا دیے جیسے وہ بھی اس سے متفق ہوں۔ مشیرِ اعلا کی یہ تجویز، دُوسرے الفاظ میں میری موت کا منصوبہ تھی۔ اس لیے میں نے ملکہ کے تاثرات کا اندازہ لگانے کی خاطر کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے حسین سراپا نے میری دلی حالت تہ و بالا کر دی لیکن دُوسرے ہی لمحے میری توجہ جواہرات سے مرصع اُس نازک سے عصا کی طرف مبذول ہو گئی جو اُس نے اپنے دائیں ہاتھ میں تھام رکھا تھا۔ وہ اسی عصا سے اپنے مشیرِ اعلا کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے بولی۔

"تم سوچے سمجھے بغیر بولنے کے عادی ہوتے جا رہے ہو بڑے میاں۔ تمھاری تجویز ملک و قوم کی بدخواہی کے مترادف ہے۔ کالے بردق کو خراج دینا مجھے بھی پسند نہیں لیکن تم اچھی طرح جانتے ہو کہ وہ کئی سالوں سے معاہدہ توڑنے اور ہم پر حملہ کرنے کے بہانے ڈھونڈ رہا ہے۔ اگر اُسے یہ شک ہو جائے یا تمھاری تجویز کی بھنک پڑ جائے تو وہ فوراً ہم پر حملہ کر دے گا۔"

کرنڈ نے ملکہ کی اس بات پر ندامت سے سر جھکاتے ہُوئے کہا: "میں اپنی غلطی پر معذرت خواہ ہوں ملکۂ عالیہ... لیکن میرا خیال تھا کہ اس طرح ہم سرفردش..."

"بس خاموش ہو جاؤ کرنڈ۔" ملکہ اس کی بات کاٹتے ہُوئے بولی: "سرفردش کے سلسلے میں مجھے تمھاری تجویز سے اتفاق نہیں ہے۔"

"میں آپ کی توجہ ماکونا کی طرف دلانا چاہتا ہوں ملکۂ عالیہ۔" کرنڈ نے پھر بولنا شروع کیا: "آپ بخوبی جانتی ہیں کہ وہ ایک محبِ وطن افسر تھا مگر کپتان برداشں اسے قتل کرنے پر مجبور ہو گیا۔ کیوں؟ اس لیے کہ وہ اسی سرفردش کے بہکاوے میں آ گیا تھا۔ اسی نے اسے بغاوت پر اُکسایا تھا۔ اس لیے ہمیں بہرطور اسے ٹھکانے لگا دینا چاہیے۔"

مجھے مشیرِ اعلا کی بات سے یہ اندازہ کرنے میں دیر نہ لگی کہ وہ برداش کا ساتھی ہے چنانچہ میں نے بے ساختہ ملکہ کی طرف دیکھا جو عصا سے کھیلتے ہُوئے میری جانب ہی دیکھ رہی تھی۔ ایک لمحے کے لیے ہماری نظریں ایک دُوسرے سے ملیں تو مجھے اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک دکھائی دی مجھے اس چمک کا صحیح مفہوم معلوم نہ ہو سکا۔ یہ چمک مجھے پھانسی کے پھندے تک بھی لے جا سکتی تھی اور میں ملکہ کی خواب گاہ تک بھی پہنچ سکتا تھا۔ پھر وہ عصا سے میری طرف اشارہ کرتے ہُوئے کرنڈ سے بولی۔

"تم چاہتے ہو کہ اسے موت کے گھاٹ اُتار دیا جائے؟"

"ہاں ملکۂ عالیہ۔" مشیرِ اعلا کے اس جواب پر اُس کے ساتھیوں نے پھر تائیدی انداز میں سر ہلا دیے۔

ملکہ نے آنکھیں موند لیں اور عصا سے کھیلتے ہُوئے کچھ سوچنے لگی۔ اب میرے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ برداش اور کرنڈ کی سازش کامیاب ہو گئی ہے اور ملکہ میری سزا کے متعلق غور کر رہی ہے کہ اُسے کتنا کرب ناک بنایا جا سکتا ہے۔ چند لمحوں کے بعد اُس نے آنکھیں کھولیں اور کہنے لگی۔

"میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اسے...!" اتنا کہہ کر اس نے میری طرف اشارہ کیا۔

میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ میری قسمت کے فیصلے کی گھڑی آ گئی تھی۔

"موت کی سزا..." اتنا کہہ کر اُس نے تیز نگاہوں سے میری طرف دیکھا تو میں نے بھی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں کہ موت تو کہیں بھی آ سکتی تھی پھر میں بُزدلی کا اظہار کیوں کرتا۔

"نہیں دی جائے گی کیونکہ یہ اجنبی ہے اور قانونِ میزبانی کے تحت اسے تحفظ حاصل ہے۔"

"لیکن آپ اس قانون میں ترمیم کرنے کی مجاز نہیں ملکۂ عالیہ۔"

مشیرِ اعلا بولا "اگر آپ اسے موت کی سزا نہیں دینا چاہتیں تو پھر سے کالے برق کو تحفے میں دے دیجیے۔"

"تمھارے خیال میں یہ کوئی اچھا تحفہ ثابت ہوگا؟" ملکہ نے پوچھا۔

"ہاں ملکۂ عالیہ۔"

"تو پھر اُس سے زیادہ اچھے تحفے کی حق دار میں خود ہوں۔" ملکہ نے فیصلہ سُنا دیا۔

اس فیصلے سے جہاں میرے دل کا بوجھ ہٹ گیا۔ وہاں میں یہ سوچے بغیر بھی نہ رہ سکا کہ کیا ان لوگوں میں رشتوں کے تقدس کا کوئی تصور نہیں ہے؟ میں رشتے میں ملکہ کا داماد لگتا ہوں لیکن وہ... یا شاید ہو سکتا ہے کہ وہ مجھے تحفے کے طور پر زینا کو دینا چاہتی ہو۔ اتنے میں کریڈ پھر بولا۔

"آپ کا ارشاد بجا ہے ملکۂ عالیہ لیکن تارسُو کا کیا ہوگا۔ میرا خیال تھا کہ آپ اندھے تارسُو ... سے خوش اور مطمئن ہیں۔"

"اُس کے اندھے پن میں ... میرے لیے کوئی دلکشی باقی نہیں رہی اور نہ ہی وہ شاہی خاندان میں کسی لڑکی کے اضافے کا باعث بن سکا ہے۔" ملکہ بولی۔ "مگر سرفروش سے یہ فریضہ انجام دینے کی توقع کی جا سکتی ہے۔"

"مگر ہم نہیں جانتے کہ یہ کون ہے ملکۂ عالیہ۔" کریڈ اب تک میری موت کا خواہاں تھا۔

"سب جانتے ہیں کہ ایک اجنبی ہے۔ اس نے بتایا تھا کہ یہ اپنے جڑواں بھائی کے ساتھ بحری جہاز میں سفر کر رہا تھا جو طوفان میں پھنس کر تباہ ہوگیا اور یہ سچ ہے۔ ہنفشی سمندر میں طوفان آیا تھا جس میں ہمارے بھی کچھ جہاز غرق ہوگئے تھے۔"

میں نے اس اتفاق پر خدا کا شکر ادا کیا جس نے میرے جھوٹ کو سچ بنا دیا تھا۔

ملکہ ابھی تک بولے جا رہی تھی۔

"اور اس کے جڑواں بھائی والی بات بھی سچ ہے۔ تم جانتے ہو، پیغام رساں یہ خبر لایا تھا کہ بالکل اسی حُلیے کا ایک اجنبی بحری قزاقوں کو ساحل پر ملا تھا، وہ اُسے پکڑ کر لے گئے تھے اور آتشیں جزیرے پر چھوڑ آئے تھے۔"

اگرچہ مجھے بتا دیا گیا تھا کہ ملکہ کی اجازت کے بغیر میں... لب کشائی نہیں کر سکتا مگر یہ بات سُن کر میں خاموش نہ رہ سکا۔

"کیا میرا جڑواں بھائی زندہ ہے؟ وہ کہاں ہے؟"

اتنا سُنتے ہی کریڈ پھر بول اُٹھا۔ "اب تو فوری موت اس کا مقدر بن گئی ہے ملکۂ عالیہ۔ اس نے آپ کے حضور آپ کی اجازت کے بغیر لب کشائی کی ہے جس کی سزا فوری موت ہے۔"

"بس، بہت ہو چکی بڑے میاں۔" ملکہ نے عصا بلند کرتے ہوئے غصے سے کہا۔ "یہ تکلفات اپنی جگہ درست سہی لیکن اس وقت میں نے اُنھیں نظرانداز کر دیا ہے۔ اگر سرفروش کو مرنا ہے تو اس کی موت کا فیصلہ میں خود ہی کروں گی، سراما کی حکمراں میں ہوں، تم نہیں ہو۔"

"آپ کا فرمان سر آنکھوں پر۔" کریڈ عاجزی سے بولا۔ "میں نے تو صرف قانون کے احترام میں ایسا کہا تھا۔"

"تم مجھے، سراما کی حکمراں کو قانون پڑھانا چاہتے ہو؟" ملکہ نے غضب ناک لہجے میں پوچھا۔

"نہیں ملکۂ عالی مقام۔ غلام کی یہ جرأت نہیں ہو سکتی۔" کریڈ نے سر خم کرتے ہوئے کہا اور اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔

"تم ہمارے تخت کے قریب آ سکتے ہو سرفروش۔" ملکہ نے مجھ سے کہا۔

میں چوکی سے اُتر کر ملکہ فیرا کے سامنے چلا گیا۔

"کیا تم نہیں جانتے کہ ہمیں گھٹنے ٹیک کر تعظیم دی جاتی ہے؟"

میں نے گھٹنے تو ٹیک دیے مگر اپنا سر بلند ہی رکھا۔ ہماری نگاہیں ایک بار پھر ایک دوسرے سے ٹکرائیں۔ وہ مجھے پسندیدگی سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"تم جسامت میں تارسُو سے دُگنے ہو لیکن میرا خیال ہے کہ پھر بھی اُسے قتل کرنا تمھارے لیے بہت مشکل ہوگا چونکہ وہ اندھا ہے اس لیے تم بھی اندھے بن کر اُس کا مقابلہ کرو.... انصاف کا یہ تقاضا ضرور پورا کیا جائے گا۔"

یہ سُن کر دہشت کی ایک لہر میرے رگ و پے میں دوڑ گئی۔ وہ مجھے اندھا کرنا چاہتی تھی۔ میں نے اپنی دہشت پر پردہ ڈالنے کے لیے کہا۔

"کیا میرا بھائی زندہ ہے ملکۂ عالیہ؟ وہ کہاں ہے۔ اُسے کیسے تلاش کیا جا سکتا ہے؟"

"میں نے یہ نہیں کہا کہ وہ زندہ ہے۔" ملکہ بولی۔ "میں نے کہا تھا کہ بحری قزاق اُسے آتشیں جزیرے میں لے گئے تھے۔ وہاں کوئی زندہ نہیں رہ سکتا کیونکہ وہاں پانی نہیں ملتا اور سورج یوں آگ برساتا ہے جیسے برق کے منہ سے شعلے نکل رہے ہوں۔"

ان باتوں سے مجھے یہ تو پتہ چل گیا تھا کہ میرا ڈبل کیٹ بھی اسی سرزمین پر منتقل ہوا ہے۔ اب یہ معلوم کرنا تھا۔ وہ زندہ ہے یا نہیں اور وہ آتشیں جزیرہ سرامانیسڈ سے کتنی دور ہے، وہاں

کیسے پہنچا جا سکتا ہے چنانچہ میں نے کہا۔

"میں اپنے بھائی گمردش کو تلاش کرنا چاہتا ہوں ملکۂ عالیہ۔ ہم زندگی بھر ایک دوسرے کے ساتھ رہے ہیں۔ اگر اس کے زندہ رہ جانے کا امکان ہے۔ تو میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ مجھے اس کے پاس جانے کی اجازت دی جائے۔"

ملکہ کے پانچوں مشیر سرگوشیاں کرنے لگے۔

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "میرا خیال ہے کہ وہ زندہ نہیں بچا ہوگا اور اگر بچ بھی گیا تو میں تمھیں اسے تلاش کرنے کی اجازت تب تک نہیں دوں گی جب تک تم تارسُو سے مقابلے کے بعد مجھے اتنا خوش نہیں کر دیتے کہ میں تمھاری التجا ٹال سکوں۔"

"آپ کو خوش کرنا مجھے اپنے بھائی کی زندگی سے بھی زیادہ عزیز ہے، محترم ملکہ لیکن ایک اندھے آدمی کو قتل کرنا میرے نزدیک گناہِ عظیم ہے۔"

"تم اس اندھے کو نہیں جانتے سرفروش۔" ملکہ اپنے عصا سے پراسرار انداز میں تھپکتے ہوئے بولی۔ "وہ اندھا تین آدمیوں کو قتل کر چکا ہے جو اُس کی جگہ لینے کے آرزومند تھے۔ اگر اُس نے تمھیں بھی قتل کر دیا تو مجھے افسوس ہوگا۔" پھر وہ اپنے مشیروں سے مخاطب ہوئی۔ "سرفروش اور تارسُو کے مقابلے کا فوراً انتظام کیا جائے۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ آج رات میری خدمت گاہ میں کون آتا ہے سرفروش یا تارسُو...؟"

●

اُنھوں نے مجھے اپنا مدِمقابل نہیں دکھایا اور بہت سے پہرے داروں کے گھیرے میں ایک چوکور اکھاڑے میں لے آئے جس کی سیڑھیوں کے نیچے بہت سی چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں۔ وہ مجھے تنگ و تاریک کوٹھری میں دھکیل کر چلے گئے جس کے دروازے پر متعدد محافظ متعین تھے۔

کوٹھری بے حد غلیظ تھی۔ نہ صرف اُس سے بلکہ ملحقہ کوٹھریوں سے بھی بدبو کے بھبکے اُٹھ رہے تھے۔ ملحقہ کوٹھریوں میں لڑاکا غلام محبوس تھے، ان میں سے کچھ رو رہے تھے، کچھ گالیاں بک رہے تھے اور کچھ قہقہے لگا رہے تھے۔

یہاں آتے وقت میں ان کوٹھریوں میں جھانکتا آیا تھا کہ شاید ہیلو دکھائی دے جائے مگر وہ کسی کوٹھری میں نظر نہیں آیا۔ میں یہ سوچ کر بے حد مغموم ہو گیا کہ اس غریب کا مستقبل مجھ سے بھی زیادہ تاریک ہو گیا ہے۔

مجھے بہت اچھا کھانا دیا گیا... پھر تھوڑی دیر بعد کپتان برداش اور مہا پجاری کریڈ آ گئے۔ برداش خاصا بنا سنورا اور بہت ہی خوش دکھائی دیتا تھا۔

"چونکہ تم قوی الجثہ، تندرست و توانا اور جنگجو آدمی ہو اور غلاموں کے زمرے میں بھی نہیں آتے، اس لیے تم ایک اندھے آدمی کی معذوری سے ناجائز فائدہ اٹھانا پسند نہیں کرو گے۔ تمھیں تارسُو کے ساتھ ایک اندھیرے کمرے میں مقابلہ کرنا ہوگا۔ تاکہ جس طرح اُسے کچھ دکھائی نہیں دیتا، تم بھی کچھ نہ دیکھ سکو۔ کیا تم ان باتوں سے متفق ہو؟"

"ہاں..." میں نے کہا۔ "مقابلے میں کون سے ہتھیار استعمال کیے جائیں گے؟"

برداش نے میرے بڑے بڑے مضبوط ہاتھوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ "تم صرف اپنے ہاتھ استعمال کرو گے مگر تارسُو کو تلوار دی جائے گی۔ وہ تمھارے مقابلے میں چھوٹا ہے۔ کیا تمھیں اس سلسلے میں کوئی اعتراض ہے؟"

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، مہا پجاری بول اُٹھا۔

"یہ اعتراض نہیں کر سکتا۔ ملکہ کا یہی حکم ہے اور ملکہ کا محبوب بننے کے لیے اسے جان کی بازی لگانا ہی پڑے گی۔"

برداش نے جو کبھی خوش نظر آتا تھا اور کبھی ناخوش مجھ پر طنز کرتے ہوئے کہا۔ "تم میری توقعات سے کہیں زیادہ خوش نصیب نکلے سرفروش! تم نے زینا کو ہار کر اُس کی ماں کو جیت لیا ہے۔"

"تم بھی زینا کو ہار چکے ہو کپتان۔" میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "اگر وہ جہاز پر سزا بھگتنے کے لیے بھیج دی گئی ہے تو وہ تم سے بھی اتنی ہی دور ہے جتنی کہ مجھ سے... پھر میں نے تو اُسے پا کر کھو دیا ہے لیکن تم اُسے پا ہی نہیں سکے۔"

یہ سُن کر برداش نے کریڈ کی طرف دیکھا اور دونوں ہنس پڑے۔ برداش بولا۔ "تم ٹھیک کہتے ہو سرفروش! لیکن تم نہیں جانتے اور نہ کبھی جان سکو گے کہ سرامانیسڈ میں کیا کچھ ہوتا ہے؟ خیر ہٹاؤ۔ اب تم موت کے مقابلے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ میری بددعائیں تمھارے ساتھ ہیں۔ تارسُو کو فتح نصیب ہوگی۔"

... پھر اُس نے محافظوں کو حکم دیا کہ مجھے اکھاڑے میں لے چلیں۔ وہ مجھے اپنے نرغے میں لیے ہوئے اکھاڑے کے وسط میں لے آئے۔ میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ اکھاڑے کی سیڑھیاں تماشائیوں سے خالی تھیں لیکن یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ اکھاڑے میں بیک وقت ایک لاکھ تماشائی آ سکتے تھے۔ اکھاڑے کے میدان میں ریت بچھی ہوئی تھی اور وسط میں زمین کے ساتھ

ایک جگہ تختہ نصب تھا جس میں لوہے کا ایک کڑا لگا ہوا تھا۔ یہ تختہ دراصل زمین دوز اکھاڑے کا دروازہ تھا۔

محافظوں کے اشارے پر چند غلاموں نے کڑا پکڑ کر تختہ اُٹھایا تو نیچے اُترنے والی سیڑھیاں دکھائی دینے لگیں۔ برداشن، جس نے اب ہاتھ میں تلوار پکڑ رکھی تھی، زینے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"چلو نیچے اُترو سرفروش۔ تارسُو تمھاری راہ دیکھ رہا ہے۔"

"تارسُو اندھا ہے مگر میری آنکھیں ابھی اندھیرے میں دیکھنے کے قابل نہیں ہوئیں۔" میں نے اُسے جواب دیا۔

"ملکہ نے انصاف کا تقاضا پورا کرنے کا حکم دیا ہے جسے بہرطور پورا کیا جائے گا۔ اب دیر مت کرو۔ شافران تمھاری رہنمائی کے لیے موجود ہے۔"

برداشن یہ کہہ کر مہا پجاری کے ساتھ واپس جانے لگا۔ میں نے غصے میں اُس کے پاؤں پر تھوک دیا اور شافران کی طرف دیکھا جو بے حد کریہہ الشکل گبڑا تھا۔

وہ مکروہ تبسم کے ساتھ بولا۔ "آپ کو شاید میری صلاحیتوں کا علم نہیں ہے، جناب! میں جلاد بھی ہوں اور مجھے تشدد کے نت نئے طریقوں کا موجد بھی کہا جاتا ہے۔ گھبرایئے نہیں، آگے بڑھیے۔ تارسُو کی تلوار بہت دنوں سے پیاسی ہے۔"

میں اُس بدطینت اور مکروہ جلاد کی رہنمائی میں سیڑھیاں اُترنے لگا۔

نیچے تہ خانے میں شاید مشعل جل رہی تھی۔ اُس کی زرد مدھم روشنی یوں دکھائی دے رہی تھی جیسے کسی سُرنگ سے گزرتے ہوئے اس کے سامنے والے حصے میں نظر آیا کرتی ہے۔

تہ خانے کی تین دیواریں تو سنگِ سفید سے بنی ہوئی تھیں مگر چوتھی دیوار لکڑی کی تھی۔ شافران نے اُس دیوار پر دستک دیتے ہوئے باآوازِ بلند کہا۔ "کیا تم تیار ہو تارسُو؟"

دیوار کی دُوسری جانب سے کرخت آواز آئی۔ "ہاں میں اپنی تلوار کی پیاس اس شیطان کے خون سے بجھانے کے لیے بے چین ہوں، گبڑے۔"

"تو دیوار پر ہاتھ رکھ دو تاکہ جب یہ بیچ سے ہٹے تو تمھیں پتہ چل جائے۔" شافران نے اسے ہدایت دی۔

"وہ میں نے پہلے سے رکھا ہُوا ہے، گنجے جلاد۔ اب بکواس بند کرو اور مجھے شکار کھیلنے دو۔"

شافران میری طرف پلٹا اور بولا۔ "آپ سمجھ گئے نا؟ یہ کھیل بہت آسان ہے۔ میں جلتے ہوئے مشعل لے جاؤں گا اور جب اُوپر کا دروازہ بند ہو جائے گا تو روشنی کی ننھی سی کرن بھی یہاں تک نہیں پہنچ سکے گی۔ تب یہ چوبی دیوار اُوپر اُٹھ جائے گی۔ اُدھر بھی اتنا ہی بڑا اور ایسا ہی ایک کمرہ ہے پھر آپ اور تارسُو موت کا کھیل کھیلنے کو یہاں رہ جائیں گے۔ میرا خیال ہے کہ اب آپ سے کبھی ملاقات نہیں ہو سکے گی۔ ہا ہا ہا۔"

مجھے اس بدطینت گبڑے پر غصہ آ گیا۔ میں نے اُسے شانوں سے پکڑ کر سیڑھیوں کی طرف موڑتے ہوئے پیچھے سے کمر پر زوردار لات رسید کی اور کہا۔ "دفع ہو جاؤ۔"

اُس نے دیوار سے مشعل اُتاری اور سیڑھیاں چڑھتے ہوئے بولا۔ "شکریہ! تمھاری لاش گھسیٹتے ہوئے میں یہ قرض چُکانا نہیں بھولوں گا۔"

"نکل جاؤ ورنہ میں تمھاری گردن توڑ دوں گا۔" میں چلایا۔

وہ تیزی سے زینہ چڑھتا چلا گیا۔ میں جلدی سے چوبی دیوار کے قریب آیا اور پیٹ کے بل فرش پر لیٹ گیا۔ میرا ایک ہاتھ دیوار پر تھا۔ اتنے میں اُوپر سے تختے والا دروازہ گرا اور ایک دم چھا جانے والے گہرے اندھیرے میں چوبی دیوار اُوپر اُٹھنے لگی۔ میں نے اپنا ہاتھ ہٹا لیا کہ اس سے کوئی آواز نہ پیدا ہو۔

اب وہاں گھپ اندھیرا اور سناٹا مسلط تھا۔

میں نے اپنی سانس بھی روک لی۔

چند لمحے اپنے اندر اضطراب اور خوف و دہشت کے طوفان لیے گزر گئے۔ میں دم سادھے پڑا رہا۔ اچانک مجھے اپنے قریب ہی انسانی پسینے کی بُو آئی اور اس کے ساتھ ہی "شپ" کی آواز سُنائی دی۔

تارسُو کی تلوار میرے سر کے عین اُوپر لہرائی تھی اور یہ آواز اُسی کی تھی۔ شاید وہ بھی دُوسرے کمرے میں عین میرے مقابل کھڑا تھا اور اب اُس نے پہلا قدم اُٹھا کر ہوا میں تلوار چلائی تھی۔

میں نے فوراً بائیں جانب لوٹ لگائی۔

دُوسرے ہی لمحے مجھے کمرے کے پتھریلے فرش پر چنگاریاں سی اُڑتی دکھائی دیں۔

تلوار بڑے زور سے فرش کے ساتھ ٹکرائی تھی۔

میں ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل کسی کیکڑے کی طرح چلتا ہُوا پچھلی دیوار کی طرف لپکا اور دم سادھ کر پھر پیٹ کے بل لیٹ گیا۔

میری چھٹی حس تیزی سے کام کرنے لگی تھی۔

مَیں نے ذہن میں کمرے کا نقشہ بنایا۔ زینہ میری پُشت پر نو یا دس قدم دُور تھا۔ وہ اتنا تاریک تھا کہ اس میں تلوار نہیں گھُمائی جا سکتی تھی۔ مَیں نے سوچا اگر مَیں تارسُو کو وہاں تک لے جاؤں تو کیسا ہے؟ جب وہ تلوار گھُمانے کے قابل ہی نہیں رہے گا تو مَیں آسانی سے اسے ٹھکانے لگا دوں گا... مگر یہ بعد کی بات تھی۔ ابھی تو مجھے اس کے اندھے وار سے بچنا تھا... اور پھر مجھے یہ سوچ کر ہی جھرجھری آ گئی کہ اگر اندھیرے میں اس کا وار مجھ پر پڑ جائے تو...

اتنے میں ٹن سے کوئی چیز میرے سامنے فرش پر گری۔ یہ کوئی کنکر معلوم ہوتا تھا مگر مَیں اپنی جگہ ساکت رہا۔ تارسُو نے مجھے کھوجنے کے لیے بہت پُرانی چال چلی تھی۔ ایک لمحے بعد پھر وہی بُو میرے نتھنوں سے ٹکرائی مگر اب اس میں تیل یا چربی کی بساند بھی شامل تھی۔

میں بجلی کی سی سرعت کے ساتھ دیوار سے ہٹ گیا۔

میرے ہٹتے ہی تلوار دیوار سے ٹکرائی اور اس ٹکر سے اُڑنے والی چنگاریوں سے مَیں نے اندازہ لگا لیا کہ تارسو کہاں کھڑا ہو گا۔ پیشتر اس کے کہ وہ دُوسرا وار کرتا... میں فلائنگ کِک مارنے کے انداز میں اُس کی طرف اُچھلا تو میرا ایک پیر تارسُو کے جسم سے ٹکرا گیا۔

وہ گرا، تلوار فرش سے ٹکرائی اور اس کے ساتھ ہی مَیں اس پر جا پڑا، مگر میرا آدھا دھڑ اُس پر اور آدھا فرش پر تھا۔

مَیں نے اپنے وزن اور طاقت سے اُسے دبوچ کر بے بس کرنا چاہا لیکن اُس کم بخت نے اپنے جسم پر چربی یا تیل ملا ہُوا تھا، اس لیے وہ مچھلی کی طرح پھسل پھسل جاتا تھا۔ مَیں اپنے ہاتھ اس لیے استعمال نہیں کر سکتا تھا کہ اُن سے مَیں نے اُس کے ہاتھ پکڑ رکھے تھے تاکہ وہ مجھ پر تلوار کا وار نہ کر سکے۔

وہ اندھا جسامت میں مجھ سے کم ہونے کے باوجُود بے حد عیار اور چُست و چالاک نکلا۔ اس جدوجہد کے دوران اُس نے اپنے دانت میرے نرخرے میں گاڑنے کی کوشش کی تو مَیں نے ٹکر مار کر اس کی ناک توڑ دی۔

اُس نے اپنا بایاں ہاتھ چھُڑا کر میری داڑھی نوچنا شروع کر دی اور میرے پیٹ پر گھٹنوں سے ضربیں لگانے لگا۔ مَیں درد سے بے تاب ہو گیا مگر مَیں نے اُس کا تلوار والا ہاتھ نہ چھوڑا بلکہ اپنی تمام تر قوت سمیٹ کر اُسے توڑنے کی کوشش کرنے لگا۔

وہ میری چال سمجھ گیا۔ اُس نے تلوار پھینک دی جو پھسلتی ہُوئی دیوار سے جا ٹکرائی۔

مَیں نے تارسُو کو چھوڑ دیا اور اس طرف بڑھنا چاہا جدھر تلوار گری تھی مگر تارسُو کسی جونک کی طرح مجھ سے لپٹ گیا اور بُری طرح نوچنے کھسوٹنے لگا۔ جب مَیں اُسے گرفت میں لانے کی کوشش کرتا تو وہ پھسل جاتا اور جب مَیں آگے بڑھنا چاہتا تو مجھ سے لپٹ جاتا۔ آخر مَیں فرش پر لوٹتا ہُوا تلوار کی سمت بڑھنے لگا مگر تارسُو نے بھی میرے ساتھ لوٹ لگائی اور اس کا ہاتھ مجھ سے پہلے تلوار پر جا پڑا لیکن مَیں نے اُسے تلوار استعمال کرنے کی مہلت نہ دی۔

اُس نے دوبارہ تلوار اُچھال دی۔

تلوار پھسلتی ہُوئی کمرے کی دُوسری دیوار سے جا لگی۔ وہ خود بھی میرے ہاتھوں سے پھسل کر میری دسترس سے دُور ہو گیا۔ مَیں نے اندھیرے میں اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں مارے مگر اسے تلاش کرنے میں ناکام رہا۔

یکایک دُوسری دیوار کے قریب ذرا سی آہٹ ہُوئی۔

وہ تلوار کے قریب پہنچ چُکا تھا۔

اب اُدھر جانا بے حد خطرناک تھا۔ مَیں جلدی سے ہاتھوں اور پنجوں کے بل بیٹھ گیا۔ اضطراب اور دہشت بھرے لمحے جاں گُسل محسوس ہونے لگے۔

دفعتہً "ہا" کے فاتحانہ نعرے کے ساتھ فرش پر تلوار کے ٹکرانے کی آواز آئی۔ وہ تلوار ڈھونڈ چکا تھا۔ مَیں کسی بھی لمحے اُس کی زد میں آ سکتا تھا۔

مَیں جلدی سے پیچھے ہٹ کر زینے کی طرف کھسکنے لگا۔

زینے کی دیوار کے پاس پہنچ کر مَیں نے فرش ٹٹولا کہ شاید کوئی اکھڑا ہُوا پتھر ہی مل جائے۔

خوش قسمتی سے مجھے ایک پتھر مل ہی گیا۔

مَیں نے اسے ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کی غرض سے زور لگا کر اُکھاڑ لیا۔ پتھر اکھڑنے کی آواز پر دُوسری دیوار کے قریب سے پہلی بار تارسُو کی آواز سُنائی دی۔

"تم زینے کی طرف جا رہے ہو سرفروش۔ میرے ہاتھوں مرنے والے وہ تینوں بھی زینے تک پہنچ گئے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ مَیں تنگ زینے میں تلوار نہیں گھُما سکوں گا اور وہ مجھ پر قابو پا لیں گے... مگر یہ اُن کی بھُول تھی۔"

یکایک اُس نے تلوار گھُمائی تو گہری خاموشی میں مجھے "شپ... شپ" کی آوازیں واضح طور پر سُنائی دیں۔ مَیں نے اپنی مٹھی سے دُگنا پتھر مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ مَیں پہلی ہی سیڑھی پر

ہو گیا کہ اب اُس نے ہوا میں تلوار چلائی تو اُسے پتھر کھینچ ماروں گا پر خیال آیا کہ اگر نشانہ خطا ہو گیا تو بے معنی آواز پر پتھر سے نشانہ ے کا یہ میرا پہلا اتفاق تھا۔

اچانک تارسُو نے عجیب و دہشت انگیز انداز میں مسلسل ہنسنا ع کر دیا۔

"ہو ہو ہو ہو... ہو ہو ہو ہو... ہو ہو ہو ہو"

یہ منحوس آوازیں مسلسل سُنائی دینے لگیں اور یہ میرے اعصاب انداز ہو رہی تھیں۔ وہ ہنسنے کے ساتھ ساتھ آگے بھی بڑھ رہا تھا۔ شعوری طور پر دُوسری سیڑھی چڑھ گیا... پھر مجھے ایک خیال وہ زینے میں تلوار گھمانے کی بجائے اُسے گھونپنے کے انداز میں ال کرے گا کیونکہ وہاں یہی ممکن بھی تھا۔

مَیں نے چشمِ تصوّر سے دیکھا کہ مَیں سیڑھیاں چڑھ کر اُوپر جا چُکا ، تارسُو زینے میں تلوار لیے اس طرح آگے بڑھ رہا ہے جیسے زینے میں گھونپنا چاہتا ہو... پھر وہ زینے کے دائیں بائیں اُوپر سے نیچے وار کرتا ہے اور میرے لیے مزید پیچھے ہٹنے کی گنجائش نہیں رہتی۔ اس تصوّر نے میری چھٹی حِس کو بیدار کر دیا۔

مجھے کوہ نوردی کی ایک ترکیب یاد آ گئی جس کے ذریعے آدمی دو چٹانوں کے درمیان ایک پر پاؤں جما کر اور دُوسری سے پیٹھ لگا کر اُوپر چڑھ سکتا ہے۔ مَیں نے یہی ترکیب آزمانے کا فیصلہ کرتے ہُوئے زینے کی ایک دیوار کے ساتھ پیٹھ اور دُوسری دیوار کے ساتھ پاؤں جما کر اُوپر کھسکنا شروع کر دیا۔

کھُردری دیوار سے میری پیٹھ چھِلنے لگی... مگر مَیں نے پروا نہ کی۔ وہ پتھر مَیں نے رانوں میں دبا لیا تھا اور جتنی جلدی کھِسک سکتا تھا، کھِسکنے لگا۔

چند لمحوں کے بعد تارسُو کے قہقہے بند ہو گئے اور کمرے میں سنّاٹا چھا گیا۔ اسی سنّاٹے کی وجہ سے اُس نے میرے اُوپر کو کھِسکنے کی آواز سُن لی اور زینے کے پاس آ گیا۔ اب اُس کے پسینے یا چربی کی بُو میرے نتھنوں سے ٹکرانے لگی تھی۔

میرے کھِسکنے کی آواز نے اُسے یقین دِلا دیا تھا کہ مَیں زینے پر پہنچ چُکا ہُوں۔

اُس نے اطمینان کی سانس لی۔

مَیں سمجھ گیا کہ اب وہ میرے قتل کے لیے تیار ہو چُکا ہے اور وار کرنے والا ہے۔

مَیں نے آہستگی سے رانوں کے درمیان سے پتھر نکال کر مضبوطی کے ساتھ ایک ہاتھ میں پکڑ لیا۔ مَیں زینے میں اتنا اُونچا پہنچ چُکا تھا کہ وہ مجھ سے چھُوئے بغیر نکل سکتا تھا۔ اُس نے تلوار سے پہلی سیڑھی ٹٹولی تو مَیں تیار ہو گیا۔

جُونہی مجھے بدبُو کا بھبکا آیا، مَیں بڑے زور سے پتھر والا ہاتھ نیچے لایا۔ میرا خیال تھا کہ پتھر اس کے سر پر پڑے گا مگر وہ اس کے شانے اور ہنسلی کی ہڈی پر لگا جو یقیناً ٹوٹ گئی ہو گی۔ تارسُو اس اچانک حملے اور ضرب کی شدت سے لڑکھڑایا اور اُس نے تلوار اُوپر اُٹھائی جو میری ران کو زخمی کر گئی۔

مَیں نے جلدی سے اُس کی گردن اپنی ٹانگوں کی قینچی سے جکڑ لی اور اپنا پورا وزن اُس پر ڈال دیا۔ وہ ڈگمگا کر گرا تو تلوار اس کے ہاتھ سے چھُوٹ گئی۔ مَیں بھی اُس کے ساتھ ہی گرا تھا مگر مَیں نے اس کی گردن نہ چھوڑی۔

وہ مجھے کاٹنے اور نوچنے لگا۔

پیشتر اس کے کہ اُس کی گردن میری ٹانگوں کی جکڑبندی سے نکلتی، مَیں نے دونوں ہاتھوں سے اُس کا ٹینٹوا دبا لیا اور اُس کا سر فرش سے ٹکرانا شروع کر دیا۔ تیسری چوتھی ٹکر پر ہی اس کا بھیجا پاش پاش ہو گیا... اور اس کے حلق سے ایسی آوازیں نکلیں جیسے اس نے دم توڑ دیا ہو۔

مَیں نے اُس کے مُردہ جسم کو پاؤں سے دھکیلا تو وہ فرش پر پھسلتا چلا گیا۔ اب مَیں نے ہاتھ سے ٹٹول کر ران پر لگنے والے زخم کا معائنہ کیا۔ زخم گہرا نہیں تھا مگر اُس سے خُون جاری تھا جس سے میری ٹانگ تر بتر ہو گئی تھی۔

مَیں نے جلدی سے آگے بڑھ کر تارسُو کا مُردہ جسم تلاش کیا اور اُس کی کمر سے پیٹی اُتار کر اپنی ران کے زخم پر باندھ لی تاکہ خُون زیادہ نہ نکلنے پائے... پھر مَیں نے تلوار تلاش کی اور سیڑھیاں چڑھنے لگا... مگر زینہ عبُور کرتے کرتے مَیں ایک دم رُک گیا۔ مَیں نے سوچا، موت کا مقابلہ تو مَیں جیت ہی چُکا ہُوں، پھر اُسے ڈرامائی رنگ دے کر لوگوں کو مرعوب کیوں نہ کیا جائے؟ اگر مَیں خُون آلود تلوار لہراتے ہُوئے تہ خانے سے باہر نکلوں تو دیکھنے والوں پر یقیناً میری بہادری کی دھاک بیٹھ جائے گی۔ چنانچہ مَیں نے تلوار اپنی زخمی ٹانگ کے ساتھ لگا دی جس سے ابھی تک تھوڑا تھوڑا خُون رِس رہا تھا۔

چند لمحے بعد تلوار خُون آلود ہو گئی تو مَیں نے سیڑھیاں چڑھ کر تلوار سے تختے کو کھٹکھٹایا اور پُوری قوت سے چِلّایا...

"دروازہ کھولو... دروازہ کھولو۔"

باہر سے غلاموں کو کوسنے اور اُن پر کوڑے برسانے کے ساتھ ساتھ دروازہ کھولنے کے احکام سُنائی دینے لگے... اور پھر دروازہ

کھل گیا۔

تیز روشنی سے میری آنکھیں خیرہ ہوگئیں مگر میں نے نہ انھیں بند کیا اور نہ ہی ہاتھ سے اُن پر چھجا بنایا... پھر میں فاتحانہ انداز سے باہر آ گیا۔

زخم کی وجہ سے مجھے تکلیف محسوس ہو رہی تھی مگر میں نے لنگڑانے میں توہین محسوس کی۔ اس لیے سینہ تانے اُس طرف بڑھنے لگا جدھر برداش اور کریڈ کھڑے تھے۔ وہ سپاہی اور غلام سب حیرت سے مجھے دیکھے جا رہے تھے۔

جب میں اُن کے قریب پہنچا تو برداش کے نائب نے میرا راستہ روکنا چاہا... مگر میں نے تلوار سے اُسے ایک طرف ہٹا دیا۔

"تم نے تارمُو سے مقابلہ جیت لیا؟ یہ تو ناممکن تھا۔ تم برق کی نظرِ کرم کے بغیر اُس پر فتح حاصل کر ہی نہیں سکتے تھے... مگر ہمارے دیوتا اور دیوی تم پر نظرِ کرم کیوں ڈالنے لگے؟" مہا پجاری بولا۔

وہ ابھی کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا کہ برداش نے اُسے روک دیا اور مجھ سے مخاطب ہوا۔

"تم ایک بار پھر خوش قسمت ثابت ہوئے ہو سرفروش میرا خیال ہے کہ تارمُو کمزور ہو گیا تھا۔ بہرکیف اصل وجہ اب کبھی معلوم نہیں ہو سکے گی۔"

"اصل وجہ ایک نہ ایک روز تمھیں ضرور معلوم ہو جائے گی، کپتان۔ یہ تم سے میرا وعدہ ہے۔ اب مزید تاخیر نہ کرو اور مجھے ملکہ کے پاس لے چلو۔"

کپتان برداش نے بادلِ نخواستہ میرے سامنے سر خم کر دیا۔ مہا پجاری اُسے حیرت سے دیکھنے لگا۔

"وہی کرو جو سرفروش کہتا ہے۔ اب یہ ہمیں حکم دے سکتا ہے، چاہے وقتی طور پر ہی" برداش نے کہا اور کبڑے شافران کی طرف مُڑ کر غرایا "اس بن مانس کی لاش وہاں سے ہٹاؤ اور اُسے برق کے شکم میں ڈال کر نذرِ آتش کر دو۔"

★★

مجھے ایک بار پھر غسل دیا گیا۔ ران کے زخم کی مرہم پٹی کی گئی اور سجا سنوار کر ملکہ فیرا کی خواب گاہ میں بھیج دیا گیا۔ جونہی میں نے دروازے کا پردہ ہٹا کر اندر قدم رکھا، وہ تعجب اور خوشی سے بستر پر اُٹھ بیٹھی۔

"اوہ، سرفروش! میں ڈر رہی تھی کہ کہیں وہ اندھا وحشی تم پر حاوی نہ ہو جائے مگر دیوی نے تمھیں اُس پر حاوی کر دیا۔ اگر تم مر جاتے تو مجھے بڑا دکھ ہوتا۔"

میں نے اُسے جواب دینے سے پہلے اپنا سر ذرا سا خم کیا اور بولا: "میں آپ کا شکرگزار ہوں ملکۂ عالیہ کہ آپ کو میرا اتنا خیال..."

وہ کچھ کہنے کی بجائے پیار سے میری طرف دیکھتی رہی۔ میں نے اپنے ہاتھ سینے پر باندھ لیے تو میرے بازوؤں کی مچھلیاں اُبھر آئیں۔ میں دروازے کے قریب ہی کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔

وہ اُس وقت بے حد حسین لگ رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں گلابی ڈورے تیر رہے تھے اور ہونٹوں پر کھیلنے والا تبسم معنی خیز تھا۔ مجھے ایک لمحے کے لیے وہ روایتیں یاد آ گئیں جو ... نے اُس کی عمر کے بارے میں سُنائی تھیں لیکن اُس کے شگفتہ اور شاداب سراپا پر وقت کا ہلکا سا نقش پا بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اُس نے ابھی ابھی شباب کی دہلیز ... کی ہو۔

"یہاں آؤ میرے پاس بیٹھو" اُس نے مترنم آواز میں کہا۔ "تم تو بے حد مرعوب لگ رہے ہو۔"

"آپ کا حکم سر آنکھوں پر ملکۂ عالیہ لیکن میرے اور آپ کے درمیان جو رشتہ ہے وہ..."

"سراما سیڈ میں صرف دل کے رشتے کو اہمیت دی جاتی ہے" یہ کہتے ہوئے اُس نے سرک کر میرے لیے جگہ بنا دی۔

اب میں اُس کے ہر حکم کی تعمیل کرنے پر مجبور تھا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ جتنی خوش اسلوبی سے میں اُس کے حکم کی تعمیل کروں گا اتنی ہی جلدی وہ میرے زیرِ اثر آ جائے گی تب ہی میں اسے اپنے احکام کی تعمیل کرنے پر مجبور کر سکوں گا۔ دوسرے میری بقا کا دارو مدار بھی اُس کی خوشنودی پر تھا لہٰذا میں ہر قیمت پر اس کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ قرب و وصال کی گھڑیاں بالآخر اُسے مجھ پر مہربان کرنے میں کامیاب ہو گئیں تب میں نے پہلا سوال کیا۔

"کیا مجھے اپنا نوکر پیلو واپس مل سکتا ہے؟"

"اگر وہ کریڈ اور برداش کے ہاتھوں اب تک مر نہیں گیا تو ضرور مل جائے گا" وہ مسکرا کر بولی۔

"مگر اُن کا پیلو سے کیا تعلق ہے؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"کریڈ نے پیلو کو مجھ سے مانگا تھا۔ برداش نے بھی اُس کی تائید اور سفارش کی تو میں انکار نہ کر سکی اور پیلو کو اُس کے حوالے کرنے کا حکم دے دیا۔"

مجھے فیرا کی اس بات نے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ آخر وہ برداش کی بات کیوں نہیں ٹال سکتی؟ وہ ملکہ فیرا پر اس قدر حاوی کیوں ہے کہ وہ اس سے انکار نہ کر سکی؟

"وہ لوگ پیلو پر تشدد کریں گے اور اُسے ایذا پہنچا کر میرے بارے میں جاننا چاہیں گے مگر وہ غریب انھیں وہی کچھ بتا سکے گا جو میں نے اُسے بتایا ہے۔ وہ لوگ ان معلومات سے مطمئن نہیں ہوں گے اور اُسے مار ڈالیں گے۔" میں نے کہا۔

"تم پیلو کے لیے اتنے پریشان کیوں ہو؟ تمھارا اُس سے کیا تعلق ہے، سرفروش؟"

"وہ میرا دوست ہے فیرا۔ جب طوفان نے مجھے ساحل پر پھینکا تو اس سرزمین پر وہی سب سے پہلے مجھے ملا تھا اور میرا دوست بن گیا تھا۔" میں نے بے تکلفی سے کہا اور اُسے ملکۂ عالیہ کہنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

میری اس وضاحت پر فیرا نے مسہری کے پہلو میں لٹکتی ہوئی رسّی کھینچی تو باہر کہیں گھنٹیاں بج اٹھیں اور چند لمحے بعد ایک غلام خواب گاہ میں داخل ہوا۔ فیرا نے اُس سے کوئی حجاب محسوس کیے بغیر کرتے ہوئے کریڈ اور برداش کو پیغام بھجوایا کہ پیلو کو، چاہے وہ جس حال میں بھی ہو، واپس کر دیا جائے۔

جب غلام چلا گیا تو وہ میری طرف پلٹ کر بولی۔ "میں تم سے بہت خوش ہوں سرفروش! مانگو اور کیا مانگتے ہو؟"

وہ اُس گھڑی بے حد مسرور تھی۔

"میں ان بحری مقابلوں میں حصہ لینا چاہتا ہوں جو کالے برق کے اعزاز میں منعقد کیے جائیں گے۔ اس لیے مجھے ایک جہاز کا کپتان بنا دو۔ میں اپنے آپ کو اس اعزاز کا اہل ثابت کروں گا۔"

"منظور" وہ بولی۔ "اور کیا چاہیے تمھیں؟"

"میں کچھ سوال پوچھنا چاہتا ہوں لیکن ڈرتا ہوں کہ تمھیں غصہ نہ آ جائے۔"

"نہیں۔ ان لمحوں میں مجھے غصہ نہیں آ سکتا۔ پوچھو۔ کیا پوچھنا چاہتے ہو؟"

"مہا پجاری کریڈ اور برداش کا آپس میں کیا تعلق ہے؟ یہ میں اس لیے جاننا چاہتا ہوں کہ وہ مجھے سازشی نظر آتے ہیں۔"

فیرا ہنس پڑی۔ "تمھارے بارے میں سچ ہی بتایا گیا تھا کہ تم دانا اور دور اندیش ہو۔ تمھارا اندازہ ٹھیک ہے کہ وہ سازشی ہیں۔ میرے جاسوس بھی مجھے بتا چکے ہیں کہ وہ میرے خلاف سازش کر رہے ہیں۔"

"پھر بھی تم نے انھیں ڈھیل دے رکھی ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں" وہ بولی "یہ ہمارے ہاں کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ اپنی سازش کے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کریں تو میں اُن پر ہاتھ ڈال سکوں مگر کریڈ بزدل ہے اور وہ میری مٹھی میں بھی ہے۔"

"اوہ... اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ وہ تمھارا جاسوس ہے اور خود اپنے خلاف ہی جاسوسی کر رہا ہے۔" میں نے حیرت سے کہا۔

"تم ٹھیک سمجھے سرفروش۔ اب یہ بتاؤ کہ میں تمھیں اپنا سمجھوں یا نہیں؟ کیا تم کالے برق کے خلاف میرا ساتھ دو گے؟"

"مگر تم نے تو کریڈ کو کالے برق کے خلاف بولنے پر ڈانٹ دیا تھا اور کہا تھا کہ چپ چاپ خراج ادا کرنے میں ہی عافیت ہے۔"

"ہاں سرفروش! میں نے یہی کہا تھا۔ ہر وہ آدمی جسے اپنی زندگی عزیز ہے، اسی طرح کہتا ہے لیکن دل میں ہم سب اُس سے نفرت کرتے ہیں۔ ہم اُس سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں مگر اس خواہش کا اظہار نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہ ہمارے ایک جاسوس کے بدلے اُس کے دس جاسوس ہماری صفوں میں کام کر رہے ہیں۔ انتہا تو یہ ہے کہ برداش بھی اُسی کا جاسوس ہے اور اُس نے براہ راست کالے برق سے گٹھ جوڑ کر رکھا ہے۔ وہ مجھے راستے سے ہٹا کر خود سراما کا حکمراں بننا چاہتا ہے۔"

یہ کہتے کہتے نہ صرف اُس کی آواز بھرا گئی بلکہ اُس کی آنکھوں میں آنسو بھی تیرنے لگے۔ مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ ایسی بے رحم اور سنگدل عورت جو تارمُو کی کرب ناک موت کا حال مزے لے لے کر سن رہی تھی یوں آنسو بھی بہا سکتی ہے۔ میں نے اُسے زبانی دلاسا دینے کی بجائے اُس کا شانہ تھپکا تو وہ پھر بولنے لگی۔

"برداش کی غداری کا باعث شاید یہ ہے کہ وہ خالص سرامانی نہیں بلکہ دوغلا ہے اور یہ بات پورے سراما میں صرف میں ہی جانتی ہوں۔"

"وہ کیسے؟" میں نے دلچسپی سے پوچھا کیونکہ برداش مجھے بھی سرامانی نہیں لگتا تھا۔ "تمھیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ دوغلا ہے؟"

"میں اُس کی ماں ہوں، سرفروش!" فیرا بولی تو مجھے یوں لگا جیسے اس انکشاف سے میری کھوپڑی پر زبردست دھماکا ہو گیا ہو۔ میں سوچنے لگا کہ کیا اُس کے بارے میں مشہور روایتیں واقعی سچ ہیں۔ کیا وہ ازل سے زندہ ہے اور ابد تک جوان رہے گی؟ کیا یہ کبھی بوڑھی نہیں ہوگی؟

اس نے مجھے سوچ میں ڈوبے دیکھا تو بولی: "شاید تمھیں میری بات کا یقین نہیں آیا... مگر یہ حقیقت ہے۔ وہ میری

کوکھ سے جنم لینے والا واحد بیٹا ہے۔ قرنیں گزریں، منگولیا سے ایک شخص یہاں آیا تھا۔ منگولیا یہاں سے بہت دُور ہے آتشیں سرزمین سے بھی بہت دُور۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے لیکن یہ تعلق بہت جلد ختم ہو گیا۔ تاہم میں اُسے کبھی نہیں بھول سکی۔ وہ بہت غصہ ور، مغرور اور جنگجو تھا۔ اُسے سراما پسند نہیں آیا اور وہ اپنے وطن واپس چلا گیا۔ جب مجھے اس کے واپسی کے ارادے کا علم ہوا تو میں بہت روئی تھی مگر میری انا نے مجھے اُس سے رُکنے کی التجا نہ کرنے دی۔ اس کے جانے کے بعد مجھے پتہ چلا کہ اس کی نشانی میرے بطن میں پرورش پا رہی ہے۔

اور یہ نشانی برداش ہی تھی۔ چونکہ اس ملک پر عورتوں کی حکمرانی رہی ہے اور رہے گی، اس لیے بچہ پیدا ہوتے ہی ماں سے جدا کر کے دائیوں کی تحویل میں دے دیا جاتا ہے۔ وہی اُس کی پرورش کرتی اور اسے پروان چڑھاتی ہیں۔ لڑکوں کو یہ کبھی معلوم نہیں ہو پاتا کہ ان کی سگی ماں کون ہے۔ وہ دایا کو ہی اپنی ماں سمجھتے ہیں۔ وہ لوگ جو جانتے تھے کہ برداش میرا بیٹا ہے، انھیں میں نے کسی نہ کسی الزام میں قتل کرا دیا ہے۔ اب یہ راز صرف میں جانتی ہوں یا تمھیں معلوم ہوا ہے۔ تمھیں بھی میری طرح یہ راز اپنے سینے میں دفن رکھنا پڑے گا کیونکہ یہ راز میرے خلاف استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ویسے اس انکشاف سے برداش کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا کہ حکمرانی عورتوں کے حصے میں آتی ہے۔ مرد زیادہ سے زیادہ کپتان بن سکتے ہیں۔"

"اگر برداش کی سازش کامیاب ہو جائے اور کالا بروق اُسے یہاں کا حکمران بنا دے تو کیا ہو گا؟" میں نے پوچھا۔

"پھر بھی وہ یہاں زیادہ عرصے تک حکمرانی نہیں کر سکے گا سرفروش۔ کالے بروق کا بیٹا جماد ابھی چھوٹا ہے۔ جب وہ بڑا ہو گا تو کالا بروق، برداش کو کسی غلام کی طرح قتل کر کے جماد کو یہاں کا حکمران بنا دے گا۔ اس لیے میں نہیں چاہتی کہ میرا اکلوتا بیٹا تخت نشین ہو کر ذلت کی موت مرے۔ اُسے تخت نشینی کے مرحلے تک پہنچنے ہی نہ دیا جائے تو بہتر ہے۔"

میں نے ایک نگاہ فیرا پر ڈالی جس کے چہرے پہ دوشیزاؤں کی سی تازگی تھی جبکہ میں اُس کے بیٹے کی داڑھی میں چاندی کے تاروں جیسے چمکتے بال دیکھ چکا تھا۔ فیرا اپنے اُسی بے رحم اور ظالم بیٹے کو موت کے منہ میں جانے سے روکنا چاہتی تھی جسے میں خود موت کے گھاٹ اُتارنا چاہتا تھا۔ تاہم میں نے اس کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے کہا:

"تم نے ہمیشہ اُس کا خیال رکھا، اُسے تحفظ دیا اور جو دے سکتی تھیں، دے چکی ہو۔ اب وہ ایک بھرپور اور بالغ مرد ہے۔ اُسے خود عقل سے کام لینا اور اپنے پاؤں ہونا چاہیے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو، سرفروش۔ میں اُس کے لیے مزید نہیں کر سکتی۔ اوپر سے وہ میری موت کا خواہاں ہو گیا ہے۔"

"تمھیں یقین ہے کہ تمھارے علاوہ کوئی بھی حتیٰ کہ بھی نہیں جانتا کہ وہ تمھارا بیٹا ہے؟"

"ہاں سرفروش۔ اب میرے علاوہ صرف تم یہ راز جانتے مجھے اعتماد ہے کہ تم کسی کو نہیں بتاؤ گے۔"

"تم کہتی ہو کہ تمھیں مجھ پر اعتماد ہے تو مجھے زینا کے متعلق بتا دو۔ کیا وہ واقعی تمھاری بیٹی ہے؟ اگر وہ تمھاری بیٹی ہے تو اُسے سزا کیوں دی اور وہ اس وقت کہاں ہے۔ کیسی سزا بھگت رہی ہے؟"

یہ سن کر فیرا کا چہرہ ایک دم سُت گیا۔ اس نے اپنا چہرہ سینے میں گاڑ دیا اور مجھے گھورنے لگی جیسے میری آنکھوں میں اُتر دل کا حال جاننا چاہتی ہو۔ کچھ دیر اسی طرح دیکھنے رہنے کے بولی...

"یہ سچ ہے کہ زینا میری بیٹی ہے اور ہو سکتا ہے کہ دن اس ملک کی حکمراں بن جائے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ نہ بن کیونکہ میری متعدد بیٹیاں ہیں۔ شاید اُن میں کوئی دوسری بننے میں کامیاب ہو جائے۔ غالباً تم نہیں جانتے کہ ملکہ کی سے میرا ایک فرض یہ بھی ہے کہ زیادہ سے زیادہ بیٹیوں کو جنم ... مگر جیسا کہ میں تمھیں بتا چکی ہوں، بچوں کو جنم دینے کے سے میرا کوئی تعلق نہیں رہتا۔ کنیزیں اور خادمائیں انھیں پوستی ہیں، اتالیق انھیں تعلیم دیتے ہیں اور پھر وہ پجاریوں سپرد کر دی جاتی ہیں۔ مجھے اُن کے بارے میں نہیں بتایا جاتا۔ مرجاتی ہیں، کچھ قتل کر دی جاتی ہیں۔ کچھ سازش کرتی ہیں اور شادی کر کے حکمرانی کے حقوق سے محروم ہو جاتی ہیں۔ تاہم سب عسکری اور انتظامی امور ضرور سکھائے جاتے ہیں۔ میں بھی تمام مراحل سے گزری تھی۔ میری تیس بہنیں تھیں۔ اُن میں صرف میں ہی زندہ رہی اور ملکہ بننے کے لیے مجھے اپنی ماں زہر دے کر راستے سے ہٹانا پڑا تھا۔"

میں جانتا تھا کہ ملکہ فیرا کا ایک ایک لفظ سچ پر مبنی اس لیے کہ پیلو بھی مجھے اسی قسم کی باتیں بتا چکا تھا۔

"یہ سب تو ٹھیک ہے فیرا۔ تم نے اپنے بارے میں بہت کچھ بتا دیا لیکن زینا کے متعلق کچھ بھی نہیں بتایا۔ میں اس کے بارے میں اس لیے جاننا چاہتا ہوں کہ اُس نے میرے ساتھ شادی کی تھی اور وہی بتانے تمھارے پاس آئی تھی۔ مجھے صرف اتنا بتا دو کہ وہ صحیح وسلامت ہے یا نہیں؟"

"وہ بالکل ٹھیک ہے، سرفروش۔ کوئی عام آدمی اُسے چھونے کی جرأت بھی نہیں کر سکتا۔ صرف مجھے اور اس کی بہنوں کو یہ حق حاصل ہے کہ اُسے سزا دے سکیں۔ اُسے بھی ہمارے خلاف سازش کرنے اور حکمران بننے کا حق حاصل ہے۔" فیرا نے وضاحت کی۔

"تو پھر جہاز پر سزا بھگتنے کا کیا مطلب ہے؟"

"وہ ایک ایسے جہاز پر سزا بھگت رہی ہے جس پر کپتان کے علاوہ باقی سب عورتیں ہیں۔ سزا کے طور پر اسے وہاں غلاموں کی طرح صرف دو گھنٹے روزانہ چپو چلانا پڑتے ہیں۔ اب میں تمھیں یہ بھی بتا دوں تو بہتر ہو گا کہ سزا یافتہ لوگوں کے بارے میں پوچھنا اور باتیں کرنا بھی یہاں خلافِ قانون ہے۔"

"میں نے اس کے بارے میں صرف اسی لیے پوچھا تھا کہ وہ مجھے پسند تھی اور میں نہیں چاہتا تھا کہ اُسے کوئی تکلیف پہنچے۔ اب مجھے اطمینان ہو گیا ہے کہ اُسے کوئی تکلیف نہیں۔ تاہم میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ اُسے یہ برائے نام سزا کیوں دی گئی ہے؟"

"میں بتاتی ہوں۔" فیرا بولی۔ "یہ سزا اُسے اس لیے دی گئی ہے کہ وہ تم سے بے پناہ محبت کرتی ہے اور اس لڑکی کے لیے مبتلائے محبت ہونا اچھا نہیں ہوتا جس کے ملکہ بننے کا امکان ہو۔ اس کے علاوہ اُس نے تمھاری شجاعت اور مردانگی کی اتنی تعریف کی تھی کہ مجھے تم کو دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہو گیا۔ وہ تمھاری محبت میں اتنی آگے بڑھ گئی تھی کہ اس نے میری مشاورت کے سامنے حقوقِ حکمرانی سے دستبرداری کا اعلان کر دیا۔ وہ صرف تمھیں چاہتی تھی۔ اس نے مجھ پر زور دیا تھا کہ تمھیں تربیت گاہِ غلاماں سے رہا کرا دوں اور ایک آزاد اجنبی کی حیثیت سے تمھارا استقبال کروں۔"

"اور تم نے اس کے لیے اتنا بھی نہ کیا؟" میں نے کہا۔

"میں اُس کے لیے ایسا کیوں کرتی سرفروش۔ میں نے تمھاری ذہانت، شجاعت اور مردانگی کے اس سے اتنے قصے سُن لیے کہ تمھیں تارسُو کی جگہ لانے کا ارادہ کر بیٹھی۔ اور ملکہ جو چاہتی ہے، وہ ہو کر ہی رہتا ہے۔"

...اور پھر کالا بروق سالانہ خراج وصول کرنے کے لیے سراما سیڈ پہنچ گیا۔ اُسے ہر سال سو بوریاں "میٹا" دیا جاتا تھا۔ میٹا چاندی کی طرح چمک دار دھات تھی جسے غلام مجبورے پہاڑوں کی کانوں سے نکالتے تھے اور اُسے پگھلا کر سلاخوں کی شکل میں ڈھال دیتے تھے۔ کالا بروق ان سلاخوں کے سکے تیار کرواتا تھا جن کے درمیان سوراخ ہوتا تھا تاکہ اُنھیں لڑیوں میں پرو دیا جا سکے۔ وہ جعلی سکے بنانے والوں کو بدترین سزا دیتا تھا کہ سکے بنانے کے تمام حقوق اس کے اپنے پاس تھے۔ خلاف ورزی کرنے والوں کی کھال کھینچ کر انھیں کھولتے ہوئے کڑھاؤ میں ڈال دیا جاتا تھا۔

جیسا کہ ملکہ فیرا نے مجھ سے وعدہ کیا تھا، مجھے بحری مقابلوں میں حصہ لینے کے لیے ایک جہاز دے دیا گیا تھا۔ اس مقابلے میں دو حریف ہوا کرتے تھے۔ ایک گروہ کالے بروق کی طرف سے حصہ لیتا تھا اور دوسرا ملکہ فیرا کی طرف سے۔ کالے بروق کو خوش کرنے کے لیے فیرا کا گروہ ہمیشہ ہارتا تھا اور وہ لوگ نقصان اُٹھایا کرتے تھے۔ اس بار فیرا کے گروہ کی نمائندگی میں کر رہا تھا اور اس گروہ میں حصہ لینے والے غلاموں کا انتخاب بھی مجھ پر چھوڑ دیا گیا تھا۔

پیلو مجھے واپس مل گیا تھا۔ ابھی اس کی ایک ٹانگ ہی کریڈ کے تشدد کی زد میں آئی تھی کہ ملکہ کا پیغام پہنچ گیا تھا۔ اب وہ قدرے لنگڑا کر چل رہا تھا۔ میں نے غلاموں کے انتخاب کی ذمے داری اُسے سونپ دی تھی کیونکہ وہ وہاں کے لوگوں کو مجھ سے بہتر جانتا تھا۔

اُس نے جو غلام منتخب کیے ان میں وہ مکروہ شکل کا کبڑا شافران بھی شامل تھا جسے تارسُو سے مقابلے والے روز میں نے لات ماری تھی۔ جب میں نے اُس کی شمولیت پر اعتراض کیا تو پیلو اس کی وکالت میں بولا۔

"یہ میرا پرانا دوست ہے۔ جب اسے غلام بنایا گیا، اس وقت "میٹا" کی کانوں میں کام کرنے والے غلاموں کی سخت قلت تھی اور میٹا کی کانیں موت کی آغوش ہوتی ہیں۔ وہاں کام کرنے والے غلاموں کے اجسام پر پھوڑے نکل آتے ہیں اور وہ بیمار ہو کر مر جاتے ہیں۔ شافران نے وہاں کام کرنے کی بجائے جلاد بننا منظور کر لیا۔ اگر اُس کی جگہ ہم آپ ہوتے تو ہم بھی یہی کرتے۔"

میں نے ایک نظر شافران کی طرف دیکھا جس نے چمڑے کی لنگوٹی باندھ رکھی تھی۔ اس کی ٹانگوں پر پھوڑے پھنسیاں دکھائی دے رہی تھیں اور گلے میں آہنی طوق پڑا ہوا تھا۔ پیلو پھر بول اُٹھا۔

"میں اس کی ہر طرح سے ذمے داری لینے کو تیار ہوں۔"

ہمارے گروہ کے ہر غلام کی طرح یہ بھی آزاد ہونے کے لیے تڑپ رہا ہے۔ آپ میرے کہنے پر اسے ایک موقع دے دیجیے۔"

"اچھی بات ہے پیلو... لیکن اگر اس کی بیماری دوسروں کو لگ گئی تو...؟"

"یہ بیماری دوسروں کو نہیں لگ سکتی۔ میں تھوڑی بہت حکمت بھی جانتا ہوں۔ دوسرے یہ پھوڑے پھنسیاں تو ہر کان کن کو نکل آتی ہیں۔ اگر یہ چھوت چھات کی بیماری ہوتی تو آج سراما کی آدھی آبادی پھوڑے پھنسیوں میں مبتلا نظر آتی۔"

"اگر تم بضد ہو تو اس کے گلے سے یہ طوق اتار دو، اسے نہلاؤ دھلاؤ، دوسرے کپڑے پہناؤ اور بتا دو کہ میرے سامنے نہ آیا کرے۔" میں نے فیصلہ سنا دیا۔

"بہت بہت شکریہ کپتان۔ آزاد ہونے سے پہلے یا بعد میں، جب بھی موقع ملا میں آپ کے اس احسان کا قرض ضرور چکاؤں گا۔" پیلو کے بجائے شافران بولا اور اس کے ساتھ چلا گیا۔

غلاموں کے انتخاب سے پہلے میں نے پیلو کو بتا دیا تھا کہ وہ صرف اُن غلاموں کو بھرتی کرے جو آزادی حاصل کرنے کے متمنی ہوں اس لیے کہ اس مقابلے کے ساتھ ہی مجھے فرار حاصل کرنے کی بھرپور کوشش بھی کرنا تھی تاکہ زینا اور اپنے ڈیلی کیٹ کو تلاش کر سکوں۔

پیلو اور شافران کے ساتھ میری یہ گفتگو اس جہاز پر ہوئی تھی جس کا فیرا نے مجھے کپتان بنایا تھا۔ اس جہاز کا نام بھی فیرا ہی تھا۔ یہ نیا اور خاصا مضبوط تھا۔ پیلو نے میرے نائب کی حیثیت سے جس غلام کو بھرتی کیا تھا اس کا نام ارغون تھا اور غلام بننے سے پہلے وہ ملاح کے طور پر کام کیا کرتا تھا۔ میں نے اُسے بلایا اور اُس کے ساتھ صلاح مشورہ کرنے لگا۔

بحری مقابلہ شروع ہونے میں صرف ایک گھنٹہ باقی رہ گیا تھا۔ ہم اس مقابلے کے لیے پچھلے کئی روز سے تیاریاں کر رہے تھے۔ جب ارغون مجھے تیاریوں کی تفصیل بتا چکا تو میں نے پوچھا: "وہ کام کہاں تک پہنچا؟"

"میں نے دو آدمیوں کو رات بھر اس کام پر لگائے رکھا ہے۔ وہ نئی چیز جسے آپ ریتی کہتے ہیں خوب کام کرتی ہے۔ میرا خیال ہے، زنجیر ٹوٹ جائے گی۔"

میں نے اُس لمبی زنجیر کی طرف دیکھا جو بندرگاہ کے تنگ دہانے پر راستہ روکنے کے لیے تان دی گئی تھی۔ میرے لیے یہ بات بڑی تعجب خیز تھی کہ اہلِ سراما اب تک نہ یہ ریتیاں بنا سکے تھے اور نہ ہی اس کا استعمال جانتے تھے۔ مگر زنجیریں بڑی بڑی بنا لیتے تھے۔ میں نے ارغون سے پوچھا:

"انھیں کسی نے دیکھا تو نہیں؟"

"نہیں کپتان!... اگر کوئی انھیں دیکھ لیتا تو اب تک ہم بروق کے آتشیں شکم میں جل بھن کر راکھ ہو چکے ہوتے۔"

"تم بھی وہاں گئے تھے؟"

"ہاں، زنجیر کی کڑی آدھی سے زیادہ کٹ چکی ہے۔"

یہ زنجیر ہم نے کل رات سے کاٹنی شروع کی تھی۔ اسے کاٹنے کے لیے میں نے معمولی تلواروں کو ایک دوسرے سے رگڑ رگڑ کر ریتیاں بنالی تھیں۔ زنجیر سے پرے ارغوانی سمندر پھیلا ہوا تھا اور افق پر زرد کہر اُٹھ رہی تھی۔ میرے لیے سمندر اور کہر کے رنگ بھی عجوبے کی حیثیت رکھتے تھے۔

ارغون نے مجھے بتایا تھا کہ سراما کے بالمقابل سمندر کے اُس پار مملکتِ نورنیہ واقع ہے جس پر کالا برقی حکومت کیا کرتا تھا۔ کالا بروق اُسے دیوتا بروق کے نام کی مطابقت سے کہا جاتا۔ بروق دیوتا جس قدر رحمتیں اور برکتیں نازل کرتا تھا کالا بروق اتنا ہی ظالم اور سفاک تھا اس لیے اُسے کالا بروق کہا جاتا تھا ورنہ اس کا نام ادلو تھا۔

بہرحال، فرار کے بعد ہمیں نورینہ کا بھی رُخ نہیں کرنا تھا۔ غلاموں کے لیے اس فرار کا مقصد آزادی تھا مگر میں زینا اور اپنے ڈپلی کیٹ کو تلاش کرنا چاہتا تھا۔ صرف تین روز پہلے فیرا کی بحریہ کے ایک افسر نے بتلایا تھا کہ بحری قزاقوں نے اپنی گرفتاری کے بعد اس امر کی تصدیق کی تھی کہ میرے حلیے کا ایک آدمی انھیں سمندر میں ایک تختے پر بہتا ہوا ملا تھا۔ انھوں نے اُسے محض اس لیے قتل نہیں کیا کہ انھیں کوئی فائدہ نہیں تھا لہٰذا انھوں نے اُسے آتشیں سرزمین پر بھوکا پیاسا مرنے کے لیے چھوڑ دیا۔

میں نے ارغون کو ریتیاں سمندر میں پھینکنے کا حکم دے کر دُوربین آنکھوں سے لگالی اور بادبانی جہاز کی طرف دیکھنے لگا۔ یہ دُوربین سرامائی لوگوں ہی کی ایجاد تھی۔ ایک لمبی سی نلکی میں آگے پیچھے دو شیشے لگے ہوئے تھے اور درمیانی حصے میں پانی بھر دیا گیا تھا، یہی پانی محدب عدسے کا کام دیتا تھا۔ میرے لیے یہ بات بھی حیرت انگیز تھی کہ سرامائیوں نے دُوربین تو بنا لی مگر ریتیہ نہیں بنا سکے۔

بادبانی جہاز پر لہرانے والا سُرخ و سفید دھاری دار جھنڈا

پیغام دے رہا تھا کہ مقابلہ شروع ہونے میں آدھ گھنٹہ باقی رہ گیا ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ فیرا اور کالا بروق، دیوتا کو دی جانے والی قربانیوں کی تقریب سے فارغ ہو کر بندرگاہ کی طرف چل پڑے ہیں۔ گزشتہ رات میں نے ملکہ فیرا کے ساتھ اکھاڑے میں وہ مقابلے بھی دیکھے تھے جو کالے بروق کے اعزاز میں منعقد کیے گئے تھے۔ غلاموں کے دو گروہ دیوانہ وار ایک دوسرے کو تہ تیغ کر رہے تھے۔ آخر میں دونوں گروہوں میں سے صرف ایک ایک آدمی زندہ بچا تھا۔ آج قربانی کی تقریب میں شمولیت کے لیے میں نے محض اس لیے معذوری ظاہر کر دی تھی کہ غلاموں کو منجنیقوں کے ذریعے سونا تھا اونچے مجسمے کے شکم میں پھینکے جانے کا منظر میری برداشت سے باہر ہو جاتا۔ سرامائی منجنیقوں سے نشانے بازی کے بے مثال ماہر تھے۔ اتنے میں مجھے بروق والے میدان سے دُھواں اٹھتا دکھائی دیا۔ ساتھ ہی اُدھر سے آنے والی ہوا اپنے ساتھ گوشت جلنے کی بُو بھی لے آئی تو میں نے منہ پھیر لیا۔ منجنیقیں، بھینٹ چڑھائے جانے والے غلاموں کو بروق کے سوراخ شکم میں پھینک دیتی تھیں۔

میں نے ایک بار پھر دُوربین اپنی آنکھوں سے لگالی اور دیکھ کر حیران رہ گیا کہ کالے بروق کے جہازوں پر بھی منجنیقیں نصب کر دی گئی تھیں اور ان کے ساتھ بھاری پتھروں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ کالے بروق کے گروہ کا سربراہ برواشں تھا جسے قدرت نے مجھے ٹھکانے لگانے کا شاندار موقع فراہم کر دیا تھا۔ اس لیے کہ میرے جہاز اور گروہ کی چار کشتیوں پر منجنیقیں تو کجا، بڑی کمانیں بھی نہیں تھیں جن سے بیک وقت متعدد تیر چلائے جا سکتے تھے۔

میں یہ جان کر بھی بھونچکا رہ گیا کہ کالے بروق کے گروہ میں جہازوں کی تعداد نو تھی۔

یکایک مقابلہ دیکھنے والے تماشائیوں نے نعرے لگانے شروع کر دیے۔ ملکہ فیرا اور کالا بروق بھی پہنچ گئے تھے اور وہ اپنے اپنے تخت پر بیٹھ رہے تھے۔

پیلو اور ارغون آ کر میرے پاس کھڑے ہو گئے۔

ارغون کے ہاتھ میں چمڑے کا وہ بھونپو تھا جو کل رات ہی میں نے اُسے بنا کر دیا تھا اور اُسے ہدایت کی تھی کہ وہ ایسے بھونپو اپنے نائبین کو بھی بنا کر دے دے۔

ڈر کے مارے پیلو کی حالت غیر ہو رہی تھی اور اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں میں نے اس کے شانے پر تھپکی دیتے ہوئے کہا:

"ڈرتے کیوں ہو پیلو۔ میں نے تمھیں بتا تو دیا ہے کہ ہم کیسے جیتیں گے۔"

پیلو نے پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے گھگھیائی ہوئی آواز میں جواب دیا: "میں مجبور ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ میں بزدل ہوں۔ اگر ہم جیت گئے تو بھی میں مر جاؤں گا۔"

"لیکن اس وقت تم غلامی کی موت نہیں مرو گے۔ اب جاؤ اور اپنے لیے کوئی ہتھیار لے آؤ۔ میں عرشے پر کسی کو نہتا نہیں دیکھنا چاہتا۔"

"مگر میں کوئی ہتھیار چلانا نہیں جانتا۔" وہ بولا۔

"تو سیکھو... اور سیکھنے کے لیے آج بہترین موقع ہے۔ ویسے کیا تم نے میرا پیغام ملکہ کو پہنچا دیا تھا؟"

"ہاں جناب۔ اُس کے نوکر نے بتایا کہ وہ سیاہ جھنڈے کی منتظر رہے گی۔"

"ٹھیک ہے، اب جاؤ اور کوئی ہتھیار لے آؤ۔" یہ کہہ کر میں پھر ملکہ اور کالے بروق کی طرف دیکھنے لگا۔

کالا بروق لحیم و شحیم تھا۔ اس کا وزن اتنا زیادہ تھا کہ اُسے اُٹھانے اور بٹھانے کے لیے بارہ خادموں کا ایک دستہ ہمیشہ اس کے ساتھ رہتا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر میری ترکیب کامیاب ہو گئی تو آج کے بعد نہ تو اُسے خدام کے دستے کی ضرورت رہے گی اور نہ ہی خادموں کو اُسے اُٹھانا بٹھانا پڑے گا۔ اتنے میں کالے بروق نے اپنا بھاری بھرکم ہاتھ اُٹھایا جس میں ایک رنگین رُومال تھا۔ اُس نے رُومال لہرا کر مقابلے کے آغاز کا اِذن دے دیا۔

یہ اِذن ملتے ہی اس کے گروہ کے نو جہاز نیم دائرے کی صورت میں ہماری طرف بڑھنے لگے اور ان پر نصب منجنیقوں نے ہمارے بیڑے سے کچھ فاصلے پر پتھر پھینک کر طوفانی کیفیت پیدا کر دی۔

میں نے ارغون سے پوچھا: "ہوا کب چلے گی؟"

اُس نے سمندر سے اُٹھنے والے ابخرات اور افق پر کہر کے بادلوں کو دیکھتے ہوئے جواب دیا: "فوری طور پر ہوا چلنے کا امکان نہیں ہے۔ ایک یا دو گھڑیاں بیت جائیں تو شاید ہوا چلنے لگے۔"

"تو پھر ان احمقوں نے اپنے بادبان کیوں کھول دیے ہیں؟" میں نے کالے بروق کے بیڑے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"برواشں نے حکم دیا ہو گا۔ وہ اناڑی ہے۔ یہ بادبان

انھیں مدد دینے کی بجائے الٹا چپو چلانے والوں کی مشقت بڑھا دیں گے۔" ارغون نے بتایا۔ وہ بلاشبہ ایک تجربہ کار ملاح تھا۔

میں نے تلوار لہرا کر جوابی اقدام کا اشارہ کیا تو ارغون چرمی بھونپو منہ سے لگا کر اپنے نائبین کو ہدایات دینے لگا۔

ہمارا بیڑا ابھی حرکت میں آگیا۔

چونکہ ہم نے بادبان نہیں کھولے تھے۔ دوسرے ہمارے بیڑے پر چپو چلانے والے غلام صرف مقابلے میں حصہ لینے کے لیے نہیں بلکہ آزادی کے حصول کی خاطر کام کر رہے تھے اس لیے انھوں نے جی جان سے زور لگایا اور بیڑے نے بہت جلدی رفتار پکڑ لی۔

میرا جہاز سب سے آگے تھا۔ اس کے پیچھے چاروں کشتیاں سیدھی قطار کی صورت میں آگے بڑھنے لگیں۔ یہ دیکھ کر برداش بری طرح سٹپٹا گیا۔ اُس کا خیال تھا کہ جس طرح اس نے ایک قوس کی صورت میں اپنے جہازوں کو آگے بڑھایا ہے، اسی طرح میں بھی اپنے مختصر سے بیڑے کو کمان کی شکل میں، مقابلے پر لاؤں گا... مگر میں نے اس کی توقعات پر پانی پھیر دیا۔

میں نے ارغون کو اشارہ کیا تو اُس نے بھونپو پر ڈھول بجانے کا حکم دے دیا۔ چند ہی لمحوں میں درمیانی عرشے سے "ڈھم ڈھم۔ ڈھم ڈھم" کی آوازیں آنے لگیں اور چپو اس کی لے تال کے ساتھ چلنے لگے۔ پیادر نے بتایا کہ ڈھول شافران بجا رہا ہے۔

"ڈھول کی لے تیز کراؤ۔" میں نے ارغون سے کہا۔

ڈھول کی لے بڑھی تو چپو چلانے والوں کا جوش بھی بڑھ گیا۔ اس کے ساتھ ہی ہمارے بیڑے کی رفتار میں بھی تیزی آگئی۔ جب حریف جہاز ہم سے تین سو گز دور رہ گئے تو میں نے حکم دیا۔

"آگ کی ہانڈیاں تیار رکھو۔"

ارغون اور اس کے نائبین نے اپنے اپنے بھونپو سے یہ حکم دہرایا۔

"ڈھالوں کی آڑ لے لو۔" میں چلایا تو عرشے پر کام کرنے والوں نے اپنے سامنے تختے رکھ لیے جو بڑی حد تک تیروں کی بوچھار روک سکتے تھے۔

"کمانوں میں تیر چڑھالو۔" میں نے حکم دیا اور برداش کے جہاز کی طرف دیکھا جو ہم سے صرف سو گز دور رہ گیا تھا۔ اُس کا رُخ میرے جہاز کی طرف تھا۔ وہ ایک بڑا جہاز تھا۔

اگر اس کے بادبان کھلے نہ ہوتے تو اُس کی رفتار دگنی ہوا وہ میرے جہاز سے ٹکرا کر اسے پاش پاش کر سکتا تھا۔

میں نے دُوربین سے دیکھا، چپو چلانے والے غلام کوڑے برسائے جا رہے تھے۔ علاوہ ازیں برداش جھنڈوں ذریعے ہدایات دے رہا تھا، جنھیں سمجھنے میں وقت لگتا جبکہ میری بھونپو والی ترکیب اس سے کہیں زیادہ تیز ثابت ہوئی تھی۔

اتنے میں ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا جس سے برداش کے جہازوں کے بادبان بھر گئے چونکہ یہ ہوا مخالف سمت آئی تھی اس لیے اُن کے جہازوں کی رفتار مزید سست پڑ اور وہ ہچکولے کھانے لگے۔

برداش بُری طرح جھنجلا اُٹھا۔

میں نے ہتھیلیوں سے بھونپو بناتے ہوئے حکم دیا۔ "کشتیوں کو دائیں بائیں لے آؤ۔"

ارغون اور اس کے نائبین نے یہ ہدایات دہرائیں اور میرے جہاز کے پیچھے آنے والی کشتیوں میں سے دو دائیں اور دو بائیں جانب آگئیں۔ ان کی رفتار بھی بڑھ گئی۔ اب ہم مخالف جہازوں کے درمیان سے گزر کر نکل سکتے تھے.. لیکن میرا جہاز برداش کے جہاز کے سامنے تھا۔ اتنے میں برداش کے جہاز کی منجنیق نے میرے بائیں جانب کی کشتی کو نشانہ بنا دیا۔ اس کا پچھلا حصہ ٹوٹ گیا اور اس کے ملاح غلام ڈوبنے لگے۔

تماشائیوں نے نعرے لگانے شروع کر دیے۔

برداش اور اس کے ساتھی خوش خوش یہ تماشا دیکھنے لگے یہی وہ وقت تھا جب میں نے ارغون کو ایک خاص اشارہ کرنا تھا۔ میں نے بایاں ہاتھ اٹھا کر گرا دیا۔

ارغون نے بھونپو سے ہدایات دیں اور ہمارے اُلٹے ہاتھ والے چپو اندر کھینچ لیے گئے۔ میرا جہاز برداش کے جہاز کے دائیں پہلو سے گزرا اور اس کے پچاس چپوؤں کو توڑتا ہوا نکل گیا۔

اب برداش کی نہ صرف آدھی طاقت ختم ہو چکی تھی بلکہ جہاز بھی اُس کے قابو سے باہر ہو گیا تھا۔ ہم نے اس کے دائیں جانب سے گزرتے اور ٹکراتے ہوئے نہ صرف چپو توڑ دیے تھے بلکہ آگ سے بھری ہانڈیاں بھی پھینکی تھیں جن میں سے ایک بادبان پر پڑی تھی اور بادبان جلنے لگا تھا۔

میں نے آگے جا کر جہاز کو موڑا اور برداش کے جہاز کے دوسرے پہلو کی طرف لانے لگا۔ برداش کے بیڑے کے دوسرے

جہاز میرے جہاز پر منجنیق سے پتھر نہیں برسا سکتے تھے۔ اس طرح خود برداش کا جہاز بھی اُن کی زد میں آسکتا تھا کیونکہ اب وہ بے قابو ہو کر اِدھر اُدھر ڈول رہا تھا۔ ہوا بند ہو گئی تھی اور بادبان بھڑک رہا تھا۔ عرشے پر بھی متعدد جگہوں سے دُھواں اُٹھنے لگا تھا۔

برداش نے میرا جہاز دوسری سمت سے قریب آتے دیکھا تو اُس نے چپو چلانے والوں کو چپو اندر کھینچ لینے کا حکم دے دیا۔ یہ دیکھ کر میں نے ارغون کو اشارہ کیا۔ وہ اپنے جہاز کو آگے لے جانے لگا۔

میں نے دُوربین آنکھوں سے لگالی۔ کالے بروق کو اس کے خدام نے سہارا دے کر کھڑا کر دیا تھا اور وہ حیرت اور غم و غصے سے اِدھر دیکھ رہا تھا۔ فیرا نے ہاتھوں سے اپنا آدھا چہرہ ڈھک لیا تھا۔ شاید وہ کالے بروق سے اپنی فاتحانہ مسکراہٹ چھپا رہی تھی... مگر اُس کی نگاہیں بھی اِدھر لگی ہوئی تھیں وہ سیاہ پرچم لہرانے کا انتظار کر رہی تھی۔

میں نے دُوربین ہٹا کر اپنی کشتیوں پر نظر ڈالی۔ اس دوران میری ایک اور کشتی ڈوب چکی تھی مگر حریفوں کے پانچ جہاز جل رہے تھے۔ میری باقی ماندہ دو کشتیاں حریفوں کے چھوٹے جہاز پر حملہ کر رہی تھیں اُن سے آگ کی ہانڈیاں پھینکی جا رہی تھیں اور تیر بھی برسائے جا رہے تھے۔

برداش کے تین جہاز خاموش اپنی اپنی جگہ ڈول رہے تھے۔ شاید اُن پر کام کرنے والے غلاموں نے بغاوت کر دی تھی۔ اس بغاوت کا بیج میں نے ہی بویا تھا اور پیلو کے ذریعے غلاموں میں جاسوس چھوڑ دیے تھے جنھوں نے یہ مشہور کر دیا تھا کہ جو غلام بھی کسی طرح سے ہمارے بیڑے تک پہنچ جائے گا، ہم اسے آزادی کی منزل تک اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ شروع میں تو ان لوگوں نے اُسے ایک افواہ سے زیادہ اہمیت نہیں دی ہو گی... مگر اب پانسہ پلٹتے دیکھ کر وہ باغی ہو گئے ہوں گے۔

میں نے برداش کے جہاز کی طرف دیکھا۔ اس جہاز پر کئی جگہ آگ بجھائی جا چکی تھی۔ چار منجنیقیں اور دو بڑی کمانیں تیار تھیں اور جہاز کا عرشہ تیراندازوں سے بھرا ہوا تھا۔ شاید برداش نے جہاز پر موجود ہر فرد کو عرشے پر بلا لیا تھا اور ہر قیمت پر مجھے میرے ساتھیوں سمیت ٹھکانے لگانے پر تُل گیا تھا... مگر میں اس کے جہاز کو ابھی غرق نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ مجھے اس سے کام لینا تھا۔

میں نے ایک بار پھر کالے بروق پر نگاہ ڈالی۔ وہ دوبارہ اپنے تخت پر بیٹھ چکا تھا۔ میں نے دل میں دُعا مانگی کہ وہ اسی طرح بیٹھا رہے ورنہ یہ ساری محنت برباد ہو جائے گی۔

ارغون جو میرے اشارے کے مطابق جہاز کو آگے لے گیا تھا، اب اسے موڑ رہا تھا۔

"ڈھول بجانے کی لے ذرا تیز کر دو۔"

ڈھول بجنے لگا اور اس کی لے تال کے ساتھ چپو بھی تیزی سے چلنے لگے۔ میں نے برداش کی طرف دیکھا اب وہ ایک بڑی منجنیق کے پاس کھڑا میری طرف اشارہ کرتے ہوئے منجنیق چلانے والے کو ہدایات دے رہا تھا۔ منجنیق والے نے اثبات میں سر ہلایا اور اپنے کام میں لگ گیا۔ چند لمحوں کے بعد ایک بڑا پتھر مجھ سے صرف چھ قدم کے فاصلے پر آ گرا۔ منجنیق کا یہ نشانہ صرف اس لیے خطا ہو گیا تھا کہ میرے جہاز کی رفتار کچھ بڑھ گئی تھی۔ تاہم میں اسی طرح سینہ تانے اپنی جگہ کھڑا رہا کہ مجھے اپنے ساتھیوں کے سامنے مثال قائم کرنا تھی۔ میں نے سوچا کہ اگر مرنا ہے تو پھر بزدلی کیوں دکھائی جائے۔ اگر مقدر میں یہاں موت نہیں لکھی اور ہم بچ نکلے پھر میرے ساتھی کبھی میری حکم عدولی کا خیال بھی دل میں نہیں لائیں گے۔

میرا جہاز تیزی سے برداش کے جہاز کی طرف بڑھ رہا تھا جہاں سے تیروں کی بارش ہو رہی تھی مگر میں اسی طرح سینہ سپر رہا۔ ایک تیر میری خود میں پیوست ہو گیا اور دوسرا میری آستین کو چھیدتا ہوا پار نکل گیا... مگر میں نے پروا نہیں کی اور ارغون کو حکم دیا۔

"درمیانی عرشے میں ڈھول کی لے کم کرا دو۔ پچھلے حصے سے لنگر ڈالنے کے لیے تیار رہو۔ جونہی ہمارا جہاز برداش کے جہاز کے ساتھ لگے دونوں کے درمیان فوراً تختہ بچھا دیا جائے۔ جب ہم اس جہاز پر جائیں تو ہر غلام کے پاس ہتھیار ہونے چاہئیں۔"

ارغون ان احکام کی تعمیل میں مصروف ہو گیا۔

جب ہمارا جہاز برداش کے جہاز کے قریب آیا تو مجھے اس کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا "ہر آدمی سرفروش کو نشانہ بنانے کی کوشش کرے۔"

اس کے ساتھ ہی میری طرف سنسناتے ہوئے تیر آنے لگے۔ ہماری طرف سے بھی جوابی کارروائی ہونے لگی۔ اچانک ایک تیر ارغون کی ہتھیلی میں پیوست ہو گیا۔ وہ چیختا ہوا گر پڑا۔ پیلو اس کی طرف لپکا۔ اور میں اپنے ساتھیوں کو ہدایات

دینے لگا۔

"لنگر ڈالو اور دونوں جہازوں کے درمیان تختہ باندھ دو۔"

جونہی جہازوں کے پہلو ایک دوسرے سے ٹکرائے، میرے کچھ ساتھیوں نے بڑی جوانمردی سے برداش کے جہاز میں رسے ڈال دیے۔ کچھ لوگ تختہ بچھانے اور اسے باندھنے میں مصروف ہوگئے۔ ادھر سے ان پر تیروں کی بوچھار ہو رہی تھی اور ادھر سے میرے ساتھی تیر برسا رہے تھے۔ ہر طرف سے چیخ و پکار کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔

میرے ساتھیوں کے حوصلے بے حد بلند تھے وہ موت کے خوف سے بے نیاز اپنی آزادی کے لیے لڑ رہے تھے۔ جبکہ برداش کے غلام اس جذبے سے عاری تھے اس لیے اُن میں وہ جوش اور ولولہ نہیں تھا۔ اتنے میں پیلو نے نعرہ لگایا۔

"سرفروش۔ زندہ باد.... آزادی۔ زندہ باد۔"

... اور پھر ہمارے ساتھیوں کی پُر جوش آوازیں اُس کی ہم نوا بن گئیں۔ میں نے ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے میں خنجر تھام لیا اور جونہی میرے ساتھی تختہ باندھ کر ہٹے، میں نے اُس پر قدم رکھ دیا۔ یہ پہل مجھے ہی کرنا تھی تاکہ میرے ساتھی میری تقلید کر سکیں۔ میں جوش میں ڈھال لینا بھی بھول گیا تھا مگر میرے کسی ساتھی نے میرے سامنے اپنی ڈھال کر دی جس نے تیروں کی پہلی بوچھار روک دی۔

"فتح اور آزادی تمھاری منتظر ہے دوستو۔ غلاموں کو مت مارنا مگر مالکوں کو زندہ نہ چھوڑنا۔" میں نے چیخ کر کہا میرے اس نعرے نے جہاں میرے ساتھیوں کا ولولہ دو چند کر دیا، وہاں برداش کے غلاموں پر بھی اس کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ انھوں نے ہتھیار ڈالنا شروع کر دیے۔ بلکہ کچھ تو ہمارے شانہ بشانہ لڑنے اور اپنے ہی افسروں کو تہ تیغ کرنے لگے۔

"منجنیق کے افسر کو زندہ گرفتار کر لو۔" میں نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔

انھوں نے اُسے زندہ گرفتار کر لیا۔

یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ پیلو بھی اپنی چھوٹی سی تلوار لیے دیوانہ وار لڑ رہا ہے۔ برداش کے ایک نائب نے مجھ پر حملہ کرنا چاہا تو پیلو نے اس کی ٹانگوں سے نکل کر اپنی تلوار اس کے سینے میں گھونپ دی۔

تھوڑی دیر کی دست بدست لڑائی کے بعد سارا ہنگامہ ختم ہوگیا۔ میرے ساتھی فرطِ مسرت سے نعرے لگانے اور ناچنے لگے۔

میں نے عرشے پر پڑی لاشوں پر نظر ڈالی۔

ان میں برداش کی لاش نہیں تھی۔ میں نے اُس کی تلاش میں اِدھر اُدھر دیکھا تو وہ مجھے جہاز کے اگلے حصّے کی سیڑھی پر کھڑا نظر آ گیا۔ اُس کے ہونٹوں پر بڑی ہی شاطرانہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی... مگر اس مسکراہٹ کی گہرائیوں میں خوف بھی چھپا ہوا تھا جسے صرف میں ہی دیکھ سکتا تھا۔

میں نے اُس کی طرف بڑھنے سے پہلے ساری صورت حال کا جائزہ لینا ضروری سمجھا اور ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی تو پتہ چلا کہ میرے بیڑے کی باقی ماندہ دونوں کشتیاں بھی غرق ہو چکی ہیں۔ اُن تین جہازوں سے بھی دھواں اُٹھ رہا تھا جنھوں نے مقابلے میں حصہ نہیں لیا تھا اور جن پر کام کرنے والے غلام باغی ہو گئے تھے۔ اس طرح پورے سرامانی بحری بیڑے میں سے صرف "فیرا" ہی واحد کارآمد جہاز بچ گیا تھا ورنہ باقی سب تباہی کا شکار ہو چکے تھے اور یہ صورت حال میرے فرار کے منصوبے کے حق میں تھی۔ اگرچہ کالے بروق کا جہاز جس میں وہ نموریہ سے یہاں آیا تھا، صحیح و سالم تھا مگر وہ یہاں سے کافی دُور سمندر میں لنگر انداز تھا اور اگر وہ قریب یا بندرگاہ کے اندر ہوتا تب بھی ہمارا تعاقب نہیں کر سکتا تھا۔

یہ جائزہ لینے کے بعد میں نے برداش کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "اب صرف تم سے دو دو ہاتھ کرنے باقی ہیں کپتان۔ تم نیچے آتے ہو یا میں اوپر آؤں؟"

وہ مسکرایا اور بولا۔ "میں احمق نہیں کہ تم سے لڑوں، سرفروش۔ میں ہتھیار ڈالتا ہوں۔ تم میرے بدلے تاوان وصول کر سکتے ہو۔"

مجھے اُس سے ایسے جواب کی توقع نہیں تھی۔ میں نے کہا۔ "تم عرفِ عام میں ظالم اور بے رحم کے لقب سے مشہور ہو، برداش! یہ لقب تم نے واقعی بے پناہ مظالم ڈھانے کے بعد حاصل کیا ہے۔ مگر میں نہیں جانتا تھا کہ تم ایک اور خطاب کے بھی حق دار ہو... اور وہ خطاب ہے... بُزدل۔ تم بُزدل بھی ہو، برداش۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور اسی طرح مسکراتا رہا۔ پیلو کو نہ جانے کیا سُوجھی وہ تلوار لہراتا ہوا آگے بڑھا اور مجھ سے کہنے لگا۔

"اس بزدل کو ہمارے حوالے کر دو سرفروش ہم خود اُس سے نمٹ لیں گے۔"

بہت سی آوازیں پیلو کی تائید کرنے لگیں۔ میں نے ہاتھ اُٹھا کر اُنھیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور پیلو سے کہا۔

"تم تو خون کے پیاسے ہو گئے ہو، چھوٹو میاں... مگر کپتان میں ہوں اور برداش کے ساتھ کیا سلوک کرنا ہے، اس کا فیصلہ میں ہی کروں گا۔" پھر میں برداش کی طرف پلٹا۔ "کیا تم لڑو گے؟"

اُس نے اپنی تلوار نکالی اور میرے قدموں میں پھینکتے ہوئے کہنے لگا۔ "تمھیں میرے قتل سے کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا سرفروش۔ بلکہ اب صرف میں ہی تمھیں ملکہ اور کالے بروق کے غضب سے بچا سکتا ہوں۔ تم نے نہ صرف ملکہ کا پورا بحری بیڑہ تباہ کر دیا ہے بلکہ اُس کے بہت سے افسر بھی موت کے گھاٹ اتار دیے ہیں۔ دوسری جانب تم نے یہ مقابلہ جیت کر کالے بروق کی توہین کی ہے۔"... اُس نے ایک نظر ملکہ اور کالے بروق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ تمھارا ارادہ بن گیا تھا یا تم نے اور ملکہ نے کالے بروق کے خلاف سازش کی تھی... مگر ملکہ میں کالے بروق کے خلاف سازش کرنے کی جرأت نہیں ہو سکتی...!"

"سازش کے بارے میں تم خود ہی بہتر جانتے ہو کیونکہ اُس کے خلاف تم خود بھی تو سازش کر رہے تھے۔"

وہ میری اس بات پر چونک سا گیا۔

اتنے میں جہاز کے نچلے حصّے میں واقع چوبی کمرے میں کھٹ پٹ سُنائی دی۔

میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "جاؤ، دیکھو۔ میرا خیال ہے، اندر مہا پُجاری کریڈ چھپا ہوا ہے۔ اُسے پکڑ لاؤ۔"

چند لمحے بعد میرے ساتھی جس شخص کو نکال کر سامنے لائے وہ واقعی کریڈ ہی تھا۔ وہ اُن غلاموں سے زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا جنھیں وہ دیوتا بروق کے آتشیں شکم میں ڈال کر راکھ بنایا کرتا تھا۔

"کاش ہم تجھے بھی دیوتا بروق کے جہنم میں ڈال سکتے۔" ایک غلام بولا۔

"اسے آگ کی نہیں پانی کی موت پسند ہے دوستو۔"

میری اس بات پر اُس کے مظالم کا شکار بننے والے غلاموں نے مہا پُجاری کو ڈنڈا ڈولی کر کے اُٹھایا اور جھلاتے ہوئے سمندر میں پھینک دیا۔

اب میں نے پیلو سے کہا کہ وہ "فیرا" پر جا کر سیاہ پرچم لہرا دے... پھر میں نے منجنیق کے افسر کو اپنے قریب بلایا اور اسے کچھ ہدایات دیں۔ وہ بلا چون و چرا تعمیل کے لیے راضی ہوگیا۔ میں نے ایک بڑا پتھر منتخب کیا جسے میرے ساتھیوں نے مل کر منجنیق کے کانٹے پر رکھ دیا۔ جب یہ سب کچھ ہوگیا تو میں برداش کی طرف پلٹا جو ابھی تک وہیں کھڑا یہ ساری کارروائی حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

"اگر تم عزت کی موت مرنا چاہتے ہو تو نیچے آ کر مجھ سے مقابلہ کرو۔" میں نے کہا۔ "یہ تمھارے لیے آخری موقع ہے۔"

یہ سُن کر وہ بُری طرح گھبرا گیا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ رو پڑے گا۔ اُس نے بندرگاہ کے دہانے پر تنی ہوئی زنجیر پر نگاہ ڈالی اور بولا۔ "تم نے غلاموں کو آزادی کا جھانسا دے کر فرار کا جو منصوبہ بنایا ہے، وہ کبھی کامیاب نہیں ہوگا، سرفروش! ان سب کے ساتھ تم بھی مارے جاؤ گے۔"

پیشتر اس کے کہ وہ میرے ساتھی غلاموں کو مزید بھڑکاتا، میں نے سیڑھیاں چڑھ کر اس کی گردن دبوچ لی۔ اُس کی ہمت اتنی پست ہو چکی تھی کہ اُس نے ذرا بھی مزاحمت نہیں کی۔ میں اسے گردن سے پکڑے ہوئے نیچے لے آیا۔ اُس وقت تک منجنیق کے سامنے ایک سفید چادر تانی جا چکی تھی۔

میں، برداش کو اسی چادر کے پیچھے لے گیا اور ایک نائب جسے پیلو نے ارغون کے ساتھ بھرتی کیا تھا۔ برداش کا مُنہ بند کرنے اور اُسے پتھر کے ساتھ باندھنے کی ہدایت کی اور یہ دیکھنے کے لیے چادر کی اوٹ سے نکل آیا کہ کالے بروق پر اس ہنگامے کا کیا ردِعمل ہوا ہے۔ وہ اُسی طرح اپنے تخت پر بیٹھا ادھر ہی دیکھ رہا تھا جبکہ ملکہ فیرا کی نشست خالی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اُس نے سیاہ پرچم دیکھ لیا ہے اور کوئی بہانہ کر کے وہاں سے چلی گئی ہے۔

... پھر میری نگاہ اُس چھوٹی کشتی پر جا پڑی جو حقیقتِ حال معلوم کرنے کے لیے ہمارے جہازوں کی طرف آ رہی تھی۔ میں منجنیق کے افسر کی طرف پلٹا اور اُس کی گردن پر تلوار کی نوک رکھتے ہوئے بولا۔

"میں منجنیقوں کی کارکردگی اور تمھارا نشانہ دیکھ چکا ہوں۔ تم برداش سمیت اس پتھر سے کالے بروق کو نشانہ بناؤ گے اور اگر تمھارا نشانہ چوکا تو یہ تلوار تمھاری گردن اُڑانے میں دیر نہیں کرے گی۔"

منجنیق افسر نے لرزتے ہوئے کہا۔ "میں پُوری پُوری کوشش کروں گا... مگر کبھی کبھی ہوا اور بدقسمتی کے باعث نشانہ خطا بھی ہو جاتا ہے۔"

"ہوا کا رُخ اور رفتار کو دیکھ کر منجنیق چلاؤ۔ تم اپنے کام میں ماہر ہو۔ اگر تمھیں اپنی زندگی عزیز ہے تو نشانہ نہیں چوکے گا۔"

میری یہ تنبیہ اُسے مزید محتاط رکھنے کے لیے کافی تھی۔

اس نے منجنیق کا کانٹا آگے پیچھے کیا اور منجنیق داغنے کی تیاری کرنے لگا۔

میں نے اپنی نگاہیں کالے بروق پر مرتکز کر دیں۔

کالا بروق اپنے بھاری بھرکم وجود کے ساتھ اِدھر ہی دیکھ رہا تھا کبھی کبھی وہ اُس کشتی کو بھی تیزی سے چلانے کا اشارہ کرتا جو ہماری طرف بھیجی گئی تھی۔ اتنے میں ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔ منجنیق داغی جا چکی تھی۔ پتھر کے ساتھ بندھا ہُوا برداش اپنے نشانے کی طرف پرواز کر رہا تھا۔ کالا بروق جسے زندگی بھر کبھی موت کے خوف نے پریشان نہیں کیا تھا اپنی طرف تیزی سے آنے والا پتھر دیکھ کر بُری طرح بوکھلا گیا اور چیختے ہُوئے، خادموں کو پکارنے لگا۔ مگر وہ اپنی جان ... نے کے لیے بھاگ رہے تھے۔ کالے بروق نے اُٹھنے کی کوشش کی مگر اس اُڑتی ہوئی موت نے اُسے یہ دیکھنے کی بھی مہلت نہیں دی کہ پتھر کے ساتھ بندھا ہُوا وجود اس کے معتمد برداش کا ہے۔

میں نے برداش کے ساتھ کیا ہوا وعدہ پورا کر دیا۔ بلکہ فیرا کے ساتھ کیا ہُوا وعدہ بھی وفا ہو چکا تھا۔ اُسے کالے بروق سے نجات مل چکی تھی... مگر میں نہیں چاہتا تھا کہ اُسے میرے فرار کی اطلاع اپنے اکلوتے بیٹے کی موت کی خبر سے پہلے ملے۔ اس لیے میں جلدی جلدی اپنے ساتھیوں کو احکام دینے لگا۔

دو منجنیقیں فیرا پر منتقل کر دی گئیں۔ عرشہ لاشوں سے صاف کر دیا گیا اور برداش کے جہاز کو آگ لگانے کے بعد ہمارا جہاز تیزی سے ہٹ گیا۔

اب ہوا خاصی تیز چلنے لگی تھی اور ہم نے بادبان کھول دیے تھے۔

میں اب تک بے حد مصروف رہا تھا اس لیے ارغون کے بارے میں نہیں پوچھ سکا تھا کہ وہ مر گیا یا زندہ ہے، جب میں نے پیلو سے دریافت کیا تو وہ بولا: "وہ زندہ ہے۔ میں نے تیر نکال دیا ہے اور چونکہ تھوڑی بہت حکمت جانتا ہوں اس لیے ...."

"حکمت کی باتیں رہنے دو۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی: "اب تم جنگجو بن چکے ہو۔ ہم زنجیر کے قریب آ گئے ہیں اگر وہ نہ ٹوٹی تو ہمیں لڑتے ہوئے جان دینا پڑے گی۔ مجھے اُمید ہے کہ اب تم بزدلی نہیں دکھاؤ گے۔"

"فکر نہ کرو۔ اب مجھے مرنے سے ڈر نہیں لگتا۔" وہ مسکرا کر بولا۔

"شاباش۔ جلدی سے جاؤ اور شافران سے کہو کہ ڈھول بجانا شروع کر دے۔"

چند لمحوں کے بعد ڈھول کی تیز لے تال کے ساتھ چپو اُٹھنے، گرنے اور سمندر کا سینہ چیرنے لگے۔ میں نے کمان سنبھال لی اور جہاز کو زنجیر کے وسط کی سیدھ میں لے آیا تاکہ پہلے ہی جھٹکے میں وہ اپنی کھلی ہوئی کڑی سے ٹوٹ جائے۔

ہر آتے لمحے کے ساتھ جہاز کی رفتار بڑھتی جا رہی تھی اور زنجیر قریب تر آتی جا رہی تھی۔ تماشائی، ملک کے اہل کار اور کالے بروق کا علاج اب ہمارے منصوبے سے پوری طرح آگاہ ہو چکا تھا، دم بخود ہمارے جہاز کی طرف دیکھ رہا تھا۔

جہاز پوری رفتار کے ساتھ زنجیر سے ٹکرایا مگر زنجیر نہ ٹوٹ سکی۔ تماشائیوں نے ہماری ناکامی پر مسرت کا نعرہ لگایا۔ جہاز بے قابو ہو کر ڈولنے لگا۔ میں نے بھونپو مُنہ سے لگاتے ہُوئے چیخ کر کہا: "چپو چلاتے رہو... اور اپنی غلامی کی یہ زنجیر توڑ دو۔"

چپو چلتے تو جہاز زنجیر سے ٹکرا جاتا... زنجیر تن جاتی مگر ٹوٹنے کا نام نہ لیتی۔ ساتویں بار جب جہاز زنجیر سے ٹکرایا تو وہ ٹوٹ گئی۔ اور جہاز لہروں کا سینہ چیرتا کُھلے سمندر میں داخل ہو گیا۔

کُھلے سمندر میں آنے کے بعد میں نے جہاز کا رُخ جنوب کی طرف موڑ دیا۔ اس لیے کہ سراما کے مقابل نوریتہ تھا جہاں ہم جا نہیں سکتے تھے۔ جنوب کی جانب وہ آتشیں سرزمین تھی جہاں قزاقوں نے میرے ڈیلی کیبٹ کو مرنے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ مجھے اس کی تلاش میں وہاں جانا تھا۔

... لیکن فی الوقت ہمارے لیے سب سے بڑا مسئلہ خوراک اور پانی کے ذخیرے کا تھا۔ چونکہ ہمارے جہاز کو صرف مقابلے میں حصہ لینا تھا لہٰذا اس میں خوراک اور پانی کا ذخیرہ نہیں کیا گیا تھا۔ چنانچہ ہم نے جنوب کی طرف جاتے ہوئے جہاز کو ساحل بلرما کی طرف موڑ دیا اور سب سے پہلے آنے والی چھوٹی سی بندرگاہ سے ضرورت کی ساری اشیا حاصل کرنے کے بعد پھر ان دیکھے سفر پر روانہ ہو گئے۔

تقریباً ایک ہفتے تک میں جہاز کی مرمت، زخمیوں کی دیکھ بھال اور تنظیم نو میں مصروف رہا۔ میرے لیے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ جہاز پر صرف دو سو افراد کی گنجائش تھی جبکہ اس پر چار سو افراد سوار تھے۔ میں نے ارغون سے بات کی تو وہ بولا۔

"یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں، اسے بڑی آسانی سے حل کیا جا

...ہے۔"

"وہ کیسے؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"جب بھی کوئی جہاز دکھائی دے، اُس پر حملہ کر دیا جائے ... قبضے میں لانے کے بعد آدھے آدمی دونوں جہازوں ... دیے جائیں۔"

"مگر یہ بڑی غلط بات ہے۔" پیلو اپنی تلوار کے دستے پر ... تے ہوئے چلایا: "پھر ہم میں اور بحری قزاقوں میں کوئی فرق ... ہے گا۔"

مجھے یہ دیکھ کر حیرت اور مسرت ہوئی کہ پیلو کے اندر کا مرد ... کے ساتھ ساتھ وہ اُستاد نہیں مرا تھا جو اخلاقی قدروں کی ... کھتا تھا لیکن یہ نہیں جانتا تھا کہ بقا کی جدوجہد میں ایسے ... بھی آتے ہیں جہاں اخلاقی اصول دھرے کے دھرے ... تے ہیں۔

گزشتہ دو تین روز سے میرے سر میں ہلکا ہلکا درد رہنے ...

میرا خیال تھا کہ شاید ڈاکٹر فریدوں کا کمپیوٹر میری کھوج ... ہے لیکن یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ یہ سر درد مسلسل بھاگ دوڑ ... الے کی تھکن کا نتیجہ تھا۔ جو بعد میں ٹھیک ہو گیا۔

ایک روز اچانک مجھ پر وہ عجیب و غریب انکشاف ہوا ... ڈاکٹر فریدوں کے ان تجربات کا بنیادی محرک تھا۔ وہ میرے ... دمکان کے سفر سے یہ جاننے کا بھی آرزومند تھا کہ ان سرزمینوں ... میں قدرت نے کون کون سے خزانے دفن کر رکھے ہیں۔ ... حیرت انگیز بات تھی کہ میں یورینیم کے لامحدود ذخائر روندتا ... تک پہنچا تھا۔ مگر مجھے پتہ بھی نہ چلا کہ وہ بھورے پہاڑ جو ... کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ہیں، اپنے اندر یورینیم چھپائے ... تھے جسے مقامی زبان میں "میٹا" کہا جاتا تھا۔

یہ انکشاف مجھ پر یوں ہُوا تھا کہ پیلو جنگجو بننے کے ساتھ ... جہاز کا خود ساختہ طبیب بھی بن گیا تھا اور جہاز پر موجود ... ہے مرہم تیار کر کے شافران اور دوسرے زخمیوں کا علاج ... تھا۔ دوسرے زخمی تو اس کے علاج سے رُو بصحت تھے مگر ... کو افاقہ نہیں ہُوا تھا۔

ایک روز وہ شافران کو میرے پاس لے آیا اور بولا: ... ہر دو کے پھوڑے پھنسیاں اس لیے ٹھیک نہیں ہو رہیں ... اس نے میٹا کا ایک ٹکڑا اپنی جیب میں چھپا رکھا ہے۔ جب ... یہ ٹکڑا اس کی جیب میں رہے گا، یہ کبھی تندرست نہیں ہو سکتا۔"

"میں اسے خود سے جدا نہیں کر سکتا۔" ... اپنی نہیں تھی۔

... دیکھا جو بادلوں سے صاف

دکالت کی: "میں اُسے اپنے لیے نیک شگون سمجھتا ... یہ محسوس ہی نہیں ہوتا تھا کہ یہاں

"وہ کیسے؟" میں نے پوچھا۔ ... ہے۔ میں نے ارغون سے پوچھا: "کیا

"جب کبھی میں اُسے دیکھتا ہوں ... بارہ بھی آئے گا؟"

قسمت تصور کرتا ہوں کہ مجھے میٹا کی کانوں ... د کا یقین ہے، اسی طرح طوفان کی

ورنہ دوسرے کان کنوں کی طرح میں بھی ...

"مگر میٹا کا وہ ٹکڑا اس کے پاس ... ہوں سے کہہ دو کہ وہ کھینا شروع کر دیں۔

پھر جائے گا جبکہ ہمیں اس کی ضرورت ... کی طرح تھکے ہوئے ہیں لیکن ہمیں سفر جاری

ہے اور اسے چپو چلانے والوں سے ... شافران سے کہو کہ وہ جیسے چاہے، ان سے

لیے اسے حکم دو کہ وہ ٹکڑا سمندر میں ... حالت ایسی نہیں ہے کہ دوسرے طوفان کا

پھینک دے۔

اس میں کوئی شک نہیں ... تمہارے پہلے سے کہیں شدید ہوگا۔"

پیلو نے بیان کی تھیں مگر میں اُس ... میں بھی اپنے چوبی کمرے سے نکل کر عرشے پر چلا

منحوس کبڑے کی یاد دلاتا تھا او ... کا حوصلہ بڑھانے لگا۔ اس طوفان میں ہمارے

آتی تھی حالانکہ جہاز پر سفر کرنے ... بھی ٹوٹ گیا تھا۔ ہمارے پاس فالتو مستول تو

تھا۔ میں نے اس سے چھٹکارا ... نصب نہیں کر سکتے تھے۔ ڈر یہ تھا کہ اس دوران

"پیلو! اس سے میٹا کا ... طوفان نہ آ جائے۔ میں نے ایک ساتھی کو ٹوٹے ہوئے

شافران نے بادل نخواستہ ... یا اور کہا وہ اپنے آپ کو رسیوں کے ساتھ جکڑ

کو دے دیا جو اس نے میری طرف ... دیکھتا رہے۔ جونہی اُسے زمین دکھائی دے، چلا

سے کچھ چھوٹا تھا مگر جسامت کے ... کہ ہم جلد از جلد وہاں پہنچنے کی کوشش کر سکیں۔ میں

ہوتا تھا۔ میں نے کالے اور مجبور ... میں آتشیں سرزمین کا ساحل دکھائی دے جائے

پر رکھ دیا اور شافران سے کہا۔ ... لے جائیں گے۔ ہمارے پاس اتنے آدمی تھے

"جب میں اچھی طرح ... دیکھ کر فیرا نامی اس جہاز کو کھڑا کر سکتے تھے...

کہ یہ تمہیں واپس مل ... گزر جانے کے بعد بندرگاہ تلاش کرنا کوئی مشکل کام نہیں

شافران نے میرا ...

سے گھورتا ہُوا چلا گیا ... میرے ساتھی مسلسل پانچ گھنٹے تک جہاز کھینچتے رہے اتنے

"لاہیے یہ ٹکڑا ... مستول پر چڑھا ہوا آدمی ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے چلایا:

پھنسیاں نکل آئیں گی ... "اُدھر دیکھو۔ ایک جہاز ڈوب رہا ہے۔"

"آج نہیں، کل ... ڈوبتے ہوئے جہاز سے ہمیں خوراک اور دوسرا سامان

یعنی پگھلا ہُوا میٹا یا کوئی ... تھا جو ہمارے فوری مسائل حل کر دیتا۔ میں نے آنکھوں

اُسے حکم دیا۔ ... کا چھجا بنا کر اُدھر دیکھا اور مستول والے سے پوچھا۔

"میٹا کی سلاخ یا ... "کیا تم پہچان سکتے ہو وہ جہاز کس کا ہو سکتا ہے؟"

"سلاخ شاید نہ ... ہاں... قزاقوں کا جہاز لگتا ہے کیونکہ اس کی نوک پر

"یہ ناممکن ہے ... ۔ پیلی پٹی آویزاں ہے۔ اس کا مستول ٹوٹ چکا ہے اور اگلا

... ب ہو رہا ہے۔ مگر اس پر عورتیں دکھائی دے رہی ہیں۔

اس نے منجنیق تھا۔ ملکہ فیرا کے پاس بھی خالص میٹل کے بمشکل
تیاری کرنے لگا۔

میں نے اپنی لگا ہیں، دو جہاز پر چار سو آدمی موجود ہیں۔ ان
کالا بروق اپنے بھاری ۔ سکہ ضرور ہو گا۔ جاؤ اور جب تک
رہا تھا کبھی کبھی وہ اُس کشتی کو بھی تہ آنا:
ہماری طرف بھیجی گئی تھی۔ اتنے بھیجا تا تھا اس لیے چپ چاپ میرے
منجنیق داغی جا چکی تھی۔ یہ
اپنے نشانے کی طرف پرواز کر رہا تھا ۔ ایک دلچسپی کا باعث وہی خیال
موت کے خوف نے پریشان نہیں کیا ہے منتقل کرتا ہے۔ ان کی کوکھ میں کیا
آنے والا پتھر دیکھ کر بُری طرح بو کھلا گیا اور سونا، ریڈیم اور یورینیم بھی ہو
کو ٹپکانے لگا۔ مگر وہ اپنی جان ۔ نے ہو۔ اسی لیے اسے خالص شکل
کالے بروق نے اُٹھنے کی کوشش کی۔
موت نے اُسے یہ دیکھنے کی بھی مہلت نہیں۔ چھوٹا سا چکو رسکہ لے آیا
بندھا ہوا وجود اس کے معتمد برداشش کا ہے۔ ار کھا تھا۔ میں نے اُسے
میں نے برداشش کے ساتھ کیا ہوا وعدہ پورا۔ شیشے کا کام کرتا تھا پھر
فیرا کے ساتھ کیا ہوا وعدہ بھی وفا ہو چکا تھا۔ یہ کون سی دھات ہے۔
سے نجات مل چکی تھی... مگر میں نہیں جانتا تھا معلوم ہوتا تھا۔
فرار کی اطلاع اپنے اکلوتے بیٹے کی موت کی خبر مڑے پر میری نگاہ پڑی
اس لیے میں جلدی جلدی اپنے ساتھیوں کو ۔ ان پر یقین نہ آیا میں
دو منجنیقیں فیرا پر منتقل کر دی گئیں۔ عرشوں نے بھی تصدیق کر دی
کر دیا گیا اور برداشش کے جہاز کو آگ لگانے ۔ رہی ہے۔ جس نے ٹکڑے
تیزی سے ہٹ گیا۔

اب ہوا خاصی تیز چلنے لگی تھی اور ۔ مجھ پر ایک ایسے خزانے کا
دیے تھے۔
۔ تر ہماری زمین پر
میں اب تک بے حد مصروف رہا تھا اس لیے قیمت پر ایٹم بم
کے بارے میں نہیں پوچھ سکا تھا کہ وہ مر گیا یا زندہ ہے۔
میں نے ہیلو سے دریافت کیا تو وہ بولا۔ "وہ زندہ ہے۔ میں تابکاری
تیر نکال دیا ہے اور چونکہ تھوڑی بہت حکمت جانتا ہوں ا
لیے ....."
"حکمت کی باتیں رہنے دو۔" میں نے اس کی بات ۔ میرے
دی۔ "اب تم جنگجو بن چکے ہو۔ ہم زنجیر کے قریب آ گئے ہیں۔ پیش گوئی کر رہی
لوٹی تو ہمیں لڑتے ہوئے جان دینا پڑے گی۔ مجھے اُمید ہے ہیں اس لیے
تم بزدلی نہیں دکھاؤ گے۔"
۔۔ ہم جتنی جلدی
"فکر نہ کرو۔ اب مجھے مرنے سے ڈر نہیں لگتا۔"
"شاباش۔ جلدی سے جاؤ اور شافران سے کہو کہ" میں نے پوچھا

اس نے چمڑے کے ٹکڑے پر کشیدہ ایک نقشہ میرے
سامنے پھیلا دیا۔ ہم جس سمندر میں سفر کر رہے ہیں، اس کے ا
جانب سراما اور دوسری جانب نمورنیہ تھا اور ان دونوں
ملکوں کے مابین کہیں کہیں سمندر کی چوڑائی بہت زیادہ ہو جا
تھی ورنہ بیشتر حصے میں خاصی کم ہی رہتی تھی۔ شمال میں بقول
ارغون اتنا وسیع اور بے کراں سمندر تھا کہ اب تک کوئی جہاز
اس کے دوسرے کنارے نہیں پہنچ سکا تھا۔ اس لیے شمال
طرف جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور آتشین سرزمین
بھی بہت دُور تھی۔ ارغون نے بتایا کہ اس ارغوانی سمندر میں
جب بھی طوفان آتا ہے تو کئی کئی روز بلکہ ہفتوں جاری رہتا ہے
اگر ہم بادبان لپیٹ کر لنگر انداز ہو جائیں تب بھی اُن طوفانوں
کے سامنے ٹک نہیں سکتے۔

ہم نہ سراما واپس جا سکتے تھے اور نہ ہی نمورنیہ... اس
لیے صرف جنوب کا ہی راستہ باقی رہ گیا تھا۔ سو ہم نے جنوب کی
طرف سفر جاری رکھا لیکن چند گھڑیوں کے اندر اندر طوفان نے
ہمیں اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

سمندر میں کوہ پیکر لہریں اُٹھنے لگیں۔

ہواؤں کی شدت بڑھتی چلی گئی۔

جہاز بے قابو ہو کر ایک تنکے کی مانند اِدھر اُدھر بھٹکنے اور
ڈولنے لگا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہر لہر ہمیں اتھاہ گہرائیوں
میں ڈبونے کو بے تاب اور ہر جھکڑ جہاز کو پاش پاش کرنے
کے لیے بے قرار ہے۔ کچھ لہریں جہاز کو اُٹھا کر پٹخ دیتی تھیں اور
کچھ اس کے اوپر سے گزر جاتی تھیں۔ اُوپر سے گزرنے والی لہروں
سے جہاز میں پانی بھر جاتا لیکن چار سو افراد اپنی جان بچانے کے لیے
پانی نکالنے لگے تھے ابھی وہ پانی پوری طرح نہ نکال پاتے تھے
کہ لہر پھر آ جاتی تھی۔

ہم دو روز تک بپھرے ہوئے سمندر سے لڑتے اور سائیں
سائیں کرتے جھکڑوں کے تھپیڑے برداشت کرتے رہے لیکن تیسرے
دن کسی میں مقابلے کی تاب نہ رہی اور جہاز آہستہ آہستہ نیچے بیٹھنے لگا
... مگر پھر اچانک ہی ایک معجزہ رُونما ہوا اور جس تندی و تیزی
سے طوفان آیا تھا، اسی سرعت کے ساتھ فرو بھی ہو گیا... لیکن
جاتے جاتے وہ اپنی لپیٹ میں بہت سے ملاح بھی لے گیا تھا۔

موت کے سلسلے میں مسلسل شب روز کام کرنے والے
ہمارے ساتھی ابھی دم بھی نہیں لینے پائے تھے کہ میں نے انہیں
آرام کرنے سے پہلے پانی نکالنے اور جہاز کی صفائی کرنے کا حکم

دے دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے ارغون کو ہدایت کر دی کہ اب
کھانے پینے کی راشن بندی کر دی جائے اور جو اس کی خلاف ورزی
کرے اُسے سمندر کی لہروں کے سپرد کر دیا جائے۔ یہ اس لیے
ضروری تھا کہ خوراک کا بہت سا ذخیرہ تباہ ہو گیا تھا اور پینے کا
پانی بھی ختم ہونے والا تھا۔

پیلو کی حالت اگرچہ بہت خراب تھی مگر چونکہ اس نے اپنے
آپ کو جہاز کا طبیب بنا لیا تھا، اس لیے میں نے اُسے زخمیوں
اور بیماروں کی خبر گیری کا حکم دیا۔ تو وہ بولا۔

"میں تو ابھی خود بیمار ہوں۔ اُن کا علاج کیسے کروں؟"

"ہمت سے کام لو پیلو۔ ساتھیوں کے سامنے اچھی مثال
پیش کرو۔ بُرا وقت گزر چکا ہے۔ جاؤ۔" میں نے اُسے دلاسا دیا
تو وہ چلا گیا۔

ارغون نے، جو اَب میری جگہ کمان سنبھالے ہوئے تھا
کھڑکی سے جھانکتے ہوئے کہا۔ "تم غلطی پر ہو، سرفروش! بُرا وقت
گزر نہیں گیا بلکہ اب آنے والا ہے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"ارغوانی سمندر کے یہ طوفان ہمیشہ دو حصوں میں آتے
ہیں۔ یہ طوفان جو گزر گیا ہے وہ پلٹ کر آئے گا اور ہو سکتا ہے
ایک پہر، ایک دن یا اس سے بھی زیادہ دیر میں آئے... مگر آئے
گا ضرور... اور اپنے دامن میں پہلے سے زیادہ شدتیں اور
زیادہ ہلاکت خیزی لائے گا۔ یہ سکون وقتی ہے۔"

مجھے ارغون کی بات پر یقین کرنا پڑا کیونکہ اب تک اس نے
جو بھی پیش گوئی کی تھی حرف بحرف درست ثابت ہوئی تھی۔

"کیا تمہیں اندازہ ہے کہ ہم اس وقت کہاں ہیں؟" میں
نے سوال کیا۔

"نہیں... بس اتنا کہہ سکتا ہوں کہ طوفان ہمیں جنوب کی
طرف ہی لایا ہے۔"

"تو پھر اپنے آدمیوں سے کہہ دو کہ وہ جہاز کو جنوب کی
طرف کھینا شروع کر دیں۔ کیونکہ ہوا بالکل تھم گئی ہے۔ شاید ہم
آتشین سرزمین کے قریب پہنچ گئے ہوں اور ہمیں کوئی بندرگاہ
دکھائی دے جائے جہاں ہم پناہ لے سکیں۔ کیا تم ایسی کوئی بندرگاہ
جانتے ہو؟"

"نہیں... بہت کم سرامانیوں نے آتشین سرزمین دیکھی
ہے۔ کہتے ہیں کہ اُس کے تپتے ہوئے صحرا صرف منگرال ہی عبور
کر سکتے ہیں جو اس سرزمین کی دوسری جانب رہتے ہیں۔"

مجھے منگرالوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

میں نے آسمان کی طرف دیکھا جو بادلوں سے صاف
تھا۔ سمندر بھی پُرسکون تھا اور یہ محسوس ہی نہیں ہوتا تھا کہ یہاں
سے ہلاکت خیز طوفان گزرا ہے۔ میں نے ارغون سے پوچھا۔ "کیا
تمہیں یقین ہے کہ طوفان دوبارہ بھی آئے گا؟"

"جیسے مجھے اپنے وجود کا یقین ہے، اسی طرح طوفان کی
واپسی کا بھی ہے۔"

"تو پھر اپنے آدمیوں سے کہہ دو کہ وہ کھینا شروع کر دیں۔
میں جانتا ہوں کہ وہ بُری طرح تھکے ہوئے ہیں لیکن ہمیں سفر بلا
تاخیر جاری رکھنا ہے۔ شافران سے کہو کہ وہ جیسے چاہے ان سے
کام لے۔ جہاز کی حالت ایسی نہیں ہے کہ دوسرے طوفان کا
مقابلہ کر سکے جو بقول تمہارے پہلے سے کہیں شدید ہو گا۔"

... پھر میں بھی اپنے چوبی کمرے سے نکل کر عرشے پر چلا
گیا اور ساتھیوں کا حوصلہ بڑھانے لگا۔ اس طوفان میں ہمارے
جہاز کا مستول بھی ٹوٹ گیا تھا۔ ہمارے پاس فالتو مستول تو
تھا مگر ہم اُسے نصب نہیں کر سکتے تھے۔ ڈر یہ تھا کہ اس دوران
کہیں دوسرا طوفان نہ آ جائے۔ میں نے ایک ساتھی کو ٹوٹے ہوئے
مستول پر چڑھایا اور کہا وہ اپنے آپ کو رسیوں کے ساتھ جکڑ
لے اور تاحدِ نظر دیکھتا رہے۔ جونہی اُسے زمین دکھائی دے، چلا
کر مجھے بتائے تاکہ ہم جلد از جلد وہاں پہنچنے کی کوشش کر سکیں۔ میں
نے سوچا تھا کہ اگر ہمیں آتشین سرزمین کا ساحل دکھائی دے جائے
تو ہم جہاز کو وہاں لے جائیں گے۔ ہمارے پاس اتنے آدمی تھے
کہ ہم ریتلے ساحل کو کھود کر فیرا نامی اس جہاز کو کھڑا کر سکتے تھے...
پھر طوفان گزر جانے کے بعد بندرگاہ تلاش کرنا کوئی مشکل کام نہیں
ہو گا۔

میرے ساتھی مسلسل پانچ گھنٹے تک جہاز کھینتے رہے اتنے
میں مستول پر چڑھا ہوا آدمی ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے چلایا۔

"اُدھر دیکھو۔ ایک جہاز ڈوب رہا ہے۔"

ڈوبتے ہوئے جہاز سے ہمیں خوراک اور دوسرا سامان
مل سکتا تھا جو ہمارے فوری مسائل حل کر دیتا۔ میں نے آنکھوں
پر ہاتھ کا چھجا بنا کر اُدھر دیکھا اور مستول والے سے پوچھا۔

"کیا تم پہچان سکتے ہو وہ جہاز کس کا ہو سکتا ہے؟"

"ہاں... قزاقوں کا جہاز لگتا ہے کیونکہ اس کی نوک پر
انسانی کھوپڑی آویزاں ہے۔ اس کا مستول ٹوٹ چکا ہے اور اگلا
حصہ غرقاب ہو رہا ہے۔ مگر اس پر عورتیں دکھائی دے رہی ہیں۔"

بہت سی عورتیں ہیں۔"
عورتوں کے ذکر پر میرے ساتھیوں میں سرگوشیاں ہونے لگیں۔۔۔ یہ سرگوشیاں نئی مشکلات کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی تھیں۔
"تمہارا کیا خیال ہے، ارغون؟" میں نے پوچھا۔
ارغون دوربین لگا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا حالانکہ مجھے اس جہاز پر عورتیں، ہاتھ اور رنگین کپڑوں کے ٹکڑے ہلاتی صاف دکھائی دینے لگی تھیں۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ کہیں یہ وہی جہاز تو نہیں جس پر زینا کو سزا بھگتنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔
"اس پر تو بہت سی عورتیں ہیں۔" ارغون نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔
"میں جانتا ہوں ارغون۔ تم جہاز کے بارے میں بتاؤ۔"
"جہاز تو قزاقوں کا ہی معلوم ہوتا ہے۔ اس کی حالت خراب ہے مگر وہ ڈوب نہیں رہا ہے۔"
"اگر یہ قزاقوں کا جہاز ہے تو قزاق کہاں ہیں؟ یا یہ عورتیں ہی بحری قزاق ہیں؟" میں نے پوچھا۔
"نہیں۔۔۔" اس نے دوربین مجھے دیتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ انھوں نے یہ عورتیں کسی دوسرے جہاز سے اس پر منتقل کی ہوں گی۔"
"خیر پتہ چل جائے گا۔" میں نے کہا۔ "تم اپنا جہاز اس کے قریب لے چلو۔ ہو سکتا ہے کہ قزاق نچلے حصے میں چھپے ہوئے ہوں۔"
تھوڑی دیر بعد ساری حقیقت ہمارے علم میں آ گئی۔ یہ واقعی وہی جہاز تھا جس پر زینا سزا بھگت رہی تھی۔ قزاقوں نے اسے گھیر کر کپتان کو جو اس جہاز پر واحد مرد تھا، قتل کر دیا اور ان مجبور عورتوں پر ظلم و ستم کرتے رہے۔۔۔ پھر اس جہاز کو ڈبونے کی غرض سے نقصان پہنچا کر بھاگ نکلے۔۔۔ مگر جہاز قابلِ مرمت تھا۔ اس لیے میں نے ارغون سے کہا۔ "اب تم ہی کپتان ہو ارغون۔ تم ہمارے جہاز سے ضرورت کی ہر چیز اور دو بڑھئی ساتھ لے سکتے ہو۔ اس جہاز کی مرمت کروا کر اسے قابلِ استعمال بنا لو۔ تب تک ہم یہیں لنگر انداز رہیں گے۔"
یہ سن کر ارغون نے آسمان کی جانب دیکھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔ "ہو سکتا ہے کہ طوفان اتنی جلدی نہ آئے۔" میں نے اسے دلاسا دیا۔
ارغون میری تجویز پر عمل کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔
"ان عورتوں کا کیا ہوگا؟" اس نے پوچھا۔
"تمہارے خیال میں کیا ہونا چاہیئے؟" میں نے جواب دینے کی بجائے سوال کر دیا۔
"سرامانی دستور کے مطابق تو انھیں تناسب کے اعتبار سے بانٹ لینا چاہیئے۔"
موجودہ صورتِ حال میں مجھے اس کی تجویز سے اتفاق کرنا ہی بہتر محسوس ہوا کیونکہ پیلو نے بھی اس کی تائید کر دی تھی۔ میں نے پیلو سے کہا کہ وہ سب سے پہلے زینا کو تلاش کر کے اس کا خاص خیال رکھے۔
ہمیں اپنے ساتھیوں کی وجہ سے جہاز کی مرمت میں زیادہ دیر نہ لگی۔ باقی انتظامات بھی جلد ہی مکمل ہو گئے اور جب میں ہر طرف سے فراغت پا کر اپنے جہاز کے کمرے میں داخل ہوا تو وہاں زینا کے ساتھ ایک اور عورت بھی موجود تھی جس نے اپنا نام شہزادی مرینڈا بتایا۔
زینا نے مجھے پہچاننے سے انکار کر دیا۔
مرینڈا نے مجھے بتایا کہ زینا قزاقوں کا مسلسل شکار بنتی رہی ہے اس لیے اس کا ذہنی توازن خراب ہو چکا ہے۔ اس نے مجھے اور پیلو کو نوچ کھسوٹ کر کیبن سے نکال دیا۔
میں بھاری دل اور بوجھل قدموں کے ساتھ عرشے پر آ گیا۔
زینا کے ساتھ گزارے ہوئے وقت کی یادیں مجھے بری طرح ڈسنے لگیں۔ اس نے میری وجہ سے کتنے دکھ اور کتنے صدمے جھیلے تھے۔ میرا جی چاہا کہ میں پھوٹ پھوٹ کر رو دوں اور دل کا غبار ہلکا کر لوں مگر اتنے میں مجھے اپنے کندھے پر کسی کے نرم نرم ہاتھ کا ہلکا سا دباؤ محسوس ہوا۔
میں نے پلٹ کر دیکھا۔
میرے سامنے سرو قامت مرینڈا کھڑی تھی۔ سیاہ بالوں اور بادامی آنکھوں والی یہ لڑکی جو اپنے آپ کو منگرال شہنشاہ چموتان کی بیٹی کہتی تھی۔ اگرچہ بے حد خوبصورت تھی لیکن میرا دل اس کی پکار نہ سن سکا۔ میں نے اسے ٹال دیا اور سوچنے لگا کہ قدرت میرے ساتھ ایسا مذاق کیوں کرتی ہے؟ میں نے لالہ کو دل کی گہرائیوں سے چاہا تھا مگر میری مجبوریوں نے مجھے چپ کا زہر پلایا تو وہ مجھ سے روگردانی کرنے لگی۔۔۔ اور اب جبکہ میں لالہ کا لگایا ہوا زخم زینا سے بھرنا چاہتا تھا تو اس نے بھی مجھے پہچاننے سے انکار کر دیا۔ آخر میرے مقدر میں اتنی محرومیاں کیوں لکھ دی گئی ہیں؟
میں نے پھر زینا سے بات کرنا چاہی لیکن وہ یوں سکڑ سمٹ کر پیچھے ہٹ گئی جیسے مجھ سے بری طرح خوفزدہ ہو۔ اس

کی آنکھوں میں دہشت اور کرب کے سائے لہرا رہے تھے۔ میں اُس کے اس ردِ عمل کا سبب جان چکا تھا... مگر اب سوال یہ تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے اور میں اُس کی مدد کس طور کر سکتا ہوں؟

پہلی شب جب مرینڈا میرے پاس آئی تھی تو میں کچھ اور سمجھا تھا لیکن بعد میں مجھے احساس ہوا کہ یہ میری غلط فہمی تھی۔ میں نے اُس کی کسی ادا میں سپردگی کی کیفیت محسوس نہیں کی لیکن وہ ہر وقت میری طرف دیکھتی اور عجیب انداز سے مسکراتی رہتی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ مجھے اچھی طرح جانتی ہو یا جیسے اُس نے میرے دل کا حال پڑھ لیا ہے اس کا رویّہ ہم سب کے ساتھ ایسا تھا جیسے ہم اُس کے محکوم اور غلام ہوں۔

ہمیں دوبارہ سفر شروع کیے تیسرا روز تھا کہ ہوا دوبارہ چلنی شروع ہو گئی۔ آسمان پر بادل بھی گھِر گھِر کر آنے لگے تھے اور لہریں بھی بلند و شوریدہ سر دکھائی دینے لگیں۔ یہ سب بقول ارغون طوفان کی واپسی کے آثار تھے۔ میرے ساتھی جتنی تیزی سے جہاز چلا سکتے تھے، اپنے چپوؤں کی مدد سے چلاتے رہے... اور یہ بھی ایک معجزہ ہی تھا کہ طوفان آنے سے پہلے پہلے ہمیں ساحل نظر آ گیا۔

یہ بے شجر و بے گیاہ ساحل آتشین سرزمین ہی کا تھا۔

تا حدِ نظر ریت کے سوا کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میرے ساتھی ساحل پر اُترنے کے لیے تیار نہ ہوئے تو میں نے اُنھیں ان کے حال پر چھوڑ دیا اور ایک کشتی میں زینا، مرینڈا، پیلو، شافران اور چند دوسرے لوگوں کے ساتھ ساحل پر آ گیا۔ میں نے اپنے ساتھ آنے پر کسی کو مجبور نہیں کیا تھا۔ زینا کے سوا وہ سب خود ہی میرے ساتھ رہنا چاہتے تھے۔ مگر میں زینا کو نہیں چھوڑ سکتا تھا اسی لیے اُسے بھی ساتھ لیتا آیا تھا۔

ہم ساحل پر اُترے ہی تھے کہ صحرا کی جانب سے طوفانِ گرد و غبار آیا اور وہ جہاز کو بہا لے گیا۔ تیز ہواؤں نے جہاز فیرا کو جلد ہی ہماری نگاہوں سے اوجھل کر دیا۔ طوفانِ باد و باراں نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا، میں نہیں جانتا۔ البتہ یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ صحرا کے سینے سے اُٹھنے والے بگولوں نے ہمیں ریت میں دفن کرنے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی تھی... لیکن خوش قسمتی سے ہم بچ گئے تھے۔

●

ہمیں اس لق و دق صحرا میں سفر کرتے کئی روز ہو گئے تھے۔ دن میں سورج ہم پر آگ برساتا لیکن رات اپنے دامن میں ایسی ٹھنڈک لیے اُترتی کہ ہم ٹھٹھرنے لگتے تھے۔ ان چند روز میں مجھ پر بڑے عجیب و غریب انکشافات ہوئے تھے۔ جنھوں نے مجھے بُری طرح چکرا کر رکھ دیا تھا... اور یہ انکشافات مرینڈا نے کیے تھے جسے اب میں منگرال شہنشاہ جھوتان کی بیٹی تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

مرینڈا کا مزاج اور طور طریقے بھی شہزادیوں جیسے ہی تھے۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ میرا ہم شکل، میرا جڑواں بھائی منگرالوں کی سرزمین پر پہنچ چکا ہے اور اس کے باپ جھوتان نے اُسے اپنا وزیر بنا لیا ہے۔ اُس نے یہ بھی بتایا... کہ وہ مجھ سے ملنے کے لیے بے تاب ہے اور اس نے میری تلاش میں ہر طرف آدمی بھیج دیے ہیں۔

مرینڈا نے یہ انکشاف کبھی ایک ساتھ نہیں کیے تھے جب کبھی وہ ترنگ میں ہوتی تھی مجھے ایک آدھ بات بتا دیتی تھی جس سے میرا جذبۂ تجسس دوچند ہو جاتا اور جب میں اُسے مزید کچھ بتانے کے لیے اصرار کرتا تو وہ خاموشی اختیار کر لیتی تھی۔

صحرا کے افق پر برف پوش چوٹیوں والے پہاڑ دکھائی دیتے تھے۔ مرینڈا نے بتایا تھا کہ ان پہاڑوں کے اُس پار منگرال بستے ہیں اور اس کا باپ اُن پر حکمرانی کرتا ہے۔ ہمارا سفر مسلسل جاری تھا مگر وہ پہاڑ اب بھی اتنے ہی دُور تھے جتنے دُور کہ پہلے روز دکھائی دیے تھے۔

یہ حقیقت تھی کہ اس صحرا میں پانی کا کہیں نام و نشان تک نہیں تھا مگر میں نے پانی کے حصول کا ایک طریقہ معلوم کر لیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ عام موسم میں ہوا سمندر کی جانب سے صحرا کی طرف چلتی ہے اور اپنے ساتھ نمی کے بخارات لاتی ہے۔ چنانچہ رات کے پہر میں ریت میں دبے ہوئے پتھر ایک ڈھیر کی صورت میں جمع کر لیتا۔ ٹھنڈے پتھروں پر نمی جمع ہو کر قطروں کی صورت اختیار کر لیتی اور یہی قطرے نہ صرف ہماری پیاس بجھانے کے کام آتے بلکہ میں ان سے وہ چھوٹا سا مشکیزہ بھی بھر لیتا جو شافران نے جہاز سے آتے وقت اپنی پیٹی کے ساتھ باندھ لیا تھا۔

کھانے کا مسئلہ بھی مرینڈا کی مدد سے کسی حد تک حل ہو گیا تھا۔ مرینڈا نے بتایا تھا کہ اس صحرا میں ایسے سانپوں کی کمی نہیں جو زہریلے نہیں ہوتے۔ چنانچہ ہم تلوار کی مدد سے روز اتنے سانپ مار لیا کرتے جنھیں بھون کر ہماری بھوک مٹ جاتی تھی۔

مرینڈا نے یہ بھی بتایا کہ دُور دکھائی دینے والے پہاڑوں سے پہلے ایک نخلستان واقع ہے۔ جب ہم وہاں پہنچیں گے تو ہماری خاطر مدارت کی جائے گی اور شاہ جھوتان کو ہماری آمد کا پیغام

بھیجا جائے گا۔ یہ پیغام ملتے ہی راجدھانی سے ایک گروہ ہمیں لینے کے لیے آ جائے گا۔ میرے لیے اب یہ سوچ پریشان کن تھی کہ میرا ڈپلی کیٹ راجدھانی میں ایک اعلا عہدے پر فائز میرا انتظار کر رہا ہے۔ وہ جس حیثیت میں تھا، میرے ساتھ ہر سلوک کر سکتا تھا۔ پہلے تو میں اُس کی تلاش میں آتشین سرزمین پہنچنا چاہتا تھا مگر اب میں اس شش و پنج میں تھا کہ منگرالوں کی راجدھانی جاؤں یا نہ جاؤں۔ لیکن وہاں جائے بغیر کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔

اب کبھی کبھی میرے سر میں درد بھی ہونے لگا تھا جب کبھی میرے سر میں درد کی لہر اُٹھتی، میں سوچتا کہ کیا میرے ڈپلی کیٹ کے سر میں بھی درد کی ایسی ہی لہر اُٹھتی ہو گی؟ اس لیے کہ کمپیوٹر کی لہریں اس سے ٹکراتی اور اُسے بھی کھوجتی ہوں گی۔

زینا کی حالت ویسی ہی تھی۔

وہ اب تک نہ مجھے پہچان سکی تھی اور نہ ہی پیلو کو... صرف شافران ہی ایک ایسا فرد تھا جس کے ساتھ وہ قدرے مانوس ہو گئی تھی۔ وہ بھی پوری طرح اس کی نگہداشت کرتا تھا۔ ایک رات پیلو نے مجھ سے کہا۔

"زینا کی وجہ سے ہم تیزی کے ساتھ سفر نہیں کر سکتے۔ وہ پاگل ہو گئی ہے۔ جب میں اُسے جنونی حالت میں دیکھتا ہوں تو میرا دل پھٹنے لگتا ہے کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ وہ زندگی بھر پاگل رہنے کی بجائے مر جائے؟"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو، پیلو؟" میں نے پوچھا۔

"ہم دل پر پتھر رکھ کر اُسے یہیں صحرا میں چھوڑ کر آگے بڑھ جائیں تو بہتر ہو گا۔"

یہ سُن کر مجھے دھچکا سا لگا۔ میں نے پیلو کو گھورتے ہوئے کہا۔ "یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ تم جو معلمِ اخلاق تھے؟ وہ وقت یاد کرو پیلو، جب تمھاری زندگی بچانے کے لیے میں نے اُسے پکڑا تھا۔ پھر سرانانی رسم و رواج کے مطابق وہ میری بیوی بنی تھی۔ میں اُسے نہیں چھوڑ سکتا۔"

"میں آج بھی معلمِ اخلاق ہوں۔" وہ بولا۔ "وقت نے میرے ہاتھ میں تلوار تھما دی تھی اور وقت نے ہی وہ تلوار میرے ہاتھ سے چھین لی ہے۔ طاقت اور اقتدار آنی جانی چیزیں ہیں لیکن علم و اخلاق کو زوال نہیں۔ میں نے تو یہ بات اس لیے کہی تھی کہ وہ ناقابلِ علاج ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کا حسن اور جوانی اُسے پھر درندگی کا شکار بنا دے۔"

"نہیں پیلو۔ اب وہ میرے ساتھ ہے میں ایسی نوبت نہیں آنے دوں گا۔" میں نے اُسے گھورتے ہوئے بات جاری رکھی۔ "یہ بتاؤ کہ تم نے یہ مشورہ مرینڈا کے کہنے پر تو نہیں دیا؟"

"نہیں جناب۔ آپ کو یہ شک کیسے ہوا؟" اُس نے حیرت سے پوچھا۔

"اس لیے کہ وہ زیادہ تر تم ہی سے باتیں کرتی رہتی ہے۔"

"ہاں کپتان... اور وہ باتیں صرف آپ کے اور زینا کے متعلق ہوتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ آپ کے بارے میں سب کچھ جان لینا چاہتی ہے۔"

ہم اس وقت پتھروں پر جمع ہونے والے قطرے سمیٹ کر مشکیزہ بھر رہے تھے۔ رات کا پچھلا پہر تھا اور سردی بہت بڑھ گئی تھی۔ اتنے میں زینا کراہنے لگی۔

میں نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔

وہ سردی سے کانپ رہی تھی۔

شافران نے جلدی سے اُسے اپنی آغوشِ شفقت میں سمیٹ لیا۔ جیسے ماں اپنے بچّے کو سردی سے بچانے کے لیے گود میں بھر لیتی ہے۔

پیلو سونے کے لیے چلا گیا مگر میں وہیں بیٹھا سوچتا رہا۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ اب میں پہلے سے کہیں زیادہ جذباتی ہو گیا تھا زندگی نے میرے ساتھ کتنا بے رحمانہ سلوک کیا تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں مر جاؤں لیکن جب کبھی ایسا موقع آتا تھا تو میں لاشعوری طور پر اپنے تحفظ اور بقا کے لیے سینہ سپر ہو جاتا تھا۔ میرے متضاد خیالات کی رو یہیں تک پہنچی تھی کہ مجھے اپنے پیچھے کچھ کھٹکا سا سُنائی دیا۔

میں نے پلٹ کر دیکھا۔

قریبی چٹان کے ساتھ شہزادی مرینڈا کھڑی تھی۔ وہ سرو قامت تھی۔ اور پچھلے پہر کی چاندنی میں اُس کا حسن بے پناہ لگ رہا تھا۔ اُس نے اُسی عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "مجھے سردی لگ رہی ہے، سرزوش۔"

"سردی تو مجھے بھی لگ رہی ہے مرینڈا۔ میں تمھارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟"

اُس نے زینا کی طرف اُنگلی اُٹھا دی جو شافران کی آغوشِ شفقت میں سمٹی ہوئی تھی۔ "یہ کیڑا جانور بھی جانتا ہے کہ سائبان کیسے بنا جاتا ہے۔"

مَیں سر سے پاؤں تک کانپ کر رہ گیا۔

●

صبح جب ہم نے اپنے سفر کا آغاز کیا تو مرینڈا میرے قریب آ گئی: "میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکی سرفروش!" اس نے کہا۔

"کیا فیصلہ؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"تم دونوں بھائیوں میں سے کون بہتر ہے؟ تم یا وہ؟"

اس کا مطلب تھا کہ وہ میرے ڈپلی کیٹ سے بھی مل چکی تھی۔ میں بہت کچھ جاننے کے لیے بے تاب ہو گیا۔

"میں اس سلسلے میں تفصیل جاننا چاہتا ہوں؟" میں نے کہا۔

"میں جانتی تھی کہ تم ضرور جاننا چاہو گے۔ مجھے بھی تم سے دل چسپی ہے۔ میں اس سلسلے میں پیلو کو کرید تی رہی ہوں۔ اس نے مجھے تمھارے بارے میں بہت کچھ بتایا ہے مگر وہ باتیں نہیں بتا سکا جو میں جاننا چاہتی تھی۔ میں تم سے بات کرنے کے لیے مناسب وقت کی منتظر تھی۔ میں چاہتی تھی کہ جب نخلستان تک صرف پانچ یوم کا سفر باقی رہ جائے تو بات کروں گی اور اب وہ وقت آ گیا ہے۔ تم اپنے جڑواں بھائی کے متعلق کیا جاننا چاہتے ہو، سرفروش؟"

"وہ سب کچھ جو تم جانتی ہو۔" میں نے کہا۔

"عجیب سی بات ہے کہ جب اس نے تمھارے بارے میں سُنا تو بولا کہ تم اس کے جڑواں بھائی ہو اور وہ تمھارے بارے میں سب کچھ جاننا چاہتا ہے۔ تم دونوں کیسے جڑواں بھائی ہو کہ ایک دوسرے کے بارے میں جاننا چاہتے ہو؟"

"سب کچھ جاننے سے میری مُراد بچھڑنے کے بعد حالات سے ہے شہزادی۔ ۔ ۔ مگر اُسے یہ کیسے معلوم ہوا کہ میں زندہ ہوں؟"

"سراما سے ایک گھڑ سوار آیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ اُسے وہاں کے مہاپُجاری نے بھیجا ہے اور وہ جاننا چاہتا ہے کہ تمھارا جڑواں بھائی یہاں پہنچا ہے یا نہیں؟"

میں سمجھ گیا کہ یہ حرکت کرنڈ کی ہو گی لیکن ان باتوں کا آغاز جس انداز سے ہوا تھا، وہ کچھ اور ہی غمازی کرتا تھا۔ میں نے پوچھا۔

"تمھارا کیا اندازہ ہے شہزادی کہ ہم دونوں بھائیوں میں سے کون بہتر ہے؟"

"میں فی الحال کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی، سرفروش۔"

●

شہزادی مرینڈا نے بتایا تھا کہ ہم پانچویں روز نخلستان تک پہنچ جائیں گے۔ اس کی بات درست ہی ثابت ہوئی۔ وہاں شہزادی کی وجہ سے ہماری بڑی آؤ بھگت کی گئی۔ ہمیں کھانے کو عمدہ غذا اور پہننے کو نئے کپڑے دیے گئے۔ چشمے کے سامنے ہی وہ درّہ تھا جہاں سے منگرولوں کی جماعت آنے والی تھی اور جس کا ذکر مرینڈا نے کیا تھا۔

مرینڈا دن میں تو مقامی لوگوں کے ساتھ رہتی لیکن رات ہوتے ہی ہمارے پاس آ جاتی تھی۔ مقامی لوگ قد آور تھے۔ مرینڈا نے بتایا کہ وہ منگرولوں کے نچلے درجے کے قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی عورتیں اس طرح نقاب ڈالتی تھیں کہ چہرے کا زیریں حصہ ڈھکا رہے مگر آنکھیں آزاد رہیں۔ کچھ منگرول ٹوپی پہنتے تھے اور کچھ پگڑیاں باندھتے تھے۔ ان لوگوں نے ہمارا پُرتپاک خیر مقدم کیا تھا اور میرے لیے یہ بات بڑی ہی تعجب خیز تھی کہ ہمارا خیر مقدم اور مہمان داری میرے ڈپلی کیٹ کی ہدایت پر کی گئی تھی جو وہاں وزیر کے عہدے پر فائز تھا۔

صحرا کے پُرصعوبت سفر کی تھکن اور نقاہت دو تین روز میں ہی جاتی رہی۔ جب ہم ساحل پر اُترے تھے اور سفر کا آغاز کیا تھا تو کُل نو افراد تھے۔ ۔ ۔ مگر نخلستان تک پہنچتے پہنچتے صرف پانچ ہی رہ گئے تھے۔ میں، زینا، مرینڈا، پیلو اور شافران۔ ۔ ۔ میں نے ایک بار پھر زینا سے بات کرنا اور اُسے اپنا رشتہ یاد دلانا چاہا۔ ۔ ۔ مگر وہ مجھے خالی خالی نظروں سے دیکھتی رہی اور پھر یوں شافران سے لپٹ گئی جیسے کوئی خوف زدہ بچہ ماں سے لپٹ جاتا ہے۔ ۔ ۔ شافران بڑے پیار سے اس کے بالوں میں اُنگلیاں پھیرنے اور اُسے تھپکنے لگا۔ مرینڈا بھی یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ وہ مجھے الگ لے گئی اور بولی۔ ۔ ۔

"اس کا پاگل پن کبھی ٹھیک نہیں ہو گا، سرفروش۔ ہمارے ملک بیکال میں ایسے لوگوں کے لیے ایک مقام مخصوص کر دیا گیا ہے جہاں دیوانوں کی خبرگیری اور نگہداشت کی جاتی ہے۔ میں اسے وہاں بھجوا دوں گی۔"

"نہیں شہزادی۔" میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "میں یہ بات پسند نہیں کروں گا۔ زینا میری ذمّے داری ہے کیوں کہ سرامانی قانون کے مطابق اس نے مجھ سے شادی کی تھی۔"

"ہُش۔ ۔ ۔!" وہ بولی۔ "اب تم سراما میں نہیں ہو اور پھر کیا تم ایک ایسی عورت کے شوہر کہلانا چاہتے ہو جو قزاقوں کی بربریت کا اس قدر نشانہ بنی ہے کہ اپنا ذہنی توازن تک کھو بیٹھی ہے؟"

مجھے مرینڈا کی اس بات پر غصہ آ گیا۔ "تم بھی تو قزاقوں کے قبضے میں تھیں شہزادی۔ انھوں نے تمھارے ساتھ بھی تو وہی سلوک کیا ہو گا جو زینا کے ساتھ کیا ہے۔"

مرینڈا نے پُرغرور انداز سے اپنی گردن کو جھٹکا دیا اور بولی: "میں منگرول شہنشاہ کی بیٹی ہوں، سرفروش۔ قزاقوں کو میرے سامان سے ایسے ثبوت مل گئے تھے جن سے یہ حقیقت آشکارا ہوتی تھی۔ ۔ ۔ پھر میں نے اُن سے گراں زرِ تاوان ادا کرنے کا وعدہ بھی کیا تھا اس لیے ان کی درندگی سے محفوظ رہی ہوں۔ دوسرے جب انھوں نے مجھے قیدی بنایا تو وہ زینا کے جہاز پر قابض ہو چکے تھے اور زینا اُن کی مسلسل درندگی کا شکار بن رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر وہ شہزادی ہے تو اس نے میری طرح قزاقوں سے زرِ تاوان ادا کرنے کا وعدہ کیوں نہیں کیا؟ اگر وہ ایسا کرتی تو اُن کی درندگی سے یقیناً محفوظ رہتی۔"

"تم خوش قسمت ہو، شہزادی۔" میں نے اُسے مختصر سا جواب دیا۔ میں اُسے یہ نہیں بتانا چاہتا تھا کہ اگر زینا اُن سے زرِ تاوان دینے کا وعدہ کر بھی لیتی تو ملکہ فیرا اُس کی ادائیگی نہ کرتی کیوں کہ اس طرح اس کی ایک بیٹی اپنے آپ ٹھکانے لگ جاتی اور اس کے لیے زہر کے ایک پیالے کا خطرہ کم ہو جاتا۔

اتنے میں مرینڈا پھر بول اٹھی: "تم نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ میں قزاقوں کے ہاتھ کیسے لگی تھی؟"

"میں نے پوچھا تھا۔ ۔ ۔ مگر تم نے بتایا ہی نہیں۔"

"اوہ ہاں۔ ۔ ۔ ۔ دراصل میری اَنا یہ برداشت نہیں کرتی تھی کہ کوئی مجھ سے پوچھ گچھ کرے۔ خیر۔ ۔ ۔ اب تمھیں سارا قصّہ بتائے دیتی ہوں۔ میں نمورینہ کے قریبی ملک اردنا جا رہی تھی۔ میرے ساتھ ایک چھوٹا سا کارواں تھا۔ تم اسے میرا محافظ دستہ بھی کہہ سکتے ہو۔ ہمارا جہاز اپنی منزل کی طرف جا رہا تھا کہ قزاقوں کی کشتیوں نے اُسے گھیر لیا۔ کچھ لوگ مارے گئے اور کچھ نے فرار ہونا چاہا تو ڈوب کر ہلاک ہو گئے۔ قزاق مجھے اُسی جہاز پر لے آئے جسے تم نے مرمت کروا کر اپنے ساتھی کو دے دیا تھا۔ اس جہاز پر بہت سی عورتیں تھیں۔ زینا بھی ان میں شامل تھی اور چونکہ وہ سب سے حسین تھی اس لیے سب سے زیادہ تختۂ مشق بنتی رہی۔ اتنے میں ایک زبردست طوفان آیا۔ جہاز کا اگلا حصّہ ٹوٹ گیا۔ قزاق سمجھے کہ جہاز ڈوبنے والا ہے۔ وہ اپنی کشتیوں میں بیٹھ کر جہاز سے چلے گئے لیکن طوفان نے اُن کی کشتیاں اُلٹ دیں۔ اُن میں سے دو کسی طرح دوبارہ جہاز تک پہنچ گئے۔ ۔ ۔ مگر غصّے میں بھری ہوئی عورتوں نے جوشِ انتقام میں اُنھیں مار ڈالا۔ ۔ ۔ پھر تمھارا جہاز آ گیا۔ اس کے بعد کے حالات تم خود بھی جانتے ہو۔"

شہزادی اُس حفاظتی دستے کے انتظار میں وہاں ٹھہری ہوئی تھی جو ہمیں لینے کے لیے بیکال سے آنے والا تھا۔ میں سارا دن بستی کے باہر ایک چھوٹے سے چشمے کے پاس درختوں کی چھاؤں میں بیٹھا سوچتا رہتا تھا۔ میری سمجھ میں اب تک یہ بات نہیں آسکی تھی کہ میرے ڈپلی کیٹ نے ہمارے پُرتپاک خیر مقدم اور خاطر و مدارت کے احکام کیوں جاری کیے ہیں؟ مجھے یہ اندیشہ تھا کہ اس عزت و تکریم کی بجائے اس نے میرے قتل کا حکم صادر کر دیا ہو گا۔ اس متضاد سلوک کا مطلب تھا کہ وہ کسی خاص منصوبے کے تحت ایسا کر رہا ہے۔ وہ منصوبہ یا چال کیا ہو سکتی ہے، میرے فہم و ادراک سے باہر تھی۔ اس لیے مجھے اس وقت تک کچھ بھی نہیں کرنا تھا جب تک کہ وہ خود کوئی قدم اُٹھانے میں پہل نہ کرے۔ اس سلسلے میں مجھے صرف دفاعی جنگ لڑنا تھی۔

تھوڑی دیر پہلے میرے سر میں زور کا درد اُٹھا تھا۔ اس بار یہ درد بے حد شدید تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کمپیوٹر کی لہروں نے مجھے تلاش کر لیا ہو۔ ۔ ۔ پھر ایک دم ہی وہ درد ختم بھی ہو گیا۔ یہ اس

اُمر کی نشانی تھی کہ ڈاکٹر فریدوں، مجھے کسی بھی لمحے واپس بلاسکتا ہے۔

مَیں نے پیلو کی طرف دُکھ سے دیکھا جو مجھے سر درد میں مبتلا دیکھ کر بُری طرح پریشان ہوگیا تھا۔ وہ بولا "کیا آپ کو بہت تکلیف ہے، جناب؟ مَیں کوئی دوا تیار کردوں؟"

"نہیں پیلو، سر درد تھا جو ٹھیک ہوگیا" مَیں اُسے کیسے بتاسکتا تھا کہ اب کسی وقت بھی ہم کبھی دوبارہ نہ ملنے کے لیے جُدا ہوسکتے ہیں۔ مَیں نے اس سے پوچھا "تم مستقبل میں کیا کرنا چاہتے ہو، شہنگو میاں؟"

"مَیں سراما جاکر ملکہ فیرا کی حمایت میں نوربنہ کے خلاف آزادی کی جنگ لڑنا چاہتا ہوں۔ مَیں غلام ملک نہیں بلکہ آزاد ملک کا آزاد شہری بننا چاہتا ہوں۔"

"تم دوبارہ سراما جانا چاہتے ہو؟" مَیں نے تعجب سے پوچھا۔

"مَیں سرامانی ہوں، جناب۔ میری جڑیں سراما میں ہیں۔ اگر زندگی نے وفا کی تو میں اپنے وطن ضرور جاؤں گا۔"

مَیں نے سوچا کہ وہ ٹھیک ہی کہتا ہے۔ ہر آدمی کی جڑیں اپنے ہی وطن میں ہوتی ہیں۔ میں خود بھی تو اپنی سرزمین اور اپنے وطن کی طرف لوٹ جاؤں گا۔ . . پھر اچانک مجھے ایک بات سُوجھی۔ مَیں نے کہا "تم جینئس بننا چاہتے ہو، پیلو؟"

"وہ کیا ہوتا ہے؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ عظیم تر انسان ہوتا ہے پیلو! جسے لوگ ہمیشہ عزت و تکریم سے یاد کرتے ہیں۔ اس کے ہم عصر ہی نہیں بلکہ آنے والی نسلیں بھی اس پر فخر کرتی ہیں اور اس کے مجسمے بناکر اُنھیں ہار پہناتی ہیں۔"

"جیسے دیوتا بروق کے مجسمے بنائے جاتے ہیں؟"

"ہاں . . . بلکہ اس سے کہیں زیادہ خوب صُورت" مَیں نے جواب دیا۔

"پھر تو میں جینئس بننا پسند کروں گا لیکن کیا اس کے لیے مجھے پہلے مرنا پڑے گا؟"

مجھے اس کی بات پر ہنسی آگئی "موت تو برحق ہے دوست سب کو ایک نہ ایک روز مرنا ہی ہے . . . مگر جینئس بننے کے لیے مرنا شرط نہیں۔ مَیں تمھیں ایک ایسی راز کی بات بتاتا ہوں، جو تمھیں جینئس بنادے گی۔"

"ضرور بتایئے جناب! مجھے آپ پر اعتماد ہے۔"

"تو پھر غور سے دیکھو اور ہر بات اچھی طرح ذہن نشین کرتے جاؤ" یہ کہہ کر مَیں نے زمین پر دائرہ بنایا۔

"یہ سورج ہے یا چاند . . . مگر یہ مجھے جینئس کیسے بنائے گا؟"

وہ فوراً ہی بول اُٹھا۔

"بیچ میں مت بولو اور غور سے دیکھتے جاؤ۔ یہ نہ تو سورج ہے اور نہ ہی چاند ہے . . . بلکہ یہ ایک پہیّہ ہے . . . اور یہ دوسرا پہیّہ ہے" مَیں نے دوسرا دائرہ بناتے ہُوئے سمجھایا اور پھر تقریباً نصف گھنٹے بعد وہ پہیّے کی کارکردگی سے آگاہ ہوچکا تھا۔ اس نے تعجب سے پوچھا . . .

"یہ باتیں اب تک سراما کے کسی آدمی نے کیوں نہیں سوچیں؟"

"اس لیے کہ اُن میں کوئی جینئس نہیں تھا۔ میرا خیال ہے کہ منگرولوں میں بھی ایسا کوئی جینئس پیدا نہیں ہُوا جو پہیّے کا استعمال جانتا ہو۔ تم انھیں کسی چمڑے یا کپڑے پر مت بنانا بلکہ ہر بات اپنے ذہن میں نقش کرلو اور جب بھی موقع ملے سراما پہنچ جاؤ۔"

"مَیں ایسا ہی کروں گا۔ بس سمجھ لو کہ میں جینئس بن گیا ہوں۔"

ابھی ہم پہیّے کی باتیں ہی کر رہے تھے کہ گھوڑوں کی ٹاپیں سُنائی دیں۔ ہم نے پلٹ کر دیکھا تو درّے کی سمت سے تقریباً پچیس گھڑ سوار آتے دکھائی دیے۔ وہ میرے قریب آکر رُک گئے۔ اُن کے سربراہ نے مجھے چمڑے کے ٹکڑے پر مشتمل ایک خط دیا جس میں یہ الفاظ تحریر تھے . . .

"برادرِ عزیز! مَیں تمھیں خوش آمدید کہتا ہوں۔ یہ خبر میرے لیے خوشی کا باعث بنی کہ تم زندہ ہو۔ مَیں تم سے ملنے کے لیے بے تاب ہوں۔ فی الفور روانہ ہوجاؤ۔

تمھارا جُڑواں بھائی۔ گومرشن"

تقدیر ایک بار پھر مجھے اپنے نقلی ہمزاد کے رُوبرو لے [illegible]ئی تھی۔

ہم آمنے سامنے کھڑے، ایک دوسرے کو عجیب نگاہوں سے [illegible]یکھ رہے تھے۔ ان نگاہوں میں تجسّس، خدشے، وسوسے، [illegible]نید اور خوف کے جذبے شامل تھے لیکن عدم اعتمادی کا رنگ [illegible]ب سے گہرا تھا۔

مجھے اس کمرے میں آئے چند لمحے ہی ہُوئے تھے کہ وہ میرے [illegible]س پہنچ گیا تھا۔ ہم دونوں منگرالوں کے لباس پہنے ہُوئے تھے۔ فرق [illegible]ا تو صرف اتنا کہ میرے ڈپلی کیٹ کی دستار قرمزی رنگ کی [illegible]ی اور میری سفید . . . اس کے آنے سے پہلے مَیں نے کمرے کا اچھی [illegible]ح جائزہ لے لیا تھا۔

یہ مکان، شہر کی دیگر عمارات کی طرح مٹی کی پختہ اینٹوں کا [illegible]ہُوا تھا اور اینٹیں غالباً اس لیے استعمال کی گئی تھیں کہ شہر کے [illegible]ں، طوفانوں کے تند و تیز جھکڑوں سے محفوظ رہ سکیں۔ سامنے [illegible]یوار میں ایک دریچہ تھا جس سے تموتان کے محل اور شہر کے مینار [illegible]ائی دے رہے تھے۔

پہلی بار جب میرا اپنے ڈپلی کیٹ سے آمنا سامنا ہُوا تھا تو [illegible]ہذب دُنیا کے لباس میں تھے . . . مگر آج ہمارے جسم کے اُوپری [illegible]مبے لباس تھے۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہُوئی کہ اس کے سینے پر بھی [illegible]ل کے ویسے ہی نشانات ہیں، جیسے میرے سینے پر تھے۔ البتہ میرے [illegible]اور جسم کے دوسرے حصّوں پر جن نئے زخموں کا اضافہ ہُوا تھا، [illegible]سے میرے نقلی ہمزاد کا سینہ اور دوسرے اعضا محروم تھے۔ اس کا [illegible]ب تھا کہ ڈپلی کیٹ تیار کرنے والا اصلی شخصیتوں کی ہر بات [illegible]باخبر رہتا ہوگا۔ ایک بار میرا آپریشن ہُوا تھا جس کی وجہ سے میرے پیٹ [illegible]دائیں جانب ٹانکے لگنے سے کن کھجورے جیسا نشان باقی رہ گیا تھا۔ میں [illegible]دیکھا کہ میرے نقلی ہمزاد کے پیٹ پر بھی کن کھجورے جیسا ٹانکوں کا [illegible]ن موجود ہے۔

میرا ڈپلی کیٹ آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا مگر مَیں کمرے میں ٹہلتا اور [illegible]ے سے نظر آنے والے شہر کے مینار دیکھتا رہا۔ دراصل مجھے اپنے [illegible]کیٹ کے اطمینان اور سرد مزاجی نے گھبراہٹ میں مبتلا کردیا تھا۔ [illegible]مَیں جانتا تھا کہ کدورت اس کے دل میں بھی جمی ہُوئی ہے . . . بظاہر وہ بڑا مطمئن نظر آنے کی کوشش کر رہا ہے۔

مجھے اس کی بالادستی قبول نہیں تھی۔ پہلے راؤنڈ میں [illegible]وہ صرف لالہ اور اس کے خاندان کی وجہ سے جیت گیا تھا۔ [illegible]اس وقت ان کی زندگیاں داؤ پر نہ لگی ہُوئی ہوتیں تو میں جان پر کھیل کر بھی اس کا مقابلہ کرلیتا مگر اب ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ تاہم اس ملاقات میں کشت و خون کا امکان نہیں تھا۔ اگر وہ چاہتا تو اس وقت میری بجائے میرا بریدہ سر ایک طشت میں اس کے سامنے رکھا ہوتا . . . مگر اس نے مجھے بڑے احترام سے بُلوایا تھا . . . کیوں؟ . . . یہ عقدہ وَا ہونا ابھی باقی تھا۔

میرے ڈپلی کیٹ نے پائپ نکالا، اس میں حشیش کا بُرادہ بھرا اور انگیٹھی سے لکڑی کا ٹکڑا جلا کر اُسے سُلگایا پھر جلدی جلدی کش لینے لگا جس سے کمرے میں سپید سا دُھواں اور ایک عجیب سی مست کردینے والی خوشبو پھیل گئی۔ اچانک وہ بولا . . .

"یہاں اپنا کردار ادا کرتے ہُوئے، میں ہر طرح کا نشہ کرسکتا ہوں۔ شاید مَیں اپنے ملک میں حشیش پینے کا تصوّر بھی نہ کرسکتا۔ مجھے افسوس ہے، سرفروش! کہ تم تمباکو نوشی نہیں کرتے ورنہ اپنے ملک میں مجھے بھی اُسی برانڈ کے سگریٹ پلاکرتے جو تم پیتے۔"

میں اس بار پھر متعجب ہُوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کمبخت کا لب و لہجہ بھی بالکل میرے جیسا ہی تھا۔ وہ دوبارہ پائپ کے کش لینے میں مصروف ہوگیا۔

ہماری یہ ملاقات اچانک اور قطعی غیر متوقع طور پر ہُوئی تھی۔ آج جونہی ہم یہاں پہنچے تھے، مرنیدا یہ وعدہ کرکے محل کے دوسرے حصّے میں چلی گئی تھی کہ پیلو، زینا اور شافران کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ اس کے جاتے ہی شاہی ملازمین زینا، شافران اور پیلو کو الگ لے گئے تھے اور مجھے تقریباً درجن بھر کنیزوں کے جُھرمٹ میں، حمام بھیج دیا گیا تھا۔ وہاں غسل سے پہلے میرے بال تراشے گئے اور خط بنایا گیا پھر جب میں نہا دھوکر اور نیا لباس پہن کر حمام سے باہر آیا تو مجھے ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ اس کے چند منٹ بعد ہی میرا ڈپلی کیٹ آگیا تھا اور اب میرے سامنے آلتی پالتی مارے بیٹھا حشیش پی رہا تھا۔

رضا آفندی نے مجھے تاکید کی تھی کہ اُسے دیکھتے ہی قتل کردوں۔ میں اُسے قتل کرنے کی کوشش کرسکتا تھا، لیکن اس کے بعد . . .؟ مَیں نے فی الوقت یہ خیال اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔

میرا ڈپلی کیٹ دُھواں اُڑاتے اور مُسکراتے ہوئے بولا "آرام سے بیٹھ جاؤ، سرفروش! مجھے تم سے بہت سی باتیں پوچھنی ہیں اور شاید تم بھی مجھ سے کچھ سوال کرنا چاہو گے۔ یہاں کوئی خطرہ محسوس نہ کرو۔ اب ہم اُن حالات میں نہیں ملے جب مجھے تمھارے ساتھ کچھ زیادتی کرنا پڑی تھی۔ وہاں ہم ایک دوسرے کے دُشمن تھے جب کہ یہاں دوست ہیں۔"

"اچھا۔۔" میں نے مصنوعی تعجب سے کہا "یہ تم نے کیسے سمجھ لیا کہ ہم ایک دوسرے کے دوست ہیں؟ میں تو اس پُرانے نکتۂ نظر سے سوچ رہا تھا کہ ہم ایک دوسرے کے مدِمقابل ہیں۔"

وہ بالکل میرے ہی جیسے انداز میں مُسکرایا اور بولا "مجھے اسی بات کا خدشہ تھا سرفروش! ہم اپنی دُنیا میں تو ایک دوسرے کے مدِمقابل ہو سکتے ہیں لیکن ماضی کی اس اندھیری دُنیا میں جہاں ہم نیم وحشی انسانوں اور خوں آشام تہذیب کے حصار میں پھنس گئے ہیں، ایک دوسرے کے دشمن نہیں ہو سکتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شروع میں میں تمھیں تلاش کر کے مار ڈالنا چاہتا تھا مگر اب مجھے تمھاری ضرورت ہے۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ ہم اسی مُردہ زمانے کی قید میں کب تک بقا کی جنگ لڑتے رہیں گے۔ کمپیوٹر کب ہمیں اپنی زمین پر بُلائے گا اور میں کب اپنے وطن واپس پہنچوں گا؟ یہ ساری باتیں تم ہی مجھے بتا سکتے ہو۔"

"میں اس سلسلے میں تمھاری کوئی مدد نہیں کر سکتا میرے نقلی ہمزاد۔ یہ بتاؤ، کیا تم پر سر درد کے دورے پڑتے ہیں؟"

"ہاں۔۔۔ کبھی کبھی میرا سر درد سے پھٹنے لگتا ہے۔" وہ اپنی کنپٹیوں پر ہاتھ رکھتے ہُوئے بولا "تو۔۔ اس درد کا ہماری واپسی سے کوئی تعلق ہے کیا؟"

"ہاں۔۔۔" میں نے اُسے سچ سچ بتا دیا۔ "درد کی یہ لہریں کمپیوٹر کی اُن لہروں سے پیدا ہوتی ہیں جو ہمیں کھوجتی ہیں۔"

"مجھے بھی یہ شک ہُوا تھا۔" وہ بولا "اس کا مطلب ہُوا کہ ہمیں واپسی کے لیے تلاش کیا جا رہا ہے۔"

"ہاں۔ ہم کسی وقت اپنی زمین پر منتقل ہو سکتے ہیں۔"

میں نے تائید کی تو وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ میرے جی میں آیا کہ اس پر یکبارگی حملہ کر کے اُسے ختم کر دوں مگر یہاں آتے وقت میں قاتلوں کے کٹے ہُوئے سروں کی نمائش دیکھ چکا تھا جو کھمبوں کے ساتھ لٹکے ہوئے تھے۔ دوسرے شہزادی مرینا ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کر پائی تھی کہ ہم دونوں میں سے کون بہتر ہے اور اس فیصلے کے بعد صرف اُسی کو زندہ رہنا تھا جو بہتر ہوگا۔ ان باتوں نے مجھے اس پر حملہ کرنے سے روک دیا۔ میں نے سوچا کہ اگر میرا نقلی ہمزاد مجھ سے عیاری برت رہا ہے تو مجھے بھی عیاری، مکر اور چالاکی سے کام لینا ہوگا۔

اتنے میں میرا ڈپلی کیٹ یوں بول اُٹھا جیسے اس نے میرے خیالات پڑھ لیے ہوں۔

"مجھے صحیح صورتِ حال سے آگاہ کرو، سرفروش! دھوکے میں مت رکھو۔ دیکھو میں تمھیں فی الوقت کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا حالانکہ میرے لیے ایسا کرنا بے حد آسان ہے۔ میں جیموتان کا وزیر ہوں جو انگلی سے اشارہ کرتا ہے تو لوگوں کی گردنیں کٹ جاتی ہیں لیکن اپنے ساتھ مجھے تمھاری جان بھی عزیز ہے۔"

میں پہلے ہی طے کر چکا تھا کہ عیاری کا جواب عیاری سے دوں گا چنانچہ اس کے جواب میں بولا "میرا خیال ہے تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔ جس طرح تمھیں میری ضرورت ہے اسی طرح تم بھی میری ضرورت بن گئے ہو۔ میں کمپیوٹر کے بارے میں جانتا ہوں اور تم یہاں کی معلومات رکھتے ہو۔ اس لیے ہمیں ایک دوسرے کو اعتماد میں لینا پڑے گا۔ ویسے مستقبل کے لیے میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی ہے، شاید تم بھی اس سے اتفاق کرو گے۔"

"یہ ہوئی نا بات۔" اس نے گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے ہُوئے کہا مگر جب ہم دونوں کی نگاہیں ملیں تو مجھے یُوں محسوس ہُوا جیسے اس کے دل میں کچھ اور ہی ہو۔۔۔ اس نے بھی غالباً میرے بارے میں ایسا ہی اندازہ لگایا تھا۔ تاہم اس نے بات جاری رکھی۔

"یہ معاہدۂ دوستی ایک تقریب کا تقاضا کرتا ہے، سرفروش جسے ہم جام و مینا سے منائیں گے۔"

یہ کہہ کر وہ دروازے پر گیا جس کے کواڑ چمڑے کے بنے تھے اور اس پر پیتل کے نقش و نگار تھے۔ اس نے اُسے کھول کر بارتالی بجائی اور اپنی جگہ واپس آ گیا۔ چند لمحوں کے بعد دو بے حسین اور نوشباب کنیزیں ایک طشت میں جام و مینا اور دو میں پھل لیے داخل ہوئیں اور ہمارے سامنے رکھ کر مؤدب کھڑی ہو گئیں۔

میرے ڈپلی کیٹ نے انھیں اشارہ کیا تو وہ اس کے قریب آ گئیں۔ وہ حشیش کے سرور میں چند لمحے اُن سے چھیڑ چھاڑ کرتا رہا پھر اچانک ہی جیسے اُسے میری موجودگی کا احساس ہُوا تو اس نے کنیزوں کو جانے کا اشارہ کیا اور جام بھرنے لگا۔ ایک جام میری طرف بڑھاتے ہُوئے بولا۔۔۔

"اس نیم وحشی تمدن میں حُسن و شباب کی جو فراوانی ہے وہ ہماری مہذب دُنیا میں کہیں نظر نہیں آتی۔ میرے پاس ان زیادہ نازک اندام اور نوعمر بیسیوں کنیزیں ہیں۔ جیموتان کا محل مختلف قبائل کی کنیزوں سے بھرا پڑا ہے جو ہر لمحے میری منتظر"

میں اس بات کے جواب میں صرف مُسکرا دیا اور جام سے ایک چُسکی لے لی۔

"اس میں نہ زہر ہے اور نہ ہی بے ہوشی کی دوا۔ یہ"

یہ کہہ کر اس نے اپنا جام مُنہ سے لگایا اور خالی کر کے دوسرا بھر

اس کی یہ حرکت صاف بتا رہی تھی کہ وہ پرلے درجے کا شرابی ہے اور یہ بات میرے حق میں بہتر ہی تھی۔

"وہ تجویز کیا ہے؟" بالآخر اس نے پوچھا۔

"اپنی زمین پر واپسی کے بعد تم ہمارے ملک میں سیاسی پناہ لے لو۔" میں نے کہا۔

"مگر کیوں؟" اس نے تعجب سے پوچھا۔

"اس لیے کہ جب تمھیں کمپیوٹر یہاں سے منتقل کرے گا تو تم وہاں دھر لیے جاؤ گے۔ تم پر دُہرے الزامات کے تحت مقدمہ چلے گا۔ جاسوسی کا بھی اور ہمارے پروجیکٹ کو اُڑانے کی دھمکی کا بھی... جیل میں جانے کے بعد خود تمھارا ملک بھی تمھاری طرف سے شُبہے میں مبتلا ہو جائے گا۔ تب خود تمھارا بھی جی چاہے گا کہ ہمارے ہاں رہ جاتے مگر اس طرح تمھاری عمر عزیز کا بیشتر حصہ زنداں میں کٹ چکا ہو گا، لیکن اگر تم ابھی سے میرے ساتھ معاہدہ کر لو تو میں جاتے ہی تمھیں سیاسی پناہ دلوا دوں گا بشرطیکہ کمپیوٹر مجھے اور تمھیں بخیریت واپس منتقل کر دے۔"

وہ کچھ سوچنے لگا۔

اس نے اپنا پائپ دوبارہ بھرا اور جام اُٹھا کر دریچے کے پاس چلا گیا۔ شاید وہ مجھ سے اپنے چہرے کے تاثرات چھپانا چاہتا تھا۔ اس تجویز سے میرا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ وہ مجھے کوئی بھی نقصان نہ پہنچائے... بلکہ میری زندگی کی خود حفاظت کرے۔ دوسرے اس کے سیاسی پناہ لینے پر اس کے ملک کی بدنامی ہو گی اور بین الاقوامی سطح پر اس کے وقار کو دھچکا لگے گا۔

میرا ڈپلی کیٹ پلٹا اور بولا "کیا تمھارا کمپیوٹر کسی مُردہ شخص کو بھی منتقل کر سکتا ہے؟"

"نہیں... کمپیوٹر مُردہ خلیوں میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کر سکتا۔ اس لیے مُردہ منتقل نہیں کیا جا سکتا۔" میں نے جواب دیا۔

اتنے میں باہر سے نفیریوں اور جھانجھروں کی آوازیں آنے لگیں۔

میرا ڈپلی کیٹ مسکراتے ہوئے بولا "آج تمھارے اعزاز میں ایک جشنِ رقص و موسیقی منعقد کیا جا رہا ہے۔ شاہی مہمانوں کے اعزاز میں ایسے جشن منانا یہاں کا دستور ہے۔ میرے اعزاز میں بھی جشن ہُوا تھا۔ مگر آج کا جشن کچھ زیادہ ہی دھوم دھام سے منایا جائے گا کہ ہم دو بچھڑے ہوئے بھائی ایک بار پھر مِل گئے ہیں... آج حسین کنیزوں کی نئی کھیپ دف اور عودِ کی وحشی تال پر رقص کرے گی۔ اس کے بعد تم جپوتان کی بارگاہ میں پیش کیے جاؤ گے اور وہ فیصلہ کرے گا کہ ہم میں سے کون اس کا داماد بنے گا کِس کے حِصّے میں سیج اور کِس کے حِصّے میں تختہ دار آئے گا۔ کتنی عجیب صورتِ حال ہے... ہے نا؟"

یہ سُن کر خوف کی ایک لہر میرے جسم میں دوڑ گئی۔

مجھے مرینڈا کی بات یاد آئی کہ وہ اب تک ہم میں سے کسی ایک کو منتخب نہیں کر سکی، اس لیے میں نہیں جانتا کہ ہم میں سے کِسے بہتر قرار دیا جا سکتا ہے پھر مجھے اپنے ڈپلی کیٹ کا وہ سوال یاد آگیا کہ کیا کمپیوٹر کسی مُردے کو بھی منتقل کر سکتا ہے؟... اور تیسرا خیال یہ آیا کہ شاید جان بُوجھ کر میرے ڈپلی کیٹ نے مجھے قتل نہیں کیا تھا۔ وہ یہ کام خود نہیں بلکہ جپوتان سے کروانا چاہتا تھا۔ تاہم میں نے اپنے آپ کو ان خدشات سے بے نیاز اور نڈر ظاہر کرتے ہُوئے کہا...

"یہ تو بعد کی باتیں ہیں، پہلے سیاسی پناہ کے بارے میں فیصلہ کر لو، کیوں کہ کمپیوٹر کسی بھی لمحے تمھیں واپس منتقل کر سکتا ہے۔"

"یہ کوئی مسئلہ نہیں، بڑے بھائی! میں سیاسی پناہ حاصل کرنے کو تیار ہُوں۔ مسئلہ تو یہ ہے کہ آیا ہم دونوں واپسی تک زندہ بھی رہیں گے یا نہیں۔ تم تو یہ بھی نہیں جانتے کہ ہماری واپسی کب ہو گی۔"

"ہاں... وہ اگلے چند لمحوں میں بھی ہو سکتی ہے اور مہینوں میں بھی نہیں۔ میں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ کمپیوٹر ہماری کھوج میں ہے لیکن یہ مرینڈا کا چکر...؟"

"تمھاری سمجھ میں نہیں آسکا۔ یہی کہنا چاہتے ہو، نا تم؟" وہ بولا "جپوتان منگرالوں پر حکمرانی کرتا ہے... مگر وہ خود مرینڈا کے قابو میں ہے۔ مرینڈا جو چاہتی ہے، وہی ہوتا ہے اور ہم اس سلسلے میں خوش نصیب ہیں کہ وہ ہمیں چاہتی ہے۔ ہم میں سے بہتر کون ہے، اس کا فیصلہ وہ فوری طور پر نہیں کر سکتی۔ اس کے لیے وہ ہمیں الگ الگ آزمائے گی اور اس آزمائش کے دوران ہمیں کچھ وقت مِل جائے گا۔"

ڈپلی کیٹ کی اس بات سے میرے دل کو کچھ ڈھارس مِلی۔

"اگر ہم میں سے ایک خود ہی دستبردار ہو جائے تو اُسے آزمانے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔ میں تمھارے حق میں دستبردار ہونے کو تیار ہوں۔ تم جپوتان کے داماد بن جاؤ۔" میں نے کہا۔

یہ سُن کر اس نے قہقہہ لگایا اور بولا "یہ ناممکن ہے، سرفروش! مرینڈا جپوتان کو بتا چکی ہے کہ ہم دونوں ہی اُسے پسند ہیں... مگر ہم میں سے بہتر کون ہے، اس کا فیصلہ نہیں کر سکی۔ دوسرے منگرالوں میں یہ رواج ہے کہ جس آدمی سے شہزادی کی شادی نہ ہو

سکے، اُسے بے لباس اور نہتا کر کے صحرا میں چھوڑ دیا جاتا ہے... دوسرے دن منگرال اپنے شکاری کتوں کے ساتھ اس کی تلاش میں نکلتے ہیں اور جس طرح جانوروں کا شکار کیا جاتا ہے، اُسی طرح وہ اس کا شکار کرتے ہیں اور پھر سَر کاٹ کر جپوتان کی خدمت میں لے آتے ہیں۔ وہ اُسے نیزے پر بلند کر کے محل کی دیوار پر نصب کروا دیتا ہے۔ اس عمل کو شہزادی کی خوش گوار ازدواجی زندگی کے لیے نیک شگون سمجھا جاتا ہے۔ اس صورتِ حال کے تحت ہم میں سے ایک کو شکار ہونا پڑے گا۔ کیا کمپیوٹر ہمیں فوری طور پر اس مصیبت سے نجات نہیں دِلا سکتا؟"

"اگر ڈاکٹر فریدون چاہے تو ہم چند لمحوں میں اپنی زمین پر پہنچ سکتے ہیں، ورنہ جو کچھ بھی ہمارے مقدر میں لکھا ہے، وہ بھگتنا ہی پڑے گا۔"

"تو پھر آزمائش کے وقت کو کسی نہ کسی طرح زیادہ طول دینا بہتر ہو گا۔" اس نے کہا "آج جپوتان سے ملاقات کے بعد تمھیں مرینڈا کے پاس بھیجا جائے گا۔ کوشش کرنا کہ وہ آزمائش کا وقت بڑھانے کے لیے رضامند ہو جائے۔" یہ کہہ کر اس نے جام دوبارہ بھرے اور ایک میری طرف بڑھاتے ہُوئے بولا "لو... فی الوقت اپنے سارے تفکرات اس میں ڈبو دو۔"

میں نے اس کی تقلید میں جام ہونٹوں سے لگا تو لیا لیکن ایسا محسوس ہُوا جیسے شراب میں سارے جہاں کی تلخیاں گھُل گئی ہوں...

"ایک بات تو بتاؤ۔" میں نے جام رکھتے ہُوئے کہا "وہ بم کہاں گیا جسے تمھارے ساتھ ہی اس سرزمین پر منتقل کیا گیا تھا؟"

وہ کچھ دیر تو میری طرف دیکھتا رہا... پھر اس نے سوگوار سے تبسم کے ساتھ جواب دیا "وہ بم... اُسے میں نے جپوتان کے ایک دُشمن ملک کے خلاف جنگ میں استعمال کر کے منگرالوں کو عظیم ترین فتح سے ہمکنار کیا تھا۔ تمھارا کیا خیال ہے، انھوں نے مجھے بلاوجہ ہی تو وزیر نہیں بنا لیا ہو گا؟"

میں نے ایک طویل سانس لی۔ بم کے استعمال ہو جانے کی خبر میرے لیے بے حد خوش کُن تھی۔ گویا وہ اَب میرے لیے زیادہ... خطرناک ثابت نہیں ہو سکتا تھا۔ ابھی ہم نائے نوش ہی میں مصروف تھے کہ جشن میں شرکت کا بلاوا آگیا۔

میرے نقلی ہمزاد نے سچ ہی کہا تھا کہ اس نیم وحشی تمدن میں حُسن و شباب کی جو فراوانی ہے، وہ ہمارے کسی بھی تہذیب یافتہ ملک میں دِکھائی نہیں دیتی۔ اس بزمِ طرب میں نہ شراب کی کمی تھی اور نہ ہی شباب کی... ہر فرد حتیٰ کہ میرا ڈپلی کیٹ بھی لذتیں کشید کرنے میں مگن تھا مگر میں سوچوں کی بھول بھلیوں میں بھٹکتا رہا کہ نہ جانے، آنے والا وقت میرے لیے، اپنے فرغل میں کیا چھپا کر لاتا ہے... خنجر یا پھول...؟

جشن کے اختتام پر مجھے ایک وسیع و عریض اور بہت ہی بلند و بالا ہال میں لے جایا گیا۔ یہ ہال جس کی چھت پر بہت بڑا مخروطی گنبد بنا ہُوا تھا، کسی معبد کی یاد دِلاتا تھا۔ اس کی دیواروں پر منگرال حکمرانوں کی چرمی تصاویر آویزاں تھیں اور سامنے کوئی چالیس پچاس ہاتھ اُونچا مجسمہ رکھا ہُوا تھا۔ اگر اس مجسّمے کا سر مہاتما بدھ کے سر سے تبدیل کر دیا جاتا تھا کیوں کہ اسے پتھر سے نہیں بلکہ مٹی گارے سے بنایا گیا تھا۔ مجسّمے کا چہرہ برداش سے مشابہت رکھتا تھا۔ ویسی ہی خمیدہ عقابی ناک اور پتلے پتلے ہونٹ تھے۔ آنکھیں اور داڑھی بھی برداش جیسی ہی تھی۔ مجسّمے کے دائیں بائیں بڑی بڑی انگیٹھیوں میں عود و عنبر سُلگ رہے تھے۔

جیسا کہ مجھے میرے ڈپلی کیٹ نے بتایا تھا۔ میں کمرے میں داخل ہو کر مجسّمے کے سامنے گھٹنوں کے بل جُھک گیا اور بولا...

"میں، سرفروش! آپ کی خدمت میں آداب بجا لاتا ہُوں شہنشاہِ معظم۔ میں آپ کے فیصلے کا متمنی اور منتظر ہُوں، عالم پناہ!"

جواب میں جپوتان کی بھاری آواز آئی جس سے کمرہ گونجنے لگا۔

"ہم تمھیں خوش آمدید کہتے ہیں، سرفروش! ہمارے ہاں ہر اجنبی کو خوش آمدید کہا جاتا ہے اور مہمان داری کی جاتی ہے بشرطیکہ وہ ہمارے قانون اور رسم و رواج کی خلاف ورزی نہ کرے۔ ہمیں اُمید ہے کہ اپنے بچھڑے ہوئے بھائی سے مِل کر تمھیں مسرت ہُوئی ہو گی۔"

یہ آواز مجسّمے کے کھوکھلے پیٹ سے آرہی تھی اور یوں لگتا تھا جیسے بھونپو استعمال کیا جا رہا ہو تا کہ سامعین پر شہنشاہ جپوتان کا رُعب و دبدبہ طاری ہو جائے۔ میں نے بمشکل اپنی ہنسی ضبط کرتے ہُوئے کہا۔

"آپ بجا فرماتے ہیں، عالی جاہ! اپنے بھائی کے ملاپ نے مجھے بے حد خوشی عطا کی ہے۔"

"لیکن اس ملاپ نے ایک مسئلہ بھی پیدا کر دیا ہے، سرفروش! ہماری دختر مرینڈا تم دونوں بھائیوں کو پسند کرتی ہے، جب کہ ہمارا قانون اور رسم و رواج اُسے صرف ایک آدمی سے شادی کی اجازت دیتا ہے۔ تم اس معاملے میں کیا کہتے ہو؟" جپوتان کی آواز گونجی۔

"بندہ اس سوال کا جواب دینے سے قاصر ہے، عالی جاہ! اس

کا فیصلہ تو آپ ہی کر سکتے ہیں، شہنشاہِ معظم!"

میرے اس جواب پر خاموشی چھا گئی۔ چند لمحے بعد مجھے مرینڈا کی آواز سُنائی دی: "آپ خاموش کیوں ہو گئے ہیں، آبا جان!"

ہر چند کہ مرینڈا نے یہ بات آہستگی سے کی تھی مگر مجسمے کے اندر لگے ہُوئے بھونپو شاید آلۂ مکبر الصوت کا کام انجام دے رہے تھے، فوراً ہی چموتان کی آواز پھر گونجنے لگی۔

"تم سچ کہتے ہو، سرفروش۔ اس مسئلے کا فیصلہ ہمیں ہی کرنا ہے۔ کیا تم ایک عورت کی خاطر اپنے بھائی سے اس وقت تک برسرِ پیکار رہ سکتے ہو جب تک کہ تم دونوں میں سے کوئی ایک ہلاک نہیں ہو جاتا؟"

"اگر یہ آپ کا حکم ہے تو مجھے بجالانا پڑے گا، عالی جاہ . . . لیکن ایک بھائی کے لیے دوسرے بھائی کو قتل کر دینا انتہائی کربناک عمل ہے، شاہِ معظم!"

میرا یہ جواب چموتان کی حکم عدولی کے مترادف تھا لیکن مَیں اب اپنے ڈپلی کیٹ کو موت کے گھاٹ نہیں اُتارنا چاہتا تھا کیونکہ اس نے اپنے ملک سے غداری کرتے ہُوئے ہمارے ملک میں سیاسی پناہ لینے کا وعدہ کر لیا تھا۔

"ہمارے پاس اس مسئلے کا ایک اور بھی حل موجود ہے . . . سرفروش! ہماری دختر تم دونوں کو الگ الگ آزمائے گی اور خود فیصلہ کرے گی کہ تم میں سے کون اُسے زیادہ پسند ہے۔ وہ جسے پسند کرے گی، اُسے دُلہا بنایا جائے گا اور دوسرے کو ہمارے رسم و رواج کے مطابق صحرا میں چھوڑ دیا جائے گا۔ کیا یہ فیصلہ تمھیں منظور ہے؟"

"مجھے منظور ہے، عالی جاہ . . . لیکن مَیں آپ سے کچھ مراعات کا متمنی ہوں۔ یہ مراعات مجھے اپنے لیے نہیں بلکہ دوسروں کے لیے درکار ہیں،" مَیں نے لجاجت سے کہا۔

"بولو کیا چاہتے ہو؟ اگر وہ مراعات ہمارے قبضۂ قدرت میں ہُوئیں تو ہم بُخل سے کام نہیں لیں گے۔"

مَیں نے مجسمے کے سامنے سرخم کرتے ہُوئے کہا: "بندۂ ناچیز، آپ کا بے حد شکر گزار ہے شاہِ عالی۔ وہ مراعات آپ جیسی عظیم ہستی کے لیے کوئی بڑی بات نہیں۔ میری پہلی درخواست یہ ہے کہ میرے ساتھ جو پاگل لڑکی آئی ہے، اُسے پاگل خانے نہ بھیجا جائے بلکہ اُسے شافران کے ساتھ سر چھپانے کی کوئی جگہ دے دی جائے اور اگر وہ شافران کی بیوی بن جائے تو میرے لیے مسرّت کی بات ہو گی۔"

مَیں ان حالات میں زینا کے لیے بس اتنا ہی کر سکتا تھا۔

"ہم تمھاری یہ درخواست منظور کرتے ہیں،" چموتان کی آواز آئی: "اور کیا چاہتے ہو؟"

"میرے دوست پیلو کو بحفاظت سراما بھیج دیا جائے، عالم پناہ!"

"اگر وہ جاسوس نہیں ہے تو ہم اُسے واپس بھیج دیں گے۔ دراصل ہمیں سراما کے لوگوں پر اعتماد نہیں ہے۔ یہ بڑی باغیانہ سرشت کے مالک ہیں۔ آج کل ان کی ملکہ نے نمورینہ کے خلاف لام بندی کا حکم دے رکھا ہے۔"

"پیلو جاسوس نہیں ہے، عالم پناہ۔ مَیں حلفیہ کہہ سکتا ہُوں۔"

"ٹھیک ہے اُسے بحفاظت ارغوانی سمندر تک بھیج دیں گے اور جہاز پر بھی سوار کروا دیں گے۔ یہ ہمارا وعدہ ہے۔"

"بس مجھے اتنی ہی مراعات درکار تھیں، شہنشاہِ معظم . . . مَیں آپ کی عنایات کا تہِ دل سے شکر گزار ہُوں،" مَیں نے سرخم کرتے ہُوئے کہا۔

"اب تم جا سکتے ہو۔ کچھ دیر بعد تمھیں آیندہ کے لیے احکامات مِل جائیں گے۔"

مَیں نے ایک بار پھر سرخم کیا اور اپنے نقلی ہمزاد کی ہدایت پر اُلٹے قدموں چلنے لگا۔ اتنے میں مجھے مرینڈا کا قہقہہ سُنائی دیا۔

وہ آگ اور لوگوں کی زندگی سے کھیل رہی تھی۔

اس معبد سے مجھے دوبارہ حمام لے جایا گیا۔ نہانے کے بعد سجانے سنوارنے کے ساتھ ساتھ مجھ پر عطر پاشی بھی کی گئی۔ اب مجھے ایک ایسے کمرے میں لایا گیا جہاں پیلو بھی موجود تھا۔ مَیں نے اُسے واپسی کا مژدہ سُنایا تو وہ رونے لگا۔

"نہیں سرفروش! مَیں تمھارے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے خود سے جُدا نہ کرو،" اس نے کہا۔

"مگر مَیں خود بھی یہاں نہیں رہوں گا، پیلو۔ تم سراما جاؤ اور پہیے کی ایجاد سے اپنے آپ کو غیر معمولی ذہین ثابت کرو۔"

ابھی مَیں پیلو کے ساتھ باتیں ہی کر رہا تھا کہ میرے سَر میں دَرد کی شدید ٹیسیں اُٹھنے لگیں۔ مَیں نے اُسے باہر بھیج دیا اور خود آرام کی غرض سے لیٹ گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد مجھے مرینڈا کا بُلاوا آ گیا اور میں محافظ کے ساتھ چل دیا۔

ہم متعدد زینے چڑھتے اُترتے مختلف راہ داریوں سے گزرے جن کے ساتھ بنے ہُوئے کمروں سے نقرئی قہقہوں کی آوازیں اور خوشبو کے جھونکے آ رہے تھے۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ چموتان کے حرم میں تقریباً ایک ہزار عورتیں ہیں جب کہ اس کی بیٹی مرینڈا کو صرف

[ا]یک مَرد . . . ایک شوہر رکھنے کی اجازت تھی۔

محافظ مجھے مرینڈا کی خواب گاہ کے دروازے تک لے آیا، [او]ر اس وقت تک وہیں کھڑا رہا تھا جب تک کہ میں خواب گاہ [می]ں داخل نہیں ہو گیا۔

سامنے مسہری پر مرینڈا میری منتظر تھی۔ آج اس کا حُسن [ب]ے پناہ تھا۔ مَیں مسحور سا ہو کر اُسے دیکھتا ہی رہ گیا اور سوچا، [ا]یسا حُسن بلا خیز آدمی کو قتل پر بھی اُکسا سکتا ہے اور زہر کا پیالہ [پی]نے پر بھی . . . اتنے میں وہ مسہری سے اُٹھی اور باہیں پھیلائے [آ]گے بڑھی مگر میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کی چال میں لڑکھڑاہٹ [تھ]ی جیسے اس نے بہت زیادہ پی رکھی ہو۔ اگر میں دو قدم آگے بڑھ [کر] اُسے سہارا نہ دیتا تو وہ گر پڑتی۔

"کیا تم نے بہت پی لی ہے مرینڈا؟" میں نے پوچھا۔

"اُونھوں . . ." وہ نفی میں سر ہلاتے ہُوئے بولی: "مَیں نے [آش]ی کھائی ہے۔" اس کی زبان میں بھی لکنت تھی۔

"آشی کیا ہوتی ہے؟" مَیں نے پوچھا۔

"ایک جڑی بُوٹی . . . تم کھاؤ گے؟"

"نہیں مرینڈا،" مَیں نے جواب دیا اور اُسے سہارا دے کر [مس]ہری کی طرف چلنے لگا۔ ابھی مَیں اُسے بستر پر لٹا کر سیدھا بھی [نہ]یں ہو پایا تھا کہ مجھے اپنی پیٹھ پر کوئی نوک دار چیز چُبھتی ہُوئی [مح]سوس ہُوئی۔

ساتھ ہی میرے ڈپلی کیٹ کی آواز سُنائی دی۔

"اپنی جگہ سے مت ہلنا میرے پیارے بھائی! ورنہ یہ بھالا [تمھ]ارے جسم میں اُتر جائے گا۔"

"مگر کیوں؟" مَیں نے حیرت سے پُوچھا۔

"مَیں نے سارے مسئلوں کا حل سوچ لیا ہے، پیارے بھائی! [تمھ]ارے کمپیوٹر کو ناکام بنانے کی ترکیب بھی میری سمجھ میں آ گئی ہے۔ [تم کہ]تے ہو کہ اگر دماغ کے خُلیے کام نہ کریں تو کمپیوٹر کی لہریں اُن [پر ا]ثر و بدل نہیں کر سکتیں۔ اس لیے مَیں نے آشی کھائی ہے جو [میرے] دماغ کے خُلیوں کو سُن کر دے گی۔ مَیں نے مرینڈا کو بھی کافی [مقدا]ر میں آشی کھلا دی ہے۔ تاکہ صبح وہ تمھاری لاش دیکھے تو [یہ س]مجھے کہ خود اُسی نے تمھیں قتل کر دیا ہو گا۔"

"لیکن تم یہ سب کچھ کیوں کر رہے ہو؟ جب مَیں نے تمھیں [سی]اسی پناہ دِلوانے کا وعدہ کر لیا ہے تو . . ."

"مجھے سیاسی پناہ کی ضرورت نہیں، سرفروش! میں تمھاری [او]ر اپنے وطن واپس نہیں جانا چاہتا۔"

"کیوں؟" مَیں نے حیرت سے پوچھا۔

"اس لیے کہ میں یہیں رہنا چاہتا ہوں۔ مَیں مرینڈا سے شادی کروں گا اور چموتان کی موت کے بعد یہاں کا حکمران بن جاؤں گا پھر اس کے حرم کی ساری کنیزیں میری ہوں گی۔ اگر مجھے یہ خدشہ نہ ہوتا کہ تمھارا کمپیوٹر کسی وقت مجھے بُلا سکتا ہے تو میں تمھیں ہرگز ختم نہ کرتا مگر اَب میں مجبور ہُوں۔ میرے سَر میں دَرد کی لہریں اُٹھ رہی تھیں، جو واپسی کی علامت ہوتی ہیں۔ یہی بتایا تھا نا تم نے۔ مَیں نے آشی سے اپنے دماغ کے خلیوں کو سُن کر دیا ہے۔ اَب تم مَرنے کے لیے . . ."

ابھی وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ مَیں بجلی کی سی سُرعت سے بائیں جانب ہٹ گیا۔ اس طرح بھالے کے پھل نے مجھے زخمی تو کر دیا لیکن وہ میرا کندھا چیرتا ہُوا بے ہوش مرینڈا کے سینے میں اُتر گیا جہاں سے خون کا فوارہ سا اُبل پڑا۔

میرا ڈپلی کیٹ اس اچانک افتاد سے پہلے تو سراسیمہ ہو گیا مگر پھر جلدی سے اس نے بھالا نکال کر مجھ پر حملہ کر دیا۔ مَیں جلدی سے جُھکا اور اس سے پہلے کہ بھالے کا دوسرا وار مجھے موت سے ہمکنار کرتا، میں فرش پر لوٹتا ہُوا مسہری کے نیچے سے دوسری طرف نکلا اور پُوری قوت سمیٹ کر بھاری مسہری اُلٹ دی، جو میرے ڈپلی کیٹ پر جا پڑی اور بھالا ٹوٹ گیا۔

مَیں نے جلدی سے لپک کر بھالے کا ٹوٹا ہُوا ڈنڈا اُٹھایا اور اپنے ڈپلی کیٹ کے سر پر دے مارا۔ اُسے بھالے کا پھل میرے سینے میں اُتارنے کی مہلت نہ مل سکی۔ وہ اُسے دونوں ہاتھوں میں تھامے ڈھیر ہو گیا۔

عین اُسی وقت دَرد کے مارے میری کنپٹیاں پھٹنے لگیں۔ یہ کمپیوٹر کا بُلاوا تھا۔ مَیں صرف اتنا ہی سوچ سکا کہ صبح میرا ڈپلی کیٹ مرینڈا کا قاتل ٹھہرایا جائے گا۔ سب یہی سمجھیں گے کہ اس نے مجھے قتل کر کے میری لاش غائب کروا دی ہو گی۔ اس طرح زینا، شافران اور پیلو پر کوئی مصیبت نازل نہیں ہو گی۔

ابھی مَیں اتنا ہی سوچ پایا تھا کہ خواب گاہ گھُومتی دِکھائی دینے لگی پھر کہیں سے ایک بہت بڑے ہاتھ نے مجھے دبوچ لیا۔ مَیں نے مرینڈا کی طرف دیکھا۔

اس کے سینے سے بہنے والا خون پھیلتا چلا گیا۔ ہر شے سُرخی میں ڈوب گئی اور مَیں خود بھی خون کے سمندر میں ڈوبتا چلا گیا۔

میرا خیال تھا کہ جب میری آنکھ کھلے گی تو ڈاکٹر فریدوں میری ناز برداری کے لیے موجود ہو گا... لیکن چشمِ ہوش نے جو کچھ بھی دیکھا، وہ عقل سے بعید تھا اور میں حیران و ششدر چاروں طرف دیکھتا رہ گیا۔ کیونکہ نہ تو میں ڈاکٹر فریدوں کی لیبارٹری میں تھا اور نہ ہی اپنی زمین کا ماحول دکھائی دے رہا تھا۔

میں نے ڈاکٹر فریدوں کو کوسنا بلکہ اس قسم کی بے ضرر سی بددعاؤں سے نوازنا شروع کر دیا کہ اللہ میاں اس بڈھے کو کسی ایسی حسینہ کے عشق میں مبتلا کر دے جو اُسے ناکوں چنے چبوا دے اور ترگنی بلکہ چوگنی کا ناچ نچا دے۔

اب آپ سوچیں گے کہ میں ایسے کوسنوں اور بددعاؤں پر کیوں اُتر آیا تھا؟... تو جناب صورتِ حال ہی کچھ ایسی تھی کہ میری ساری بہادری اور جواں مردی دھری کی دھری رہ گئی تھی۔ خمرشان میں میرا پالا اُن لوگوں سے پڑ گیا... جنھیں آپ عرفِ عام میں ہیجڑے یا خواجہ سرا کہتے ہیں۔ آپ کہیں گے کہ اس قسم کے لوگوں سے تو یہاں بھی پالا پڑتا ہی رہتا ہے بلکہ بعض ممالک میں تو اُن کے بغیر خوشی کی تقریبات اُس وقت تک نامکمل سی رہتی ہیں۔ جب تک یہ لوگ ٹھمکے نہیں لگاتے... لیکن جناب! خمرشان میں صورتِ حال یکسر مختلف تھی۔ ذرا اپنے آپ کو میری جگہ رکھ کر چشمِ تصور سے دیکھیے آپ کے چاروں طرف ننھے ننھے ہی زنخے ہوں اور اُن کے سردار چیف زنخے نے آپ کو محبوس کر رکھا ہو اور پھر یہ زنخوں کی وہ قسم بھی نہیں جو خواتین کی طرح سج سنور کر جھوٹ موٹ شرماتی اور شستہ غمزے دکھاتی ہے۔ یہ مخلوق ویسی بھی نہیں تھی جو سنگاپور یا یورپ کے کچھ بازاروں میں نوخیز حسیناؤں کو مات کرتی نظر آتی ہے۔ یہ تو زنخوں کی وہ نسل تھی جس نے ماؤں کی کوکھ سے نہیں بلکہ ترقی یافتہ سائنس کی بدولت شیشے کے مرتبانوں سے جنم لیا تھا۔ اب آپ اپنے ایمان سے بتایئے کہ میرا بوکھلانا بجا تھا یا نہیں؟

اگر آپ میری یہ سرگزشت مسلسل پڑھتے آ رہے ہیں تو جانتے ہی ہوں گے کہ مجھے کمپیوٹر کے ذریعے گزرے زمانوں میں بھیجنے سے ڈاکٹر فریدوں کا مقصد جہاں ایسی فرسودہ تہذیبوں سے واقفیت حاصل کرنا تھا جن کا سراغ تاریخِ انسانی میں کہیں نہیں ملتا، وہاں وہ اُس دَور کے اُن معدنی خزانوں کا بھی پتہ چلانا چاہتا تھا جن کی اہمیت و افادیت سے اُس زمانے کا وحشی انسان ناآشنا تھا۔ ڈاکٹر فریدوں کا خیال تھا کہ جس طرح کمپیوٹر نے ماضی کا سفر ممکن بنا دیا ہے، اُسی طرح زمانۂ قبل از تاریخ کے معدنی خزانے بھی موجودہ دَور اور دُنیا میں منتقل کرنا ممکن ہو جائے گا۔ اس لیے مجھے اضافی تحقیق کی بھی تھوڑی بہت تربیت دی گئی تھی تاکہ میں ماضی کے ہر سفر کے دوران معدنی خزائن کا جائزہ لوں اور وقت آنے پر اُن زمینوں کا سینہ چیر کر سونا، چاندی، ہیرے، پلاٹینم اور یورینیم کے ذخائر حاصل کیے جا سکیں۔ لیکن اس بار عجیب صورتِ حال سامنے آئی۔ میں اپنی زمین پر واپس آنے کی بجائے مستقبل کے کسی دَور میں پہنچ گیا تھا اور اب خمرشان میں نیم انسانی زنخوں میں گھرا ہوا تھا۔

خمرشان ایسا عجیب و غریب علاقہ تھا جہاں نہ آسمان دکھائی دیتا تھا اور نہ ہی سُورج، چاند اور ستارے نظر آتے تھے۔ اس کے باوجود یوں لگتا تھا جیسے ہر طرف پونم کی چاندنی پھیلی ہوئی ہو۔ میں ابھی ماحول کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ میری سماعت سے ایک عجیب" لنگناتی سی آواز ٹکرائی۔

"مرشا... ادمرشا، ٹھیلا یہاں لا... ابے احمق اُدھر نہیں اِدھر"

میں نے جھاڑیوں کی اوٹ سے آواز کی سمت دیکھا تو تعجب سے دیکھتا ہی رہ گیا۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر کپاس جیسا ایک کھیت تاحدِ نظر پھیلا ہوا تھا۔ یہ آواز اُسی کھیت کے کسی گوشے سے آئی تھی مگر بولنے والا اور اُس کا مخاطب دونوں نظر نہیں آ رہے تھے

اتنے میں پھر آواز آئی...

"تم بہت اچھے جانور ہو مرشا۔ مگر میرا خیال ہے کہ یہ فصل کا تیار ہو گی۔ تم ٹھیلا دوسری طرف لے جاؤ۔ دوسرے جانوروں کو بھی ساتھ لے جانا اور "ہیوا" چُن کر اُدھر جمع کرنا۔ تم لوگوں کو پورے "شبرے" کام کرنا ہے۔"

اگرچہ میں اس زبان سے آشنا نہیں تھا مگر ڈاکٹر فریدوں کے سائنسی عمل کی بدولت میں ساری بات بخوبی سمجھ رہا تھا۔ اسے سائنسی ٹیکنالوجی کا کمال ہی سمجھیے کہ ماضی کے ہر سفر میں میں ہزاروں سال پہلے بولی جانے والی زبانیں سمجھ لیتا تھا بلکہ میرے خیالات بھی اُسی زبان میں ڈھل کر کلام کی صورت خود بخود میرے ہونٹوں پر آ جاتے تھے۔

میں نے ایک بار پھر کھیت پر نظر دوڑائی لیکن اس چاندنی میں مجھے کوئی ذی رُوح دکھائی نہ دیا۔ چونکہ ہمیشہ کی طرح اب بھی اپنے لیے لباس، کھانے اور کسی پناہ گاہ کی ضرورت تھی لہٰذا میں نے ذاتی تحفظ کی طرح ایک پتھر اُٹھایا اور کھیت کی طرف بڑھنے لگا۔

جیسا کہ میں بتا چکا ہوں، کھیت میں تاحدِ نظر کپاس جیسے پودے قطاروں میں لگے ہوئے تھے۔ یہ پودے میرے سینے تک بلند تھے اور ان میں سفید رنگ کے ڈوڈے لگے ہوئے تھے۔ بہت

دُور کھیت کے دُوسرے کنارے گنبد والی ایک عمارت دکھائی دے رہی تھی مگر روشنی کی کمی کے باعث طرزِ تعمیر واضح نہیں تھی... وسیع و عریض کھیت چھوٹے چھوٹے قطعات میں تقسیم کر دیا گیا تھا اور ان قطعات کے درمیان پختہ راستے بنے ہوئے تھے۔

مَیں ان راستوں پر آگے بڑھتا چلا گیا مگر نہ وہ آواز دوبارہ اُبھری اور نہ ہی کوئی آدمی کھیت میں کام کرتا نظر آیا۔ اس عجیب سے نیم روشن ماحول اور پُر اسرار سناٹے نے میری ہڈیوں میں خوف کی ایک سرد لہر دوڑا دی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس زمین کا آسمان کہاں ہے؟... ہے بھی یا نہیں... ہے تو مجھے دکھائی کیوں نہیں دیتا؟... اور یہ چودھویں کے چاند کی سی روشنی کہاں سے پھُوٹ رہی ہے؟

مَیں چلتے چلتے رُک گیا اور چاروں طرف نگاہیں دوڑانے لگا۔ اچانک میری حیران نگاہیں ایک عجیب سے منظر پر رُک گئیں اور ہاتھ میں پکڑے ہوئے پتھر پر میری انگلیوں کی گرفت مضبوط تر ہو گئی۔

پندرہ بیس آدمی ڈوڈے چُننے میں مصرُوف تھے۔ اگر وہ مجھے دیکھ چکے ہوتے تو اس طرح ڈوڈے چُننے میں مشغول اور مگن نہ رہتے۔

... پھر میری حیرت میں مزید اضافہ ہو گیا۔ وہ ڈوڈے چُننے والے انسان نہیں بلکہ انسان نما حیوان تھے۔ آپ انھیں قدِ آدم بُوزنے کہہ سکتے ہیں۔ وہ اگرچہ انسانوں کی طرح دونوں پاؤں پر کھڑے ہوتے اور چل سکتے تھے لیکن کبھی کبھی وہ چاروں ہاتھوں پاؤں کے بل بھی چلنے لگتے تھے۔ وہ آپس میں باتیں بھی کرتے جا رہے تھے مگر اُن کی گفتگو میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

اب مجھے یاد آیا کہ سب سے پہلے میری سماعت سے ٹکرانے والی آواز نے کسی مرشا کو مخاطب کرتے ہوئے اُسے "اچھا جانور" کہا تھا تو ٹھیک ہی کہا تھا... لیکن اس کا تو یہ مطلب تھا کہ وہ بندر نما انسان، آدمیوں کی زبان سمجھتے تھے، جب ہی تو وہ غائب متکلم 'مرشا' کو اپنی زبان میں ہدایات دے رہا تھا...

'خداوندا... یہ کیسی سرزمین ہے؟ یہ کیسی مخلوق ہے اور مَیں کس دَور میں آ گیا ہُوں؟' مَیں نے سوچا اور دُوسرے راستے پر مُڑ گیا کہ اس مخول بیابانی سے سابقہ نہ ہی پڑے تو بہتر ہے۔

ابھی مَیں کچھ ہی دُور گیا تھا کہ وہی کھنکھناتی ہُوئی آواز پھر سُنائی دینے لگی اور میرے قدم اپنے آپ رُک گئے۔ ہاں، یہ وہی آواز تھی لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ غائب متکلم اب کسی اور سے مخاطب نہیں بلکہ خُود کلامی کر رہا ہے۔

"کیا مُصیبت ہے۔ اتنے کم حیوانوں سے بیس شبروں میں فصل کیسے سمیٹی جا سکتی ہے۔ مگر گرانجو کو اس سے کیا غرض کہ مَیں حیوانوں سے کس طرح کام لیتا ہُوں۔ اُسے تو بس زیادہ سے زیادہ 'پے وا' چاہیے۔"

... پھر میری حیران نگاہوں نے اُسے تلاش کر لیا۔ وہ اب تک مجھے اس لیے دکھائی نہیں دیا تھا کہ اُن بندر نما انسانوں کی طرح اُس کا قد بھی چھوٹا تھا اور وہ اپنے قد کے برابر پودوں میں آسانی سے نظر نہیں آ رہا تھا۔ مَیں نے اُسے غور سے دیکھا تو مجھ پر ایک بار پھر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ وہ جس طرح قیدِ لباس سے آزاد تھا، اُسی طرح تذکیر یا تانیث کی "تخصیص" سے بھی بالاتر تھا۔ اُسے میری موجودگی کا علم یا احساس نہیں تھا۔ اس لیے وہ بے دھڑک اُس طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا، جہاں مَیں پتھر تھامے کھڑا تھا۔

وہ چلتے چلتے رُکا، ایک ڈوڈا توڑا اور اُسے کھانے لگا۔ مَیں ڈوڈے کا جائزہ لے چکا تھا، اُس میں کپاس جیسا ریشہ تھا۔ اس کا مطلب ہُوا کہ یہ مخلوق کپاس خور ہے۔ ابھی مَیں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ خواجہ سرا ایک راستے پر مُڑ گیا۔ مَیں بھی دبے پاؤں آہستہ آہستہ اُس کے پیچھے جانے لگا۔

یہ راستہ دُوسرے راستوں کی بہ نسبت زیادہ چوڑا تھا اور سیدھا ایک بہت بڑے پلیٹ فارم کی طرف جاتا تھا جس پر اُسی ریشے دار ڈوڈے کی بڑی بڑی گانٹھیں رکھی ہُوئی تھیں اور کچھ انسان نما جانور برف پر چلنے والی بغیر پہیوں کی گاڑی سے ملتے جُلتے ٹھیلے سے ڈوڈوں کی گانٹھیں اتار رہے تھے۔ مَیں پودوں کی اوٹ میں رُک کر دیکھنے لگا کہ اُن کا اگلا اقدام کیا ہو گا۔

وہ بندر نما انسان گانٹھیں اُتار کر بغیر پہیوں کا ٹھیلا گھسیٹتے ہُوئے دُوسرے جانب کھیت میں چلے گئے اور خواجہ سرا نما وہ شخص گانٹھیں شمار کرنے لگا... پھر اُس نے ایک رجسٹر اُٹھایا اور اُس پر کچھ لکھنے لگا۔ ظاہر ہے کہ اُس نے اُن گانٹھوں کا اندراج ہی کیا ہو گا۔

مَیں پُختہ راستے کی بجائے پودوں کے بیچوں بیچ چلتا ہُوا پلیٹ فارم کے قریب پہنچ گیا جہاں وہ زنخہ خود کلامی میں مصرُوف تھا۔ "مَیں بھی کتنا احمق ہُوں کہ رجسٹر یہیں کھلا چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ مرشا یا دُوسرے حیوان لکھنا پڑھنا نہیں جانتے لیکن اگر انھیں یہ معلوم ہو جائے کہ اُن کو کس طرح دھوکا دے کر استحصال کیا جا رہا ہے تو یہ حیوان بغاوت پر اُتر آئیں گے۔ بالکل اُسی طرح جیسے

نوں نے نویں صدی کے شبروں میں کی تھی۔ بہرصُورت آیندہ مجھے ناعیر محتاط ہرگز نہیں ہونا چاہیے ورنہ گرانجو مجھے مار ڈالے گا۔"

جب تک وہ خُود کلامی میں مصرُوف رہا، مَیں اُس کی جسمانی ساخت کا جائزہ لیتا رہا۔ وہ ہلکے پھُلکے جسم کا تھا جیسے ہمارے ہاں بارہ بارہ سال کے لڑکے ہوتے ہیں۔ اُس کے جسم پر سُنہرا رُواں اُگا ہُوا تھا اور سر، جسم کی مناسبت سے قدرے چھوٹا تھا۔ وہ اپنی ساخت کے اعتبار سے کسی طور بھی میرے لیے ضرر رساں ثابت نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے مَیں نے پتھر پھینک دیا۔

مَیں نے سوچا کہ چُپکے سے آگے بڑھ کر اُس کے ہاتھ سے رجسٹر چھین لُوں مگر پھر خیال آیا کہ کہیں وہ ڈر کر اُن حیوانوں کی طرف نہ بھاگ جائے۔ اس لیے یہی مناسب ہو گا کہ مَیں بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ اُسے مِلوں تاکہ وہ مجھے اپنا دُشمن نہ سمجھے اور میرے ساتھ بات چیت کرنے لگے تاکہ مَیں اُس سے معلومات حاصل کر سکُوں۔

مَیں گربہ پا آگے بڑھا اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہُوئے اپنی بتیسی کی نمائش کرنے لگا۔

اُس نے بے خیالی میں سر اُٹھایا، مجھے مسکراتے دیکھا تو اپنی باچھیں بھی کھول دیں مگر پھر یکایک چونکا، ایک نظر سر سے پیروں تک مجھے دیکھا اور رکوع کی حالت میں جاتے ہُوئے بولا۔

"اوہ!... انسان دیوتا! مَیں معافی کا طلب گار ہُوں، انسان دیوتا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ پنجرے سے فرار ہو کر یہاں پہنچ گئے ہیں۔ حکم دیجئے، انسان دیوتا، مَیں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہُوں؟"

اُس کی پنجرے سے فرار ہونے والی بات نے مجھے چکرا دیا۔ مَیں نے کہا۔ "مجھ سے ڈرو نہیں، میرے ساتھ آؤ۔ مَیں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہُوں۔"

وہ میرے ساتھ پودوں کی اوٹ میں آ گیا تاکہ کھیت میں کام کرنے والے وہ بُوزنے ہمیں نہ دیکھ سکیں جو نہ تو میری بات سمجھ سکتے ہیں اور نہ ہی اُن کی بات میرے پلّے پڑ سکتی تھی۔

خواجہ سرا نما وہ شخص ایک بار گھٹنوں کے بل میرے سامنے بیٹھتے اور ہاتھ جوڑتے ہُوئے بولا۔ "میری غلطی معاف کر دیجئے، انسان دیوتا۔ مَیں آپ کا غلام ہُوں۔ ابھی مَیں نے اپنی عُمر کے صرف دو سو شبرے گزارے ہیں اور تین سو شبرے باقی ہیں۔ اس لیے ابھی مجھے تباہ نہ کیجئے گا۔"

"اگر تم نے میرے کہنے پر عمل کیا تو مَیں تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔" مَیں نے نرمی سے جواب دیا۔ اور سوچنے لگا کہ لفظ "شبرے" دنوں، مہینوں یا سالوں کے لیے استعمال کیا گیا ہو گا۔ بہرصُورت یہ لفظ وقت کے پیمانے کو ظاہر کرتا تھا۔ مَیں نے اپنی اس سوچ کی تصدیق کے لیے بات جاری رکھی۔ "بلکہ تمھارے شبرے بھی بڑھا دُوں گا۔"

"اوہ!" وہ خوش ہوتے ہُوئے بولا۔ "مگر میری عمر تو صرف پانچ سو شبرے مقرّر کی گئی ہے۔ کیا آپ اسے بڑھا سکتے ہیں انسان دیوتا؟"

"ہاں۔" مَیں نے جواب دیا۔ "لیکن اس سلسلے میں پھر بات کریں گے۔ تم نے ٹھیک اندازہ لگایا کہ مَیں پنجرے سے فرار ہو کر یہاں پہنچا ہُوں۔ مجھے تمھاری مدد کی ضرُورت ہے۔"

"آپ کو کس قسم کی مدد چاہیے، انسان دیوتا؟"

"بات یہ ہے کہ فرار کے دوران مَیں گر پڑا تھا اور مجھے سر پر چوٹ آ گئی تھی جس سے میری یادداشت بُری طرح متاثر ہُوئی ہے۔ مَیں پچھلی بہت سی باتیں بھُول گیا ہُوں۔ مجھے بتاؤ کہ یہ کون سی جگہ ہے؟ مَیں یہاں کیا کروں؟ وہ پنجرہ کہاں تھا جس میں مَیں قید تھا؟ مجھے یہ ساری باتیں بتاؤ جو میرے حافظے سے نکل گئی ہیں۔"

"آپ نے "بنگو" بہت پی لی ہو گی ورنہ آپ کو چوٹ نہ لگتی اور آپ کا حافظہ خراب نہ ہوتا۔" وہ مسکرا کر بولا۔

بنگو سے اُس کی مُراد غالباً شراب تھی۔ مَیں نے اُس کی بات گول کرتے ہُوئے پُوچھا۔ "تمھارا نام کیا ہے؟"

میرے اس سوال پر اُس نے اپنا دایاں بازو اُوپر اُٹھا لیا اور اپنی بغل دکھاتے ہُوئے۔ "میرا شناخت نامہ پڑھ لیجیے انسان دیوتا۔"

مَیں نے دیکھا کہ اس کی بغل میں ایک مہر لگی ہُوئی تھی مگر مَیں اُس کی تحریر سے ناآشنا تھا۔ مَیں نے کہا۔ "تم خُود ہی بتا دو۔ مَیں پڑھنا بھی بھُول چکا ہُوں۔"

"میرا نام برد نگا ہے۔ میرا سنِ پیدائش ۴۶۱۷ شبرے اور سالِ وفات ۵۱۱۶ ہے۔ میری ذہنی سطح چھٹے درجے کی ہے۔"

"ہُوں۔" مَیں نے اثبات میں سر ہلاتے ہُوئے سوچا کہ اس کا سالِ وفات بھی پہلے سے ہی کیسے مقرّر کر دیا گیا ہے؟ یہ چکّر کیا ہے؟ مگر مَیں نے اس سلسلے میں مزید سوال کرنے کی بجائے کہا۔ "تمھارا نام برد نگا ہے اور میرا نام سرفردش۔"

"ایسا عجیب نام مَیں نے پہلی بار سُنا ہے، انسان دیوتا۔" وہ بولا۔ "مگر خیر، میری ذہنی سطح صرف چھٹے درجے کی ہے۔ مَیں صرف بول اور سوچ ہی سکتا ہُوں۔ اس سے آگے کا علم مجھے نہیں ہو سکتا۔ میرا خیال ہے کہ آپ اُن بیس لوگوں میں سے ایک ہیں، جنھیں پنجروں میں بند رکھا جاتا ہے اور چونکہ میلۂ خون قریب آ گیا ہے تو

آپ اس خوف سے فرار ہو گئے ہیں کہ کہیں آپ کو میلۂ خون کے لیے منتخب نہ کر لیا جائے۔ یہی بات ہے نا، انسان دیوتا؟"

"تم بہت باتونی ہو بردنگا۔ میں نے پوچھا تھا کہ یہ کون سی سرزمین ہے؟"

"یہ سرزمین خمرشان ہے انسان دیوتا۔ کیا آپ اپنے ملک کا نام بھی بھول گئے ہیں؟"

"میں نے تمھیں بتایا تھا کہ سر میں چوٹ لگنے کی وجہ سے میری یادداشت کھو گئی ہے۔ اب یہ بتاؤ کہ یہ خمرشان کا کون سا علاقہ ہے؟"

"یہ خمرشان کا جنوبی صوبہ خراگ ہے انسان دیوتا۔ وہ بُرجِ گوگوش ہے۔" اُس نے گنبد والی عمارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بات جاری رکھی۔ "اور ہم ہمیشہ کی طرح یہاں پے وا کاشت کرتے ہیں۔"

"مرشا کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"مرشا!"... وہ تعجب سے بولا۔ "آپ اُس معمولی حیوان کو کیسے جانتے ہیں انسان دیوتا؟"

"تمھیں سوال کرنے کی اجازت نہیں ہے بردنگا۔" میں نے قدرے غصے سے کہا۔ "جو پوچھا جائے اس کا جواب دیتے رہو۔ سمجھ گئے؟"

"ہاں، انسان دیوتا۔" وہ ہاتھ جوڑتے اور لرزتے ہوئے بولا۔ "میری غلطی معاف کر دیجیے۔ میری ذہنی سطح صرف چھٹے درجے کی ہے نا، اس لیے غلطی ہو جاتی ہے۔"

"مجھے کھانا، لباس اور پناہ گاہ کی ضرورت ہے۔ کیا یہاں کوئی ایسی جگہ ہے جہاں کوئی میرے سکون و تنہائی میں مخل نہ ہو سکے؟"

"آپ جانتے ہیں کہ یہاں ایسی کوئی جگہ نہیں ہو سکتی جہاں آپ "اُن" کی نگاہوں سے اوجھل رہ سکیں۔ اوہ... معاف کیجیے گا، انسان دیوتا۔ میں پھر بھول گیا کہ آپ کا حافظہ ختم ہو گیا ہے۔ آئیے، میرے ساتھ آئیے۔ یہاں بہت زیادہ خطرہ ہے۔"

وہ میرے آگے آگے چلتا ہوا مجھے کھیت کے کنارے ایک بڑے سے گڑھے میں لے آیا اور بولا۔ "وہاں کی بہ نسبت یہاں خطرہ کم ہے۔"

"کیسا خطرہ بردنگا؟"

"جاسوسی پردے پر دیکھے جانے کا خطرہ انسان دیوتا۔ یہ بہت ہی بُرا ہوا کہ آپ سب کچھ بھول چکے ہیں ورنہ آپ کو یاد رہتا کہ "وہ" سب کی نقل و حرکت جاسوسی پردے پر دیکھتے رہتے ہیں۔ اور خمرشان میں ہر وقت سروں پر خطرہ منڈلاتا رہتا ہے۔ اب دیکھیے نا۔ اگر گرانجو جاسوسی پردے پر میری نقل و حرکت دیکھنا چاہے اور میں اُسے نظر نہ آؤں تو وہ مجھ سے اس کی وجہ پوچھے گا اور اگر وہ اس وجہ سے مطمئن نہ ہو تو مجھے تباہ کر دے گا حالانکہ ابھی میرے تیرہ سو شمرے باقی ہیں اور اگر اس نے آپ کو جاسوسی پردے پر دیکھ لیا تو گرفتار کر کے دوبارہ جبر رُت بھجوا دے گا جہاں آپ کو پنجرے میں بند کر دیا جائے گا۔"

بردنگا کی باتوں سے میں سوچوں کے گرداب میں ڈوب گیا۔ اسپائی اسکرین سے کسی کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھنا تو ہمارے دور اور دُنیا کی تازہ ترین ٹیکنالوجی شمار ہوتی ہے۔ تب بھی یہ سکرین وہاں عام نہیں لیکن معلوم ہوتا تھا کہ یہ لوگ سائنسی ترقی میں بہت آگے جا چکے ہیں۔

مجھے سوچ میں ڈوبے دیکھ کر بردنگا نے کہا۔ "گھبرائیے نہیں انسان دیوتا۔ ابھی گرانجو ہمیں نہیں دیکھ پایا۔ اگر وہ ہمیں دیکھ چکا ہوتا تو اب تک جنگجو جانور یہاں پہنچ چکے ہوتے۔ پھر بھی ہمیں یہاں سے جلد از جلد فرار ہو جانا چاہیے ورنہ وحشی سپاہی ہمارے پرخچے اُڑا دیں گے۔"

"ہم یہاں سے کیسے اور کہاں فرار ہو سکتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"یہ تو میں نہیں جانتا، انسان دیوتا کیونکہ میری ذہنی سطح صرف چھٹے درجے کی ہے مگر مجھے ایک ایسی جگہ کا ضرور علم ہے جہاں ہم کچھ دیر چھپ سکتے ہیں۔"

اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر ایک جگہ بیٹھ کر جلدی جلدی مٹی ہٹانے لگا۔ مٹی ہٹتے ہی ایک تختہ نظر آیا۔

بردنگا نے وہ تختہ اُٹھایا تو اُس کے نیچے ایک زمین دوز راستہ دکھائی دینے لگا۔

"جلدی سے نیچے اُتر جائیے انسان دیوتا۔" اُس نے بے چینی سے کہا۔

میں جلدی سے اس سوراخ میں اُتر گیا۔ میرے بعد بردنگا بھی اُترا اور اُس نے وہ تختہ جو دراصل ایک سُرنگ کا خفیہ دروازہ تھا، بند کر دیا۔

یہ سُرنگ اتنی اُونچی تھی کہ میں جھکے بغیر آگے بڑھ سکتا تھا۔ اس کا فرش اور دیواریں پتھر سے بنائی گئی تھیں۔

"یہ سُرنگ کہاں جاتی ہے بردنگا؟" میں نے پوچھا۔

"معلوم نہیں انسان دیوتا۔"

"تو پھر تم مجھے اس میں کیوں لے گئے ہو؟"

"تاکہ گرانجو ہمیں جاسوسی پردے پر نہ دیکھ سکے۔" وہ بولا۔ "دراصل ہوا یوں تھا انسان دیوتا کہ ایک روز کھیتوں میں کام کرنے والے

ایک جانور نے پے وا کی ایک گانٹھ غائب کر دی۔ میں اُسے تلاش کرتا ہوا گڑھے میں آیا تو میری نظر اس سُرنگ کے دروازے پر پڑ گئی۔ وہ جانور گانٹھ سُرنگ میں چھپانے کے بعد تختے پر مٹی ڈالنا بھول گیا تھا۔ اب جب آپ نے کسی محفوظ مقام کے بارے میں کہا تو مجھے یہ سُرنگ یاد آ گئی۔"

مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہو رہی تھی کہ سُرنگ کے اندر بھی ویسی ہی چاندنی جیسی روشنی پھیلی ہوئی تھی مگر اس روشنی کا مخرج کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

"کیا تم اس سُرنگ کے بارے میں اور کچھ بھی نہیں جانتے؟" میں نے پوچھا۔

"صرف اتنا اور جانتا ہوں، انسان دیوتا کہ عظیم جنگوں کے دوران جب پُشکانی وحشیوں نے خمرشان پر لشکر کشی کی تھی تو ملکہ ادر مہا پُجارن نے کچھ مرد دیوتاؤں کے ساتھ اس سُرنگ میں پناہ لی تھی اور وہ لوگ اس وقت تک یہیں مقیم رہے تھے جب تک کہ پُشکانی لشکروں کو پسپا اور تہ تیغ نہیں کر دیا گیا تھا۔ جب آپ کا حافظہ ٹھیک ہو جائے گا تو باقی باتیں آپ کو خود ہی یاد آ جائیں گی جو مجھے یقیناً معلوم نہیں۔"

میں بردنگا کی بات پر مسکرا دیا۔ وہ غریب جتنا جانتا تھا مجھے بتا چکا تھا۔

"تم اس سُرنگ میں کہاں تک گئے تھے؟" میں نے سوال کیا۔

"آگے جا کر ایک بہت بڑا کمرہ آتا ہے انسان دیوتا۔ میں بس اسی کمرے تک گیا تھا اور وہ گانٹھ جو جانور نے چرائی تھی وہیں ملی گئی تھی۔" اتنا کہہ کر اس نے کچھ سوچا اور بولا۔ "میرا خیال ہے کہ یہ سُرنگ بُرجِ گرگوش تک جاتی ہوگی جہاں سے خونخوار پُشکانی قبیلے پر نظر رکھی جاتی ہے۔"

اس کے بعد میں نے بردنگا سے کوئی سوال نہیں کیا اور چپ چاپ سُرنگ میں آگے بڑھتا رہا۔ تھوڑی دُور جا کر سُرنگ وسیع ہونے لگی اور وہ کمرہ آ گیا جس کا ذکر بردنگا نے کیا تھا۔

اس کمرے کے بیچوں بیچ ایک گول چبوترہ بنا ہوا تھا۔ یہ چبوترہ کسی پلاسٹک نما میٹریل سے بنایا گیا تھا اور چبوترے کے اوپر چھت کے مرکزی حصے میں روشنی کی ایک گیند متحرک رہی تھی۔

میں کافی دیر تک روشنی کے اس عجیب و غریب گولے کی طرف دیکھتا رہا مگر میری سمجھ میں نہ آ سکا کہ وہ کسی تار یا گلوب کے بغیر کس طرح معلق ہے۔

میں نے چبوترے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بردنگا سے پوچھا۔ "یہ چبوترہ کیسا ہے؟"

اتنا سنتے ہی وہ میرے قدموں میں گر پڑا اور بولا۔ "یہ نہ پوچھیے انسان دیوتا۔ اس کے بارے میں بات کرنا ممنوع ہے۔ میں اس کے متعلق کچھ بھی نہیں بتا سکتا۔"

میں نے اُس کی حالت دیکھ کر مزید سوال نہ کیے اور کمرے کی دیواروں سے آویزاں ہتھیار اور وردیوں کا جائزہ لینے لگا۔ ان ہتھیاروں اور وردیوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ کسی زمانے میں یہ محافظوں کا کمرہ رہا ہوگا اور شاید یہ وہی زمانہ ہوگا جب بردنگا کے بقول ملکہ اور مہا پُجارن نے اس سُرنگ میں پناہ لی تھی۔

یہ دیکھ کر بھی میں متعجب ہوئے بغیر نہ رہ سکا کہ وہ ہتھیار بھی اُسی میٹریل سے تیار کیے گئے تھے جو چبوترے کی تعمیر میں استعمال ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے خمرشان کے لوگ دھات کے استعمال سے واقف نہیں ہیں۔

میں نے اپنے لیے ایک وردی کا انتخاب کیا اور اُسے پہننے کے ایک سرا اُٹھا کر بردنگا سے بولا۔ "میں تو یہ بھی بھول گیا ہوں کہ یہ سپر کس چیز کی بنی ہوئی ہے۔"

"یہ بھی پے وا کی بنی ہوئی ہے انسان دیوتا۔ خمرشان میں ہر چیز پے وا سے بنائی جاتی ہے مگر شاید آپ چوٹ کی وجہ سے بھول گئے ہیں۔"

"اور یہ خود۔" میں نے خود بجاتے ہوئے پوچھا جو خاصا وزنی تھا۔

"یہ ترغون کا بنا ہوا ہے جو پے وا سے تیار کیا جاتا ہے۔"

میں نے اپنے لیے ایک تلوار منتخب کی جو اگرچہ اسی پلاسٹک جیسے مواد کی بنی ہوئی تھی لیکن اس کی دھار تیز اور پھل لچک دار تھا۔

میں پوری طرح تیار ہو گیا تو بردنگا میرے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے بولا۔ "میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں انسان دیوتا۔ اور اپنے آپ کو خوش قسمت بھی سمجھتا ہوں کیونکہ میں اپنے قبیل کا واحد رِنہ ہوں جس نے ایک مرد کا دیدار کیا ہے اور جو جانتا ہے کہ مرد اور خواجہ سرا میں کیا فرق ہوتا ہے۔"

مجھے بردنگا کی بات پر ہنسی آ گئی۔ میں نے پوچھا۔ "کیا خمرشان میں مرد نہیں ہوتے؟"

"ہوتے ہیں انسان دیوتا۔" وہ بولا۔ "لیکن وہ پنجروں میں بند ہیں اور کوئی خواجہ سرا اُوری طرح اُن کا دیدار نہیں کر سکتا۔ کیا آپ یہ بات بھی بھول چکے ہیں؟"

بردنگا کی اس بات نے مجھے مخمصے میں ڈال دیا۔ یہ خمرشان

کیسی سرزمین تھی جہاں مُردوں کو پنجروں میں بند رکھا جاتا تھا۔ آخر کیوں؟... اور اُنھیں پنجروں میں کون بند رکھتا تھا؟

مَیں بردنگا سے اس سلسلے میں سوال کرنے ہی والا تھا کہ اچانک میری نگاہ دوبارہ کمرے کے بیچوں بیچ بنے اُس گول چبوترے پر جا پڑی جس کے بارے میں پُوچھنے پر بردنگا بُری طرح دہشت زدہ ہو گیا تھا۔

مَیں نے سوچا کہ اگر اُس سے دوبارہ پُوچھوں گا تو وہ پھر کچھ بتانے سے انکار کر دے گا۔ اس لیے مَیں خود ہی چبوترے کی طرف بڑھنے لگا۔ بردنگا نے مجھے چبوترے کی طرف بڑھتے دیکھا تو گڑگڑانے لگا۔

"نہیں... نہیں، انسان دیوتا۔ اُس کے قریب مت جایئے۔"

مَیں نے دیکھا کہ وہ دہشت کے مارے لرز رہا تھا۔ پھر وہ اُٹھ کر میرے قدموں سے لپٹ گیا۔ مَیں نے اُسے نرمی سے ہٹایا اور تلوار نکال کر چبوترے کے اُوپر ہَوا میں دائیں بائیں تلوار گھمائی تو بردنگا رونے لگا:

"ایسا نہ کریں انسان دیوتا۔ ایسا نہ کریں۔ مَیں نے تو آپ کا ہر حکم مانا ہے پھر آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟"

"مگر تم اتنے خوفزدہ کیوں ہو، بردنگا؟ دیکھو۔ اِدھر دیکھو۔ کچھ بھی تو نہیں ہوتا۔"

مَیں چبوترے پر کھڑا ہو گیا مگر بردنگا سر جُھکائے اُسی طرح لرزتا کانپتا رہا۔ مَیں چبوترے سے اُتر کر اُس کے قریب آتے ہُوئے کہا۔

"آؤ چلیں۔ تم تو خواہ مخواہ خوفزدہ ہو رہے ہو۔"

وہ اُٹھتے ہُوئے بولا: "آپ نہیں سمجھتے انسان دیوتا کہ چبوترے پر چڑھنا آپ کے لیے نہیں بلکہ میرے لیے کس قدر خطرناک ہے۔ آپ نے یہ حرکت شاید اس لیے کی ہے کہ آپ سب کچھ بھُول چکے ہیں۔ ورنہ آپ ایسا نہ کرتے۔ خیر جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔ اب آیئے چلیں۔ شاید یہ سُرنگ ہمیں بُرج گرگوش تک پہنچا دے اور وہاں سے فرار ہو کر مَیں تباہ ہونے سے بچ جاؤں۔"

وہ میرے آگے آگے چلنے لگا۔

میری سمجھ میں اب تک نہیں آ سکا تھا کہ بردنگا آخر اُس چبوترے سے اتنا خوفزدہ کیوں ہے مگر وہ کم بخت کچھ بتاتا بھی تو نہیں تھا۔

جب سُرنگ دوبارہ تنگ ہونے لگی تو اچانک ایک نیلگوں شعلہ نمودار ہُوا اور بردنگا اُچھل کر میرے قدموں میں آ گرا۔ مَیں نے اُس کی طرف دیکھا۔

وہ میرے قدموں سے لپٹتے ہوئے بولا: "گرانجو... گرانجو نے ہمیں دیکھ لیا ہے، انسان دیوتا۔ اُس نے برقی مقناطیسی پردے سے ہماری راہ مسدُود کر دی ہے۔"

وہ نیلگوں شعلہ جو ایک لمحے کے لیے نمودار ہُوا تھا، اب غائب ہو چکا تھا۔ مَیں بردنگا کو ہٹا کر آگے بڑھا تو اچانک مجھے یُوں محسوس ہُوا جیسے مَیں کسی آہنی دیوار سے ٹکرا گیا ہُوں۔ اس کے ساتھ ہی وہ نیلگوں شعلہ دوبارہ چمکا اور مَیں بھی یُوں بردنگا کے پاس جا گرا جیسے کسی نے بڑے زور سے دھکا دیا ہو... لیکن اس سے زیادہ تعجب خیز بات یہ تھی کہ مجھے نہ بجلی کا جھٹکا لگا تھا اور نہ ہی شعلے سے جلن محسوس ہوئی۔ کوئی چوٹ بھی نہیں آئی تھی۔ بس یُوں لگا تھا جیسے کسی بہت بڑے فولادی ہاتھ نے مجھے پیچھے دھکیل دیا ہو۔

اتنے میں بردنگا نے روتے ہُوئے اُسی گول چبوترے کی طرف اشارہ کیا۔

مَیں نے وہیں پڑے پڑے اُدھر دیکھا تو حیرت سے میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

چبوترے پر دُھویں کا ایک ہیولا بڑی تیزی سے گردش کر رہا تھا... پھر اُسی دُھویں نے ایک وجُود کی شکل اختیار کر لی اور یہ وجُود ایک اور خواجہ سرا کا تھا... مگر یہ زنخہ بردنگا سے زیادہ جسیم اور مضبُوط تھا۔ اُس کا سر بڑا اور اُسترے سے مُنڈا ہُوا تھا... اور آنکھیں گہرے سبز رنگ کے بڑے بڑے نگینوں کی طرح یُوں چمک رہی تھیں جیسے رات کے اندھیرے میں سیاہ بلی کی آنکھیں چمکتی ہیں۔

بردنگا اُسے دیکھتے ہی رونے اور گڑگڑانے لگا: "مجھے معاف کر دو گرانجو۔ مجھے معاف کر دو۔ مَیں نے تو قانون کے مطابق انسان دیوتا کے حکم کی تعمیل کی ہے۔ مَیں اس کے سوا کر بھی کیا سکتا تھا۔ تم تو جانتے ہی ہو۔ مجھے معاف کر دو۔"

گرانجو اُسے کوئی جواب دینے کی بجائے چبوترے سے اُتر کر ہماری طرف بڑھنے لگا۔ بردنگا کے برعکس اُس کے گلے میں ہیروں کی ایک مالا اور زرغون کی ایک مہر پڑی ہُوئی تھی جو اُس کے عہدے کا اِظہار کرتی تھی۔

اُس نے میری طرف نگاہ ڈالے بغیر بردنگا سے پُوچھا: "تم کتنے شبروں کے ہو؟"

"ابھی مَیں نے صرف دو سو شبرے پُورے کیے ہیں۔ میری عُمر کے تین سو شبرے باقی ہیں۔ مجھ پر رحم کرو۔"

گرانجو اپنی گردن لٹکائے اور بھویں اُچکاتے ہوئے کچھ سوچنے لگا... پھر وہ اپنی جسامت کی بہ نسبت باریک آواز میں بولا: "مجھے افسوس ہے بردنگا کہ مَیں تم پر رحم نہیں کر سکتا۔ مَیں جانتا ہُوں

کہ اس میں تمھارا کوئی قصُور نہیں۔ تم نے قانون کے مطابق انسان دیوتا کے حکم کی تعمیل کی ہے۔ اس کے ہر حکم کی تعمیل کرنا ہم سب خواجہ سراؤں کا فرض ہے۔" یہ کہہ کر وہ میری طرف پلٹا اور بولا۔

"کورنش بجا لاتا ہُوں، انسان دیوتا۔" ساتھ ہی رقص کے انداز میں اُس نے اپنا دایاں بازو لہراتے ہُوئے اُوپر اٹھایا اور اپنی بغل دکھاتے ہوئے بولا: "شناخت نامہ ملاحظہ فرمایئے سرکار۔ گرانجو۔ چودھواں درجہ... سن پیدائش چار ہزار چھ سو پانچ شبرے... سالِ وفات پانچ ہزار چار سو چار شبرے۔ مگر میری بغل کو نہ چھُویئے گا مجھے گدگدی ہوتی ہے۔ مَیں خواجہ سراؤں کے قبیلے کا 'نیم مرد' ہُوں۔ اب مجھے اجازت دیجیے کہ مَیں بردنگا سے نمٹوں۔" یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا اور بردنگا سے بولا: "کھڑے ہو جاؤ۔"

ایسا لگتا تھا جیسے بردنگا میں اُٹھنے کی سکت بھی باقی نہ رہی ہو۔

"رحم گرانجو... رحم۔" وہ گڑگڑانے لگا۔

"بکواس مت کرو۔" گرانجو باریک آواز میں دھاڑا۔ "مَیں نیم مرد کی حیثیت سے تمھیں حکم دیتا ہُوں کہ اُٹھو اور چبوترے پر کھڑے ہو جاؤ۔"

بردنگا سے اُٹھا نہ جا سکا۔ وہ کہنیوں اور گھٹنوں کے بل چبوترے کی طرف رینگنے لگا۔ وہ بُری طرح رو رہا تھا۔ جب وہ چبوترے کے قریب پہنچا تو اُس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔

"انسان دیوتا۔ آپ نے تو میرے شبرے بڑھانے کا وعدہ کیا تھا۔ اب کم از کم مجھے بچا ہی لیجیے۔" وہ گڑگڑانے لگا۔

مجھے بردنگا پر رحم آ گیا۔ مَیں نے گرانجو سے کہا: "اے نیم مرد... بردنگا نے جو کچھ کیا ہے، میرے حکم پر کیا ہے۔ اگر میرے حکم کی تعمیل قابلِ تعزیر ہے، تو پھر اس کی سزا اُسے نہیں، بلکہ مجھے ملنی چاہیے۔ لہٰذا اُسے چھوڑ دو اور اگر دے سکتے ہو تو مجھے سزا دو۔" یہ کہتے ہُوئے مَیں نے میان سے تلوار بھی نکال لی۔

گرانجو پلک جھپکائے بغیر، سانپ کی طرح ٹکٹکی باندھے کچھ دیر میری طرف دیکھتا رہا... پھر اُس کے بھینچے ہوئے باریک ہونٹوں پر بڑی ہی ظالمانہ مسکراہٹ اُتر آئی۔

"آپ کے بارے میں کوئی بہت بڑی گڑبڑ معلوم ہوتی ہے انسان دیوتا..." پھر وہ بردنگا کی طرف پلٹا۔ "چپ چاپ چبوترے پر کھڑے ہو جاؤ بردنگا ورنہ تمھیں دُوسرے درجے کی اذیت ناک موت مرنا پڑے گا۔ کیا تم وہ موت مرنا چاہتے ہو؟"

بردنگا یہ سُن کر تھرا اُٹھا اور سسکیاں لیتے ہُوئے گھسٹ کر چبوترے پر چڑھنے لگا۔ مَیں یہ برداشت نہ کر سکا اور نتیجے کی پروا کیے بغیر مَیں نے بڑے زور سے گرانجو پر تلوار کی ضرب لگائی مگر اپنی جھونک میں فرش پر جا گرا کیونکہ وہ تلوار گرانجو کے جسم سے یُوں گزر گئی تھی جیسے ہَوا سے گزری ہو۔

گرانجو نے قہقہہ لگایا اور بولا: "مَیں حقیقت نہیں، ایک خیال، ایک تصویر، ایک واہمہ اور ایک سایہ ہُوں، انسان دیوتا۔ میرا وجُود کہیں اور ہے۔ تم نے جس پر وار کیا، وہ میرے وجُود کا تصویری پیکر ہے۔ اگر تم عمرشان کے مرد یا دیوتا ہوتے تو یہ حقیقت تمھارے علم میں ہوتی اور تم میرے تصویری پیکر پر وار نہ کرتے۔ اسی لیے مَیں نے تم سے کہا تھا کہ تمھارے سلسلے میں کوئی بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ خیر، یہ بات بعد میں ہو گی پہلے مَیں بردنگا سے نمٹ لُوں۔"

اسی دوران بردنگا چبوترے پر چڑھ چُکا تھا اور گھٹنوں کے بل بیٹھا تھر تھر کانپ رہا تھا۔ گرانجو نے اپنا ہاتھ اُٹھایا اور یُوں اِشارہ کیا جیسے کسی کو بردنگا کا سر قلم کرنے کا حکم دے رہا ہو۔ بردنگا کے مُنہ سے بے ساختہ چیخ نکلی مگر وہ اُدھوری ہی رہ گئی کیونکہ اتنے میں اُس کا وجُود دھویں میں بدل چُکا تھا اور ہر طرف گوشت جلنے کی بُو پھیل گئی تھی۔

اب گرانجو کے اُس تصویری پیکر نے ایک دیوار کی طرف مُنہ پھیرتے ہُوئے گویا کسی کو حکم دیا: "بردنگا کے خاتمے کا اندراج کر دو۔"

مَیں یہ نفرت انگیز المیہ دیکھ کر گُنگ سا رہ گیا۔

مجھے یُوں محسوس ہُوا جیسے مَیں کسی الف لیلوی کہانی کا ایک ایسا کردار ہُوں جو خوفناک جن کے طلسم کدے میں پہنچ گیا ہو۔ مَیں نے اپنی تلوار نیام میں ڈال دی کہ وہ کسی خیال یا تصویری پیکر کو ہلاکت سے ہم کنار نہیں کر سکتی تھی۔ پہلے تو مَیں غم و غصّے سے پیچ و تاب کھاتا رہا... پھر یہ سوچ کر اپنے آپ کو تسلّی دے لی کہ اگر یہ گرانجو کا تصویری پیکر ہے تو وہ حقیقی پیکر بھی تو رکھتا ہو گا۔ مجھے اس وقت کا انتظار کرنا چاہیے، جب وہ اپنے حقیقی پیکر میں میرے سامنے آئے... تب مَیں اس کا یہ قرض ضرور چُکا دُوں گا۔ مَیں اسی سوچ میں ڈُوبا ہُوا تھا کہ گرانجو میری طرف متوجہ ہو گیا۔

"اب تمھارے بارے میں بات ہو جائے، انسان دیوتا۔ کیا تم اُن ہیں مَردوں میں سے ایک ہو جو دارالخلافہ جبروت میں مقید ہیں؟"

مَیں اس سلسلے میں بردنگا سے تو سُن ہی چُکا تھا، اس لیے مَیں نے کہا: "ہاں۔ مَیں وہیں سے فرار ہُوا ہُوں لیکن راستے میں سر پر شدید چوٹ لگنے کی وجہ سے میری یادداشت بڑی حد تک ختم ہو چکی ہے۔"

گرانجو کی سبز آنکھیں مجھے گھُورتی رہیں۔ وہ گردن مٹکاتے

اور بھویں اُچکاتے ہوئے کچھ دیر سوچتا رہا... پھر بولا "تم اُن بیس مَردوں میں سے نہیں ہو، انسان دیوتا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟... مگر یہ سب کچھ میری سمجھ میں آنا چاہیے اور مجھے اس کا ادراک ہو کر ہی رہے گا۔ میری لوحِ پیدائش پر میری ذہنی سطح چودھواں درجہ ظاہر کرتی ہے مگر حقیقت میں وہ چودھویں درجے سے بہت آگے اور بہت بلند ہے... لیکن "وہ لوگ" اس حقیقت سے آگاہ نہیں۔" اتنا کہہ کر وہ پھر گردن مٹکاتے اور بھویں اُچکانے لگا۔

یہ حرکت اس امر کی غماز تھی کہ وہ سوچ رہا ہے۔

چند لمحے بعد وہ مجھ سے مخاطب ہُوا "تمھاری شخصیت اسرار کے لبادوں میں لپٹی ہوئی ہے اجنبی... لیکن اسرار کے پردے زیادہ دیر تک تمھاری شخصیت اور خمرستان میں آمد کا مقصد نہیں چھپا سکتے۔ ہو سکتا ہے، تب میں تمھیں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کروں۔ اب تم اپنے بارے میں کیا کہتے ہو؟"

"ٹھیک سمجھے گرانچو، میں اُن بیس مَردوں میں سے نہیں ہُوں جو جبرات میں محبوس ہیں؟"

میں نے اسے صاف صاف بتا دینا ہی مناسب جانا کہ اُس تصویری پیکر کا میں کچھ بگاڑ بھی تو نہیں سکتا تھا۔

میں نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ "میں نے جھوٹ بولا تھا کہ وہاں سے فرار ہونے کے بعد سر پر چوٹ لگنے کے باعث میری یادداشت خراب ہو گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں تمھاری سرزمین کے لیے ایک اجنبی ہُوں۔ تم مجھے کافی سمجھدار اور عقل مند معلوم ہوتے ہو۔ آؤ ہم ایک دُوسرے کو اپنے بارے میں بتائیں اور دُشمنوں کی بجائے ایک دُوسرے کے دوست بن جائیں۔"

گرانچو اپنے مخصوص انداز میں سوچنے لگا۔

میں نے یہ سوچتے ہُوئے کہ کہیں وہ میرے وار کرنے والی حرکت کی بِنا پر انکار نہ کر دے، ان الفاظ میں پیش بندی کی۔ "مجھے افسوس ہے، تھوڑی دیر پہلے میں نے اشتعال میں آ کر تم پر حملہ کر دیا تھا۔ دراصل اُس وقت میں بِرلنگا کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گیا تھا۔ بہرصورت مجھے اپنی اس حرکت پر ندامت ہے اور میں چاہتا ہُوں کہ اب ہم دوست بن جائیں۔"

"یہ عجیب سی بات ہے کہ تم ہماری زبان میں بات کرتے ہُوئے کچھ ایسے الفاظ بھی بول جاتے ہو جو میرے لیے نئے ہیں اور میں اُن کے مفہوم و معانی سے ناآشنا ہُوں۔ مثلاً لفظ 'دوست'، ہماری زبان کا لفظ نہیں۔ اس کے کیا معنی ہیں؟"

میں نے اپنے ہونٹوں پر دوستانہ تبسم چپکانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "اس کا مطلب ہے کہ ہم ایک دُوسرے کو نقصان نہ پہنچائیں بلکہ ایک دُوسرے کے کام آئیں اور ایک دُوسرے کی مدد کریں۔"

"اوہ...!" وہ بولا۔ "میں خود بھی یہی سوچ رہا تھا لیکن یہ مت سمجھنا کہ اُس سوچ کا باعث تمھاری شخصیت یا یہ دُور از کار ہتھیار ہیں۔ ہم نے ہزاروں شبرے پہلے کے یہ دقیانوسی ہتھیار محض اس لیے رکھ چھوڑے ہیں کہ ہمارے نیم وحشی سپاہی ان سے کھیل سکیں۔"

میں خاموش رہا۔

وہ پھر کسی سوچ میں ڈُوب گیا۔ میری خاموشی میں یہ مصلحت تھی کہ میں اس کے دل کا حال جاننا چاہتا تھا۔

چند لمحوں بعد گرانچو نے دیوار کی طرف دیکھتے ہُوئے بآوازِ بلند کہا۔ "تمام اسپائی اسکرین بند کر دو۔ یہ میرا... نیم مرد کا حکم ہے۔ اب تک جو گفتگو ریکارڈ کی گئی ہے، اسے صاف کر دو اور جب تک میں دوبارہ حکم نہ دُوں ریکارڈنگ نہ کی جائے۔" یہ ہدایات دے کر وہ مجھ سے مخاطب ہُوا۔ "میرے ساتھ آؤ۔ ہم تخلیے میں بات کریں گے۔" یہ کہہ کر وہ اُسی گول چبوترے پر کھڑا ہو گیا۔

میں قدرے ہچکچایا تو اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "شاید تم بِرلنگا کا حشر دیکھ کر خوفزدہ ہو گئے ہو۔ مگر ڈرو نہیں اجنبی... جیسا کہ تم نے کہا تھا، اب ہم دوست ہیں۔ تم میرے کام آؤ گے تو میں تمھارے کام آؤں گا۔"

میں چبوترے پر اُس کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا... مگر مجھے اُس کے وجود کا مطلق احساس نہ ہو سکا۔ وہ واقعی ایک تصویری پیکر تھا۔

وہ میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ اور بولا۔ "تم اس تصویری پیکر والی بات اب تک نہیں سمجھ سکے اجنبی... اور تمھاری اسی بات نے مجھے بتا دیا تھا کہ تم وہ نہیں ہو جس کا اُن سے وعدہ کیا گیا ہے؟"

"کیا مطلب؟" میں نے کچھ نہ سمجھتے ہُوئے بے اختیار سوال کیا۔

"یہی کہ تم ہرموجہ نہیں ہو۔ وہ موعود نہیں ہو جس کے بارے میں "وہ لوگ" یقین رکھتے ہیں کہ ایک روز وہ خمرشان آئے گا اور انھیں تمام تر مشکلات و مصائب سے نجات دلائے گا۔ اگر تم وہی موعود ہرموجہ ہوتے تو تمھیں پتہ چل جاتا کہ تم میرے تصویری پیکر پر وار کر رہے ہو، میرے وجُود پر نہیں۔"

"یہ باتیں ہم آرام سے بیٹھ کر کیوں نہ کریں۔" میں نے اُسے

ٹالنے کے لیے کہا۔ مجھے اس بے حجاب خواجہ سرا کے قریب کھڑے کوفت محسوس ہو رہی تھی۔

"اچھا تو پھر اُس کُرسی پر بیٹھ جاؤ۔" اُس نے جواب دیا اور ایک جانب اشارہ کیا تو میری آنکھیں فرطِ حیرت سے پھٹ گئیں۔

ایک لمحے قبل ہم سُرنگ کے ہتھیاروں والے کمرے میں گول چبوترے پر کھڑے تھے اور اب کھڑے کھڑے پلک جھپکتے ہی ایک ایسے کمرے میں پہنچ گئے تھے جو وسیع و عریض تھا۔ اُس کی چھت بھی کافی اُونچی تھی اور دیواروں میں لگے خفیہ اسپیکروں سے موسیقی کی مدھم آواز کمرے میں تیر رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے کمرے کی دیواریں بھی ترغون کی بنی ہوئی ہُوں۔

کمرے کے وسط میں ایک بہت بڑی میز رکھی تھی جس کے ایک جانب ریوالونگ چیئر اور سامنے دو کُرسیاں موجود تھیں۔

گرانچو میز کی دُوسری جانب ریوالونگ چیئر پر بیٹھ گیا۔

اُس کی گہری سبز آنکھیں مجھ پر جمی ہُوئی تھیں۔

وہ یُوں مسکراتے ہُوئے میری طرف دیکھ رہا تھا جیسے کوئی اوباش بوڑھا اپنی نئی نویلی دُلہن کی طرف دیکھتا ہے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ میں ایک لمحے کے لیے بُری طرح شرما گیا۔

"بیٹھو دوست۔" اس نے بڑی محبت سے کہا۔

میں کُرسی پر بیٹھ گیا۔

"سُنو۔ میں ایک فیصلے پر پہنچ گیا ہُوں۔ میں جانتا ہُوں کہ تم ہرموجہ نہیں ہو اور تم بھی جانتے ہو کہ تم ہرموجہ نہیں ہو... لیکن "وہ" نہیں جانتے کہ تم ہرموجہ نہیں ہو۔ اس لیے میں چاہتا ہُوں کہ تمھیں اُن کے سامنے اُسی ہرموجہ کی حیثیت سے پیش کر دُوں جس کا اُن سے وعدہ کیا گیا ہے۔ تم سمجھ گئے نا میری بات؟"

"ہاں... لیکن جب تک ہم سارے معاملات طے نہ کر لیں، میں ہرموجہ بننے کا وعدہ نہیں کر سکتا اور ہاں۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تم تصویری پیکر ہو یا میں حقیقی گرانچو سے بات کر رہا ہُوں؟"

یہ سُن کر اس نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا اور بولا۔ "چھُو کر دیکھ لو۔"

میں نے اُس کا ہاتھ چھُوا تو پتہ چلا کہ وہ تجسیم اختیار کر چکا تھا۔ اس کا برف کی طرح سرد ہاتھ چھُو کر مجھے یُوں محسوس ہُوا جیسے میں نے کسی مُردے کا ہاتھ چھُو لیا ہو۔

"معاملے کی بات شروع کرنے سے پہلے مجھے تمھارے کوائف کا اندراج کرنا ہے اجنبی... لیکن ٹھہرو۔ پہلے مجھ سے کوئی جھوٹ بولو۔"

"کیا مطلب؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"کوئی بھی ایسی بات کرو جو سچی نہ ہو۔"

"میرا نام دِلرُبا خانم ہے۔" میرے اتنا کہتے ہی اُس کی کُرسی سے ایک عجیب سی بِھن بِھناہٹ سُنائی دی۔ اور دونوں ہتھوں پر لگے ہُوئے بلب جلنے بجھنے لگے۔ وہ مسکرانے لگا۔

"اب تم سمجھ گئے ہو گے کہ جھوٹ بول کر مجھے دھوکا نہیں دے سکتے۔"

"ہاں۔ میں سمجھ گیا۔" میں نے بھی جواباً مسکرا کر کہا۔

اُس نے میز پر رکھی ایک سلیٹ اُٹھائی اور دُوسرے ہاتھ میں قلم تھامتے ہُوئے پُوچھا۔ "تمھارا نام؟"

"سرفروش..." میں نے جواب دیا۔

"لیکن فی الحال تم سرفروش نہیں ہو بلکہ ہرموجہ ہو... وہ انسان دیوتا جس کا اُن سے وعدہ کیا گیا تھا اور جس کی آمد کا "وہ" لاکھوں شبروں سے انتظار کر رہے ہیں۔"

گرانچو اپنی سبز آنکھیں میری آنکھوں میں ڈالے بولتا رہا۔ ان آنکھوں میں مجھے عیاری اور مکر کی چمک صاف دکھائی دے رہی تھی۔

میں نہیں جانتا کہ خمرشان کے شبرے ہمارے ہاں کے کتنے وقت کے برابر تھے۔ وہاں دن اور رات کی شناخت بھی ناممکن تھی کہ ہمہ وقت پونم کی سی ٹھنڈی چاندنی چھائی رہتی تھی۔ گرانچو سے بات چیت کے بعد مجھے ایک وسیع و عریض آرام دہ کمرے میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ یہ کمرہ بھی اُسی کمرے جیسا ہی تھا جس میں میری اور گرانچو کی مفصل گفتگو ہوئی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس کمرے میں میز کی جگہ پلنگ بچھا ہُوا تھا اور کمرے کی دیواروں کے ساتھ ساتھ بڑی بڑی الماریوں میں کتابیں سجی ہوئی تھیں۔

میں نہ جانے کتنے دنوں سے اس کمرے میں مقیم تھا۔

شروع شروع میں تو مجھے وقت کاٹنا مشکل ہو گیا لیکن پھر جب میں نے الماریوں سے کتابیں نکال کر دیکھنا شروع کیں تو مجھے از خود ہی اُن کی تحریریں پڑھنا آ گئیں... اب میرا بیشتر وقت اُن کے مطالعے میں گزرتا تھا۔ میں ان کتابوں کا مُطالعہ بڑے شوق سے کرتا رہا کیوں کہ یہ کتابیں خمرشان کی قدیم تاریخ پر مبنی تھیں۔

میں جانتا تھا کہ اسپائی اسکرین کے ذریعے ہر وقت میری کڑی نگرانی کی جا رہی ہے۔ لیکن اُن سے متعلق آلات کہاں نصب تھے، یہ مجھے معلوم نہیں ہو سکا تھا۔

اس کمرے میں منتقل ہونے سے پہلے گرانچو نے کہا تھا: "میں چاہوں تو تمھیں کسی وقت، کسی لمحے اور کسی بھی جگہ چشم زدن میں ہلاک کر سکتا ہوں... مگر جیسا کہ تم نے کہا ہے، ہم ایک دوسرے کے دوست بن کر ایک دوسرے کے کام آ سکتے ہیں، میں تمھیں ہلاک نہیں کروں گا اور اس کے بدلے میرے کام آؤ گے۔ آج کے بعد تم سرفروش نہیں بلکہ ہرموجہ ہو۔ میں نے اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے جو منصوبہ بنا رکھا تھا، اب مجھے اس میں کچھ تبدیلیاں کرنا پڑیں گی اور یہ تبدیلیاں بہتری کے لیے ہوں گی۔ تب تک تمھیں انتظار اور آرام کرنا پڑے گا۔"

یہ گرانچو کا یک طرفہ فیصلہ تھا جسے بحالتِ مجبوری مجھے قبول کرنا پڑا تھا اور اس کے بعد گرانچو سے میری ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اس دوران میری داڑھی بڑھ گئی تھی مگر میں نے شیو نہیں کیا۔ میری خدمت اور نگرانی کے لیے جو محافظ مقرر کیے گئے تھے وہ زنخوں کے علاوہ وہی بوزنے قسم کے نیم وحشی انسان تھے۔ ان خدمت گاروں میں عورتیں بھی شامل تھیں جو ستر پوشی کے لیے کپڑے کی مختصر دھجیاں استعمال کرتی تھیں۔ یہ کپڑا بھی پے وا، یا ترغون سے بنا ہوا تھا۔ چوں کہ یہ خدمت گار اور نگران نجم شان کی زبان نہیں سمجھتے تھے، اس لیے میں نے ان پر توجہ دینا مناسب نہ سمجھا۔ دوسرے بے لباس زنخوں کو دیکھ کر مجھے گھن آنے لگتی تھی... اور برونگا بھی یاد آ جاتا تھا جو میری وجہ سے مارا گیا تھا۔

جب میں کمرے میں پڑے پڑے اور پڑھتے پڑھتے بور ہو جاتا تو ٹیرس پر آ کر چہل قدمی کرنے لگتا۔

میرا کمرہ چوتھی منزل پر واقع تھا۔

کبھی کبھی میں ٹیرس کے جنگلے سے جھک کر نیچے بھی دیکھ لیا کرتا تھا لیکن نیچے کی منزلوں میں مجھے کبھی کوئی زنخہ یا کوئی دوسرا فرد دکھائی نہیں دیا تھا۔ میرے سامنے یا تو پے وا، کے کھیت تھے یا لق و دق میدان تھا... لیکن روشنی کے باعث میں زیادہ دور تک نہیں دیکھ پاتا تھا۔

آپ سوچتے ہوں گے کہ میں نے وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کیوں نہیں کی اور اس طرح بے دست و پا ہو کر کیوں رہ گیا؟ تو بات دراصل یہ ہے کہ گرانچو نے اس عمارت کے باہر صرف تین فٹ کے فاصلے پر وہی برقی مقناطیسی پردہ آویزاں کر رکھا تھا، جو غیر مرئی تھا لیکن جب کوئی چیز اس سے ٹکراتی تھی تو نیلگوں شعلے کے ساتھ وہ مقناطیسی پردہ ٹکرانے والی شے کو پیچھے دھکیل دیتا تھا۔ اگر یہ غیر مرئی پردہ حائل نہ ہوتا تو میں چوتھی منزل سے تو کیا ساتویں منزل سے بھی فرار ہو چکا ہوتا۔

ایک روز جب میں نے ٹیرس پر ٹہلتے ہوئے، جنگلے سے نیچے جھانکا تو میری نگاہ تیسری منزل کے جنگلے کے ساتھ لگے ہوئے ایک نسوانی پیکرِ حسن پر جم کر رہ گئی۔ میں نے اپنی زندگی میں بے شمار خوبصورت عورتیں دیکھی ہیں لیکن وہ جو جنگلے کے پاس کھڑی اپنے بال سنوار رہی تھی۔ عجیب ملکوتی حسن کی مالک تھی۔ بعض عورتوں کو دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے وہ آگ ہوں۔ انھیں دیکھنے والے اس آگ سے کھیلنے کو تڑپ اٹھتے ہیں لیکن وہ لڑکی اپنے تراشیدہ جسم میں تمام تر حدتیں رکھنے کے باوجود شعلہ کم اور شبنم زیادہ لگتی تھی، نہ جانے اسے کیسے یہ احساس ہو گیا کہ میں اوپر سے دیکھ رہا ہوں۔ اس نے گردن کو ہلکا سا جھٹکا دے کر اوپر دیکھا۔ اس کے گلاب لب ہلکے سے تھرتھرائے، سیاہ آنکھوں پر پلکوں کی جھالر دو تین بار اوپر نیچے ہوئی اور وہ بغیر کچھ بولے بہت کچھ کہہ کر ٹیرس سے اندر چلی گئی۔

وہ تو چلی گئی لیکن میں نہ جانے کب تک وہاں کھڑا دعائیں مانگتا رہا کہ وہ ایک بار پھر باہر آ جائے مگر دعائیں قبولیت کی گھڑیوں میں مستجاب ہوتی ہیں اور وہ گھڑیاں شاید قبولیت کی نہیں تھیں۔

دوسرے روز میرا بیشتر وقت ٹیرس پر گزرا لیکن میری آنکھیں پیاسی ہی رہ گئیں۔

تیسرے روز جب وہ مجھے دکھائی دی تو میں سیدھا کمرے میں آیا اور پلنگ پر بچھی ہوئی چادر پھاڑ کر اس کی پٹیاں بنائیں پھر انھیں کھینچ کر ان کی مضبوطی کا جائزہ لیا اور انھیں ایک دوسری سے باندھ کر ٹیرس پر واپس آ گیا۔ پٹی، جنگلے سے باندھی اور اس کے ساتھ لٹک کر تیسری منزل کے ٹیرس پر پہنچ گیا۔

وہ لڑکی کمرے میں موجود تھی۔ اس نے پلکوں کے پٹ کھول کر ایک نظر مجھے دیکھا اور گھٹنوں کے بل میرے سامنے بیٹھ گئی۔

"کیا تم جانتی ہو کہ میں کون ہوں؟" میں نے پوچھا۔

اس نے سر اٹھائے بغیر جواب دیا: "ہاں میرے آقا، تم ہرموجہ ہو... وہ دیوتا جس کا ہماری کتابوں میں ذکر آیا ہے وہ موعود جس کا لاکھوں غیبروں سے انتظار کیا جا رہا ہے۔"

لڑکی کے منہ سے یہ بات سن کر میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا اور میں سمجھ گیا کہ گرانچو نے اپنا کام شروع کر دیا ہے یہ لڑکی اسی کے ایما پر مجھے نظر آئی تھی اور وہ خود بھی یہی چاہتا تھا کہ میں اس کے پاس آؤں۔ اگر وہ ایسا نہ چاہتا تو اسپائی اسکرین اسے یا نگرانوں کو اسی وقت مداخلت کے لیے مجبور کر دیتیں۔ جب میں چادر پھاڑ کر یہاں آنے کی تیاریاں کر رہا تھا۔

... اور جب جوشِ جذبۂ سرکش کے، طوفانی لمحے گزر گئے تو میں نے اس لڑکی سے پوچھا: "تمھارا نام کیا ہے؟"

"میرا نام ژرولے ہے آقا... میں ان لوگوں کی کنیز ہوں جن سے آپ کی آمد کا وعدہ کیا گیا ہے۔"

میں کتابوں میں، ان کی کنیزوں کے بارے میں پڑھ چکا تھا۔ جبروت میں انھیں ثانوی درجے کی عورتیں شمار کیا جاتا تھا اور یہ بھی، "ان کی طرح جبروت سے باہر نجم شان کے کسی علاقے میں نہیں جا سکتی تھیں۔ میں سوچنے لگا کہ پھر ژرولے یہاں کیسے آ گئی ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ گرانچو نے اپنی مقصد براری کے لیے ژرولے کا تصویری پیکر استعمال کیا ہو... لیکن پھر خیال آیا کہ اگر ژرولے تصویری پیکر ہوتی تو مجھے اس کے وجود اور اس کے لمس کا کبھی احساس نہ ہوتا... ژرولے سچ مچ کی عورت تھی اور ایسی عورت تھی کہ میں اسے کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔ تاہم میں نے اپنے تعجب کی تسکین کے لیے اس سے پوچھا: "اگر تم ان کی کنیز ہو تو جبروت سے یہاں جنوبی صوبۂ خراگ کے اس علاقے میں کیوں اور کیسے آ گئی ہو؟"

"مجھے سزا کے طور پر یہاں بھیجا گیا ہے، آقا!" وہ بولی۔

"کیسی سزا...؟" میں نے پوچھا۔

"وہی سزا جو گناہ گار لڑکیوں کو دی جاتی ہے۔ جبروت میں، میں مردوں کے پنجرے میں چلی گئی تھی... اس لیے میں آپ کے قریب آنے سے گریز کر رہی تھی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ ہرموجہ دیوتا ایک گناہ گار لڑکی کو اپنی محفل سے نوازے لیکن آپ نے میری بات سننا گوارا ہی نہیں کی۔"

"دیوتاؤں کو جو چیز اچھی لگتی ہے، وہ اسے اپنا لیتے ہیں اور کوئی مزاحمت برداشت نہیں کرتے۔" میں نے ژرولے کو جواب دیا۔ "تم مجھے اچھی ہی نہیں، بہت ہی اچھی لگی ہو۔"

عین اسی لمحے مجھے گرانچو کے ہنسنے کی مدھم سی آواز سنائی دی۔ میں نے فوراً پلٹ کر دیکھا۔ کمرے کے کونے میں گرانچو کا تصویری پیکر دھواں بن کر غائب ہو رہا تھا۔ مجھے یہ سوچ کر غصہ آ گیا کہ وہ اس کمرے میں ہونے والی ہر بات اسپائی اسکرین پر دیکھ سکتا تھا۔ اس کے باوجود وہ یہاں تماشا دیکھنے کیوں آ گیا تھا؟

★ ★

میں ژرولے کو اعتماد میں لے کر وہاں سے فرار کا منصوبہ بنانا چاہتا تھا... مگر ہماری ہر حرکت دیکھی اور ہر سرگوشی ریکارڈ کی جاتی تھی اس لیے میں اشاروں کنایوں میں بھی اس سے مطلب کی بات نہیں کر سکا تھا۔ تاہم اس کی خوبصورت آنکھیں جب بھی میری طرف اٹھتی تھیں، مجھے ان میں اپنے لیے بے پناہ پیار اور عقیدت کے ساتھ ساتھ دکھ کے سائے بھی لہراتے نظر آتے تھے۔

کیا وہ چاہتی تھی کہ میں اسے سزا سے بچاؤں؟... اگر وہ خود یہ نہیں چاہتی تھی تو بھی میرا دل مجھ سے یہی تقاضا کیے جا رہا تھا کہ اس پر دکھ کی کبھی ہلکی سی پرچھائیں بھی نہ پڑے۔

ابھی میں ژرولے کے معصوم حسن کا پوری طرح جائزہ نہیں لے پایا تھا کہ چھ انسان نما حیوان سپاہی اور چھ زنخے وہاں پہنچ گئے، اور انھوں نے مجھے اپنے ساتھ چلنے کا حکم دیا۔ میری سمجھ میں نہ آ سکا کہ اگر ژرولے کا قرب میرے لیے قابلِ تعزیر تھا تو مجھے اور اسے اتنی چھوٹ کیوں دی گئی تھی؟

میں چپ چاپ زنخوں اور وحشی سپاہیوں کے نرغے میں ژرولے کے کمرے سے نکل گیا۔

وہ لوگ مجھے سیدھے گرانچو کے کمرے میں لے آئے جہاں وہ میرا منتظر تھا۔ اور آج خلافِ معمول پورے لباس میں تھا۔ اس

نے شفاف، ترشونی لبادہ پہن رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کارتوسوں والی پیٹیوں جیسی دو پیٹیاں بھی تھیں۔ اُس نے ایک پیٹی میری طرف بڑھاتے ہُوئے کہا: "یہ باندھ لو۔"

پیٹی دیتے ہُوئے اُس نے جان بُوجھ کر میرے ہاتھوں کو چھُوا تاکہ مجھے یقین دلا سکے کہ اس وقت اُس کا تصویری پیکر نہیں بلکہ وہ خود مجھ سے مخاطب ہے۔

میں پیٹی کمر میں باندھنے لگا۔

"ہمیں کافی دُور جانا ہے، دیوتا۔" اس نے کہا۔

"کہاں...؟" میں نے پُوچھا۔

"گرگوشس... وہاں ہمیں موسم کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس لیے لبادہ بھی لے لو۔"

گرانچو کی موسم والی بات سے مجھے یاد آگیا کہ خمرشان میں اُنھوں نے موسم کو بے اثر کیا ہُوا تھا اور گرگوشس والوں کو شاید یہ سہولت حاصل نہیں تھی۔ اسی لیے گرانچو نے ایک لبادہ مجھے بھی دے دیا۔

پھر اُس نے ایک دیوار کو چھُوا تو اُس کا ایک حصّہ دروازے کی طرح کھُل گیا۔ وہ مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہُوئے اس دروازے میں داخل ہو گیا۔

یہ ایک تاریک اور تنگ سُرنگ تھی۔ گرانچو نے اپنا ایک ہاتھ بُلند کیا تو ہمارے سروں پر روشنی کا ایک گولا نمودار ہُوا جو ہمارے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ گرانچو میرے آگے آگے تھا۔ ایکا ایکی میرے جی میں آئی کہ اب وہ تصویری پیکر میں نہیں ہے تو کیوں نہ میں اُسے کراٹے کے ایک ہی ہاتھ سے اُس کی گردن توڑ دُوں؟... لیکن میں نے اپنی اس خواہش پر قابو پا لیا کہ ابھی میں اس ماحول اور ملک میں اجنبی تھا۔ جتنا ضرورت مند گرانچو میرے لیے تھا، اتنی ہی مجھے بھی اُس کی ضرورت تھی۔

وہ تیز تیز چلتے ہُوئے بولا: "آج زندگی میں پہلی مرتبہ میں اپنے آپ کو خطرے میں ڈال رہا ہُوں۔ اس لیے تمھیں بے حد محتاط رہنا اور موقع و محل کے اعتبار سے مناسب اقدام کرنا ہو گا۔ یاد رکھو کہ مجھے پیش آنے والا خطرہ تمھارے لیے بھی ہوگا۔ ہم گرگوشس کے بادشاہ فروندا اور اُس کی بیٹی شہزادی راغنی سے ملنے جا رہے ہیں۔ وہ نہ تو مجھے پسند کرتے ہیں اور نہ ہی اُنھیں مجھ پر اعتماد ہے۔ شاہ فروندا اور راغنی، اُن کے دیوتا ہرموجہ پر بھی یقین نہیں رکھتے۔ لیکن میں اُنھیں یہ یقین دلا دُوں گا کہ تم میری اور پشکانیوں کی مدد کر سکتے ہو اور واقعی تم ہمارے لیے مددگار ثابت ہو گے... مگر یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لو کہ پشکانی

شاہ فروندا اور شہزادی سب کے سب بے حد ظالم اور خونخوار لوگ ہیں اور ہر صورتِ حال سے تمھیں خود نمٹنا ہو گا۔"

گرانچو کی اِن باتوں سے مجھے یہی اندازہ ہُوا کہ عام محلاتی سازشوں کی طرح وہ بھی ایک سازش کے ذریعے خمرشان کے موجودہ حکمرانوں کا تختہ اُلٹ کر خود اقتدار پر قابض ہونا چاہتا ہے اور اس مقصد کے لیے مجھے آلۂ کار بنا کر پشکانیوں سے فائدہ اٹھانے کا متمنی ہے۔ مجھے اُس سے زیادہ اپنی فکر تھی۔ اس لیے میں نے کوئی جواب نہ دیا اور چپ چاپ اُس کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔

اچانک مجھے ژروسے کے کمرے میں اُس کے تصویری پیکر کی یاد آگئی۔ میں نے گرانچو سے پُوچھا: "کیا تمھیں یا تمھارے تصویری پیکر کو مجھے ژروسے کے ساتھ دیکھ کر لُطف آیا تھا گرانچو...؟"

"میں کسی لُطف کے لیے وہ تماشا نہیں دیکھ رہا تھا، ہرموجہ" وہ بڑی سنجیدگی سے بولا۔ "بلکہ میں وہ تماشا اپنے علم میں اضافے کی خاطر دیکھ رہا تھا۔ بوتلوں کی کوکھ سے جنم لینے والے خواجہ سراؤں کو ایسے جذبات سے محروم کر دیا جاتا ہے مگر میرا معاملہ دُوسرا ہے۔ میری تخلیق کے دوران اُن سے کوئی بھول چُوک ہو گئی تھی۔ اس لیے اُنھوں نے میری ذہنی استعداد چودھویں درجے کی مقرر کی ہے حالاں کہ وہ اس درجے سے بہت بُلند ہے۔ دوسرے وہ لوگ میرے اندر سے ایسے جذبات بھی یکسر خارج نہیں کر سکے جو عام مردوں اور عورتوں میں پائے جاتے ہیں۔ مگر خواجہ سراؤں کو ان سے محروم کر دیا جاتا ہے۔"

گرانچو کی اس بات سے میں سمجھ گیا کہ اُس نے مجھے ژروسے کے ساتھ ملاقات کا موقع کیوں دیا تھا۔

"تم ژروسے سے کہہ رہے تھے کہ وہ تمھیں بہت اچھی لگتی ہے۔ کیا تم نے سچ کہا تھا؟" گرانچو نے سوال کیا۔

"ہاں... وہ بلا کی حسین عورت ہے اور واقعی مجھے بہت اچھی لگی ہے۔" میں نے اعتراف کیا۔

"تب تو تم چاہو گے کہ اُسے وہ سزا نہ دی جائے جس کے لیے وہ میرے پاس بھیجی گئی ہے؟"

"ہاں... اگر میں اُسے بچا سکا تو ضرور بچاؤں گا... مگر وہ سزا کیا ہے؟" میں نے پُوچھا۔

"وہ اُن وحشیوں کے حوالے کر دی جائے گی جنھیں تم کھیتوں میں کام کرتے دیکھ چکے ہو۔ جب تک وہ زندہ رہے گی، وحشی اُسے جھنجھوڑتے رہیں گے اور وہ مر جائے گی تو اُسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے گرگوشس کے میدان میں پھینک دیا

جائے گا۔"

گرانچو نے مزے لے لے کر سزا کی تفصیل بتائی تو... مجھے جھرجھری آگئی۔

"نہیں... میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گا۔"

"یہ تمہارے بس کی بات نہیں ہرموجہ... البتہ اگر میں ...خواجہ سراؤں کا نیم مرد چاہوں تو وہ اس سزا سے بچ سکتی ہے۔ لیکن میں ایسا اُسی صورت میں چاہ سکتا ہوں، جب تم میرے تابع فرماں رہو اور میرے خلاف کبھی کوئی اقدام نہ کرو میں نے اُسے ایک خفیہ مقام پر منتقل کر دیا ہے جہاں اُس کی کڑی نگرانی کی جا رہی ہے۔ اگر تم نے میرے کسی حکم کی تعمیل نہ کی تو اُس کے ساتھ بے انتہا ظالمانہ سلوک کیا جائے گا۔"

یہ کہہ کر اُس نے قہقہہ لگایا۔

"میں اُن جذبات سے بھی آگاہ ہوں جنھیں پرانی کتابوں میں محبت یا چاہت کا نام دیا گیا۔" اس نے اپنی دانست میں انکشاف کیا۔

میں گرانچو کی ان باتوں پر تلملا کر رہ گیا۔ اب آہستہ آہستہ اُس کی عیاری مجھ پر کھلتی جا رہی تھی۔ اُس نے اپنے علم میں اضافے کے لیے نہیں بلکہ مجھے ژردلے کی محبت میں مبتلا کرنے کے لیے اُس سے ملاقات کا موقع دیا تھا... اور وہ میری اس کمزوری سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔

میں نے اُسے کوئی جواب نہ دیا اور اپنے غصّے پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا۔

کچھ دُور جا کر سُرنگ چوڑی ہونے لگی اور ہمارے سروں پر تھرکتا ہوا روشنی کا گولا، ایک مقام پر ٹھہر گیا جس کے نیچے فرش میں ایک بڑا گول سوراخ دکھائی دے رہا تھا۔ یہ کسی دوسری سُرنگ کا دہانہ تھا... وہاں چار حیوان نما آدمی، سپاہیوں کی وردی میں موجود تھے۔ اُنھوں نے تلوار کے ساتھ ساتھ ویسی ہی بندوقیں بھی کندھوں سے لٹکا رکھی تھیں جیسی کہ میں اُس کمرے میں دیکھ چکا تھا، جہاں سے میں نے پہلی مرتبہ وردی اور تلوار حاصل کی تھی اور جہاں گرانچو نے گول چبوترے پر بردونگا کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ یہ عجیب سی بندوقیں بارود سے نہیں بلکہ ہَوا کے دباؤ سے گولی چلاتی تھیں۔

گرانچو نے وحشیوں کی زبان میں، اُن سے کچھ کہا تو اُنھوں نے سر جھکایا، عجیب سی نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور سوراخ سے ہٹ گئے۔ گرانچو نے کارتوسوں والی پیٹی کا ڈائل گھمایا۔

اور مجھے بھی اپنی تقلید کرنے کی ہدایت دی۔

جونہی میں نے ڈائل گھمایا، اُس کے کارتوسوں جیسے خالی خانوں سے ہَوا گزرنے لگی اور مجھے ایسا محسوس ہُوا جیسے کششِ ثقل کم ہوتی جا رہی ہو۔ میں دل ہی دل میں خمرشان کے سائنس دانوں کو اس ایجاد پر داد دینے لگا۔

گرانچو اُس سوراخ میں کُودا اور مجھے بھی اشارہ کیا کہ کُود جاؤ۔ کودنے کے ساتھ ہی پیٹی کے سوراخوں سے خارج ہونے والی ہَوا کی رفتار بڑھ گئی اور ہم ہَوا میں تیرتے ہوئے گہرائی میں جانے لگے۔

"مجھے یقین ہے کہ تم ویسا ہی کرو گے جیسا کہ میں نے سمجھایا ہے۔ تمھاری اپنی بقا اسی میں ہے۔" اس نے تنبیہہ کی۔

وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔

اگر واقعی مجھے اپنی بقا کا خیال نہ ہوتا تو میں اِس اندھیری سُرنگ میں گرانچو کا کام تمام کر دیتا مگر مشکل یہ تھی کہ مجھے پیش آنے والے حالات اور اُس نئی سرزمین گرگوش کے بارے میں مجھے کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ اس لیے میں خاموشی سے ہَوا میں تیرتا چلا گیا۔

جب ہمارے پاؤں زمین پر ٹکے اور میں نے اِدھر اُدھر دیکھا تو پتہ چلا کہ ہم ایک غار میں ہی کھڑے ہیں۔ گرانچو نے ڈائل گھما کر پیٹی اُتار لی۔ میں نے بھی اُس کی تقلید کی... پھر ہم دونوں غار کے تنگ دہانے سے نکل آئے۔

"جیسا کہ تم نے مجھے اپنی سرزمین کے بارے میں بتایا ہے یہ سرزمینِ گرگوش بھی اُس سے ملتی جُلتی ہے... مگر اس کے باشندے... بڑے خوں خوار اور ظالم ہیں۔"

میں نے گرانچو کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی کیوں کہ میں اس نئے ماحول کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔ اس وقت ہر طرف گہرا اندھیرا چھایا ہُوا تھا، بارش ہو رہی تھی... اور سائیں سائیں کرتی تیز ہَوائیں چل رہی تھیں۔ فضا میں کافی خنکی تھی۔ شاید اسی لیے روانگی سے پہلے گرانچو نے خود بھی لبادہ اوڑھ لیا تھا اور مجھے بھی اوڑھ لینے کو کہا تھا۔

وہ اس گھُپ اندھیرے میں بڑی آسانی سے پتھریلے راستے پر چل رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے یہ راستہ اُس کا دیکھا بھالا ہو۔

ایک چٹان کا موڑ مُڑنے کے بعد ہم رُک گئے۔

کچھ فاصلے پر ایک الاؤ روشن تھا جس کے ارد گرد

کچھ لوگ بیٹھے تھے۔

گرانچو اور اُس کے پیچھے میں اُسی الاؤ کی طرف بڑھنے لگا۔ قریب جانے پر پتہ چلا کہ یہ الاؤ ایک غار میں روشن کیا گیا تھا۔ بارش اور ہَوا کے شور کی وجہ سے الاؤ کے گرد بیٹھے ہوئے آدمیوں کو ہماری آمد کا پتہ نہ چل سکا۔ میں نے غور سے اُن کی طرف دیکھا۔ وہ میرے ہی جیسے انسان تھے لیکن اُن کے نین نقش اور سر منگولوں سے ملتے جُلتے تھے۔ اُنھوں نے جانوروں کی کھال کے لباس پہن رکھے تھے۔ سب کے پاس تلواریں تھیں۔ اُن کے قریب ہی بھالے بھی موجود تھے۔ ان میں سے ایک نے اپنے کندھے پر ترکش اور کمان بھی لٹکا رکھی تھی۔ وہ گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے بھون کر وحشیوں کی طرح کھا رہے تھے۔ کبھی کبھی وہ اُس کتّے کی طرف بھی ہڈی اُچھال دیتے تھے جو اُن کے قریب بیٹھا تھا۔

یکایک کتّے نے کان کھڑے کیے اور پلٹ کر بھونکنے لگا۔ شاید اُسے ہماری آمد کا پتہ چل گیا تھا۔

"جب تک میں تمھیں نہ بلا دوں یہیں رُکے رہنا..."

یہ کہہ کر گرانچو غار کے اندر چلا گیا۔

الاؤ کے گرد براجمان آدمی چوکنا ہو گئے۔ سب نے تلواروں کے دستے پر ہاتھ رکھ لیے کچھ کھڑے بھی ہو گئے۔ تیر کمان والے نے جلدی سے ایک تیر چلّے پر چڑھا لیا۔

گرانچو نے اپنا دایاں ہاتھ بلند کرتے ہوئے کہا۔ "گھبراؤ نہیں دوستو۔ میں خمرشان کے زنخوں کا نیم مرد ہوں اور تم مجھے پہچانتے ہو میں یہاں اس وقت شاہ فرزندا سے ملنے آیا ہوں۔ میرے ساتھ ایک اور آدمی بھی ہے۔ وہ بھی شاہ فرزندا کا مہمان ہے اور تم اس کے ساتھ احترام سے پیش آؤ گے۔"

"وہ کون ہے اور کہاں ہے؟" اُن میں سے ایک لحیم شحیم آدمی نے پوچھا۔

گرانچو نے بآوازِ بلند مجھے پکارا۔ "اندر آ جاؤ ہرموجہ۔"

میں غار میں داخل ہُوا تو اُن سب کی نگاہیں مجھ پر جم گئیں۔ وہ میرے قد و قامت اور جسمانی ساخت سے مرعوب دکھائی دیتے تھے۔ پھر وہ آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے۔

کچھ دیر بعد اُن کا لحیم شحیم سردار گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور اپنی تلوار پیشانی سے چھوتے ہوئے بولا۔ "ہم تمھارے حکم کی تعمیل کریں گے، دیوتا۔"

مجھے حیرت ہُوئی کہ اس قدر سائنسی ترقی کے باوجود یہاں اتنی جہالت بھی موجود ہے۔ میں نے اُس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "اُٹھو... تم میرے دوست ہو اور ہمیشہ میرے دوست رہو گے۔"

"اب دیر مت کرو، ہمیں شاہ فرزندا کے پاس لے چلو، وہ ہمارا منتظر ہوگا۔"

یہ سُنتے ہی اس گروہ کے سردار نے ایک مشعل اُٹھائی اور ہمارے آگے آگے چلنے لگا۔ اُس کے ساتھی وہیں رہ گئے۔ وہ ہماری رہبری کرتا ہُوا ایک تنگ درّے سے گزرا۔

ہَوا تیز تھی اور بارش بھی جاری تھی۔ میرا خیال تھا کہ مشعل بجھ جائے گی مگر نہ ہَوا اُسے گُل کر سکی اور نہ ہی بارش کا کوئی اثر ہوا کچھ دُور جانے کے بعد مجھے ایک انبوہِ کثیر کی ہلکی ہلکی آوازیں سُنائی دینے لگیں۔

بالآخر ہم ایک بہت بڑی غار کے دہانے کے قریب پہنچ گئے جس کے اندر سینکڑوں مشعلیں جل رہی تھیں اور ہزاروں لوگ ناؤ نوش میں مصروف تھے۔ ان کی سرمستیوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کوئی جشن منا رہے ہیں۔

میرے اس خیال کی تصدیق ہمارے رہبر نے کر دی۔

"آج ہم خونی میلہ منا رہے ہیں اور ایک روز جبروت میں بھی اسی طرح منائیں گے۔"

"بے شک۔" گرانچو بولا۔ "وہ وقت آ گیا ہے اور میں جبروت میں تمھیں فراموش نہیں کروں گا... جاؤ شاہ فرزندا کو ہماری آمد کی اطلاع کرو۔"

جب ہمارا رہبر غار میں چلا گیا تو گرانچو نے مجھ سے کہا۔ "تم نے اپنا کردار بڑی عمدگی سے ادا کیا ہے۔ کیا تم اپنی سرزمین پر بادشاہ تھے؟"

"نہیں... میں جس سرزمین سے آیا ہوں، وہاں بادشاہت دم توڑ رہی ہے۔" میں نے اُسے جواب دیا اور اندر سے آنے والی آوازیں سُن کر پوچھا۔ "کیا یہ لوگ شراب پی رہے ہیں؟"

"چیز تو وہی ہے مگر یہ لوگ اُسے دامو کہتے ہیں۔ جیسا کہ میں تمھیں بتا چکا ہوں، یہ پشکانی بڑے ظالم اور وحشی ہوتے ہیں اور ہمارے چاروں اور خطرہ ہی خطرہ ہے۔ تمھیں وہی کرنا ہے جو میں بتا چکا ہوں ورنہ ہم بُری طرح مارے جائیں گے۔"

اتنے میں ہمارے رہبر نے ہمیں اندر آنے کا اشارہ کیا۔

ہم غار میں داخل ہوئے تو میں یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ وہ یونان کے قدیم اکھاڑے سے مطابقت رکھتا تھا۔ چاروں طرف

چٹانیں کاٹ کر دائرے میں نشستیں بنائی گئی تھیں جن پر ہزاروں بدمست پشکانی شراب سے دل بہلا رہے تھے۔ کوئی نشے کی ترنگ میں نعرے لگا رہا تھا تو کوئی گا رہا تھا۔

ہر طرف وحشیانہ قہقہے بکھر رہے تھے۔

پہلے تو اُنھوں نے ہماری طرف توجہ ہی نہ دی مگر جوں جوں ہم آگے بڑھتے رہے، شور و غوغا کم ہوتا گیا اور نشے میں دھت پشکانیوں کی نگاہیں ہم پر مرتکز ہوتی چلی گئیں۔

گرانچو نے سرگوشی میں کہا: "وہ جو درمیان میں قربان گاہ بنی ہوئی ہے، اُس کے قریب جا کر احتراماً سر جھکا دو مگر اُس پر رکھی ہوئی تلوار کو مت چھونا۔"

میں نے قدیم سپہ سالاروں کی طرح اپنا سینہ تان لیا، سر بلند رکھا اور بڑی باوقار چال سے قربان گاہ کی طرف بڑھا جو دس فٹ لمبی اور تقریباً سات فٹ اُونچی تھی اور اُس پر ایک بڑی اور وزنی خون آلود تلوار رکھی ہوئی تھی۔

قربان گاہ کے قریب پہنچ کر مجھے یُوں محسوس ہُوا جیسے میرے قدموں کے نیچے ریت بچھی ہُوئی ہو... پھر میرا پیر کسی چیز سے ٹکرایا تو وہ لڑھکتی ہُوئی دُور جا گری۔

میں نے اس طرف دیکھا تو مجھے جھرجھری آ گئی۔

یہ کسی پشکانی کا کٹا ہُوا سر تھا۔

وہیں دو بے کفن لاشیں بھی پڑی تھیں۔ دوسری لاش کا سر بھی غائب تھا اور ریت پر خون کے لوتھڑے جم گئے تھے۔

اب غار میں مکمل خاموشی چھا گئی تھی۔

میں اُسی طرح باوقار انداز میں قربان گاہ کے قریب تر پہنچ گیا۔ میری نگاہ ایک بار پھر اُس کے دستے پر بیش قیمت ہیرے جواہرات جڑے ہُوئے تھے۔ گرانچو نے مجھے بتایا تھا کہ وہ دو دھاری تلوار اتنی وزنی ہے کہ کوئی پشکانی اُسے ایک ہاتھ سے نہ تو اُٹھا سکتا ہے اور نہ ہی چلا سکتا ہے۔

قربان گاہ کے اگلے حصّے سے تقریباً پچاس فٹ دُور پتھر سے تراشے ہُوئے دو تخت بھی رکھے ہُوئے تھے جن پر شاہ فروندا اور اُس کی بیٹی شہزادی راشی براجمان تھی۔ میں نے بلا جھجک ایک نظر اُن کی طرف دیکھا، پھر گھٹنوں کے بل جھک کر ماتھا قربان گاہ پر ٹکاتے ہُوئے دونوں ہاتھ یُوں پھیلا دیے جیسے کوئی دیوتا آشیرواد دے رہا ہو۔

میرے اس عمل کے ساتھ پشکانیوں نے فلک شگاف نعرے لگانے شروع کر دیے۔

میں نے کن انکھیوں سے دیکھا کہ گرانچو نے بھی میری طرح قربان گاہ کو تعظیم دی ہے... پھر ہم دونوں اُٹھ کھڑے ہُوئے اور میں گرانچو کی ہدایت کے مطابق تخت کی طرف بڑھنے لگے۔

"میں شاہ فروندا اور شہزادی راشی کے سامنے اپنا سر خم کروں گا... مگر تم ایسا نہیں کرو گے۔ ہر موجہ کسی کے سامنے سر خم نہیں کرتا۔ وہ دیوتا ہے۔ تم اُس وقت تک بات بھی نہیں کرو گے جب تک تم سے بات نہ کی جائے۔ اور ہاں غیر متوقع حالات سے نمٹنے کے لیے بھی تیار رہنا۔" گرانچو نے سرگوشی میں کہا۔

ہم تخت کے قریب پہنچ کر رُک گئے۔

گرانچو نے ایک گھٹنے کے بل جُھک کر شاہ فروندا اور شہزادی کے سامنے سر خم کرتے ہُوئے کہا: "نیم مرد گرانچو شاہ اور شہزادی کی خدمت میں کورنش بجا لاتا ہے اور ہر موجہ کو متعارف کراتا ہے جو خمر شانیوں کا موعود ہے۔ جس کی آمد کا وہ مدت سے انتظار کر رہے ہیں۔"

شاہ فروندا جو بے حد لحیم شحیم تھا، اپنی چھوٹی چھوٹی... مگر انگاروں کی طرح سُرخ آنکھوں سے مجھے گھورنے لگا۔ شہزادی راشی کی بادامی آنکھیں تو پہلے ہی سے مجھ پر جم کر رہ گئی تھیں۔ وہ بار بار اپنے یاقوت رنگ ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی جب کہ فروندا کی آنکھیں میرے ذہن کو پڑھنے میں مصروف تھیں۔

میں نے بھی اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

غار میں بیٹھے ہُوئے پشکانی ایک دم خاموش ہو گئے۔ وہ اپنے بادشاہ کی بات سُننے کے لیے ہمہ تن گوش تھے۔

"تم کہتے ہو کہ یہ خمر شانیوں کا موعود دیوتا ہے۔ یہ اگرچہ دیوتا ہی نظر آتا ہے مگر میں اُس وقت تک اسے دیوتا تسلیم نہیں کر سکتا جب تک تم اور یہ خود اپنے دیوتا ہونے کا کوئی ثبوت نہ دے دے۔" شاہ فروندا نے گرانچو کو گھورتے ہُوئے کہا۔

گرانچو نے مُسکراتے ہُوئے جواب دیا: "آپ بجا فرماتے ہیں شہنشاہ۔ وقت آنے پر آپ کو ثبوت بھی مِل جائے گا۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اگر آپ اسے دیوتا تسلیم کریں گے تو خمر شانی بھی اپنے آپ اسے دیوتا مان لیں گے اور ان کی پہلی شکست یہ ہو گی کہ اُن کا موعود دیوتا، جس کا ذکر اُن کی مقدس کتابوں میں آیا ہے، خمر شانیوں کے پاس نہیں بلکہ پشکانیوں کے پاس آیا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہو گا کہ دیوتا خمر شانیوں کو پسند نہیں کرتا اور پشکانیوں کو عزیز سمجھتا ہے، لہٰذا خمر شان پر پشکانیوں کی حکومت ہونا چاہیے۔ اس طرح خمر شانیوں کی مقدس کتابوں

والی پیش گوئی بھی غلط ثابت ہو گی... پھر یہ آپ کو جبروت لے جائے گا جہاں اس وقت آپ کو حکمراں ہونا چاہیے تھا۔ اس لیے میری درخواست ہے کہ مجھ پر اعتماد کرتے ہُوئے میرے منصوبے پر عمل کیا جائے تو پشکانیوں کو اپنا کھویا ہوا اقتدار دوبارہ مل سکتا ہے۔"

شاہ فروندا، گرانچو کے اس جواب پر غور کرتا رہا جب کہ شہزادی راشی اس دوران مجھ پر نگاہوں ہی نگاہوں میں "گفتگو" کرتی رہی۔ ہمارے درمیان مسکراہٹوں کے تبادلے نے مجھے بہت کچھ بتا دیا تھا اور میں اپنی جگہ مطمئن ہو گیا تھا کہ اتنے میں شاہ فروندا نے اپنی موٹی گردن راشی کی طرف گھمائی اور بولا: "تمھارا کیا خیال ہے، شہزادی؟"

راشی باپ کے اس اچانک تخاطب پر چونک سی گئی...

پھر اُس نے اپنا مُنہ شاہ فروندا کے کان کے قریب لے جا کر سرگوشی میں کچھ کہا تو شاہ نے میری طرف دیکھا اور بولا: "تم جو کوئی بھی ہو، راشی تمھیں پسند کرتی ہے۔ میں نے تمھارے بارے میں اس نکتۂ نظر سے نہیں سوچا تھا۔ شہزادی کی پسندیدگی نے میری سوچ کی راہیں بدل دی ہیں۔ کیا تمھیں شہزادی کے اس فیصلے پر کوئی اعتراض ہے؟"

میں، جو اَب تک شہزادی کے حُسن و شباب سے بُری طرح متاثر ہو چکا تھا کہے بغیر نہ رہ سکا: "میں... ہر موجہ دیوتا، شہزادی کے فیصلے کو بنظرِ پسندیدگی دیکھتا ہُوں۔"

یہ سُن کر شاہ کے مُنہ سے بے ساختہ ایک ٹھنڈی سانس نکل گئی۔ اُس نے افسوس کے لہجے میں کہا: "پھر تو میں تمھاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ تمھیں اپنی زندگی کی حفاظت خود ہی کرنا پڑے گی۔ اگر تم نے مقابلہ جیت لیا تو شہزادی تمھاری ہو گی۔"

میں ایک لمحے کے لیے بھونچکا رہ گیا۔

میرا خیال تھا کہ راشی کی پسندیدگی سے سارا مسئلہ حل ہو جائے گا مگر شاہ کی بات سے پتہ چلا کہ مجھے کسی سے مقابلہ کرنا پڑے گا اور پھر قربان گاہ کے قریب پڑی سر بریدہ لاشوں سے ساری بات میری سمجھ میں آ گئی۔

میں نے گرانچو کی طرف دیکھا۔

اُس کی آنکھوں میں مایوسی اور تاسف کے سائے لہرا رہے تھے اور اب بقول اُس کے، مجھے حالات سے خود ہی نمٹنا تھا۔

یکایک شہزادی راشی نے تالی بجائی تو ایک نوجوان پشکانی سامنے آ گیا۔ وہ قامت میں اپنے قبیلے کے دُوسرے نوجوانوں سے کہیں زیادہ بلند اور تنومند تھا۔ اُس نے کھال کا مختصر سا لباس اُتارا تو مجھے یُوں محسوس ہُوا کہ اُس کا جسم فولاد کا بنا ہُوا ہو۔ اُس کے ایک ایک عضو کی مچھلیاں تڑپ تڑپ کر مجھے یاد دلا رہی تھیں کہ تن سازی میں وہ مجھ سے کچھ آگے ہی کی چیز ہے۔

وہ شہزادی راشی کی طرف بڑھا اور آہستہ سے کچھ بولا... مگر راشی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اُس نے "دامو" کا پیالہ اُٹھایا اور پشکانی کے چہرے پر انڈیل دیا۔

شاہ فروندا یہ دیکھ کر بُری طرح ہنسنے لگا

شہزادی تخت سے اُٹھ کھڑی ہُوئی اور میری طرف آنے لگی۔

"خبردار، اُسے غصہ مت دلانا۔ گرگوشس کی اصل حکمراں راشی ہی ہے۔ یہ جو چاہتی ہے، وہی ہوتا ہے۔" گرانچو نے سرگوشی کی۔

میں نے شہزادی کی طرف دیکھا، وہ سانپ کی طرح لہراتی ہُوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ اُس کے دہکتے چمکتے سراپا نے میرے خُون کی گردش بڑھا دی۔ بلاشبہ وہ ناقابلِ فہم حُسن کی مالک تھی۔

وہ میرے سامنے آ کر رُک گئی۔

اُس کا قد مجھ سے چھوٹا تھا اس لیے پنجوں کے بل کھڑی ہو کر میری آنکھوں میں جھانکتے ہُوئے بولی: "تم ہر موجہ ہو یا نہیں... مگر میں تمھیں دیوتا سمجھتی ہُوں۔ اور اپنا دل ہار کر تمھیں جیتنا چاہتی ہوں، اس لیے یہ مقابلہ تمھیں جیتنا پڑے گا تاکہ وہ میری جیت بن جائے۔ غوطار سے میرا دل بھر گیا ہے، تمھیں میری خاطر اُسے شکست دینا پڑے گی۔"

اُس کی باتوں نے میرے جسم میں چنگاریاں سی بھر دیں۔

"دیوتا ہمیشہ فتح یاب ہوتے ہیں، شہزادی۔" میں نے پُر وقار لہجے میں کہا۔

اتنے میں شاہ کی بھاری بھرکم آواز سُنائی دی۔ وہ ہتھیار لانے کا حکم دے رہا تھا۔

شہزادی دوبارہ اپنے تخت کی طرف چلی گئی۔ میں نے مجمعے پر نظر ڈالی۔ سب پینا پلانا بھول کر موت اور زندگی کے کھیل کا انجام دیکھنے کو بے تاب ہو رہے تھے۔ مجمعے کی اکثریت غوطار غوطار کے نعرے لگا رہی تھی۔ کبھی کبھی کوئی آوازہ بلند اُس کا جوش ان الفاظ سے بھی بڑھا دیتا تھا...

"تمھارا تیسرا شکار آ گیا ہے، غوطار۔"

"اس کا سر بھی اُڑا دو غوطار۔"

میں نے گرانچو کی طرف دیکھا۔

وہ تخت کے ایک جانب ہاتھ باندھے چُپ چاپ کھڑا تھا۔ مجھے اُس کی بات یاد آ گئی کہ غیر متوقع حالات کا سامنا مجھے

خود ہی کرنا پڑے گا اور اب وہ غیر متوقع حالات سامنے آ گئے تھے۔

یکایک شاہ فروندا نے ہاتھ بلند کیا تو ہر طرف خاموشی چھا گئی۔

"یہ مقابلہ بہت سی باتوں کے لیے فیصلہ کن ثابت ہوگا۔ ہمیں نیم مرد گرانچو کی سچائی کا بھی پتہ چل جائے گا۔ اگر تم واقعی ہرموجہ ہو تو غوطار کو ختم کر دو گے ورنہ وہ تمہارا سر اڑائے بغیر نہیں رہے گا۔ وہ ہم پشکانیوں میں میرے بعد سب سے زیادہ طاقتور، جنگجو اور بہادر ہے... اُدھر دیکھو۔" شاہ فروندا نے مجھ سے کہا اور اُس نے سربریدہ لاشوں کی طرف اشارہ کر دیا۔

"ان لوگوں نے غوطار کو للکارا تھا، اور یہ ان کا حق تھا کیوں کہ آج ہمارا خونی میلہ منایا جا رہا ہے۔ ان میں سے جو بھی غوطار کو قتل کر دیتا، رانی کو جیت لیتا۔ اگرچہ تم نے مقابلے سے پہلے ہی رانی کا دل جیت لیا ہے مگر ہمارے رواج کے مطابق تمہیں غوطار سے مقابلہ کرنا پڑے گا۔ اب اپنے لیے ہتھیار چن لو۔"

میں نے ہتھیاروں کی طرف دیکھا... مگر مجھے اُن میں سے کوئی ہتھیار پسند نہ آیا۔ میں نے اپنی تلوار نیام سے نکالتے ہوئے کہا۔ "بس مجھے ایک ڈھال کی ضرورت ہے۔ اور کچھ بھی نہیں چاہیے۔"
یہ کہتے ہوئے گرانچو پر بھی ایک نگاہ ڈالی۔

اُس کا چہرہ دُھواں دُھواں ہو رہا تھا۔ یُوں لگتا تھا جیسے اُس کے سارے ہی خواب بکھر کر رہ گئے ہوں۔

اچانک غوطار نے ایک نعرہ لگایا اور مجھے ٹھوکر لگانے کے لیے اُچھلا۔ میں بروقت جھکائی دے کر ہٹ گیا۔ غوطار مُنہ کے بل گر گیا... لیکن اس نے چیتے کی سی پھرتی سے پلٹ کر حملہ کرنا ہی چاہا تھا کہ شاہ فروندا کی غضب ناک آواز گونج اُٹھی۔

"رک جاؤ غوطار، جب تک میں حکم نہ دوں، تم مقابلہ شروع نہیں کر سکتے۔"

غوطار یہ سن کر اپنے دوستوں میں چلا گیا جو نعرے لگا کر اس کی ہمت بڑھا رہے تھے۔

شاہ فروندا نے مجھ سے کہا۔ "تمہیں غوطار کی طرح صرف ایک لنگوٹ میں لڑنا ہوگا۔ اور ہاں۔ کیا تم واقعی اس چھوٹی سی تلوار سے لڑو گے؟ یاد رکھو، مقابلے میں ڈھال استعمال کرنے کی اجازت نہیں اس لیے تمہیں ڈھال فراہم نہیں کی جا سکتی۔"

"اُسے ڈھال استعمال کرنے کی اجازت دے دی جائے۔" غوطار چلایا۔ "اور مجھے تیر کمان کی، اس طرح مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

فروندا نے مجھ سے پُوچھا۔ "بولو کیا چاہتے ہو؟"

"مجھے منظور ہے۔" میں نے جواب دیا۔

کچھ دیر بعد ہم دونوں لنگوٹ باندھے سینکڑوں کے مجمعے میں کھڑے تھے۔

مجمع غوطار کا طرف دار تھا۔

غوطار کے پاس میری تلوار کے مقابلے میں بڑی تلوار تھی۔ اور تیر کمان بھی جب کہ میرے پاس چھوٹی تلوار اور چھوٹی سی ڈھال کے سوا کچھ نہیں تھا۔ مجھے غوطار کے تیروں کا مقابلہ نفسیاتی تیروں سے کرنا تھا۔

"تم لڑنے کے لیے تیار ہو یا پہلے رونا دھونا اور گناہ بخشوانے کے لیے دُعا مانگنا چاہتے ہو؟" میں نے پہلا زبانی تیر چلایا۔

غوطار نے میری بات کا جواب نہیں دیا اور ایک جال اُٹھا کر کندھے پر ڈال لیا۔

شاہ فروندا نے مجھ سے کہا۔ "تم بھی ایک جال لے سکتے ہو۔"

"میرے لیے بس یہ تلوار اور ڈھال ہی کافی ہے۔ میں غوطار کی طرح بزدل نہیں ہُوں۔" میں نے دوسرا نفسیاتی تیر چھوڑا لیکن وہ میرے اس داؤ میں بھی نہیں آیا۔

اُس نے جال بائیں ہاتھ میں لے کر جھلانا شروع کر دیا۔

اُس کے دائیں ہاتھ میں تلوار تھی اور ایک کندھے سے کمان ترکش لٹک رہے تھے۔ وہ مجھے خُوں خوار نگاہوں سے دیکھتے ہُوئے قربان گاہ کی طرف بڑھ گیا۔

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ ایک منجھا ہُوا جنگجو اور لڑاکا تھا قربان گاہ کی طرف بڑھنے کا مطلب یہ تھا کہ وہ عقب سے محفوظ رہے اور اگر میں اس پر زوردار حملہ کروں تو وہ غچہ دے کر سامنے سے ہٹ جائے اور میں اپنی جھونک میں قربان گاہ کی چٹان سے جا ٹکراؤں اور اس سے پہلے کہ سنبھل سکوں، وہ میری گردن اُڑا دے۔

اُس کی یہ چال سمجھ کر میں جان گیا کہ میرا مقابلہ کسی معمولی حریف سے نہیں بلکہ ایک ایسے تجربہ کار جنگجو سے ہے جو مجھ پر غالب آ سکتا ہے... اور اس خیال سے ہی مجھے جھرجھری آ گئی... مگر میرے لیے بھی یہ موت و زیست کا پہلا خونچکاں کھیل نہیں تھا۔

میں ایک ہاتھ میں تلوار اور دُوسرے میں ڈھال لیے آہستہ آہستہ اس کی دائیں جانب بڑھنے لگا تا کہ جال کی لپیٹ میں نہ آ سکوں جسے وہ بائیں ہاتھ سے اُوپر نیچے گھما رہا تھا۔

غوطار آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگا۔

وہ بھی اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ کہیں میں جال کی جھپٹ میں آنے سے پہلے ہی تلوار کی نوک اُس کے دل میں نہ اُتار دوں۔ چنانچہ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتے ہوئے وہ ایک دم برق رفتاری سے گھوما اور اُس کے جال نے میرا سر اور تلوار والا کندھا اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

ایک لمحے کے لیے مجھے یُوں محسوس ہُوا جیسے میں بے دست و پا ہو کر رہ گیا ہُوں اور ابھی اُس کی تلوار میرے سینے میں اُتر جائے گی۔

میں نے ڈھال سامنے کر دی مگر وہ بڑا کائیاں نکلا اور اُس نے تلوار گھونپنے کی بجائے میرے سر پر ضرب لگانا چاہی لیکن اُس وقت تک میری ڈھال بلند ہو چکی تھی اور میں نے سر جھکا کر اس کے چہرے پر ٹکر مار دی تھی۔

میری یہ چال اور حملہ غوطار کے لیے بالکل غیر متوقع تھا۔ وہ بُری طرح لڑکھڑا کر گرا اور میں جال کی لپیٹ سے آزاد ہو گیا۔

اب جال میرے پاس تھا اور غوطار گھٹنوں کے بل اُٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے جال اُس پر پھینکا مگر... وہ لڑھکنیاں کھاتا ہُوا ہٹ گیا۔ اس سے پہلے کہ میں تلوار سے اُس پر وار کرتا، وہ اُٹھ چکا تھا اور ہماری تلواریں آپس میں ٹکرا گئی تھیں اَب مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اُسے طاقت کے بل بوتے پر نہیں بلکہ عسکری حکمت عملی سے ہی شکست دی جا سکتی ہے۔ کیوں کہ طاقت اور پھُرتی میں وہ مجھ سے کم نہیں تھا۔

ہر چند کہ میں ایک ماہر شمشیر زن تھا مگر غوطار بھی اس فن سے پُوری طرح آشنا تھا۔ اُس کے ہر وار سے میری ڈھال کا ٹکڑا اُڑ جاتا تھا اور وہ چھوٹی ہوتی چلی جا رہی تھی میں اُسے یہ موقع اس لیے دے رہا تھا کہ وہ تھک جائے مگر وہ اُسی طرح تازہ دَم رہا۔

وہ حملہ کر کے برق رفتاری سے پیچھے ہٹ جاتا تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس نے ترکش سے ایک تیر نکال کر اپنے دانتوں میں دبا لیا مگر میں نے اُسے کندھے سے کمان اُتارنے کا موقع نہ دیا۔ اگر وہ کمان اُتار لیتا تو میری موت یقینی تھی۔

مجمع بار بار "مار دو غوطار... سر اُڑا دو غوطار" کے نعرے لگا کر اس کی ہمت بڑھا رہا تھا اور مجھے راشی، شاہ فرونداً یا گرانچو کا ردِ عمل دیکھنے کی مہلت بھی نہیں مل رہی تھی۔

میں نے غوطار کو کندھے سے کمان اُتارنے کا موقع نہیں دیا۔ بالآخر اُس نے بھی کمان اُتارنے کا ارادہ ترک کر دیا اور ہا[تھ] سے ہی تیر میری طرف پھینکا جو میری ران زخمی کر گیا۔ اپنی ٹانگ پر خُون کی لکیر دیکھ کر جہاں میں جنگی جنون میں مبتلا ہو گیا۔ وہاں مجمع بھی دل کھول کر غوطار کو داد دینے لگا۔

آپ جانتے ہوں گے کہ جب مجھ پر خون سوار ہو جاتا [ہے] تو میں ہر خوف و خطر سے بے نیاز ہو کر دُشمن پر ٹوٹ پڑتا [ہوں] لیکن ایسے دُشمن سے میرا پالا پہلی بار پڑا تھا جو طاقت اور پھُ[رتی] میں میرا ہم پلّہ تھا۔ تاہم میں اُسے گھیر کر قربان گاہ کی چٹا[ن] کے پاس لے جانے کی کوشش کرنے لگا جہاں وہ بھا[ری] بھرکم دو دھاری تلوار رکھی ہُوئی تھی۔

غوطار بھی میری چال سمجھ گیا اور اُدھر جانے سے کترا[نے] لگا۔ اُس کی توجہ ذرا سی ہٹی تو مجھے اُس پر ایک بھرپُور ضر[ب] لگانے کا موقع مل گیا۔ میں نے اُس کے بازو پر وار کیا ا[ور] وہاں سے خون کا دھارا پھوٹ نکلا۔

غوطار کا ایک ہاتھ کسی حد تک ناکارہ ہو چکا تھا۔ م[یں] نے اُسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا اور چند مزید زخم لگا[ئے]۔ غوطار خُون میں نہا گیا۔ ایسا لگتا تھا کہ میں جب چاہوں اُ[سے] موت کے گھاٹ اتار سکتا ہُوں اُسے چھوٹے چھوٹے ز[خم] لگانا میری مردانگی کی توہین بلکہ ایک قسم کا ظلم تھا۔ اس [لیے] میں نے اُسے ایک ہی وار میں ختم کر دینے کا فیصلہ کر لیا اور ج[ب] وہ میرے حملے سے اُچھل کر ریت پر جا گرا تو میں اُس پر [آخری] وار کرنے کے لیے جھپٹا... مگر جونہی میں اُس کے قر[یب] پہنچا اُس نے دونوں ہاتھوں سے ریت کی مُٹھیاں میر[ی] آنکھوں میں جھونک دیں۔

میں ایک لمحے کے لیے اندھا ہو گیا لیکن میری چھٹی [حس] نے مجھے فوراً پیچھے ہٹ جانے کا مشورہ دیا۔ اگر میں ا[یسا نہ کرتا] تو میرا کام تمام ہو جاتا کیوں کہ غوطار نے وہیں سے مجھ پ[ر ضرب] لگائی تھی مگر تب تک میں پیچھے ہٹ چکا تھا۔

وہ دوبارہ اپنی جھونک میں ریت پر جا گرا [...]

میں اس دوران میں اپنی آنکھیں مَل کر دیکھنے کے [قابل] ہو چکا تھا۔ وہ دوبارہ ریت پر جھکا ہُوا تھا مگر اب میں [اس] کے اس حربے سے ہوشیار ہو چکا تھا۔ میں نے ایک [ہاتھ] اپنی آنکھوں پر رکھ لیا تا کہ اُنھیں ریت سے بچا سکوں [مگر] دُوسرے ہی لمحے مجھے یُوں محسوس ہُوا جیسے توپ کا گولہ [میرے] سینے میں آ کر لگا ہو۔ میں بے تحاشا اُچھل کر پیٹھ کے بل [...]

تب مجھے اپنے قریب لڑھکتے ہُوئے سر سے یہ اندازہ ہُوا کہ غوطار نے دُوسری مرتبہ ریت نہیں بلکہ وہ بریدہ سر دے مارا تھا جو قربان گاہ کے قریب زمین پر پڑا تھا۔ وہ تلوار سونت کر مجھ پر جھپٹ پڑا۔

اس سے پہلے کہ تلوار میری کھوپڑی کو پاش پاش کر دیتی۔ میں نے ڈھال کی آڑ لے کر لڑھکنی لگائی۔ آدھی ڈھال کے پرخچے اُڑ گئے مگر میری کھوپڑی بچ گئی۔ مجمع نے زور دار نعرے لگا [کر] غوطار کی ہمت بڑھائی۔ وہ پھر میری طرف جھپٹا اور دوسرا [و]ار کیا۔ میں نے اُسے بھی اپنی شکستہ ڈھال پر روک لیا اور اس کے ساتھ ہی غوطار کے کندھے سے لٹکتی کمان پکڑ کر اُسے [اپ]نی طرف کھینچا تو وہ میرے اُوپر آ رہا۔

مجمع نے ایک بار پھر نعرہ لگایا۔ غوطار نے اپنا پورا وزن [مج]ھ پر ڈال کر بھرپُور طاقت سے مجھے دبانا چاہا تو میں نے کمان [ا]چانک کھینچ کر چھوڑ دیا جو کوڑے کی طرح اُس کے مُنہ پر لگا تو اُس [کی] چیخ نکل گئی۔

وہ پیچھے ہٹا تو میں اُس کی گرفت سے نکل گیا اور لوٹ [پو]ٹتے ہُوئے اُٹھ کھڑا ہُوا لیکن اب میں اپنی تلوار اور ڈھال سے محروم ہو چکا تھا۔

غوطار بھی اُٹھا اور اپنی تلوار لیے میری طرف جھپٹا۔ مگر [اُس] وقت تک میں قربان گاہ کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اور [می]رے دائیں ہاتھ کی انگلیوں نے بڑی تلوار کا دستہ ٹٹول لیا [تھ]ا۔ جونہی غوطار اپنی تلوار لہراتا میرے قریب آیا، میں نے بڑی [تل]وار کی ایک ہی ضرب سے اس کی گردن اُڑا دی۔

غوطار کا سر بریدہ جسم ایک لمحے کے لیے وہیں کھڑا رہا [پ]ھر دھم سے گر پڑا اور وہ مجمع جو ایک لمحے قبل پُر شور نعرے [لگ]ا رہا تھا یُوں خاموش ہو گیا جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔

میں نے تلوار کی نوک زمین میں گاڑ دی اور اس کے [سہ]ارے کھڑے ہو کر دم لینے لگا... میری سانسیں دھونکنی کی [طر]ح چلنے لگی تھیں... اچانک مجھے خیال آیا کہ گرانچو نے مقدس [تلو]ار کو چھُونے سے منع کیا تھا لیکن اب تو میں اُسے چھُو ہی [چکا تھا]ں بلکہ اُس سے پشکانیوں کے بہت بڑے بہادر کو قتل بھی کر [چک]ا تھا۔

انہونی ہو چکی تھی... اَب دیکھنا یہ تھا کہ مجھے اس جُرم کی [کیا] سزا ملتی ہے۔ میں نے ایک نظر شہزادی راشی کی طرف دیکھا۔ وہ [ش]اہ فرونداً کی طرف جھکی اور اُس سے سرگوشی میں کچھ کہنے لگی شاہ [فرو]نداً نے گرانچو کو قریب آنے کا اشارہ کیا... پھر وہ تینوں کچھ دیر تک کانا پھُوسی کرتے رہے۔ اب تک میں بھی دم لے چکا تھا اور فیصلہ سُننے کا منتظر تھا۔

شہزادی راشی، شاہ فرونداً اور گرانچو میری طرف بڑھنے لگے۔ مجمع دم بخود تھا۔

مجھے اُن لوگوں کے سانس لینے کی آواز تک صاف سنائی دے رہی تھی۔ شاہ فرونداً کا ہاتھ اپنی تلوار کے قبضے پر تھا اور وہ تینوں آہستہ آہستہ میرے قریب آ رہے تھے۔ سینکڑوں پشکانیوں کی آنکھیں ہم پر مرتکز تھیں۔

مجھ سے دس، بارہ قدم دُور شہزادی راشی اور گرانچو رُک گئے۔ صرف شاہ فرونداً آگے بڑھتا رہا۔ اس کا ہاتھ اُسی طرح تلوار کے قبضے پر تھا... پھر وہ بھی مجھ سے تین قدم کے فاصلے پر رُک گیا۔ اُس نے تلوار نکالی، اُسے چُوما اور گھٹنوں کے بل میرے سامنے جُھک گیا۔ تب پہلے اُس نے مقدس تلوار سے لگا ہُوا خُون اپنی انگلی سے سمیٹ کر پیشانی پر لگایا پھر گمبھیر لہجے میں کہنے لگا۔

"اے ہر موجہ دیوتا... خمر شانیوں کی مقدس کتابوں میں لکھا ہے کہ تُو اُنھیں نجات دِلانے کے لیے آئے گا... مگر تُو ہم پشکانیوں کے پاس آیا ہے تاکہ ہمیں دوبارہ خمر شان اور اُس کی راجدھانی جبروت لے جائے جو ہمارا کھویا ہوا وطن اور ہماری میراث ہے۔ اے ہر موجہ، ہم تمھیں خوش آمدید کہتے ہیں اور تمھیں اپنے نجات دہندہ کی حیثیت سے قبول کرتے ہیں۔ ہم تمھارے احکام کی تعمیل کریں گے۔ مجھے اپنی خوشنودی سے نواز، اے ہر موجہ دیوتا!"

یہ کہہ کر اُس نے سر جھکا لیا اور بڑی ہلکی آواز میں جو صرف میں ہی سُن سکتا تھا، کہنے لگا: "میرے کندھے کو مقدس تلوار سے چھُو۔ میرے بعد راشی کو بھی تلوار سے چھُونا، پھر مقدس تلوار لے کر تیزی سے اُس کے ساتھ چلے جانا۔"

صُورتِ حال کے اچانک یُوں پلٹا کھانے پر میں نے دل ہی دل میں خُدا کا شکر ادا کیا... پھر تلوار سے شاہ فرونداً کا شانہ چھُوا... وہ ہٹا تو شہزادی میرے سامنے آئی اور گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہُوئے بولی:

"میری محبّت قبول کر دیوتا اور مجھے اپنے پیار سے نواز دے۔"

میں نے اُس کے نرم و نازک شانے کو بھی تلوار سے چھُوا تو وہ اُسی طرح سر جھکائے ہُوئے سرگوشی میں بولی: "وقت ضائع کیے بغیر میرے ساتھ چل دو۔" یہ کہہ کر وہ اُٹھی، اُس نے اپنا

ایک ہاتھ میری طرف بڑھایا، میں نے اُس کا ہاتھ تھام لیا اور اُس کے ساتھ چلنے لگا۔ جاتے جاتے میں نے گرانجو کی طرف دیکھا۔ اُس کا چہرہ یُوں اُترا ہُوا تھا جیسے وہ اس صُورتِ حال سے ناخوش ہو۔

راشی میرا ہاتھ تھامے وحشی پشکانیوں کے درمیان سے یُوں گزری جیسے کوئی فاتح، کسی مغلوب قوم کے درمیان سے سربلند اور سُرخ رُو گزرتا ہے۔ وہ مجھے لے کر تخت کے عقب میں جا پہنچی۔ اُس کا مرتعش ہاتھ اُس کے دِلی جذبات کا آئینہ دار تھا۔ جونہی ہم تنگ اور مُڑے تُڑے راستے میں داخل ہُوئے جو چٹانیں کاٹ کر بنایا گیا تھا، وہ مجھ سے اور قریب ہو گئی۔

اچانک ایک چٹان کے پیچھے سے دو پشکانی سپاہی آ گئے۔ راشی نے اُنھیں ڈانٹ دیا اور وہ سر جُھکا کر ہٹ گئے۔

اس تنگ راستے کے خاتمے پر ہم ایک چھوٹے سے کمرے میں داخل ہُوئے۔ یہ کمرہ بھی ایک چٹان کاٹ کر ہی بنایا گیا تھا۔ کمرے میں ایک جانب نرم گرم کھالوں کا بستر لگا ہُوا تھا، ایک دیوار کے ساتھ مشعل جل رہی تھی اور دوسری دیوار میں ایک کھونٹی کے ساتھ پانی کا مشکیزہ لٹک رہا تھا۔ میں اُسے اُتارنے کے لیے بڑھا، تو راشی نے اپنے بازو پھیلا کر میرا راستہ روک دیا۔

"مجھے پیاس لگی ہے اور میں اپنا زخم بھی دھونا چاہتا ہُوں۔"

"مجھے تم سے زیادہ پیاس لگی ہے۔" وہ مُسکرا کر بولی۔ "اور جہاں تک تمھارے زخم کا تعلق ہے، میں اُس کی مرہم پٹی کروں گی۔ گرگوش میں راشی کا حکم چلتا ہے اور وہ اگر مگر یا انکار سُننے کی عادی نہیں۔ میری یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا، اور یہ بھی کہ جب ہم دونوں کے علاوہ کوئی نہ ہو تو تمھاری حیثیت ہر موجہ دیوتا کی نہیں ہو گی۔ میں جو یہاں کی اصل حکمراں ہُوں، جو چاہوں گی، تم وہی کرو گے۔"

مجھے اُس کی بات پر غُصّہ تو بہت آیا مگر میں نے اثبات میں سر ہلا دیا کہ یہ سرزمین ابھی میرے لیے اجنبی تھی اور میں اس کے حالات سے بھی ناواقف تھا۔

"میں تمھاری شکر گزار ہُوں کہ تم نے میرے بھائی غوطار کو قتل کر دیا جو بادشاہ بننے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ تم بھی تھوڑے سے خواب دیکھ لو اس کے بعد میں تمھیں بھی اسی طرح کسی سے قتل کرا دُوں گی مگر وہ وقت ابھی بہت دُور ہے۔"

میں سکتے کے عالم میں کھڑا رہ گیا۔ یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ غوطار اس کا بھائی بھی ہو سکتا تھا۔

میں گرگوش میں تین روز رہا۔ اس دوران راشی نے مجھے اپنے کمرے سے باہر جانے کا بہت کم موقع دیا۔ جب کبھی مجھے باہر جانے کا موقع ملا، وہ میرے ساتھ ہُوا کرتی تھی اور یہ موقع مجھے اُس وقت ہی ملتا تھا جب وہ پُوری طرح مطمئن ہوتی۔ میں گھڑ سواری کی فرمائش کرتا تو وہ ٹال نہ سکتی۔ تب میرے ساتھ وہ بھی گھڑ سواری کے لیے اپنی کمیں سے نِکل آتی تھی۔

گھڑ سواری کے بہانے میرے دو مقصد تھے۔ ایک تو وہی جس کی خاطر ڈاکٹر فریدوں مجھے کسی سفر پر بھیجتا تھا اور دُوسرا یہ کہ میں اس سرزمین اور لوگوں کے بارے میں حالات جان کر خُود اپنے مستقبل کے بارے میں بھی کوئی منصُوبہ بنا سکوں۔

ان تین دنوں میں میرے، راشی، شاہ فرزندا اور گرانجو کے درمیان متعدد بار مجلسِ مشاورت ہو چکی تھی اور مستقبل کے متعلق کئی منصُوبے بھی سوچے اور بنائے گئے تھے۔ میں بہت جلد اس نتیجے پر پہنچ گیا تھا کہ اس مجلس کے شرکا میں سے ہر فرد دُوسرے تین افراد کو ٹھکانے لگانے کی ترکیبیں بھی ساتھ ہی ساتھ سوچ رہا ہے۔ گرانجو بے حد عیّار اور مکّار تھا، شاہ فرزندا بے انتہا ظالم آدمی تھا اور راشی ... وہ اُن دونوں کا مجمُوعہ تھی اور مجھے یہ فیصلہ کرنے میں کوئی دقت محسوس نہ ہُوئی کہ وہ شاہ فرزندا اور گرانجو سے بھی زیادہ خطرناک تھی۔

ایک بار جب وہ عالمِ سرمستی میں تھی، اُس نے مجھ سے کہا۔ "میں چاہتی ہُوں کہ خمرشان پر قبضے کے بعد تم میرا ایک اور کام بھی کر دو۔"

"وہ کیا؟" میں نے پوچھا۔

"تم میرے لیے بلکہ ہم دونوں کی خاطر میرے باپ شاہ فرزندا کو بھی قتل کر دینا کیونکہ تخت پر بیک وقت تین افراد متمکن نہیں ہو سکتے۔"

"تین افراد؟" میں نے تعجب سے کہا۔ "تمھارا مطلب صرف دو ہی تخت نشین سے ہونا چاہیے راشی اور وہ تخت نشین تم ہو گی۔"

اس بات پر وہ بے ساختہ ہنس پڑی اور بولی۔ "تم طاقت ور ہی نہیں بے حد عقل مند بھی ہو، مردجہ!"

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔ "اس لیے میں یہ بھی جاننا چاہتا ہوں کہ تم مجھے کس کے ہاتھوں قتل کروانا چاہو گی؟"

"ابھی میں اس سلسلے میں کچھ نہیں جانتی۔" اس نے برجستہ کہا۔ "لیکن وقت آنے پر میں کوئی نہ کوئی صُورت نکال ہی لوں گی۔"

یہ تھی نازک اندام مگر حسنِ وحشی کی مالک راشی کی سوچ!

ادھر شاہ فرزندا مجھے اپنا رقیب سمجھنے لگا تھا۔ پہلے تو اُس نے خود مجھ کو تحفے کے طور پر یا میری مہمان داری کے لیے تنہائیوں کا شریک

تھا اور اب مجھ سے حسد کرنے اور بُری طرح جلنے لگا تھا اور گرانجو جسے شاہی سائنس دانوں نے شیشے کے مرتبان سے جنم دیا تھا اور جس کی درجہ بندی میں وہ غلطی کر گئے تھے، ان باپ بیٹی سے زیادہ عیّار تھا اور اسے جدید ٹیکنالوجی کی وہ سہولتیں بھی حاصل تھیں جن سے ہم تینوں محروم تھے۔ اس کے باوجُود مجھے گرانجو کی بھی مات کھانی تھی ورنہ ڈاکٹر فریدوں کا کمپیوٹر میری لاش تلاش کرنے میں ناکام بھی ہو سکتا تھا۔

میں نرم گرم بستر پر لیٹا ہُوا تھا۔ میں اور راشی ابھی ابھی باہر سے واپس آئے تھے اور کچھ تھکے ہُوئے سے تھے۔ اس پہاڑی علاقے میں بارش بہت ہوتی تھی لیکن جب کبھی بادل نہ ہوتے تو مجھے آسمان اور سُورج دکھائی دیتے تھے اور بہت دُور خمرشان اور گرگوش کی سرحد پر ایک اُونچی اور اُفق تا اُفق پھیلی ہوئی فصیل بھی نظر آتی تھی جس کے اُس پار ایک عجیب سی دُھند چھائی رہتی تھی۔ کیوں اور کیسے؟ یہ غالباً خمرشان کے سائنس دانوں کا کمال تھا جنھوں نے دُھند کی چادر تان کر موسم پر قابو پا رکھا تھا۔ میں انھی سوچوں میں ڈُوبا ہُوا تھا کہ راشی بولی۔

"میرا خیال ہے، میں تمھیں کسی سے قتل نہیں کرواؤں گی!"

"وہ کیوں؟" میں نے حیرت ظاہر کیے بغیر پوچھا۔

"اس لیے کہ تمھیں پا کر مجھے جتنی خوشی ملی ہے، اتنی خوش میں پہلے کبھی نہیں تھی۔ تم نے مجھے حقیقی محبت سے آشنا کیا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے ایک قہقہہ لگایا اور بات جاری رکھی۔ "میرا خیال ہے خمرشان میں بھی تم جیسا کوئی دُوسرا نہیں ہو گا اور وہ آدمی جو جبروت کے پنجروں میں بند ہیں، اُنھیں تو بقول گرانجو مردوں میں شمار کرنا ہی حماقت ہے۔ جبروت پر قابض ہوتے ہی میں پنجروں میں بند تمام آدمی قتل کرا دُوں گی لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم بھی تو اُنھی میں سے ایک ہو اور جبروت کے پنجروں سے بھاگ آئے ہو، پھر گرانجو کیسے کہتا ہے کہ پنجروں

والے آدمیوں کو مردوں میں شمار کرنا حماقت ہے؟"

چونکہ میں جبروت کے پنجروں میں بند آدمیوں کے بارے میں تفصیل نہیں جانتا تھا۔ اس لیے میں نے کہا: "اُنھیں قتل نہ کروانا بلکہ اُنھی میں سے کسی کو میرے قتل پر مامور کر دینا۔"

"نہیں نہیں... میں تمھیں قتل نہیں کراؤں گی۔" وہ بولی۔ "اتنا مجھے معلوم ہے کہ خمرشانی تم جیسے تنومند اور کشیدہ قامت نہیں ہوتے۔ اگر میں نے تمھیں قتل کروا دیا تو پھر میرے لیے کونسا ساتھی رہ جائے گا؟"

"گراپخو۔" میں نے بے ساختہ جواب دیا۔

راشی نے بڑے زور کا قہقہہ لگایا۔

"وہ تو خواجہ سراؤں کا نیم مرد ہے۔ میرا ساتھی کیسے ہو سکتا ہے؟"

"تم نے ایک بار خود ہی تو بتایا تھا کہ وہ جب بھی یہاں آتا ہے اپنے ساتھ یہاں کی کوئی نا کتخدا لے جاتا ہے۔ اگر وہ خواجہ سرا ہوتا تو کسی کو کیوں لے جاتا؟"

"لیکن تمھیں دُوسری لڑکیوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہونی چاہیے۔" راشی بپھرتے ہوئے بولی۔ "آیندہ میرے سامنے کسی اور کا ذکر مت کرنا۔"

"سمجھو راشی۔" میں نے اسے تحمّل سے سمجھایا۔ "میں یہ سب کچھ اس لیے جاننا چاہتا ہوں کہ ہم گراپخو کی عیاری کا جواب عیاری سے نہیں دے پائیں گے۔ وہ ہم سب سے زیادہ مکّار اور چالاک ہے۔ میں یہ بات اس لیے جاننا چاہتا تھا کہ اگر پشکانی لڑکیاں اس کی کمزوری ہیں تو ہمیں اس کمزوری سے فائدہ اُٹھانا چاہیے۔"

راشی کچھ دیر سوچتی رہی، پھر بولی: "شاید تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔ جن لڑکیوں کو وہ اپنے ساتھ لے گیا تھا، میں نے اُن سے پوچھا تھا۔ وہ بتاتی تھیں کہ گراپخو خواجہ سرا ہی ہے مگر وہ ذہنی طور پر مردوں جیسی باتیں کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس طرح وہ اپنی معلومات میں اضافہ کرتا ہے۔"

یہ سُن کر مجھے ایک لمحے کے لیے گراپخو پر رحم آ گیا۔ خمرشان کے سائنس دانوں کی کسی بھول چوک سے ایک خواجہ سرا ہستی کو مرد کی سوچ اور ذہن مِل گیا تھا اور اب وہ بے چارہ نہ اِدھر کا رہا تھا اور نہ ہی اُدھر کا... پھر اچانک میرے ذہن پر ایک انوکھی ترکیب آ گئی جسے میں نے سرگوشی میں راشی کے کان میں انڈیل دی۔

وہ ایک دم بھڑک اُٹھی۔

"نہیں... میں اس کی رفاقت کا تصوّر بھی نہیں کر سکتی۔"

"ضد نہ کرو راشی۔ اگر تم اُس کی کمزوری بن گئیں تو وہ تمھارے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکے گا۔"

میں نے یہ مشورہ اُسے اس لیے دیا تھا کہ میں خود بھی اُس کی کمزوری بنتا جا رہا تھا۔ اس لیے راشی مجھے اُس کے ہاتھوں کوئی ضرر نہ پہنچنے دیتی۔

میں نے بات جاری رکھی۔ "اور دیکھو۔ وہ نہ تو تم پر اعتماد کرتا ہے اور نہ ہی تمھارے باپ پر اور نہ مجھ پر... وہ ہمیں اپنے مقصد براری کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہے تو پھر کیوں نہ تم بھی اُسے مقصد براری کے لیے استعمال کریں؟"

"تم بھی گراپخو جیسی باتیں کرتے ہو۔" وہ بولی۔ "بہت سے لفظ بولتے ہو۔ بالکل اُسی طرح جیسے تیز ہوائیں دروں سے گزرتی چلی جاتی ہیں مگر اُن کی کوئی منزل نہیں ہوتی۔ بہرکیف میں تمھاری بات ماننے کی پابند نہیں کیونکہ میں شہزادی بلکہ ملکہ ہوں... البتہ میں اس پر غور ضرور کروں گی۔ اب تم کوئی بات نہیں کروگے۔ چونکہ کل صبح تمھیں گراپخو کے ساتھ واپس جانا ہے اس لیے ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔"

میں اپنی جگہ مطمئن تھا کہ اُس کے ذہن میں ایک ایسی ترکیب کا بیج بو دیا ہے جس سے گراپخو پر قابو پایا جا سکتا ہے۔

* *

جب میں گراپخو کے ساتھ جنوبی صوبہ خراگ کے بُرج گرگوش واپس آیا تو تلوار ساتھ لیتا آیا تھا۔ شاہ فرزوند تلوار نہیں دینا چاہتا تھا مگر گراپخو نے اُسے کسی نہ کسی طرح راضی کر ہی لیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ سکا تھا کہ آخر گراپخو مقدس تلوار میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہا ہے۔ چنانچہ میرے استفسار پر اُس نے بتایا۔

"مقدس تلوار اتنی ہی قدیم ہے جتنی کہ سرزمینِ خمرشان۔ جب خمرشان کے مرد اپنے وطن سے نکالے گئے تھے تو وہ یہ تلوار اپنے ساتھ گرگوش لے آئے تھے۔"

"وہ اپنے وطن سے کیوں نکالے گئے تھے؟" میں نے پُوچھا۔

"عورتوں نے اُن کے خلاف بغاوت کر دی تھی اور اُنھیں مار مار گرگوش میں دھکیل دیا تھا۔"

"لیکن عورت اور مرد کا تو ہمیشہ کا رشتہ ہوتا ہے۔ مردوں کے بغیر تو اُن کی نسل ہی ختم ہو جانی چاہیے تھی۔"

"اقتدار حاصل کرنے والی وہ عورتیں نادان نہیں تھیں۔ اُنھوں نے نسل کی بقا کے لیے کچھ آدمیوں کو قیدی بنا لیا تھا۔" گراپخو نے وضاحت کی۔ "شکست خوردہ آدمی گرگوش میں بس کر جشتی بن گئے مگر اُن کے ذہن سے یہ بات اب تک نہیں نکلی کہ بُنیادی طور پر وہ خمرشانی ہیں اور ایک نہ ایک روز اُنھیں دوبارہ خمرشان پر قبضہ کرنا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ جب تم خمرشان کے دارالحکومت جبروت جاؤ تو مقدس تلوار تمھارے پاس ہونی چاہیے تاکہ وہ دیکھ کر مرعوب ہو جائیں اور تمھیں ہر موجہ دیوتا تسلیم کریں۔"

میں یہ تو جانتا تھا کہ گراپخو بہت عیار ہے لیکن اب مجھے اس کی دُور رس منصوبہ بندی کا بھی قائل ہونا پڑا۔ میں نے پوچھا۔

"مجھے جبروت کب جانا ہوگا؟"

"بہت جلد۔" اس نے جواب دیا۔

"کیا تم مجھ پر ایک چھوٹا سا احسان کر سکتے ہو، گراپخو؟"

"کیا؟" اس نے مستانہ وار پلکیں جھپکا کر پوچھا۔

"جبروت جانے سے پہلے میں ایک بار ژرولے سے ملنا چاہتا ہوں۔"

یہ سُن کر گراپخو نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

"شہزادی راشی کے بعد بھی تمھیں اس کنیز سے دلچسپی ہے۔ آخر اس میں ایسی کیا خوبی ہے؟"

"تم ان دونوں میں فرق محسوس نہیں کر سکتے گراپخو... راشی سراپا آتش ہے مگر ژرولے شعلہ و شبنم کا لطیف امتزاج ہے۔ راشی محبت کو خراج سمجھتی ہے جبکہ ژرولے کے حُسن میں نسائیت ہے۔ وہ محبت کو تحفہ سمجھتی ہے جو محبت کرنے والوں کو قدرت کی طرف سے خود بخود ہی مِل جاتا ہے، اسے زبردستی حاصل نہیں کیا جاتا۔"

"میں دو عورتوں کے درمیان یہ فرق نہیں سمجھتا مگر ایک وقت آئے گا کہ مجھ پر بھی اس فرق کا ادراک ہو جائے گا۔ بہرکیف میں ژرولے کو تم سے ملنے کی اجازت دے دوں گا۔"

میں نے اپنے کمرے میں آنے کے بعد خوشبودار پانی سے غسل کیا اور نیا لباس پہن لیا۔ جب میں آئینے کے سامنے کھڑا ہُوا تو پہلی بار مجھے اپنی بڑھی ہوئی داڑھی دیکھ کر خوشی ہوئی کہ وہ میرے چہرے پر بہت بھلی لگ رہی تھی۔ پھر میں ژرولے کے انتظار میں مقدس تلوار کے دستے میں جڑے ہوئے ہیرے جواہرات دیکھنے لگا۔ خمرشانیوں اور پشکانیوں کے لیے وہ آرائش پتھر کے ٹکڑے تھے۔ لیکن ہماری دُنیا میں اُن کی مالیت کروڑوں سے کم نہیں تھی۔ اگر راشی ہر وقت میرے سر پر سوار نہ رہتی تو میں گرگوش میں ارضیاتی تجربہ ضرور کرتا۔

ابھی میں اُن ہیروں کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ گراپخو کے حیوان نما سپاہی اور خواجہ سرا، ژرولے کو لے کر آ گئے۔ وہ حسبِ معمول بے حد پُرکشش لگ رہی تھی۔

میں نے سپاہیوں اور خواجہ سراؤں کو بھیج دیا اور ژرولے کی طرف دیکھا جو اپنی آنکھوں میں پیار کے دیپ جگائے مجھے دیکھتی رہی۔ میں جانتا تھا کہ گراپخو اسپائی اسکرین پر ہمیں دیکھ رہا ہوگا مگر مجھے اُس کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ جب ہماری نظریں چار ہوئیں تو ژرولے نے عجیب سے انداز میں پلکیں جھپکائیں۔ یوں محسوس ہُوا جیسے وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں کوئی پیغام دینا چاہتی ہو یا مجھے کسی خطرے سے خبردار کر رہی ہو لیکن موقع و محل ایسا نہیں تھا کہ میں اُس سے کوئی سوال کر سکتا۔ ہماری کی گئی سرگوشی تک ریکارڈ ہو سکتی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا تو اچانک اس کے ہاتھ سے بٹن کے برابر کوئی چیز میرے ہاتھ میں منتقل ہو گئی...

میں نے چونکے بغیر اُس کی طرف دیکھا۔ اُس نے پھر ناقابلِ فہم انداز میں پلکیں جھپکائیں۔ میرا دل شدت سے دھڑک اٹھا لیکن میں اس سے کچھ بھی نہیں پُوچھ سکتا تھا۔ اچانک اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں پگھلنے لگا۔ میں نے لاشعوری گھبراہٹ کے تحت اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ دُھواں بن کر فضا میں تحلیل ہو گئی۔

میں حلق کے بل چیخ پڑا اور میری آواز دیر تک کمرے کی چار دیواری میں کسی بھٹکے ہوئے مسافر کی طرح سر ٹکراتی رہی۔

میں حیران تھا کہ وہ معصوم چہرہ لڑکی یوں اچانک ہی دُھواں بن کر فضا میں کیسے تحلیل ہو گئی لیکن جو لڑکی میرے پاس آئی تھی وہ سرتاپا ژرولے ہی تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ میرے ہاتھ میں وہ بٹن نُما شے کیسے منتقل کرتی؟ بہرحال جو کچھ بھی ہُوا اس میں نیم مرد گراپخو کے علاوہ کسی اور کا ہاتھ نہیں ہو سکتا۔

میں بے ساختہ چیخ اُٹھا: "یہ کیا حرکت ہے گراپخو؟"

"تاؤ کھانے کی ضرورت نہیں ہرموجہ دیوتا۔ تم نے تھوڑی دیر کے لیے ژرولے کو دیکھنے کو کہا تھا۔ میں نے تم کو دکھا دیا۔ بس اب جبروت جانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ میں سپاہی بھیج رہا ہوں۔"

میں غصّے سے بل کھا کر رہ گیا۔ لیکن قہرِ درویش برجانِ درویش کے مصداق مجھے خاموش ہی رہنا پڑا۔ میں نے یہی سوچ کر صبر کر لیا کہ ژرولے جو بٹن نُما چیز مجھے دینا چاہتی تھی وہ دینے کی اُسے مہلت مل گئی تھی اور میرا خیال تھا کہ اس میں کوئی خفیہ پیغام پوشیدہ ہوگا مگر میں اُسے یہاں نہیں دیکھ سکتا تھا لہٰذا میں نے اُسے کمر پر ہاتھ رکھنے کے بہانے پیٹی میں اُڑس لیا۔

⊛

میں خمرشان کی راجدھانی جبروت میں کھڑا تھا۔ میں یہاں کیسے پہنچا، یہ تو مجھے معلوم نہیں، البتہ اتنا ضرور یاد ہے کہ گراپخو کے حیوان نما سپاہی مجھے اپنے نرغے میں لیے ہوئے ایک لیبارٹری نُما کمرے میں لے گئے تھے اور گراپخو نے مجھے ایک چبوترے پر لیٹ جانے کو کہا تھا... پھر مجھے یوں محسوس ہُوا تھا جیسے میری رُوح پرواز کر رہی ہو اور میرا جسم پیچھے رہ گیا ہو... کچھ دیر بعد میں نے اپنی رُوح

دوبارہ اپنے جسم میں داخل ہوتے محسوس کی اور جب آنکھ کھلی تو میں جبروت پہنچ چکا تھا۔ ہو سکتا ہے یہ سب کچھ میرا واہمہ ہی ہو لیکن نقلِ مکانی کا یہ عمل میری عقل و فہم سے بالاتر تھا۔

جبروت کا شہر ایک میدانی علاقے میں واقع تھا۔ اس کی گلیاں اور سڑکیں وسیع و عریض اور بے حد صاف ستھری تھیں مگر یہاں بھی وہی کہر کا پردہ چھایا ہوا تھا اور ہر طرف نیم کی چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں آپ کو بتانا بھول گیا کہ میں نے اس سلسلے میں گرائجو سے پوچھا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ دھند کا یہ دبیز پردہ نہ صرف موسم پر قابو پانے کے لیے تانا گیا ہے بلکہ یہ "پےدا" کی کاشت کے لیے بھی بے حد ضروری ہے جو خمر شان کی واحد قیمتی فصل ہے۔ اسی فصل سے ہی ان کی تمام ضروریات پوری ہوتی تھیں۔

میں ایک عمارت کی اوٹ سے باہر آیا تو دیکھا کہ سڑکوں اور گلیوں میں ویسے ہی حیوان نما کارندے اور خواجہ سرا آجا رہے تھے۔ انھیں دیکھ کر مجھے اس لیے کوئی تعجب نہ ہوا کہ اول تو میں اس قسم کی مخلوق برجِ گرگوش میں دیکھ چکا تھا، دوسرے گرائجو نے بھی مجھے بتا دیا تھا کہ راجدھانی میں بیشتر کام یہی لوگ انجام دیتے ہیں۔ البتہ ابھی تک مجھے وہ صنف نظر نہیں آئی تھی جسے جبروت بلکہ پورے خمر شان پر اقتدار حاصل تھا۔

میں چھپتا چھپاتا محل کی طرف بڑھنے لگا جو شہر کے مرکزی چورا ہے پر واقع تھا... اور جب میں محل کے قریب پہنچا تو مجھے وہ صنف بھی نظر آ گئی جسے دیکھنے کی مجھے کافی دنوں سے آرزو تھی... یہ صنف... صنفِ نازک تھی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ بے حد خوبصورت عورتیں تھیں۔ گرائجو نے مجھے بتایا تھا کہ ان عورتوں کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ نہیں ہے مگر ملک کا اقتدار انھی کے پاس ہے۔ وہ سب کی سب کشیدہ قامت تھیں، سب کے لباس یکساں تھے۔ سب جوان تھیں اور یوں لگتا تھا جیسے سب ایک ہی جیسی خوشبو استعمال کرتی ہیں کیونکہ ہر طرف فضا میں ایک ہی خوشبو ہلکورے لے رہی تھی۔

گرائجو نے روانگی سے پہلے مجھے بتا دیا تھا کہ خونی میلہ شروع ہونے سے کچھ دیر پہلے وہاں پہنچوں اور یہ خونی میلہ لشکانیوں کے میلے سے یکسر مختلف ہو گا۔ شاید اسی لیے راجدھانی کا ہر فرد، کیا خواجہ سرا، کیا حیوان نما خدمت گار اور سپاہی اور کشیدہ قامت جوانیاں، سب کے سب ایک ہی سمت رواں دواں تھے۔

میں اب تک یہ احتیاط برت رہا تھا کہ کسی کی نگاہ میں نہ آؤں۔ مجھے یہی ہدایت دی گئی تھی جب سڑک پر آمد و رفت تقریباً ختم ہو گئی تو میں آگے بڑھا مگر اب بھی میں اپنے آپ کو درختوں اور پھولدار جھاڑیوں کی اوٹ میں رکھے ہوئے تھا۔

محل کے بیرونی دروازے کے پاس مجھے شفاف ترغون کا بنا ہوا ایک سو فٹ اونچا مینار دکھائی دیا۔ جس کے دائیں اور بائیں جانب دو نوشباب حسیناؤں کے مجسمے استادہ تھے۔ دونوں ہم شکل اور جڑواں دکھائی دیتی تھیں۔ بقول گرائجو وہ دونوں بہنیں تھیں۔ ایک کا نام اشنار تھا اور دوسری کا شمورا... شمورا خمر شان کی حکمراں دیوی تھی اور اشنار مہاپجارن تھی۔

میں نے دیکھا کہ محل کے وسیع و عریض صحن میں ایک جانب حسین و جمیل عورتیں، دوسری طرف خواجہ سرا... اور حیوان نما خدمت گار ایک دائرے میں جمع تھے۔

یہ دراصل ایک اکھاڑا تھا جس میں گلابی رنگ کی شفاف ریت بچھی ہوئی تھی اور چاروں طرف روشنی کے وہی گولے تھرتھرا رہے تھے جو میں سرنگ اور برجِ گرگوش میں بھی دیکھ چکا تھا۔ گرائجو نے مجھے بتایا تھا کہ ان گولوں کو لیزر کی شعاعوں کے ذریعے برقی رو پہنچائی جاتی ہے۔ یہ برقی رو جوہری توانائی کے ایک تالاب سے حاصل ہوتی ہے۔ میرا کام اس برقی تالاب کو تلاش کر کے برقی رو کا سلسلہ منقطع کر دینا تھا تاکہ راج دھانی کے سائنس داں نہ تو مقناطیسی پردے آویزاں کر سکیں اور نہ ہی سرخ آندھی جنم دے سکیں جو اس شہر بلکہ ملک کے دفاع کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ اگر توانائی کے تالاب سے برقی رو کا سلسلہ بند ہو جائے تو لشکانی ایک ہی یلغار میں جبروت پر قبضہ کر سکتے تھے۔

اس اکھاڑے کے اردگرد باہر کی جانب چبوتروں پر بہت سے مینار بنے ہوئے تھے جن کی پرستش کی جاتی تھی۔ میں ایک مینار کی اوٹ سے اکھاڑے کا نظارا کرنے لگا۔

اکھاڑہ پوری طرح بھر چکا تھا اور اب ہر طرف خاموشی چھا گئی تھی اور اس کی جگہ مدھم آواز میں موسیقی سنائی دینے لگی تھی۔

اکھاڑے کے وسط میں دو تخت رکھے ہوئے تھے جن پر اشنار اور شمورا کو براجمان ہونا تھا مگر وہ ابھی نہیں آئی تھیں۔

چند لمحوں کے بعد موسیقی دب گئی اور نفیریوں کی آواز آنے لگی۔

اس کے ساتھ ہی محل کی جانب سے اشنار اور شمورا یکساں شفاف ملبوسات میں آتی دکھائی دیں۔ انھیں کنیزوں کے ایک دستے نے اپنی حفاظت میں لے رکھا تھا اور یہ کنیزیں ژڈلے کے قبیلے کی تھیں۔ اس لیے ہر کنیز مجھے ژڈلے کی یاد دلا رہی تھی۔

اشنار اور شمورا اکھاڑے کے وسط میں رک گئیں۔

انھوں نے ایک دوسرے کی پیشانی پر بوسہ دیا اور اپنے اپنے تخت پر بیٹھ گئیں۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ خمر شان کی حکمراں ملکہ شمورا کی نیم وا آنکھیں جھپکے بغیر خلا میں گھورے جا رہی تھیں اور وہ اس ہنگامے سے قطعی لاتعلق نظر آ رہی تھی جبکہ مہاپجارن کا ہر انگ متحرک دکھائی دیتا تھا۔ اس نے ہاتھ سر سے بلند کر کے تالی بجائی تو موسیقی کے ساتھ ساتھ نفیریاں بھی زور زور سے بجنے لگیں... پھر اس نے دوبارہ ہاتھ بلند کیے تو پرشور موسیقی مدھم پڑ گئی۔ اب اس نے بآوازِ بلند اعلان کیا۔

"خمر شان کے خونی میلے کا آغاز کیا جائے اور مردوں کے پنجرے کھول دیے جائیں۔"

اس اعلان کے ساتھ ہی حسینانِ جبروت کے حلقے میں ہلچل سی مچ گئی اور دبی دبی سرگوشیوں نے بھنبھناہٹ کی صورت اختیار کر لی... پھر کہیں سے پنجروں کے دروازے کھلنے کی آواز آئی...

چند لمحوں کے بعد دو دو کی قطار میں بیس مرد اکھاڑے میں داخل ہوئے۔ یہ مرد کیا تھے، مردوں کے نام پر تہمت تھے۔ کیونکہ ان میں مجھے نہ تو مردانگی کی جھلک دکھائی دی اور نہ ہی تندرستی و توانائی کا احساس ہوا۔ ان میں سے کسی کا قد بھی پانچ فٹ سے زیادہ نہیں تھا۔ وہ سب کے سب لشکری لباس میں تھے اور انھوں نے تلواریں بھی اٹھا رکھی تھیں، وہ

تھالنے کی دُھن پر اکھاڑے کے مرکز میں آنے اور دس دس کی دو قطاریں بنا کر ایک دُوسرے کے سامنے کھڑے ہو گئے۔

اشنار نے پھر تالی بجائی تو اُس کے اور شمورا کے درمیان دُھوئیں کا ایک بگولا گردش کرنے لگا۔ یہ دیکھ کر مجھے جھرجھری سی آ گئی۔

مَیں سمجھا کہ شاید وہ گرانجو کا تصویری پیکر ہو گا لیکن جب دُھوئیں نے تصویری پیکر اختیار کیا تو پتہ چلا کہ وہ ایک خواجہ سرا ہی ہے مگر وہ گرانجو سے بہت مختلف تھا۔

تب مجھے یاد آیا کہ گرانجو نے بتایا تھا، وہ راج دھانی میں اس وقت تک داخل نہیں ہو سکتا جب تک کہ اُسے خود نہ بُلایا جائے... یا راجدھانی پر چھایا ہُوا مقناطیسی شامیانہ ہٹا نہ دیا جائے۔

مَیں نے تخت کے سامنے نمودار ہونے والے خواجہ سرا کے تصویری پیکر کی طرف غور سے دیکھا تو پتہ چلا کہ سبز آنکھوں والا یہ خواجہ سرا گرانجو کی بہ نسبت کافی معمّر ہے۔ اُس کے چہرے پر جھریوں کا جال بچھا ہُوا ہے اور بھویں تک سفید ہو چکی ہیں۔

اُس نے اشنار اور شمورا کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا تو شمورا نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ وہ اسی طرح بے حس و حرکت بیٹھی خلا میں گھورتی رہی۔

"تم اپنے فرائض سے بخوبی آگاہ ہو خواجہ سراؤں کے شہنشاہ... اُن کی تعمیل کرو۔" اشنار نے کہا۔

خواجہ سرا نے ایک بار پھر سرِ تسلیم خم کیا اور مَردوں کی طرف بڑھ گیا جو ایک دُوسرے کے سامنے شمشیر بدست کھڑے تھے۔ خواجہ سرا نے اُن کے قد و قامت کے مطابق جوڑے بنائے اور طبل پر چوٹ کا اشارہ کیا۔ اعلان ہوتے ہی مرد ایک دُوسرے سے مصروفِ پیکار ہو گئے۔ مجھے یہ منظر دیکھ کر رُومیوں کے پہلوان یاد آ گئے۔ چند ہی لمحوں میں دس مرد دُوسرے دس مَردوں کے ہاتھوں مر چکے تھے۔

اب خواجہ سرا نے وحشی خدّام کو اشارہ کیا، وہ آگے بڑھے اور دس لاشیں اُٹھا کر چلے گئے۔ کچھ خادموں نے نئی ریت بچھائی۔ طبل پھر بجنے لگا، تلواریں پھر ایک دُوسرے سے ٹکرانے لگیں اور چند ہی لمحوں بعد پانچ مرد اور ڈھیر ہو گئے۔

اشنار موت کا یہ خونیں کھیل دیکھ کر قہقہے لگاتی رہی لیکن شمورا اسی طرح بے حس و حرکت خلا میں گھورتی رہی۔

مرد اس وقت تک ایک دُوسرے کا خون بہاتے رہے جب تک کہ اُن میں سے اُٹھیں لقمۂ اجل نہیں بن گئے۔ آخری بچ رہنے والا بھی بُری طرح زخمی تھا۔

اشنار نے زخمی فاتح کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "تلے مَردوں کے مرد... جیسا کہ کتابوں میں لکھا ہے اور جیسا کہ مَیں کہتی ہُوں، تم زندہ رہو گے اور مَردوں کے ہنروں کے محافظ ہو گے۔ تمہیں یہ حق بھی حاصل ہے کہ ہماری کنیزوں میں سے جو کنیز تمہیں پسند ہو، وہ تمہیں عطا کر دی جائے گی!"

یہی وہ وقت تھا، جب گرانجو کی ہدایت کے مُطابق مجھے مداخلت کرنا تھی۔ مَیں نے مینار کی اوٹ سے نکل کر ایک نعرہ لگایا تو سب کی نگاہیں میری طرف اُٹھ گئیں۔

مَیں نے مقدس تلوار لہراتے ہوئے کہا۔ "اب تمہیں کوئی حُکم دینے اور کوئی فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں رہا، اشنار!... اب میرے حکم اور فیصلے کی تعمیل ہُوا کرے گی کہ مَیں ہرموجہ ہُوں۔ وہ دیوتا جس کی آمد کا تم لوگوں سے وعدہ کیا گیا تھا، مَیں آ گیا ہُوں اور اب ہر فرد کو میرے احکام بجا لانا ہوں گے۔"

اس دوران سارا مجمع دم بخود تھا۔ بوڑھے خواجہ سرا نے مجھے دیکھ کر دونوں ہاتھ سینے پر باندھ لیے تھے۔ کچھ عورتیں، خواجہ سرا اور خدّام گھٹنوں کے بل جُھک گئے تھے۔ مَیں مقدس تلوار لہراتا ہُوا اشنار اور شمورا کے تخت کے قریب آ گیا۔

اشنار تخت پر کھڑی ہو گئی۔

"اگر تم واقعی دیوتا ہرموجہ ہو تو تمہیں کتاب میں کی گئی پیش گوئی نبھانا پڑے گی۔" وہ بولی۔

مَیں گرانجو کے منصوبے کے اس حصّے پر عمل کرنا نہیں چاہتا تھا... مگر اس سے مفر کی بھی کوئی صُورت نہیں تھی۔ چنانچہ مَیں مَردوں کے مَرد اُس واحد فاتح کی طرف پلٹا اور اس سے کہا "اپنے دفاع کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

وہ بے چارا ڈر کے مارے کانپنے لگا۔ پھر دو قدم پیچھے ہٹا اور التجا آمیز نگاہوں سے اشنار کی جانب دیکھنے لگا۔ مَیں نے اشنار کو بولنے کا موقع دیے بغیر اُسے حکم دیا۔ "تلوار اُٹھاؤ اپنی..."

مَیں اس غریب کو قتل نہیں کرنا چاہتا تھا اور اشنار کو اشتعال دلا رہا تھا کہ خود ہی مجھے اس کی جاں بخشی کے لیے کہہ دے... مگر وہ ایک لفظ نہ بولی۔

فاتح مرد نے اپنی تمام تر ہمت و قوت مجتمع کرتے ہوئے تلوار اُٹھائی مگر پھر اسے پھینک کر گھٹنوں کے بل میرے

سامنے بیٹھتے ہوئے بولا۔ "میں کسی دیوتا کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ میں ہرموجہ سے جان کی امان چاہتا ہوں میری جان بخش دو دیوتا ۔"

میں نے ایک نظر اشنار کی طرف دیکھا۔

"کیا دیوتا کو پیش گوئی پر عمل کرنے کے لیے مہاپجارن کے حکم کا انتظار ہے۔ اگر ایسا ہے تو ..." وہ بولی...

ابھی وہ اتنا ہی کہہ پائی تھی کہ میں نے اشتعال میں آکر اس بے چارے کا سر بھٹے کی طرح اُڑا دیا.... پھر میں نے اشنار سے کہا: "ہرموجہ حکم دیا کرتا ہے سُنا نہیں کرتا۔ میں یہاں خرشان کے مستقل تحفظ اور گرگوش دشمنوں کے خطرے سے ہمیشہ کے لیے نجات دلانے آیا ہوں۔ اشنار ! یہ بندوبست فوراً کیا جائے۔"

یہ کہتے ہوئے میں نے تیز نگاہوں سے اشنار کی طرف دیکھا۔ وہ بلا کی حسین لیکن بے رو ... نازک اندام تھی۔ اس کی سیاہ گہری آنکھوں میں بے پناہ ذہانت کی چمک نمایاں تھی۔

اُس کے یاقوتی لبوں پر ایک سحر انگیز تبسم اُبھرا... اور وہ بولی: "تم ہرموجہ دیوتا ہو تو تمھارے ہر حکم کی تعمیل کی جائے گی۔ گوما کے ساتھ جاؤ دیوتا! یہ تمھارے آرام کا خیال رکھے گا۔" اس نے بوڑھے خواجہ سرا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بات جاری رکھی: "میں کچھ دیر بعد دیوتا کے پاس آجاؤں گی۔"

میں بوڑھے خواجہ سرا گوما کی رہبری میں اکھاڑے سے محل کی طرف جانے لگا تو وہ لڑکیاں جنھیں حسن و شباب کے پیکر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا، میرے سامنے گھٹنوں کے بل جھک گئیں۔ ایک لمحے کے لیے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں سچ مچ کا دیوتا ہوں اور دیوتاؤں کو ندیدوں کی طرح انسانی حسن کا نظارا نہیں کرنا چاہیے۔ اس لیے ان کی طرف دیکھے بغیر بے نیازی کے انداز میں آگے بڑھتا چلا گیا۔

محل کے بائیں باغ سے گزر کر ہم ایک طویل راہداری میں داخل ہو گئے جس کا اختتام ایک وسیع و عریض ہال پر ہوا۔ اس ہال کا طرزِ تعمیر قدیم و جدید کا خوبصورت امتزاج تھا۔ ہال کی دیواروں میں مغلیہ طرز کی محرابیں بنی ہوئی تھیں لیکن طویل دریچے فرانسیسی دریچوں سے ملتے جلتے تھے۔ اس ہال میں بیسیوں خواجہ سرا مختلف اقسام کی مشینوں پر کام میں مصروف تھے۔ عمارت اور مشینوں میں خرشان کی واحد پیداوار ترغون کو استعمال کیا گیا تھا۔ وہاں کام کرنے والے ہر خواجہ سرا کا لباس یکساں تھا۔ کچھ خواجہ سرا سلیٹوں پر کچھ لکھنے میں ... مصروف تھے۔ سب نے سر جھکا کر گوما کو یا مجھے تعظیم دی... مگر منہ سے ایک لفظ بھی نہ بولے۔

گوما میری رہبری کرتا ہوا مجھے دوسرے ہال میں لے گیا۔ یہ ہال تعمیر کے اعتبار سے مختلف تھا۔ اس میں تین دیواریں تو دائرے کی صورت میں بنی ہوئی تھیں مگر چوتھی دیوار سیدھی تھی۔ اس دیوار پر بے شمار سُوئچ لگے ہوئے تھے۔ ہال کے درمیان میز نما مشین پر گوما جیسا ایک اور بوڑھا خواجہ سرا بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے پہلے گوما پھر مجھے دیکھا اور سر خم کر کے اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ گوما نے دائیں دیوار کے پاس جا کر ایک بٹن دبایا تو بغلی گول دیوار میں ایک دروازہ کھل گیا۔

گوما مجھے لیے ہوئے اس دروازے میں داخل ہو گیا۔

یہ ایک مربع کمرہ تھا اور اس میں ایسی بھنبھناہٹ گونج رہی تھی ں سے میرے کان بخوبی آشنا تھے۔ یہ بھنبھناہٹ دراصل صدہا پیوٹرز کی تھی اور میں ایسی ہی آواز ڈاکٹر فریدوں کے کمپیوٹرز چیمبر ں جاتے وقت کئی بار سن چکا تھا۔

گوما نے ایک دیوار کے ساتھ رکھے ہوئے کاؤچ کی طرف اشارہ رکے کہا: "یہاں تشریف رکھیے جناب۔ آپ کو قیام گاہ تک پہنچانے سے پہلے میں آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں کہ مہاپجارن اشنار مجھے یہی فرمان ہے۔"

میں نے اُسے جواب دینے کی بجائے اپنے لبادے سے ب ٹکڑا پھاڑا اور اُس سے تلوار پر لگا خون صاف کرنے لگا۔ یرا مقصد یہ تھا کہ وہ مقدس تلوار اچھی طرح پہچان لے۔ میرے ں عمل کا نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔

"آپ یہاں تشریف لانے سے پہلے گرگوش گئے ہوں گے ونکہ یہ مقدس تلوار وہاں وحشی پشکانیوں کے ناجائز قبضے میں ں۔" اس نے بڑے ادب سے کہا۔

"ہاں گوما..." میں نے خون آلود چیتھڑا پھینکتے ہوئے بڑی بے نیازی سے جواب دیا: "اس تلوار کے لیے مجھے عزطار کو قتل رنا پڑا جو پشکانیوں میں سب سے طاقتور اور بہادر تھا... مگر یہ ماری باتیں تو تم جانتے ہی ہوگے۔"

"نہیں جناب۔" وہ بولا: "مجھے اعتراف ہے کہ گرگوش کے ملسلے میں ہماری معلومات اتنی نہیں ہیں جتنی کہ ہونی چاہییں۔ ہم میرا قیاس یہی تھا۔"

مجھے محسوس ہوا جیسے بوڑھا خواجہ سرا مجھے باتوں میں لگا کر میرے ملق اندازہ کرنا چاہتا ہے کہ میں کتنے پانی میں ہوں۔ میں نے ں کی گہری سبز آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا: "تم نے کہا ہے کہ مجھ سے کچھ باتیں کرنا چاہتے ہو... مگر میں تم سے بات وں کروں؟ میں ہرموجہ ہوں اور صرف ملکہ شمورا یا مہاپجارن اشنار سے بات کروں گا۔ وہ کہاں ہیں۔ اُنھیں فوراً میرے حضور آنا چاہیے۔ یسے تم کون اور کیا ہو؟"

بوڑھا گوما چند لمحے مجھے گھورتا رہا۔ پھر بولا: "آپ کے بُو اور یہاں آمد نے بڑی عجیب صورتِ حال پیدا کر دی ہے وتا۔ میں آپ کو دیوتا کے لفظ سے اس لیے مخاطب کر رہا ہوں آپ نے اپنے آپ کو ہرموجہ کی حیثیت سے متعارف کرایا ہے لانکہ میں اور اشنار اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہرموجہ دیوتا کا کوئی وجود نہیں اور سیدھے سادے لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے یہ ڈھکوسلا بنایا گیا ہے تاکہ وہ کبھی سرتابی کی جرأت نہ کر سکیں۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ گرگوش سے خرشان میں کیسے داخل ہو گئے اور پھر مقناطیسی پردوں کو عبور کرتے ہوئے جبروت کیسے آپہنچے؟ میں آپ سے یہ سوال اس لیے کر رہا ہوں کہ اشنار ان کا جواب چاہتی ہے اور اس وقت وہ ہماری گفتگو سن رہی ہے۔"

گوما کے اس انکشاف نے کہ ہرموجہ دیوتا محض ایک ڈھکوسلہ ہے، مجھے عجیب مخمصے میں ڈال دیا۔ میں نے چند لمحے اس صورتِ حال پر غور کیا، پھر گوما سے پوچھا: "کیا یہ کمرہ اور یہ جگہ خفیہ کہلا سکتی ہے۔ کیا یہاں ہونے والی بات چیت یا نقل و حرکت جبروت کے باہر اسپائی اسکرین پر تو نہیں دیکھی سُنی جا سکتی؟"

"آپ کا اشارہ غالباً جنوبی صوبہ خراگ کے بُرجِ گرگوش کی طرف ہے جناب! نہیں۔ ہماری گفتگو اور نقل و حرکت وہاں نہیں دیکھی سُنی جا سکتی۔ البتہ مہاپجارن اشنار سب کچھ دیکھ اور سُن رہی ہے۔ اس لیے آپ بلا کھٹکے سب کچھ صاف صاف اور سچ سچ بتا دیں۔"

میں نے گوما کو اوّل تا آخر اپنی ساری رُوداد سُنا دی۔ اس دوران نہ تو وہ کچھ بولا اور نہ ہی اشنار نے کوئی دخل اندازی کی جو محل میں بیٹھی ہماری گفتگو سُن رہی تھی۔

آخر میں گوما بولا: "ہمارے سائنس داں بخوبی جانتے ہیں کہ کائنات میں ہماری دُنیا کے علاوہ بھی کئی اور سیارے ہیں۔ ہم نے بارہا اُن سیاروں سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش بھی کی لیکن اپنی اس کوشش میں ناکام رہے۔ ہمارے ہاں صرف ایک ہی فصل ہوتی ہے جس کا نام نیدوا ہے۔ ہم اپنی ساری ضروریات نیدوا کی مختلف مصنوعات سے پوری کرتے ہیں مگر اُس کی کاشت کے لیے ایک خاص قسم کا موسم درکار ہوتا ہے۔ اس لیے ہم نے موسم پر قابو پالیا ہے۔"

"مگر ہمارے سائنس داں ابھی موسم پر قابو نہیں پا سکے۔" میں نے اُسے بتایا: "تم یہ مت سمجھو کہ میں کسی اور سیارے سے یہاں آیا ہوں۔ میں اسی زمین کا باشندہ ہوں لیکن ہمارا تعلق مختلف زمانوں سے ہے۔ میں تم سے بہت پہلے کے زمانے سے تعلق رکھتا ہوں۔"

"بہرحال سائنسی ارتقا میں وقت لگتا ہے سرفروش!" وہ بولا: "میں تنہائی میں تمھیں اسی نام سے مخاطب کروں گا۔ مہاپجارن اشنار بھی تخلیے میں تمھیں سرفروش کہے گی لیکن لوگوں کے سامنے

تم ہر موجہ ہی بنے رہو گے۔"

"تم ہمیشہ اشنار کی بات کرتے ہو گوما جبکہ میں نے کتابوں میں شمورا کا ذکر بھی پڑھا ہے۔"

"کتابوں کے مطابق ہمارے مذہب میں دو جڑواں بہنیں اقتدار کی مالک ہوتی ہیں۔ ایک کو شمورا کا نام دیا جاتا ہے اور دوسری کو اشنار کہتے ہیں۔ شمورا حکمراں ملکہ ہوتی ہے اور اشنار مہا پجارن۔ اُسے موت کی دیوی بھی کہا جاتا ہے۔ سائنسی ارتقا کے باعث ہم مذہب ترک کر دیتے لیکن اقتدار پر قابض رہنے کے لیے مذہب ہماری ضرورت بن گیا ہے۔ ایک بات اور بھی سُن لو۔ یہاں اقتدار کی ساری ذمے داریاں اشنار پوری کرتی ہے۔ کیونکہ شمورا ذہنی طور پر ایک بچی ہے۔ اُس کی ذہنی نشوونما ویسی نہیں ہوئی جیسی کہ ہونی چاہیے تھی۔"

"مجھے گرانجو کے بارے میں بھی بتاؤ گوما۔" میں نے اُسے کہا۔

"گزشتہ کچھ عرصے سے ہم گرانجو کی ذہنی استعداد کے بارے میں مشکوک تو ہو چکے تھے لیکن ہمیں اس بات کا یقین نہیں ہو سکا تھا کہ اُس کی استعداد چودھویں درجے سے زیادہ ہے۔ اب تم نے بتایا ہے تو ہمیں اس سلسلے میں بھی ضروری اقدام کرنا پڑے گا۔"

"چونکہ گرانجو لڑکیوں میں دلچسپی رکھتا ہے۔ اس لیے میں نے شہزادی راشی سے کہا تھا کہ وہ اُسے اپنے دام میں پھنسا کر ختم کر دے۔" میں نے گوما اور اشنار کو بتایا جو کہیں دُور بیٹھی سُن رہی تھی۔

"گرانجو کا خاتمہ ہمارے مفاد کے خلاف ہو گا سرفروش۔ ہم چاہتے ہیں کہ وہ زندہ رہے اور پشکانیوں کو اُکسا کر خمرشان میں لے آئے تاکہ ہم اُنھیں ہمیشہ کے لیے ختم کر دیں۔ ویسے گرانجو اتنا عیار ہے کہ اُسے کوئی عورت ختم نہیں کر سکتی۔"

گوما نے راشی کو نہیں دیکھا تھا اور وہ اُس کی تخریبی صلاحیتوں سے بھی آگاہ نہیں تھا اس لیے وہ ایسا کہہ رہا تھا۔

"تمھاری سوچ ٹھیک نہیں سرفروش! خود میری تخلیق کے عمل میں بھی کچھ گڑبڑ ہو گئی تھی اور جوانی میں، میں بھی گرانجو جیسا ہی تھا مگر یقین رکھو گرانجو کو کوئی عورت دھوکا نہیں دے سکتی۔" گوما نے کہا۔

مجھے یُوں محسوس ہُوا جیسے گوما دلوں کا حال پڑھنا جانتا ہو۔ میں اُس سے یہ پوچھنے ہی والا تھا کہ کمرے میں اشنار کی آواز گونجنے لگی۔

"تم نے بہت باتیں کر لیں گوما۔ اب باقی باتیں میں خود ہی ہر موجہ یا سرفروش سے کر لوں گی۔ اب اُسے اُس کی قیام گاہ پر لے جاؤ۔ جب یہ آرام کر لے تو اسے میرے پاس لے آنا۔"

گوما نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "نہیں اشنار نہیں۔ جب تک رسم پوری نہ ہو جائے تمھیں یا شمورا کو ہر موجہ سے نہیں ملنا چاہیے کیونکہ کتابوں میں یہی لکھا ہے۔ تم مانو یا نہ مانو مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ خمرشان پر زبردست خطرہ منڈلا رہا ہے۔ اس لیے مجھ پر اعتماد کرو مہا پجارن اور تھوڑا سا صبر کر لو۔"

کچھ دیر خاموشی چھائی رہی پھر اشنار نے صرف ایک لفظ کہا جسے میں نہ سمجھ سکا۔ لیکن گوما کے چہرے کے تاثرات بتلا رہے تھے کہ اشنار نے اُس کی تجویز رد کر دی ہے۔ وہ کچھ دیر چُپ چاپ کھڑا رہا، پھر بولا۔ "وہ مجھ سے ناراض ہو گئی ہے۔ دراصل وہ تمھیں دیکھنے کے بعد اپنے دل پر قابو نہیں پا رہی جبکہ ہمیں اور بھی بہت سے مسائل کی طرف دیکھنا ہے۔"

گوما کی ان باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ اب اشنار ہماری گفتگو نہیں سُن رہی۔ گوما نے میری سوچ بھانپتے ہوئے کہا۔ "ہاں۔ وہ ہماری بات نہیں سُن رہی۔ مگر تم کیوں مضطرب ہو؟"

میں نے اُسے ٹالنے کے لیے مٹھی سے وہ بٹن نما چیز نکال کر گوما کے ہاتھ پر رکھ دی جو ژدلے نے مجھے دی تھی۔ "یہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تم نے اب تک مجھے اس کے متعلق کیوں نہیں بتایا تھا؟"

"میں نہیں چاہتا تھا کہ اشنار کو میرے اور ژدلے کے تعلقات کا علم ہو۔ آخر یہ ہے کیا بلا؟"

"یہ ایک پیغام ہے۔" وہ اس بٹن نما چیز کو محدب شیشے سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "ژدلے کو میں نے ہی گرانجو کے پاس جاسوسی

کے لیے بھیجا تھا۔ اُس نے اُن تمام باتوں کی تصدیق کی ہے جو تم نے بتائی ہیں اس لیے اب تم پر کسی قسم کے شک و شبہے کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ مجھے خوشی ہے کہ ژدلے ابھی تک زندہ ہے۔"

"لیکن ژدلے نے تو مجھے بتایا تھا کہ وہ سزا کے طور پر بُرجِ گرگوش بھیجی گئی ہے؟"

"ہاں۔۔ اُس نے سچ ہی بتایا تھا۔۔ مگر تم اُس کے لیے کیوں پریشان ہو رہے ہو؟"

"وہ تمھارے لیے جاسوسی کر رہی ہے گوما۔ تمھیں اُس کو مرنے سے بچانا چاہیے۔"

"میں نے اُس سے ایسا کوئی وعدہ نہیں کیا تھا اور کرتا بھی کیسے؟ اُس نے گناہ کیا تھا جس کی سزا اُسے بہر صورت بھگتنا تھی اگر اُس نے جاسوسی کی ہے تو یہ اُس کا فرض تھا۔ اگر اُسے سزا کے طور پر وہاں نہ بھیجا جاتا تو گرانجو مشکوک ہو جاتا اور ہم حقیقتِ حال سے بے خبر رہتے۔۔۔ مگر تم اُس کی اتنی حمایت کیوں کر رہے ہو؟"

"اس لیے کہ وہ مجھے پسند ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اُسے موت کے مُنہ میں جانے سے بچا لیا جائے اور۔۔" ابھی میں اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ اُس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھنے کے ساتھ ساتھ کچھ سُننے کی کوشش بھی کرنے لگا۔۔۔ پھر اُس نے مجھے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور ایک دروازہ کھول کر دُوسرے کمرے میں داخل ہو گیا۔

میں بھی اُس کے پیچھے پیچھے کمرے میں داخل ہُوا۔

یہ بے حد طویل کمرہ تھا جس میں لاتعداد کمپیوٹر چل رہے تھے۔

"یہ پُورے خمرشان کا مرکزی کنٹرول رُوم ہے۔ سارا کاروبارِ حکومت یہیں سے کنٹرول کیا جاتا ہے۔ آؤ میں تمھیں دکھاتا ہوں کہ اسے چلانے کے لیے برقی توانائی کہاں سے حاصل کی جاتی ہے۔" یہ کہہ کر گوما میری رہنمائی کرنے لگا۔

کمپیوٹرز کی بھُول بھُلیوں میں ایک جگہ زمین دوز سیڑھیاں دکھائی دیں۔ گوما اور اُس کے پیچھے میں بھی نیچے اُتر گیا۔ گوما بولا۔ "ہر موجہ کی حیثیت سے آپ کو بلا تاخیر توانائی کا تالاب دیکھ لینا چاہیے کیونکہ وہ آپ ہی کا عطا کردہ ہے اور اسی کی وجہ سے ہمارا کاروبارِ حیات چل رہا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ اور مہا پجارن اشنارا سے دانش مندانہ طور پر استعمال کرتے رہیں گے۔" یہ کہتے ہوئے اُس نے جلدی جلدی آنکھیں جھپکائیں تاکہ میں کوئی سوال نہ کروں۔

اب ہم ایک ایسے کمرے میں پہنچ گئے تھے جس کی چھت گنبد نما تھی۔ اس کے نیچے عین مرکز میں ایک گول تالاب بنا ہُوا تھا جس کے کنارے کنارے ایک چھوٹا سا جنگلا لگا ہُوا تھا۔ جنگلے کی جانب بڑھتے ہوئے اچانک میری نگاہ دُوسری دیوار کی طرف اُٹھ گئی اور میں وہیں کا وہیں کھڑا رہ گیا۔

دیوار کے ساتھ ایک تخت پر اشنار آنکھیں بند کیے لیٹی ہوئی تھی لیکن اب اُس کے بال سیاہ کی بجائے سُرخ دکھائی دے رہے تھے۔ اُس کے یاقوتی ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم بکھرا ہُوا تھا۔

گوما نے میری نگاہیں اُس پر مرتکز دیکھیں تو میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ "یہ اوّلین ملکہ اشنار ہے جسے مرے ہوئے لاکھوں شبرے گزر چکے ہیں لیکن جب تک خمرشان زندہ ہے، یہ مر کر بھی اسی طرح زندہ رہے گی اور جب تک یہ زندہ رہے گی، خمرشان بھی زندہ رہے گا۔۔ کتابوں میں یہی لکھا ہے۔"

"لیکن یہ مر کر کیسے زندہ ہے؟"

"کیونکہ اسے موت کے بعد توانائی کے تالاب کے پاس رکھ دیا گیا تھا اور توانائی کے تالاب کی تاثیر سے ہر شے اسی حالت میں باقی رہتی ہے تاوقتیکہ توانائی کی لہریں منقطع نہ کر دی جائیں۔۔۔ اور خیال ہے کہ اگر توانائی کی لہریں منقطع کر دی جائیں تو بھی ملکۂ اوّل اسی طرح زندہ رہے گی کیونکہ اس کی لاش لاکھوں شبروں سے اسی حالت میں منجمد ہو چکی ہے۔"

گوما کے اس انکشاف پر مجھے جھرجھری آ گئی۔

"آیئے۔ میں آپ کو توانائی کا تالاب دکھا دوں۔ دراصل پُورے خمرشان میں یہی وہ واحد جگہ ہے، جہاں نہ ہماری گفتگو باہر سُنی جا سکتی ہے اور نہ ہی ہم اسپائی اسکرین پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہاں صرف ہماری آنکھیں اور ہمارے کان ہی ایک دُوسرے کو دیکھ اور سُن سکتے ہیں۔"

"یہاں کون کون آ سکتا ہے؟"

"اب تک صرف اشنار، شمورا اور میں یہاں آ سکتے تھے مگر تم چوتھے آدمی ہو جو یہاں آئے ہو۔ میں نے تمھیں توانائی کا تالاب دکھا کر خمرشان کی تقدیر تمھارے ہاتھوں میں دے دی ہے جیسا کہ گرانجو چاہتا تھا۔"

ہم جنگلے کے قریب آ گئے۔

یہ جنگلا تقریباً بارہ فٹ قطر والے تالاب کے گرد پھیلا ہُوا

تھا۔ اس تالاب کی سطح اتنی پُرسکون، صاف و شفاف تھی کہ یوں لگتا تھا جیسے صدیوں سے اسے چھیڑا نہ گیا ہو۔ میں نے تالاب میں جھانک کر گہرائی کا اندازہ لگانے کی کوشش کی تو یوں محسوس ہوا جیسے وہ اتھاہ ہو... لیکن ذرا گہرائی میں مجھے ایک بے حد چمک دار اینٹ رکھی دکھائی دے گئی۔

"وہ چمک دار چیز کیا ہے؟" میں نے گوما سے پوچھا۔

"یہی چیز تو ساری توانائی کا سرچشمہ ہے جناب!" وہ بولا۔

"کیا آپ جانتے ہیں کہ اس سے توانائی کیسے حاصل کی جاتی ہے؟"

"میں سائنس داں نہیں بلکہ جنگجو ہوں گوما۔ یہ بتاؤ کہ اگر اسے کسی طرح چھیڑا جائے تو کیا ہوگا؟"

"معلوم نہیں مگر کتابوں میں لکھا ہے کہ اگر اس چمک دار چیز کو کسی طرح حرکت میں لایا جائے تو سب سے پہلے چھیڑنے والا فنا ہو جائے گا پھر توانائی ختم ہو جائے گی اور اگر توانائی ختم ہو گئی تو خرشان تباہ و برباد ہو جائے گا۔"

"اب تم خود ہی اندازہ کرو گوما گراچو کتنا عیار اور خطرناک ہے اگر میں اس کے کہنے پر عمل کرتا تو نہ صرف خود مر جاتا بلکہ خرشان بھی تباہ ہو جاتا۔"

"صرف اتنا ہی نہ ہوتا۔" گوما بولا۔ "اس کے بعد وہ پشکانیوں کو یہاں لے آتا تاکہ بچے کھچے خرشانی بھی ان کے ہاتھوں تہ تیغ ہو جاتے۔"

میں نے یہ سن کر نصف تلوار نیام سے باہر کھینچ لی اور گوما سے کہا۔ "میں یہ سب کچھ اب بھی کر سکتا ہوں گوما۔"

"ہاں۔ آپ مجھے قتل کیے بغیر یہ تلوار پھینک کر اس چمک دار چیز کو ہلا سکتے ہیں اور میں آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا کہ ہم خواجہ سرا لڑنا بھڑنا نہیں جانتے لیکن میں نہیں سمجھتا کہ آپ محض گراچو کی خاطر مرنا پسند کریں گے۔"

میں نے ایک اور قہقہہ لگایا اور کہا۔ "تم گراچو کی خاطر مرنے کی کہہ رہے ہو۔ مجھے سب سے زیادہ مسرت اس روز ہوگی جب میں گراچو کو ختم کردوں گا... اور میرا خیال ہے کہ وہ وقت زیادہ دور نہیں ہے۔"

"وہ وقت جتنی جلدی آئے بہتر ہے لیکن ہمیں ہر قدم بڑی احتیاط سے اٹھانا پڑے گا اور اس سے پہلے منصوبہ بندی کرنا پڑے گی جس میں اشنار بھی شریک ہوگی۔ دوسرے یہ بھی یاد رکھو کہ ہم بار بار یہاں آکر باتیں نہیں کر سکتے ورنہ اشنار مشکوک ہو جائے گی... اور ہاں! وہ تڑدے والی بات ادھوری رہ گئی تھی۔ آخر چکر کیا ہے؟"

"چکر صرف اتنا ہے کہ میں اسے چاہتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ تم اپنے اختیارات سے کام لے کر اسے بچا سکتے ہو۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم اسے یعنی ایک ایسی لڑکی کو اتنی اہمیت کیوں دے رہے ہو جو اعلا عورتوں کی خدمت کے لیے پیدا ہوئی تھی اور جسے مقررہ وقت پر ختم ہو جانا ہے۔ بہرصورت میں تمھاری خاطر کوشش کروں گا مگر اس وقت وہ برج گرگوش میں گراچو کی قید میں ہے اور میں اس کی خاطر گراچو کو ختم نہیں کر سکتا۔ دوسرے جب تک گراچو، برج گرگوش میں ہے میں اس کا کچھ بگاڑ بھی نہیں سکتا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تم نے مجھے ٹالنے کے لیے کوشش کرنے

کا کہہ دیا ہے مگر صحیح معنوں میں تم ژدلے کو بچانا نہیں چاہتے ؟"

"نہیں سرفروش۔ اس وقت اسے بچانے کا موقع نہیں ہے لیکن موقع ملتے ہی میں تمھاری خواہش ضرور پوری کروں گا۔ اگر میں اس وقت ژدلے کو واپس بلاؤں تو گراچو فوراً مشکوک ہو جائے گا کہ تم نے سب کچھ ہمیں بتا دیا ہے۔ میں گراچو کے لیے توانائی کی ترسیل روک کر اُسے بے بس کر سکتا ہوں مگر اس طرح خود جبروت کا دفاع بھی ختم ہو جائے گا۔ تب گراچو پشکاتیوں کو لے کر ہم پر حملہ کر دے گا۔ تم یہ ساری باتیں کیوں نہیں سمجھتے ؟"

"میں سب سمجھتا ہوں گوما۔ تم ژدلے کو محض اشنار کے ڈر سے نہیں بچانا چاہتے کہ کہیں وہ تم سے ناراض نہ ہو جائے ۔"

"اس میں کوئی شک نہیں کہ تم بہت عقلمند ہو، سرفروش ! حقیقت یہی ہے کہ میں اشنار کی خفگی مول نہیں لے سکتا۔ تم نہیں جانتے کہ وہ کتنے اختیارات کی مالک ہے۔ شمورا تو برائے نام حکمراں ملکہ ہے ورنہ سب کچھ اشنار کے ہاتھوں میں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر میں اشنار کو نہ روکتا تو وہ اب تک اپنی بہن شمورا کو قتل کر کے . . . کھلم کھلا حکمراں ملکہ بھی بن جاتی۔ وہ اب بھی شمورا کو ختم کیے بغیر نہیں رہے گی۔ اب ایک بات اور بھی سُن لو۔ جس جُرم کی پاداش میں ژدلے کو سزا دی گئی . . . اشنار خود بھی وہ جُرم بار بار کر چکی ہے۔ وہ خفیہ طور پر مَردوں کے پنجرے سے کسی نہ کسی کو بلواتی رہتی ہے۔ وہ اگلی صبح اُس فرد کو کوئی ایسا زہر کھلا دیتی کہ وہ پنجرے میں واپس جاتے ہی مر جاتا۔ میں اس کے اس جُرم سے آگاہ ہوں مگر وہ اتنی دیدہ دلیر ہے کہ اُسے ذرا بھی پروا نہیں۔"

اب تک تو میں راشی ہی کو انتہائی سنگدل عورت سمجھتا رہا تھا مگر اب پتہ چلا کہ اشنار جیسی نرم و نازک لڑکی اُس سے کہیں زیادہ بے رحم اور پتھر دل ہے۔ وہ مقصد برآری کے لیے نہ تو رشتوں کا کوئی خیال کرتی ہے اور نہ ہی مذہب کے تقدس کا احترام کرتی ہے۔ رسم و رواج تک کی پروا نہیں کرتی۔

"اب تم خود ہی سوچو سرفروش ! اگر اشنار کو ذرا سا بھی شبہ ہو گیا کہ تم ژدلے میں دلچسپی رکھتے ہو تو یہ شک ہی ژدلے کی موت بن جائے گا۔ صرف اُس کی ہی نہیں، تمھاری اور میری موت بھی . . . مجھے نہ ژدلے کی پروا ہے اور نہ اپنی ! میں اپنی عُمر کے شبرے پورے کر چکا ہوں بلکہ ہر بار جب مجھے ختم کرنے کی باری آتی ہے تو اشنار میرے شبرے بڑھا دیتی ہے مگر میں تمھاری موت نہیں چاہتا کیونکہ مجھے تم سے بہت سی اُمیدیں ہیں۔ آؤ۔ اشنار تم سے ملنے کے لیے بے تاب ہو رہی ہو گی . . . اور پھر تمھیں "رسمِ فتح و جبر" بھی ادا کرنی ہے ۔"

●

جب رسم "فتح و جبر" کی تیاریاں مکمل ہو گئیں تو گوما مجھے اپنے ساتھ اکھاڑے میں لے آیا۔ اکھاڑہ ایک بار پھر پرستان بنا ہُوا تھا۔ اعلا نسب حسینائیں بھی اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ وہاں موجود تھیں اور کنیزوں کی فوج بھی موجزن تھی۔ ہر زبان پر میرے چرچے اور ہر لب پر میرا نام تھا۔ اب تک جبروت کے ہر فرد کو پتہ چل چُکا تھا کہ ہر موجہ جبروت، خرشان اور اہلِ خرشان کو بچانے کے لیے پہنچ گیا ہے اور اب رسم فتح و جبر انجام دی جانے والی ہے۔ جس میں یا تو ہر موجہ، شمورا اور اشنار سے اُن کی بھینٹ بالجبر وصول کرے گا یا اپنا سر اُن کی بھینٹ چڑھا دے گا۔

اس بار اکھاڑے میں حیوان نما سپاہیوں کے متعدد جتھے بھی جگہ جگہ متعین کر دیے گئے تھے۔ ایک خدشہ یہ بھی تھا کہ اعلا نسب کی "گرسنہ خواتین" کہیں باغی ہو کر مجھ پر نہ ٹوٹ پڑیں۔

اکھاڑے میں لانے سے پہلے مجھے عرقِ گلاب سے غسل دیا گیا تھا۔ غسل کے وقت بھی خواجہ سراؤں کا ایک دستہ میری نگرانی پر مامور تھا۔ غسل کے بعد مجھے ایک چھوٹا سا کپڑا ستر پوشی کے لیے دیا گیا کہ رسم کے مطابق میرے لیے یہی طے ہُوا تھا۔ میں اکھاڑے میں اپنی "تلوار" ساتھ لے جانا چاہتا تھا مگر مجھے اس کی اجازت نہ دی گئی۔ البتہ اتنی رعایت ضرور برتی گئی کہ مقدس تلوار میرا خادمِ خاص فرزیو سنبھالے رہے جو ایک نوعمر خواجہ سرا تھا۔

اکھاڑے میں آتے وقت بتایا گیا تھا کہ مجھے شمورا اور اشنار کا مقابلہ کرنا پڑے گا جن کے پاس تلواریں سپر اور بھالے ہوں گے مگر میرے پاس ایک تنکا بھی نہیں ہو گا۔

میں نے گوما سے پوچھا: "اس رسم میں دکھاوا کتنا ہو گا اور حقیقت کتنی ؟ کیا شمورا اور اشنار سچ مچ مجھے ہلاک کرنے کی کوشش کریں گی ؟"

"وہ یقیناً تمھیں مار ڈالنے کی بھرپور کوشش کریں گی۔" گوما نے جواب دیا۔ "اگر وہ ایسا نہیں کریں گی تو کتابوں کی پیش گوئی غلط ثابت ہو گی اور تمھیں کوئی بھی دیوتا تسلیم نہیں کرے گا۔ تمھیں اسی لیے نہتا رکھا گیا ہے کہ تم دیوتا ہو اور دیوتاؤں کو مقابلے کے لیے ہتھیاروں کی ضرورت نہیں پڑتی . . . البتہ تم شمورا اور اشنار کو "علامتی" طور پر قتل کرو گے۔ تمھیں یہ مقابلہ ہر حال میں جیتنا ہو گا، سرفروش ! ورنہ تم مارے جاؤ گے اور اگر تم مارے گئے تو

خرشان تباہ ہو جائے گا۔"

مجھے خرشان سے زیادہ خود اپنی فکر تھی۔ میں یہ سوچ کر ابھی سے گھبراہٹ میں مبتلا ہو رہا تھا کہ ہزاروں عورتوں، وحشیوں اور خواجہ سراؤں کے سامنے دو عورتوں سے کیسے مقابلہ کروں گا اور اگر میں نے مقابلے میں اُن پر قابو پا بھی لیا تو انھیں "علامتی موت" کیسے ماروں گا۔ میرے لیے اس مقابلے کا ہر پہلو بڑا شرمناک تھا مگر اس کے باوجود میں مقابلہ کرنے پر مجبور تھا۔

سوچنے کا وقت نہیں رہا تھا۔ تاہم میں نے کچھ نفسیاتی داؤ پیچ آزمانے کا فیصلہ کر لیا۔

گوما نے کہا تھا کہ اگر میں مقابلہ ہار گیا تو اشنار کے ہلکے سے اشارے پر حیوان نما سپاہیوں کے دستے مجھ پر ٹوٹ پڑیں گے اور میرے پرخچے اُڑا دیں گے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مرنے سے پہلے میں بہت سے سپاہیوں کو مار ڈالوں گا مگر پھر بھی اپنی جان نہیں بچا سکوں گا۔ شاید اسی لیے اکھاڑے میں جگہ جگہ سپاہیوں کے دستے متعین کر دیے گئے تھے اور ابھی مزید دستے آ رہے تھے۔

اکھاڑے کے وسط میں ترغون سے بنے ہُوئے دو شفاف حصے دار کمرے رکھ دیے گئے تھے۔ اُن کی لمبائی چوڑائی ایک ریلوے اپارٹمنٹ جتنی تھی۔ ایک کمرے میں دو مرصع کرسیوں پر شمورا اور اشنار بیٹھی تھیں اور دُوسرا کمرہ خالی تھا۔ شمورا اور اشنار بھی میری طرح مختصر لباس میں تھیں۔ شمورا حسبِ معمول ساکت و صامت بیٹھی . . . اپنے سامنے خلا میں گھورے جا رہی تھی جبکہ اشنار بے حد بیباق و چو بند اور چوکنّا نظر آتی تھی۔ گوما کا کہنا ٹھیک ہی تھا کہ اشنار کم عمر اور نرم و نازک ہونے کے باوجود اندر سے فولاد ہے۔ اس کا ذہن بے حد سازشی ہے اور اُس پر ایک پل یا ایک لمحے کے لیے بھی اعتماد نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی اُس کے کسی اقدام سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس کا نتیجہ کس شکل میں نمودار ہو گا۔ اکثر یوں معلوم ہوتا کہ وہ بازی ہارنے والی ہے مگر عین وقت پر پانسہ بیشتر اُسی کے حق میں پلٹ جاتا ہے۔ یہی وہ باتیں تھیں جنھوں نے مجھے نفسیاتی داؤ پیچ آزمانے پر اُکسایا تھا۔

میں جانتا تھا کہ جبروت کی اعلا نسل حسینائیں ترسی ہُوئی ہیں۔ سب سے پہلے میں نے انھیں اپنے قد و قامت سے مرعوب کرنا اور تندرست و توانا ہاتھ پیروں کی نمائش سے اُن کی گرسنہ نگاہوں کو تسکین پہنچانا ضروری سمجھا۔ چنانچہ اکھاڑے میں آنے کے بعد میں فن سازوں کی طرح مختلف پوز بناتے ہُوئے چاروں طرف گھوم گیا۔ میں نے دیکھا کہ بہت سے شیریں لبوں سے بے اختیار ہلکی ہلکی سیٹیاں نکل گئیں۔ بہت سے چہرے تمتما اُٹھے اور بے شمار آنکھوں میں جذبے انگڑائیاں لینے لگے۔ میں اُن کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ مجھے معلوم تھا کہ سیاہ داڑھی مونچھوں میں میرے سفید دانتوں کی قطار بھلی لگتی ہو گی۔ مجھے مسکراتے دیکھ کر حسینانِ جبروت بھی مسکرانے لگیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ مسحور ہو کر میرے پیچھے پیچھے چل پڑی ہیں۔ میں نے اُن کی طرف ہاتھ لہرایا تو جواب میں لاتعداد بازو شاخِ گل کی طرح لہرا گئے۔

میں کن انکھیوں سے اشنار کا بھی جائزہ لیتا جا رہا تھا۔ وہ اپنی جگہ بُری طرح کھول رہی تھی۔ ان حرکات سے میرا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اشنار کے دل میں زیادہ سے زیادہ جذباتِ رقابت بیدار کر دوں تاکہ اُس کے دل میں میری تمنا بھڑک اُٹھے اور اگر وہ مجھے قتل کرنے کا منصوبہ بنا بھی چکی ہو تو کم از کم وقتی طور پر اسے ملتوی کر دے۔ چنانچہ میں نے اُسے مزید تاؤ دلانے کے لیے حسینانِ جبروت کو سلام کیا اور پھر ایک قہقہہ لگایا تو وہ بھی بے اختیار ہنس پڑیں۔ انتہا تو یہ ہے کہ حیوان نما وحشی سپاہی اور خواجہ سرا بھی یُوں ستائشی انداز میں سر ہلانے لگے جیسے میں نے اُن پر تنویمی عمل کر دیا ہو۔

. . . اور ان ساری باتوں کا اشنار پر وہی ردِّعمل ہُوا جو میں چاہتا تھا لیکن شمورا اب بھی اُسی طرح ایک مرمریں مجسّمے کی صورت، ہر بات سے لاتعلق ساکت و صامت بیٹھی تھی۔ اتنے میں نہ جانے کہاں سے موسیقی کی مدھم آواز آنے لگی، جو بتدریج بلند ہوتی چلی گئی۔

میں قدم قدم اُس شفاف کمرے کی طرف بڑھنے لگا جس میں شمورا اور اشنار بیٹھی تھیں۔ دونوں کے . . . ایک ہاتھ میں تلوار اور دُوسرے میں ڈھالیں تھیں۔ بھالے فرش پر اُن کے نزدیک رکھے ہُوئے تھے۔ قریب جانے پر پتہ چلا کہ وہ دو کمرے نہیں بلکہ کمرہ تو ایک ہی ہے جس کا دُوسرا حصہ، شمورا اور اشنار سے مقابلے اور انھیں "علامتی موت" مارنے کے لیے خالی چھوڑ دیا گیا تھا۔ جب میں کمرے کے مختصر سے زینے کے پاس پہنچ گیا تو ایک خواجہ سرا نے اُس کا دروازہ کھول دیا۔ اشنار اپنی کرسی سے اُٹھ کر آگے بڑھی اور بولی: "آؤ دیوتا آؤ۔ ہمیں علامتی موت مارو یا خود مر جاؤ !"

میں نے ایک نظر دونوں بہنوں پر ڈالی۔ اُن کے چہرے، اُن کے جسم، اُن کے نین نقش سب یکساں تھے۔ فرق تھا تو صرف اتنا کہ اشنار کے بال سیاہ لیکن شمورا کے بال ملکہ اول کے بالوں کی

مرخ سُرخ تھے جسے مَیں نے تالابِ توانائی والے چیمبر میں دیکھا تھا۔

مَیں نے پہلی سیڑھی پر قدم رکھا تو اشنار کمرے کے وسط میں تن کر کھڑی ہو گئی۔

مَیں نے دُوسرے زینے پر قدم رکھا تو اُس نے تلوار یُوں سونت لی جیسے ایک ہی وار میں میرا سر قلم کر دے گی۔

مَیں نے تیسری سیڑھی پر پاؤں رکھا تو اُس نے اپنی ٹانگیں پھیلا کر مضبوطی سے قدم جما لیے اور ڈھال کو بھی اس حالت میں لے آئی کہ حملے کی صُورت میں بچاؤ کے کام آ سکے۔ چوتھے زینے پر قدم رکھنا موت کی دہلیز پر قدم رکھنے کے برابر تھا۔

مَیں ایک لمحے کے لیے رُک گیا۔

اکھاڑے میں ہر طرف موت کی سی خاموشی چھا گئی۔

مَیں اشنار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتا اور سوچتا رہا کہ وہ مجھ پر کیسے وار کرنا چاہتی ہے۔ اُس کے پھیلے ہوئے بازُو سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ دائیں سے بائیں تلوار چلائے گی اور اگر مَیں اپنے دائیں جانب ہٹا تو وہ اپنی ڈھال میرے چہرے پر مارے گی چنانچہ مَیں نے کمرے کے فرش پر قدم رکھنے سے پہلے ہی اپنے دفاع کی ترکیب سوچ لی۔

مَیں نے اچانک قدم بڑھایا اور یکدم جُھکائی دے کر اشنار کی تلوار کے نیچے سے اس کے پیچھے نکل گیا مگر یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ اشنار نے تلوار دائیں سے بائیں نہیں چلائی تھی بلکہ اُسے میرے دل میں گھونپنے کی کوشش کی تھی گوما ٹھیک ہی کہتا تھا کہ اُس کا اقدام بظاہر کچھ نظر آتا ہے مگر وہ کرتی کچھ اور ہی ہے۔ یہاں بھی اُس نے ایسا ہی کیا تھا۔ اگر مَیں سانپ کی طرح لہرا کر تلوار والے ہاتھ کے نیچے سے نہ نکل جاتا تو میرا کام تمام ہو چکا ہوتا۔ اتنے میں وہ بھی پلٹ گئی اور چلّائی: "اُٹھو شمورا... حملہ کر دو۔"

... لیکن شمورا خاموش بیٹھی رہی۔

اشنار ایک بار پھر زور سے چلّائی: "شمورا... اُٹھو۔ اسے قتل کر دو۔ یہ تم سے تمھاری ذات کی بھینٹ لینا چاہتا ہے۔"

شمورا یُوں چونکی جیسے نیند سے بیدار ہوئی ہو۔ وہ تلوار اور ڈھال لیے ہُوئے ایک دم اُٹھی مگر مجھے ایسا لگا جیسے وہ نشے میں ہو۔ اس لیے کہ اُس کی نگاہیں پھر ایک جگہ مرتکز ہو کر رہ گئی تھیں۔

اب شمورا میرے آگے تلوار سونتے کھڑی تھی اور اشنار پیچھے سے آہستہ آہستہ میری طرف بڑھ رہی تھی۔ اچانک شمورا نے تلوار سر سے بلند کی۔ یہی وہ لمحہ تھا جب مَیں نے جُھکائی دی اور چشم زدن میں اُس کے پیچھے آ کر ایک بازو اُس کی کمر میں ڈال دیا اور دُوسرے ہاتھ سے کلائی مروڑ کر اُس سے تلوار چھین لی۔ شمورا تو بیلے کی ڈال جیسی نازک لڑکی تھی۔ مجھے اسے نہتا کرنے میں بمشکل آدھا منٹ لگا ہو گا۔ مَیں نے اُس کی تلوار اور ڈھال دُوسری طرف پھینک دی اور ایک نظر اشنار پر ڈالی جو کسی چیتے کی طرح دبے پاؤں میرے عقب میں بڑھ رہی تھی۔ مَیں شمورا کو ڈھال بنائے پلٹ گیا۔

"جلدی کرو ہرموجہ۔ اسے علامتی موت مار دو۔ یہ مدافعت کے قابل نہیں ہے۔" اشنار نے تیز سرگوشی کی۔

اشنار کی اس بات پر مجھے گوما کی باتیں یاد آ گئیں۔ مَیں سمجھ گیا کہ اقتدار کی خاطر اشنار نے شمورا کو منشیات کا عادی بنا دیا ہے۔ اس لیے وہ بے حس و حرکت بیٹھی رہتی ہے اور سارا کاروبارِ حکومت اشنار انجام دیتی ہے۔

"تم چاہتی ہو کہ مجھے شمورا کی طرف متوجہ کر کے عقب سے حملہ کر دو۔"

"تم کیسے دیوتا ہو کہ مجھ سے ڈر رہے ہو۔" اُس نے طنز کیا۔ "مَیں تو اس لیے کہہ رہی تھی کہ مجھے تمھاری ضرورت ہے۔"

شمورا اب میرے بازُو کے حلقے میں جھول رہی تھی۔ مَیں نے اُسے فرش پر گرا دیا لیکن ابھی مَیں اُسے لِٹا کر اُٹھا بھی نہیں تھا کہ اشنار نے اُچھل کر مجھ پر تلوار سے ضرب لگائی اگر مَیں دو سیکنڈ پہلے نہ ہٹ جاتا تو تلوار شمورا کی بجائے میری گردن پر پڑ چکی ہوتی۔

شمورا تلوار کی ضرب سے چیخی تو اشنار اُس کی طرف متوجہ ہو گئی۔ میرے لیے اتنی ہی مہلت کافی تھی۔ مَیں نے فوراً جھپٹ کر تلوار والی کلائی پکڑ لی مگر وہ بے حد پھرتیلی ثابت ہُوئی۔ اُس نے بائیں ہاتھ میں پکڑی ہُوئی ڈھال پھینک کر تلوار اُس میں منتقل کر لی اور مَیں اُس کی کلائی چھوڑنے پر مجبُور ہو گیا۔ جُونہی مَیں تلوار کی زد سے نکلا، اُس نے لپک کر بھالا اُٹھا لیا۔

اب اُس کے ایک ہاتھ میں تلوار اور دُوسرے میں بھالا تھا۔ مَیں نے شفاف کمرے سے باہر دیکھا۔ حیوان نما سپاہی جوش و خروش سے اُچھل رہے تھے جبکہ بہت سے

خواجہ سراؤں نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا تھا اور املانس کی خواتین دم بخود ہماری طرف دیکھ رہی تھیں۔

اشنار گرانو سے بھی کہیں زیادہ عیار اور خطرناک ثابت ہو رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اُس پر کیسے قابُو پاؤں۔ مقابلے کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ مجھے نہ تو اُسے زخمی کرنا ہے اور نہ ہی کوئی ہتھیار استعمال کر سکتا ہوں۔

اشنار کبھی مجھ پر بھالا تولتی اور کبھی تلوار... وہ کسی بھی لمحے مجھ پر بھالا پھینک سکتی تھی۔ اس لیے مَیں بار بار جگہ بدلنے پر مجبُور تھا۔ اُدھر وہ بھالے اور تلوار کی زد پر مجھے ایک کونے میں گھیر رہی تھی۔ بالآخر مَیں ایک کونے میں گِھر ہی گیا۔ اشنار کے ہونٹوں پر بڑی ہی سفاک مسکراہٹ اُتر آئی۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹی اور مشاق نیزے بازوں کی طرح بھالا تول کر مجھ پر جھپٹی۔

مَیں بجلی کی سی سُرعت سے ایک طرف ہٹا، بھالا کیبن کی شفاف دیوار سے ٹکرایا اور اس سے پہلے کہ وہ مجھ پر دُوسرا وار کرتی، مَیں نے بھالا پکڑ کر ایک جھٹکے سے اپنی طرف کھینچا تو وہ مجھ پر آ گری۔ مَیں نے دونوں ہاتھوں سے اُس کی کلائیاں پکڑ لیں۔ اب وہ وار کرنے سے قاصر تھی مگر اُس نے اپنے دانت میرے ایک بازُو میں گاڑ دیے۔

مَیں درد کی شدت سے بلبلا اُٹھا لیکن مَیں نے اس کی کلائیاں اُس وقت تک آزاد نہ کیں جب تک کہ دونوں ہتھیار اُس کے ہاتھوں سے فرش پر نہیں گِر گئے... پھر مَیں نے اپنا ایک ہاتھ اُس کے بالوں میں ڈال کر جھٹکا دیا تو وہ چیخ کر پیچھے ہٹ گئی۔

مَیں نے اشنار پر بھی قابُو پا لیا تھا۔ اب وہ مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی۔ مَیں نے کمرے کی شفاف دیوار سے باہر دیکھا۔

تماشائی اُچھل اُچھل کر نعرے لگا رہے تھے مگر اُن کی آواز اندر نہیں آ رہی تھی۔ تاہم اُن کے اُچھلنے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ میری جیت پر خوش ہیں۔ اُنھوں نے مجھے اپنی جانب دیکھتے پا کر سر خم کرنے شروع کیے تو مَیں سمجھ گیا کہ اُنھوں نے مجھے ہرموجہ تسلیم کر لیا ہے۔

جہاں ایک جانب مجھے اس وحشی بلّی پر قابو پانے کی خوشی تھی، وہاں مجھے اُس کی عیاری اور مجھے قتل کرنے کی سازش پر بے حد غصہ بھی آ رہا تھا۔ مَیں نے وہیں کھڑے کھڑے فیصلہ کر لیا کہ مَیں اُسے "علامتی موت" مارتے ہُوئے اپنا غصہ اُتارُوں گا اور مَیں نے ایسا ہی کیا۔ اس دوران وہ چیخ چیخ کر روتی اور منت سماجت کرتی رہی لیکن مَیں نے اُس کی ایک نہ سُنی۔

اب مَیں شمورا کی طرف متوجہ ہُوا تو یہ دیکھ کر میری آنکھیں فرطِ حیرت سے پھٹی رہ گئیں کہ وہ مر چکی تھی۔

●

اس رسمِ فتح و جبر کے تقریباً ایک ماہ بعد تک جبروت میں جشن منایا جاتا رہا۔ شمورا کو اگرچہ اشنار نے زہریا منشیات کی زیادہ مقدار کھلا کر مار دیا تھا لیکن لوگوں کو یہ بتایا گیا کہ وہ میرے حقیقی ہرموجہ ثابت ہونے کی خوشی برداشت نہ کر سکی اور ہلاک ہو گئی۔

اب مَیں اور اشنار، جبروت اور خرشان کے حکمران تھے۔ اہلِ خرشان کو اُن کا موعود دیوتا مِل چکا تھا۔ مجھے املانس کی اُن خواتین سے متعارف کرایا گیا جن کے ہاتھوں میں ملک کا اقتدار تھا لیکن جو میرے اور اشنار کے زیرِ نگیں تھیں، وہ سب ایک ایک کر کے میرے سامنے لائی گئیں۔ مَیں نے بظاہر اُن پر کوئی توجہ نہ دی کیونکہ مَیں اشنار کو جذبۂ رقابت میں مُبتلا کر کے اپنے لیے کوئی نئی مُصیبت کھڑی نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن مَیں انھیں گِنتا ضرور رہا تھا۔ اُن کی تعداد نو سو ننانوے تھی۔ ہر خاتون حُسن میں یکتا اور کشیدہ قامت تھی۔ اس لیے کہ پیدائش کے بعد ہر لڑکی کو بڑی سختی سے جانچا اور پرکھا جاتا تھا۔ جو لڑکی کسی بِنا پر حُسن کے معیار پر پُوری نہ اُترتی تو اُسے اُسی وقت ہی ختم کر دیا جاتا تھا۔ اُن کی تعداد پر بھی قابو رکھا جاتا تھا جو ہمیشہ ایک ہزار سے ایک کم ہی رہتی تھی۔ مجھے اُن خواتین کی عمر کا بھی کوئی اندازہ نہ ہو سکا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وقت اُن کے چہروں اور جسموں پر اپنے نقوش چھوڑنے میں ناکام رہتا ہے یا اُس کے نقوش ثبت ہونے سے پہلے ہی اُن کے شُبرُوں کی تعداد پُوری ہو جاتی ہے۔

مَیں نے اُن پنجروں کا بھی معائنہ کیا جن میں خرشان کے اعلا مرد قید رکھے جاتے تھے تاکہ میلۂ خُون کی قربانی کے لیے اُنھیں کام میں لایا جا سکے۔ اُن کی پرورش اور نگہداشت کے سارے فرائض خواجہ سرا انجام دیتے تھے۔ مَیں نے سوچا کہ جب مَیں حقیقی معنوں میں خرشان کا حکمراں بن جاؤں گا تو موجودہ نظام یکسر بدل ڈالوں گا۔ فی الوقت مَیں وہاں کے حالات اور دُوسری باتوں کی کھوج میں لگا ہُوا تھا تاکہ وقت آنے پر مناسب اقدام کر سکوں۔ میری آمد سے پہلے یہاں ایک مخصوص

قسم کی بادشاہت قائم تھی۔ سارے امورِ سلطنت خواجہ سرا انجام دیتے تھے جن کا سربراہ گوما تھا جو خواجہ سراؤں کا بادشاہ کہلاتا تھا۔ گوما صرف شورا اور اشنار کو جواب دہ تھا۔

خمرشان کے چھ صُوبے تھے۔ ہر صُوبے پر ایک ایک خواجہ سرا گورنر کی حیثیت سے متعین تھا۔ جب تک ان صُوبوں سے پے وا کی پیداوار آتی رہتی تھی اور حیوان نما انسان بغاوت نہیں کرتے تھے۔ ان خواجہ سراؤں سے کوئی باز پُرس نہیں کی جاتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ گرانجو جیسے اقتدار کے لالچی مرکزی حکومت کے خلاف سازش کرنے سے باز نہیں آتے تھے۔

کنیزوں کے علاوہ کچھ لونڈیاں ایسی بھی تھیں جن سے افزائشِ نسل کا کام لیا جاتا تھا۔ میں نے جبروت میں بچّہ گھر بھی دیکھے۔ یہاں ان لونڈیوں کو رکھا جاتا تھا جو اُمید سے ہوتی تھیں اور سولڑکوں میں سے بمشکل ایک یا دو زندہ رکھے جاتے تھے تاکہ جب وہ میلۂ خوُن۔ کے مرحلے سے گزر جائیں تو اُن سے مزید افزائشِ نسل کا کام لیا جاسکے۔ اسی طرح کچھ لڑکیاں زندہ رکھی اور پروان چڑھائی جاتی تھیں جو جوان ہوں یا بڑی ہوکر کنیزوں اور لونڈیوں کے فرائض انجام دے سکیں۔ خواجہ سراؤں کی نسل کشی نہیں کی جاتی تھی بلکہ انھیں سائنسی عمل کے ذریعے بوتلوں میں جنم دیا جاتا تھا اور اُن کی درجہ بندی کی جاتی تھی۔ وہ انسانی بچّوں کی بہ نسبت بہت تیزی سے پروان چڑھتے تھے اور اُنھیں مقررہ شہرے عطا کر دیے جاتے تھے۔ شہرے وہاں کے ماہ و سال کا نام تھا۔

حیوان نما غلام اور سپاہی ابھی انسانی ارتقا کے مراحل سے گزر رہے تھے۔ اُن کی افزائشِ نسل قدرتی طریقے پر تذکیر و تانیث کے ملاپ سے ہوتی تھی۔ محنت، مزدوری، کاشت کاری اور تمام گھٹیا خدمات انھی لوگوں سے لی جاتی تھیں۔ ان کی زبان بھی خمرشانیوں سے مختلف تھی اور یہ اپنے مالکوں کے بے حد وفادار تھے۔

میرے اور گوما کے درمیان گرانجو کے متعلق اکثر بات چیت ہُوا کرتی تھی۔ گوما نے جنوبی صوبہ خراگ کو، جہاں برج گرگوش واقع تھا، توانائی کی ترسیل کم کر دی تھی تاکہ گرانجو کھُل کر سامنے آئے مگر گرانجو توانائی کی کمی پر خاموش رہا تو گوما نے موسم کو متاثر کرنے والے مقناطیسی پردے کی استعداد بھی گھٹا دی لیکن گرانجو کی طرف سے کوئی احتجاج ہوا اور نہ ہی یہ اطلاع ملی کہ وہ لپشکانیوں کے ساتھ حملے کی سازش کر رہا ہے یا نہیں۔

ایک رات جب میں، اشنار کے ساتھ تھا اور وہ گہری نیند میں ڈوبی ہوئی تھی تو میں نے خواب گاہ کے ایک کونے میں گرانجو کا تصویری پیکر نمودار ہوتے دیکھا۔ وہ خلافِ معمول وردی میں تھا اور اُس نے ہلکے پھُلکے ہتھیار بھی جسم پر سجا رکھے تھے۔ وہ میری طرف دیکھ کر استہزائیہ انداز میں مسکرایا مگر میں خاموش رہا۔ وہ آگے بڑھا اور اشنار کو عجیب نظروں سے دیکھتے ہُوئے بولا۔ "میں اسے آج پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔ یہ واقعی بے حد خوبصورت ہے۔ تم نے اسے کیسا پایا؟"

"ٹھیک ہے۔" میں نے مختصر سا جواب دیا۔

"اس کا مطلب ہے کہ تم یہاں بہت خوش ہو۔ ایسا ہونا بھی چاہیے۔ یہ بتاؤ کہ تم نے میرے منصُوبے پر عمل کیوں نہیں کیا؟"

"کیا تم واقعی یہ سمجھتے تھے کہ میں تمھارے منصُوبے پر عمل کروں گا؟"

"نہیں۔ میں جانتا تھا تم اتنے بے وقوف نہیں کہ میرے منصُوبے کے مطابق توانائی کا مخرج برباد کر کے خود بھی تباہ ہو جاؤ۔ اگر میں تمھیں اتنا احمق سمجھتا تو کبھی تم سے کام نہ لیتا۔"

"پھر تم نے مجھے توانائی کا مخرج تباہ کرنے کے لیے کیوں کہا تھا؟"

"میں تمھارا امتحان لینا چاہتا تھا۔" گرانجو سر کھُجاتے ہُوئے بولا۔ "تم ہمارے لیے ایک اجنبی سرزمین کے اجنبی باشندے تھے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ تم احمق ہو یا دانش مند۔"

"اب تو تم جان گئے ہو کہ میں احمق نہیں ہوں۔ میں ہر موجہ ہوں اور اشنار کے ساتھ یہاں کا حکمراں ہوں۔"

"میں خود بھی یہی چاہتا تھا، میرے دوست۔" گرانجو نے مسکرا کر کہا۔ "دراصل، میں نے دو منصُوبے بنائے تھے۔ پہلا یہ کہ اگر تم اتنے احمق ثابت ہُوئے کہ تم نے توانائی کا مخرج تباہ کر دیا اور خود بھی تباہ ہو گئے تو لپشکانی، خمرشان پر یلغار کر دیں گے... لیکن مجھے اعتراف ہے کہ میرا یہ منصُوبہ اچھا نہیں تھا۔ اس طرح میں خمرشان پر تو قابض ہو جاتا لیکن توانائی سے محروم ہی رہتا اور اسے دوبارہ پیدا کرنے کے لیے بہت عرصہ لگ جاتا جبکہ لپشکانیوں کو قابو میں رکھنے کے لیے مجھے توانائی کی ضرورت ہے۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ وہ کیسے وحشی لوگ ہیں۔"

"ہاں۔ راشی کیسی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اچھی ہے۔" وہ مسکراتے ہُوئے بولا۔ "مگر اب وہ کچھ بدل گئی ہے۔ پہلے وہ مجھ سے نفرت کرتی تھی اور میری توہین کرنے سے باز نہیں آتی تھی لیکن آج کل وہ مجھے پسند کرنے لگی ہے۔ اور سچ بات تو یہ ہے کہ میں بھی اُسے پسند کرتا ہُوں کیونکہ وہ منفرد شخصیت کی مالک ہے۔"

"لیکن تم تو ایک خواجہ سرا ہو گرانجو۔ پھر تمھیں اس سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟"

"ہو سکتا ہے، میں خواجہ سرا نہ رہوں۔ کم از کم راشی کا تو یہی خیال ہے اور یہ بھی مت بھُولو کہ سائنس کے سارے معجزے صرف جبروت ہی میں نہیں ہوتے۔ وہ کہیں اور بھی رُونما ہو سکتے ہیں۔"

"کیا مطلب؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"ہزارہا شہرے پہلے جب خمرشان میں یہ سائنسی نظام رائج نہیں ہُوا تھا، یہاں ایک چیز بیماری کے نام سے مشہور تھی۔ لوگ اس میں مُبتلا ہو کر مر جاتے تھے مگر اہلِ خمرشان میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو اس کا علاج کرتے اور حکیم یا جراح کہلاتے تھے۔ جب سائنسی نظام عروج پر آنے لگا تو اہلِ خمرشان کو ان لوگوں کی ضرورت نہ رہی چنانچہ وہ ملک سے باہر یا دُور دراز حصّوں میں چلے گئے۔ مجھے ایک ایسے ہی حکیم یا جراح کی تلاش تھی۔ آخر مجھے پتہ چل گیا کہ مغربی صوبے میں ایک ایسا حکیم و جراح اب تک زندہ ہے۔ میں نے اپنے وحشی سپاہی وہاں بھیج کر اُسے بُلوا لیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں ذہنی طور پر تو مرد ہُوں لیکن ایک خاص عمل جسے وہ آپریشن کا نام دیتا ہے، اس کے بعد میں جسمانی طور پر تم جیسا بن سکتا ہوں۔ تمھارا کیا خیال ہے سرفروش، کیا ایسا ممکن ہے؟"

"تمھاری خواہشات روز بروز بڑھتی جا رہی ہیں گرانجو۔ پہلے تم خمرشان کے حکمراں بننا چاہتے تھے۔ اب تم مرد بھی بننا چاہتے ہو۔ میں تمھیں صرف یہ مشورہ دے سکتا ہُوں کہ ہر معاملے میں ہوشیار رہو اور سوچ سمجھ کر قدم اُٹھاؤ۔"

"میں جانتا تھا کہ تم یہی کہو گے۔" وہ بولا۔ "تم اس وقت سے بہت بدل گئے ہو سرفروش جب میں نے بردنگا کو تباہ کر کے تمھیں حراست میں لیا تھا۔ تمھارے دل میں میرے خلاف نفرت کا لاوا اُبل رہا ہے۔ اس لیے تم میرے منصُوبے میں میرا ساتھ دینے پر آمادہ نہیں ہو۔"

مجھے ایک بار پھر محسُوس ہُوا جیسے گرانجو نے میرے خیالات پڑھ لیے ہوں۔ میں نے کہا۔ "ہو سکتا ہے، تمھارا خیال ٹھیک ہو لیکن اب مجھے تمھاری ضرورت نہیں رہی۔ سب نے مجھے ہر موجہ کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔ مجھے اشنار مل گئی ہے اور میں یہاں کا حکمراں بن چکا ہُوں۔ تم مجھے کیا دے سکتے ہو؟ مجھے سب کچھ حاصل ہو چکا ہے۔ تمھارے لیے یہی کیا کم ہے کہ میں نے تمھارے خلاف کوئی اقدام نہیں کیا اور تمھیں جنوبی صوبۂ خراگ کا گورنر رہنے دیا ہے۔ اب تمھیں لپشکانیوں کے ساتھ مل کر سازش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جب میں اپنی تیاریاں مکمل کر لُوں گا تو خود ہی اُنھیں تباہ کر دُوں گا۔"

"اور کچھ کہنا ہے تمھیں؟" گرانجو نے پوچھا۔

"نہیں۔ اب تم جا سکتے ہو۔" میں نے جھُوٹ مُوٹ جمائی لے کر کہا۔ "میں تھکا ہُوا ہُوں اور سونا چاہتا ہُوں۔"

"میں چلا جاؤں اور تم میرے لگائے ہُوئے پودے سے پھل کھاتے رہو۔ نہیں سرفروش! تم نے یہ کہہ کر اپنے آپ کو وحشی غلاموں سے بھی زیادہ احمق ثابت کر دیا ہے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ تمھاری ایک بہت بڑی کمزوری میرے ہاتھ میں ہے۔ مگر تم یُوں ظاہر کر رہے ہو جیسے اب وہ تمھاری کمزوری نہیں رہی۔ ٹھہرو۔ میں تمھیں ایک دلچسپ تماشا دکھاتا ہُوں۔ اگر گوما مقناطیسی پردوں کی استعداد اور توانائی کی مقدار کم نہ کرتا تو میں تمھیں تماشے کی بجائے حقیقی منظر دکھا دیتا لیکن گوما چاہتا ہے کہ میں احتجاج یا التجا کرنے یہاں آؤں تو وہ مجھے گرفتار کر لے... مگر میں احمق نہیں ہُوں۔ اس لیے تصویری پیکر میں یہاں آیا ہُوں جسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اُسے بتا دینا کہ میں تجسیم میں اس وقت یہاں آؤں گا جب لپشکانی میرے ساتھ ہوں گے اور میں ایک فاتح کی حیثیت سے یہاں قدم رکھوں گا۔ خیر ہٹاؤ۔ تم تماشا دیکھو۔"

"ٹھہرو گرانجو۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "تماشا دکھانے سے پہلے یہ بتاؤ کہ جب مقناطیسی پردوں اور تمھیں فراہم کی جانے والی توانائی کی استعداد گھٹا دی گئی ہے تو پھر تمھارا تصویری پیکر یہاں کیسے پہنچ گیا؟"

"یہ تو بچّوں کا سا سوال ہے سرفروش۔" وہ بولا۔ "میں نے بُرج گرگوش میں اپنے مخرج لگا رکھے ہیں جو اسی کم توانائی سے چل رہے ہیں اور مجھے مطلوبہ توانائی فراہم کر رہے ہیں۔ خیر۔ ادھر دیکھو۔" یہ کہہ کر اُس نے خواب گاہ کے مرکز کی طرف انگلی اٹھائی تو ایک منظر اُبھرنے لگا۔ یہ بڑا مکروہ اور گھناؤنا منظر تھا۔

بُرج گرگوش کے ایک کمرے میں راشی کے ہاتھ پاؤں چار کھونٹوں سے باندھ دیے گئے تھے اور وہ فرش پر لیٹی چیخ رہی تھی۔ ہر چند کہ اُس کی آواز نہیں آ رہی تھی مگر مجھے یُوں محسُوس ہو رہا تھا جیسے وہ چیخ چیخ کر فریاد کر رہی ہو۔ مدد کے لیے پکار

رہی ہو... مگر اُس کی مدد کو وہاں کوئی نہیں تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں راشی خنجر لیے قہقہے لگا رہی تھی اور وحشی سپاہی باری باری ژولے کے ساتھ ذلیل ترین تشدد کیے جا رہے تھے۔ پھر راشی اُس کے قریب آئی اور اُس نے خنجر ژولے کی گردن میں چبھونا شروع کر دیا۔ ژولے اس نئے کرب سے کراہ اٹھی۔ مَیں نے بے ساختہ گرانجو کے تصویری پیکر سے کہا: "بس۔ بند کرو یہ مکروہ نظارا۔"

وہ ہنسا اور بولا: "ابھی تم نے پورا منظر دیکھا ہی کہاں ہے۔ آگے دیکھو کہ ہوتا کیا ہے۔" یہ کہہ کر اُس نے پھر انگلی سے اشارہ کیا تو دُوسرا منظر اُبھرنے لگا۔

ژولے ہوش و حواس کھو چکی تھی لیکن اس عالم میں بھی سسکیاں لیے جا رہی تھی۔ اب چار وحشیوں نے اُسے ہاتھ پاؤں سے ڈنڈا ڈولی کر رکھا تھا۔ راشی نے اُنھیں حکم دیا تو اُنھوں نے اسے بُرج کی تیسری منزل سے نیچے پھینک دیا۔ ژولے اُن نوکیلے کھونٹوں پر جا گری جو پہلے سے وہاں گڑے ہوئے تھے۔

یہ رُوح فرسا منظر دیکھ کر مَیں نے آنکھیں بند کر لیں۔ مَیں غم و غصّے سے لرز رہا تھا اور میرا پُورا جسم پسینے سے شرابور ہو گیا۔ مجھے دُکھ تھا تو اس بات کا کہ میرے سامنے گرانجو کا تصویری پیکر ہے۔ کاش وہ حقیقت میں میرے سامنے ہوتا تو مَیں عملاً اُس کا خُون پی جاتا اور پھر اُس کے پرخچے اُڑا دیتا۔

"تمھارے غرشا... کے سارے دیوتاؤں کی قسم! مَیں تمھارے ساتھ اس سے بھی بُرا سلوک کروں گا جو تم نے ژولے سے کیا ہے۔" مَیں نے کہا۔

گرانجو قہقہہ لگا کر بولا: "چلو تمھاری نیت تو ظاہر ہو گئی ویسے ابھی مَیں نے ژولے کے ساتھ یہ سلوک نہیں کیا اور وقت سے پہلے تمھیں وہ سب کچھ دکھا دیا ہے جو اُس وقت عمل میں لایا جائے گا جب تم میرا حکم ماننے سے انکار کر دو گے۔ بولو! کیا ارادہ ہے؟"

"تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" مَیں نے پُوچھا۔

اس پر اُس نے مختصراً اپنا منصوبہ بتا دیا کہ وہ مجھ سے کیا کام لینا چاہتا ہے۔ مَیں نے غم و غصّہ ضبط کرنے کے لیے ایک بار پھر آنکھیں بند کر لیں۔

"آنکھیں بند کر لینے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا سرفروش! مَیں جانتا ہُوں ژولے تمھاری کمزوری ہے اور جو لوگ کسی کی کمزوری سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتے وہ احمق کہلاتے ہیں اور گھاٹے میں رہتے ہیں۔"

اتنے میں اشنار نے کروٹ لی تو مَیں نے جلدی سے کہا: "اچھی بات ہے گرانجو۔ چلو اب دفع ہو جاؤ۔"

دُوسرے ہی لمحے وہ ہوا میں تحلیل ہو گیا۔

اشنار نے کروٹ بدلی اور ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی پھر مجھے بستر کے کنارے بیٹھا دیکھ کر بولی: "کیا بات ہے دیوتا، تم کچھ پریشان نظر آ رہے ہو؟"

"مَیں نے ابھی ایک ڈراؤنا خواب دیکھا ہے، اس لیے اُٹھ گیا۔"

"تم جبروت میں خوش تو ہو نا؟ مجھ سے کوئی شکایت تو نہیں؟"

"نہیں۔ مَیں تم سے بے حد خوش ہُوں۔" مَیں نے جواب دیا۔ "بہرحال مَیں ذرا گوما سے ملنے جا رہا ہُوں۔"

"تم روزانہ گوما سے ملتے ہو، باتیں کرتے ہو، منصوبے بناتے ہو مگر لشکانیوں کا مسئلہ اب بھی وہیں ہے جہاں پہلے تھا۔"

مَیں نے تلوار اُٹھائی اور دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا: "اب یہ مسئلہ بلا تاخیر حل ہونا چاہیے... اور یہ حل ہو کر رہے گا۔" یہ کہہ کر مَیں خواب گاہ سے نکل گیا۔

مختلف سرنگوں اور راہ داریوں سے گزرتے ہوئے مَیں نے سوچا کہ اگر مَیں ژولے کو بھول جاؤں تو گرانجو اور لشکانیوں کا مسئلہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو سکتا ہے۔ آخر ژولے سے میرا تعلق ہی کیا ہے۔ صرف اتنا کہ وہ میری خوش وقتی کی رفیق بنی تھی... اور اگر ایک فرد کی قربانی سے لاتعداد زندگیاں سنور جائیں تو مجھے اپنے دل پر پتھر رکھ ہی لینا چاہیے... لیکن کیا مَیں واقعی اپنے دل پر پتھر رکھ سکتا تھا؟

●

جب مَیں کمپیوٹر چیمبر میں گوما سے ملا تو فیصلہ کر چکا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ مَیں گوما کو توانائی والے تالاب کے کمرے میں لے گیا تاکہ ہماری گفتگو کوئی تیسرا فرد نہ سُن سکے۔

"جنوبی صوبہ خزاگ اور بُرج گرگوش کو توانائی کی فراہمی بالکل بند کر دو۔ گرانجو حملے کی تیاری کر چکا ہے۔ مَیں چاہتا ہُوں کہ وہ بلا تاخیر جبروت پر حملہ کر دے۔ اُس کی اور لشکانیوں کی آمد تک مَیں بھی ساری تیاریاں مکمل کر لوں گا۔"

گوما کچھ دیر خاموشی سے میری طرف دیکھتا رہا، پھر بولا: "ہاں۔ میرا خیال ہے کہ وہ وقت آ گیا ہے۔ مگر کیا تم گرانجو سے ملے ہو۔ کیا وہ تصویری پیکر میں یہاں آیا تھا؟"

"ہاں وہ آیا تھا اور مجھے دھمکی دے گیا ہے۔" پھر مَیں نے اُسے ژولے والی ساری تفصیل بتا دی۔

"کیا تم نے اُس کا ساتھ دینے پر رضامندی کا اظہار کیا ہے؟"

گوما نے پوچھا۔

"میں نے اسے دھوکا دینے کے لیے کہہ دیا کہ میں اُس کا ساتھ دُوں گا۔ مجھے تم سے ملنے اور تیاری کے لیے وقت درکار تھا۔ اُس نے مجھ سے کہا تھا کہ پہلے میں توانائی کی فراہمی روک دُوں۔ جب پشکانی خمرشان میں داخل ہو جائیں تو توانائی بحال کر دُوں تاکہ پشکانی مقناطیسی پردے سے باہر نہ جا سکیں اور وہیں پھنس کر رہ جائیں۔ پھر میں تمھیں قتل کر کے اشنار کو گرفتار کر لُوں۔ اس کے بعد وہ تمھاری جگہ خواجہ سراؤں کا بادشاہ بن کر اقتدار پر قبضہ کر لے گا۔ اُس کے خیال میں یہ ایک بہترین منصوبہ ہے۔"

"اس میں کوئی شک نہیں کہ اقتدار پر قبضے کے لیے اُس نے بہت عُمدہ منصوبہ بنایا ہے مگر اُس نے تم سے یہ بھی تو کہا ہو گا کہ یہ سب کچھ ہونے کے بعد تم اسی طرح ہر موجہ ہی بنے رہو گے۔ ہے نا؟"

"ہاں... اور مجھے اُس کی اس بات پر یقین بھی ہے کیونکہ اسے دکھاوے کے لیے ایسا کرنا ہی پڑے گا۔"

"لیکن کیا تم اُس کے ہاتھوں میں کٹھ پُتلی بن سکتے ہو؟ درپردہ تو وہی حکمراں ہو گا۔"

"تمھیں ایسا سوچنا بھی نہیں چاہیے گوما۔ یہ نوبت ہی نہیں آئے گی کہ وہ تمھاری جگہ اقتدار پر قابض ہو سکے۔" میں نے جواب دیا۔

"مجھے تمھارے اس جواب سے خوشی ہوئی سرفروش۔" گوما نے کہا۔ "لیکن ایک لمحے کے لیے فرض کر لو کہ تم اس کا ساتھ دیتے ہو۔ پھر کیا تمھارے ساتھ اشنار کی بجائے ژولے یہاں حکمرانی کرے گی؟ کہیں اُس نے تمھیں یہ سبز باغ تو نہیں دکھایا؟ اس لیے کہ ژولے تمھاری کمزوری ہے اور تم اُس کے لیے سب کچھ کر سکتے ہو۔"

گوما کی اس بات پر میں کھول ہی تو گیا۔ "کیا بکتے ہو گوما۔ میں یہ تو ضرور چاہتا ہُوں کہ ژولے گراچُو اور راشی کے... تشدّد کا شکار بن کر ہلاک نہ ہو لیکن میں اپنے ضمیر اور تمھیں دھوکا نہیں دے سکتا۔ میرے خُون میں غدّاری اور لالچ کے جراثیم نہیں ہیں۔"

"اچھی بات ہے سرفروش۔" وہ بولا۔ "لیکن میں چاہتا ہُوں کہ اشنار کو یہ علم ہرگز ہرگز نہ ہونے پائے کہ تم ژولے کو پسند کرتے ہو ورنہ وہ جذبۂ رقابت میں اندھی ہو کر صرف ژولے کو مارنے کی خاطر پُورے جبروت کو بھک سے اُڑا دے گی۔"

"یہ بات مجھ پر چھوڑ دو گوما۔ میں اشنار سے خُود نمٹ لُوں گا۔ میرے نزدیک تمھاری اہمیت اُس سے کہیں زیادہ ہے۔ اب میری بات غور سے سُنو۔ تم جنوبی صُوبہ خراگ اور بُرج گرگوش کے لیے توانائی کا سلسلہ منقطع کر دو گے تاکہ پشکانی مقناطیسی پردے کے اندر آ[جائیں]۔ تم توانائی اُس وقت بحال کرو گے جب میں تم سے کہوں گا۔ م[گر]... میرے علاوہ تم کسی کی بات نہیں مانو گے، چاہے کچھ ہو جائے۔ ہو سکتا ہے، حالات تمھیں پریشان کر دیں اور تم اپ[نے] آپ کو مجبور سمجھنے لگو لیکن پھر بھی توانائی کی فراہمی بحال نہ کرنا۔ [مجھ] سے وعدہ کرو کہ تم میری اس بات پر ضرور عمل کرو گے۔"

"اگر میں یہ وعدہ نہ کروں تو؟" گوما نے پوچھا۔

میں نے تلوار نیام سے نکالتے ہوئے جواب دیا۔ "پھر میں تم[ھیں] ابھی قتل کر دُوں گا گوما... لیکن بہتر ہے کہ ایک بار پھر سوچ لو۔"

گوما مسکراتے ہوئے بولا۔ "میں تمھارا امتحان لے رہا تھا کہ اس سلسلے میں کس حد تک سنجیدہ ہو۔ میں جانتا ہُوں کہ تم نے کیا [سوچ] رکھا ہے۔ اس لیے وعدہ کرتا ہُوں کہ تمھارے حکم کے بغیر توانائی [کی] فراہمی بحال نہیں کروں گا لیکن یہ مت بھُولو کہ تم یہاں نئے ہو ا[ور] بہت سی باتیں نہیں جانتے۔"

"جو کچھ اور جتنا کچھ مجھے جاننا چاہیے، وہ میں جان چکا ہوں۔"

"اس کے باوجود شاید یہ بات نہیں جانتے کہ جب خراگ کو توانائی کی فراہمی مکمل طور پر بند کی جائے گی تو پُورے خمرشان ا[ور] خُود جبروت میں بھی تمام کاروبار ٹھپ ہو جائے گا۔ کسی چیز پر ہ[مارا] قابو نہیں رہے گا۔ ہم پشکانیوں سے زیادہ کمزور ہو جائیں گے بلکہ اُ[ن] وحشیوں کے سامنے یکسر بے بس ہو کر رہ جائیں گے۔"

میں نے تلوار پر ہاتھ مارتے ہوئے جواب دیا۔ "اتنے بھی [نہیں] جتنا تم سمجھ رہے ہو۔"

"لیکن توانائی کا سلسلہ منقطع ہوتے ہی یہاں اندھیرا چھا[جائے] گا۔ موسم ہمارے قابو میں نہیں رہے گا۔ پلے وا کے کھیت سُوکھ جائ[یں] گے۔ کمپیوٹر اور بجلی کے پلانٹ رُک جائیں گے۔ خواجہ سراؤں ک[و] فراہمی بند ہو جائے گی۔ خوراک تیار کرنے والے کارخانے ٹھپ ہو جائیں گے اور سب سے زیادہ ڈر اس بات کا ہے کہ کہیں ہمارے خدمت گار اور وحشی سپاہی بغاوت نہ کر دیں۔" گوما نے وضاحت کی۔

"جو بھی ہو گا، دیکھا جائے گا۔ یہ گڑبڑ صرف ہمارے ساتھ نہیں، گراچُو کے ساتھ بھی ہو گی۔ توانائی کے بغیر وہ بھی کچھ نہیں کر سکے گا جبکہ میں بڑی آسانی سے اُسے ختم کر دُوں گا کیونکہ و[ہ] تصویری پیکر اختیار نہیں کر سکے گا۔ میں شاہ فرزندا اور راشی کو بھ[ی] زندہ نہیں چھوڑوں گا اور میرا خیال ہے کہ جب شاہ فرزندا اور راشی

[نہیں ر]ہے گی تو پشکانی جنگ نہیں لڑ سکیں گے۔"

"اچھی بات ہے، سرفروش! میں جوہری توانائی کا سلسلہ [بند] کر رہا ہُوں اور وعدہ کرتا ہُوں کہ اُسے تمھارے حکم کے بغیر بحال [نہیں ک]روں گا۔" یہ کہہ کر وہ کمپیوٹر چیمبرز میں آیا اور اُس سے ملحق [ایک چ]ھوٹے سے کمرے میں داخل ہو کر اُس نے توانائی کی ترسیل کا [سلسلہ] بند کر دیا۔

سوئچ بند ہوتے ہی ہر طرف خاموشی چھا گئی... موت کی [سی خام]وشی... قبرستان کی سی خاموشی جس سے دل ہول اُٹھتا ہے۔

"میں اشنار سے خود بات کروں گا۔ اگر وہ تم سے پوچھے تو کہنا [کہ میں] نے تمھیں کچھ نہیں بتایا۔ اس لیے وہ تم سے کچھ اُگلوانے کی خاطر دباؤ نہیں ڈالے گی۔ ابھی مجھے بہت سی تیاریاں کرنی ہیں۔ یہ [بتاؤ] اب تم کیا کرو گے؟"

"میں یہیں اسی مقام پر تمھارے حکم کا منتظر رہوں گا مگر دیر [نہ ک]رنا سرفروش۔ سوئچ بند ہوتے ہی موت خمرشان کے چپّے چپّے [پر رق]صنے لگی ہے۔"

"فکر نہ کرو گوما۔" میں نے اُسے تسلی دی۔ "میں خمرشان کو بچاؤں [گا۔] اب خمرشان پہلے سے کہیں بہتر ہو گا۔"

گوما سے رخصت ہو کر میں محل کا طویل زینہ طے کرتا ہُوا چھت [پر] پہنچا جہاں اعلانسل کی کئی خواتین، کنیزوں سے مالش کروا [رہی] تھیں۔ میں نے اُن سب کو وہاں سے چلے جانے کا حکم دیا اور [اِرد گرد کے] اطراف کا جائزہ لینے لگا۔ یہ چھت میرے لیے مشاہداتی مقام [کا کام د]ے سکتی تھی۔

میں نے ایک خواجہ سرا کو بھیجا کہ وہ اشنار کو بُلا لائے اور [وہاں سے] میز کرسیاں منگوائیں۔ وہاں خمرشان اور جبروت کا نقشہ اور دُوربین وغیرہ نہیں تھی۔ اس لیے مجھے اُن کی مدد [کے بغ]یر ہی اپنی مرضی اور پسند کا میدانِ کارزار منتخب کرنا تھا۔ مجھے [معلوم] تھا کہ جوہری توانائی کی فراہمی کا سلسلہ منقطع ہوتے ہی [گراچُو] اور پشکانی وہاں سے چل پڑے ہوں گے۔ کیونکہ گراچُو کو پُورا [یقین] تھا کہ میں جلد از جلد توانائی کی ترسیل بند کر دُوں گا۔

جیسا کہ گوما نے کہا تھا، اب ہر طرف اندھیرا چھانے لگا ہے[۔ اب] مجھے اُفق پر دُھند کا جال پھٹتا نظر آیا اور کہیں کہیں چھوٹے [چھو]ٹے شگاف بھی دکھائی دینے لگے جن سے آسمان نظر آ رہا تھا۔ [میں س]مجھ گیا کہ موسم کو کنٹرول کرنے والی کَل کی یہ چادر ہٹتے ہی سُورج [کی رو]شنی بڑھتے ہوئے اندھیرے کو نگل رہی ہے۔ اتنے میں اشنار اپنی کنیزوں کے جھُرمٹ میں وہاں آ گئی۔ میں نے کنیزوں کو رُخصت کر دیا اور اشنار کو اپنے قریب بُلایا تو وہ ایک ادائے دلبری سے شکایت آمیز لہجے میں بولی۔ "اگر قریب ہی بُلانا تھا تو دُور کیوں ہوئے تھے؟"

"یہ ان باتوں کا وقت نہیں ہے اشنار۔" میں نے اُس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے نرمی سے کہا۔ "اس لمحے سے تم مجھے دیوتا نہیں بلکہ سرفروش کہہ کر مخاطب کیا کرو گی، ہر موجہ بالکل نہیں۔"

"تم ہر موجہ تھے ہی کب سرفروش؟"

"پہلے یہ بات ہم تین افراد جانتے تھے اور اب وقت آ گیا ہے کہ یہ حقیقت سب کو معلوم ہو جانی چاہیے۔ میری بات ذرا غور سے سُنو اور یہاں بیٹھ جاؤ۔"

اشنار میری باتیں غور سے سُنتی اور سمجھتی رہی۔

جب میں اُسے اپنے منصُوبے کی تفصیل بتا چکا تو وہ بولی۔

"صرف ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی، جب پشکانی خمرشان میں گھُس آئیں گے تو ہم دوبارہ مقناطیسی پردہ ڈال کر اُنھیں گھیر سکتے ہیں اور سُرخ آندھی بھیج کر اُنھیں تباہ و برباد کر سکتے ہیں تو پھر تم اُن سے جنگ کیوں لڑنا چاہتے ہو؟"

"اس کی دو وجوہ ہیں۔ اس طرح گراچُو کو فرار کا موقع مل جائے گا۔ دُوسرے میں سارے پشکانیوں کو ختم کر دینا مناسب نہیں سمجھتا۔"

"کیوں؟... تمھارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟ کیا تم نہیں جانتے کہ وہ ظالم درندے ہمارے خُون کے پیاسے ہیں؟"

"شکست کے بعد وہ اپنی ساری وحشت و بربریت بھُول جائیں گے۔ دُوسرے تم خُود بھی اچھی طرح جانتی ہو کہ تمھارے پاس اعلانسل کے مرد برائے نام ہی رہ گئے ہیں۔"

اشنار میری اس بات سے کچھ بھڑک کر بولی۔ "تم نے یہ کیوں کہا کہ میں اعلانسل کے مردوں کو خود اچھی طرح جانتی ہُوں۔ اس بات سے تمھارا کیا مطلب ہے؟"

"بگڑنے کی ضرورت نہیں۔ میں جانتا ہُوں کہ تم مردوں کے پنجروں تک جاتی رہی ہو مگر مجھ پر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" میں نے اُسے سمجھایا۔ "تم پشکانیوں میں سے منتخب آدمیوں کے علاوہ باقی تمام مردوں کے ساتھ جو چاہے سلوک کرنا۔"

"نہیں۔ میں اُن سب کو تباہ کر دُوں گی اور گوما کو بھی نہیں چھوڑوں گی جس نے تمھیں یہ ذلیل مشورہ دیا ہے۔" یہ کہہ کر اُس نے تالی بجائی تو گوما کا نائب خواجہ سرا اور وحشی سپاہیوں کا ایک دستہ ہمارے قریب آ گیا جو اشنار کے محافظوں پر مشتمل تھا اور اُس کے ایک اشارے پر میرے پرخچے اُڑا سکتا تھا۔

میں نے نرم لہجے میں کہا: "تم بے شک گوما کو بھی ختم کرا سکتی ہو اور مجھے بھی لیکن پھر بھی تمھیں میرا نعم البدل نہیں مل سکے گا۔ کیا مجھے خرشان سے محبت نہیں ہے؟ کیا میں اس کا تحفظ نہیں چاہتا؟ پہلے اپنے آپ سے یہ سوال کرو پھر مجھے تمھارا ہر فیصلہ منظور ہو گا۔"

وہ کافی دیر تک میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتی رہی۔ میں نے کن انکھیوں سے محافظ سپاہیوں کی طرف دیکھا۔ وہ شمشیر بدست اشتار کے حکم کے منتظر تھے۔

اشتار کچھ دیر بعد سپاہیوں سے بولی: "یہاں سے ہٹ جاؤ۔" پھر مجھ سے مخاطب ہوئی: "ہاں تو تم کیا کہہ رہے تھے؟"

"مجھے جو کہنا تھا میں کہہ چکا ہوں۔"

"میں جاننا چاہتی ہوں کہ تم جنگ کیسے لڑو گے؟"

"جبروت کے اردگرد کوئی شہر پناہ نہیں اس لیے گرانچو اور پشکانی براہِ راست شہر میں داخل ہو جائیں گے اور شہر میں داخل ہونے کا نزدیک ترین راستہ وہ ہے۔" میں نے راستے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بات جاری رکھی: "ہم اُن جھونپڑیوں کو مسمار کر کے ناکہ بندی کر دیں گے۔" پھر میں گوما کے نائب سے مخاطب ہوا۔ "تم فوراً یہ جھونپڑیاں توڑنے اور ناکہ بندی کے احکام جاری کر دو۔"

وہ سر جھکا کر چلا گیا۔

"اور...؟" اشتار نے پوچھا۔

"ہم اپنی ساری طاقت یہیں جمع رکھیں گے۔ تمھاری عورتیں ایک زمانے میں جنگجو تھیں۔ انھیں ایک بار پھر جنگجو بننا پڑے گا اور وہ تمھاری کمان میں لڑیں گی۔ اس لیے جتنی جلدی انھیں ہتھیار بند کر سکتی ہو، کر دو۔"

"ٹھیک... اور کچھ؟"

"سب تیار ہو جائیں تو انھیں اس مینار کے پاس جمع کر دو۔"

"لیکن میں انھیں اطلاع کیسے دوں۔ توانائی کا سلسلہ تو منقطع ہو چکا ہے؟" اشتار نے سوال کیا۔

مجھے اس کی بات پر ہنسی آ گئی۔ میں نے اپنا پاؤں زمین پر مارتے ہوئے کہا: "یہ رہی توانائی۔ پاؤں سے کام لو اشتار۔ خواجہ سراؤں کو دوڑاؤ۔ میرے اور تمھارے درمیان رابطے کے لیے ایک چوکی بھی ضروری ہے تاکہ ہم ایک دوسرے کو پیغام پہنچا سکیں۔"

اشتار کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ اس نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ "اچھی بات ہے سرفروش۔ میں تمھارے احکام پر عمل کروں گی۔"

اتنے میں گوما کا نائب واپس آ گیا۔

"تمھارے بادشاہ گوما کا حکم ہے کہ تم میرے احکام کی تعمیل کرو گے۔ کیونکہ وہ ایک بے حد ضروری کام میں مصروف ہے۔ اس لیے اب سارے خواجہ سراؤں کے سربراہ تم ہو... مگر تمھیں میرے زیرِ اثر رہنا ہے۔ سمجھ گئے؟"

"ہاں دیوتا۔ فرمایئے میرے لیے کیا حکم ہے؟"

"سب سے پہلے اپنے خواجہ سراؤں کی مکمل فہرست تیار کرواؤ اور انھیں سپاہیوں میں بدل دو کہ تم سب کو بھی جنگ لڑنی ہے۔"

"جنگ؟" خواجہ سرا نے حیرت سے دُہرایا: "خواجہ سرا کبھی لڑے ہیں جو اب لڑیں گے دیوتا۔ دوسرے ہم میں سے کسی کو بھی جنگ کی تربیت نہیں دی گئی۔ مجھے ڈر ہے کہ ہم آپ کے کسی کام نہیں آ سکیں گے دیوتا۔"

"گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ ساری بات سردار کی ہوتی ہے۔ رہبر اچھا ہو تو خواجہ سرا بھی میدان مار لیتے ہیں۔ جاؤ سب کو یہاں پر اکٹھا کرو۔" میں نے اس کی ہمت بندھاتے ہوئے حکم دیا۔

جب وہ جانے لگا تو میں نے کہا: "سنو۔"

وہ رُک گیا۔

میں نے پوچھا: "ان سپاہیوں پر کون حکمرانی کرتا ہے؟"

"ان پر کمتر درجوں کے خواجہ سرا حکمراں ہیں دیوتا۔"

"اس پر بھی تم کہتے ہو کہ جنگ نہیں لڑ سکتے؟" میں نے حیرت سے کہا: "خیر۔ کیا یہ جنگ لڑ سکیں گے؟"

"یہ تو حکم کے بندے ہیں دیوتا۔ انھیں آگ میں کودنے کا حکم دیا جائے تو یہ آنکھیں بند کر کے کود پڑتے ہیں۔"

"مگر میں نے سنا ہے کہ کبھی کبھی یہ بغاوت پر بھی اُتر آتے ہیں۔ کیا یہ سچ ہے؟"

"یہ اس بڈھے کھوسٹ کی رائے ہے دیوتا مگر..." وہ... قدرے تذبذب سے بولا: "معاف کیجیے گا مجھ سے غلطی ہو گئی۔ یہ الفاظ جلدی میں میرے منہ سے نکل گئے۔"

"کوئی بات نہیں۔ تم گوما کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہو، یہ تمھارا معاملہ ہے۔ مجھے تو میرے سوالوں کے جواب دو۔"

"اگر ان پر چابک برستے رہیں تو یہ وحشی ضرور لڑیں گے، جناب! ان سے کام لینے کا یہی ایک طریقہ ہے۔ کبھی کبھی ان میں سے کسی کو سرِ عام پھانسی بھی دے دی جاتی ہے، پھر کافی عرصے تک یہ لوگ سر نہیں اُٹھاتے۔"

"صحیح معنوں میں ان سے کام کون لیتا ہے؟"

"سب سے کم تر درجے کے خواجہ سرا۔ وہ انھی کے ساتھ رہتے

ہیں اور ان کی زبان سمجھتے ہیں۔ یہ جنگلی اتنے بے وقوف ہیں کہ خرشانی زبان سیکھ ہی نہیں سکتے۔ اس لیے ان پر جو خواجہ سرا ماسٹر مقرر کیے گئے ہیں انھوں نے ان کی زبان سیکھ لی ہے۔"

"اچھی بات ہے۔ جاؤ وہی کرو جو میں نے کہا ہے اور ہاں میرے خادم فرزیو کو فوراً میرے پاس بھیج دو۔"

گوما کا نائب سر خم کرکے چلا گیا۔

میں نے ایک بار پھر ماحول کا جائزہ لیا۔ مقناطیسی گھر کا پردہ زائل ہو چکا تھا اور آسمان کا ایک بڑا حصہ نظر آ رہا تھا۔ آفتاب غروب ہونے والا تھا۔ اس لیے مغرب میں شفق کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے جنوب کی جانب نظر دوڑائی۔ جہاں سے گرانچو اور پشکانیوں کو آنا تھا مگر مجھے دُور اُفق پر گرد کے ایک بادل کے سوا کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ شاید یہ گرد پشکانی لشکر کی وجہ سے اُڑ رہی تھی۔ اب تک میں خرشانی شہروں سے وقت کا تعین کر چکا تھا۔ اس اعتبار سے گرانچو اور پشکانیوں کو جبروت تک پہنچنے کے لیے کم از کم چار دن لگنے چاہییں تھے اور ان چار دنوں میں مجھے ساری تیاریاں مکمل کر لینا تھیں۔

خرشانی، خاص طور پر جبروت کے لوگ سائنسی آسائشوں کے عادی ہو چکے تھے اور مقناطیسی پردے کی وجہ سے انھیں اپنے دفاع کی کوئی پروا نہیں رہی تھی حتیٰ کہ وہ لڑنا بھی بھول چکے تھے۔ مجھے خدشہ تھا کہ توانائی کا سلسلہ منقطع ہونے اور ان آسائشوں سے محروم ہونے پر کہیں وہ خوفزدہ نہ ہو جائیں یا وحشی غلام بغاوت پر نہ اتر آئیں مگر ایسا لگتا تھا کہ اشتار نے حالات پوری طرح سنبھال لیے تھے ورنہ اب تک خوف و ہراس کے آثار نظر آ جاتے۔

میں ابھی سوچوں میں گم تھا کہ میرا خادم فرزیو آ گیا۔

فرزیو ایک نوعمر خواجہ سرا تھا۔

اس نے ادب سے کہا: "آپ نے مجھے یاد فرمایا، دیوتا؟"

"ہاں بیٹھو۔" میں نے جواب دیا۔

"میں آپ کے سامنے بیٹھوں؟" اس نے ناقابلِ یقین انداز میں کہا۔

"ہاں... بیٹھ جاؤ۔" میں دھاڑا تو وہ دھپ سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ مجھے اس کی اس بے ساختہ حرکت پر ہنسی آ گئی۔

"میں جو کام تمھیں بتاؤں گا، وہ کرو گے؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے تو پیدا ہی اس لیے کیا گیا ہے، دیوتا۔"

"یہ بتاؤ کہ تمھارا درجہ کیا ہے؟"

"میں بارھویں درجے کا خواجہ سرا ہوں جناب۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے اُسے ایک نظر دیکھا اور دل میں اس کا تقابلی جائزہ لینے لگا۔ گرانچو کو چودھویں درجے کا خواجہ سرا شمار کیا جاتا تھا مگر وہ اس درجے سے کہیں زیادہ تھا۔ فرزیو اس سے کم درجے سے تعلق رکھتا تھا لیکن "کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہے۔" کے مصداق میں نے اسے اپنا ذاتی محافظ بنانے کا فیصلہ کر لیا۔

"میں تمھیں اپنا خصوصی نائب بنانا چاہتا ہوں فرزیو۔"

یہ کہتے ہوئے میں نے گلے میں پڑی زنجیر اُتاری اور اُسے پہنا دی۔

"یہ زنجیر اس بات کی علامت ہے کہ اب تم میرے معتمدِ خاص ہو... مگر اب تم میرے سوا کسی کا حکم نہیں مانو گے حتیٰ کہ اشتار اور گوما کا بھی نہیں... اگر تم میری توقعات پر پورے اُترے تو گوما کے بعد میں تمھیں خواجہ سراؤں کا بادشاہ بنا دوں گا اور اگر تم نے میری حکم عدولی کی یا کسی دوسرے کا حکم مانا تو میں تمھیں وحشی غلاموں کے حوالے کر دوں گا۔"

"نہیں نہیں دیوتا۔ میں آپ کے علاوہ کسی کا حکم نہیں مانوں گا۔" وہ گھبرا کر بولا۔

"تم ہر وقت سائے کی طرح میرے ساتھ رہو گے اور میری حفاظت کرو گے۔ حفاظت سے میرا مطلب ہے کہ میری لاعلمی میں عقب سے کوئی مجھ پر حملہ نہ کرنے پائے۔ سمجھ گئے؟"

"سمجھ گیا دیوتا۔ میں اپنی جان دے دوں گا مگر آپ پر آنچ نہیں آنے دوں گا۔"

"میں تمھیں سارے وحشی غلاموں پر قابو رکھنے والے ماسٹرز کا سردار بنا رہا ہوں۔ اب سب سے پہلے تمھیں یہ کرنا ہے کہ جبروت میں خوراک اور پانی کا جتنا بھی ذخیرہ ہے، تم اُسے جمع کر کے میرے بتائے ہوئے مقام پر محفوظ کر دو گے۔ جتنا پانی ہے، اس کی ٹنکیاں منتقل کراؤ گے اور جب یہ کام مکمل ہو جائیں تو سارے وحشی غلاموں کو چوراہے میں جمع کر کے مجھے اطلاع دو گے۔ اگر کوئی بات تمھاری سمجھ میں نہ آئی ہو تو مجھ سے پوچھ لو۔"

"میں سب سمجھ گیا ہوں دیوتا مگر ایک بات سمجھ میں نہیں آ رہی۔"

"وہ کیا؟" میں نے پوچھا۔

اس پر فرزیو نے آسمان کی طرف اُنگلی اُٹھا دی اور بولا: "آج تک کسی خواجہ سرا نے یہ چیز نہیں دیکھی۔ یہ کیا بلا ہے دیوتا؟"

"یہ آسمان ہے۔ فکر نہ کرو، یہ کسی پر نہیں گرے گا۔" میں نے اُسے اطمینان دلایا۔

★★

اگلے تین دنوں اور راتوں کو مَیں مسلسل جاگتا اور تیاریاں مکمل کرتا رہا یہاں تک کہ تھک کر چُور ہو گیا لیکن ابھی ایک کام باقی تھا۔

ہر چند کہ جبروت کی اعلا نسل خواتین اور اُن کی کنیزوں نے فوجی وردیاں پہن لی تھی مگر وہ فنِ حرب سے ناآشنا تھیں۔ ابھی مجھے اُن کو میدانِ جنگ میں لڑنے کی تربیت دینا تھی۔

مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اشنار نے اپنی نوسو ننانوے خواتین کی فوج کو باقاعدہ متعدد دستوں میں تقسیم کر دیا تھا اور وہ اُن کی کمانڈر بنی ہُوئی تھی۔ ہر اعلا نسل خاتون کے ساتھ ایک ایک کنیز بھی تھی جس نے اُن کے ہتھیار یعنی تلوار، بھالا اور ڈھال اُٹھا رکھی تھی۔ چلتے وقت جب سب مِل کر گاتی تھیں تو بڑا جوش و جذبہ پیدا ہو جاتا تھا۔

مَیں نے اُنھیں تلوار چلانا اور بھالا پھینکنا سکھایا اور تعجب کی بات یہ ہے کہ اُنھوں نے پہلے ہی دن بہت کچھ سیکھ لیا اور ایک دُوسرے کے ساتھ مشق کرنے لگیں۔

جنوب کی طرف وحشی غلاموں کی جھونپڑیاں مسمار کر کے ہر ممکن ناکہ بندی کر دی گئی تھی۔ مَیں نے سامنے شفاف ترغون کے نوکیلے ٹکڑے گڑوا دیے تھے۔ اُن کے پیچھے پے داکی گانٹھیں رکھوا دی تھیں اور اُن کے عقب میں گانٹھوں کے متعدد بڑے بڑے مینار بنوا کر اُن پر بیک وقت چھ تیر چھوڑنے والی بڑی کمانیں اور منجنیقیں نصب کروا دی تھیں۔

کمانیں اور منجنیقیں چلانے کا کام کنیزوں کو سکھا دیا گیا تھا اور وہ تھوڑی سی مشق کے بعد یہ کام بخوبی انجام دے سکتی تھیں۔

آج چوتھا روز تھا لیکن گرانجو اور پشکانیوں کے لشکر ابھی تک دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ مَیں نے جنوب کی طرف ہرکارے دوڑا دیے تھے تاکہ جُونہی وہ اُنھیں آتا دیکھیں مجھے آگاہ کر دیں۔

صبح کے وقت جب اشنار نے اپنی فوج کی حاضری لی تو اُن میں سے ایک عورت غائب تھی۔ جب اُسے تلاش کیا گیا... تو مردوں کے حجرے کے قریب پایا گیا۔ اُس وقت وہ داموکے نشے میں دُھت تھی۔ اشنار نے اپنی زنانہ فوج کے سامنے، خود ہی اُس کی گردن اُڑا دی تاکہ کسی اور خاتون کو ایسی حرکت کرنے کی جرأت نہ ہو سکے۔ جہاں مجھے اشنار کے اس اقدام کا قائل ہونا پڑا کہ وہ قانون اور اصُولوں کی پابند ہے وہاں اُس کے دل گُردے پر بھی حیرت ہوئی اور مجھے گوما کی باتیں یاد آ گئیں۔ اگرچہ میرے ساتھ اُس کے سلوک سے کسی قسم کا شک نہیں کیا جا سکتا تھا مگر اس کے باوجود مَیں اُس پر مکمل اعتماد بھی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ بظاہر وہ جیسی دکھائی دیتی تھی، اندر سے اتنی ہی مختلف تھی۔ اور اس کا مجھے پہلے دن ہی تجربہ ہو گیا تھا۔

چوتھی رات چونکہ بُری طرح تھک گیا تھا اس لیے مَیں نے نگرانی کی چوکی پر آ کر دو میزیں جوڑیں اور اُن پر لیٹ گیا۔ ابھی بمشکل میری آنکھ لگی ہوئی کہ فرزیمو نے مجھے جگا دیا

"بیدار ہو جائیے دیوتا۔"

"کیوں؟ کیا ہُوا؟" مَیں نے بڑبڑا کر اُٹھتے ہُوئے پُوچھا۔

"جنوب سے ایک ہرکارہ آیا ہے۔"

مَیں نے بلاتاخیر ہرکارے کو طلب کر لیا۔

"گرانجو اور پشکانی لشکر سے اِدھر آ رہا ہے دیوتا،" ہرکارے نے بتلایا۔

"اُن کی تعداد کیا ہے؟"

"یہ تو مجھے معلوم نہیں مگر اُنھوں نے ہمارے بہت سے وحشی غلام قتل کر دیے ہیں۔"

"کیا وحشی غلام لڑے تھے میرا مطلب ہے اُنھوں نے اُن کا مقابلہ کیا تھا یا نہیں۔"

"کچھ غلام لڑے تھے مگر باقی ڈر کے مارے بھاگ گئے۔ پشکانی بڑے خونخوار ہیں دیوتا۔ اُن کے پاس بڑے بڑے خنجر اور گھوڑوں والے تختے ہیں۔"

"گھوڑوں والے تختے؟" مَیں نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں دیوتا۔" اس بار فرزیمو نے جواب دیا۔ "مَیں نے بوڑھے خواجہ سراؤں سے سُنا ہے کہ پہلے خمرشانیوں کے پاس بھی ایسے ہی تختے ہُوا کرتے تھے جن میں دو چکّر لگے ہوتے تھے اور گھوڑے اُنھیں کھینچتے تھے۔"

"اوہ۔" مَیں سمجھ گیا کہ اُس کی مُراد رتھ سے تھی۔

"مگر پشکانیوں کے تختوں میں چکّروں کے ساتھ تلواریں بھی لگی ہوئی ہیں۔" ہرکارے نے بتایا۔

مجھے ہرکارے کی اس بات سے تو کوئی تشویش نہ ہُوئی لیکن یہ سوچ کر ضرور فکرمند ہو گیا کہ اگر اُن کے پاس رتھ ہیں تو وہ اُن پر وافر مقدار میں سامانِ رسد بھی ضرور لاد کر لائے ہوں گے جب کہ ہمارے پاس سامانِ رسد کی کمی تھی اس لیے ہم جنگ کو طول نہیں دے سکتے تھے۔

بہرصُورت مَیں نے ہرکارے کو رُخصت کر دیا اور خود سو گیا۔

صُبح میری آنکھ کھُلی تو فرزیمو نے بتایا کہ اشنار اور گوما کا

ب یہاں آیا تھا۔ دونوں کے ہاتھوں میں تلواریں تھیں۔ وہ آہستہ ستہ آپ کی جانب بڑھ رہے تھے مگر مَیں بھی تلوار نکال کر سامنے آ ۔ مجھے دیکھ کر گوما کا نائب تو بھاگ نکلا مگر مہاپجارن کھڑی مجھے ُرتی رہی۔ مَیں سمجھا کہ وہ مجھے قتل کر دینا چاہتی ہے مگر وہ مجھے ں کیے بغیر ہی چلی گئی۔

مجھے فرزیمو کی بات پر ہنسی آ گئی۔

"وہ تمھیں نہیں بلکہ مجھے قتل کرنا چاہتی تھی۔"

"آپ کو... نہیں نہیں، دیوتا کو کوئی قتل نہیں کر سکتا اور ر وہ آپ کی طرف تو اُس وقت آتی جب مَیں ختم ہو جاتا۔"

مَیں نے اُسے کوئی جواب نہ دیا مگر یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا اشنار موقع ملتے ہی مجھے ہلاک کر دے گی اور جنگ کے دوران اُسے موقع ملنا یقینی تھا۔

●

دُوسری شام گرانجو اور پشکانیوں کے لشکر جنوبی میدان میں ہنچ گئے اور اُنھوں نے جبروت کے سامنے پڑاؤ ڈال دیے۔ لشکر میں لنے والے الاؤ ظاہر کرتے تھے کہ وہ ہمیں نیم دائرے کی صُورت میں ہر کر تین اطراف سے حملہ کرنا چاہتے ہیں۔

مَیں نے الاؤ شمار کر کے تعداد کا اندازہ لگانا چاہا۔

یہ الاؤ سو سے زیادہ تھے۔ اگر ہر الاؤ کے گرد ایک سو پشکانی وں تو بھی اُن کی تعداد دس ہزار بنتی تھی جبکہ گرانجو کے وحشی لام اُن کے علاوہ تھے۔ اُن کے مقابلے میں ہماری نفری ڈھائی تین زار سے زیادہ نہیں تھی۔ پھر ایک خرابی یہ بھی تھی کہ ہماری نفری میں ورتوں کی تعداد زیادہ تھی۔ اس کے علاوہ ہرکارے کے مطابق، وحشی لام، پشکانیوں کا مقابلہ کرنے سے ڈرتے تھے۔ یہ صُورتِ حال اگرچہ یوس کُن تھی مگر مَیں جنگ جیتنا چاہتا تھا۔

پو پھٹتے ہی مَیں نے فرزیمو کو حکم دیا کہ وہ سب کو جگانے کے نتظامات شرُوع کر دے۔ اس وقت موسم خراب ہو رہا تھا اور ہلکی ہلکی ہوار پڑ رہی تھی۔ تاہم ہَوا ہمارے موافق تھی یعنی اُس کا رُخ پشکانی شکر کی طرف تھا۔

چونکہ میں خواتین کی فوج کے پیچھے مَیں نے پے داکی گانٹھوں سے ایک اہرام نما مینار تعمیر کروا لیا تھا۔ مَیں سب سے اُوپر والی گانٹھ کھڑا ہو گیا۔ دُوسری اور تیسری قطاروں والی گانٹھوں پر فرزیمو اور س کے نائب آ گئے تاکہ لڑائی کے حالات کے مطابق جب مَیں اُنھیں ہدایات دُوں تو وہ اُن پر عمل کراتے جائیں۔

پشکانیوں کا لشکر بھی صف آرا ہونے لگا۔ لشکر کے پیچھے اُن کے خیمے نصب تھے جن میں شاہ فرزندا، راشی اور افسروں کے خیمے نمایاں نظر آ رہے تھے۔ اُن میں سے کوئی ایک خیمہ گرانجو کا بھی ہو گا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ ثڈلے کو بھی اپنے ساتھ لایا ہو گا اور وہ کسی نہ کسی خیمے میں قید ہو گی کیونکہ وہ اُسی کی وجہ سے مجھے دھمکا رہا تھا اور توانائی کے سلسلے کا انقطاع اپنے منصُوبے کا ایک حِصّہ سمجھ رہا تھا۔

جب روشنی بڑھی تو مَیں نے شاہ فرزندا کا خیمہ پہچان لیا۔ وہ دُوسرے خیموں سے الگ تھلگ نصب تھا اور اُس کے باہر ایک نیزے کے ساتھ گھوڑوں کی تین دُمیں لہرا رہی تھیں... پھر مجھے شاہ فرزندا اور گرانجو دکھائی دیے... وہ ایک مقام پر کھڑے لشکر کا جائزہ لے رہے تھے۔ اتنے میں ایک خیمے سے راشی برآمد ہوئی اور ہماری تیاریوں کا جائزہ لینے لگی۔

مَیں نے اُسے دیکھ کر ہاتھ اُٹھایا۔

وہ کچھ دیر میری طرف دیکھتی رہی پھر گرانجو کے پاس جا کر باتیں کرنے لگی۔ مَیں نے تو اُسے گرانجو کے خلاف اُکسایا تھا مگر اُس کا یہ انداز کچھ اور ہی بتا رہا تھا۔

اتنے میں پشکانی لشکر میں قرنا پھُونکے جانے لگے۔

یہ اُس چال بازی کے آغاز کی نشانی تھی جس پر گرانجو عمل کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے مجھ سے کہا تھا کہ مَیں معمُولی سی مدافعت کے بعد ہتھیار ڈال دُوں اور اس دکھاوے کے بعد اُنکی شرائط پر اُس سے صُلح کر لُوں کہ مَیں اشنار کے ساتھ حسبِ معمُول خمرشان پر حکمرانی کرتا رہُوں گا۔ گوما کو ختم کر دیا جائے گا اور گرانجو اُس کی جگہ خواجہ سراؤں کا بادشاہ بن جائے گا۔ پشکانی گرگوش سے نقلِ مکانی کر کے دوبارہ خمرشان کے میدانوں میں آباد ہو جائیں گے اور اُنھیں خمرشانیوں کے ساتھ مساوی حقوق حاصل ہوں گے۔

یہ صُلح بھی دکھاوے کی تھی۔ گرانجو چاہتا تھا کہ اس کے بعد پشکانیوں کو ٹکڑوں میں تقسیم کر کے ختم کر دے اور جب پشکانی ختم ہو جائیں تو وہ اشنار کو اور مجھے بھی جان سے مار کر اقتدار پر قابض ہو جائے۔ اگرچہ اُس نے یہ باتیں مجھے نہیں بتائی تھیں مگر مَیں اُس کی چال خُوب سمجھتا تھا۔

طبلِ جنگ کی بجائے پشکانیوں نے ایک بار پھر صُلح نامے کے لیے قرنا پھُونکے اور شاہ فرزندا جس کے دائیں جانب راشی اور بائیں جانب گرانجو تھا، آگے بڑھنے لگا۔ اُسے نصف فاصلے تک آنا تھا اور نصف فاصلہ مجھے اور اشنار کو طے کر کے اُن سے بات چیت کرنا تھی۔

مَیں نے جھُک کر فرزیمو کو ہدایات دیں اور پھر مینار سے اُتر آیا۔

جب میں خواتین کی فوج کے پاس سے گزرا تو میں نے تلوار اُٹھا کر اُنھیں سلامی دی۔ اُنھوں نے جواباً سلامی دیتے ہوئے "ہرموجہ... دیوتا" کے نعرے لگائے لیکن اشنار نے، جو پنجروں کے مردبھی میدان میں لے آئی تھی صرف تلوار سے سلامی کا جواب دیا۔ مُنہ سے ایک لفظ بھی نہ بولی۔

میں اُسے ساتھ لیے بغیر اکیلا ہی صُلح کی بات چیت کرنے کے لیے اس میدان کی طرف بڑھ گیا۔ جہاں شاہ فرزندا، راشی اور گراچو میرے منتظر تھے۔

میں اُن سے چند قدم کے فاصلے پر رُک گیا۔

شاہ فرزندا کچھ دیر مجھے گھورتا رہا، پھر بولا: "تم یہاں آکر شاہ خرشان بن بیٹھے، سرفرِدش! بولو کیا اس بار بھی ہمارے ساتھ دھوکا کروگے یا جو کچھ تم نے گراچو کے ساتھ طے کیا ہے، اس پر عمل کرنا چاہتے ہو؟" اُس نے میری جنگ کی تیاریوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بات جاری رکھی: "مگر یہ نشانیاں تو اس بات کی مظہر ہیں کہ تم ہتھیار نہیں ڈالنا چاہتے۔"

"مجھے تمھارے اس خیال سے اتفاق ہے شاہ فرزندا۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

یہ سُنتے ہی اس کا ہاتھ اپنی شمشیر کے قبضے پر پہنچ گیا لیکن گراچو نے بھتیجی کی نمائش کرتے ہوئے اُس کا ہاتھ روک دیا۔

"تم اتنے احمق نہیں ہو سکتے، سرفرِدش کہ ہمارے ساتھ دوبارہ دھوکا کرو۔ میں تمھیں دکھا چکا ہوں کہ اس صُورت میں کیا ہوگا۔ ژدلے ہمارے ساتھ آئی ہے اور اس وقت شاہ فرزندا کے خیمے میں موجود ہے۔"

"میرا اندازہ بھی یہی تھا گراچو۔ میں تمھیں کسی قسم کا دھوکا نہیں دینا چاہتا۔ میرا خیال ہے، تم جانتے ہوگے کہ میں نے تم سے کوئی سودے بازی نہیں کی تھی... اور نہ میں خرشانیوں یا اپنے آپ کو دھوکا دینا پسند کرتا ہوں۔ اگر تم جبروت یا خرشان پر قبضہ کرنا چاہتے ہو تو اسے فتح کرلو۔"

یہ کہتے ہوئے میں نے کن اکھیوں سے راشی کی طرف دیکھا۔ اُس کی نگاہیں مجھ پر مرتکز تھیں لیکن اُس کی آنکھوں میں نفرت کا لاوا تیر رہا تھا جس نے میری ہڈیوں میں سردی لہر دوڑادی۔

"تم نے میرے ساتھ بھی فریب کیا ہے سرفرِدش! ہمارے مابین جو باتیں ہوئی تھیں، وہ بھی جھُوٹ ثابت ہوئی ہیں۔" وہ غصّے سے بل کھا کر بولی۔

میں نے اُسے اور گراچو کو دیکھتے ہوئے جواب دیا: "اور تم نے بھی مجھ سے جو وعدہ کیا تھا، اُس پر پوری نہیں اُتری ہو۔"

اس پر گراچو نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا: "مجھے قتل کرنے کا؟ میں تمھیں اتنا بے وقوف نہیں سمجھتا تھا، سرفرِدش اور راشی تمھاری طرح احمق نہیں ہے۔ یہ اچھی طرح جانتی ہے کہ اُس کا مفاد کس سے وابستہ ہے۔"

"تم نے ایک خرشانی کنیز کو مجھ پر ترجیح دی ہے سرفرِدش۔ جب گراچو نے مجھے بتایا کہ تم ژدلے کو چاہتے ہو تو مجھے یقین نہ آیا۔ پھر میں نے خود ژدلے سے بات کی تو پتہ چلا کہ وہ بھی تمھیں چاہتی ہے اور اس جُرم میں تم دونوں کو ایسی کربناک موت ملے گی کہ خود موت بھی اس سے پناہ مانگے گی۔"

"بس بس بہت باتیں ہو چکیں۔" گراچو بولا: "اگر تم نے میری تجویز کے مطابق ہتھیار نہ ڈالے تو ہم تمھیں شکستِ فاش دیں گے۔ تب پہلے ژدلے کو تمھارے سامنے اور تمھیں اُس کے سامنے ایسے تشدد کا نشانہ بنایا جائے گا کہ دیکھنے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے۔ لیکن اگر تم ہتھیار ڈال دو تو میں اپنے وعدے پر قائم رہوں گا۔"

میری بجائے راشی نے اسے جواب دیا: "اگر یہ ہتھیار ڈال دے تو بھی میں ژدلے کو نہیں بخشوں گی۔"

"سُن لیا۔ تم ایسا وعدہ کیوں کرتے ہو جسے تم نباہ نہیں سکتے۔"

میرا خیال تھا کہ ان باتوں کے دوران فرزیو ترغون فیکٹری پہنچ چکا ہوگا جس کی چھت پر بھی میں نے منجنیقیں اور کمانیں نصب کروا دی تھیں۔ اُدھر گراچو غالباً یہ سوچ رہا تھا کہ اب جبکہ پشکانی لشکر یہاں پہنچ گیا ہے تو مقناطیسی پردہ دوبارہ کیوں نہیں تنا گیا؟ سُرخ آندھیاں اب تک کیوں نہیں چلیں؟ آخر توانائی کا سلسلہ بحال کیوں نہیں کیا گیا؟

ہم دونوں اپنی اپنی سوچوں میں ڈوبے ہوئے تھے کہ شاہ فرزندا نے نیام سے تلوار نکال لی اور اسے لہراتا ہوا بولا: "آؤ ہم تم آپس میں لڑکر جنگ کا فیصلہ کرلیں۔ اگر تم ہار گئے تو اقتدار ہمارے حوالے کردینا۔ اگر میں ہار گیا تو ہم واپس چلے جائیں گے۔"

میں نے بھی اپنی تلوار نکالنے میں دیر نہیں لگائی اور جواب دیا: "مجھے بخوشی یہ شرط منظور ہے۔"

راشی اور گراچو جلدی سے ہمارے درمیان آگئے۔ راشی اپنے باپ سے بولی: "کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو بابا۔ سرفرِدش یہی تو چاہتا ہے۔ یہ تمھیں قتل کرکے ہمیں برباد کردے گا۔ تلوار نیام میں ڈالو اور میری بات سُنو۔"

قدرت نے مجھے بڑا اچھا موقع دیا تھا مگر وہ راشی اور گراچو کی وجہ سے ختم ہوگیا۔ میں نے تلوار نیام میں ڈالتے ہوئے کہا: "تم جب

چاہو، مجھ سے مقابلے کی خواہش پُوری کر سکتے ہو فرزندا۔" یہ کہہ کر میں واپسی کے لیے چل دیا۔ جاتے جاتے میں نے پلٹ کر دیکھا، راشی اور گراچو، شاہ فرزندا سے بحث میں اُلجھے ہوئے تھے۔

میں سیدھا مینار کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

اب جنگ ناگزیر تھی اور اس کا آغاز ہونے ہی والا تھا۔

میں نے مینار پر چڑھ کر فرزیو کو اشارہ کیا تو بڑی بڑی کمانوں سے پشکانیوں کے خیموں پر آتشگیر تیر برسنے لگے۔ میں نے سوچا تھا کہ اگر اگلے خیموں میں آگ لگ گئی تو ہوا اسے دُوسرے خیموں تک بآسانی پھیلا دے گی۔ مگر تیروں کی پہلی باڑ خیموں تک نہ پہنچ سکی۔ میں نے فرزیو کو کمانیں نشانے پر کرنے کا اشارہ کیا۔

اس بار تیر نشانے پر بیٹھے اور بہت سے خیموں میں آگ لگ گئی۔

اتنے میں میں نے دیکھا کہ راشی ژدلے کو فرزندا کے خیمے سے باہر لے آئی ہے۔ اُس کے ہاتھ پُشت پر بندھے ہوئے تھے اور راشی اُسے طمانچے مار رہی تھی مگر ژدلے طمانچوں کی بارش میں بھی سربلند کھڑی رہی... پھر جلتے ہوئے خیموں کے دُھویں نے اُسے میری نگاہوں سے چھُپا لیا۔

چند لمحے بعد جب دُھواں ہوا میں تحلیل ہوا تو میں نے دیکھا کہ سپاہیوں نے ژدلے کو زمین پر گرا دیا ہے اور گراچو چار گھُڑسواروں کو بلا رہا ہے۔ اتنے میں مجھے اشنار مینار پر چڑھتی دکھائی دے گئی۔ وہ میرے پاس آرہی تھی۔ میں ژدلے کی طرف سے انجان سا بن گیا جیسے مجھے اس نظارے سے کوئی غرض، کوئی واسطہ اور کوئی تعلق ہی نہ ہو۔

اشنار اُوپر آکر میرے ساتھ کھڑی ہوگئی اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

ژدلے کے ہاتھ پاؤں الگ الگ گھوڑوں سے باندھ دیے گئے تھے اور ان گھوڑوں کا رُخ متضاد سمتوں میں تھا۔ میں نہیں سمجھتا تھا کہ گراچو اتنی جلد بازی سے کام لے گا مگر وہ جُوا کھیلنے پر تُل گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ حالات بگڑتے دیکھ کر وہ ژدلے کے عوض مجھ سے سودے بازی پر مجبور ہو جائے گا مگر یہ صُورتِ حال میری سوچ کے بالکل برعکس تھی۔

"وہ عورت کون ہے؟ یہ کوئی کنیز دکھائی دیتی ہے۔" اشنار نے دھیمی آواز میں کہا۔

"ہاں اُس کا نام ژدلے ہے شاید۔" میں نے بے پروائی سے جواب دیا: "گوما نے مجھے بتایا تھا کہ اُسے سزا کے طور پر گراچو کے پاس بھیجا گیا تھا۔ گوما اس کے ذریعے جاسوسی کرنا چاہتا تھا۔ شاید گراچو کو اس بات کا علم ہو گیا ہے۔ اس لیے وہ اُسے جاسوسی کرنے کی سزا دینا چاہتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس طرح ہم خوفزدہ ہو جائیں گے اور ہتھیار ڈال دیں گے۔"

"تو پھر وہ اس سزا پر عمل درآمد کیوں نہیں کر رہا؟" اشنار نے پوچھا: "اُسے کس بات کا انتظار ہے؟"

"یہ تو گراچو ہی بہتر جانتا ہوگا۔ مجھے کیا معلوم۔" میں نے دُرشتی سے جواب دیا: "اب تم اپنے دستے میں واپس جاؤ اور یاد رکھو کہ تمھیں وہی کرنا ہے، جو میں کہوں گا۔"

اشنار نے بڑی گہری نگاہوں سے مجھے دیکھا اور بولی: "اچھی بات ہے، سرفرِدش... مگر میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ جب ہم توانائی کا سلسلہ بحال کرکے اپنے دُشمنوں کو ہمیشہ کے لیے ختم کر سکتے ہیں تو تم جنگ کیوں کرنا چاہتے ہو؟ خرشانیوں کو اُن دُرندوں سے کیوں قتل کروانا چاہتے ہو؟"

"میں اپنے احکام کی وضاحت کرنے کا عادی نہیں ہوں۔ جاؤ اور وہی کرو، جو تم سے کہا جا رہا ہے۔"

اشنار پیچ و تاب کھاتی ہوئی مینار سے اُترنے لگی اور میں نے سوچا کہ اب مجھے نہ صرف اپنے عقب سے ہوشیار رہنا پڑے گا بلکہ میری زندگی اور اس جُوئے کا دارومدار اس بات پر بھی ہے کہ کہیں گوما، اشنار کے دباؤ میں آکر توانائی کا سلسلہ نہ بحال کردے۔

میں نے ایک بار پھر پشکانی لشکر کی طرف دیکھا۔ اب شاہ فرزندا اپنے لشکر کو دو صفوں میں ترتیب دے رہا تھا۔ اُن کے بیشتر خیمے جل چکے تھے... مگر اُنھیں اُن کی پروا نہیں تھی۔ شاید لشکریوں کو یہ یقین دلا دیا گیا تھا کہ اب وہ خیموں میں نہیں بلکہ جبروت کے پُختہ مکانات میں رہیں گے۔

میں نے فرزیو کو دُوسرا سگنل دیا۔ وہ ترغون فیکٹری کی چھت پر منجنیقوں کے پاس کھڑا تھا۔ اُس نے میرا اشارہ پاتے ہی پے در پے ترغون کے بنے ہوئے گولے پشکانی لشکر پر پھینکنے شروع کردیے۔ ان گولوں نے بہت سے پشکانیوں کو گوشت کے لوتھڑوں میں بدل دیا... مگر فرزندا نے اپنی صف بندی جاری رکھی۔ ایک گولا اُس کے بہت قریب گرا... مگر اُس نے ذرا بھی توجہ نہیں دی۔ وہ وحشی بلاشبہ بے حد بہادر تھا۔

میں نے دیکھا کہ پشکانی لشکر کے پیچھے رتھ جوتے جا رہے تھے۔ رتھوں کے پہیوں کے ساتھ لگے ہوئے خنجر دُور سے چمک رہے تھے اور اُن کی یہ چمک ہمارے غلام سپاہیوں کو ڈرانے اور بھگانے کے لیے کافی تھی... مگر اس کے باوجود میں نے پشکانیوں کی مقدس تلوار نکالی اور اُسے سر سے بلند کرتے ہوئے چلّایا۔

"بزدل پشکانیو... ادھر دیکھو۔ یہ رہی تمھاری مقدس تلوار، تم میں ہمت ہے تو آؤ اور اسے چھین لے جاؤ۔"

میری اس للکار نے جیسے شاہ فرزندا اور اُس کے لشکریوں کے تن بدن میں آگ لگا دی۔ وہ نعرے لگاتے ہوئے آگے بڑھے۔ میں نے فرزینو کو اشارہ کیا۔ منجنیقوں نے گولے اور کمانوں نے تیر برسانے شروع کر دیے اور یوں یلغار کرتے ہوئے پشکانیوں کے قدم رک گئے۔ اُن میں سے بہت سے ڈھیر ہو گئے۔ اتنے میں شاہ فرزندا کی آواز سنائی دی۔ وہ پشکانیوں کو واپس بلا رہا تھا۔ پشکانی تیزی سے پیچھے ہٹ گئے اور اُن کی جگہ گرانچو کے وحشی سپاہی آگے بڑھنے لگے۔ وہ اپنے آدمی بچانا اور گرانچو کے وحشیوں کو جنگ کا ایندھن بنانا چاہتا تھا تاکہ جب ہم اپنا "اسلحہ" ختم کر بیٹھیں تو وہ آگے بڑھ کر ہمیں اپنی تلواروں اور نیزوں پر رکھ لیں۔

میں نے بھی شاہ فرزندا کی چال دہرائی۔ وحشی سپاہیوں کو آگے بڑھایا۔ اُن کے پیچھے خواجہ سرا ماسٹر تھے۔ اُن ماسٹروں کی راہِ فرار مسدود کرنے کے لیے میں نے پنجروں والے مردوں کو اُن کے پیچھے بھیج دیا۔ اشنار نے احتجاج تو کیا مگر میرا حکم رد کرنے کی جرأت نہ کر سکی۔

میرے وحشی سپاہی گرانچو کے وحشی سپاہیوں سے ٹکرا گئے۔ خواجہ سرا ماسٹر بھاگنے لگے تو پنجروں والے مردوں نے اُن پر کوڑے برسانے شروع کر دیے۔ خواجہ سراؤں نے اپنا غصہ سپاہیوں پر اُتارا اور وہ اپنا غصہ گرانچو کے سپاہیوں پر اُتارنے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ گرانچو کے سپاہی میدان سے بھاگ نکلے۔

جنگ کا پہلا پانسہ میرے حق میں پڑا۔

میں نے نعرہ لگایا تو عورتوں کی فوج نے بھی جوش و خروش سے نعرے لگانے شروع کر دیے... مگر میں نے دیکھا کہ اشنار کا چہرہ راکھ ہو رہا تھا۔

میں نے میدانِ جنگ پر نظر ڈالی۔

گرانچو کے سپاہی پسپا ہو چکے تھے۔ میں نے اپنے بچے کھچے سپاہیوں کو واپس بلا لیا تاکہ وہ تازہ دم ہو جائیں اور چلایا "بزدل پشکانیو۔ تمھارا بھی یہی حشر ہوگا۔"

یہ سنتے ہی شاہ فرزندا نے تلوار لہرا کر اپنے سپاہیوں کو اشارہ کیا تو وہ نقاروں کے تیز تھاپ کے ساتھ آگے بڑھنے لگے لیکن اُن کا رُخ اُس طرف نہیں تھا جہاں وحشی غلام ایک دوسرے سے ٹکرائے تھے۔ وہ اُن سے قدرے ہٹ کر آگے بڑھ رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، قدرت میرا ساتھ دے رہی ہے کیونکہ وہ اُس حصے کی جانب پیش قدمی کر رہے تھے جدھر میں نے ناکہ بندی کے لیے زرغون کی شفاف رسیوں سے راستہ بند کر رکھا تھا اور زمین میں نوک دار کھونٹے گاڑ دیے تھے۔

پشکانی نقاروں کی پرجوش تال پر اندھا دھند آگے بڑھے تو رسیوں سے ٹکرا کر کھونٹوں سے زخمی ہونے لگے۔ اُوپر سے تیروں کی بوچھار نے اُن کے کشتوں کے پشتے لگا دیے مگر اُن کی پیش قدمی میں فرق نہ آیا۔ ایک کے پیچھے دوسری صف آگے بڑھتی رہی۔ میں نے دیکھا کہ شاہ فرزندا اگرچہ زخمی ہو چکا ہے مگر اُن کو جوش دلانے کے لیے خود بھی لاشوں کو روندتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے۔ میرا جی چاہا کہ میدان میں کود کر اُس سے دو دو ہاتھ کروں۔ مجھے یقین تھا کہ میں اسے تہ تیغ کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگاؤں گا اور جب اُس کے وحشی لشکری اپنے بادشاہ کا سر مقدس نیزے کی نوک پر بلند دیکھیں گے تو ہتھیار ڈال دیں گے مگر اتنے میں میری نگاہ رتھوں پر جا پڑی جنھیں صف آرا کیا جا رہا تھا اور اُن کی صف آرائی راکشی کر رہی تھی۔

اب مینار سے اُترنا میرے لیے بے حد خطرناک ہو سکتا تھا۔ میں رتھوں پر نظر نہ رکھ سکتا اور مجھے یہ بھی معلوم نہ ہو سکتا کہ انھیں کس رُخ سے یا کدھر کو آگے بڑھایا جا رہا ہے۔

عین اُسی وقت مجھے اشنار کا پیغام ملا کہ وہ پشکانیوں پر حملہ کر دے؟ میں نے پہلے تو انکار کر دیا مگر پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا "بشرطیکہ اس حملے میں خواتین کا دستہ شامل نہ ہو۔"

اس بات سے میرا مقصد یہ تھا کہ بچے کھچے مردوں کے ساتھ اوّل تو وہ اپنے ارادے سے باز آ جائے گی اور اگر اُس نے حملہ کیا بھی تو باقی ماندہ پنجروں والے مرد بھی ختم ہو جائیں گے۔ تب اُسے افزائشِ نسل کے لیے تندرست و توانا مردوں کی اہمیت کا احساس ہوگا اور وہ سارے پشکانیوں کو ختم کرنے کے خیال سے دست کش ہو جائے گی۔

میں نے دیکھا کہ اب بھی پشکانیوں کی چار صفیں آگے بڑھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اتنے میں اشنار بچے کھچے مردوں کے ساتھ اُن پر ٹوٹ پڑی۔

میں اُسے اتنا احمق نہیں سمجھتا تھا کہ وہ خود میدانِ جنگ میں کود جائے گی... مگر شاید وہ اپنی دھاک بٹھانا چاہتی تھی یا پھر یہ چاہتی تھی کہ مجھے ختم کرنے کے بعد کوئی اُس پر اعتراض کی جرأت نہ کر سکے۔

شاہ فرزندا کے خونخوار لشکری اشنار کے ساتھیوں پر بھوکے

بھیڑیوں کی طرح ٹوٹ پڑے مگر انھوں نے بھی جم کر مقابلہ کیا کیونکہ اشنار اُن کے ساتھ تھی۔ اتنے میں شاہ فرزندا، اشنار کی طرف لپکا۔ اشنار کے لیے فرار کی کوئی صورت نہیں تھی، اس لیے وہ اُس سے مقابلے پر ڈٹ گئی اور تعجب کی بات تو یہ ہے کہ فرزندا پر حملے میں پہل بھی اُسی نے کی تھی۔ شاہ فرزندا نے اُس کی تلوار، اپنی تلوار پر روکی تو میں صورتِ حال کا اندازہ کرتے ہوئے مینار سے کود گیا۔

اگرچہ میں اندھا دھند اُس طرف بھاگ رہا تھا اور راستے میں متعدد رکاوٹیں تھیں... مگر میری نگاہیں اشنار اور فرزندا پر مرتکز رہیں۔ میں نے دیکھا کہ فرزندا نے اپنی تلوار پر ذرا سا دباؤ ڈال کر اشنار کی تلوار کو دُور پھینک دیا۔ اب اشنار خالی ہاتھ تھی مگر اُس نے عقل مندی یہ کی کہ ایک دم پیچھے ہٹ گئی اور اس کے دو ساتھی درمیان آ گئے۔

ابھی میں اُن سے تقریباً بیس قدم کے فاصلے پر تھا کہ فرزندا نے اُن دونوں کا کام تمام کر دیا اور اندھا دھند اشنار کی طرف لپکا مگر بیچ میں پڑے ایک پشکانی سے ٹکرا گیا جسے کمان سے پھینکے جانے والے بھالے نے مار گرایا تھا اور بھالا ابھی تک اُس کے سینے میں پیوست تھا۔ فرزندا نے جھنجلاتے ہوئے اپنے ہی سپاہی پر تلوار سے ضرب لگا کر اُس کا سر تن سے جدا کر دیا اور پھر اشنار کی طرف لپکا۔

اب موت اشنار کے سامنے تھی۔

شاہ فرزندا نے وحشیانہ نعرہ لگایا اور تلوار سر سے بلند کر لی تاکہ ایک ہی وار میں اشنار کے دو ٹکڑے کر دے لیکن اتنے میں میں وہاں پہنچ گیا... اور میری تلوار فرزندا کی تلوار سے ٹکرا گئی۔

"پیچھے ہٹ جاؤ۔" میں نے اشنار سے کہا۔

اشنار پیچھے ہٹ گئی پھر میرے اور فرزندا کے درمیان مقابلہ ہونے لگا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ شاہ فرزندا بے حد موٹا ہونے کے باوجود نوجوانوں سے زیادہ پھرتیلا تھا اور غوطار سے کہیں زیادہ بہتر شمشیر زن تھا۔ مجھے اپنی شمشیر زنی پر ناز تھا لیکن فرزندا سے مقابلہ کرتے ہوئے پتہ چلا کہ میں نے اُس کے متعلق غلط اندازہ لگایا تھا۔

وہ پینترے بدل بدل کر مجھ پر وار کر رہا تھا اور میرے لیے اس پر وار کرنا تو کجا، اپنا دفاع کرنا بھی مشکل ہو رہا تھا کہ اتنے میں چند پشکانی سپاہی بھی اپنے بادشاہ کی مدد کے لیے پہنچ گئے۔

اشنار وہاں سے جا چکی تھی۔

اس کے پنجروں والے سارے مرد مر چکے تھے اور فرزینو منجنیقوں سے میری کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس طرح میں خود بھی اُن کی زد میں آ کر ہلاک ہو سکتا تھا۔ اب میرے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ رہا کہ میں شمشیر زنی کے ساتھ ساتھ مارشل آرٹس سے بھی کام لوں۔ ہرچند کہ میں بری طرح گھر چکا تھا مگر میرے ہاتھ اور پیر الگ الگ اپنا کام دکھا رہے تھے۔ اتنے میں عورتوں کی فوج کا ایک دستہ پرجوش نعرے لگاتا ہوا ہماری طرف آتا دکھائی دیا۔

یہ شاید اشنار کی کارستانی تھا۔ میں ابھی انھیں جنگ کا ایندھن نہیں بنانا چاہتا تھا مگر اشنار کی حماقت نے انھیں میدانِ جنگ میں دھکیل دیا تھا۔

پشکانیوں نے اپنی زندگی میں ایسی خوبصورت عورتیں کبھی نہیں دیکھی تھیں اس لیے وہ ہکا بکا سے ہو کر انھیں دیکھنے لگے۔ ان عورتوں نے بھی ایسے وجیہہ جوان نہیں دیکھے تھے اس لیے وہ بھی لڑنا بھول گئیں اور وہ ہماری طرف سے غافل ہو گئے۔ اتنے میں شاہ فرزندا نے مجھ پر وار کرتے ہوئے کہا "آج میری تلوار تمھارا خون چاٹ کر ہی رہے گی، دھوکے باز!"

"شکست تمھارا مقدر بن چکی ہے فرزندا... اور یہ شکست بھی تمھیں عورتوں کے ہاتھوں نصیب ہوگی۔"

میری یہ بات دراصل ایک نفسیاتی حربہ تھی۔ جونہی عورتوں نے یہ الفاظ سُنے، وہ فرزندا کے لشکریوں پر ٹوٹ پڑیں اور اُن کا صفایا کرنے لگیں۔ شاہ فرزندا کی توجہ اُدھر منعطف ہوئی تو میری تلوار نے اُس کا بازو زخمی کر دیا۔ فرزندا کے منہ سے ایک ہیبت ناک چیخ نکلی مگر اُس نے تلوار اپنے بائیں ہاتھ میں منتقل کر لی۔

وہ ایک ماہر شمشیر زن ضرور تھا لیکن ایک طرف تو وہ زخمی ہو چکا تھا، دوسری طرف اُس کا بایاں ہاتھ دائیں ہاتھ جیسی کارکردگی نہیں دکھا سکتا تھا۔ چنانچہ اُس کے زخموں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہوتا چلا گیا اور پھر وہ نڈھال ہو کر گرا تو میری آخری ضرب نے اس کی گردن تن سے جدا کر دی۔

میں نے فوراً ہی اُس کا سر قریب پڑے نیزے پر بلند کیا اور نعرہ لگایا۔

"ادھر دیکھو پشکانیو! دیکھو کہ میں نے تمھارے بادشاہ کا کیا حشر کیا ہے۔"

پشکانیوں نے جب شاہ فرزندا کا بریدہ سر میرے نیزے کی نوک پر بلند دیکھا تو اُن کے حوصلے پست ہو گئے۔ وہ تیزی سے پسپا ہونے لگے جب کہ باقی ماندہ عورتوں کی فوج بھی نعرے لگاتی میدان میں آ گئی۔

میں نے اب تک گرانچو اور ڈوبلے کی طرف کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ دراصل مجھے اُن کی طرف دیکھنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا،

اب جو مَیں نے اُدھر دیکھا تو وہاں نہ گرابخو تھا اور نہ ہی رتھ... البتہ مجھے جلے ہُوئے خیموں کے عقب میں ایک رتھ پر راشی ضرور دکھائی دے گئی۔ مَیں نے پُوری آواز کے ساتھ چِلّا کر اسے مخاطب کیا۔

"راشی!... اِدھر دیکھو راشی۔ تمھارا سر بریدہ باپ تمھیں بُلا رہا ہے۔"

راشی نے میری طرف یا اپنے باپ کے کٹے ہُوئے سر کی طرف دیکھا تو فرطِ حیرت سے اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

اُس نے کمر سے بندھا ہُوا قرنا اپنے لبوں سے لگایا اور اُسے پھُونکنے لگی۔

قرنا کی آواز کے ساتھ ہی سارے رتھ ایک قوس کی صُورت میدان میں بڑھنے لگے۔ ہر رتھ پر ایک رتھ بان اور ایک تیر انداز سوار تھا اور ہر رتھ کو دو دو گھوڑے کھینچ رہے تھے۔ یُوں محسوس ہوتا تھا جیسے راشی اپنے باپ کا بریدہ سر دیکھ کر پاگل ہو گئی ہو۔

وہ بڑے زوروں سے قرنا پھُونکے جا رہی تھی جس کے ساتھ ساتھ رتھوں کی رفتار میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اُدھر میدان میں عورتوں کی ساری فوج، بھاگتے ہُوئے پشکانیوں کا پیچھا کر رہی تھی ہر طرف ایک بھگدڑ سی مچی ہُوئی تھی۔

رتھ بان جوش میں گھوڑوں پر کوڑے برسا رہے تھے۔ اُنھیں یہ احساس تک نہیں رہا تھا کہ خود اُن کے اپنے لشکری رتھوں کی زد میں آ رہے ہیں۔ مَیں نے یہ صُورتِ حال دیکھ کر چیختے ہُوئے عورتوں کو حکم دیا۔

"بھاگو... محفوظ مقام کی طرف بھاگو... اپنے آپ کو بچاؤ۔"

خُدا کا شکر ہے کہ عورتوں کی فوج اشنار کی کمان میں ہونے کے باوجُود اُس کی طرح ضدی نہیں تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ اُنھیں مجھ پر اندھا اعتماد ہے۔ مَیں نے ہرکارے سے اطلاع ملتے ہی رتھوں سے محفوظ رہنے کے لیے ایک خندق کھدوالی تھی اور یہ خندق پے دا کے خشک پودوں سے اس طرح پاٹ دی گئی تھی کہ بظاہر میدان کا حصّہ لگتا تھی۔ عورتیں اس محفوظ مقام کی طرف بھاگیں تو راشی نے رتھوں کو اسی طرف موڑنے کا حکم دے دیا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ وہاں اُس کے لیے پہلے سے جال بچھا دیا گیا ہے۔

رتھ بان گھوڑوں پر چابک برساتے ہُوئے اُدھر آئے تو بیشتر رتھ خندق میں گر پڑے اور تباہ ہو گئے۔ اُوپر سے عورتوں کی فوج نے اُن پر نیزے پھینکنے شروع کر دیے۔

راشی نے اپنے رتھ بان کو دھکا دے کر خُود باگیں سنبھال لیں اور رتھ کا رُخ میری طرف موڑ دیا... مگر اُس وقت تک وہ تیروں

سے زخمی ہو چکی تھی۔ اُس نے ایک ہاتھ میں تلوار اور دُوسرے میں نیزہ اُٹھا رکھا تھا۔ وہ تلوار والے ہاتھ سے گھوڑوں کی باگیں بھی تھامے ہُوئے تھی۔

جب وہ میرے قریب آئی تو مَیں نے فرزندا کا سر اُس کی طرف اُچھالا مگر وہ جھُکائی دے کر بچ گئی۔ اُس کے ساتھ ہی اس نے مجھ پر نیزے سے وار کیا۔ جس نے میرا بایاں بازُو زخمی کر دیا... مگر یہ زخم کاری نہیں تھا۔ اتنے میں اُس کے پیچھے سے دُوسرا رتھ گزرا تو مَیں لپک کر اُس پر سوار ہو گیا۔ تیر انداز نے مجھ پر حملہ کرنے کی بجائے کمان پھینک دی اور رتھ سے کُود گیا۔ رتھ بان کو مَیں نے اُٹھا کر نیچے پھینک دیا اور گھوڑوں کی راسیں سنبھال لیں۔

راشی اپنا رتھ موڑ کر میرے رتھ کے قریب لے آئی تھی اور اب پہلو سے رتھ ٹکرا کر میرے رتھ کو اُلٹنے کی کوشش کر رہی تھی۔

میرے رتھ میں صرف دو گھوڑے تھے جبکہ اُس کے رتھ میں چار گھوڑے جُتے ہُوئے تھے۔ مَیں اپنے رتھ کو گرنے سے بچانے کی کوشش کرتا تو وہ مجھ پر نیزے سے حملہ آور ہو جاتی۔ مَیں اپنے آپ کو نیزے کی زد سے بچاتا تو میرا رتھ بے قابو ہونے لگتا۔

یہ صُورتِ حال کافی دیر تک جاری رہی۔

ہمارے رتھ ایک دُوسرے کے ساتھ لگے، میدان میں چکر کاٹتے رہے۔

ایک بار راشی نے نیزے سے مُجھ پر وار کیا تو مَیں اُس کا نیزہ پکڑنے میں کامیاب ہو گیا۔ مَیں نے نیزے کو زور سے کھینچا تو اُس نے نیزہ چھوڑ دیا اور مَیں رتھ سے گرتے گرتے بچا۔ عین اُسی وقت اُس نے خنجر نکالا اور مجھ پر پھینکنے ہی والی تھی کہ اُس کی پُشت میں ایک بھالا پیوست ہو گیا۔ وہ لڑکھڑائی اور رتھ میں گر پڑی۔

مَیں سنبھلا اور اس کے چار گھوڑوں والے رتھ پر کُود گیا لیکن وہ میرے کُودنے سے پہلے ہی دم توڑ چکی تھی۔ مَیں نے بے لگام گھوڑوں کی راسیں سنبھالیں اور رتھ روک لیا۔

معاً مجھے اپنے پیچھے ایک اور رتھ رُکنے کی آواز آئی۔ مَیں نے جلدی سے پلٹ کر دیکھا۔ اس رتھ میں پشکانیوں کی بجائے اشنار اور ایک خواجہ سرا سوار تھا۔

"تم نے مجھے فرزندا کے ہاتھوں مرنے سے بچایا تھا سرفروش۔ مَیں نے اُس احسان کا بدلہ چُکا دیا ہے۔ راشی کو بھالا مَیں نے مارا تھا اور اگر مَیں اُسے وقت پر نہ مار دیتی تو اس وقت تم مر چکے ہوتے۔" اشنار نے کہا۔

"مَیں تمھارا شکر گزار ہُوں۔" مَیں نے جواب دیا۔

"شکر گزار تو مَیں بھی ہُوں کہ تمھاری وجہ سے ہم نے پشکانیوں پر فتح پائی ہے۔ ہم نے بہت سے پشکانیوں کو پکڑ لیا ہے۔ ہم ہر خاتون کے لیے ایک ایک پشکانی رکھ کر باقی سب کو ٹھکانے لگا دیں گے۔"

"یہ باتیں پیش از وقت ہیں اشنار۔" مَیں نے ہانپتے ہُوئے کہا۔ "بعد میں اطمینان سے فیصلہ کر لینا۔"

"تم بہت تھک گئے ہو سرفروش دیوتا۔" وہ بولی اور پھر خواجہ سرا سے مخاطب ہُوئی۔ "دیوتا کو فتح کا جام پلاؤ ارمیدی۔"

خواجہ سرا نے صراحی سے جام بھر کر میری طرف بڑھا دیا۔

"فتح کا جام پہلے تم پیو اشنار۔" مَیں نے کہا۔

"نہیں، مَیں بعد میں پیوں گی۔ پہلا حق تمھارا ہے۔" اُس نے مسکراتے ہُوئے کہا۔

اچانک مجھے گُوما کی باتیں یاد آ گئیں۔

اُس نے کہا تھا کہ اشنار پر کبھی اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اُوپر سے کچھ دکھائی دیتی ہے مگر اندر سے کچھ اور ہی ہوتی ہے۔ خُود مجھے بھی اس کا تجربہ ہو چکا تھا۔ اس لیے مَیں نے خواجہ سرا سے کہا۔ "یہ خمرشان کی فتح کا جام ہے۔ یہ خمرشان کے عوام کی فتح ہے اس لیے پہلا جام یہ خواجہ سرا پیے گا۔"

یہ سُنتے ہی خواجہ سرا بے ساختہ بول اُٹھا۔ "نہیں نہیں دیوتا۔ مَیں زہر نہیں پیوں گا۔" یہ کہہ کر اُس نے صراحی پھینکی اور رتھ سے کُود کر بھاگ کھڑا ہوا۔

مَیں نے قہقہہ لگایا اور جام راشی کی لاش پر انڈیلتے ہُوئے کہا۔

"تمھیں فتح مبارک ہو اشنار! مَیں گرابخو کی تلاش میں جا رہا ہوں۔"

"گرابخو کی یا اُس کنیز کی تلاش میں... مَیں خوب سمجھتی ہُوں سرفروش۔" وہ تنک کر بولی۔

"تمھارا جو جی چاہے، سمجھتی رہو۔" مَیں نے کہا اور گھوڑوں کی باگیں سنبھال لیں۔ گھوڑے اب تازہ دم ہو چکے تھے۔

مَیں رتھ دوڑاتا ہُوا سوختہ خیموں کے قریب پہنچا۔ شاہ فرزندا کا خیمہ خالی تھا۔ مَیں نے ایک زخمی پشکانی سے پوچھا۔ "گرابخو کہاں ہے؟"

"وہ کنیز کو اپنے رتھ میں بٹھا کر فرار ہو گیا ہے دیوتا۔"

"کس طرف گیا ہے وہ؟"

"اُدھر...!" اُس نے ہاتھ اُٹھا کر ایک جانب اشارہ کیا۔

مَیں نے رتھ اسی طرف موڑ لیا۔

میرا رتھ سرپٹ دوڑ رہا تھا۔

آگے جا کر یہ راستہ تنگ ہوتا گیا۔ اس کے دونوں جانب پے دا کے کھیت تھے۔ مَیں نے دیکھا کہ میدانِ جنگ سے فرار ہونے والے

کچھ پشکانی گھوڑوں کی ٹاپیں سُن کر پے دا کے کھیتوں میں رُوپوش ہو رہے ہیں۔ وہ شاید گرگوش کی طرف واپس جا رہے تھے۔

مجھے وقت گزرنے کا احساس نہ ہُوا۔ میرا رتھ نہ جانے کب تک دوڑتا رہا۔

اچانک مجھے یُوں محسوس ہُوا جیسے کسی نے طوفانوں کے دروازے کھول دیے ہوں۔ ہَوا کے ایک بے حد تیز تھپیڑے نے مجھے رتھ سے نیچے گرا دیا۔ غنیمت ہے کہ مَیں پیٹھ کے بل گِرا تھا۔ اگر مَیں سر کے بل گرتا تو یقیناً میری کھوپڑی ٹوٹ جاتی۔ میرے رتھ کو بھی شدید جھٹکا لگا تھا اور وہ اُلٹتے اُلٹتے بچا تھا۔

مَیں نے پلٹ کر دیکھا تو مجھے دُور اُفق پر دُھویں کا ایک بہت بڑا درخت نُما، بادل نظر آیا جو ہر لمحے بلند ہوتا جا رہا تھا۔

مَیں دوبارہ رتھ پر سوار ہُوا اور اپنے سفر پر گامزن ہو گیا۔

پے دا کے سائے لمبے ہو چلے تھے کہ اچانک مجھے دُور ایک رتھ دکھائی دیا۔ اُس رتھ کے ساتھ ژدلے بھی کھڑی تھی۔ جب میرا رتھ قریب پہنچا تو مجھے رتھ میں لیٹا ہُوا گراچو بھی نظر آ گیا۔ مَیں نے اپنا رتھ اُس کے پیچھے روک دیا اور اُتر کر ژدلے کے قریب جا پہنچا۔

ہر چند کہ ژدلے بڑے کرب، بڑے عذاب اور بے پناہ عقوبتوں سے گزری تھی مگر اس وقت مجھے دیکھ کر اُس کے ہونٹوں پر جو معصوم مسکراہٹ اُتری، اُس نے ژدلے کو ایسا ملکوتی حُسن بخش دیا جس کی یاد آج بھی میرے دِل میں گلاب سے کھِلا دیتی ہے۔ وہ اپنی باہیں پھیلاتے ہُوئے بولی۔

"مجھے یقین تھا کہ آپ ضرور آئیں گے دیوتا!"

"اور میرا دل بھی یہ گواہی دیا کرتا تھا کہ تم مجھے ضرور ملو گی... اور ... اور مَیں اس بدبخت خواجہ سرا سے تم پر کیے جانے والے ہر ظلم کا بدلہ لے کر رہوں گا!"

"لیکن اب آپ ایسا نہیں کر سکیں گے دیوتا!"

"وہ کیوں؟" مَیں چونک پڑا۔

"اس لیے کہ گراچو مر چکا ہے!"

"مر چکا ہے؟" مَیں نے تعجب سے دُہرایا۔ "کس نے مارا ہے اسے؟"

"اس نے خُودکشی کی ہے دیوتا!"

"کیوں؟" میری حیرت ابھی تک رفع نہیں ہوئی تھی۔

"کیونکہ جبر دت تباہ ہو چکا ہے۔ اس کی جوہری توانائی ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکی ہے اور اس کے ساتھ ہی گراچو کے سارے خواب ریزہ ریزہ ہو گئے ہیں!"

"تمھیں کیسے معلوم ہُوا کہ جبر دت کی توانائی ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی ہے؟"

"مجھے گراچو نے بتایا تھا دیوتا! ہمارے رتھ کو ایک شدید جھٹکا لگا تھا۔ پھر اُس نے شمال سے دُھواں اُٹھتے دیکھ کر کہا تھا کہ سرفروش داعی دیوتا ہے۔ اس نے جوہری توانائی ختم کر دی ہے۔ اب میرے سارے خواب مر گئے ہیں اس لیے مَیں بھی مر جانا چاہتا ہُوں۔ یہ کہہ کر اُس نے ایک سُنہری گولی نکالی اور اسے کھا کر مر گیا۔ آپ نے توانائی کیوں ختم کر دی دیوتا؟"

"توانائی مَیں نے نہیں، گوما نے ختم کی ہو گی۔ وہ جبر دت اور خرشان کو نئی زندگی دینا چاہتا تھا، وہ زندگی جو فطری ہے۔ وہ مجھ سے کہا کرتا تھا کہ سائنس کا ارتقا اور اُس کی عطا کردہ آسائشیں انسان کو فطرت سے، مذہب سے اور خُدا سے دُور کر دیتی ہیں... پھر وہ انسان نہیں رہتا بلکہ مشین بن جاتا ہے۔ اس لیے یہ سائنسی ارتقا ختم ہو جانا چاہیے تاکہ انسان خُدا کی طرف لوٹ سکے مگر وہ کہتا تھا کہ لوگ اُس کی بات نہیں سُنتے اور اسے بُڈھا خبطی سمجھتے ہیں!"

"اب کیا ہو گا دیوتا؟" وہ پریشانی سے بولی۔

"خرشان کو نئی زندگی ملے گی ژدلے۔ خرشان کے انسان نئی زندگی سے آشنا ہوں گے۔ اُنھیں محنت تو ضرور کرنا پڑے گی مگر وہ خُدا سے قریب ہو جائیں گے!"

"یہ باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں دیوتا!"

"مجھے دیوتا مت کہو ژدلے۔ مَیں انسان ہوں اور انسان ہی رہنا چاہتا ہُوں۔ آؤ چلیں!"

مَیں نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور ہم چار گھوڑوں والے رتھ کی طرف بڑھ گئے... لیکن اُسی لمحے عقب سے ایک خونخوار قہقہہ سنائی دیا اور ہم دونوں ٹھٹک گئے۔ مَیں نے چونک کر پلٹتے ہُوئے آواز کی طرف دیکھا اور پھر مجھے یُوں محسوس ہُوا جیسے میری سانسوں کی آمدورفت اچانک ہی رُک گئی ہو۔

دُوسرے رتھ سے گراچو کی لاش آہستہ آہستہ اُٹھ رہی تھی۔ لاش کے قہقہے بے حد خوفناک تھے۔ ژدلے مارے خوف کے مجھ سے چمٹ گئی اور خود میرا جسم بھی ہلکی ہلکی کپکپاہٹوں کا شکار ہو گیا۔

اس کے بعد "سرفروش" کے دوسرے حصے کا مطالعہ کریں